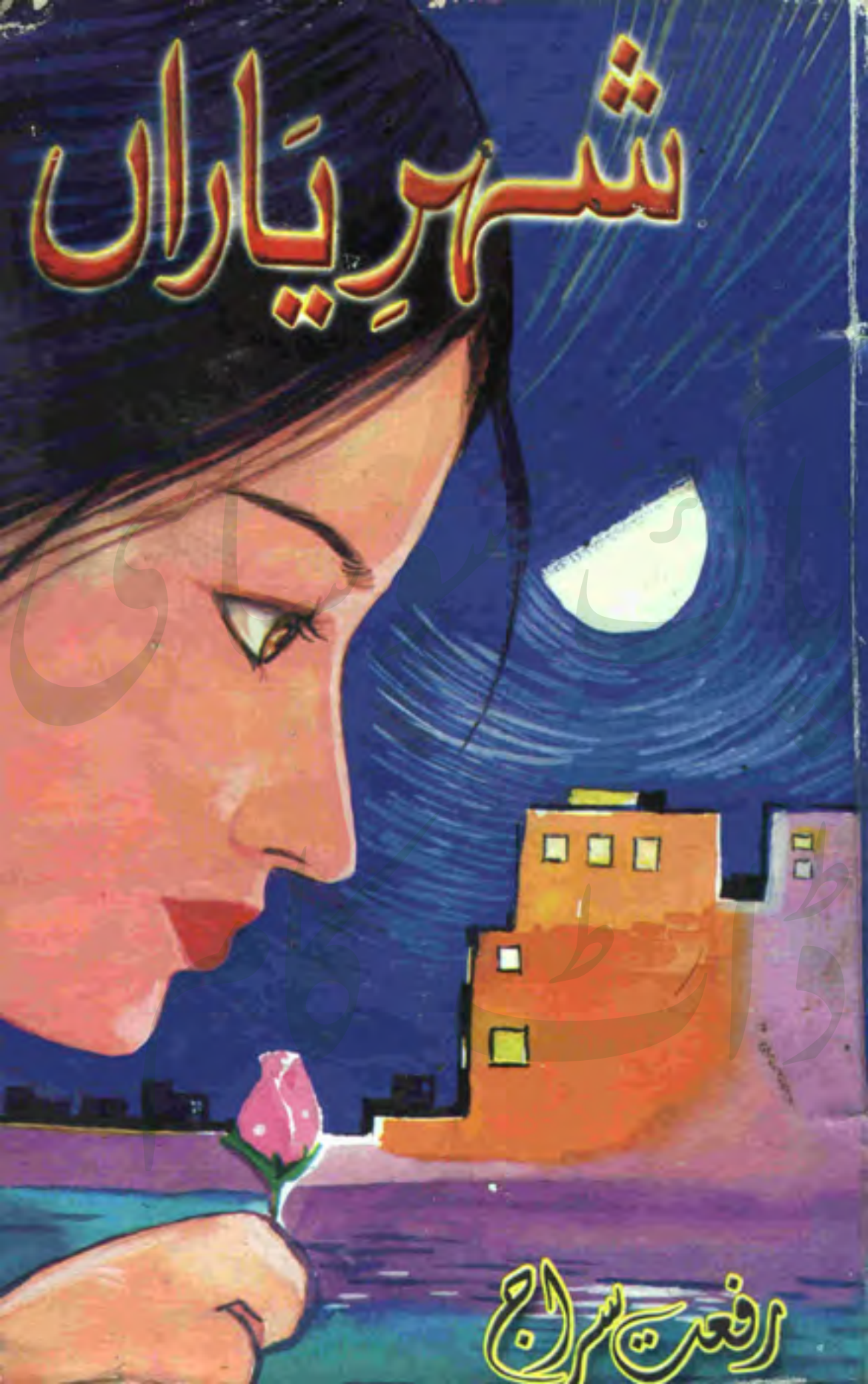


# شہرِ پیاراں



رفعت سراج

شادی کا گھر تھا۔

ظاہر ہے بقیہ نور بنا ہوا تھا۔

لہراتے آنچل، خوشبوئیں، مسکراہٹیں، ایک خوشی کا عالم۔ آتشیں گلابی چم چم کرتے سوٹ میں لباس کھلی کلی کی طرح وہ بھی ہنستی مسکراتی ادھر سے ادھر آ جا رہی تھی۔ بارات آچکی تھی۔ رونق اپنے عروج پر پہنچ رہی تھی۔  
معاً ایک بچی (جو اس کے لیے اجنبی تھی) نے اُسے مخاطب کر کے آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ کچھ ہنسی، چونکی، ادھر ادھر جائزہ لینے کے انداز میں دیکھا، پھر کچھ سوچ کر شامیانے کے اس طرف آگئی جس کی سمت، بچی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ پشت کیے انجن بنا چھکا چھک دھواں چھوڑ رہا تھا۔

قدموں کی چاپ پر پلٹا۔ نوگرما دیے والی نظریں اس کی چہرے کو سلگنا لگی تھیں۔ وہ اس کے قریب آگئی۔ خاصی گھبرا رہی تھی۔ اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ اس سے قبل کہ کچھ بولتی، کچھ کہتی یا سمجھتی اس نے اس کا ہاتھ تھاما (سگریٹ ہونٹوں میں دبا ہوا تھا) اور بجلی کی سی سرعت سے اس سمت بڑھا، جہاں چھوٹی سی سرخ کار کھڑی تھی جس کے اگلے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اس نے بے دردی سے اسے اندر دھکیلا اور دروازہ بند کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر آکر دروازہ بعد میں بند کیا اور ایک سیلینڈر پر پاؤں پہلے جمائے گاڑی کے پیچھے تیزی سے چڑھائے۔ آٹا ٹاٹا گاڑی فرمائے بھرنے لگی تھی۔ یہ سب اس قدر اچانک اتنا ناگہاں تھا کہ وہ کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھی مگر کار اسپینڈ لیے آگے بڑھتے دیکھی تو ایک دم حواسوں میں آگئی۔  
”یہ۔ یہ۔ کیا کر رہے ہیں۔ کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟“ مارے گھبراہٹ کے وہ بے ربط ہونے لگی تھی۔

خاموش بیٹھی رہو۔ بالفرض محال اگر بھگا کر بھی لے جا رہا ہوں تو اپنی قانونی دشمنی بیوی کو۔ اس میں جھہیں یا کسی۔ اور کو مطلق اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

اس کے لہجے میں غراہٹ تھی۔ وہ بید کی طرح لرز رہی تھی۔ اس کی بات پر تو رہے سبے اوسان بھی جاتے رہے۔ ”مگر کیوں؟ کیوں کالک ملنا چاہتے ہیں آپ میرے چہرے پر۔؟“ وہ جیسے ہوش میں آکر ہڈیاں انداز میں چینی تھی۔

”زیادہ ڈائیا لگ بولنے کی ضرورت نہیں۔ خاموش بیٹھی رہو۔“ اس نے غلت بھرے انداز میں مونڈ کاٹا کہ وہ اس

کے شانے پر جھول کر رہ گئی۔

”احسن! پلیز، یہ نہ کریں خدا کے لیے، ایک لمحے کو سوچیں، یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔“

”مگر مجھے اس معاشرے میں رہنا ہے۔“

”اور میرے ساتھ رہنا ہے۔“ احسن نے فوراً اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”یہ آپ کی خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے۔“ وہ دھواں دھار رو پڑی۔

”کالج نامے پر دستخط میری خوش فہمی ہی نے تو کرائے تھے۔“ وہ استہزائیہ ہنسنا نظریں سامنے ہی مرکوز تھیں۔

”کیا جج جج تم نے گواہوں کی موجودگی میں اعتراف نہیں کیا تھا کہ میرا ساتھ قبول ہے۔؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”مگر اس طرح نہیں۔“ وہ ہچکچاہٹ لے کر رو رہی تھی۔

”میں نہیں جانتا اس طرح اور اس طرح کو۔ سمجھیں اور اب زیادہ ٹسوے بہانے کی ضرورت نہیں۔ تم آخر کار اسی کے پاس ہو، اسی کے ساتھ ہو جس کے ساتھ بہر حال تمہیں رہنا تھا۔“

”میں جان دے دوں گی۔ مگر۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”تو پھر ابھی کیوں نہ گاڑی دے ماروں کہیں پر۔ محبت کی ایک نئی کہانی تیار ہو جائے گی۔“ اس نے اسپید بڑھا دی۔

”آپ چاہتے کیا ہیں؟“ آخر کار اسے مقول سوال سوچھ گیا۔

”تمہارے اور اپنے بڑوں کو سبق سکھانا چاہتا ہوں۔“ وہ غرایا

”مگر اس سارے قصے میں میرا کیا قصور نکلتا ہے؟ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟“ اس نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”سزا کب دے رہا ہوں، انجام دے رہا ہوں۔ آخر جو ان ہو، تمہاری اپنی بھی تو کوئی زندگی ہے۔ آج سے بلکہ ابھی سے ہمارا ہی مون پیڑ شروع ہو رہا، کیا تمہارے لیے یہ خوشی کی بات نہیں؟“

اس کے لہجے میں عجب سی کاٹ تھی۔

وہ بدک کر دروازے سے لگ گئی۔ مارے خوف اور شرم کے اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

”یہ ریک حرکت نہیں کر سکتے۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اچھا!۔۔۔“ وہ استہزائیہ ہنسنا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، اب تک کا جو اقدام ہے، یہ بدیہرسل ہے۔؟“

”پلیز، خاموش ہو جائیں۔ میرا دل بند ہو جائے گا۔“ واقعی اس کی جان پر پٹی ہوئی تھی۔

”ایسا تم نہ کرنا، مردے سے انتقام لینا میرے بس سے باہر ہو گا۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

”انتقام۔؟ یہ نیا انکشاف تھا۔ وہ بھونچکی سی رہ گئی تھی۔

”میں اس بگڑے ہوئے انسان کے ساتھ رہنا اتنا ہی ناپسند کرتی ہوں جتنا کہ میرے والدین۔ کہا تھا ناں۔“ وہ

پوچھ رہا تھا۔

”کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں۔“ اس نے بڑے جوش سے کہا۔

”ہا۔۔۔“ احسن کا قبضہ کار میں گونج کر رہ گیا تھا۔

”معصومیت کہوں یا نادانی اتنے قریب بیٹھی ہو اور یہ بات کہہ رہی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں عالم برزخ میں لے

جا رہا ہوں۔

جب تم وہاں سے نکلو گی۔ کم از کم میرے کیوٹ سے دو تین بچوں کی امی جان تو بن چکی ہو گی۔“

مارے حیا اور خوف کے اس کی حالت غیر ہو گئی۔

”احسن! اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کر دیے۔ آنسو خشاروں پر سلسلہ وار بہہ رہے تھے۔

”دیکھئے۔ یہ ہاتھ جڑے ہیں۔ مجھ پر رحم کر دیجیے۔ ایسا نہ کیجیے۔ جیسے آپ کہیں گے، میں ویسے ہی کروں گی۔ مگر خدا را“

احسن نے گاڑی روک دی اور اس کا دل خوش فہمی کے گرداب میں بچکوں کے کھانے لگا۔ (یعنی اسے ترس آئی گیا)

احسن نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”کوئی گستاخی کر بیٹھا تو برا مانو گی۔

”مگر اپنی اداؤں پر کنٹرول کرو۔ مجھے کنٹرول سے باہر کر دیں گی۔“ اس کے لہجے سے نشہ چھلکنے لگا تھا

اس نے خوفزدہ ہو کر اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

”احسن! میں آپ کی عزت ہوں۔“ فرار کے تمام مسدود راستے اسے وہ۔۔۔ میں لے آئے تھے۔

”اسی لیے تو عزت افزائی کر رہا ہوں۔“ اس نے پھر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

”اس کا انجام نہ آپ کے حق میں اچھا ہو گا اور نہ میرے حق میں۔“ بالآخر اس نے دھمکی دی۔

وہ مسکرایا۔

”اچھا۔۔۔!! تم ابھی تک انجام ہی پر سوچ رہی ہو۔ بہت بچپنا ہے ابھی۔“

اس نے ایک موڑ کاٹا۔ تاحد نگاہ مرکز دوڑ رہی تھی۔ دائیں بائیں ویران تھا۔ انکا دنگا جھاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

وہ اس کے شیشے میں مکمل چنسی ہوئی تھی۔ فراری، کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ خوشامد، منت، دھمکی، آنسو ہر شے بے

اثر ٹھہری تھی۔

”میں آپ کے ارادے جانتا چاہتی ہوں۔“ اس نے خود پر قابو پا کر حالات کا سامنا کرنے کا ارادہ کیا

”ارادے میرے بڑے نیک ہیں۔ بے فکر رہو۔ اور خلاصہ یہ ہے کہ آج تمہاری رخصتی ہو گئی ہے۔ میں ان لوگوں

میں سے نہیں ہوں جو ترستے ترستے، آہیں بھرتے اس دنیا سے گزر جائیں۔ چیلنج قبول کرنے کے بجائے ہتھیار ڈال دیں۔

تمہاری ذات پر میرا جو حق بنتا ہے، پائی پائی وصول کروں گا۔ تمہیں احساس نہیں کہ تم کتنی بڑی جیتی جاگتی قیامت ہو، یہ

نقدیر کی زور آوری ہے کہ میری ہو۔“

”میں آپ کو آپ کے عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ آپ نے بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔“

”میرے خیال میں اب تمہیں خاموش ہو جانا چاہیے۔“ وہ ایک بار پھر غرایا تھا۔

اس کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس کی نگاہوں میں گھر والوں کی صورتیں پھر نے نکلیں۔ اس کے غائب ہو جانے پر انہیں کس قسم کے حالات سے دو

چار ہونا پڑے گا۔ اس کے بھائیوں پر کیا پہاڑ ٹوٹیں گے۔

ہزار وہ اس کی منکوحہ ہے مگر معاشرے کے کچھ ضابطے ایسے ہیں جن کی خلاف ورزی پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔

اس نے تھوڑا سا چہرہ موڑ کر کن اکھیوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ڈھانٹ شرٹ، سیاہ پیٹ۔ وہ بے حد جاذب نظر آ رہا تھا

ہمیشہ کی طرح۔ سیاہ کھنٹی مونچھوں سے بالائی ہونٹ مکمل ڈھانپ رکھا تھا۔ نچلے ہونٹ سے خون چھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

آستیش کہیں تک مزی ہوئیں۔ گریبان کھلا ہوا۔ آنکھوں میں سفاکی، انداز میں بے رحمی اور انتہا پسندی۔

اس نے محسوس کر لیا، وہ اب مکمل اس کے کنٹرول میں ہے، رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

وہ آہستہ سے ذرا آگے جھک گئی اور ہنسی ہی سے اُلٹے ہاتھ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اس نے معصوم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھاگ کر جان نہیں بچا سکتی تو چھلانگ مار کر گاڑی کے پیروں کے نیچے آ جائے گی۔

یہ بھی ایک لمحہ ہوتا ہے۔

خودکشی کے لیے محض ایک فیصلہ من لمحہ چاہیے ہوتا ہے، جو اس کی زندگی میں آچکا تھا۔

ہاں، وہ تو جین آ میز زندگی گزارنے سے بہتر یہ سمجھتی ہے کہ جان دے دے۔ وہ اپنے پیارے باپ کی پگڑی نہیں اچھال سکتی۔ آہستہ سے کلک کی آواز ابھری۔ اس نے پیشتر دروازہ کھینچ کر تکی، اس کے بائیں بازو کے ٹکڑے میں تھی۔

”نہ۔ نہ۔ میری جان۔ یوں غافل نہ سمجھو۔ جو آپ کو جانتا ہے، وہ بے خبر کیسے بیٹھ سکتا ہے؟

میرا تو پورا وجود آکھ بن کر آ، اور اس غم کو کر رہا ہے سوئٹ ہارٹ۔

ویسے مجھے تمہاری بہادری پسند آتی۔

وہ نچلا ہونٹ وہاں بہت سفاکی سے مسکرا رہا تھا۔

وہ اس کے بازو کی گرفت سے اپنا وجود چھڑانے میں ناکام رہی تو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ اسے اپنے شانے سے لگائے ایک ہاتھ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔

اس کے وجود کی تھک سے رواں رواں کانپ رہا تھا۔ وہ آج سے پہلے کبھی اس کے اتنے قریب نہیں آئی تھی۔ وہ اس کی زندگی میں داخل ہونے والا اولین مرد تھا۔ جس نے ”بھارت“ کی ابتدا ہی میں اس پر اپنا نام لگا دیا تھا۔

قریب سے ایک ٹرک گزرا تو اسے شرم کے جی چاہا کہ بیٹھی بیٹھی مر جائے۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ بے لکڑی سی تھی۔

”احسن! میں کچھ نہیں کروں گی۔ آپ اپنا ہاتھ ہٹالیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔“

اتنی قربت سے اس کے وجود میں بھونچال آ گیا تھا۔

”گویا دست بردار ہو جاؤں؟ ارے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہاری خاطر تو سپر پاور سے نکلنے کو تیار ہوں۔ خیر ساری عمر بڑی ہے۔ ابھی نیا نیا معاملہ ہے، تھوڑے دن تو گھبراؤ گی۔ عمر بڑی ہے۔ تمہاری بات ماننے لیتے ہیں۔“

احسن نے اس کی طرف جھک کر لاک لگا دیا۔

اور پہلے کی طرح آرام سے بیٹھ کر کار ڈرائیو کرنے لگا۔ اس کی اتنی قربت نے شاید احسن کو پھٹلا سا دیا تھا۔ عجب شہابی اور اطمینان کی کیفیت اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

اب وہ کچھ گنگنا رہا تھا۔

چلو کہیں دور یہ سماج چھوڑ دیں۔

اسے یہ سارے انداز سو قیادو عامیاندگ رہے تھے۔ ایک قیامت تھی جو دل پر گز رہی تھی۔

ایک سوالیہ نشان اس کے سامنے تھا کہ

کیا ہوگا؟

”آپ نہ کہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟“ اس نے ہمت کر کے اس کی سمت دیکھا۔

”اتنی کے اس پار۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ لگا دی۔ رفیع کی آواز ابھری۔

کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم میرے کیا ہو

وفا جس نے لوٹی، وہی بے وفا ہو

وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

معاذ اللہ! آبادی نظر آئی کوئی تو تیر شدہ ہستی تھی۔ چند وسیع مکان بنے ہوئے تھے۔ باقی پلاٹ یونٹی بڑے تھے یا چند کے گرو چہار دیواری کھینچی ہوئی تھی۔

اتنا سنا۔

اتنی دیرانی۔

اس کے اعصاب جواب دینے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی۔

”احسن! میرا تصور بتا دیجئے۔“ وہ رقت سے گویا ہوئی۔

”مگن کر بتاؤں گا۔ چلو شاپاش۔ آتو۔“ اس نے بے رنگ درویش کے ایک مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔

”سنو، اگر بھاگنے اور شور مچانے کی کوشش کرو گی تو یاد رکھنا میں پوزیشن ہولڈر ہوں۔ اس کے علاوہ میری

جیب میں نکاح نامہ اور نکاح کی تصاویر موجود ہیں۔ کوئی میرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔“

وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بڑے کاٹ دار لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس پر بھی وہ شس سے مس نہ ہوئی۔

احسن نے دروازہ کھول کر اسے بازو سے پکڑ کر بے دردی سے کھینچا۔ اور پوری قوت سے دروازہ بند کر دیا۔

ایک ہاتھ سے گیٹ کا تالا کھولا۔ اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے راہداری میں چلا گیا۔ کونے میں بنے ہوئے ایک کمرے کا لاک کھول کر اسے اندر لے کر داخل ہوا۔ نیلے رنگ کا ایک بھاری بھر کم صوفہ سامنے تھا۔ اس نے صوفے پر تقریباً

اسے بیٹھ دیا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا جب تم جانتی ہو تمہاری مزاحمت کی میرے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے تو پھر یہ سب کیوں کر

رہی ہو؟

کر کیا سکتی ہو تم؟ کیا خاموشی سے بات نہیں مان سکتیں؟“ وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ وہ لڑکھڑکی ہو گئی۔

اس نے اس کا بازو تھام کر اسے صوفے پر گر ادایا۔

”دیکھو شوہر! میں خود تمہارے ساتھ کوئی ظلم کرنا نہیں چاہتا، مگر مجھ پر ظلم ہوا ہے میں اپنے اور تمہارے ماں باپ کو کچھ سبھا دینا چاہتا ہوں۔ ہمیشہ ہمیش کے لیے میں شاید تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں چھوٹا بھی پسند نہ کرتا۔

مگر میں تمہیں اس حالت میں دوبارہ ان کے پاس چھوڑ کر نہیں آؤں گا۔ اس لیے کہ اس طرح ان کا کچھ نہیں بگڑے گا

اب جب تم ان سے ملو گی تو مکمل ”مسز احسن“ بن کر۔

رخصتی کے بعد دوانی مسز احسن بن کر۔ سمجھیں۔؟ نہیں۔؟“

وہ بے رحمی سے مسکرا رہا تھا۔

”عملاً سمجھاؤں گا۔“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شوہاری نا اہلیں کا بچنے لگی تھیں۔

”پانی پیو گی یا کچھ کھاؤ گی؟“ وہ اس کے صبح چہرے کو بھر پور نظروں سے جانچ رہا تھا۔



”زہر عشق کیوں کھا کر نہیں دیکھتیں۔“ وہ برصہ کہہ کر مسکرایا تھا۔  
 ”جن کا ساتھ سائے کی طرح ہے ان کی اتنی فکر جس کے ساتھ عمر گزارنی ہے۔“  
 ”نہیں گزارنی ہے مجھے آپ کے ساتھ عمر۔“ وہ چمککاری۔  
 ”یہ تو فیصلہ ہو ہی جائے گا۔“

کیا تمہیں کامل یقین ہے تمہارے والدین تمہارے ساتھ بھلائی کر رہے تھے؟“  
 ”والدین ہمیشہ بھلائی ہی کیا کرتے ہیں۔“  
 ”یہ کوئی فارمولہ نہیں ہے۔ میرا تجربہ مختلف ہے۔“ وہ قطعی انداز میں گویا ہوا۔  
 کسی پر ناگہانی پڑتی ہے تو کہا جاتا ہے۔ تعجب ہے یقین نہیں آتا۔  
 خود پر ناگہانی پڑتی ہے تو کہا جاتا ہے۔ ہائے میری تقدیر۔  
 وہ بھی یہی کہہ سکتی تھی مگر وہ کم ہمت نہیں تھی۔ وہ اس پہنچ سے شستا چاہتی تھی۔  
 یہ سوچ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو رہی تھی کہ شادی کا گھر ماتم کدہ بن چکا ہوگا۔  
 معاؤہ کھڑی ہو گئی

اس کے لب کا پ ر رہے تھے۔ وہ انکوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 وہ بہت غور اور دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔  
 وہ ایک دم اس کے گھٹنوں پر جھک گئی۔

”احسن! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ مجھے چھوڑ آئیے۔ یقین کریں میں کسی سے نہیں کہوں گی کہ آپ مجھے لے گئے تھے۔“ وہ سسکی۔

”کہہ بھی دو گی تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔“ وہ تلخی سے مسکرایا۔

”اتنے سنگدل نہ بنیے۔“ وہ نرمی ہوئی آواز سے بولی۔

”اب چلا۔ جب ایک فریق سنگدل بنتا ہے تو دوسرے فریق پر کیا گزرتی ہے۔“

”ہاں چل گیا پتا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”مجھے احساس ہو گیا ہے۔ اب آپ کو کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہوگی۔“  
 ”وہ امن کی قاتلہ کار روپ دھار رہی تھی۔“

”بہت اچھی بات۔ مجھے یہ عہد لے کر از حد مسرت ہو رہی ہے۔“

آج کی شب تو تمہارے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ یہ میرے پلان میں شامل نہیں ہے۔ آج تو گھنٹن میں میری حاضری بہت ضرور دینی ہے۔“

وہ ہنستا ہنستا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تم اس گھر کی فی الحال مالکن ہو۔ سیاہ سفید کی مالک ہو۔ ہم کل ملیں گے۔ اور یاد رکھو۔ اگر تم نے اپنی جان پر بنانے کی کوشش کی۔ تو یاد رکھنا میں تمہاری تمہارے بے روح وجود کی تصویر بنا کر خبر کے ساتھ بڑی سرکیشن کے اخبار میں دولں گا۔ جب کسی کی انوشاہہ بیٹی لاوارث انداز میں تمہیں اپنے گھر والوں کا بیعت خیال ہوگا۔“  
 وہ انسان نہیں درندہ لگ رہا تھا۔

”سانے کھانے پینے کی کچھ چیزیں اور پانی موجود ہے۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے۔  
 ”احسن! نہیں۔ نہیں۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ دوڑ کر اس کے قریب گئی۔  
 احسن نے اسے شانوں سے تمام لیا۔

”یہ مجبوری ہے میری جان۔ اور دیکھو اسے اٹک نہ بہاؤ۔ کہ میں بے قرار ہو کر ان کا ذائقہ بکھنے پر مجبور ہو جاؤں۔“

”ہائیں۔!“ وہ خاک بھی نہیں کبھی۔ حیر سے پھلی آنکھوں سے بس دیکھا کی۔

”کوئی ظالم بھی ہو اور مصوم بھی تو عجیب سی پجوشن ہو جاتی ہے۔ اب اسے حیر نہ چلاؤ۔ فیک اٹ ایزی ڈارنگ۔“  
 شرم اور کوفت سے اس کا ہر حال ہو گیا۔

”آپ مجھے ان بدتمیزے ناموں کے ساتھ مخاطب نہ کریں۔ واقعی آپ۔۔“ وہ ایک دم پُپ ہو گئی۔

وہ اس سے جھٹکا کر کے صورت حال مزید بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔

”یہ تو قربتوں کے نام ہیں۔ میں نہیں بخاں لب کروں گا، اگر تم مجھ سے دور ہو کر وہاں مومنے پر بیٹھ جاؤ۔“

اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا، وہ جھک کر پیچھے ہٹ گئی۔

”میں اس قید تہائی میں مر جاؤں گی۔“

”میں تمہارے عشق میں ابھی تک نہیں مرا جو اس قید تہائی سے زیادہ شدید اور اذیت ناک ہے۔ برداشت کے

دوسرے پلڑے میں تم آ جاؤ شاید توازن قائم ہو جائے۔“

اس نے تیزی سے باہر نکل کر لاک لگا دیا۔

جس وقت وہ گھر سے باہر آیا تو پورے گھر میں اس کی سسکیاں بکھری ہوئی تھیں۔

حسب معمول پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھلا۔

”ارے بد ذات کے بچہ۔ وہاں باہر سارے پودے سوکھ رہے ہیں۔ کسی کو اتنی تو فتن نہیں کہ پانی ڈال دے۔ کیا یہ

سب اپنا بچہ ہو چکے ہیں۔ یا فوٹ ہو چکے ہیں؟“

اس قیامت کی گھن گرج تھی کہ پورا گھر لرز اٹھا تھا اگرچہ روزانہ کا معمول تھا پھر بھی اس بگل حشر کے بجتنے ہی پیسے دو

اروزندہ ہوتا تھا۔

صفیہ شوہر کی گھن گرج کے ساتھ ہی کسی کوئے سے باہر برآمد ہو جاتی تھیں۔ حسب معمول اس وقت بھی وہی سب سے

پہلے منظر پر تھیں خشک لب جو سب سے بڑی تھی ایک بھائی احسن سے چھوٹی تھی، اور چھ بہنوں اور ایک بھائی سے بڑی تھی، سلائی

شین پر چمکی کچھ سی رہی تھی۔ چند منٹوں کے لیے رک گئی تھی۔ اس سے چھوٹی نیلہ پن درک میں مصروف تھی۔ باپ کی آمد کا

ملاحظہ اٹھا تو تمام چیزیں پٹنگ کے نیچے کھکا دیں۔

اس سے چھوٹی نائلہ۔ اپنی ایک پرانی قمیض پر نیا ڈیزائن ڈال رہی تھی۔ اس نے قمیضی دی کے پیچھے چھپا دی۔

اس سے چھوٹی انشا اپنی چادر دھو رہی تھی۔ چند بلائیے دم سادھنے کے بعد دوبارہ دھلائی میں لگی گئی تھی

اس سے چھوٹی راحیلہ ہوم درک کر رہی تھی۔

اور سب سے چھوٹی بیلا بھاگ کر کچن میں دم سادھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”اگر کہاں ہے؟“

”پڑھنے گیا ہوا ہے۔“ صنفیہ آہستہ سے گویا ہوئیں۔

”یہ سب بہانے ہیں۔ بے وقوف عورت۔ آخر تمہیں کب عقل آئے گی۔ اندھیرا ہو چلا ہے۔ دیکھو، میں تم سے پھر کہتا ہوں وہ پڑھ نہیں رہا، بلکہ تم سب کو پڑھا رہا ہے۔ آوارہ گرد لڑکوں کے ساتھ سڑکیں ناپتا ہے۔

میں خوب جانتا ہوں ان چال بازوں کو۔“

”خیر، یہ تو طے ہے کہ پڑھنے جاتا ہے۔ اگر پڑھتا نہیں تو اتنے اچھے نمبروں سے کیسے پاس ہو جاتا ہے۔“

”آج کل نقل کر کے پڑھنے کا فیشن ہے۔ تم اور تمہاری اولاد فیشن میں تو بہر حال آگے ہے۔ ترقی میں پیچھے ہے تو کیا

ہوا۔“

(ہونہ۔ ترقی کرنے بھی دیں۔)

”میں کہتا ہوں اس پر نگاہ رکھو۔ ایک نے آسمان میں نشان گاڑ دیے ہیں مگر تم ہوش میں نہیں آؤ گی۔ تمہارے نصیب میں یہی ہے کہ سر پکڑ کر روٹی رو۔

بڑے کو بھی تمہاری وجہ سے رنگ آئے تھے، اب یہ چھوٹا بھی۔“

”ہر بات کا التزام اور ذمہ میرے ہی سر ہے۔ یہ تو میں مانتی ہوں کہ میں سخت بد نصیب ہوں۔ نصیب اچھے ہوتے تو۔۔۔ وہ جل کر کہتے کہتے رک گئیں۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بولو۔۔۔ رک کیوں گئیں۔ تمہارے باپ نے بھیجے میں یہ ڈیڑھ گز کی زبان ہی تو دی تھی۔“ شیخ رحیم الدین بری طرح دہاڑے۔

حالانکہ یہ طعنہ اگر پست آواز میں بھی دیا جاتا تو خشم و جاں سلگانے کو کافی تھا۔

”آپ کے ہاں سات بیٹیاں ہیں شیخ صاحب۔ ان بے چاریوں کے پاس تو زبانیں بھی نہیں ہیں۔ آپ کیا دین گے انہیں؟“

پہلے وہ خاموش رہا کرتی تھیں مگر جب سے احسن کا سانچہ گزرا تھا وہ دل کی بھڑاس نکال کر ہی سکون پاتی تھیں۔

”اگر میرے پاس کچھ نہیں ہوگا تو میں بیاہوں گا بھی نہیں۔ ایک ایک روٹی کھاتی رہیں گی یہیں۔ جہیز نہیں دے سکتا تو کیا ہوا۔“ ایک روٹی تو کھلا سکتا ہوں۔“

”ایک روٹی کے پکرنے اباجی کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے۔ کاش ایک روٹی سے باہر آگے بڑھ کر بھی زندگی کی ضرورت کو سمجھیں۔“ شکیلہ نے تاسف سے سوچا اور اپنی ماں کی طرف دیکھا جو ناکردہ گناہوں کے بوجھ سے روز بروز دبی جا رہی تھی۔

گھر میں نو افراد اس وقت موجود تھے مگر گھر میں سناٹا یوں تھا گویا کوئی آبادی نہیں یہاں۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے سے بھی کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔

صنفیہ نے کھانا میاں کے سامنے لا کر رکھا۔

”میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔“

شیخ صاحب کی کسی بات سے اب اچنبھا نہیں ہوا تھا۔ وہ مڑے لے کر واپس پلٹ گئیں۔

ان کے اس انداز سے شیخ رحیم الدین جیسے انکاروں پر جا بیٹھے۔

(دماغ ہی نہیں ملتے اس عورت کے، پوچھا تک نہیں کہ کھانا کیوں نہیں کھا رہا۔؟)

”ارے بھی احسن کی ماں! وہ پھر کڑک آواز میں مخاطب ہوئے۔

”آری ہوں۔“ انہوں نے کچن میں سے فوراً جواب دیا۔ مبادا ایک لمحے کی دیر سے بادشاہ سلامت کی طبع نازک برہم ہو جائے۔

”جی۔۔۔؟“ وہ پھر آمو جو ہوئیں۔

”یہ لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ جودل میں تھا۔ انہوں نے حسب عادت پھر اس کے اُلٹ بات کی۔

”کام کر رہی ہیں۔“

”صبح سے کیا کر رہی تھیں۔؟“

”کام کر رہی تھیں۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ محل سرا جو ہے یہ گھر، غلام گردشوں سے لے کر بارہ در یوں تک کام کرنا پڑتا ہے۔“

لہجے کی کٹ فطرت ثانیہ تھی۔ بغیر طنز کے آج تک کوئی گفتگو مکمل نہیں ہوئی تھی۔

وہ خاموش رہیں۔

”کیا سوچا ہے اب تم نے۔؟“ وہ ہاتھوں کا تکیہ بنا کر پلنگ پر لیٹ گئے

صنفیہ دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

”کس کے بارے میں؟“ وہ واقعی نہیں سمجھتی تھیں۔

”شکلیلہ کے لیے۔“ لہجہ کچھ نرم ہوا۔

”صرف شکلیلہ کے بارے میں میں تو سب کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔“ وہ تفتی سے گویا ہوئیں۔

”جان کر انجان بننا تو تمہاری عادت ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو، میں تم سے کیوں بات کر رہا ہوں۔“

”میں کیوں کر آپ کو یقین دلاؤں۔ واقعی مجھے علم نہیں کہ آپ نے شکلیلہ کا قصہ کیوں شروع کیا ہے۔ اب کیا نئی افتاد

پڑی ہے۔؟“

شیخ رحیم الدین کو اس لہجے پر پھر جال آگیا۔ مگر معاملہ بہت اہم تھا۔ اور ساتھ ہی مشکل یہ تھی کہ صنفیہ کے بغیر بات آگے بڑھ بھی نہیں سکتی تھی۔

”افتاد ہی پرانی ہے۔“ وہ برہم تاثرات بہر حال چھپائیں سکے۔

”کیا مطلب؟“ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ عجیب سے خدشات سے ان کا دل کاچنے لگا۔

”انعام علی آئے تھے آج۔“

”شیخ صاحب! میں اس موضوع پر گفتگو کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر چکی ہوں۔“

”باپ کے گھر سے لائی تھیں یہ اولاد۔“ وہ ہذیانی انداز میں چیخے۔

”شرم کریں شیخ صاحب۔ ساری عمر بے احتیاطی سے گزاری ہے۔ کم از کم یہ تو سوچ لیا کریں۔ جوان بچیاں گھر میں

ہیں۔“

”اگر میں ایرے غیرے تو خیرے کو بھی بیٹی دے دوں تو کون روک سکتا ہے مجھے۔ میں اپنی اولاد پر بھروسہ کرتی ہوں۔“

”خدا کا خوف کریں۔ یہ آپ کی اولاد ضرور ہے۔ مگر اللہ کی مخلوق بھی ہے۔ جواب بھی دینا ہے۔ اللہ کو سننے بھی

دکھاتا ہے۔“

دیکھو صفیہؓ مد میں رہو۔ اگر مجھے زیادہ غصہ آگیا تو.....“

”زیادہ.....“ صفیہؓ سختی سے مسکرا کر باہر نکلنے لگیں..... ”اور جب آپ نے کرنی ہی اپنی مرضی ہے تو پھر مجھ سے رائے لینا کیا معنی؟ ان کی آواز بھرا گئی۔“

”اپنا چچو گنوا دیا ہے میں نے اس جھگڑے کے پیچھے۔“

”میں اس جہنی کا ذکر تک اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔ خبردار اگر کسی نے اس گھر میں اس کا بدذات کا نام لیا۔“

شکیلہ سے کہہ دو..... بہتر یہی ہے کہ میری مرضی کو اپنی مرضی بنالے۔ دشمن نہیں ہوں میں اس کا.....“ وہ دو ٹوک انداز میں گویا ہوئے۔

”زندگی سنور جائے گی اس کی۔ لاکھوں کی جائیداد کی مالک ہوگی۔ اور کیا چاہیے؟“

”دل کی خوشی بھی چاہیے۔ اس پر بھی غور کریں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”گھر میں آسودگی ہو تو دل خوش رہتا ہے۔“ شیخ رحیم الدین دو ٹوک انداز میں بولے۔

”دولت دل خوشی کی ضمانت نہیں ہے۔“ وہ بگڑ کر بولیں۔

”تمہاری بد بختی کیا میرے لیے کافی نہیں ہے۔ تم نہیں چاہتیں کہ وہ خوشحال زندگی گزارے۔“ وہ عادت کے مطابق چیخ کر بولے۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کیوں منع کر رہی ہوں۔ اگر آپ اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہیں تو دشمن میں بھی نہیں ہوں..... میں نے جو کہا تھا کہہ دیا۔ اب مجھ سے اس موضوع پر بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ باہر نکل گئیں۔

”اس عورت کی نحوست سارے گھر کو لے ڈوبے گی۔ ویسے روتی رہتی ہے کہ لڑکیوں کا کیا ہو گا؟ کوہ قاف کے شہزادے آئیں گے اس کی بیٹیوں کو بیاہنے۔“ وہ بڑبڑا رہے تھے۔

”میں کہہ دوں گا کسی بھی دن آجائے چار آدمیوں کو لے کر..... اور دو بول پڑھا دوں گا۔“

صفیہ غیض کی حالت میں اندر داخل ہوئیں۔

”انعام علی سے یہ بھی کہہ دیجیے گا۔ میری لاش سے گزر کر ہی شکیلہ کو لے جاسکتا ہے۔ سنا آپ نے؟“

”تم اپنی زبان کو لگام دو۔ سر توڑ دوں گا تمہارا۔ اگر تم نے راستے میں آنے کی کوشش کی تو طلاق دے دوں گا۔ سمجھیں۔“ وہ دھماکے سے بولیں۔

شکیلہ کانپ کر اندر آگئی اور ماں کا ہاتھ تھام کر زبردستی کمرے سے باہر لگئی۔

”ای! ای! ای!..... خدا کے لیے کیوں اپنی بے عزتی کراتی ہیں میری وجہ سے۔“ وہ بے قرار ہو کر روئی۔ ”میں اس عمر میں آپ کا تماشا بننے نہیں دیکھ سکتی۔“

جس قفسے کی وجہ سے میرا بچہ بدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ میں اس کا کیا دھرا برباد کروں؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ قطعی انداز میں بولیں۔

”میرے نزدیک سب سے اہم بات آپ کا جوڑ آپ کی عزت ہے۔ میری زندگی میری خوشی سے بھی زیادہ۔“

”تم اپنی جگہ میں اپنی جگہ درست۔ تم فکر نہ کرو میری۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئی بولیں۔

”حرج ہی کیا ہے اگر میری وجہ سے گھر میں سکون نہیں ہو گا۔ تمہارے بعد وہ تمہاری بہنوں کو بھی دار پر چڑھا میں

میں۔ تمہارے سلسلے میں میرا فیصلہ کن رویہ ہمیں بہت سے طوقا لوں سے بچالے گا۔ اب کم ہمتی کا وقت نہیں ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔“ انہوں نے شفقت سے شکیلہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آپ کے فیصلہ کن رویے سے اباجی کا بھی کوئی فیصلہ کن رویہ سامنے آ سکتا ہے۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔“

”تم میری ہمت نہیں توڑو شکیلہ! انہوں نے تمہارے لیے جہنم کا انتخاب کیا ہے۔“ وہ دکھ سے بولیں۔

”ای! آپ بھی اور ہم سب بھی اباجی کے غصے سے واقف ہیں۔ میں آپ کی ضرورت ہے۔ ہر شے سے بڑھ کر اہم آپ کی اس گھر میں موجودگی ہے۔“ وہ بولی۔

”میں اپنی اولاد کے لیے کانٹوں کا راستہ منتخب نہیں کر سکتی۔ میں مجبور ہوں۔“

وہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

”ای!..... حالات کو سمجھیں۔ یہ سمجھ لیجیے گا کہ میں مر گئی۔“ وہ رو دی۔

صفیہ تڑپ کر رہ گئیں۔ انہوں نے شکیلہ کا سر کاٹھ سے لگا لیا اور آنکھوں سے آنکھ رواں ہو گئے۔

”میری بچی..... سر میں تیرے دشمن۔ میں ہی نہ مر جاؤں۔ کیوں زندہ رہوں یہ پھاڑ سے دکھ اٹھانے کے لیے۔“

”ای! اباجی کی بات مان لیں۔ شاید اس آپریشن سے اس گھر کے ناسور سے نجات مل جائے۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر دلی رہی۔

”یہ فیصلہ میری متاع کے لیے آگ کا راستہ ہے۔ میرا کیجہ پھٹ جائے گا میری بچی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”جب احسن بھائی کچھ نہ کر سکے جنے کی حیثیت سے تو آپ کیا کر سکتی ہیں؟ میری وجہ سے دوسروں کو تباہ نہ کریں۔ ناراضی ہوں خوش ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میں زندہ ہوں ابھی..... تم فی الحال چپ رہو۔ ابھی کئی محاذوں پر لڑنے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔ اولاد ہی کمزور بنا دیتی ہے۔“

اولاد کی محبت..... بڑی قوت ہے..... تم فکر نہ کرو..... ماں زندہ ہے ابھی میری بچی۔ چپ کے قفل تو توڑ ہی دیے ہیں مانے۔“

”ای!..... اگر میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو گیا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گی۔“

”میری زندگی تم پر شمار..... مجھے کمزور نہ بننا..... مجھے قوت دو۔“ وہ مضبوطی سے بولیں۔

”ای!..... میرا دل کاٹتا ہے۔“

”گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔

”آج تمہاری حالہ کے ہاں بارات ہوگی..... اس نے میری راہ دیکھی ہوگی، کوئی تنہا بھی نہیں بھجوا سکی۔“

تمہارے باپ کے پاس تو کبھی ہمارے لیے پیسے نہیں ہوں گے۔ ایلا کی فیس کے لیے بھی پیسے چاہئیں۔ آتے ہی ہمارے باپ نے یہ قصہ پھینک دیا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ کھترانی سے کہہ کر تم بہنوں کے لیے سلائی کا کام مانگ لوں۔ مارا بھی دل بہلا رہے گا۔“

انہوں نے خوبصورتی سے بات کا رخ موڑ دیا۔

”جیسے آپ کہیں ای!۔“ وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

”ارے شہوار کو دیکھا ہے کہیں؟“ نیلوفر حواس باختہ سی اس سمت آئی جہاں تمام لڑکیاں جمع تھیں۔  
 ”نہیں..... تو..... ہو سکتا ہے اور پر سورہی ہو..... تھک گئی ہوگی۔“ ایک کزن نے انکار کے ساتھ ساتھ مشورہ دیا۔  
 ”سب جگہ دیکھ کر ہی تو آ رہی ہوں۔ اوپر نیچے۔ دائیں بائیں سب جگہ دیکھ لیا۔“  
 ”ہائیں.....!“ اب وہ سب چونکیں۔  
 ”جس وقت بارات آئی وہ اوپر میرے ساتھ ہی کھڑی تھی اور دولہا پر تھیرے کر رہی تھی۔“  
 ”میں نے تو اسے اس وقت دیکھا تھا جب وہ اپنا پرانہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ بال پھیلانے ہوئے۔“ اس کی پھر زادہ سو میہ نے بھی حافظے سے ایک ایسا منظر برآمد کر لیا جس میں ”وہ“ موجود تھی۔  
 ”مگر جا کہاں سکتی ہے؟“ وہ ایک ایک کر کے کھڑی ہو گئیں۔  
 ”ای کی کا تو بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔“ نیلوفر وہاں سی ہو رہی تھی۔  
 ”ایک ایک کمرہ ہاتھ روم، اسٹور، کچن، بیٹری، نوکروں کے کوارٹر چھان مارے ہیں۔ تم لوگ خود ہی سوچو رات کا نچ رہا ہے، اس وقت کہاں جا سکتی ہے۔“ وہ بری طرح ہراساں تھی۔  
 ”وہ سب کی سب پیچھے چل پڑیں۔ باہر مردوں میں بھی ”اہم“ لوگوں کو اطلاع پہنچ گئی تھی۔  
 ”سارے گھر میں عجیب جھگڑا مچی ہوئی تھی۔  
 ”احسن بھائی.....!“ راہداری میں اس کا سامنا احسن سے ہو گیا۔  
 ”شہوار کو دیکھا ہے؟“ نیلوفر رو دینے لگی۔  
 ”ہاں..... بچپن سے اب تک ہزاروں بار دیکھا ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔  
 ”میں اس لئے نہیں پوچھ رہی ہوں۔ وہ گھر میں کہیں نہیں ہے۔ ایک نچ رہا ہے رات کا۔“  
 ”کیا مطلب؟“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”اب مطلب بھی بتانا پڑے گا۔“ وہ رو دی۔  
 ”احسن تیزی سے باہر نکل کر میز پر آ گیا۔ پورے گھر میں قیامت برپا ہو چکی تھی۔ ہر شخص تیزی سے آ جا رہا تھا۔  
 ”اس محل سے شہوار کہیں سے آگ آئے گی۔  
 ”اس نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں ڈال لیا اور سگاکر دھوئیں کے دائرے بنانے لگا۔  
 ”ہر ایک کے چہرے کی ہدایتاں اُڑ رہی تھیں اور اس کے چہرے پر مدہم سی مکان رکھال تھی۔  
 ”روم چل رہا تھا اور نیر و بال سری بجا رہا تھا۔“  
 ”آخر نیر و کی بھی تو کوئی نفسیات ہوگی۔ پر گہرائیوں میں کون اترے۔  
 ”ارے غضب خدا کا شہوار اچھا ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔“  
 ”بڑی ممانی باجنتی ہوئی میز پر پہنچیں اور احسن کو دیکھا تو بھر پور طریقے سے ہونے اور چونکنا کا مظاہرہ کیا۔  
 ”کمال کرتے ہیں آپ لوگ کہاں جاتے گی رات گہری ہو چکی ہے تھک کر کسی کمرے میں سو رہی ہوگی۔  
 ”اطمینان سے بولا۔  
 ”ارے میاں! پاگل سمجھا ہے ہمیں سارا گھر جھان مارا ہے آخر گھر ہی تو ہے کوئی ”کامپلیکس“ تو نہیں۔  
 ”سوراج میں چھٹنے سے رہی جوان جہاں لڑکی۔“ وہ چل کر بولیں۔

”اس کی ماں کا رور و کر برا حال ہے۔ ارے جاؤ خالہ کو سنبھالو اسے ڈھونڈو۔“ وہ بری طرح بوکھلا رہی تھیں۔  
 ”کیا خالہ جان مجھ سے کلام کرنا پسند کریں گی؟“ وہ طنزیہ بولا۔  
 ”ارے بیٹے! آخر وہ تمہاری خالہ ہے دشمن تو نہیں ہے۔ یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں وہ تمہاری خالہ ہی نہیں ساس بھی نا غائب ہونے والی بچی ان کی بیٹی ہی نہیں تمہاری بیوی بھی ہے۔ کیا یہ بات تمہارے لئے اتنی اہم نہیں جتنی اس ماں کے لئے ہے؟“  
 ”جب ہی تو کہتے ہیں اولاد پر زیادہ جبر بھی اچھا نہیں ہوتا خود ہی فیصلے کرتے پھر رہے تھے کم از کم اس سے بھی پوچھ ہوتا“ وہ طنزیہ سے گویا ہوا۔  
 ”بعد میں گن گن کر بدلے لینا فی الحال جا کر خالہ کو سنبھالو۔ اسے تلاش کرو۔“ وہ بھڑک کر بولیں۔  
 ”ویسے بننا اتھارا اطمینان خوب ہے، تعجب ہے تمہیں تو سب سے زیادہ لگرمند ہونا چاہئے تھا۔“  
 ”میں مطمئن نہیں ہوں ممانی بیان۔“ وہ سنبھل گیا۔  
 ”بلکہ مجھے رورہ کر ان سب پر غصہ آ رہا ہے جو یکطرفہ کارروائی کر رہے تھے یہ سب اس کے مجرم ہیں میں ان سب کو بھی معاف نہیں کروں گا اس حادثے کے ذمہ دار یہ سب خود ہی ہیں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے زینہ طے کرنے لگا۔  
 ”اے لو اس لڑکے کو اب الہام بھی ہونے لگا ہے۔ ارے خوبصورت لڑکی ہے زمانہ خراب ہے۔ اللہ معلوم کسی کی بات۔“  
 ”اتنی ہمت وہ.....“  
 ”م میں بھی نہیں کر سکتی خود کیوں جانے لگی؟ اچھی بھلی ہنسی کھاتی پھر رہی تھی..... ارے یہ بیٹھے مانے کیا ہو گیا۔“  
 ”وہ بڑبڑاتی ہوئی خود بھی زینہ طے کرنے لگی تھیں۔  
 ”ایک گھنٹے بعد شہوار کی ماں کو بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔  
 ”احسن چہرے پر مصنوعی لگرمندی ظاہر کرتے ہوئے اندر سے انتہائی مطمئن تھا۔  
 ”ارے اب تو پولیس اسٹیشن چلے جائیں۔“ اس کی خالہ کراچے ہوئے شوہر سے کہہ رہی تھیں۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں پولیس اسٹیشن جانے کی۔“  
 ”اخبارات میں میری بیوی کے بارے میں خبروں پر ادھیات سے کپٹن لگیں میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس ساری اہم حال کے ذمہ دار آپ لوگ ہیں۔ اپنی انا کے شکار انسانوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے اپنی سنیارائی کو کیش دوانے والے۔“ وہ بڑھئی سے گویا ہوا۔  
 ”ہاں بھابی! پولیس کو خبر دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سوائے بدنامی کے۔“  
 ”شہوار کے چچا نے احسن سے اتفاق کیا۔  
 ”ارے اس لڑکے کو دیکھو ہم موت کے منہ میں جا پڑے ہیں یہ جلی کٹی سنار ہا ہے بے ادب۔“ انہوں نے سسکی لی۔  
 ”تجائی پر بھی داویلا نہ چھاؤں تو کیا قہقہہ لگاؤں۔“ وہ بڑھئی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کی مستحمانہ جس ت آسودگی محسوس کر رہی تھی۔  
 ”وہ تو مغرب کے بعد ہی سے دکھائی نہیں دی تھی۔ رات سے اس کی طبیعت خراب تھی میں کبھی جا کر لیٹ گئی ہے۔“  
 ”اس کی کزن نے ایک اور یادداشت پیش کی۔



جی میں تو آتا ہے اسے شوٹ کر دوں۔“ اس کا ذہن پھر سلگ اٹھا۔ گاڑی سنان سڑک پر پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس کے خیالات کی رفتار گاڑی کی رفتار سے کہیں آگے تھی۔ شیریں کی لائیں اب نظر آنے لگی تھیں۔

”خالہ اصغری..... کچھ مجھ میں نہیں آتا ایک طرف تو آپ کہتی ہیں کہ جس وقت پاکستان بنا تھا آپ ”موڈ“ میں تھیں۔“  
 ”اب آپ کہہ رہی ہیں کہ اکبر علی کی شادی اس وقت ہوئی جب ایوب خان کا مارشل لاہ لگا تھا۔“  
 اکبر علی آپ کو انعام میں ملے تھے؟“ بلال بڑی مصومت سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”دیکھو دلہن..... دیکھ رہی ہوں اس کی حرکتیں.....؟“ خالہ اصغری تھکے سے اکھڑ گئیں۔

”صاف صاف کیوں نہیں کہتا لڑکے کہ جھوٹی ہوں..... اے لو..... مجھے بڑھی کھوسٹ ثابت کرنے پر تیار رہتا ہے۔“  
 رے غوں نے کھالیا ہے مجھے، ورنہ میری عمر کمر ہے۔ گڑیاں کھیتی پھرتی تھی پکڑ کے اماں باوا نے شادی کر دی۔ سال بھر میں اکبر علی پیدا ہو گیا۔

یہ لڑکا تو زبان پکڑنے کو تیار بیٹھا رہتا ہے۔ اے بنے کیا کہا ہو گا میں نے۔“  
 ”چھوڑیں خالہ! اس کی عادت ہے مذاق کرنے کی۔ آپ بتا رہی تھیں کہ اچھوٹے والے کی لڑکی دکھائی تھی آپ نے۔“  
 ”ہم ہر لڑکی کو؟ پھر کیا کہا انہوں نے؟“ منزہ نے ان کی توجہ بلال کی طرف سے ہٹائی۔  
 ”ہزار خرے ہیں لوگوں کے۔ چار پیسے کیا ہیں آسمان پر اڑتی ہیں۔ پولیس لڑکی تو بہت لمبی ہے۔ میں نے کہا تو بیگم اگلیں کٹوا دو۔“

بھلا یہ کوئی باتیں ہیں بیویوں لڑکیاں دکھا چکی ہوں۔ کوئی چھوٹی ہے کوئی موٹی ہے کوئی ذیلی ہے کوئی لمبی ہے۔ کوئی غیپ پیکھا شغف کوئی اٹنا تو..... اے میں نے تو کہہ دیا..... بی بی اوپر آؤ ر بھجوا دو۔“  
 منزہ مسکراہٹ ضبط کرتی ہوئی خالہ کیلئے فرنج میں سے پان نکالنے لگی۔  
 ”دلہن.....!“  
 ”جی خالہ.....!“

”یہ بلال کی پڑھائی میں کتنا دقت اور ہاتی ہے.....؟“ وہ رازدارانہ انداز میں پوچھ رہی تھیں۔  
 ”آپنی..... بتا دیجئے خالہ کو میں عنقریب ”فرنگن“ کی تلاش میں یورپ جانے والا ہوں۔“  
 ”ناموسی فرنگن میں ایسے کیا مٹر خاب کے پر لگے ہوتے ہیں.....؟“ خالہ اصغری ہمزگ گئیں۔  
 ”آپنی! خالہ کو ٹھنڈا پانی پلائیں۔ ایک شکار ہاتھ سے نکلنے پر ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ بلال شرارت سے کہہ اٹھا۔

”اے طبیعت خراب ہو میرے دشمنوں کی..... ارے تجھے کیا پتا فرنگن سے شادی کر کے دین ایمان کا کیسے ستیا ناس تا ہے۔ اولاد الگ آدمی تیرے بیٹے۔ کیوں دلہن.....؟“  
 ”جی ہاں خالہ! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.....“ منزہ مسکرائی۔  
 ”خیر چھوڑیں خالہ..... میرے ایک جاننے والے ہیں ان کا رشتہ تلاش کریں۔“ بلال نے سنجیدگی سے کہا۔  
 خالہ اصغری کی آنکھیں چپکنے لگیں۔  
 ”کیا کرتے ہیں؟“ وہ اشتیاق سے پولیس۔

”احسن! بارات آنے کے بعد تم کہاں غائب ہو گئے تھے.....؟“ اس کے ماموں زاد نے نہ جانے کیا سوچ کر پڑا۔

”ہاں۔ میں ہی تو لے کر بھاگا تھا۔ سمندر میں دھکا دے کر آیا ہوں اسے۔“ وہ خوشوار انداز میں الٹ پڑا۔  
 ”تمہیں تو پاکستان کے ٹھکے سرائے رسانی کا سربراہ ہونا چاہئے۔ اچھی خاصی بال کی کھال نکالنا آتی ہے تمہیں۔“  
 استہزائیہ انداز میں بولا تھا۔

”اگر مجھے پر شک ہے تو پولیس سٹیشن جاؤ ر پورٹ کرو میرے خلاف، مگر وہ تمہیں تھوک کے بھاد مل جائیں گے۔“  
 طاقتور گواہ تو لڑکی کے ماں باپ کی صورت میں موجود ہیں ہی۔ ”وہ زہریلا ہو رہا تھا۔“  
 اس کا کزن چپیں بجھیں ہو کر رہ گیا۔

”میں تو یہ کہہ رہا تھا.....“  
 ”اب صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“ احسن نے ترشی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میری بیوی ہے وہ تم سے زیادہ میری عزت کا مسئلہ ہے اس وقت“ وہ تیز قدموں سے باہر نکل آیا اور گاڑی کی طرف، بڑھا۔ مبادا لوگ سمجھیں وہ شہوار کی تلاش میں جا رہا ہے۔

”یہ گاڑی کس کی ہے۔ اس کے پاس.....؟“ اس کے ایک کزن نے دوسرے کزن کو مخاطب کیا۔  
 ”کسی دوست کی ہوگی۔“ جواب ملا۔  
 گھر کے اندر عجب روٹا بیٹا شروع ہو چکا تھا۔  
 ”تھینکس گاڈ“ اس نے گاڑی شیریں کی طرف موڑتے ہوئے سکون کا سانس بھرا۔  
 اب تک اس کا منصوبہ نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

شہوار کو بلانے کیلئے اس نے جس بچی کا انتخاب کیا تھا وہ ”باراتی بچی“ تھی۔ اپنے خاندان کی تو وہ تمام بچیوں۔ واقف تھا۔ بارات کے استقبال کے وقت باراتیوں کی ایک کار سے اس نے اس بچی کو اترتے دیکھا۔ ”باراتی بچی“ انتخاب اس منصوبے کا حصہ تھا۔ اس کی خالہ زاد بالکل غیروں میں جا رہی تھی۔ اس کے سسرالی اس خاندان کے لئے قلم اچھی تھے۔

اس نے بچی کو بلا کر دور سے شہوار کی طرف اشارہ کر کے بتایا تھا کہ وہ جو شوٹنگ پنک پکڑے پہنچے ہوئے لڑکی کھڑے ہے اسے پیغام دو کہ شامیانے کے اس طرف احسن بھائی بلا رہے ہیں بہت ضروری بات ہے۔  
 شامیانے کے اس طرف تو کروں کے گھروں کا پچھلا حصہ تھا جہاں مالی کی کچھ سات بکریاں بندھی رہتی تھیں۔  
 گاڑی اس نے وہاں پہلے لے جا کر کھڑی کر دی تھی اور اگلے دونوں دروازے بھی کھول دیے تھے۔ اسے اس باب کی مطلق فکر نہیں تھی کہ منصوبہ بنا کام بھی ہو سکتا ہے۔

وہ قسم کی صورت حال کیلئے خود کو تیار کر چکا تھا۔ ”تخت پائنتی“ قسم کا فیصلہ کر چکا تھا۔  
 اسے پکڑے جانے کے خیال سے بھی کچھ خوف نہیں تھا۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس۔  
 خاص اس وقت آپریشن کیا جب اندر نکاح کا پروگرام جاری تھا۔  
 ”کہیں وہ خود کو ختم نہ کر لے..... عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔“  
 معالے شہوار کا خیال آیا۔ ”صرف اس کی بزدلی کی وجہ سے تو آج یہ دن دیکھنا پڑا ہے۔“

”بہت کچھ کرتے ہیں بے وقوفیاں کم کرتے ہیں..... یعنی اچھے خاصے سمجھدار ہیں۔“ وہ بولا۔  
”بلال.....!“ منزہ نے اسے ٹوکا۔

”آپ مداخلت نہ کریں آپ! بڑا پادفل کا ٹائٹ دے رہا ہوں خالہ کو۔“

”اے دلہن! تم چپ رہو ہاں کیا کہہ رہا تھا؟“ خالہ کا جوش و خروش عروج پر تھا۔

”بہت مال دار آدمی ہیں۔ بڑا نام ہے ان کا۔“ بلال نے بتایا۔

”اچھا.....!“ مارے اشتیاق کے اب ان کی حالت آؤٹ آف کنٹرول تھی۔

”کئی شہروں میں کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ ماں باپ بھی نہیں ہیں بے چارے کے۔“

”اے ہے“ خالہ نے تاسف کا اظہار ضروری سمجھا۔

”بے چارے بہت تنہا ہیں۔ بہت ڈکمی ہیں بہت ترس آتا ہے انہیں دیکھ کر۔ سب انہیں چھوڑ چکے ہیں۔ آہ.....“

”ہاں بیٹے! نصیب کی بات ہے۔“ خالہ نے آہ بھری۔

”دو پوتے جتنے وہ بیویوں کے ساتھ مستقل یورپ میں جا بسے ہیں۔“ بلال نے مزید کہا۔

”پوتے.....“ وہ مجھوچکا سی رہ گئیں۔

”وہ بھی شادی شدہ۔“ منزہ نے بھی گلہ لگایا۔

خالہ ایک دم حواسوں میں آ گئیں۔ اور ادھر ادھر چہل تلاش کرنے لگیں۔ ”ایسے جوتے لگاؤں گی..... دیکھ رہے

دلہن.....! میں اس کے جوڑی ہوں۔ اے لوجھ سے مذاق کرتا ہے۔“

بلال جلدی سے وہاں سے کھسک گیا۔

اسی وقت کال بیل بجی۔

”دیکھنا بلال! کون ہے۔“ منزہ خالہ کو پاندان دے کر بیہ کا فیڈر بنانے لگی۔

”آپی! اسد بھائی ہیں۔“ بلال نے اطلاع دی۔

”اوہ..... بھائی! انہیں۔ خاور بھی بس آتے ہوں گے۔“ منزہ ایک دم الٹ ہو گئی۔

”یہ اسد کون ہیں دلہن.....“ خالہ پوچھ رہی تھیں۔

”خاور کے دوست ہیں۔ بہت قریبی بہت پرانے۔ سکول کے زمانے سے ساتھ ہیں۔ معاش نے الگ الگ

ہے۔ خاور سمندر تاپنے لگے۔ اسد بھائی بزنس کرتے ہیں۔“

”اے شادی شدہ ہیں.....؟“ خالہ نے کرل کے پیچھے سے گزرتے ہوئے باوقار اور خوبرو سے اسد کو نہایت

سے دیکھا۔

”نہیں..... کوئی لڑکی ابھی پسند نہیں آئی۔“

”اے کیا بہت خوبصورت لڑکی مانتے ہیں؟“ خالہ نے آہستگی سے پوچھا۔

”چنانچہ..... کبھی یہ بات کہی تو نہیں۔“ منزہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”ماشاء اللہ کس چیز کی کسی ہے انہیں تو ایک سے ایک لڑکی مل سکتی ہے۔ کیوں دلہن.....؟“

”جی.....!“

”خالہ!“ بلال پھر آہنچا۔

”آپ کسی دن میرے ساتھ سائیکل ٹرسٹ کے ہاں چلے گا۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”یہ کیا ہوتا ہے؟“ وہ متحجب ہوئیں۔

”نفسیات کا ڈاکٹر ہوتا ہے۔“ بلال نے سمجھایا۔

”پرس وہاں کیوں جاؤں؟“ انہیں ڈاکٹر سن کر ہی غصہ آ گیا۔

اس لئے کہ اس بوئے زمین پر آپ سے کوئی کنوارا بدداشت نہیں ہوتا جب کہ آپ کوئی کیشن وغیرہ بھی نہیں لیتی ہیں۔“

”دیکھ بلال! تو کسی دن پٹ جائے گا مجھ سے۔ اے دیکھو پاگل بنا رہا ہے مجھے۔“

منزہ نے بیہ کے منہ سے فیڈر لگائی اور ڈیڑھ سال کے بلی کو گود میں اٹھا کر لاونچ میں چلی آئی فستی ہوئی۔

”السلام علیکم..... میں تو سمجھی خاور آپ کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ سچ ان کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا۔

میری خالہ نے مجھ سے کہا تھا سی من (SEA MAN) سے شادی ہو رہی ہے۔ شوہر کم مہمان زیادہ ہوا کرے گا۔

چ نکلتا ٹھیک کہا تھا۔“ منزہ نے شکایتی انداز میں کہا۔

”پورے سات ماہ بعد آئے ہیں۔ پھر بھی گھر میں کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔“

اسد مسکرا دیئے۔ ”میں آپ کی پریشانی سمجھتا ہوں۔“

”اسد بھائی.....! آپ خاور سے کہیں ناں کہ وہ یہ ملازمت چھوڑ دیں اور بزنس کر لیں۔ آپ زور ڈالیں گے ناں تو

وہ یقیناً مان جائیں گے۔

عاجز آگئی ہوں اس اکیلے پن سے..... وہاں بیٹے میں بھی امی ابو اور بلال اور شادی کے بعد وہی حساب.....

انسانوں کو ترسی ہوئی ہوں۔“

”میں خاور سے کہوں گا مگر بھابھی..... بھری ملازمت اس کا کریز ہے۔ ہمیشہ سے یہی کہتا تھا کہ سمندری زندگی میں

عجیب سارے محسوس ہوتا ہے۔“

”چنانچہ اس میں کیا حراز ہے۔ مجھے تو بعض اوقات احساس تنہائی بہت زیادہ ہوتا ہے۔

آج کل تو بلال ہے میرے پاس مگر جب اس کی پڑھائی مکمل ہو جائے گی اور یہ نو شہرہ واپس چلا جائے گا تو کچھ میں

کسی دن ان کے سارے کاغذات پھاڑ ڈالوں گی۔“

اس کا قہقہہ بلند ہوا اور ساتھ ہی خاور اندر داخل ہوئے۔ ”کن“ کاغذات کے پھاڑنے کا پروگرام بن رہا ہے۔

”السلام علیکم..... عالی جناب اسد صاحب.....“ خاور خوشدلی سے گویا ہوئے۔

”وعلیکم السلام“

”یار تم نے مجھ کو بہت تنگ کیا ہوا ہے۔“

”ارے ان کی حس لطیف بہت محدود ہے۔ انہیں کیا پتہ جب دو چاہنے والے شدت انتظار سے گزر کر ایک دوسرے

سے ملتے ہیں تو.....“ خاور اسد کی بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ منزہ بھی چپ گئی۔

”انہیں کیا بتایا۔ جب گھر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دیتا ہوں تو زندگی کی سانسوں میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ ایک

نئی قوت حیات ملتی ہے۔

پانیوں پر سفر کے دوران یہ سوچ کتنی فرحت بخش ہوتی ہے کہ کہیں ایک گھر ہے جس میں ایک.....“

”اچھا چھوڑیں“ منزہ نے سرخ چہرے کے ساتھ خاور کو ٹوک دیا۔ جس پر خاور اور اسد دونوں نے قہقہہ لگایا تھا۔

”آئی! خال کو بلا لاؤں۔“ بلال نے اندر آ کر پوچھا۔

”آئی ہوئی ہیں؟“ خاور نے مسکرا کر منزہ سے پوچھا۔

”ہوں۔“ منزہ بھی مسکرا دینی۔

”خالہ! آجائیں۔ اسد بھائی انتظار یو کیلئے تیار ہیں۔“ بلال نے وہیں سے فرار مارا۔

”اے میں تو خود ہی آ رہی تھی۔ بچے ہیں میرے۔ کوئی پردہ ہے میرا۔“ خالہ جو اندر آنے کو بے قرار تھیں کشاں کشاں اندر چلی آئیں۔

”السلام علیکم۔“ اسد اور خاور نے انہیں سلام کیا۔

”جیتے رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔“ وہ نہال ہو کر گویا ہوئی تھیں اور بڑی جانتی ہوئی نظروں سے اسد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”خیر سے کتنے بھائی بہن ہو؟“ انہوں نے عادت سے مجبور ہو کر سلسلہ کلام کا آغاز کیا۔

”تین..... دو بھائی اور ایک بہن۔“ وہ بولے۔

”بہن شادی شدہ ہے؟“

”جی..... تین بچوں کی ماں ہے ماشاء اللہ۔“ وہ مسکرائے۔ وہ خود بھی بڑی دلچسپی سے خالہ کو دیکھ رہے تھے۔

”اور بھائی.....؟“ ان کا اگلا سوال تھا۔

”وہ بھی شادی شدہ ہیں! انگلستان میں ہوتے ہیں۔“

”اے کیا فرنگن سے شادی ہوئی ہے؟“ انہوں نے ڈری ڈری نظروں سے بلال کی طرف دیکھا

”نہیں..... میری بھابی میری پھوپھو زاد بھی ہوتی ہیں۔“

”اے ہاں۔ سمجھ دار لوگ کبھی بھی میم سے شادی نہیں کرتے۔“ انہوں نے چوری چوری بلال کی طرف دیکھا۔

”خالہ..... میں سمجھ داروں کے قبیلے سے نکلنے کیلئے تیار ہوں مگر فرنگن کو دل سے نہیں نکال سکتا۔“ بلال نے شدید مجبوری ظاہر کی۔

”پتھر پڑ چکے ہیں تیری عقل پر“ خالہ نے سخت بے زار انداز میں اظہارِ افسوس کیا۔

”بڑے ہیں تمہارے بھائی تم سے؟“ وہ پھر اسد کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”جی۔“

”اے بیٹے! تم رہنے والے کہاں کے ہو؟“ انہوں نے معلومات کا دائرہ پھیلا نا چاہا۔

”بنیادی طور پر ہم افغانی ہیں۔“ وہ مسکرا کر حیران سے ہو کر خالہ کو دیکھ رہے تھے۔

”ہاں! ہوں گے۔ ماشاء اللہ سرخ و سفید ہو کر ذیل ہوا اللہ نظر بد سے بچائے۔“

”یہ تعریف آپ کو بھی ملتی ہے۔ اسد بھائی..... ابھی اجو ہوٹل والے کی لڑکی کا مسئلہ موجود ہے۔“ بلال نے شرارت سے کہا۔

”کیسی! اونچی سیدی ہانکتا ہے۔ اجو ہوٹل والے کی لڑکی کے علاوہ کہ بھائی صاحب کی پوتی شجاعت علی خان کی بھتیجی بھی موجود ہے۔“

اس قدر خوبصورت کہ اندھیرے میں بٹھا دو تو روشنی ہو جائے۔“

”پھر انہیں لاہور بھجوادیں۔ وہاں لوڈ شیڈنگ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کم از کم دو گھنٹوں میں تو روشنی مستقل رہے گی۔“ بلال نے حیرت مشورہ دیا۔

”دیکھ رہی ہوں بہن۔ ہر بات میں مذاق“ خالہ نے سخت برا مانایا۔

”ارے خالہ آپ پر واہ نہ کریں۔ اس کی تو عادت ہے۔ باز نہیں آؤ گے بلال.....“ منزہ نے مصنوعی ہنسی سے بلال کو گھورا۔

”نیکل کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ مفت مشورہ دیتا ہوں! اس لئے قدر نہیں ہے۔“ بلال نے چہرے پر غمناکی طاری کی۔

”ممکنی وگنی ہو چکی ہے تمہاری.....؟ وہ تجس سے بے حال نظر آ رہی تھیں۔

”نہیں!“ انہوں نے مختصر جواب دیا۔

”کیوں بچے..... کسی بیوی چاہتے ہو؟“

”میں بتاتا ہوں۔ ایک مرتبہ اسد بھائی نے مجھے بتایا تھا۔

جس کی ناک فرح دیا کی طرح دانٹ ڈیانا کی طرح آنکھیں صوفیہ لارین جیسی یا الزبتھ ٹیلر جیسی رنگت مارلن منرو جیسی! جسم گرم رنگارنگ اور جیسا عقل ملکہ نور جہاں جیسی..... اور وہ جوڑی کی طرح ایک نظر آتی ہو۔

اسی لئے اسد بھائی شادی نہیں کرتے۔ اسلام میں چھ شادیوں کی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ یہ ساری صفات ایک خاتون میں اکٹھی ہونا بہت مشکل ہیں۔“ بلال نے ناہوسی سے کہا۔

خالہ ہکا بکا بلال کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ جو نام اس نے روانی سے بتائے تھے وہ قیامت تک انہیں زبانی یاد نہیں ہو سکتے تھے۔

”اے دلہن..... کیا یہ لڑکیاں اسد میاں کی رشتے دار ہیں.....؟“ وہ انتہائی پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔ فرح دیا اور ملکہ نور جہاں کے علاوہ ہر نام ان کیلئے اجنبی تھا۔

جی خالہ..... ان کا کائناتی رشتہ ہے اسد بھائی سے۔“ بلال نے انتہائی سنجیدگی سے بہن کے بجائے جواب دیا۔

”یہ کون سا رشتہ ہے؟“ وہ جھلائیں۔

”یہ آدم اور حوادوں کی طرف سے ہوتا ہے۔“ بلال نے وضاحت کی۔

”بلال! دیکھ میں بہت برداشت کر رہی ہوں..... اگر تو حد سے بڑھا.....“

تو اجو ہوٹل والے کی لڑکی سے دو بول پڑھا دوں گی۔“ خاور نے شوخی سے خالہ کے جملے میں اضافہ کیا۔

سب کے مشترک قہقہے سے ڈرانگ روم میں زندگی رقصاں ہو گئی۔

”اے میاں..... اب تم بھی اس کے ساتھ مل جاؤ۔“ خالہ نے ناراضگی سے خاور کو دیکھا۔

”چھوڑیں خالہ..... آپ اسد بھائی سے غشیں۔ یہ تو یونہی مداخلت کرتے رہیں گے۔“

منزہ نے خالہ کی سمت دوسری سمت موڑ دی۔

”اے ہاں میاں..... بات تو تم سے ہو رہی تھی..... تم اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے ہو؟“

”ماں باپ ان کے ساتھ رہتے ہیں کیوں کہ باپ تو ریٹائرڈ آری آفیسر ہیں۔ یہ کیا پوت ہیں۔“

”کیا ہے بلال.....؟“ منزہ نے ٹوکا۔ ”بات کرنے دو خالہ کو۔“

خالہ کا موڈ سخت آف ہو گیا تھا۔ خاور نے آکھ بجا کر اسد کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔

”منزہ! بھئی تم نے خالہ کو وہ باسکٹ گفٹ نہیں کی جو اس بار لے کر آیا ہوں میں۔ خالہ بہت خوبصورت باسکٹ ہے۔ ہاتھ سے بنی ہوئی ہے۔ درختوں کی چھال سے تیار ہوتی ہے۔“ ”پرل ہاربر“ پر ایک ریڈ انڈین خود تیار کر کے بیچتا ہے۔ سیاحوں کو بہت پسند آتی ہیں۔ لے کر آؤ نا منزہ۔“ خاور نے منزہ سے کہا۔

”ابھی لائی۔“ وہ ہارنکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد اندر آئی۔ ایک چھوٹی سی ٹوکری اس کے ہاتھ میں تھی۔

”یہ لیجئے خالہ۔۔۔۔۔ خاور کی طرف سے اس مرتبہ کا تحفہ۔“

”بہت خوبصورت ہے یہ ٹوکری، بھلا ہوتا ہمارا۔ مجھے جیسی ناکارہ عورت کو بھی یاد رکھتے ہو۔“ جذبہ تشکر ان کے لہجے سے ہوا یا تھا۔

”ایسے نہیں کہتے خالہ! آپ تو ہماری بزرگ ہیں۔ اور اس کی حیثیت ہی کیا ہے۔“ خاور نے ٹوکری کی طرف اشارہ کیا۔

”میاں۔۔۔۔۔! تحفہ تو تحفہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

خاور میاں! جب تم جہاز لے کر مکے مدینے جاؤ تاں تو مجھے وہ تسبیح ضرور لا کر دینا جو اندھیرے میں چمکتی ہے۔“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔ انشاء اللہ۔۔۔۔۔ بھئی منزہ یا دودلا دینا۔۔۔۔۔ کبھی میں بھول جاؤں تو خالہ کو شکایت ہو۔“

”جیتے رہو۔۔۔۔۔ بھاگ لگے ہیں۔“

”خالہ۔۔۔۔۔ مجھے کتنی ”ٹوکریوں“ کے عوض دعا ملے گی۔۔۔۔۔ بلال کو پھر گدگدی ہوئی۔

”تو نے قسم کھانا ہوگی ”فرقہ“ سے شادی نہیں کرے گا تب ہی دعائیں دوں گی۔ ارے ان کی طرف لڑکے نہیں ہیں

جو ہم اپنے بھی دے دیں۔ کیسی چالاک قوم ہے ٹوکریاں دے کر گھر داماد بلکہ ”ملک داماد“ بنا لیتی ہیں۔

اسد میاں! تم فکر ہی نہ کرو۔ ایسی لڑکی دکھاؤں گی۔ شادی کرتے ہی بنے گی۔“

منزہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے ہارنکل گئی مبادا خالہ اسے جتنے ہوئے دیکھ لیں اور ناراض ہو جائیں۔

جب کہ تین مردانہ طبقے اس کے تعاقب میں آئے تھے۔

رونے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

(اس کائنات میں ہر شے کی حد ہے سوائے خدا کے۔

انسان کا ذہن اس کی پیمائش میں قروں تک پھیل جائے وہ دوسری بات ہے)

رورو کر گویا سوتے بھی خشک ہو گئے تھے۔

ایسے حالات میں بھوک پیاس تو کیا لگے گی۔

اس کی کیفیت اس قیدی کی طرح تھی جسے مساندھیرے پھانسی لگنے والی ہو۔

اور وہ رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں کاٹ رہا ہو۔

ہر چہرہ ہر منظر۔

حتیٰ کہ درود پوار۔

مکڑی کے جالوں سے اٹنی چھت۔

نہر در!۔۔۔۔۔ بے ڈھب سا فرش۔

اس طرح دیکھ رہا ہو گویا یہ سب نوادرات ہوں۔

یہ احساس کراہ یہ بے مایہ چیزیں تک منظر سے ہٹ جائیں گی۔

امید و بیم کی کوئی کرن۔

کسی معجزے کا متوی خیال۔

خالات کے حق میں ہونے کا معمولی سادہ پن بھی جسے چھو کر نہیں گزرتا۔

اس نے چھت سے لٹکتے پتے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔

اسی دم لائٹ چلی گئی۔ گھناؤپ اندھیرے میں عجیب سے سائے تیرتے نظر آنے لگے۔

”امی۔۔۔۔۔!“ اس نے دہشت زدہ ہو کر پوری قوت سے چیخ ماری تھی۔





اوقات کا احساس دلارہا تھا۔ وہ اسے لے کر ساتھ کے کمرے میں چلا گیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اسے ہاتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا۔

”دیکھو.....!“ اس نے شہوار کو مخاطب کیا۔

وہ رک گئی۔ مگر چپ نہ ٹوٹی۔

”زیادہ جلدی دکھانے کی کوشش کرو گی تو بہت بچھتاؤ گی۔ اگر بچھتانے کیلئے تم ندر ہیں تو باقی گھر والے تو ہیں۔ مجھے آزمانے کی کوشش تمہیں بہت پہنچے گی۔“

وہ ہاتھ روم کے دروازے سے ہٹ گیا اور بیڈ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

وہ خاصی دیر واش بین کے سامنے کھڑی انگلیک بھاتی رہی پھر ایک دم چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور جلدی جلدی منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔

ہاتھ روم میں تو یہ موجود نہیں تھا۔ وہ پانی سے بھیکے چہرے کے ساتھ باہر آگئی اور اسے سامنے بیٹھے دیکھ کر ٹھنک گئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے کہنے کے مطابق چائے بنا رہا ہوگا۔

بھیکے بالوں کی لٹیس رخساروں پر چمکی ہوئی شیش۔ پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ اس کی اگلی ضرورت بھانپ گیا۔ ”تو یہ یہاں وارڈ روم میں ہے۔“ (اف خدایا! کس قدر انتظام کر رکھا تھا) وہ اسی طرح خاموشی سے وارڈ روم کی سمت بڑھ گئی۔

”ویسے تو یہ دامن بھی حاشرہ ہے..... مگر.....“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر چپ ہو گیا۔

اس نے نیوی بلیو شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا۔ گل کے مقابلے میں زیادہ تک سب سے تیار نظر آ رہا تھا۔

اس نے وارڈ روم کے پٹ کھول کر تو یہ تلاش کیا جو آخر کار مل گیا۔ تو لیے کیلئے احسن نے کوئی نشان دی نہیں کی تھی بلکہ اس کی تلاش کی کوئی گنجشکی سے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے خاصا تکلیف دہ لباس پہنا ہوا ہے۔ الجھن ہو رہی ہوگی۔“ اس نے شہوار کے بھاری کا مڈار سوٹ کو ناقدانہ انداز میں دیکھا

”تم میرا کوئی شلوار سوٹ پہننا چاہو تو جہن لو..... دوپٹا البتہ تمہیں نہیں مل سکے گا۔ ویسے بھی میرے سامنے دوپٹے کا تکلف ضروری نہیں۔“

وہ خاموش رہی۔

”تمہیں میرے کپڑے استعمال کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ یوں بھی اللہ کا فرمان ہے کہ مایاں بوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ میرے کپڑے بڑے ضرور ہیں مگر تمہیں یہاں دیکھنے کون آ رہا ہے۔ شام تک کپڑے لے آؤں گا تمہارے تاپ کے ایڑی قسم کے۔ اوکے.....؟“

وہ بول رہا تھا مگر شہوار کی چپ نہ ٹوٹی تھی۔

”اگر تم چپ رہنے کی قسم کھا کر کوئی بننے کا بہرہ بھی مجھ پر ہو تو بھی مجھے منظور ہے۔“

وہ خشک انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ تمام لیا۔ اس نے اپنی حقیقت محسوس کر لی تھی۔ اس لئے مزید بگاڑ..... کے خدشے سے مزاحمت نہیں کی۔

وہ سوچ رہی تھی وہ اس کے کنبے پر عمل کر کے اس میں لچک پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور اپنی بات منوانے

کمرے کے اندر کوئی چٹنی نہیں تھی اس لئے وہ اندر سے بند نہیں کر سکتی تھی۔

چٹنی کا نشان البتہ موجود تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ چٹنی وہاں سے اکھاڑ دی گئی ہے لہذا جب وہ اندر داخل ہوا تو وہ نیچے پڑی دکھائی دی۔ صوفے سے سر نہکا ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔

ایک لمحے کو تو اس کے ہاتھوں کے طوطے واقعی اڑ گئے۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی سمت آیا تھا۔ جوڑیوں سے بھری کلائی تمام کرنٹیں محسوس کی۔

سینے کے دھیسے دھیسے زیرہم کو محسوس کیا تو حواس بحال ہوئے۔ ”جھٹکنس گاڈ.....“ اس نے رکھا ہوا سانس خارج کیا۔ آگے بڑھ کر پانی کا جگ اٹھایا اور اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔ کتنی بکھری بکھری اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔

کل کتنی پور پور سے بچی ہوئی تھی اور اب دوپٹہ کہیں تھا۔ خود کہیں۔ ڈھیل چوٹی سے بال نکل رہے تھے۔ سونے کی جھمکیوں کے سہارے..... بے سہارے سے ادھر ادھر جھول رہے تھے ہونٹوں پر شاکٹانک پنک لپ اسٹک کا نشان موجود تھا۔ وہ بہت اچانکیت مگر فکر مند سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کافی کوششوں کے بعد اس کے ہونٹوں میں جھٹش ہوئی۔ ایک کرناک سی سسکاری اس کے ہونٹوں سے آزد ہوئی..... ”آہ۔“

”شہوار.....!“ احسن نے آہستگی سے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور اس سے یوں دور رہی جیسے کوئی متعدی مرض میں مبتلا ہو۔ اس کا چہرہ سٹا ہوا اور آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ اس نے دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر دوپٹہ خاص خاصہ ٹھیکہ پر تھا۔ وہ مسٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

احسن نے دوپٹہ خود اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیا اور ٹخنوں پر زور دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اٹھو منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لئے چائے بنا رہا ہوں۔“

وہ اس سے مس نہ ہوئی۔

”مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش فصول ہے کہ تم ایک باحیا اور مشرقی لڑکی ہو اور جذبات دبانے کی پریکٹس اس مشرقی عورت کو خوب ہوتی ہے..... پارسانی کے جھنڈے گاڑنے کی یہ عورت چٹنی شوقین ہوتی ہے جانتا ہوں۔

لیکن جس میں ذرا سی بھی عقل ہو وہ جانتا ہے کہ جذبات، میں مرد و عورت ایک سے ہوتے ہیں۔ محض اظہار کرنے اور نہ کرنے کا فرق ہوتا ہے۔

میں ایمان لایا تمہاری پارسانی پر بابا..... اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو۔“

اس کی زبان سے گویا انگارے جھڑ رہے تھے اور جھلاہٹ نمایاں تھی۔

وہ خاموشی سے اس کی تقریر سن رہی تھی۔ اس کی بات مکمل ہونے پر بھی اس نے کوئی حرکت نہیں کی۔

”میں تمہیں اشاکر ہاتھ روم میں بھی لے جا سکتا ہوں اور منہ ہاتھ بھی دھلا سکتا ہوں۔“ اس نے گویا دمکی دی۔

وہ خوف زدہ ہی ایک دم کھڑی ہو گئی اور ادھر ادھر ہاتھ روم کا دروازہ تلاش کرنے لگی۔

”یہ بیڈ روم نہیں ہے ڈرائنگ روم ہے۔..... آؤ میرے ساتھ۔“ اس مرتبہ اس کے لہجے میں غری تھی۔

وہ اس کے ہمراہ باہر نکل گئی۔ اب وہ کوئی خطرہ مول لینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ احسن کا مضبوط وجود اسے اپنی

کے قابل ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے ہر قسم کی مزاحمت موقوف کر دی تھی۔ وہ اسے لے کر کچن میں چلا آیا اور چائے بنانے لگا۔

اشک تو عام دنوں میں بھی اس کی پلکوں پر فوراً چمکنے لگ جاتے تھے۔ اب تو صورت حال بہت مشکل تھی۔ وہ اس کی جانب سے پشت کئے چائے بنانے میں مگن تھا۔ وہ بے آواز اشک بہا رہی تھی بلکہ وہ خود ہی بے اختیار بہہ رہے تھے۔ وہ بیماری کا مدانی کے دوپٹے سے برابر انہیں صاف بھی کر رہی تھی۔

معاذہ پلٹا..... اسے آنسو بہاتے دیکھ کر ایک لچکے کوٹھکا۔ پھر خاصے استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔  
”در شہوار.....! عجیب بے وقوف سی لڑکی ہو۔ آنسو بہانے میں مصروف ہو گئیں۔ یہ تمہارے دائیں جانب تیز دھار کا چاقو تو رکھا تھا۔ اسے اٹھا کر میری پشت میں گھونپ دیتیں۔ کتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔“

وہ شاید رات بھر سو یا نہیں تھا اس کی آنکھوں سے سرخی پھٹک رہی تھی۔ جس سے شہوار کو مزید خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی بات پر بھی اس نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ حلق میں تو آنسوؤں کے گولے پھنس رہے تھے۔ بولتی کیونکر.....؟

دو کرسیاں اور چھوٹی سی ٹیبل ایک کونے میں سیٹ تھیں۔ اس نے چائے کے دو کپ اور کچھ لوازمات ٹیبل پر رکھ کر اس کی سمت دیکھا۔

”چائے نوش فرمائیے۔“ وہ اس کے انتظار میں کھڑا نہیں رہا بلکہ کہتے ہوئے بیٹھ بھی گیا۔

وہ اسی طرح کھڑی رہی..... ہونٹ کاٹتی رہی۔  
”آخر تمہیں یہ شوق کیوں ہے کہ میں تمہیں بھونچو کر تمہاری خدمتیں کروں.....!“ وہ جیسے برس پڑا۔ وہ دہل کر آگے بڑھ آئی اور اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

”چائے میں شکر نہیں ہے اپنی پسند سے شامل کرو۔“ وہ ایک ایک پیس منہ میں لیتے ہوئے بولا اور بغور اس کی صورت دیکھنے لگا۔

شہوار کیلئے اس کا اس طرح دیکھنا قابل برداشت سا تھا۔ جب کہ درمیان میں فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔

”آپ مجھے اس طرح نہ دیکھیں.....“ وہ رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

”پھر کس طرح دیکھوں.....؟“ وہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ یہ پہلی سادہ سی مسکراہٹ تھی۔

”چلو..... کفر تو ٹاٹا خدا خدا کر کے..... مجھے کیا علم تھا کہ جو کام میری زبان نہیں کر سکتی وہ نگاہیں کر سکتی ہیں۔“

اس نے واقعی اس کی طرف دیکھنا ترک کر دیا اور چائے کا کپ اس کی سمت کھسکا دیا۔ چارو ناچار اس نے کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ پچھلا اور تلخ ذائقہ۔ اس نے کپ ایک دم ٹیبل پر رکھ دیا۔

”میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کی چائے میں شکر نہیں ہے۔“ وہ نظریں بدستور جھکائے چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ شہوار نے چائے میں شکر ڈال کر چمچ ہلانا شروع کیا تو چلاتی چلی گئی۔

”شکر ملائی جا رہی ہے یا حلیم گھوٹا جا رہا ہے۔“ بالآخر اسے نوکنا پڑا۔

وہ ایک دم رک گئی اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔

”کچھ کھاؤ بھی..... میں نے تو کل شادی کا کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔“ احسن نے ایک پیس کی پلٹ کھسائی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر قہقہہ تھی۔

اس نے جھٹ ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

احسن نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”مجھے اس کا بعداری سے خطرے کی بو آ رہی ہے۔ یقیناً چائے پی کر تم مدعا بیان کر دو گی۔“ وہ اسے اب نظروں سے بھر لے لگا تھا۔

وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔

”بعض لوگوں کی بیویاں پیدائشی گونگی ہوتی ہیں پھر بھی اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ اس لئے تمہاری خاموشی میرے پرستار نہیں بن سکتی۔“

وہ اس کا شوہر ہی نہیں سگا خالہ زاد بھائی بھی تھا۔ رشتوں کے جال اس کی کسی فیصلہ کن سوچ کو آڑا نہ ہونے ہی نہیں دے رہے تھے۔ کہ وہ پیالی ہی اس پر کھینچ مارتی یا کوئی اور چیز۔ احسن سے اس کا رشتہ در رشتہ تھا۔

پہلے وہ اس کا خالہ زاد بھائی محبوب اور پھر شوہر تھا۔ اگرچہ وہ عمر میں اس سے تقریباً دس گیارہ برس بڑا تھا مگر یہ حقیقت تھی اس نے اسے ذل دیا تھا۔

وہ چائے کا کپ رکھ کر ہاتھ گود میں رکھ کر کم سم بیٹھی تھی۔

”کیا رات ڈر لگا تھا.....“ وہ پوچھ رہا تھا۔

اسے رات کا منظر یاد آ گیا..... تو بھر جھری ہی آگئی۔ اس نے ایک لمحہ کو اس کی سمت دیکھا مگر کچھ نہیں بولی۔

”آؤ کمرے میں چلتے ہیں۔“ احسن کا لہجہ اب بالکل ہموار تھا۔

”میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں قطعیت سے بولی۔

”تو میں لے جاؤں گا۔“ وہ اس کی سمت بڑے جارحانہ انداز میں بڑھا۔ وہ ایک دم لرز کر کھڑی ہو گئی۔

”احسن.....! یہ اتنا بڑا ظلم ہے کہ کوئی حد نہیں۔“ وہ پھر رو دی۔

”دیکھو شوہار.....! یہ واحد لڑا آخری راستہ تھا۔ اگر مجھے یہی سب کرنا ہوتا تو میں چار آدمی تمہارے دروازے پر لے کر آ کر نہ کیوں پہنچتا؟

اگر میں عدالت کا دروازہ بھی کھٹکھٹاتا تو میری مدد کی جاتی اور لیڈی پولیس کی مدد سے تم میرے حوالے کی جاتیں۔ اٹھ کر یہ کارروائی ملاحظہ کرتا۔

مجھے انتہائی راستوں پر لانے والے یہی میرے اور تمہارے بڑے ہیں۔ اس میں میرا تمہارا کوئی قصور نہیں۔“

”ہیں ان کی عزتیں اچھا لے کر کوئی حق نہیں پہنچتا۔“ وہ ترشی سے گویا ہوئی۔

”اور انہیں ہمیں برباد کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

کیا تھا جو خالہ جان اور خالو جان مجھے سے حقیقت حال معلوم کرنے کو شش کرتے۔ ان کیلئے میرے باپ کا جملہ سندی بت رکھتا ہے۔

اور ان کی نظروں کے سامنے گزرے ہوئے میرے ماہ و سال کچھ حیثیت نہیں رکھتے.....؟ ایسے عاقبت نا اندیشوں کو یہ فیصلہ کن قسم کے لوگ چاہئیں۔ آدھے ہوش تو ٹھکانے آچکے ہوں گے۔ کان کھول کر سن لو شوہار۔

اگر تم اسی طرح مزاحمت کرتی رہی تو تمہارے گھر کا ایک ایک فرد خوشی کا نام تک سننے سے محروم ہو جائے گا۔

میں کشتیاں جلا چکا ہوں۔ مجھے آزماؤ گی تو پچھتاؤ گی۔ میری طرف سے تم کمرے میں جاؤ یا نہ جاؤ۔ یہاں بیٹھو یا

استور میں..... اس چار دیواری سے باہر کی دنیا اب تم پر بند ہے۔ اگر تم خود کو نقصان پہنچا کر اپنی ذات سے مجھے خبر کرنے کی کوشش کرو گی تو میں تمہارے گھر کے ایک ایک فرد پر زندگی حرام کر دوں گا۔

وہ بری طرح گرج رہا تھا۔

”میں رات سے سو یا نہیں۔ سونے جا رہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ البتہ یہ بھڑکی چاقو موزہ ہیں۔ مجھے ان کی مدد سے سوتے میں ہلاک کیا جاسکتا ہے۔“

وہ طنز یہ مسکرایا..... وہ اس کی جڑوں سے واقف تھا کہ وہ کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں.....

”اس وقت تو تم پر میکہ سوار ہے۔“

میں تو تمہیں بچھلی محبتوں کے واسطے دے کر بھی رام نہیں کر سکتا۔ اور ہاں جس راستے سے تمہیں گھر میں لایا تھا وہ گھر بچھلا حصہ ہے۔ اگلے حصہ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہے۔ راستے بتا دیے ہیں اور اختیار دے دیا ہے..... نیلو فرامین، دانیال، نوفل اور دوسرے لوگوں کے مستقبل کا انحصار تمہارے ہی کسی اقدام سے وابستہ ہے۔“

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ کیا کہہ کر گیا یہ تو بعد کی بات تھی۔ اسے تو اپنے بہن بھائیوں کے ناموں ہی نے خلیان میں جھٹلا کر دیا تھا۔

”میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی احسن!“ وہ فریش پر بیٹھنے لگی، گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”بہت شوق سے..... میں اس کا بھی انتظام کر چکا ہوں۔ میری درخواست پولیس اسٹیشن میں موجود ہے کہ میری با کو خطرہ لاحق ہے۔ شک کی بنیاد پر آپ محترمہ کے گھر والوں کے نام اور پتے وہاں موجود ہیں۔ احتیاطاً بتانے آگیا ہوں سخت نیند آ رہی ہے۔ امید ہے اب مجھے مزید پریشان نہیں کرو گی۔“

وہ اندر آ کر بات مکمل کر کے واپس اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ ششدر سی بیٹھی اس کے دور ہوتے قدموں کی آواز سن رہی تھی۔

وہ خاموش و ساکت بیٹھے بیٹھے ایک دم چمک گئی۔

کیا کرنا چاہئے.....؟

کیا ہوگا؟

گھر والوں کی کیا کیفیت ہوگی؟

ایک تو اسے سوالات ذہن میں آجھرے۔

مگر وہ کسی قسم کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتی تھی۔ خواہ اس گھر کے دروازے کھلے ہوں یا دیواریں تک مگرمی ہوں۔ اس طرح آرام سے اسے کچن میں بٹھا کر سو نہیں سکتا۔ یقیناً اس کے ذہن میں پورا پردہ گرام مرتب ہے۔

وہ سوچتی ہوئی باہر نکل آئی۔

نیم تاریک راہداری سے گزرتے ہوئے اس نے ادھ کھلے دروازے سے جھانکا۔

وہ ایک بچے کو بیٹھنے غافل سو رہا تھا۔

کرشمہ تارک تھا۔

اس کے سونے کا انداز تارک تھا وہ ایک دم غافل ہے۔

اس سوچ کے ساتھ ہی اس کے وجود میں تو آتیاں بارش بن کر برسیں۔

وہ بے پاؤں پچھلے دروازے کی سمت آئی۔

دو کلوڑنی تالا اس میں جھول رہا تھا۔

وہ دیوانہ وار مین گیٹ کی سمت دوڑی۔ اس سے بڑا تالا وہاں جھول رہا تھا۔

اس نے اس بلند و بالا تو تعمیر شدہ گھر پر ایک شکستہ نظر ڈالی۔

میں فرار ہونا بھی چاہوں تو احسن تمہاری پہنچ سے دور تو پھر بھی نہیں..... ایک ہی محل ہے کہ تم سے دوستی کی جائے۔

اور امن کے ساتھ علیحدگی ہو

کہ میں اپنی روایات کی دھجیاں اڑانے کو قطعی تیار نہیں۔

چندر منٹ وہ کھڑی سوچتی رہی۔

خدا نہ کرے وہ اس وقت کسی نامحرم کے ساتھ تھا نہیں ہے۔ وہ جو یہاں موجود ہے۔ ایک زمانے کو گواہ بنا کر اس کا ہوا

اگر میں مر بھی جاؤں تو یہ اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔ میرا پورا گھر خاک کر دے گا۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس کی

توں کی بھی گواہ ہوں۔

بھڑکتے شعلوں کو ہوا دینے لیں میرا بھی کم ہاتھ نہیں۔

میں اسے محبتوں کا واسطہ اور یقین و امید کے دلا سے دوں گی۔ وہ مان جائے گا۔ اس کی یہ انتہا پسندی اس کی محبت ہی کا

ظہار ہے۔

وہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔ اب اس کے دل میں خوف و اہمیں کی جگہ خوش امید نے لے لی تھی۔ وہ

ڈروپ سے اس کی شلواری قمیض نکال رہی تھی۔

ایسے انتہا پسندوں سے غصے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ ان سے مفاہمت کی جائے۔ میری اکثر تیزی کچھ کام

کے گی۔ اس نے تجزیہ کر لیا تھا۔

وہ تجزیہ کر سکتی تھی کہ ایک دو سال سے نہیں وہ برسوں سے اس کے قریب رہی ہے اور جو قریب رہتا ہے وہی زیادہ جانتا

اس کا سیاہ شلوار سوٹ زیب تن کر کے اس نے بال سلجھائے۔ زیورات اتار کر اس نے وارڈروپ میں رکھ دیے

ہالوں کو سلجھا کر ڈھیلا سا جوڑا بنایا۔ آستینیں ہاتھوں سے باہر لٹک۔ ہی قمیض تو اس نے کہنیوں تک فولڈ کر لیا تھا۔

کمرے میں ڈرائنگ ٹیبل پر نہیں تھی۔ اس لئے وہ اپنا سر پا دیکھنے سے قاصر تھی قمیض البتہ وہ ٹخنوں تک پہنچتی دیکھ

تھی۔

احسن نے اپنے کپڑے اسے استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اس نے یہ سوچ کر عمل کیا تھا کہ اس کا یہ عمل احسن میں

بھیلا کر دے گا اور وہ اس پر رحم کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ وہ اس عجیب و غریب طبعے میں کافی دیر وہ ادھر ادھر پھرتی

تھی۔

شاہد وہ چار گھنٹے سو یا ہوگا۔

وہ بغیر ہلکا ستر والے لالہ لالہ میں اسٹول پر سوچوں میں گم بیٹھی تھی اور حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے خود کو تیار کر رہی تھی۔

اسے سامنے موجود پاکر بڑا کرکھڑی ہوگئی۔

احسن کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نہ جانے کیسا تاثر تھا کہ وہ نگاہیں جھکانے پر مجبور ہوگئی۔

”شاباش! اس کی بھاری آواز ابھری۔“ شوہر کو خوش رکھنے والی بیویاں جنتی ہوتی ہیں۔“

اپنے سیاہ شلوار سوٹ میں اسے لمبوس دیکھ کر وہ واقعی بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ بھاری کاہلی کا آتش لگلائی دوپٹہ اس نے اس مردانہ سوٹ پر ہونڈاؤڑھ رکھا تھا۔

”کپڑے تو اور رنگوں میں بھی تھے۔ یہ تم نے سیاہ سوٹ کا انتخاب کس ”غلم“ میں کیا ہے؟

”کمرے میں اندھیرا سا تھا۔ کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔“ وہ آہستگی اور رسائی سے بولی۔

”اوہ.....!“ وہ اس کے مفاہمت آمیز رویے پر چونکا۔

”ویسے تمہیں سیاہ رنگ نہیں پہننا چاہئے تھا۔ آج تو ہم اپنی جی زندگی کی پہلی شب پہلی بار ایک ساتھ گزاریں گے!

اس کی گھمبیر آواز ابھری۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

دل حلق کے راستے باہر آنے کے جتن کرنے لگا۔

”خیر کوئی بات نہیں میں ابھی بازار سے تمہارے لئے اور کپڑے لاؤں گا تو ایک عروسی جوڑا بھی لے آؤں گا۔ ٹھیک

ہے؟ تم دیکھ لو میں نے ابھی تک کسی بے ضابطگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خاصا اصولی شخص ہو۔“ وہ بھوک لگ

رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے شاپنگ میں کچھ دیر ہو جائے۔ اسٹیکس وغیرہ موجود ہیں تب تک کام چلا دیتا۔ اوکے۔“

اسے محسوس ہوا پاؤں پڑنے کیلئے یہ وقت موزوں نہیں۔ اسے احسن کی واپسی کا انتظار کرنا چاہئے۔ خدا معلوم کتنی د

باہر ہے گا۔

ادھر گھر میں گھر والوں پر قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی۔ جتنی ہوں تو یہ مزید ہتھے سے اکھڑ جائے گا۔ خاموش رہتی ہوں

دیر ہو رہی ہے۔

”کیا سوچ رہی ہو.....؟“ وہ بخور دیکھ رہا تھا۔

اس نے نفی میں گردن ہلائی گویا کہہ رہی ہو۔ ”کچھ نہیں۔“

”ویسے مجھے تم سے یہی امید تھی۔ یونہی محبت کرتی رہو۔ جان بھی حاضر ہے۔“ وہ مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔

”خالہ.....!“

”ہاں میرے بچے.....!“

”میں سوچ رہا ہوں جڑی چلا جاؤں۔“

”وہاں کیا بات رہا ہے؟“ خالہ کا ڈلا ر ایک دم ہوا ہو گیا۔

”وہاں ایک سب سے بڑی آسانی میسر ہے۔“

”تاک سے کھاتے ہیں۔“ وہ جل کر بولیں۔

”یہ کوئی آسانی ہے یہ تو بہت مشکل کام ہے۔“

”پھر.....؟“

”وہاں نوکری اس شرط پر ملتی ہے کہ وہاں کی لڑکی سے شادی کرو۔“

”توبہ استغفار.....! اے دیکھو کیا ڈھنگ ہیں لڑکیاں بیاہنے کے۔

دیکھ لو بہن.....! یہاں ماں باپ نہیں کر سکتے وہاں حکومتیں کر رہی ہیں شادیاں.....! اور یہاں کا یہ حال کہ تین تیرہ بارہ

.....! خاندان والے ہی شادی نہیں ہونے دیتے۔ ایک بچی بیٹھی ہے رشتہ نہیں آرہا۔

اچانک ایک دن کسی خالہ کی پہلی پھڑکی اور وہ اپنے ہونہار کا سوال لے کر پہنچ گئیں یہ خالو کو جاتے دیکھا تو ان کی بحث

بھونچھی بھی راج و لارے کا رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔

اب لڑکی کی ماں پریشان کئے کسے ہاں کروں اور کسے ناں۔ اس کو ناں کہوں تو وہ ناراض۔ اس کو ناں کروں تو وہ ناراض۔

وہی مثل ہوگئی۔ بلی نے پیہ مار کر دودھ گرا دیا۔ نہ پینا نہ پینے دیا۔ آپس میں اتفاق ہو تو کسی کی بچی بیٹھی نہ رہے اور نہ

کے باہر شادی کرنے کا سوچیں۔

”بہن! تمہارے خاندان میں کیا لڑکیاں نہیں ہیں.....؟“

خالہ اصغری نے منہرہ کی جانب روئے سخن کیا۔

”ماشاء اللہ بہت ہیں۔“ اس نے دیکھ کر کلمہ کا سوچ لے آف کیا تا کہ خالہ کی بات توجہ سے سن سکے۔

”تو کیا اچھی نہیں ہیں.....؟“ وہ انجھیں۔

”نہیں خیر۔ بہت اچھی اچھی لڑکیاں ہیں۔“

”تو تم یہ کر دو بہن.....! بلال کو کسی کھونٹے سے باندھ دو پہلی فرصت میں۔ تمہارے اپنے ہی خاندان کا ایک مسئلہ کم ہو

”یہ ہانتا ہی نہیں۔ میں یا امی کیا کر سکتے ہیں.....!“ اس نے محبت سے بھائی کو دیکھا۔

”نہیں ہانتا۔ خوب کہی۔ لگا دو دو جوئے اس کے تو اچھے بھی مانتیں گے۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

”یہاں کی لڑکیاں میرے معیار پر پوری نہیں اتریں خالہ.....!“ وہ شریر ہوا۔

”ارے کچھ خدا کا خوف کر بلال.....! تیری جاگیر میں سورج غروب نہیں ہوتا یا سن و سلوٹی اترتا ہے تیرے گھر

.....! اسی دم فون کی گھنٹی بجی۔

بلال نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو..... جی..... السلام علیکم!“

”جی..... آئی.....! وہ تو ہمارے نزدیک ہی رہتی ہیں بلکہ اس وقت تو گھر میں موجود ہیں.....! ارے غضب خدا کا“

پا آئی سے نہ کہنے گا“

منہرہ نے ابھی ہوئی نظروں سے بلال کی سمت دیکھا۔

”کس کا فون ہے بلال.....؟“

”راجو آئی کا.....“ اس نے ماؤہ میں پر ہاتھ رکھ کر بہن کو جواب دیا۔

”ہر کسی کے ساتھ ایک سے انداز میں شروع ہو جاتے ہو۔ کچھ خیال کیا کرو۔“ اس نے بلال کو تنبیہ کی۔

”اے کون ہیں یہ راجو آئی.....! سسرالی رشتے دار ہیں تمہاری.....؟“ خالہ نے دونوں بہن بھائی کے درمیان قطع

کی۔

”اسد بھائی کی امی ہیں خالہ!“ منہرہ نے فطری شائستگی سے خالہ اصغری کو جواب دیا۔

”اے بلال.....! ذرا میری توبہات کرا دے جیسے.....! مجھے تو ان سے بہت ضروری ملتا ہے۔“ خالہ کا جوش و خروش

دیدنی تھا۔

”آئی..... خالہ موجود ہیں۔ لیجئے بات کیجئے۔ وہ بھی آپ سے بات کرنے کیلئے بے چین ہیں۔“

”سلام علیکم بہن!“

”کیسی ہیں آپ؟“ اے بس بہن موسم ہی ایسا ہے۔ آپ کا بچہ..... ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک۔ اللہ نظر بد

بچائے۔

بلال نے بتایا تھا.....؟ اے یہ بلال بڑا نیک اور خیر خواہ بچہ ہے۔ دوسروں کے دکھ درد اپنے سمجھتا ہے۔“

منزہ..... سخت الجھن میں نظر آرہی تھی۔

”کیا بتایا تھا تم نے آئی کو؟“ وہ بلال سے پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں..... بس خالہ کا تعارف کرایا تھا۔ پرسوں جب حلیم پہنچائے گیا تھا تو آپ کا بچہ کا خاص تحفہ.....“

”کوئی کام کرتے“ کوئی بات کہتے ذرا سوچ بھی لیا کرو۔“ منزہ نے ڈانٹا۔

”اب آئی خالہ سے ملاقات کر کے اسد بھائی کے لئے موزوں لڑکی کا پتہ لیں گی۔ جنہیں معلوم ہے خالہ کا

احباب.....؟ اسد بھائی کے اپنے خاندان میں ایک سے ایک لڑکی موجود ہے۔ خواہاں کسی کا نام ضائع ہوگا۔“ منزہ

بلال سے ناراضگی کا اظہار کیا۔

”وہ تو آئی.....“

”بس چھوڑو..... اب ان کے کام بھی آتا۔ اگر اسد بھائی قابو ہیں نہ آپائیں تو تم خالہ کے کام آجانا۔“

وہ غصے سے کہہ کر..... پھر ویکیم کلینر کا رپٹ پر چلانے لگی۔

”سچ آئی..... آئی خود بھی سیر لیں ہیں۔ میں نے کوئی کنویں تک نہیں کی۔ یوں ہی تہ کرہ کیا تھا۔“ بلال سے من

ناراضگی ایک لمحے کو برداشت نہیں ہوتی تھی۔

”اب وقت طے کر کے ملاقات تو کرانا ہوگی..... بات جو آگے بڑھا دی ہے۔ چودھریوں، ٹھاکروں کا گیر دا

میں اسد بھائی شادی کریں گے نہیں۔

اجو ہوٹل والے ان کے معیار سے میچ آجائیں گے۔ وقت برباد ہوایا نہیں.....؟ وہ بلال سے پوچھ رہی تھی۔

خالہ ابھی تک ریسور کے سنگ سنگ جھول رہی تھی۔

خوب لبک لبک کر ”ٹھیک کہا۔ بہت اچھے..... آپ کے کیا کہنے۔“

جیسے الفاظ تھوک کے بھاؤ اگل رہی تھیں۔

خلاف معمول شیخ رحم الدین آج دوپہر ایک بجے ہی وارد ہوئے تھے۔

ٹکلیہ نے طاہری اور دبی کا راستہ دوپہر کے کھانے پر بنایا تھا۔ وہ سب کھاپی کر ظہر کی نماز کی تیاریوں میں مگن تھیں۔

باپ کو خلاف معمول جلد گھر میں دیکھ کر کوئے کھدروں میں گھسنے لگی تھیں۔“

”خیر تو ہے۔ آج جلدی کیسے آگئے؟“ صفیہ آگے بڑھیں۔

”گھر ہے میرا جب چاہے آسکتا ہوں۔“ وہ حسب معمول الٹ کر بولے۔

صفیہ خاموش ہو گئیں اور کھانا لینے چل دیں۔

”کہاں جا رہی ہو.....؟ ادھر آؤ۔“

وہ ٹھیک کر رک گئیں۔

”جی.....“ وہ قریب آئیں۔

”مغرب کے بعد انعام علی چار آدمی لے کر آ رہا ہے نکاح کر رہا ہوں ٹکلیہ کا۔ کھانے پینے کا بندوبست کرلو۔“

منفہ پر جیسے گویا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا۔

پہنی پٹنی آنکھوں سے شیخ صاحب کو دیکھنے لگیں۔

”سالم نگوگی۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ کیا انہونی ہو رہی ہے.....؟“ وہ بگڑ کر بولے۔

”آپ کی موجودگی کسی انہونی سے کم ہے کیا۔ جو آپ نے صادر فرمایا اس کی تعمیل نہیں ہوگی۔“

وہ جیسے ہوش میں آکر غضبناک ہو کر بولیں۔

”یہ تو وقت بتائے گا تعمیل ہوگی یا نہیں..... ٹکلیہ کو بلاؤ۔“ وہ دہاڑے۔

”کوئی نہیں آ رہی ٹکلیہ جو بات کرتا ہے مجھ سے کریں۔“ وہ بھی غرائیں۔

”تمہارے ساتھ نکاح میں بندھ کر نہیں آئی تھی..... اولاد ہے وہ میری.....“ وہ مزید بگڑے۔

”آپ باپ ضرور ہیں اس کے مگر خالق حقیقی اس کا اللہ ہے..... آپ.....“

”میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ اور جو کہتا ہوں وہ کرو۔“

”ہرگز نہیں مگر کبھی نہیں۔“ وہ چٹان کی طرح ڈٹ گئیں۔

”میں ٹکلیہ سے پہلے تمہیں رخصت کروں گا۔ سمجھیں۔ زبان دی ہے میں نے، کھیل نہیں ہے۔“

وہ بری طرح بگڑ گئے۔

”کردیں مجھے رخصت۔ میں اپنی بچیوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔ روٹی ہی یہاں کھا رہے ہیں۔ محنت مزدوری کر کے

ٹلے اور کھالیں گے۔“

”تم اگر اس گھر سے جاؤ گی تو تنہا ہو جاؤ گی۔ جو لینا چاہتی ہو لے لو اور فوراً سے پیشتر یہاں سے نکل جاؤ۔ میں کا نہ لکھ رہا

ن احرام کر رہا ہوں تمہیں خود پر۔“ وہ جیب سے قلم نکال کر کاغذ ڈھونڈنے لگے۔

ٹکلیہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اندر کمرے میں آئی۔

”اباجی..... خدا کے لئے..... خدا کے لئے..... یہ نہ کریں۔ اس عمر میں میری ماں کے سر پر خاک نہ ڈالیں۔ مجھے

پ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔ انعام علی کی بجائے اگر آپ کسی خا کو ب کو بھی میرے لئے منتخب کریں گے تو بھلا مجھے منظور

ہے۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”بکواس بند کر ٹکلیہ۔ گھانٹ دوں گی تمہارا۔ اب اس آمر کی نہیں چلنے دوں گی۔“

شاہ رحم الدین کو پیچھے دھکیل کر وہ ٹکلیہ کی طرف بڑھیں۔

شاہ صاحب لیٹر پینے لے کر پانک پر بیٹھ رہے تھے۔

ٹکلیہ نے قہم ان کے ہاتھ سے چھین لیا۔

”کہہ تو رہی ہوں میں مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ جو آپ کہیں گے وہی ہوگا۔ چاہے امی میرے ٹکڑے ٹکڑے کر

والا ڈالیں ذال دیں۔ مگر میں صرف آپ کی بات مانوں گی۔ یقین کریں۔ یہ نہ کریں اباجی خدا کیلئے۔“ وہ ان کے گھٹنوں



پرجھک گئی۔

صغیر عتاب کی طرح خشک پرجھپٹیں۔

”تو میری راہ مشکل بنا رہی ہے خشک! میں اپنے بچے کی در بدری کے عوض یہ سودا نہیں ہونے دوں گی جس کے پیچھے میری کوکھ میں آگ لگی ہے وہ بات نہیں ہونے دوں گی۔“

”فرض کر لیں امی! احسن بھائی در بدر نہیں ہوئے فرض کر لیں وہ باہر چلے گئے ہیں فرض کر لیں کہ ان کا کچھ بگڑا مگر اباجی کے فیصلے میں مداخلت نہ کریں۔ میں ان کے فیصلے سے خوش ہوں۔ مجھے اپنے باپ کا فیصلہ منظور ہے۔“

”سن لیا تم نے؟ میری بیٹی میری بات رکھ رہی ہے۔ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں ثابت ہو گیا کہ یہ بیٹی ہے۔۔۔۔۔ اگر تم نے اسے کچھ کہنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ وہ رک گئے۔“

صغیر پہلے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے خشک کو دیکھتی رہی پھر تیرا کر فرض پر آ رہی ہیں۔

خشک نے باپ کی طرف یوں دیکھا گویا رحم کی ہیک مانگ رہی ہو۔

اگرچہ ان کا نام رحیم الدین تھا مگر ان پر یہ مثل صادق آ رہی تھی کہ آنکھ سے اندھے نام نین سکھ۔ رحم تو گویا انہیں نہیں گزرا تھا۔

باقی تمام لڑکیاں باہر کھڑی کانپ رہی تھیں۔ خشک کی چیخ پر اندر در آئیں اور ماں کے ارد گرد بیٹھ گئیں اور ہوش لانے کی تدبیریں کرنے لگیں۔

”نبیلہ! انہوں نے غبرو بیٹی کو مخاطب کیا۔

”جی اباجی!۔۔۔۔۔! اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”تم اگر اپنی نائیکہ کی ایک دو سہیلیوں کو بلانا چاہو تو بلاؤ۔ شام کی چھوٹی سی دعوت کا انتظام کرو۔

مغرب کے بعد انعام علی بارات لے کر آ رہا ہے۔ کچھ مگنا ہو تو لکھ دو۔“

وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

وہ ششدری انہیں جاتا دیکھنے لگیں

نمبر تین نائیکہ پانی لے آئی تھی اور ماں کے چہرے پر چھینے مار رہی تھی۔ صغیر کو ہوش میں آتا دیکھ کر خشک باہر نکل گئی۔

کوئے میں بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں گھس گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

احسن چندر برس کی عمر تک اپنے تایا کی سرپرستی میں رہا تھا جنہوں نے بیوی کے مرنے کے بعد تہائی اختیار کر لی تھی وہ چار سال کا تھا اور خشک کو دس تھی۔ جب اس کے تایا نے بھائی سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ باہر جا رہے چاہتے ہیں احسن کو اپنے ہمراہ لے جائیں۔

ان دنوں شیخ رحیم الدین بے روزگار تھے اور گھر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شیخ صاحب کو بیٹے کا مستقبل روشن نظر ایک لمحہ دیر کے بغیر انہوں نے بیٹا بھائی کو سوئپ دیا۔ ان کے انہی بھائی کے تعاون سے ان دنوں گھر کا خرچ چل رہا تو صغیر جیٹھ کے احسان تلے وہ بی بی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے شوہر کا فیصلہ قبول کیا۔

دوسرے دن شیخ رحیم الدین کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی اور تقدیر کا زہر گھونٹ گھونٹ پی رہی تھیں۔ خیال کیا کو بیٹے کا اچھا ماحول محبت کے ساتھ میسر آ رہا ہے تو برائی کیا ہے۔ یہاں تو سرکاری اسکول کی تعلیم ہی

نظر آ رہی تھی۔ وہاں بہترین تعلیم کے بہترین مواقع میسر نظر آ رہے تھے۔ احسن تایا سے قریب بھی بہت تھا اور باپ سے زیادہ ان سے محبت کرتا تھا۔

یہ سب عوامل اکٹھے ہوئے اور وہ اپنے تایا کے ساتھ بحرین چلا گیا۔ اس کی دوری کا اگرچہ دکھ تھا مگر ایک شاندار مستقبل کی خاطر صغیر نے کیلجے پر پتھر رکھ ہی لیا تھا۔

سات برس کے عرصے کے دوران وہ اگرچہ آثار ہاتھ مگر ان کا کم اور تایا کا زیادہ لگنے لگا تھا۔ آٹھ سال بعد جب شیخ رحیم الدین کے بھائی مستقل وطن واپس آ گئے تب بھی احسن ان کے ساتھ ہی رہا تھا۔

شیخ صاحب کے بھائی کے قریب ہی اڑدس پڑدس میں صغیر کی بیٹیں آباد تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی خالاؤں کے بھی نزدیک ہوتا گیا۔

صورت شکل بھی اچھی تھی اس پر بہترین ماحول اور بے پایاں محبتوں نے اس میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ خود سری بھی پیدا کر دی تھی۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے لے کر اب تک لفظ ”نہ“ نہیں سنا تھا۔

پہلی شوکر اسے اس وقت لگی جب شیخ صاحب کے بھائی خالق حقیقی سے جا ملے اور احسن کو واپس باپ کے پاس آنا پڑا۔

تایا کے مقابلے میں باپ کی ایک ایک ادا مختلف لگی۔ تایا بلا کے شفیق اور باپ پر لے درجے کا آمر۔

تایا کے گھر میں اسے ذہنی و فکری آزادی میسر تھی یہاں ماحول اس کے الٹ تھا کہ چھینک مارنے سے پہلے بھی گویا اجازت ضروری تھی۔

تایا کے گھر میں اسے روزمرہ کے مسائل کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ یہاں وہ ماں کو پائی پائی کا حساب دیتے ہوئے دیکھتا تھا۔

تایا گھر میں داخل ہوتے تھے تو دل جھکا اٹھتا تھا۔ باپ کی آمد سے روح میں سنائے اترتے تھے۔

تایا اعلیٰ سرکاری عہدیدار تھے۔

ذاتی گھر ساری عمر نہیں بنایا تھے۔ سرکاری رہائش گاہیں انہیں مرتے دم تک میسر رہیں۔ البتہ کچھ پیسہ احسن کے نام ضرور جمع تھا۔ جس کے لئے تاکید تھی وہ اس کی تعلیم پر خرچ کیا جائے۔

ان کے اپنے شاہانہ ٹھاٹھ باٹ تھے وہی احسن کو بھی میسر تھے۔ پھر وہ شیخ صاحب کو بھی مالی معاونت کرتے رہتے تھے۔

ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد گویا ہر سمت ایک غلاپہ ایدہ ہو گیا تھا۔

سب سے بڑا غلا تو احسن کی ذات میں ہی پیدا ہوا۔

پھر شیخ صاحب کو بھی ایک مضبوط سہارا چھین جانے کا احساس ہوا۔ معاشی مسائل گھر گھر آئے تو وہ مزید تلخ ہوتے گئے۔ گویا کر یا اور نیم چڑھا والی مثل ہو گئی۔

احسن نے روز اول سے ان کی آمریت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ماں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس ماحول اور اس لہجے کا عادی نہیں ہے۔

ماں کیا کہیں وہ تو خود سمجھوتے کی چادر لپیٹے بیٹھی رہتی تھیں۔

احسن تو کچھ عرصے ہی میں اس ماحول سے بیزار ہو گیا تھا۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا اسے ماں سے شدید ہمدرد ہوتی گئی۔ اس کا دل ماں کیلئے حساس ترین ہو گیا وہ صرف ماں کی وجہ سے اس ناگوار ماحول میں خود کو دم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

من مانی تو وہ بہر حال کرتا ہی تھا۔۔۔۔۔ جب جی چاہتا خالاؤں کے پاس کراچی چلا جاتا کہ آہستہ آہستہ کراچی میں کم کے دل میں آباد ہو گیا تھا۔ خالاؤں کا نور نظر تھا۔ ہر ایک نگاہ سے محبت ملتی تھی جب بھی شیخ رحیم الدین کے گھر میں اس کا دم گھٹنے لگتا وہ اسلام آباد سے کراچی کی طرف دوڑتا۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم تھی کہ شیخ صاحب نے اس کی نفسیات بگاڑنے میں پورا پورا کردار ادا کیا تھا۔۔۔۔۔ خوش مزاج اور مفاہمت پسند احسن کی جگہ اب ایک نئی شخصیت جنم لے چکی تھی۔ اگرچہ یہ شخصیت اکثریت پر آشکار نہیں تھی۔ وہ باپ کے زیادتیوں پر اپنی فیصلوں کے سامنے ڈٹ کر بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ بہنوں کی مٹیں اور ماں کی کوئی تاویل اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہ کر سکتی تھی۔

شیخ رحیم الدین کے لئے وہ لوہے کا چٹا ثابت ہو رہا تھا۔

ان کے لئے وہ خطرے کا سنگل تھا۔ سانپ کے گھانے کی چھو بھڑکتا ہوا آگ لگنے لگتی تھی اور نہ ننگے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صنفیہ کو کوئی زور اور حاکمیتی میسر آئے اور وہ ان کی حاکمیت کے دائرے سے باہر نکل جائے۔ اس پر بھی کبھی عورت کے ساتھ شروع دن سے ہی "ناک" کے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی قیمت پر بھی بیوی کو مستحکم پوزیشن میں دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ جب انہیں یہ علم ہوا کہ احسن اپنی خالہ کے ہاں شادی کا خواہش مند ہے (یہ خبر انہیں اپنی بہن کے ذریعے ملی تھی)

تو انہوں حیرت انگیز طور پر اس کا فیصلہ قبول کیا تھا۔ اگرچہ وہ اس وقت تعلیمی دور سے گزر رہا تھا۔

وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح بیٹا ان کا احسان مند ہو اور ماں پر انہیں یعنی باپ کو فوقیت دینے لگے۔

انہوں نے احسن کا رشتہ حسب خواہش طے کر دیا تھا

دو شہزاد اپنی دو سیال میں سب بچوں سے بڑی تھی اور داد کی لاڈلی تھی۔ لہذا جب دادی مرض الموت میں مبتلا ہوئیں تو خواہش ظاہر کی کہ شہزاد کا نکاح ان کی زندگی میں کر دیا جائے۔ وہ اسے دلہن بنا دیکھنا چاہتی ہیں۔

ان کی خواہش کے احترام میں ایک چھوٹی سی سادہ سی تقریب میں وہ احسن کی منکوحہ بن گئی۔

ابھی اس کی فنی فنی ملازمت تھی کہ گھر میں قیامت برپا ہو گئی۔

شیخ رحیم الدین نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اور احسن مل کر بھی سات بیٹیوں کو وقت پر نہیں بیاہ سکتے۔ یہی خیال ان کے ذہن میں راسخ ہو گیا تھا جس کے رد عمل کے طور پر انہوں نے اس قسم کے رشتوں کی تلاش شروع کر دی تھی جن کے قائم ہونے؛ اخراجات کم ہوں۔ جب کہ احسن اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے سخت جدوجہد میں مصروف ہو چکا تھا یہی وجہ تھی کہ جب باپ نے اپنا ہم عمر داماد کم خرچ بالائیں کی بنیاد پر منتخب کیا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

اس روز غالباً رات کے گیارہ بجے تھے۔

وہ دفتر کی فائلوں میں سرکھپا رہا تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ ماں کی بلند آواز سنی۔

اس کی ماں کے منہ میں تو زبان ہی نہیں پھریہ آواز کس کی ہے؟ وہ چونک پڑا تھا۔

"احسن!" وہ ماں کی آواز پر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور ماں کے کمرے کی سمت بڑھا تھا اور آہستہ سے دستک دی تھی۔ شیخ رحیم الدین کی گرج چمک ہنوز جاری تھی۔

"آ جاؤ۔۔۔۔۔" ماں کی اجازت پر وہ کمرے میں داخل ہوا۔

صنفیہ پلنگ پر بیٹھی غصے سے کھول رہی تھیں اور شیخ رحیم الدین کمر پر ہاتھ باندھے ادھر سے ادھر ٹپل رہے تھے۔

اس سے قبل صنفیہ کچھ بولتیں شیخ صاحب نے احسن کی سمت دیکھا۔

"سمجھاؤ اپنی ماں کو۔"

"کیا سمجھاؤ؟" وہ باپ کی عادات سے واقف تھا اس لئے اپنے طور پر فرض کر چکا تھا کہ پھر باپ نے ہی کوئی بات کی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ اس کا لہجہ تنگ تھا۔

"اسے سمجھاؤ۔۔۔۔۔ آج کل رشتے لٹا کس قدر مشکل ہے۔۔۔۔۔" وہ گرم لہجے میں پھنکارے۔

"خیریت۔۔۔۔۔؟" اس نے باری باری ماں اور باپ کو دیکھا۔

"اپنا ہم عمر بہنوئی لائے ہیں ڈھونڈ کر تمہارے لئے۔" صنفیہ تلخی سے بولیں۔

"کیا مطلب۔۔۔۔۔؟" اسے گویا شاک لگا تھا۔

"قسمت سے ایک کر دوڑتی تمہاری بہن کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ تمہاری ماں سے برداشت نہیں ہو رہا۔ یہ عورت نہیں جی کہ اس کے بچے خوش حال زندگی گزاریں۔" وہ بھڑک کر بولے۔

"خیریت۔۔۔۔۔؟" اس کر دوڑتی کی نظر کرم ہماری سمت کیوں ہے؟" وہ سرد لہجے میں باپ سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا اس کے ہم پلہ لوگوں میں لڑکیوں کا کال ہے؟" اس نے مزید سوال کیا۔

صنفیہ کے منہ سے یہ سن کر کر رشتے کا طلب گار باپ کی عمر کا ہے؟ وہ منانے میں آ گیا تھا۔ اسی لئے اس کے تپ کر کے۔

"دیکھو میاں۔۔۔۔۔ اتن بھائی ہو اور یہ ماں مگر میں باپ ہوں۔ مجھے ایک کے بعد ایک نمٹانا ہے۔ اسی طرح اگر کوہ قاف لے شہزادوں کے انتظار میں بیٹھے۔ ہے تو یہ سب بیٹیں بیٹھی دکھائی دیں گی۔۔۔۔۔ سن رہے ہو۔" وہ گرم نگاہوں سے صنفیہ کو دیکھ رہے تھے مخاطب تھے۔

"سن رہا ہوں۔"

"مگر ہم اب اتنے بھی گئے گزرے نہیں کہ ہم پلہ رشتہ ڈال سکے۔" وہ رسوائیت سے گویا ہوا۔

"پھر ہر لڑکی کیلئے کم از کم ایک لاکھ نقد موجود ہونا ضروری ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"یہ خیال چند فراموشی قسم کے لوگوں کی وجہ سے عام ہے۔ ایک لاکھ۔۔۔۔۔ کوئی فارمولا کوئی قسم نہیں ہے۔" وہ ہنوز پست آواز میں باپ سے مخاطب تھا۔

"جب تک ہم کسی مستحکم پوزیشن کو نہیں ہار رہے ہیں تو ہوش کے ناخن لو احمقو۔" وہ ماں سے ایک ساتھ مخاطب تھے۔

"مگر ہم مفروضوں کی بنیاد پر انسانی زندگیوں سے نہیں کھیل سکتے۔ ہمیں کہیں سے بھی اس کی اجازت حاصل نہیں۔"

وہ دے دے برہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”مگر میں تمہاری یا اس بے وقوف عورت کی اجازت کا محتاج نہیں ہوں۔ آیا سمجھ میں.....؟“ وہ غیظ میں کف اڑا لگے تھے۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”میاں! احساس کے علاوہ روپیہ بھی درکار ہے۔“ وہ استہزائے انداز میں بولے۔

”وہ بھی آجائے گا۔“ وہ اب بھی نرمی سے کہہ رہا تھا۔

”ہاں بینک موجود ہیں اور مزید کل رہے ہیں۔ ڈاکے مارنا شروع کر دو۔“

انہوں نے طنزیہ مشورے سے نوازا۔

”میں یہ کام بھی کر سکتا ہوں۔ مگر اپنے گھر کے جیتے جاگتے زندہ لاشیں بنی نہیں دیکھ سکتا۔“

”دیکھو میاں!.....!“

”ہاں یہ ہے اگر تم عالمی کورٹ کا کیل بھی لاکھڑا کر دو میں کسی دلیل کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ سنا.....؟“

میں نے فیصلہ کرنا تھا سو کر لیا۔ زبان ہی ہے کوئی مذاق نہیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں گویا ہونے۔

”کس سے پوچھ کر آپ زبان دے آئے ہیں؟“ وہ مجھڑک اٹھا تھا۔

”میرے سب بڑے گزر چکے ہیں۔ میں بخیر ہوں۔ کل کے بچوں سے اور دو لکے کی عورت سے مجھے کسی قسم

اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔“

”کم از کم میری موجودگی میں آپ میری ماں کی قیمت مقرر کرنے سے پرہیز ہی کیا کریں۔“

اس کے ہنسا ہنسا ہنسنے لگے تھے۔

”ورنہ.....؟“ وہ ٹپٹپٹے ٹپٹے رکے اور کڑے تیوروں سے احسن کو گھورنے لگے۔

”ورنہ ہم آپ سے الگ رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

پتا نہیں کس طرح اس کے منہ سے اتنی بڑی بات نکل گئی تھی۔

”چر خوب.....!“

اگرچہ ان کی اتانیت اور مطلق العنانیت کو زبردست دھچکا پہنچا مگر وہ بظاہر طنزیہ مسکرائے۔

”تو ایسا کرو.....“

وہ شعلہ بارنگ ہوں سے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

”ابھی اور اسی وقت اپنا اور گمراہ والوں کا بور یا بستر اٹھاؤ اور جدھر سینگ سائیں نکل جاؤ۔ علاوہ ٹھیکہ کے۔“

وہ اس لئے کہ زبان دے چکا ہوں۔ بیٹی اسی کو دوں گا۔ چاہے تم زمین آسمان ملانے کا مجھڑ کر دکھاؤ۔“

لو..... قضیہ اپنی جگہ موجود..... وہ کیوں گمراہ والوں کو در بدر کرتا پھرے۔

”ابا جی!.....! اس نے اپنی انا کیل کر رسانیت سے مخاطب کیا۔

”ہم سب کو چھوڑیے۔ کم از کم ٹھیکہ سے تورا لے لیجئے۔“ ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے نیا لہجہ اختیار کیا۔

”وہ کیا کہے گی.....؟“

کیا کہہ سکتی ہے.....؟

میں دلی ہوں اس کا بخیر ہوں اس پر۔“ وہ غضبناک ہوئے۔

ابھی تو اب سے کچھ دیر پہلے کا احسن کا باغیانہ انداز نہیں بھول رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ کچا چا جائیں یا سر پھاڑ ڈالیں۔

”آپ ہر بات میں شریعت سے متعلق فروعی و نزاعی مسائل اٹھاتے ہیں۔۔۔“

اس سلسلے میں بھی تو شریعت کا واضح حکم موجود ہے۔“

اس نے باپ کی دھکتی رنگ پر ہاتھ رکھا۔

شیخ رحیم الدین بری طرح بلبلاتا آئے۔

اتنی گستاخی..... اتنی بے ادبی..... اس نے ان کا تاج پیردوں میں لاد رکھا تھا۔

”بے ادب..... گستاخ!..... اتنا بھی نہیں جانتا کہ ماں باپ کے اختیار ہر رشتے سے بھی بڑھ کر ہیں۔“

وہ ہچکھاڑے۔

آپ خود کہہ رہے ہیں۔ ”ماں باپ۔“ اس نے نکتہ پکڑا۔

ماں کی مظلومیت اسے کج بخشی کے راستے پر لے آئی تھی۔

شیخ رحیم الدین کا بس نہ چلا کہ اپنے بال لوچنے لگتے۔

”ارے بے وقوف..... فلاں..... اور فلاں۔“

وہ بدکلامی پر اتر آئے ہمیشہ کی طرح۔

”تمہاری ماں پر لے درجے کی جاہل اور بے وقوف عورت ہے۔ اس سے مشورہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”آپ کی زیادتیاں سننے والی ہستی کی حیثیت سے تو لانا ثانی ہیں۔ یہ تو مان لیں۔“ وہ بولا۔

”یہ فرزند ارجمند پیدا کیا ہے تم نے۔ یہ کمانڈر انچیف ہے تمہاری اولاد کا.....؟“ وہ صغیر پر اڑت پڑے۔

”لگا دو ان سب کو میرے پیچھے چار سو تیس عورت..... یہ جال بچائے ہیں چپکے چپکے.....؟“ وہ جنونی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ تو احسن کی کج بخشی پر تپ رہے تھے۔ جسے کج بخشی تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔

ایک ذمہ دار جوان بیٹے کی حیثیت سے وہ گھر کے معاملات میں مداخلت کرنے کا حق رکھتا تھا۔

وہ اتنا آگے کیوں آیا تھا۔

اس میں سارا قصور شیخ رحیم الدین کی ”مغل اعظم“ قسم کی مطلق العنانیت کا تھا۔ اگرچہ وہ ہر زیادتی پر خاموش رہا تھا۔

مگر صغیر اور ٹھیکہ کا اتنا زبردست استحصال اس سے برداشت نہ ہو سکا تھا۔

”میں آپ سے صرف اتنا کہہ رہا تھا کہ آپ ان کی بھی سنیں۔ انہیں بھی ٹھیکہ کی ماں کی حیثیت سے حق دیں کہ یہ اپنی

رائے دے سکیں۔“

”تمہاری سات پشتوں میں کبھی عورت کو اتنا سر نہیں چڑھایا گیا۔ اب کیا سورج مغرب سے نکلنے لگا ہے؟“

وہ پیش بھرے لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

”آپ کی نظر میں اگر عورت فاتر افضل ہے اور صاحب الرائے نہیں ہے تو پھر میری طرف آجائے۔

میں مرد ہوں..... آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ سے ہوں۔ ٹھیکہ کا بھائی ہوں۔ پھر میری رائے پر غور کیجئے۔“

یہ مضبوط دیوار ایک دن میں تو نہیں بنی ہے۔  
بلکہ ابھی یہ دیوار مکمل ہی کب ہوئی ہے۔  
اگر دیوار مکمل چودھوی گئی۔

تو شیخ رحیم الدین کے باجوج ماجوج پہلے سے کہیں زیادہ فساد چائیں گے۔  
اور بدل ہے میرا پتھر تو نہیں۔

”خبردار جوتم نے ایک قدم بھی بڑھایا۔“  
انہوں نے احسن کا بازو جھجھوڑا۔

”ای..... مجھے خبر دو کہ۔ میں سب کچھ سہہ سکا ہوں مگر اس قسم کی بات برداشت نہیں کر سکتا۔“  
وہ بازو چھڑا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

صفیہ دیوانہ وار اس کے پیچھے دوڑیں۔ ”احسن..... بات سنو میری۔“  
احسن اپنے کمرے میں آکر کچھ چیزیں سینے لگا۔

نانکلاس کے پیچھے دوڑی دوڑی آئی تھی۔

”احسن بھائی! خدا کیلئے نہ جائیں، میں آپ سے بہت ڈھارس رہتی ہے۔“

”جب ماں کی عزت کا سوال ہو تو زہری لپی لیتا چاہئے۔ میں تو صرف گھر سے ہی جا رہا ہوں۔“  
وہ نانکلا کی سمت دیکھ کر بغیر ہی کہہ رہا تھا۔

”ارے وہ تو بہت شاطر ہیں۔ اسی طرح نشانے لگا کر گالیاں دیتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے سدا ٹوٹی پھوٹی رہوں۔  
مجھے کوئی سہارا نہ دے۔“

”تم ان کے منصوبے کو کیوں کامیاب بنا رہے ہو.....؟“ صفیہ اس کے بستر پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔  
”ای! آپ حوصلہ رکھیں۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ مجھے ایسا ماحول چاہئے جہاں میں پرسکون دماغ کے  
ساتھ اس جنم سے آپ لوگوں کو نکالنے کے بارے میں سوچ سکوں۔ میں آپ سے دور نہیں ہوں۔ گھبراہٹ نہیں۔“  
”ارے میں مر جاؤں گی۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

”احسن بھائی! آپ شاید ہم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا بہانہ چاہ رہے تھے۔“ نبیلہ نے روتے ہوئے گویا طنز بھی  
کیا۔

احسن ایک دم چونک سا گیا۔

”یہ بات نہیں ہے۔ بلو۔ مجھے کچھ کر لینے دو۔ اس ماحول میں میں تم لوگوں کے کسی طرح کا نم نہیں آسکتا۔“

اس نے باپ کی گالی کا ذکر بہنوں کے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھا اور دلا سادیا۔

”تم بدگمان مت ہو۔ میں ایک پراسٹن اور پرسکون ماحول میں رہ رہا تھا۔

تایا جان کے انتقال کے بعد جب میں اس گھر میں داخل ہوا۔ تو مجھے زندگی کی کڑواہٹ کا اندازہ ہوا۔ پھر بھی۔ چندہ  
بلک سے تمہارے ساتھ ہوں۔

چھٹکارا پانا ہوتا تو اتنا طویل کیسے گزارا کر لیتا.....؟ مجھے کچھ کر لینے دو۔“

وہ سب حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”میں بچوں کو اتنی اہمیت دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ میرا دماغ مت چاٹو۔ فیصلہ ہو چکا۔“ انہوں نے قطعی انداز  
میں بات مکمل کی۔

”ہماری مرضی شامل ہوئے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ غماظر آیا۔  
”یہ وقت بتائے گا۔“ وہ بولے۔

اور وہ وقت بھی نہیں آئے گا۔“ وہ بھی فیصلہ کن انداز میں بولا۔

”احسن.....! میں نے بہت برداشت کیا ہے۔ اب حد ہو گئی ہے۔ اتنی بات تو کبھی میرے باپ نے مجھے نہیں کہی۔  
دراصل یہ سارا قصور اس عورت کا ہے۔ اس نے بچوں کو میرے خلاف بہت خاموشی سے تیار کیا ہے۔ مگر میں نپٹ لوں گا۔  
مگر پہلا کام تم یہ کرو کہ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔“ وہ دھماکے سے۔

”ارے غضب خدا کا۔ ایک آفت کے بعد دوسری۔ وہ کیوں جائے.....؟“  
صفیہ بلبلاتا کر کھڑی ہو گئیں۔

مگر شیخ صاحب نے جیسے بیوی کی بات نہیں سنی۔ بدستور احسن کو گھورتے رہے۔  
دوسرے جھکائے کھڑا تھا۔

”تم نے سنا نہیں.....؟“ ان کا زہر اشنک ہو گیا۔

”کہیں نہیں جائے گا۔“ صفیہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بمشکل ہس کے سینے تک آ رہی تھی۔

”میں کہہ رہا ہوں فوراً اسے بے دخل کر دو۔“ وہ پھر دھماکے سے۔

انہوں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ انہیں احساس ہو چلا تھا ان کی شہنشاہیت کے دن اس کے ہاتھوں پورے ہو  
جائیں گے۔ ایک ضرب کلیم لگا چاہتی ہے۔

اور اپنی اس حاکمیت کیلئے وہ ہر شے قربان کر سکتے تھے۔

احسن بدستور اپنی جگہ خاموش کھڑا تھا۔

”اگر جوتم مجھ سے ہو۔ راقی میری اولاد ہو۔ تو ایک منٹ یہاں نہیں رکو گے اور میرے بیٹے جی اس گھر میں داخل نہیں  
ہو گے۔“

وہ بہت کچھ کر سکتا تھا مگر اپنی ماں پر چھینے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

”ٹھیک ہے البتہ! اسے ماں سے از حد شرم آ رہی تھی۔

”میں جا رہا ہوں۔ اس لئے کہ میں واقعی آپ کی اولاد ہوں۔ مگر وہ جو ظلم آپ کرنے جا رہے ہیں۔ وہ میرے گھر  
سے باہر جانے کے بازو نہیں ہونے کا۔“

صفیہ بے قرار ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

اتنے برسوں بعد سوکھے دھاتوں پر پانی پڑا تھا۔

اتنے برس بعد ٹھنڈی ہوائیں آئی تھیں۔

مشقت و تکلیف کا ایک ایک لمحہ قرن پر بھاری ہوتا ہے۔

یہ مضبوط دیوار۔

انہوں نے بیٹے کی سمت دیکھا۔

وہ اصرار کے نزدیک آیا۔

”ہم ملتے رہیں گے۔“

”اس وقت کہاں جاؤ گے؟“ منیہ یاس بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

”میں اس سے بڑی گالی بھی برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر تم سے دوری میری جان لے لے گی۔“ منیہ کا کلیجہ پھٹا جا

تھا۔

”خدا نہ کرے ای۔ حوصلہ رکھیں۔ میں شیخ رحیم الدین صاحب کا بیٹا ہوں۔ مجھے ثابت کرنے دیجئے۔

اگر میں بھی ان کی ذات سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تو اتنی زندگیاں بے موت مرجائیں گی۔ آپ میرے علاوہ

سب کے بارے میں بھی تو سوچئے۔

ای۔ شیخ صاحب کا معالج انہی کے گھر میں سے برآمد ہونا چاہئے۔“

کوئی اور وقت ہوتا تو منیہ اس قسم کی صورت حال کبھی برداشت نہ کرتیں کہ بیٹا باپ کو باجی کہنے کی بجائے

صاحب کہے۔

وہ بہت رکھ رکھاؤ والے خاندان سے تھیں۔ جائز زبان کھولنا بھی ان کے ماحول میں گستاخی اور بے ادبی تھی۔

یہ اس وجہ سے تھی کہ خاندان میں سب کچھ تھا مگر اتھمال اور خود غرضی نہیں تھی۔

حقیقت میں انہوں نے کبھی احسن کو باپ کے مقابل لانے کی شعوری کوشش نہیں کی تھی مگر وہ ہوشمند انسان تھا۔

چند دنوں بعد تمیں کی سرحد بھی پھلا کٹنے والا تھا۔

اس کا دینگ لہجہ۔

دو ٹوک رو یہ۔

اتھنا پسندی پر مبنی مزاح۔

انہیں ہولایا کرتا تھا۔

وہ ڈرتی تھیں کہ۔۔۔ کہیں وہ کسی دن باپ کے سامنے نہ اکھڑا ہو۔

میکنا وجہ تھی کہ وہ کبھی شیخ صاحب کی رپورٹنگ بیٹے سے نہیں کرتی تھیں اور بیٹیوں کو بھی پختی سے تاکید کی تھی کہ وہ باپ

کیخلاف بھائی سے کوئی بات نہیں کریں۔

مگر وہ جیتا جاگتا باشعور انسان تھا۔ اندھا بہرہ گوگنا نہیں تھا۔

اس نے بہت ابتدا میں اندازہ لگا لیا تھا کہ اس گھر میں زندگی کا چہرہ خاصا مختلف ہے۔

وہ سوٹ کیس اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

وہ سب پیچھے پیچھے روتی ہوئیں آئیں۔

بات کیا تھی۔

موضوع کیا تھا۔

اور واقعہ کیا ہو گیا تھا۔

ٹکلیہ کرے میں بیہوش پڑی تھی اور کسی کو پتا نہ تھا۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی شیخ صاحب!“ منیہ درود کر دی اپنی مورہی تھیں۔

”ارے کیا کسی کا جنازہ اٹھ رہا ہے جو اس قدر رونا دھونا ہو رہا ہے۔“

شیخ رحیم الدین کی دھاڑ سے گھر لرز اٹھا تھا۔

”میرے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے شیخ صاحب! تمہیں اللہ سمجھے۔“

انہوں نے شیخ صاحب کی آواز سن کر مزید سنگ کر جیسے بدو عادی تھی۔

وہ جاچکا تھا

اور وہ حواس باختہ سی ادھر ادھر پھر رہی تھی۔

ایک ہی سوال ذہن میں گردش کر رہا تھا کہ۔۔۔

کیا ہوگا۔۔۔؟

آگے سرکتا ہوا ایک ایک لمحہ جیسے نوئے قتل لئے جا رہا تھا۔

فتیں اس کی کر لی تھیں۔

خوشامدیں اس کی کر لی تھیں۔

دھمکیاں اسے دے کر دیکھ لی تھیں۔

وہ کون سا حربہ تھا جو آزمایا نہیں تھا۔

اس کے کپڑے پہن کر عجیب و غریب حلیہ بنا لیا تھا۔

پھر بھی دل میں ایک موہوم ہی امید تھی۔

ایسی امید جو جاں بلب تک کو میسر آ جاتی ہے۔

پھر اس پر مستزاد گھر بھر کی بربانی کا خیال اسے مزید بدم کئے دے رہا تھا۔

اس کی ماں تو جانبر نہ ہو سکے گی۔

ماں کا خون گویا اس کی گردن پر ہوگا۔

آخر ایسے بے درد کو ول دینے کی حماقت بھی تو کی تھی۔

بھاگ کر وہ ان سے جا بھی ملی تو کیا ہوا۔

وہ اس کی عجوبہ بنی نہیں منکوحہ بھی ہے۔

وہ آئندہ مرحلے میں مزید اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔

وہ اس کی دسترس سے کسی طرح دور نہیں۔

وہ جانے کب تک ٹپکتی رہتی۔

گیٹ کی کھڑ پڑ سنائی دی۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اگرچہ سورج غروب ہونے میں خاصا وقت تھا۔

مگر اس کا دل ایک الگ اٹھان میں غروب ہو رہا تھا۔

”کب سے مارچ پاسٹ جاری ہے؟“

وہ اس کے سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا۔



وہ لرز کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

وہ بخور اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

محض ایک رات میں اس کے چہرے کے چراغ بجھ کر رہ گئے تھے۔

آنکھوں کے گرد حلقے بہت واضح تھے۔

روبوکر پوٹے ٹیبلٹ متورم تھے۔

”یہ تمہارے کپڑے ہیں۔“ احسن نے چند ٹکٹ اس کے سامنے ڈال دیئے۔

”ایک لباس فاخرہ بھی ہے جو آج رات کے لئے تمہیں زیب تن کرنا ہے۔“

اگرچہ روایتی ہنگامہ ہمیں میسر نہیں۔ مگر دل کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔“

شہوار کی جان چنے کی طرح لرزنے لگی۔



”لو کی کو دلہن بناتے وقت پورا پورا سجاایا جاتا ہے کہ وہ کسی کی زندگی میں فیاضت برپا کر دے۔ تم تو پہلے ہی میرے دل میں ہنگامہ محشر اٹھا چکی ہو۔ مگر..... ایک چیز دو آئندہ بھی ہوتی ہے۔“

وہ مسکرا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”باقی باتیں روایتی ہوں گی۔ اور روایتی جگہ پر ہوں گی۔“

اس نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دھپایا اور لائٹرز کا شعلہ دکھایا۔

اس عمل کے دوران وہ کن اکھیوں سے اس کا جائزہ بھی لیتا رہا۔

شہوار کی پیشانی عرق آلودھی اور تھیلیاں بھی پسینے سے تر تھیں۔

”احسن.....!“ اس کی کانچی ہوئی آواز ابھری۔

”جناب!“ اس نے صوفے سے ٹپک لگا کر اسے دلچسپی سے دیکھا۔

”آپ اگر مجھے اپنا کہتے ہیں اپنا سمجھتے ہیں تو میری صرف ایک بات سن لیجئے۔“

”جملہ شرطیں مگر اہم ہے۔ سناؤ وہ کیا بات ہے جس کیلئے تم نے اتنا لمبا جملہ تیار کیا ہے۔“

اس کی آواز شہید کی کالبادہ اوڑھ چکی تھی۔

”میں آپ کی عزت ہوں۔ میرے حوالے سے جو بھی رشتہ ہے وہ بھی آپ کے لائق عزت ہونا چاہئے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”وہ تو ہے۔“ احسن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کہاں ہے۔ آپ کا صرف تجلّی پر ٹیکٹ ہے۔ عمل نہیں۔ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ وہ ہم سب کی روسیای کیلئے کافی ہے۔“

”میرا تم سے نکاح ہوا ہے۔ یہ بات سارا زمانہ جانتا ہے۔“ وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔

”مگر کمر سامنے کا یہ پرو۔ سحر (طریقہ کار) ایک دم غلط ہے۔ اس عمل کی ساری زندگی میرے چہرے پر ہمیشہ کیلئے لگ جائے گی۔“ وہ بولی۔

”مگر میرے پاس اس کے سوا دوسرا راستہ نہیں ہے۔ اور یہ راستہ بھی مجھے تمہارے اور اپنے بچوں نے دکھایا ہے۔“

بہ درہم ہوا۔

”کیا آپ کو مجھ پر حقوڑا سا بھی اعتبار ہے.....؟“ وہ لجاجت سے پوچھ رہی تھی۔

”بھئی تھا۔“ وہ بیکھائی سے بولا۔

”مگر جب تم نے میرے بجائے اپنے والدین کا ساتھ دینے کا اعلان کیا تو وہ ختم ہو گیا۔“

احسن نے ہاتھ آگے کر کے سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔

”بھری جگہ کوئی بھی ہوتی تو وہ بھی کرتی۔ والدین زندہ حقیقتیں اور پائندہ محبتیں ہوتے ہیں۔ میری زندگی اور پابندی کے بارے میں بھی سوچئے۔“

”کوئی ظلم پڑھ کر۔ مجھ پر بھونکنے تاکہ میں اپنی ذات فراموش کر کے کاٹھ کا آئینہ جاؤں۔“

وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر طعنے انداز میں گویا ہوا۔

”میرا آپ کی محبت پر ایمان ہے۔ مجھے آپ کی شدتوں کا احساس ہے۔ میری صرف ایک بات مان لیجئے صرف ایک بار مجھ پر احسان کر دیجئے۔ آخری مرتبہ۔“

وہ منت سے بولی۔

”فرمائیے“

”مجھے چھوڑ آئیے۔ جو چاہے مجھ سے قسم لے لیجئے۔ میں صاف کہہ دوں گی کہ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔

آخر اس سے پہلے بھی تو جاہد بھائی کے پرد پوزل کے مقابلے میں میں نے آپ کیلئے آواز اٹھائی تھی۔

آئندہ مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہوگی جس سے آپ کی دل آزاری ہوتی ہو۔ میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کر دوں گی۔“ اب انگٹ اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔

بہت سارے محبت آمیز لمحات احسن کی نگاہوں میں جھلک رہے تھے۔

”اگر جو پھر تم نے مجھ سے چال چلی.....؟“

”مجھے اس کا انجام پتا ہے۔“ شہوار کا دل اس کے بدلے ہوئے لیجے پر خوشی سے دھڑکا۔

احسن چند لمحوں کی صورت دیکھ کر ہانپا ہوا تھا کہ باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں واپس آیا۔ تو ایک لیٹر پیڑ اور قلم اس کے ہاتھ میں تھا جو اس نے شہوار کی سمت بڑھا دیا۔

”لکھو۔ جو میں لکھو رہا ہوں۔“

شہوار نے دونوں چیزیں جلدی سے تمام لیں۔ البتہ چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہو گئے۔

”لکھو۔“ وہ بخیرگی سے گویا ہوا۔

میں ڈر شہوار بنت سردار محبت علی خان ہر صورت اپنے شوہر احسن شیخ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ایک عاقلہ

اور بالآخر حیثیت سے مجھے اختیار دیا جائے کہ میں اپنے شوہر کے ہمراہ ازدواجی زندگی گزار سکوں۔

میرے والدین مجھے اپنے شوہر کے پاس جانے سے روک کر جس بے جا کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مجھے اس

سلسلے میں قانون سے مدد چاہئے۔ مجھے امید ہے ایک آزاد ملک کی آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے

بھرپور قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ شکریہ۔

نقطہ در شہوار بنت سردار محبت علی خان زوجہ احسن شیخ

”مجھے دستخط کرو۔“ احسن کی پر حکم آواز گونجی۔

شہوار نے جلدی سے دستخط کر دیئے۔

”چلو۔“ احسن نے کاغذ لیٹر پیڑ سے علیحدہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔

اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ جیسے وہ امید بھرا کوئی پستانہ دیکھ رہی تھی۔

ایک ننگ اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”آخری بار تجھ پر اعتبار کر رہا ہوں اس لئے کہ اپنی طاقت سے واقف ہوں۔ چلو اٹھو۔“

وہ اسے دیکھے بغیر بولا۔

خوشی سے در شہوار کی ٹانگیں کاٹنے لگی تھیں۔ اس پر ہنوز بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔

..اہر کا سمت بڑھا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا گیٹ کی سمت جا رہا تھا۔

”احسن!“ شہوار نے اسے پکارا۔

وہ رک گیا..... اب کیا ہے؟“ وہ وہیں کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”مجھے لباس تبدیل کرنے دیں کہ.....“ وہ چپ ہو گئی۔

”تو پھر جلدی کرو۔“ وہ واپس آتا ہوا بولا۔

وہ بھرتی سے کمرے میں گھس گئی۔ پورے وجود میں جیسے بجلی دوڑنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آتش گاہی سوٹ میں ملبوس باہر آئی۔ احسن کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اسے سامنے

یکے کر فوراً گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔

وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

احسن گیٹ کے پت کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ شہوار گاڑی باہر نکلنے تک وہیں پورچ میں کھڑی رہی۔ احسن نے

اڑی باہر نکالی۔ پھر گاڑی سے اتر ادر گیٹ میں تالا ڈالنے لگا۔ شہوار اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

احسن ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا جیسے سگریٹ جلدی ختم کرنا چاہتا ہو۔ پھر جابی

لٹھائی۔ گاڑی اشارت کی اور سیدھی سڑک پر ڈال دی۔ وہ اگلے مرحلے کا انجام سوچے بغیر انتہائی خوشی کے عالم میں کھڑکی

سے باہر دیکھ رہی تھی۔

”جب تم میرے ساتھ آ رہی تھیں تو دور ہی تھیں۔ اب والدین کے پاس جا رہی ہو تو بڑی خوش ہو۔“

احسن نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”یہ تو صورت حال پر منحصر ہے کہ ہنسنا ہے یا رونے ہے۔“ وہ اعتماد سے گویا ہوئی۔

”مگر اس سے یہ بھی تو ثابت ہوتا ہے کہ تمہیں میری کوئی پروا نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”پھر کیسا ہے؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بول رہا تھا۔

”ہر شخص کی اپنی الگ اہمیت ہوتی ہے۔“ وہ بولی۔

”یہ کب ثابت کرو گی؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”انشاء اللہ بہت جلد۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”دیکھیں گے۔ اگر تم کچھ ثابت نہیں۔“ کئیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم تو کچھ نہ کچھ ثابت کر ہی دیں گے۔“ اس کا لہجہ معنی

نہ تھا۔

شہوار ایک دم چپ سی ہو گئی۔

”فطر تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے، نوبت آئی تو پوری فلم بھی دکھا دیں گے۔“ وہ بدستور دھمکی کی زبان میں بات کر رہا تھا۔

جیسے ہی گاڑی اس کے علاقے میں داخل ہوئی، شہوار کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ تمام گھر والوں کے چہرے نظروں

کے سامنے گھومنے لگے۔

اس کی واپسی پر گھر والوں کا رد عمل کیا ہوگا.....؟ یقیناً وہ خوشی سے بے قابو ہو جائیں گے۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”گاڑی تمہارے گیٹ کے سامنے روکوں یا سبیل اتار دوں؟“ احسن کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

”نہیں نہیں۔“ بس مجھے یہیں اتا دیں۔“

”گیٹ کے سامنے اترنے میں کیا حرج ہے؟“ احسن نے پوچھا۔

”کہیں.....“ شہوار نے کسی خدشے کا اظہار کرتا چاہا۔

”تمہارے بھائی مجھے جان سے نہ مار دیں، یہی سوچ رہی ہوتا؟“ وہ ہنسا۔

”مگر میں تمہارے گھر کے سامنے اتاروں گا۔ ہارن بجاؤں گا تاکہ وہ دیکھ لیں کہ میں تمہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“

اس نے ایسا ہی کیا۔

شہوار گاڑی رکھتے ہی دروازہ کھولنے لگی۔ احسن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دروازہ کھولنے سے روکا اور مسلل

بجاتا رہا۔ چند لمحوں بعد گیٹ کھلا۔ نفل کا چہرہ نظر آیا۔ احسن نے شہوار کو اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اتر گئی۔

نفل گیٹ سے باہر آچکا تھا۔

شہوار کے اترتے ہی احسن نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔ ایک گہری نظر نفل پر ڈالی اور تیزی سے گٹایا گئے

دی۔

نفل حیران و ششدر شہوار کو دیکھ رہا تھا۔

”آپا.....!“ وہ جیسے کسی گمان کے زیر اثر تھا۔

وہ بھاگ کر گیٹ پار کر گئی۔

سامنے سے نیلوفر آتی دکھائی دی۔ وہ الگ ہکا بکا کھڑی رہ گئی۔

”شہوار.....“ وہ بے یقینی کی کیفیت میں آگے بڑھی۔

شہوار اس کے سینے میں لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چند لمحوں کے اندر اندر کاریڈور میں انسانوں کی بھیڑ

گئی تھی۔ اس کی ماں کی نازک حالت کے سبب تمام قریبی رشتے دار گھر میں موجود تھے۔

”ارے اندر عائشہ بیگم کو بتاؤ..... شہوار آگئی ہے۔“ اس کی ممانی سے بولیں۔

”بتانے کے بجائے شہوار کو فوراً ان کے کمرے میں لے جاؤ۔“ ماموں نے بیوی کی بات سے اختلاف کیا۔ جو۔

پے سوالات کی زد میں تھی۔

نیلوفر فوراً شہوار کو لے کر ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

تمام رشتے دار جھپٹی ہوئی اور سوالیہ نظروں سے جاتی ہوئی شہوار کو دیکھ رہے تھے۔

جیسے جیسے اندر اترنے لگا صفیہ کی حالت اس مریض کی سی ہو گئی جسے زندگی کی کوئی امید دلا سے کو نہ ہو۔ جیسے

جانے والا سوار صحرائیں حیران و پریشان کھرا ہو۔ جیسے جانے پناہ طوفان کی زد میں۔

یا پھر۔ جیسے کوئی بھرا گھر آنکھوں کے سامنے لٹ جائے۔ پھر دل قابو میں نہ آئے۔

وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں یوں چپ بیٹھی تھی جیسے میت کے سر ہانے بیٹھی ہوں۔ آنے جانے والوں کو

نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”احر.....!“ احمر پاس سے گزرا تو انہیں پھر ایک خیال آیا۔

”جی امی.....!“

”جینے! بھائی کو فون کر آؤ..... میں کچھ دیر اس قلعے سے نکلنے کی کوشش کروں گی۔“

”امی! بھائی جان آف ہو چکے ہوں گے۔ ان کے گھر پر فون نہیں ہے۔“

”اچھا تو جینے کر اپنی اپنی خالہ کو ہی کر آؤ۔ وہ احسن کو پیغام دے دیں گی۔“

”امی..... آپ کو پتا ہے خالہ جان کا اب احسن بھائی سے کوئی رابطہ نہیں۔“ اس نے ماں کو یاد دلایا۔

”احر جینے.....! تیری بہن زعدہ دفن ہو رہی ہے تجھے احساس ہے اس کا..... کچھ نہیں کرے گا تو۔“ چودہ پندرہ سال

سے احمر نے ماں کو بلکتے دیکھا اور اس کا سہا ہونے جھلے۔

جی..... صرف ایک اختیار ہے میرے پاس۔“ وہ بڑی بردباری سے گویا۔ ”وہ یہ کہ میں آنے والے کو جان سے مار

دوں۔“

صفیہ ہل کر رہ گئی۔

ایک نہیں..... دو نہیں..... تین نہیں..... زخموں کے طویل سلسل۔

”ایسی باتیں نہیں کرو احمر۔ اللہ تمہیں ہر آفت سے اپنی پناہ میں رکھے۔“

دیوانی ہو رہی ہوں۔ میری بات کا خیال نہیں کرو..... جانے کیا اول فول بک رہی ہوں۔ نہ دل ٹھکانے ہے نہ

دماغ۔“ انہوں نے سر آہ بھری۔

مغرب کی نماز سے سب لوگ فارغ ہو چکے تھے۔

نبیلہ ناکہ زار و قطار روتے ہوئے کچن میں کھانا تیار کر رہی تھیں۔ ہر بار و کال بیل کی آواز پر کچن بند کر آ جاتا تھا۔ ٹھیکہ

کے چہرے پر الہست سکون کا عالم تھا۔ وہ انتہائی مطمئن نظر آ رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ اس کی معمولی سی کمزوری ماں کے کمزور

دودھ میں پھر کوئی طوفان برپا کر سکتی ہے۔

یا پھر اس نے خود کو کھالیا تھا۔

وہ اس مجاہد کی کیفیت اپنے اوپر طاری کر چکی تھی جو کسی عظیم مقصد کیلئے جذبہ شہادت سے مجرم میدان جنگ میں اترتا

ہے۔

اس کو پرسکون اور معمول کی حالت میں دیکھ کر احمر اور تمام بہنیں حیران و ششدر تھیں۔

ناکہ بریانی پر براؤن پیا ز چمڑک رہی تھی۔ ٹھیکہ کچن میں داخل دی۔

”نبیلہ..... بہنیں ایسی ہوتی ہیں جیسی تم لوگ ہو۔ اما جی نے تم سے کیا کہا تھا کہ کسی سبکی وغیرہ کو بانا چاہو تو بلالینا۔“

میری انکوئی سبکی جو چار قدم پر رہتی ہے تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ اسے بلوالیتیں اور بلو اتم اتنی خوبصورت مہندی لگاتی ہو۔ تم

سے اتنا نہ ہوا کہ میرے ہاتھ میں مہندی لگا دیتیں۔ شادی ایک باری تو ہوتی ہے۔“

”خدا کیلئے باجی۔ چپ ہو جائیں۔ چپ ہو جائیں۔“ نبیلہ اس کے گلے گل بٹک کر رو دی۔

”نو کیوں رہی ہو۔ خود کو سنبھالو۔“ ٹھیکہ کا ضبط حیرت انگیز تھا۔ ”میں اتنی دیر سے خطرہ کی کادی یا تم میں سے کوئی آکر

مجھ سے کہے گا کہ باجی غسل کر لیجئے۔ مگر نہیں تم لوگ کیا سوچ رہے ہو! ہمہاں غسل کرنے جا رہی ہوں۔ بیلا..... چندا

زنا مہندی کا عرق ہی نکال لو۔ عرق سے ہی کوئی ڈیزائن بنا دے گی بلو۔“

وہ سب اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے ٹھیکہ کا ڈنڈا تو ان پر گڑ گیا ہو۔

”سنا نہیں بیلا۔ دیر ہو رہی ہے۔ تم کھڑی شکل دیکھ رہی ہو۔“ وہ قدرے ناراضگی سے گویا ہوئی۔ ”مہندی کا پاؤ ڈر رکھا

ہوا تو ہے۔ امی سر میں لگاتی ہیں۔

بہنیں تو رکھتی ہیں امی۔“ وہ ایک الماری کو جھانکنے لگی۔

”یہ۔“ اس نے ایک چھوٹا سا جاکٹا نکال کر بیلا کے ہاتھ میں تھمایا۔ ”اچھا میں نہانے جا رہی ہوں۔“

وہ عام سے انداز میں کہہ کر کچن سے باہر نکل گئی۔

”آپا..... عرق لگا لوں یا.....“ بیلا نے نیلہ کی سمت دیکھا جو انتہائی ڈکھ سے نکلیہ کو جاتا دیکھ رہی تھی۔

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ آخر باجی کی شادی ہو رہی ہے۔ مہندی تو لگنا چاہئے۔ کتنی عقل مند ہیں نکلیہ باجی ہا۔

مشکل آسان کر دی ہے۔ ورنہ ہم سے کسی کی ہمت تھی کہ باجی کو مہندی لگانے کا مشورہ دیتا۔“

”پتا نہیں وہ بڑھکا کیسا ہے؟“ نائلہ بھل کر پوچھی۔

”کجھت کو ایک دو سال بعد بھی تو مرنے ہے۔ جلدی میں نہیں مرسکتا تھا۔ آگیا ہمارے گھر کے شعلوں کو مزید ہوا دینے

نیلہ نے بھی دل کی ہمزاس نکالی۔

”بیلا! احمر سے کہو اسماء باجی کو بلالائے۔ شاید باجی اپنی کیکلی سے ہی کچھ کہنا سنتا چاہتی ہوں۔“

یوں لگا جیسے کسی مرنے والے کی آخری خواہش کا احترام ہو رہا ہو۔

جتنی دیر میں اسماء آئی۔

اور جتنی دیر میں مہندی کا عرق نکلا نکلیہ کا غسل تمام ہوا۔ اس دوران دل ماتم کدہ بنے رہے۔

چمن۔ چمن۔ چمن۔ نائلہ نے باہر کی سمت کچن سے جھانکا۔

نکلیہ اپنے خوبصورت اور کھیلے ہال تولے سے جھاڑ رہی تھی۔

اس نے نائلہ کو اپنی سمت دیکھتا پکارا ہنگسی سے مسکرا کر پوچھا۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”چھوٹے کمرے میں ہیں۔“ نائلہ نے انفرادی سے جواب دیا۔ اسے نکلیہ کی مسکراہٹ سے خوف آیا۔ اسماء آ۔

ہی نکلیہ سے لپٹ گئی۔

”اتنی آفت کیوں؟ آرام سے شادی نہیں کر سکتی تھیں بدتمیز ابو بھلا اکلوتی لاڈلی کیکلی۔ وہ بھی اس قدر جلت میں دا

مفارت دے رہی ہے۔ سچ میں کبھی احمر مذاق کر رہا ہے۔“

”اچھا یہ تو بتا کیسا ہے وہ بے صبرا۔“ اسماء نے سرگوشی کی۔

”دیکھا تو نہیں ہے۔“

باجی کا انتخاب ہے اس لئے یقیناً واقع ہے کہ اس کے آباؤ اجداد کا سلسلہ قیصر و کسریٰ سے ہی ملتا ہوگا۔“ نیلہ۔

اسماء کی بات سن کر امی نے ان کے قریب آ کر انتہائی کچی اور مٹھے سے کہا۔

اسماء بے تحاشا چونک پڑی۔

”یعنی؟“ وہ نیلہ کے انداز پر متحیر و پریشان ہوئی۔

”یعنی یہ کہ ابھی تو ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ اتفاق میں برکت ہے اور اللہ کا ہاتھ بھی جماعت پر ہے۔ سب اکٹھے

دیکھ لیں گے بشمول آپ کے۔“ نیلہ مٹھے پر ہنسی بھری ہنس پڑی۔

”کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔ چھوڑو تم اسے آؤ میرے ساتھ۔“

”عرق تولے آؤ۔ مہندی تو لگا دو کم از کم۔“ نکلیہ نے نیلہ کو پھر جتایا۔

اسماء ہانکائی نکلیہ کو دیکھ رہی تھی۔ لان کے سادہ سے آسانی سوٹ میں وہ گھڑی گھڑی بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔

مگر باجی کس طرح کی کر رہی تھی۔ عجیب و غریب خودی مہندی لگانے کو کہہ رہی ہے۔ ہوتا یہ کہ بہنیں اصرار کرتیں۔

پھر نکلیہ جیسی کم کم اور شرعی لڑکی۔

وہ بہت کچھ جاننے کو بے تاب ہو گئی۔ جس کیلئے لازم تھا کہ وہ نکلیہ کے ساتھ تیار ہوتی۔ مکمل تو وہ خیر اسی وقت گئی تھی

جب احمر سے بلانے آیا تھا۔ شیخ صاحب سے وہ بھی بخوبی واقف تھی مگر نیلہ نائلہ انیلا کے مٹھے۔ نکلیہ کا اطمینان اسے الجھن

میں ڈال رہا تھا۔

”آپا.....!“ احمر کچن میں آیا۔

”ہوں۔“ نیلہ نے ہنکارا بھرا۔

”وہ لوگ آگئے ہیں۔“

دھکنا نیلہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ جوں جوں رات ہو رہی تھی اس دیری پر اس کے دل میں مہو مہی امید روشن

ہوا شروع ہو گئی تھی۔ شاید بڑھاپا ہو گیا ہو شاید اس کا مارے خوشی کے بلڈ پریش ہو گیا ہو۔ پھر شاید ڈاکٹر نے کہا ہو

کہ..... مگر..... طلسم الٹا ہو گیا۔ اسے واقعی شاک لگا تھا۔

”آگئے.....؟“ وہ احمر سے پوچھ رہی تھی۔ ”کتنے لوگ ہیں؟“ اس نے جھک کر ڈھکنا اٹھایا۔

”دو کار ہیں۔“ پانچ چھ آدمی ہیں۔“ وہ اطلاع مجھ پہنچا کر باہر نکل گیا۔

”امی کو بتا دوں آپا۔“ بیلا بھاگتی ہوئی کچن میں آئی۔

”خدا کیلئے ان کے پاس بھی نہ جانا تم۔“ نائلہ نے فوراً انوکھا۔ ”انہیں اسی طرح رہنے دو۔“

”ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے۔“ نائلہ نے بیلا کو سمجھایا۔ ایک طرح سے دہلایا۔

”آپا..... آپ کو باجی بلارہے ہیں۔“

انیلا۔ بیلا کو بلانے آئی۔

نیلہ نے سر پر آنچل ڈال لیا اور باجی جہاں کھڑے تھے ان کے قریب آ گئی۔

”جی۔“

”کمرے میں سوٹ کیس رکھا ہے۔ یہ سنبھالو اس کی چابی ہے۔ کپڑے ہیں اس میں نکلیہ کے۔“

اگر یہ دل پسند موقع ہوتا تو وہ سب کی سب سوٹ کیس پر جھپٹ پڑیں۔ کہاں یہ کہ چابی لینے وقت ہاتھ کا پ رہے

تھے۔

بیسو نائٹ کا نفل سا سوٹ کیس تھا۔ نیلہ اسے دھکیلتی ہوئی چھوٹے کمرے میں لے آئی جہاں اسماء نکلیہ کے ہاتھ

میں مہندی لگا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس شادی کی تفصیلات بھی سن رہی تھی۔

جوں جوں تفصیلات سن رہی تھی مہندی لگانے کا شوق دھیمہ ہو رہا تھا۔ اور ہاتھ کی حرکت سست۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔

نیلہ۔ سوٹ کیس کھولنے میں مگن ہو گئی تھی۔

”آگئے وہ لوگ.....؟“ اسماء کا لہجہ عجیب سے ڈکھنارہا تھا۔

”جی۔“

کھٹاک کھٹاک کی آوازوں کے ساتھ سوٹ کیس کھولا گیا۔

الان مان..... الحفظ۔

پورے کمرے میں روشنیاں برسنے لگیں۔ بھاری کا مدار و سہری شرارہ اوپر ہی چکا چونہ پھیلا رہا تھا۔  
بھاری بھاری ساڑھیاں زیورات کے چار پانچ بڑے بڑے ڈبے۔ دیشی بکس، ہنر ڈرائیو سینڈلین، امپورنڈم  
باتھ کولونز کے ڈبے۔

”آف میرے خدایا۔“ بیلا نے کم عمری کے سبب اظہار میں جلدی کی۔

”یہ سیٹ دیکھیں باجی..... ڈائمنڈ کا ہے۔“ اس نے ایک ڈبہ نکلیے کے سامنے کیا۔ جیسے معصومیت میں بہن کو بہار  
تھی۔

”ہوں۔“ نکلیے کا چہرہ ہنوز ہر تاثر سے عاری تھا۔

”کہیں ایسا تو نہیں..... اباجی کی آمریت کے مقابلے میں باجی ”بوڈھی آزادی“ کو ترجیح دے رہی ہوں۔“ نبیلہ  
ذہن میں نکلیے کے پرسکون چہرے نے شک کا ڈنک بھرا۔

”نہیں۔“ اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی۔ ”باجی اتنی ایشیا پریشہ ہیں کہ ہم سب کی خاطر جان بھی دے  
ہیں۔“ بدسوں کے ساتھ کمال یہ سوچ رہی تھی۔

”آپا۔ دولہا دیکھ آؤں۔“ بیلا نے اشتیاق سے نبیلہ سے گویا اجازت چاہی۔

”دیکھ آؤ۔ اگر امکان میں ہو۔“ اس نے چھوٹی بہن سے لہجہ بدلنا مناسب نہ سمجھا اور رسانییت سے گویا اسے اجازت  
دی۔ وہ جلدی سے باہر بھاگ گئی۔

نبیلہ نے عرصی جوڑا پلنگ پر پھیلا دیا اور دیگر لوازمات بھی نکال کر رکھ دیے اور خود باہر نکل گئی۔

نانکھ اور انیلا دوسرے کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگ گئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد احمر نے آکر اطلاع دی کہ اباجی قاضی کے ہمراہ نکاح کیلئے آرہے ہیں۔

نبیلہ پھر کچن میں سے نکل کر بھاگی۔

اباجی قاضی جی کے ہمراہ کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ ان کے دو دوست بھی ساتھ تھے۔

”تمہاری ماں کدھر ہے؟“ شیخ صاحب نے پلٹ کر آہستگی سے نانکھ سے پوچھا۔

”وہ کمرے میں ہیں مگر آپ انہیں نہ بلائیں۔“ نبیلہ نے ہمت کر کے کہا۔

”اچھا..... قاضی صاحب بسم اللہ کہتے۔“

”نکلیے بانو..... بنت شیخ رحیم الدین۔ تمہیں ایک لاکھ روپے مہر نصف موہل نصف مغل کے عوض انعام علی بن ابی  
علی کے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ کیا تمہیں قبول ہے؟“

وہ سب کی سب دم سادھے کھڑی تھیں۔

نکلیے پتہ موڑے سر جھکا کر بیٹھی۔ اس کے تاثرات مخفی تھے۔

قاضی صاحب نے دوبارہ اپنے جملے دہرائے۔

”بیٹی..... اتنی آواز سے جواب دو کہ موجودہ گواہ بھی سن لیں۔“ قاضی صاحب نے خصوصی تاکید کی۔

”جی.....!“ نکلیے کی آواز جیسے کسی کنویں سے نکلی۔

نبیلہ کا دل جیسے کسی نے بھیجا۔ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔ وہ تیزی سے باہر آگئی۔

احمر جو کمرے سے باہر کھڑا خاموشی سے اندر کمرے کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ نبیلہ کے پیچھے لپکا۔

نبیلہ اس کے گلے سے لگ کر سسک پڑی۔

”احمر..... چننا..... قیامت ہی ہوگئی ہے۔“ وہ ہلک پڑی۔ احمر اس کی پشت تھپتھا کر جیسے دلاسا دیتا رہا۔

”آپا..... روئیں نہیں۔ دیکھیں پلینز..... ورنہ میں بھی رو دوں گا۔“ احمر کی آواز بھرا گئی۔

نبیلہ اس سے الگ ہوگئی۔

”احمر..... کیا ہم اس شفی کو دیکھ سکتے ہیں؟“ اس کے دل میں خواہش جاگی۔

”بچ والے کمرے میں آ جائیں۔ میں دوسری طرف سے موقع پا کر پردہ ہٹا ہوں۔ کھڑکی سے دیکھ لیں۔ وہ انتہائی  
معصومیت سے تعاون پر تیار نظر آیا۔

”نانکھ! انیلا اور بیلا کو بھی بلا لاؤ۔ اور ہاں راحیلہ دوپہر سے امی کے پاس بیٹھی رو رہی ہے زرا دیر کو بھی باہر نکلیں اسے کہو  
آپا بار ہی ہیں۔“

اور خود بچ کے کمرے میں چل آئی۔

اور کونے سے لگ کر ڈرائنگ روم میں جھانکنے لگی۔

پورا منظر تو نظر نہیں آ سکا البتہ صوفہ بالکل سامنے تھا جس پر دولہا میاں منہمکن تھے۔ سیاہ سوٹ میں لمبوس سفید رومال  
جب میں نکالے سرخ گلابوں کا ہار گلے میں ڈالے۔ انتہائی اعتماد اور بے نیازی چہرے سے ہویا تھی۔

انتہائی سرخ و سفید چہرہ کنپٹیوں پر چمکتے سفید بال صحت مند طویل القامت بقول اباجی بیوی مرے مدت ہوگئی۔

اس نے تو کسی بے حد بوڑھے شخص کا ذہن میں تصور بنایا ہوا تھا جب کہ یہ شخص تقریباً پچاس برس کا دکھائی دے رہا تھا۔  
کلائی میں بندھی گھڑی شاید بہت قیمتی تھی۔ بلب کی روشنی میں جھگوڑی تھی جس کا عکس انعام علی کے چہرے پر بھی پڑ

رہا تھا۔ دائیں ہاتھ میں سرخ چمک دار اور خامے بڑے پتھر کی انگوٹھی بھی موجود تھی۔

”ادھہ..... دولت سے تو یوں بھی نکھار آ رہی جاتا ہے۔“ وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اسی دم اسماء انیلا نانکھ بیلا اور راحیلہ  
کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔

نبیلہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کی تلقین کی۔

”کیسا ہے؟“ اسماء کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

”دیکھ لیں۔“ اس نے جیسے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

وہ سب کھڑکی کی طرف لپکیں۔

”سامنے کھڑے ہو کر مت دیکھو۔“ اس نے نانکھ کو ٹوکا۔

”آپا..... یہ اتنے بوڑھے تو نہیں ہیں جتنا امی.....“

نبیلہ کے گھومنے پر راحیلہ ایک دم چپ ہوگئی۔

”یہاں سے باہر نکل کر تبصرہ کر لینا۔“ وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی اور سیدھی نکلیے کے پاس پہنچی۔

جو سرخ نشوونگہ شرٹ پہنے ایک آنکھ پر شیڈز لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اسماء اور نانکھ اسے تیار کرتے کرتے وہاں  
سے دولہا دیکھنے بھاگی تھیں۔



ٹکیلے نے ایک لحظے کو نظر اٹھا کر بہن کی سمت دیکھا اور پھر گہری جھکا کر سابقہ انداز میں بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھ میں آنسو کا ایک قطرہ نہیں تھا جب کہ نیلے کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

”ٹکیلے باجی..... آپ روتی کیوں نہیں دل پھٹ جائے گا آپ کا۔“ وہ بہن کے قریب بیٹھ گئی۔

”باجی..... نقصان تو ہوا ہے مگر کچھ بچت ہو گئی ہے۔ انعام علی ”ضعیف“ نہیں ہیں۔ بس اوجیز عمر میں خوبصورت ہیں۔ خدا کرے خوب سیرت بھی ہوں دیکھ کر آئی ہوں..... ہاں..... مگر.....

آپ انعام علی سے..... ہو سکے تو یہ ضرور پوچھئے گا دولت کی بنیاد پر ظلم کا سلسلہ کب تک چلا گا۔“ اس کی آواز بھرا گئی ”احسن بھائی۔“

”خدا را نیلے..... احسن بھائی کا نام نہ لو۔ بہت مشکل سے خود کو سنبھالے ہوئے ہوں۔“

ٹکیلے نے تیزی سے نیلے کو ٹوک دیا۔

ٹکیلے کی آواز زور رہی تھی۔

پھر وہ سب کی سب اندر آ گئیں۔

”ٹکیلے باجی..... فکر نہ کریں۔ وہ اتنے بوڑھے بھی نہیں جتنے کراچی سمجھ رہی ہیں۔ میں امی کو بتا آؤں۔“ راحیلہ اچھا

بھولپن سے رائے کا اظہار کر کے اجازت طلب کر رہی تھی۔

”جی..... نہیں..... کوئی ضرورت نہیں ہے۔ خاموشی سے بیٹھو۔ امی کو کوئی کچھ نہ کہے۔ تماشا بنواؤ گی۔“ نائلہ نے ہر

کوڑا اٹھا۔

”انہیں اس وقت چھیڑنا قیامت ہو گا۔ ہوش میں رہو۔“ نیلے نے بھی جھاڑ پائی۔ راحیلہ دب کر بیٹھ گئی۔

اسماء اور نائلہ ٹکیلے کو دلہن بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ دوسری طرف الباجی نے کھانا لگانے کا حکم دے دیا تھا۔

کھانے کا انتظام بڑے سے بڑے آدمے میں کر دیا تھا جو اس کمرے کے بالکل سامنے تھا جو ٹکیلے کی قیام گاہ بنا ہوا تھا۔

”ناف خدایا۔ مجھے تو نیلے نے ڈرا ہی دیا تھا بوڑھا بوڑھا کہہ کر..... اگرچہ تمہارا اس کا جوڑ تو نہیں ہے۔

مگر شکر ہے ”تماشا“ نہیں لگے گا۔ اسماء نے جیسے کیلی کو تسلی دی۔

مگر ٹکیلے کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔

خاموشی سے دلہن بنتی رہی۔ نائلہ اس کے پاؤں کے ماتحتوں پر کیوکس لگا رہی تھی۔

باقی سب کو کھانے کے انتظام میں معاونت کیلئے نیلے نے بلوایا تھا۔

برآمدے میں ہلکا سا شور اٹھا۔ اسماء نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے جھانک تاک کی۔

”دیکھو گی؟“ اس نے ٹکیلے کے کان میں سرگوشی کی۔

ٹکیلے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں نفی.....؟ سامنے ہی تو بیٹھے ہیں دولہا میاں۔ دیکھ لیں الباجی۔“ نائلہ نے بھی اصرار

کیا۔

”جا تو رہی ہوں انہیں ہمیشہ کیلئے دیکھنے۔ اتنے مال دار آدمی کے ہاں مجھے کام ہی کیا ہو گا۔ سوائے اس کے کہ بیٹل

دیکھتی رہوں۔“ اس کی مسکراہٹ زہریلی اور لہجہ تلخ تھا۔

اسماء اور نائلہ کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ مزید کچھ کہیں۔

کھانے سے فراغت کے بعد نیلے کمرے میں آئی تو ٹھک کر رہ گئی۔

زور تار پچھل سے جھانکتا افسردہ حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ وہ خود پر قابو نہ پا سکی۔ دوڑ کر ٹکیلے سے پلٹ گئی اور پھوٹ

پٹ کر رو دی۔

”ارے..... ارے..... یہ کیا ہے نیلے؟“ اسماء نے ٹوکا۔

اور اسے ٹکیلے سے علیحدہ کیا۔

کوئی رسم وغیرہ نہ ہوئی۔ کیسے کیسے ارمان دلوں میں شلگ کر رہ گئے۔

اسماء نے بمشکل دو چار ٹوکے لکھائے تھے۔ جس کے فوراً بعد ہی شیخ رحیم الدین اندر آ گئے تھے۔

”بیٹی..... ہو سکے تو اپنی ماں کو بلا لاؤ۔ اگر وہ نہیں آتی تو ٹکیلے کو باہر گاڑی میں بیٹھا آؤ۔“

”انہوں نے نائلہ کو کھانا طلب کیا تھا۔ آج لہجہ خصوصی طور پر نرم تھا۔

”باجی..... امی نہیں آئیں گی۔“ نیلے نے پھر ہمت کر کے جواب دیا۔

”تو پھر ٹکیلے کو گاڑی میں بیٹھا دو۔“

”الباجی..... اگر امی ادھر نہیں آ سکتیں تو کیا ہوا۔ ٹکیلے باجی تو ان تک جا سکتی ہیں۔“

اظہار نے ایک طرح سے مشورہ دیا تھا۔

”ٹھیک ہے ملاؤ گا اسے۔ مگر وہ بے وقوف عورت پھر کوئی..... فساد نہ چائے۔“ وہ کہتے ہوئے پھر باہر نکل گئے۔

”آئیے باجی..... امی سے مل لیجئے۔“ نیلے نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔ راحیلہ اور بیلا چپ چاپ کھڑی آنسو بہا رہی

ہیں۔

نیلے اور اسماء اسے تمام کمرے کے کمرے میں لا گئیں۔

صفینے آنے تک انہیں کھولے سیدھی بیٹنی ایک تک مہمت کو مگور رہی تھیں۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

قدموں کی آہٹوں پر انہوں نے نگاہوں کا زاویہ بدلا اور جیسے پتھر کی ہو گئی۔

ایسی پری جمال بیٹی۔

ایسی تابعدار بیٹی۔

اتنی خدمت گزار..... ایسا ریشہ و سابر بیٹی۔ ان کا سینہ جیسے پھٹنے لگا۔

ٹکیلے تیزی سے آگے بڑھی۔

ماں کے پاؤں تھام لئے۔

”امی..... مجھے معاف کر دیجئے..... مجھے معاف کر دیجئے..... مگر امی۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

صفینہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ چند لمحوں کے ٹکیلے کا چہرہ تھا۔ سہمکتی رہیں۔

پھر جھک کر اس کی دکتی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”معاف تو مجھے کرو بیٹی۔ تمہیں جنم دیا کہ سزا دی۔ ایک ہی بات ہے۔ میں کچھ نہ کر سکی میری بیٹی..... میں کچھ نہ کر

سکتی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”اللہ تمہاری جھولی خوشیوں سے بھر دے..... یہ کوئی غلطی نہیں ہے کہ ہم عمر ساتھی سے ہی خوشیاں ملیں۔ میری اور

مارسے باپ کی مثال موجود ہے۔ صرف دو برس بڑے ہیں مجھ سے..... مگر..... ہر ماں کے کچھ ارمان ہوتے ہیں۔“

انہوں نے ہونٹ کاٹے جیسے ضبط کر رہی ہوں۔

”کیسی بڑیوں جیسی ہے میری بیٹی۔“ انہوں نے پھر جھک کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

اگر مجھے ہزار ختم بھی مل جائیں تو میں اپنی بیٹی کی قربانی اور بہادری کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ وہ ہچکیاں لینے لگیں۔

”بھئی بچو۔۔۔۔۔۔ ذرا ایک طرف ہو جاؤ۔ انعام علی اپنی ساس کو سلام کرنے آرہے ہیں۔

آئیے انعام علی۔“ گھر والوں کیلئے شیخ رحیم الدین کا یہ انداز قطعی اجنبی تھا۔ لڑکیاں بدک کر ادھر ادھر ہو گئیں۔ ایسے میں اسامہ نے حواس بحال رکھے۔

ایک کرسی کھینچ کر صوفیہ کے بٹنگ کے نزدیک رکھی اور اس پر ٹھیکہ کو بٹھا دیا اور دوسری کھینچ کر اس کے برابر رکھ دی۔

”آئے انعام علی۔ دراصل آپ کی خوش دامن بنارہیں۔ آئیے۔“ شیخ صاحب انعام علی کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے صوفیہ جیسی خاندانی عورت اپنے اطوار زیادہ دیر فراموش نہ کر سکیں۔ سر پر آٹھل ڈال کر کھڑی ہونے لگیں۔

”السلام علیکم۔“

”ولیکم السلام۔“ وہ انتہائی نفاہت سے گویا ہوئیں۔

”آپ۔۔۔۔۔۔ بلیر تشریف رکھئے۔ زحمت نہ کیجئے۔“ انعام علی نے انہیں اٹھنے سے باز رکھا۔

صوفیہ کو عاقبت درجے کا لٹاؤ آ رہا تھا کہ وہ اس اوج عمر کو سر پر ہاتھ رکھ کر عادیں تو کیسے۔

نفرت و کمزورت کی انتہائی کہ انہوں نے شیخ صاحب کو دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا کر دل و دماغ سے مجبور ہو کر۔ انہوں نے

انعام علی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر ایک نظر ٹھیکہ کے چہرے پر ڈالی۔ کس قدر خوش بخت ہے یہ ساہوکار۔۔۔۔۔۔ بیہوش ہونے جیسی بیٹی لے جا رہا ہے۔ آہ۔

کچھ دل کو تسلی ہوئی تھی کہ یہ اتنا بوڑھا نظر نہیں آ رہا تھا جتنا شیخ رحیم الدین کے تعارف کے اعانہ سے ظاہر تھا۔ کتنیاں سفید تھیں۔ انعام علی نے یہ ”عیب“ چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی تھی اور کرتے بھی کیوں؟ جب بغیر مشکل و حیلہ انہیں

سب کچھ مل رہا تھا۔ ہو سکتا ہے عمر واقعی بہت ہو۔ دولت تو یوں بھی بہت سے عیب چھپا لیتی ہے۔

”اچھا۔ اب اجازت دیجئے۔“

وہ اجازت لے کر مڑ گئے۔

صوفیہ نے ایک آہ سرد کھینچ کر بیٹی کو سینے سے لگایا۔ اب سب اجتماعی انداز میں رو رہی تھیں۔ بمشکل اسامہ سے ماں کو علیحدہ کیا۔ باری باری سب سے گلے لگایا۔

”شیخ صاحب بدگمانی سمیت کمرے میں دوبارہ وارد ہوئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید صوفیہ نے پھر ہنگامہ کیا ہے۔

”جلدی کرو۔“

نبیلہ اور اسامہ نے ٹھیکہ کو تھامنا اور کارک لے آئیں۔ سیاہ رنگ کی مقوشی کا اٹکا دروازہ کھولے انعام علی منتظر کھڑے تھے۔

شیخ صاحب نے رسی انداز میں ٹھیکہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”اچھا بیٹی۔۔۔۔۔۔ اللہ کے سپرد“ دوسری کار میں باقی اصحاب بیٹھ چکے تھے۔

ٹھیکہ نے زبردست قوت برداشت کا ثبوت دیا تھا۔۔۔۔۔۔ انعام علی نے اسامہ اور نبیلہ کی سمت دیکھا۔

”السلام علیکم“ اب انہیں سلام کرنا ضروری ہو گیا۔ کیونکہ کمرے میں وہ کسی جانب متوجہ نہیں ہوئے تھے۔

”و۔۔۔۔۔۔ سلام“ انعام علی نے مختصر اجواب دیا جیسے غلٹ میں ہوں۔

”اچھا جی۔۔۔۔۔۔ اوکے۔“ انہوں نے رسماً مسکرا کر لڑکیوں کو دیکھا جن سے ان کا تعارف نہ ہو سکا تھا۔

پھر اپنے سر کی طرف بڑھے۔ اور خدا حافظ کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

ایسی عجیب و غریب شادی کا ان میں سے کسی نے بھی تصور نہیں کیا تھا۔ جس میں ان کا حقیقی بہنوئی انہیں پہچانتا تک نہ

جس سے چھینڑ چھاڑی جرات نہ کر سکیں۔ جس سے بنگ وصول نہ کریں۔

وہ دور ہوتی ہوئی گاڑیوں کو روٹی روٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔

”آپا جلدی سے آئیں۔ دیکھیں امی کو کیا ہو گیا ہے۔“ امر کی آواز آئی تو وہ سب کی سب دوڑ گئیں۔

”واہ رے میاں ہائے حیرتے گلے میں مٹھوٹا لگے۔

اپسے میں مجھے یہ مثل یاد آئی۔

دلہن حد کر دی ہے لوگوں نے۔ اے کھلا دھوکا۔ یقین مانو ایسا حلیہ بتا کے رکھتا ہے ہن ربڑی والا جیسے کہیں کا جاگیر دار لہتا تھا خالہ میری پنجاب میں پانچ دو دھبہ کی دکانیں ہیں۔ مہینے میں دو بار حساب کتاب کو پنجاب جاتا ہوں۔

اے کہاں آگرہ ساڑھی والے اور کہاں یہ ٹٹو۔ اے میں تو ایسی ذلیل و خوار ہوئی کہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

آگرہ ساڑھی والے کون ساڑھ سے لکھے ہیں اور انہوں نے کہا بھی یہی تھا کہ لڑکا چاہے ان پڑھ ہو مگر دولت مند ہوتا ہے۔ ہماری لوٹیا نازوں کی پالی ہے۔ تو میں اس نامراد ہن کے رستے گئی۔ گھر میں دو بٹنگ ان میں بھی ایک کا پایہ

ہوا۔ چار اینٹیں پائے کی جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ غسل خانے کا دروازہ رستوں سے بندھا ہوا۔ گھر میں گیس کا چولہا تک نا۔۔۔۔۔۔ مانو پورچی خانے سے راکھ تک باہر آرہی تھی۔

ہے ہے ہن حیرانیز اغرق۔۔۔۔۔۔ تو نے تو مراد دیا تھا۔ بد ذات دکان پر ایسے بن سنور کر بیٹھتا ہے جیسے پوتروں کا پ ہو۔“

خالہ کی زبان رکی اور کڑکڑ کر سردتا چلنے لگا۔

”ماگے تاکے کلڑے۔۔۔۔۔۔ گلی میں ڈکاریں۔۔۔۔۔۔ ہونہہ۔“

منزہ خاموشی سے کپڑے سینے میں مشغول رہی۔ وہ شکر کر رہی تھی کہ بلال گھر میں نہیں تھا۔ ورنہ اس ”افسوس ناک“ فتنے پر خالہ اسے ایک نہ ختم ہونے والا مکالمہ شروع ہو چکا ہوتا۔

”پھر آگرہ ساڑھی والوں نے آپ سے کیا کہا؟“ اس نے خالہ سے سوال کیا۔

”اے کیا کہتا۔۔۔۔۔۔ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی تو میں چھان چھک کر رہی تھی۔ جب تک میری مامہ ہوتی میں آگے بات نہیں بڑھاتی۔ یہ تو بس ایک ”ڈکر“ کی حد تک بات تھی۔ شکر ہے جان بچ گئی۔“

تو آپ کو ایسے ”رنگی کام“ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا بشارت ہوئی تھی کہ کسی کو بھی آزاد نہ رہنے دو۔۔۔۔۔۔؟“

وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ بلال فائل اٹھائے چلتی زبان اور جوتوں کی چرچا ہٹ کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوا۔ کون سے کام۔؟ خالہ ”رنگی“ کا مطلب پوچھنے لگیں۔ اس نے فوراً مطلب بتایا۔ ”خطرے والے کام۔“

”اے لو۔۔۔۔۔۔ خطرے تو زندگی کے ساتھ ہیں خطرہ تو ہر کام میں ہوتا ہے۔ ارے یہ ثواب کا کام ہے۔ نیکی ہے۔“

انہوں نے بلال کو سمجھایا۔

”اور ثواب بغیر خطرے کے ممکن نہیں۔“

جیسے اگر میدان جنگ میں کوئی گولی کا خطرہ نہ ہو تو لڑنے والے کو ثواب ہی نہ ملے۔“

”اچھا۔۔۔ تو میرے مزے مت لگ۔ خود تو کسی کام کا نہیں۔۔۔ باتیں بنواؤ جتنی مرضی۔“ خالہ برامان کر پھر سر دوتا چار۔

لگیں۔

بلال صوفے پر ڈھسے گیا۔

”اور خالہ سنا لیں۔ ہن ربڑی والے کے ”کیس“ کا کیا حال ہے؟“

خالہ نے چوری چوری منہ کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ تجھے کیا دلچسپی ہے؟“ انہوں نے ذرا ڈر کر بلال کی سمت دیکھا۔

”مجھے اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ بڑی مجھے بہت پسند ہے۔ یقیناً تین حلوئی کے ویسے میں سویت ڈش ربڑی تو ضرور ہو گی۔“

”اچھا چھوڑو۔ مجھے یہ بتا۔ اسد میاں کی ماں سے کب ملواریا ہے۔۔۔؟“ انہوں نے جلدی سے موضوع بدلا۔

”جب آپ کہیں۔“

”ارے کیا واقعی۔۔۔؟“ خالہ کو بال کا حامی بھرنا مشکوک دکھائی دیا۔

”واقعی۔۔۔۔۔ جب تک میرا آخری پرچہ نہیں ہو جاتا میں بزرگوں کا اسی طرح تابع دار بنار ہوں گا۔“

منزلہ سنکر بڑی۔

”کیزے تبدیل کرلو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“

”آپلی۔ خاور بھائی کا کوئی خط وغیرہ آیا۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ آج کل جاپان میں ہیں۔ لکھا ہے کہ طوفان کی وجہ سے جاپان میں قیام ڈرا طویل ہو گا اس لئے واپسی میں کمی دیر ہوگی۔ سچ خاور ماننے نہیں۔ میری تو ہر وقت جان سولی پر لٹکتی رہتی ہے۔ پانی سے مجھے ہمیشہ ہی خوف آتا ہے۔ خاور کے اصرار کے باوجود میں نے کبھی شب کا سفر نہیں کیا۔“ پچھلے سال جب عمرہ کرنے گئی تھی تو ہوائی جہاز سے گئی تھی۔“

منزلہ نے خالہ کو مخاطب کر کے بتایا۔

”اے ہاں۔ اور کیا میٹوں سموت کو ترستے رہو۔“ خالہ نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ منزلہ بکن کی سمت گئی تو خالہ نے بلال کو پھر چھیڑ دیا۔

”اے بیٹے۔۔۔۔۔ پڑھائی کے بعد کیا کرو گے۔۔۔؟“

”شادی، بہر حال نہیں کروں گا۔“ اس نے فوراً ہی خالہ کو ایس کر دیا۔

”یونہی انڈورا بھرے گا۔۔۔؟“ انہیں غصہ آ گیا۔

”یونہی انڈورا بھر دوں گا۔“ وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

”گناہ ہوتا ہے۔“ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”انڈورا پھرنے سے۔۔۔۔۔؟“ اس نے تعجب سے خالہ کو دیکھا۔

”اور کیا۔۔۔؟“ انہوں نے اپنی بات پر قائم رہ کر ثبوت دیا۔

”شادی کرنے سے جنت الٹا ہو جاتی ہے تو پھر آپ گناہ بخشوانے کیلئے حج کرنے کیوں گئی تھیں۔“

”اے وہ تو فرض ہے۔“ وہ چڑ کر بولیں۔

”بھئی واہ۔ یہ تو جتنی معلومات ہوئیں کہ شادی کر کے آدمی جتنی ہو جاتا ہے۔ پھر تو میں ہر سال کیا کروں گا۔“ وہ شریر

”شرع میں چار جائز ہیں۔“ خالہ سمجھیں وہ شریعت بھول بیٹھا ہے۔ اس لئے یاد دلایا۔

”مجھے پتا ہے حد نہیں چھلانگوں گا۔ سال کے سال بدل لیا کروں گا۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”خالہ ایک کام کریں۔“

”ہوں۔“ انہیں اچھے مشورے کی امید نہیں تھی۔ اس لئے شروع ہی میں بے زاری سے ”ہوں“ کہا۔

”آپ خانو کی تین اور کرداریں۔۔۔۔۔ قیامت والے دن عرش کے سامنے میں ہوں گی۔“

”ارے وہ ایسا سوچ کر تو دیکھیں۔۔۔۔۔ ہوش ٹھکانے لگا دوں گی۔“ خالہ کا پارہ سوانیزے پر پڑ گیا۔

”مگر آپ کو ثواب کتنا ملے گا۔۔۔۔۔ یہ بھی سوچا۔ ویسے بھی آپ کی تو خالو سے نفی نہیں۔“ وہ ہنسی کی سے بولا۔

”ارے میاں ربڑی میں کھٹ پٹ تو ہوئی ہی ہے یہ ہے ہی بے غیرت رشتہ۔ بلال۔ اے تجھ سے کچھ کہا انہوں

نے۔۔۔۔۔؟“ خالہ نے راز داری سے پوچھا۔

”کہا تو نہیں۔۔۔۔۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ وہ شرارت بھرے انداز میں بولا۔

”دیکھ۔ اگر وہ تجھ سے کچھ کہیں تو مجھے ضرور بتائیو۔ یوں بھی تو میرا بیٹا ہے۔“ وہ بڑی سادگی سے بلال سے کہہ رہی

ہیں۔ اور بلال اتنے تہہ لگانے سے عاجز تھا۔

”آپلی۔۔۔۔۔ اس نے تھوڑا دیر بعد کچھ سوچے ہوئے منزلہ کو مخاطب کیا۔

”ہوں۔“

”پھر میں چلا جاؤں؟“

”کہاں۔۔۔۔۔؟“ وہ جانے کس خیال میں تھی چونک پڑی۔

”تو شہر۔۔۔۔۔ رات سارہ چھو پھو تارتی تھیں ناں کسائی کی طبیعت خراب ہے۔“

”تو اور کیا۔۔۔۔۔ تمہیں تو پہلے ہی فرصت میں جانا چاہئے۔“

”بے چاری امی۔۔۔۔۔ ٹھیک ہی کہتیں۔۔۔۔۔ کوشش کر کے ساتھ لے آنا۔“ وہ انتہائی دکھ بھرے انداز میں بولی تھی۔

بلال نے بہن سے کچھ کہنا چاہا مگر خالہ کی طرف دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا۔

”پھر کب ملو اکی آپ کو اسد بھائی کی امی سے۔۔۔۔۔؟“

”تو شہرہ جانے سے پہلے تو نے ہر حال میں یہ کام کرنا ہے۔“

”چلو بلال اٹھو۔ جلدی سے کھانا کھاؤ۔“ منزلہ کے لہجے میں اس بار کچھ ترشی تھی جیسے وہ اس موضوع کو سخت ناپسند کرتی

”آئیے خالہ۔۔۔۔۔ آپ بھی۔“ اس نے خود پر قابو پا کر خالہ کو مخاطب کیا۔

خالہ ہاتھ دھوئے گئیں تو منزلہ نے بلال سے پھر کہا۔

”بلال پوری کوشش کرنا۔ کراہی تمہارے ساتھ آ جائیں ورنہ مجھے یقین ہے کہ وہاں کبھی بھی صحت مند نہیں ہو

”میں سمجھتا ہوں آپنی۔ آپ فکر نہ کریں۔“  
بلال کے لہجے میں کچھ دیر پہلے والی شوفی کے بجائے انتہائی سنجیدگی تھی۔

اس کی ماں کی حالت خوشی سے غیر ہو رہی تھی۔

لیکن جیسے ہی نوفل نے بتایا کہ..... امی آپ کا احسن بھائی چھوڑ کر گئے ہیں۔ کمرے میں موجود ہر شخص دم بخود ہو گیا۔  
”احسن.....!!!“ وہ انتہائی حیرانی سے شہوار کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”کیا کہہ رہا ہے نوفل.....؟“ وہ تیزی سے بولیں۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ اسے پوچھا۔ اس نے شہوار کی سمت دیکھا۔

”کیا نوفل ٹھیک کہہ رہا ہے؟“ ان کی آواز میں تحیر تھا۔

”جی۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”اس نے تمہیں کہاں سے ڈھونڈ نکالا۔ کہاں چلی گئی تھیں تم؟“ انہوں نے اسے سینے سے الگ کر کے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

باقی سب لوگ بھی کمرے میں چلے آئے۔

”کیا ہو گیا تھا..... تم کہاں چلی گئی تھیں.....؟“

بڑی ممانی نے فکر مند انداز میں اس کا شانہ ہلایا۔

”میں کہیں نہیں گئی تھی۔ مجھے لے جایا گیا تھا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”اے لو..... اتنے جھوم میں سے کیسے کوئی تمہیں لے گیا؟“ اس کی مانی نے تعجب سے پوچھا۔

”بات کیا ہے شہوار۔ ٹھیک سے بتاؤ“ اس کے ابو بھی آپکے تھے۔ انہوں نے برہم انداز میں بیٹی سے پوچھا۔

فکر، تشویش اور بہت سے بے نام خوف ان کو جکڑے ہوئے تھے۔

”اور یہ احسن تمہیں کہاں مل گیا۔ رات جب وہ جا رہا تھا میں نے تب ہی کہا تھا کہ دیکھنا یہ کچھ نہ کچھ کرے گا۔ ارے

بڑا دلیر بچہ ہے۔“ اس کی مانی نے جو احسن کی بھی مانی تھیں۔ بڑے فخر سے کہا۔ ”نوفل بتا رہا ہے تمہیں یہاں احسن پہنچا کر

گیا ہے۔“

”تم لوگ خواجہ اور رحم الدین کی باتوں میں آرہے ہو۔ لاکھوں میں ایک ہے میرا احسن۔ دیکھ لو۔ یہ کام آخر اسی نے

کیا کہ نہیں.....؟“

”ہاں..... پلیز آپ ذرا خاموش رہیں۔“ شہوار کے والد نے سنجیدگی سے ساس کو ٹوکا۔

”کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ شہوار..... سچ بتاؤ۔“ اس کے ابو کے لہجے میں فکر گوئی رہا تھا۔

”کون لے گیا تھا تمہیں اور کہاں؟“

سب انتہائی توجہ سے شہوار کی بات سننے کے منتظر تھے۔

”مجھے احسن لے گئے تھے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ ماموں اور باپ کی موجودگی میں اس پر سخت جھجک طاری

تھی۔

”ہائیں..... کسی کے بھی خاک پلے نہیں پڑا۔

”کیا بک رہی ہو؟“ اس کی مانی برہم ہوئیں۔

”ارے وہ تو کل گھر ہی میں تھا۔“ وہ داماد سے نظریں چرا کر ناراضگی سے بولیں۔

”ممانی جان مجھے احسن ہی لے گئے تھے۔“ اس کی آنکھوں سے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

”ارے مگر کیسے.....؟ وہ تو کل سب کے ساتھ ہی تھا۔“

”ہاں..... شہوار کو کہنے دیں..... سچ میں نہ تو کہیں۔“ بڑی ممانی کا تجسس کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ ساس کی ٹوک انہیں سخت

گوار گزری۔

”کس وقت لے گیا تھا احسن۔“ شہوار کے ابو کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

”جب بارات آئی تھی ناں۔ تو انہوں نے مجھے بلوایا تھا۔“

”تم اس کے بلاوے پر گئی کیوں تھیں؟“ اس کی امی کی ماستا پر بھی کالبادہ اڑھنے لگی۔ بہت سارے داہے آسیب کی

طرح ان کے قلب پر چھینے۔

شہوار جھکا سر نہ اٹھا سکی۔

”اے بات تو پوری کر لینے دو۔“ اس کے ابو نے ناگواری سے اس کی ماں کو ٹوکا۔

”پھر اس نے تمہیں بلوایا؟“ چھوٹی ممانی نے یوں کہا جیسے وہ کوئی دلچسپ کہانی سنا رہی ہو۔

”جی..... وہ وہاں گاڑی لے کھڑے تھے۔“

”کہاں.....؟“ امی نے گھورا۔

”جہاں خالہ بیگم کا امی اپنی بکریاں باندھتا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”پھر.....؟“

”انہوں نے زبردستی مجھے گاڑی میں دھکیلا۔ ایسی آفت تھی میں کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔“ اس نے بہت آہستہ آواز میں

بتایا۔

”کہاں لے کر گیا تھا.....؟“ اس کی امی کے لہجے کی ٹکٹنگ اب صاف عیاں تھی۔ بھاد میں ان کے سر پر کٹڑی تھیں۔

ماری مرکا ٹھسا اور طمطراق آنا فانا ہوا ہو گیا۔

”مجھے اس جگہ کا نام معلوم نہیں..... کوئی بنا علاقہ ہے۔“ اسے ماں کی سنجیدگی سے خوف محسوس ہوا۔

اس کی امی نے نظریں اٹھا کر اس کو گہری نظروں سے ٹولا۔

”مگر رات تو ہمارے ساتھ تھا احسن۔“ اس کی مانی نے پھر یاد دلایا۔

”مگر موصوف پھر چلے بھی گئے تھے۔“ بڑی ممانی نے جیسے ہوئے انداز میں ساس کو جیسے کچھ بتایا۔ اب کمرے میں

ایک مہیب سی قسم کا سکوت طاری ہو گیا تھا۔

”پھر وہ چھوڑ کیوں گیا؟“ اس کی امی جان چکی تھیں۔ اس کے باپ میں سوالات کرنے کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔

اس نے انہوں نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔

”میں نے ان کو خاندان کی عزت کا واسطہ دیا۔“

”اور اس کا چڑھا طوفان اتر گیا.....؟“ چھوٹی ممانی کا لہجہ ناقابل فہم تھا۔

”تم نے.....“ بڑی ممانی نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر شوہر کے گھورنے پر یک دم خاموش ہو گئیں۔ سب آہستہ آہستہ باہر نکلے گئے۔

”میں اس آوارہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اس کے ابو نے بیوی سے دھمکی آمیز انداز میں کہا اور باہر نکل گئے۔ ممانیاں بھی باہر چلی گئیں۔

”دیکھا ماں..... کیا ستم ڈھایا ہے اس احسن نے۔“ شوہار کی امی نے اپنی ماں کو مخاطب کیا۔

”اے بیٹے..... یہ کیا ہو گیا.....؟“ وہ منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

شوہار کو سخت حیرانی ہوئی۔

”اب جبکہ وہ آگئی ہے تو رونے کی وجہ؟“

اس کی مانی بھی اسے ٹٹولی باہر چلی گئیں۔ سب کے ہونٹوں پر جیسے تالے پڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ نیلو فر بھی اب ڈری ڈری اور درد رشتی۔ صرف چوبیس گھنٹے کے اندر اتنی بڑی تبدیلی۔ مگر کیوں.....؟

وہ تو آگئی ہے۔ اب کیا ہوا.....؟

اس کی امی آہستہ آہستہ بستر سے اتریں۔ ”میں وضو کر کے نماز پڑھ لوں۔“

اسے ماں کے انداز و اطوار پر شدید حیرانی ہو رہی تھی۔

امی وضو کرنے لگیں تو چھوٹی ممانی آن گئیں۔

”چائے بناؤں؟“ وہ پوچھ رہی تھیں۔

”یا اللہ..... میں اپنے گھر آئی ہوں۔ مہمان تو نہیں ہوں۔ پھر یہ سب مجھ سے اس طرح پیش کیوں آرہے ہیں۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”جہیں..... میں چائے نہیں پیتی اس وقت۔“ اس نے الجھ کر انکار کیا۔

چھوٹی ممانی نے اس کے بدلے ہوئے لچے پر ذرا چونک کر دیکھا۔ پھر معنی خیز انداز میں مسکرا دیں۔ پھر آگے بڑھیں

اور دروازہ بند کر دیا

شوہار حیرانی سے ان کی نقل و حرکت دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے بالکل نزدیک آکر بیٹھ گئی تھیں۔

”احسن رات تمہارے پاس کیا تھا؟“

”نہیں۔“ اس نے جھلا کر کہا۔

”دیکھو..... ہم گھروالے ہیں۔ ہم سے کچھ نہ چھپاؤ۔ ورنہ مشکل ہو جائے گی۔“

”جو بات تمہاری میں نے سچ سچ سب کو بتا دی ہے۔“ وہ الجھی۔

”کیا ایک دوست کو بتانے کیلئے بھی تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ وہ معنی خیز انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

اس نے حیرانی سے ممانی کو دیکھا۔ جو واقعی اس کی دوست تھیں۔ دو سال پہلے وہ بڑی چاہ سے انہیں بیاہ کر لائی تھی۔

”نہیں..... میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”دیکھو شوہار..... احسن نے تم سے کچھ تو کہا ہوگا.....؟“

”کچھ سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اسے قطعہ آگیا۔

”بھئی دیکھو ماں..... وہ تمہیں زبردستی لے کر گیا۔ آسانی سے تو نہیں چھوڑا ہوگا۔ آخر اس نے یہ سارا مکمل ہمارے

لہرانے سے انتقام لینے کی غرض سے تور چایا تھا ناں۔“ وہ جیسے اسے سمجھا بھی رہی تھیں۔

”اب تم اتنی بچی اور نادان بھی نہیں ہو۔ کیا میری بات نہیں سمجھ رہی ہو.....؟“ اس نے حیران نظروں سے ممانی کو

بکھا۔ ”کیا بات؟“

”رات وہ تمہارے پاس کیا تھا ناں.....؟“

”نہیں..... خدا کیلئے آپ یقین کیوں نہیں کر رہیں۔ وہ مجھے شام کو اس گھر میں قید کر کے گئے تھے پھر آج صبح آئے

نے۔“

”صبح سے اب تک وہ تمہارے ساتھ تھا.....؟“ پھر سوال ہوا۔

”جی..... درمیان میں ایک دو گھنٹے کیلئے وہ کہیں گئے تھے۔“

”باقی وقت تو وہ تمہارے ساتھ تھا.....؟“ وہ جیسے کچھ ثابت کرنے اور اگلوانے پر تکی ہوئی تھیں۔

”جی..... مگر وہ صبح آکر سو گئے تھے۔“

”سو گئے تھے؟“ ممانی یوں مسکرائیں جیسے وہ انہیں بے وقوف بتا رہی ہو۔

”دیکھو شوہار تم اگر کچھ چھپاؤ گی تو مشکل میں پڑ جاؤ گی۔ تمہیں احساس نہیں معاملہ کتنا سیریس ہے۔ تم شادی کے گھر

سے غائب ہوئی تھیں۔ یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی ہے۔

اور میں جو تمہارے پاس آئی ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں آئی ہوں۔ مجھے باجی (شوہار کی امی) نے بھیجا ہے۔“

”مگر کیوں.....؟“ وہ حیران ہوئی۔

”تاکہ تم سے ہر وہ بات جو چھوں جو حادثے کی طرح تم پر گزری ہے۔“

”مگر میں نے تو سب کے سامنے جو کچھ کہا ہے سچ سچ کہا ہے۔ اب کیا باقی ہے.....؟ وہ بکھڑا گئی۔

”دیکھو ذرا آرام سے۔ احسن تمہارا لڑکیاں ہے۔ وہ تمہیں اذیتا لے کر گیا۔ وہ اس طرح تمہیں کیسے چھوڑ گیا۔ رہا

اعلان کی عزت کا واسطہ وہ تو تم جاتے وقت گاڑی میں بھی دے سکتی تھیں.....؟“ وہ خاصی مشکوک نظروں سے اس کا

انزہ لے رہی تھیں۔

اب وہ ان کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئی۔

”ممانی جان..... میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے البتہ یہ

رور ہے کہ میری واہسی مشروط طریقے سے ہوئی ہے..... اور یہ بات میں صرف امی کو بتاؤں گی کہ میں کس طرح ان کی قید

سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوئی۔“

وہاں کے بستر پر دروازہ ہو گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ صورت حال بھی پیش آئے گی۔ اس نے کروٹ لی اور اس کی

مکیاں کرے میں ابھرنے لگی تھیں۔





بلکہ وہ کئی دنوں پہلے سے ”رخصتی“ منانا شروع کر دیتی تھی۔ حیلے بھانے سے رونے بیٹھ جاتی تھی۔  
خاور کا ایک گھنٹے سے زیادہ گھر سے باہر ہٹا بند کر دیتی تھی۔  
دوسری صورت میں وہ بکڑ جاتی تھی۔ خاور کے سلسلے میں وہ بڑی بے اعتبار واقع ہوئی تھی۔  
چیسے وہ اس کے شوہر نہ ہوں انٹاش ہوں۔

سسرال میں بھی یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ بہت پیسے والے کی بیٹی ہے۔ اس لئے خاور اس کی منگی میں ہے۔ صبح ہی تو بلال کاؤن آیا تھا کہ میں امی کو لے کر آ رہا ہوں۔

تب سے اس کی یہ کیفیت تھی۔

ایک عجیب طرح کا ڈکھا سے گھیرے ہوئے تھا۔

یقیناً امی کی حالت خاصی خراب ہے۔ جب ہی تو بلال انہیں زبردستی لا رہا ہے ورنہ وہ آنے والی نہیں تھیں کہ بیٹی کے گھر ڈاؤن لانا انہیں گوارہ نہیں تھا۔

”پتا نہیں کسی ہوں گی.....؟“ اس نے چشم تصور سے ماں کو دیکھا۔

اپنا ذاتی ڈکھ تو اسے کوئی نہیں تھا۔

گھر ماں کے ڈکھ سے وہ آزاد نہیں تھی۔

اس نے عجیب طرح کی کیفیت میں بیٹے کو تیار کیا۔ بچی کے سلسلے میں ملازمہ کو ہدایت دی۔ پرس اور گاڑی کی چابی اٹھا کر بیٹے کو گود میں لیا۔ اور باہر نکل آئی۔ گراؤنڈ فلور تک آتے آتے جانے کتنے ہمسایوں سے بیڑا ہٹے کرنا پڑا۔

ہلفٹ کیلئے بھیڑ دیکھ کر وہ براستہ زینہ نیچے آئی تھی۔

چیسے ہی کیا ڈنڈ کی طرف بڑھی سامنے ہی اسدا اپنی گاڑی لاک کر بے دکائی دیئے۔

”السلام علیکم“

اسد نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”علیکم السلام“ انہوں نے بچے کے پھولے پھولے رخساروں کو بھوکھو کر جواب دیا۔

”خیریت..... کہاں کا ارادہ ہے؟“ انہوں نے بلیو شلوار سوٹ میں لمبوس ہاتھ میں گاڑی کی چابی ہلاتی منزلہ کو دیکھا۔

”امی اور بلال آ رہے ہیں۔ انہیں لینے انیر پورٹ جا رہے ہیں۔“

بلال خوش ہو گیا ہوا تھا.....؟ اسد چونکے۔

”جی صرف دو تین دن کیلئے۔“

”یہ غلط ہے بھائی..... آپ مجھے بے خبر نہ رکھا کریں۔ بلال کی غیر موجودگی میں تو آپ بالکل ہی تنہا ہو جاتی ہیں۔ خاور اگر سنے گا تو کیا سوچے گا کہ کیا دوست ہے۔ میرے بچوں کا خیال بھی نہیں رکھ سکتا۔“

”آئیے.....“ اسد نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”آپ تکلیف نہ سمجھئے۔ میں خود ڈرائیو کر کے چلی جاؤں گی۔“

”معلوم ہے مجھے کہ آپ بہت ماہر ڈرائیو ہیں۔ چلئے آئیے“ وہ مسکرائے اور اس قطعی امداد پر منزلہ انکار نہ کر سکی۔

”امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں.....؟“ اسد نے پونہمی پوچھ لیا۔

”ان کی طبیعت کبھی ٹھیک نہیں رہی۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”اچھا.....!“ اسد کے لہجے میں ہلکا سا تعجب نمایاں تھا۔ ”کیا باہر بھی مگنی ہیں علاج کیلئے؟“

ایسی خوشی جو کہ نہال کر دے۔

کسی سربستہ راز کے جیسی خوشی۔

جس کا گواہ صرف اپنا دل ہو۔

چیسے کوئی دو تیز واپسی عمر بہاراں لئے میں خود ہی بدست ہو کر مسرور ہو۔

ایسی بدستی کی خوشی۔

ایسی خوشی جو کسی موسیقار کو اس وقت ملتی ہے جب وہ آتش جان کی لو بڑھا دینے والا شروع کر دیتا ہے یا پھر جب کوئی مصور شاہکار بنا کر قلم توڑ دیتا ہے۔ قلم توڑنے میں ایک لذت اور اس لذت میں گیان اور اس گیان میں روح کو بکھلا کر دینے والی ایک بچی خوشی ہوتی ہے۔ جس کو یہ اصلی خوشی میسر آ جائے۔

وہ زندگی کے مسائل اور اہمیت کے جیسے لپٹ جانے والے ڈکھوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔

اس کا چہرہ اس کے باطن کا آئینہ بن کر اس پاس کے ماحول تک کو آئینہ تماثل کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایسی خوشی کا تصور تک نہیں تھا۔

ایک کی ایک خلاء ہنوار اس کی ذات کی اساس تھا۔

ایک نا آہودگی کا جال تھا جس میں وہ ہمیشہ سے قید تھی۔

بالکل ایسے جیسے موشا جس میں شیر

جیسے پنجرے میں چڑیا۔

اگر چہ دنیاوی نقطہ نگاہ سے اس کی شخصیت قابل رشک تھی۔

سینئر کمبیر تک وہ مری میں رہی۔ حالانکہ وہ ماں سے جدائی بالکل پسند نہیں کرتی تھی مگر اس کے باپ کا خواب اس کی اکلوتی بیٹی سوسائٹی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی حیثیت سے پہچانی جائے وہ اسے ماہانہ جیب خرچ اتنی باتا تھا اور فرار دلی سے بھجواتے تھے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اتنی ڈھیر ساری رقم کا کیا کرے۔

جیتی سے جیتی کپڑا کا سٹیکس، سینڈلین، خوشبوئیں، زسوخ، ہر شے اسے حاصل تھی۔

اگر ایک دل تھا کہ کھل کر نہ دیا۔

خاور جیسا پیارا کرنے والا شوہر۔ بھی یہ غلط کرنے میں ناکام رہا تھا۔

خاور کے شپ پر اوندھ ہونے سے قبل وہ ان کے سینے سے لگ کر بری طرح روتی تھی جیسے آئندہ ملاقات سے ناامید ہو۔

“.....!”

”جی میں سن رہی ہوں۔“ وہ گڑبڑائی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں..... کیسے ہو رہے ہیں مگر والے۔ مطلب کیا ہے تمہارا.....؟“

”سب اجنبی اجنبی محسوس ہو رہے ہیں۔“ وہ رو پڑی۔

”تم پردہ کیوں کرتی ہو۔ میں تو ہوں نا تمہارا.....“ اس کی سسکیوں نے جیسے اس پر خامسا اثر کیا تھا۔

اسی دم اس کی امی نے ریسور جھٹ لیا تھا۔

دوسری طرف وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہ سب میڑ سے لوگ ہیں۔ تمہارے تعاون سے سب سیدھے کئے جاسکتے ہیں۔“

”شباباش بیٹے شباباش۔ آخر تم ہمارے حید امجد جو غمخوارے تم نہیں سیدھا نہیں کرو گے تو پھر کون کرے گا.....؟“

تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا ایک تو چوری پھر سیدہ زوری۔ میں تمہاری خالہ ہوں۔ تمہاری ما

سکی بہن۔ جو بجائے خود ماں ہوتی ہے کہ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ ماں مرے ماسی جئے۔“

وہ طیش کے عالم میں کلام کر رہی تھی۔

احسن جو شوہار کے بجائے خالہ کی آواز سن کر لمبے بھر کو چکرا گیا تھا۔ ایک دم سنبھل گیا۔

”آپ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا ہے وہ ایک ماں کبھی نہیں کر سکتی۔ لہذا ماں اور ماسی والی مشل صریحاً غلط ہے۔

ہمیشہ کیلئے کاٹ دیجئے۔“

”تم پرلے درجے کے گستاخ ہو چکے ہو احسن۔ اچھا ہوا جلدی کھل گئے۔ اب چاہے تم زمانے بھر کی گندگی ہا

منہ پرل دو۔ شوہار کی دھول نہیں پاسکتے۔“

وہ غضبناک ہو کر چیخیں اور ریسور کریڈل پر بیٹھ دیا۔

چند لمحوں کے وقف کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

اس کی امی جو سانس درست کرنے لگی تھیں فوراً ریسور پر چھٹیں۔

دوسری طرف احسن ہی تھا۔

”بیٹو خالہ جان.....!“

”مت کہو مجھے اپنی ناپاک زبان سے خالہ۔“ وہ ہنسنیں۔

”فون بند کرنے سے پہلے میری ایک بات فور سے سن لیں۔ سارے تیر کمان سے نکل چکے ہیں۔ میں آپ کو نو

اپنے روبرو درمندرہ دیکھنا نہیں چاہتا لہذا اسدہ دھمکیوں کی زبان میں پلیئر گفتگو نہ کیجئے گا۔

اگر جو شبہ ہے کہ میں بد بانک رہا ہوں تو تفصیلات صاحبزادی سے پوچھ لیجئے۔“ اس نے کھٹاک کی آواز کے۔

فون بند کر دیا تھا۔

اس کی امی ریسور تھا سناٹے کے عالم میں کھڑی رہ گئیں۔

ان کی بھانج نے تو اطلاع دی تھی کہ ”سب ٹھیک ہے۔“

”پھر یہ کیا ہے؟“ معائنہ کو یاد آیا کہ ان کی بھانجی نے یہ بھی کہا تھا کہ شوہار کی ”رہائی“ مشروط ہوئی ہے۔ وہ

صرف اپنی ماں کو بتائے گی۔ انہوں نے کچھ خوف ماحسوس کیا۔

”شوہار.....!“ ان کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”جی امی.....!“ اس نے ڈرتے ڈرتے ماں کو دیکھا۔

”کن شرائط پر احسن تمہیں یہاں پہنچا کر گیا ہے؟“

شوہار ان کے تئیر دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا اور اس کے منہ سے جھٹکا۔ ادھر امی نے اس کا بھرتا بنایا۔

”آپ بیٹھو تو جائیں پہلے۔“ اس نے آہستگی سے ماں کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”اس طرح میرے نصیب کی کالک تو صاف نہیں ہو جائے گی جو تمہارے ہاتھوں میرے چہرے پر لگی ہے۔ تمہیں جو

پانا ہے بتادو۔ کھڑے بیٹھے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ان کے انداز میں ہلاکی مارا تھی تھی۔

”امی!“ احسن مجھے ہمیشہ کیلئے لے گئے تھے۔ لیکن مجھے یہ سب منظور نہیں تھا۔ صرف آپ لوگوں کی خاطر مجھے زبردستی

ان کی مرضی کے مطابق لکھ کر دینا پڑا۔“

”کیا لکھ کر دے آئی ہو۔“ ان کا دل ڈوبنے لگا۔

شوہار نے خوف زدہ انداز میں ماں کی سمت دیکھا۔

”امی..... اگر میں انہیں لکھ کر دینے پر راضی نہ ہوتی تو وہ مجھے کبھی نہ چھوڑتے۔“

”تو مروت کسکی تھیں۔“ ماں کا غصہ قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ ”کیا دیا ہے اسے لکھ کر بتاتی کیوں نہیں؟“

شوہار نے آہستگی سے وہ الفاظ دہرا دیئے جو احسن نے نکھوائے تھے۔

اس کی امی سر قحام کر دھپ سے بیڈ پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔

”تمہارے باپ کا کیا حراج ہے۔ جانتی ہو۔ یہ کیا غضب کرائیں۔“ ان کی آواز ٹکستے تھی۔

”میں نے یہ سب آپ لوگوں کیلئے اپنے بہن بھائیوں کیلئے کیا ہے۔“ وہ رو دی۔

”اس سے تو بہتر تھا کہ تم اس کے پاس رہ جاتیں۔ یہ گڑھا جو تم کو دھڑکائی ہو اس غلطی سے زیادہ خوفناک ہے جو احسن

نے کی تھی۔

میں تمہارے باپ کا سامنا کیوں کر کروں گی۔ تم بیٹی ہو اور وہ بھانجا۔ یہ کیا غضب کر دیا۔ احسن اگر مرد ہے تو

نہارے باپ کی ناک بھی کچھ کم نہیں۔ اب تک جو ہو سو کم ہے۔“

”پھر میں کیا کرتی.....؟“ وہ رندھی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”وہ مجھے کسی طرح بھی آزاد کرنے پر راضی نہیں تھے۔“

”وہ تمہارے باپ سے رخصتی کا مطالبہ کرے گا جس پردہ رگزر راضی نہیں ہوں گے۔ یوں پھر وہ تمہاری تحریر سے کام

لے گا۔ پھر تو شاید تمہارے باپ اسے جان سے ہی مار ڈالیں گے۔ تمہارے ساتھ ساتھ گویا میں بھی برباد ہو جاؤں گی۔“

”تو پھر بتائیے میں کیا کرتی.....؟“

”تمہاری ضد کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے۔ احسن اگر چہ میرا بھانجا ہے مگر جاوید اس کے مقابلے میں بہت دھیرا اور سلجھا

لا ہے۔“ وہ برہمی سے کچھ جتا رہی تھیں۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ روٹی رہی۔

ماں الگ سر پکڑے ٹھہر حال ہی نظر آئے لگیں تھیں۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

منیہ نے احرار کا کید کی تھی کہ وہ ”سانچے“ کی خبر احسن کو نہ دے کہ اب فائدہ بھی کچھ نہیں۔ جو قیامت آتا تھی وہ تو آ

ل۔

ٹھیکہ کی رخصتی ہوئے دوسرا دن تھا۔ گھر میں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ اچانک شیخ رحیم الدین کی بہن بچوں کے آگئیں۔

وہ گزشتہ بیس سال سے قطر میں تھیں۔ عموماً خاصے طویل وقفے کے بعد وطن آیا کرتی تھیں۔ صنفیہ کیلئے اپنی یہ نذر لئے بھی اہم تھیں کہ ان کی ایک بیٹی کی پرورش ان کے ہاں ہو رہی تھی۔ بیلا سے چھوٹی شائلہ کو انہوں نے گود میں لیا تھا۔ شیخ رحیم الدین کی بہن شمیمہ کے اپنے بھائی جو چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ بے اولاد نہیں تھیں۔ ان دنوں وہ پا کر آئی ہوئی تھیں۔ جن دنوں شائلہ صنفیہ کی گود میں آئی تھی۔

شیخ رحیم الدین نے ساتویں بیٹی کی آمد پر زمین آسمان ایک کر دیئے تھے۔ قریب تھا کہ صنفیہ میکے جا بیٹھتیں۔ شمیمہ بھائی کا رویہ اور بھادو کا ذکر محسوس کر کے شائلہ کو گود لے لیا۔ اس وقت ان کے ہاں تین بیٹے تھے۔ شائلہ کو گود میں کے بعد ان کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔

شمینہ کی آمد نے گھر بھر کر جیسے دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ شیخ رحیم الدین کسی کام کے سبب گھر میں نہیں تھے۔

اتنے گھر کے افراد پھر شمیمہ کے ہمراہ پانچ بچے۔ گھر میں جیسے کسی تقریب کا گمان ہونے لگا تھا۔

”ٹھیکہ کہاں ہے بھابھی جان.....؟“ شمیمہ نے ٹھیکہ کی نظر نہ آئی تو استفسار کیا۔

صنفیہ ہونٹ کاٹی رہ گئیں۔ ”یہیں ہے۔“ انہوں نے جیسے تند کو ٹالا۔

”یہیں ہے تو نظر کیوں نہیں آ رہی؟“ وہ حیران سی ہوئیں۔ انہیں بھادو کے انداز کچھ غیر معمولی سے محسوس ہو رہا تھا۔

”نظر بھی آ جائے گی۔ تم لوگ غسل وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ پھر سب ایک ساتھ شام کی چائے پیئیں گے۔“ وہ کھڑی ہوئیں۔

اسی دم باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ پھر کچھ توقف کے بعد کال بتل بجی۔ شمیمہ کے بڑے بیٹے نے دروازہ کھولا۔ ایک دم چونک کر پیچھے ہٹا ہوا دکھائی دیا۔

”شش..... ٹھیکہ باجی..... آپ!!“

صنفیہ بے قرار ہو کر دروازے کی سمت لپکیں۔ فیروزہ بھاری ساڑھی میں ملیں ٹھیکہ آگے بڑھ کر ان کے سینے سے لگی۔ اور اپنے انگوٹوں کو بدقت تمام قابو میں کیا۔

”کیسی ہے میری بیٹی.....؟“ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

”بہت اچھی ہوں۔ امی! آپ کی دعائیں ہیں۔“ وہ ان سے الگ ہٹتے ہوئے بولی۔

”امی.....! انعام صاحب بھی ساتھ ہیں۔“ اس نے آنکھوں سے ماں کو مطلع کیا۔

صنفیہ ایک دم سنبھل گئیں۔

انعام علی ٹھیکہ کے پیچھے ہی تو کھڑے تھے۔

”السلام علیکم۔“ ان کی آواز ابھری۔

”وعلیکم السلام۔ آئے انعام علی۔“ وہ ایک دم متواضع ہو گئیں۔

”تم کب آئے ٹیپ.....؟“ وہ مسکرا کر پوچھتی زاد سے مخاطب ہوئی جو ہلکا سا کسمی ٹھیکہ کو کسمی انعام علی کو دیکھ رہا تھا۔

”باجی..... یہ کون ہیں؟“ وہ خاصا پریشان دکھائی دیا۔

”تمہارے دولہا بھائی ہیں۔ گھر والوں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔ ساری بہنیں سرخوشی کی کیفیت میں اس کی سمت دوڑیں۔ شمیمہ جو ابھی تک ہاتھ روم کے دروازے تک ہی پہنچی تھیں ہلکا کھڑی نظر آئیں۔

ٹھیکہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔ ”السلام علیکم پھوپھو.....!“

”وعلیکم السلام!“ وہ ٹھیکہ کو گلے لگاتے ہوئے بھی حیران و پریشان نظر آ رہی تھیں۔

دہن کے روپ میں ٹھیکہ کو دیکھ کر جیسے ان کے ہوش و حواس گم تھے۔

”بھابھی جان! یہ سب کیا ہے؟“ اب ان سے رہا نہ گیا۔

”تمہارے اس سوال کا جواب تمہارے بھائی کے پاس ہے۔“ وہ کہتی ہوئی ایک طرف بڑھ گئیں۔

”ٹھیکہ! کیا ہے یہ سب؟“ اب وہ بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

”دو ہی ہے پھوپھو جو آپ دیکھ رہی ہیں۔“ ٹھیکہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

”یعنی میں اس قابل نہیں تھی کہ مجھے بھی اس خوشی میں شریک کیا جاتا۔“ ان کا دل سخت بدگمان تھا۔

”خوشی۔ ہونہ!“ شمیمہ نے راستے میں پڑی ہوئی ایک کرسی کھسکائی۔

پھر بیٹھک کی سمت چلی گئی جہاں انعام علی صوفے پر متمکن ہو چکے تھے۔

”السلام علیکم!“ شمیمہ نے سلام کرتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔

”وعلیکم السلام!“ انعام علی نے بھی اب نیلے کا جائزہ لیا۔

”سالی ہوں آپ کی۔“

”اچھا۔ اچھا!“ انہوں نے کوٹ کی ایک جیب سے سگار برآمد کر کے اس کا ایک سرا دانتوں سے پکڑنا شروع کر دیا۔

”میرے علاوہ پانچ بہنیں اور ہیں ٹھیکہ باجی کی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ انعام علی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”معلوم ہے۔ کیسے؟“ شمیمہ نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

”آپ کے والد صاحب نے اپنی فیملی سے مکمل غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔“ انہوں نے رسائی سے جواب دیا۔

”اوہ.....“ (شکر ہے باجی نے ان انکشافات کا خیال رکھا)

”شیخ صاحب گھر پر موجود نہیں ہیں؟“ انعام علی نے سگار سلگایا۔

”جی نہیں۔“

”اصولاً تو ٹھیکہ باجی کو کل آنا چاہئے تھا۔ کل تمام دن ہم نے ان کا انتظار کیا۔“ وہ گویا ہوئی۔

”کل ہم لچ اور ڈنر پر احباب کیے ہاں مدعو تھے۔“ پھر مختصر جواب آیا۔

”کل آپ سب گھر والے ہمارے ہاں ڈنر پر مدعو ہیں۔“ انعام علی نے گویا دعوت دے ڈالی۔

”ہماری پھوپھو بھی آئی ہوئی ہیں قطر سے مع فیملی۔“

”انہیں بھی ساتھ لائیے گا بہت خوش ہوگی۔“ بڑھل جواب آیا۔

”اتنے میں ٹھیکہ پھوپھو کو ساتھ لئے کرے میں داخل ہوئی۔“

”یہ انعام علی ہیں پھوپھو..... اور انعام صاحب یہ میری انگوٹنی اور حقیقی پھوپھو ہیں۔“

انعام علی نے بڑے سہاؤ سے انہیں سلام کیا۔

پھوپھو حیران پریشان ہی انعام علی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

براؤن سوٹ میں ملبوس انعام علی انہیں اپنے شوہر کے ”ہم عصر“ دکھائی دیے۔ ان کا دل ڈکھ سے لبریز ہو گیا۔ دوالوں کے رویے سے کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں۔

اپنے بھائی کے بارے میں ان سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا ہے بچی کے ساتھ۔ وہ کچھ رکی باتیں کر کے باہر اپنی بھادج کے پاس چلی آئیں۔

”کیا دیکھا ہے آپ لوگوں نے.....؟“ وہ ناراضگی سے پوچھ رہی تھیں۔

”مال..... ہم لوگوں نے نہیں تمہارے بھائی نے.....“ وہ سپاٹ لہجے میں بولیں۔

”اف خدا یا..... یہاں یہ سب کچھ ہو گیا۔ اور ہم کو خبر تک نہیں۔ کون کون شامل ہوا تھا شادی میں.....؟“

”کوئی نہیں۔ نیم لوگوں کی طرف سے نہ میرے سیکے والوں کی طرف سے۔“

”ایسی کیا آفت آئی تھی.....؟“ وہ جل کر پوچھ رہی تھیں۔

”ایسی مزید کی آفتیں آنے کا امکان ہے۔“ منیفہ تلخی سے بولیں۔ ”ابھی تمہاری پانچ بھتیجیاں اور موجود ہیں۔“

”اور..... احسن.....؟ احسن نے بھی مزاحمت نہیں کی؟“ وہ حیران نظر آئیں۔

”شیخ صاحب اسے گھر سے نکال چکے ہیں۔“ ان کی آواز رندمی ہوئی تھی۔

”کہاں ہے وہ.....؟“

”کراچی میں۔“

”اس نے باپ کے فیصلے کی خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس کی سزا ملی ہے۔“

”مجھے کیا خبر کہ اتنی قیامتیں آپ کی ہیں۔“ عجیب سے ملال شمینہ کے چہرے پر نقش تھے۔

”ابھی پانچ بچیاں اس گھر میں موجود ہیں۔ پانچ مزید قیامتیں مزید آنے کا امکان موجود ہے۔“ وہ تلخی سے بولیں۔

”گھر میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ بس بہت ہو چکا۔“ شمینہ جیسے تڑپ گئیں۔

”تم کیا کر سکتی ہو..... یہاں تو بیٹا در بدر ہو گیا اور اس شخص پر کوئی اثر نہیں۔“

”فیصل.....؟“ شمینہ نے بیٹے کو آواز دی۔

”جی ہاں.....؟“

ذرا اپنے پیٹ کو فون کر کے کہو کہ امی کہہ رہی ہیں منتی جلدی ہو سکے اسلام آباد پہنچیں۔“

”خیریت.....؟“ وہ چونکا۔

”تم بس فون نہ کر آؤ۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

کیوں ہولار رہی ہو عرفان کو۔ انہیں پریشان کرنے کا فائدہ.....؟“ منیفہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔

”بھابھی جان۔ جب تک عرفان نہیں آ جاتے، آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں۔“

اسی دم شیخ صاحب نے گھر میں قدم رکھا۔

مہمانوں سے ملنے وقت وہ قدرے خوش اخلاق نظر آیا کرتے تھے۔ درحقیقت انہیں اس بات کی قطعی پروا نہیں تھی

کون ان کے پاس آ رہا ہے اور کون نہیں۔

مگر اس وقت گھر میں موجود مختلف سمتوں سے آئے ہوئے مہمان موجود تھے۔ ان کی حقیقی بہن جوان سے چھوٹی بھی نہ تھی ایک مخصوص جذبہ اس کے لئے دل میں موجود تھا۔ پھر وہ ایسی مہمان تھی جو ”زیر بار“ نہیں کرتے۔ دوسری طرف ان کا بکھر صاحب حیثیت داماد تھا۔

اور پھر الف سے بے نیلک ان کا اپنا انتخاب تھا۔

لہذا گھر والوں نے ان کی خوش مزاجی خصوصیت سے محسوس کی۔

مگر شمینہ اندر ہی اندر اس بات پر بھائی سے سخت ناراض تھیں کہ وہ اپنے اہم فیصلے اور کام کرتے وقت انہیں اس طرح بول جاتے ہیں جیسے ان کا وجود ہی نہ ہو۔

عجب طرح کی بے قراری انہیں لاحق ہو گئی تھی۔ کبھی کسی بھتیجی کے پاس جا بیٹھتیں کبھی دوسری کے پاس یا پھر بلاوجہ پک کرے سے دوسرے کمرے کی طرف سفر شروع کر دیتیں اور آڑی تر بھی نظروں سے انعام علی کا جائزہ لیتیں۔

گذشتہ اوقات کا اجمالی خاکہ تو ان کی بھابھی ان کے گوش گزار کر چکی تھیں اور وہ سن کر سر بھی پیٹ چکی تھیں مگر بھائی کے سامنے بولنے کی ہمت ان میں بھی نہیں تھی کہ شیخ رحیم الدین کو کسی کا لٹا نہیں تھا۔

تھکلیہ کسی کام سے اسٹور میں گئی تو پیچھے پیچھے چلی آئیں۔

”چندا..... کیسے ہیں یہ انعام علی.....؟“ انہیں تھکلیہ پر ٹوٹ کر ترس آ رہا تھا۔ موقع پاتے ہی بھتیجی کے دل کا حال جاننا

۱۱۔

”دو ہی تو دن ہوئے ہیں مجھے ان کے ساتھ رہتے ہوئے۔ اب اتنی جلدی کتنا سمجھا جا سکتا ہے.....؟ اس نے کچھ

ار کی کا ثبوت دیا اور بڑا نپا تھلا سا جواب دیا۔

”ارے میرا تو کھانا پینا ہر روز چلا ہے۔ اتنی لمبی چوڑی سسرال ہے۔ کہاں کہاں اور کیا کیا باتیں سننے کو لیں گی۔ رحیم

مالی نے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے کبھی وجہ ہے کہ تیار ہو گئے۔ ہر کوئی ان سے ملنے ہوئے کھراتا ہے۔

میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی..... کہ یوں بھی کوسوں کا قافلہ پر رہتی ہوں۔ مگر مجھے تمہارے ساتھ ہونے والی اس

یادتی کا اتنا ہی ڈکھ ہے جتنا کہ بھابھی جان کو۔

مجھے ڈر ہے کہ رحیم بھائی دوسری لڑکیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ نہ کریں۔ تمہارے پھوپھا کو بلوایا ہے میں نے لاہور

سے وہ یہاں آنا نہیں چاہتے اور میں اصرار کرنا غیر ضروری سمجھتی ہوں۔ مگر اب ان کی موجودگی ضروری ہے۔ میں چاہتی

ہوں فیصل اور فیضان کا رشتہ مانگ لوں رحیم بھائی سے۔“

”جی.....؟“ تھکلیہ جو ایک صندوق کھول کر کچھ ٹٹول رہی تھی چونک کر بٹلی۔

”میرا ارادہ تو تھا..... مگر ذکر اس لئے مناسب نہیں سمجھا کہ بچے چھوٹے ہیں۔ فیصل اٹھارہ سال کا ہے اور فیضان سولہ

مال کا۔ فہد اگر اہل نابل نہ ہوتا تو میں تو تین بھتیجیاں اپنے گھر لے آتی۔ اب یہ یلصیب کی بات ہے۔ ابھی میں نے کسی سے

بات نہیں کی ہے۔ صرف تم سے کر رہی ہوں۔

جو میرے اختیار میں ہو گا میں تم لوگوں کیلئے کروں گی۔ نبیلہ، نائلہ، انیلہ تو لڑکوں سے بہت بڑی ہیں۔ البتہ راجیلہ اور

طلحہ کیلئے موزوں ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا.....؟“

تھکلیہ بے ساختہ ان کے گلے لگ گئی۔

”آپ کتنی اچھی ہیں پھوپھو کوئی تو ہے جو ہماری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہے۔“



”یو..... تمہاری خالائیں تو احسن کے گرن گائے نہیں تھکتی تھیں۔“ ثمنینہ نے تعجب سے کہا۔

”سچہ میں نہیں آتا کہ ابا جان نے آخر وہ کیا بات کہی ہے کہ خالو جان تمہارے کو طلاق جیسی لعنت دلوانا چاہ رہے ہیں۔“

”وہ تو کسی بھی شہزاد کو طلاق نہیں دیں گے۔ دیکھ لیجئے گا۔ مجھ تو ڈر ہے وہ کسی دن جا کر اٹھا کر ہی لے آئیں گے۔“

”مگر اس طرح تو مزید بگاڑ پیدا ہوگا۔ یہ تو نہیں ہوتا چاہئے۔ اور پھر مرد تو بہت زیادہ ناک والے بنتے ہیں اگر ناک

خیر، میں اس کو سمجھاؤں گی۔ تم فکر نہ کرو۔“ ثمینہ نے تسلی دی۔

و حلقہ دھلائے برآمدہ میں کرسیاں اور موٹر سے ڈال دیئے گئے تھے۔ درمیان میں دو میزوں پر چائے کچھ لوازمات کرا تھہر موجود تھی۔

”تم دونوں کہاں رہ گئیں تھی۔ آؤنا چائے شہنشاہی ہو رہی ہے۔“ صوفیہ نے ان کو اپنی طرف بلایا۔  
 نکھیل نے موجود لوگوں پر تفصیلی نظر دوڑائی۔

انعام علی نظر نہیں آئے۔  
 ”میں نے چائے اندر بھجوا دی ہے۔ تمہارے اباجی بھی وہیں ہیں۔“ صفیہ نے اس کی نگاہیں پڑھ لیں۔

”تم گلزار کرو۔ میں کبھی ایسی بات نہیں ہونے دوں گی کہ تمہیں اپنے مرد کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ جو جنگ ہے

اور میرے اور تمہارے باپ کے درمیان ہے۔“ خفیہ نے بیٹی کو خیریت یقین دلائی۔ اور بہت اطمینانی سی یہ جملہ کہا تھا۔

غمیہ چلی گئی تھیں۔ ان کے شوہر ایک دن کیلئے آئے تھے اور پوری سے تمام حالات جان کر اپنے دونوں بیٹوں کا رشتہ کرنے پر متفق ہو گئے تھے۔

بجران کے لمحات میں شہینہ نے تند ہوئے ہوئے ان کی ماں جانیں سے بڑھ کر ان کا ڈنکہ بنایا تھا۔ ان کا رواں رواز

اس گھرانے کی بچی ہمدرد ہے۔

پھر اس میں شک بھی نہیں تھا کہ بحران کے ہر لمحے میں شہینہ نے نجات دھندہ کا کردار ادا کیا تھا۔ ان کی بیٹی شہینہ ہاں پرورش پاری تھی۔ شہینہ کے بچے اسے اپنی حقیقی بہن سمجھتے تھے۔

شہینہ نے ٹائٹل کو کسی احساس نہیں ہونے دلا یا تھا کہ وہ ان کی کوکھ سے پیدا نہیں ہے۔

اسے زندگی کی تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ اس کے چہرے پر کھیتی خوشیاں اور طمانیت اس بات کا یقین ثبوت تھی کہ اس کی آغوش غیر معمولی اور کشش بے پناہ تھی۔ بہترین ماحول، بہترین رہن بہن اور عمدہ خوراک نے اس کو ایک دلکش آدم اور ممتاز شخصیت میں ڈھال دیا تھا۔ اگرچہ اسے حقیقت کا پتا چل گیا تھا مگر وہ چھوٹی بچی کے گھر میں بہت مطمئن تھی۔

نندہ کے جانے کے بعد انہوں نے دو گانہ نسل شکرانہ ادا کی تھی۔

بہت بڑے ذکھ کے بعد بہت بڑی خوشی..... قدرت نے عطا کی تھی۔

مگر احسن کے مسئلے کی پھانس ان کے دل میں ہنوز گڑی تھی۔

”کل میں احسن کو فون کروں گی اور اسے یہ خوشخبری سناؤں گی۔ کچھ اس کا بھی ذہن ہلکا ہوگا۔ میرا بچہ پریشانیوں پر گھرا ہوا ہے۔ اللہ اس کی حفاظت کرے۔ اسے خوشیاں دے۔ یہ خطا اتنی بڑی ہے شیخ صاحب کہ میں تمہیں مرتے دم تک معاف نہیں کروں گی۔ پتا نہیں میرا بچہ دھنک سے کھاتا پیتا بھی ہوگا یا نہیں؟ کیا اکیلا کر کے رکھ دیا ہے۔“

ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی وہ نماز کیلئے اٹھ گئیں۔

سب لڑکیاں برآمدہ میں نماز پڑھ رہی تھیں۔

شیخ رحیم الدین نے ایک نظر بیٹھوں پر ڈالی۔

”ناٹک کہاں ہے؟“ انہوں نے سلام پھیرا تو انہوں نے فوراً پوچھا۔

”اوپر ہیں اباجی.....!“

”اوپر کیا رہا ہے؟“ وہ بگڑے۔

”شام کے وقت چھت پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آس پاس کے گھروں کے سارے لوٹے لپاڑے اس وقت

اوپر ہوتے ہیں۔“

”وہ پڑھ رہی تھیں۔“ پھلانے سلام پھیر کر جلدی سے کہا۔

”ہونہ۔ پڑھ رہی تھی۔ بڑی پروفیسر ہے۔ پڑھنے سے فرصت نہیں ملتی۔“

صفیہ کا دل جل کر خاک ہو گیا۔

دل تو چاہا کہہ دیں کہ چہرہ لگا کر رکھا کریں چھت پر بھی۔ کہ وہ بھی آپ کی ریاست کا حصہ ہے۔“ کیوں کہ وہ ان سے بالکل بات نہیں کر رہی تھیں۔ بس سنگ کر سوچتی رہ گئیں۔

ناٹک نے باپ کی گرج چمک سن لی تھی۔ جلدی جلدی اپنی کتابیں اور کاغذ سیٹھنے لگی۔ کانوں کے پیچھے دو پلہ اڑسا۔

جیسے ہی اہنا سامان اٹھایا دل دھک سے رو گیا۔

سامنے والوں کی ایک کھڑکی آباد ہو چکی تھی۔

وہ سیٹی پر ایک انٹرن مقبول نئے کی دھن بجا رہا تھا۔

آتے جاتے راستوں میں بس میں محفلوں میں اڑتی پڑتی نظریں تو یوں بھی ”معمولات“ میں شامل ہوا کرتی ہیں۔ مگر براہ راست مخاطب کرنے کا یہ واقعہ انتہائی اور گہرا دینے والا تھا۔

گر پڑتے اس نے زینہ طے کیا اور کمرے میں جا کر کئی منٹ سانس درست کیا۔

”یہ کہن بیہودہ لوگ آگئے ہیں سائے؟“ وہ جیسے خود سے پوچھ رہی تھی۔

”نماز نہیں پڑھ رہی نیلی؟“ نیلہ جانے کب کمرے میں آگئی تھی۔

”پڑھ رہی ہوں آپا.....!“

”بیٹی ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گی؟“

”نہیں نہیں خالہ..... کہئے۔ منزه کا ویسے اکٹھے کئے بہت اٹھاکا سے خلاف تبدیل کرنے میں مگن تھی۔

”ہات یہ ہے دلہن۔ مجھے تمہاری ماں.....“ خالہ رگ گئیں۔

”ہاں ہاں..... کہئے۔“ منزه کے تحریک ہاتھ رگ گئے۔

”مجھے تمہاری ماں زندگی سے بیزار دکھائی دیتی ہیں۔ چار باتوں کے جواب میں ایک بات کرتی ہیں۔ جانے کیا بچی رہتی ہیں۔ میں تو خوش ہو رہی تھی کہ چلو تمہاری ماں آجائیں گی تو گھر میں ایک رونق ہوگی۔ میرا دل پہلے گا برا نہ مانا اب والی لگتی ہیں۔ حالانکہ جس مالدار آدمی کی وہ بیوی ہیں اس شخص کی تم بھی بیٹی ہو اور بلال بھی ہے۔ مگر تمہاری ماں تم سے تعلق ہیں۔“

”ارے نہیں خالہ.....! میری امی تو بے حد سادہ اور پیاری ہیں۔“ منزه نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔

”دولت سے تو وہ بے حد بیزار ہیں۔ آپ نے ان کے کپڑے دیکھے ہیں۔ گھر میں ملل کے دوپٹے اوڑھتی ہیں۔ رنگوا۔ رسونے کی دو چڑیاں میں نے ہوش سنبھالنے پر ان کے ہاتھ میں دیکھی تھیں۔ آج تک وہی پہنے ہوئے ہیں۔

پاپا جو رقم مجھے دیتے تھے پڑھائی کے دنوں میں جب میں ہاسٹل میں رہا کرتی تھی تو امی مجھے تاکید کرتی تھی کہ رقم سوچ کر خرچ کیا کرو۔ فضول چیزیں نہ خریدا کرو۔ کپڑے موسم کے اور کم بنایا کرو۔ دو جوتی جوتوں میں گزارہ ہو سکتا ہے تو ان مت خریدا۔ بے بسی جیولری مت خریدا کرو۔ لڑکیوں کو اتنی جیولری استعمال کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔

ضرورت مند اور مستحق لوگوں کا خیال رکھا کرو غریب بچوں کو یونیفارم اور کتابیں مہیا کر دیا کرو۔ تعلیم یافتہ ہو کر کسی مل میں جائیں گے تو تمہیں دعا سنیں دیں گے۔

اب بتائیے..... ان خیالات کی حامل خاتون کو طراز دار یا مغرور کہنا درست ہے؟ انہیں ہر لمحہ خدشہ رہتا تھا کہ پاپا میں بڑی رقم دے کر کہیں بگاڑ نہ دیں۔

جب چینیوں میں میں نو شہرہ میں ہوتی تھی۔

آف تو بے ای میرا ”ہوم اکناکس“ کا بیڑہ شروع کر دیتی تھیں۔ کہتی تھیں انکوئی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہیں نا کارہ مان بنا دیا جائے۔

امی اس بات سے بھی سخت ناراض ہوتی تھیں کہ سہیلیوں کے ساتھ جا کر آئے دن ریسٹوران میں ہوٹلز میں کھانا لایا جائے۔

میں پکانے سے بہت گھبراتی تھی تو مجھے ڈانٹ ڈانٹ کر کہن میں بھیجتی تھیں اور کہتی تھیں اگر تمہارے میاں کے پاس

اتنی دولت نہ ہوئی کہ وہ ہونٹ لگا کر اسے تو کیا بھوک مرو گی۔ انہوں نے پیسے کی فمائیس کبھی پسند نہیں کی۔

انہوں نے ہماری تربیت اس طرح کی جیسے کپڑا بننے کے لئے محنت سے تانا بانا تیار کیا جاتا ہے۔ کل بلال کو ڈانر رہی تھیں وہ کوئی دوسری ڈش تیار کرنے کیلئے کہہ رہا تھا کہ کیوں بہن کی ناک میں تنکا چلا کر رکھتے ہو جو پکنا ہے وہی کھانا پڑیو۔ پاپا کے پیسے تو کاغذات پر نقش ہیں۔ ان سے تو ملکی معیشت ہی مستحکم ہو رہی ہے۔“

منزہ عجیب انداز میں ہنس پڑی۔

”ہمارے گھر کے اخراجات عام گھروں سے زیادہ نہیں۔ امی کی جو باتیں میں نے آپ کو بتائی ہیں انہیں سن کر مگر اب آپ امی کو معذور کہیں گی.....؟“

وہ مسکرا کر خالہ سے پوچھ رہی تھی۔

”خاموش بہت رہتی ہیں نا..... پھر اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہیں اس لئے خیال آگیا کہ شاید ہم ان کے برابر کے نہیں ہیں تو.....“

”ارے نہیں خالہ..... ایسا کبھی سوچنے کا بھی نہیں۔“

”پھر کہیں ایسا تو نہیں..... خدا غواستہ انہیں کوئی دکھ ہو۔ ان کے چہرے سے لگتا ہے جیسے وہ کوئی خاص بات سوچ رہی ہیں۔“

منزہ کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔

اس نے خالہ کی سمت دیکھا۔ (واقعی خالہ بے حد گہری نگاہ رکھتی ہیں۔ تجربہ کار لوگوں کے سامنے احتیاط لازم رکھا جائے)

”نہیں نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس انسان کی اپنی طبیعت ہوتی ہے۔“ اس نے جھٹ خالہ کے خیال سے اختلاف کیا۔

”اور سنا میں خالہ.....! کوئی نئی تازی..... کوئی نیا شکار چھنسا.....؟ بلال کہیں جانے کیلئے تیار ہو کر لاؤج میں آیا تو خالہ دیکھ کر بھر رگ پھڑکی۔

”خالہ! کل میں شادی شدہ لوگوں کے خیالات پڑھ رہا تھا۔ ایک مشہور مفکر کہتا ہے۔ شادی ایسا دائرہ ہے۔ جو اند ہیں وہ باہر آتا چاہتے ہیں اور جو باہر ہیں وہ اندر جانا چاہتے ہیں۔ اندر کچھ گڑبڑ ہوتی ہوگی جب ہی تو باہر آنا چاہتے ہیں۔“

رحم کریں خالہ۔ کیوں آزاد پنجپھوں کے پر کاٹی ہیں۔ آپ ”نیرو“ سے غلام تو نہیں ہیں؟“

خالہ کا تو پارہ ہائی ہو گیا تھا۔ وہ ان کے ”کاڈ“ کے خلاف جو بولتا تھا۔

”یہ کم بخت نیرو کون ہے؟ اور مجھ سے کیوں ملارہا ہے؟“ وہ سلگ اٹھیں۔

”ہے نہیں تھا۔ روم کا بادشاہ۔ بے گناہوں کو جانوروں کی کھالوں میں بند کر کے ان پر بھوکے شیر چھوڑ دیا کرتا تھا۔ شہر جلتا تھا اور وہ بانسری بجاتا تھا۔ آپ بے چارے مردوں پر شیروں کی بجائے بیویاں چھوڑ دیتی ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔“

”دیکھ تو پتے گا اب۔ ارے اس کو اتنی باتیں پتا کیسے لگتی ہیں؟ میری اتنی عمر ہو گئی مجھے تو ہٹا تک نہیں کہ نام اور دم کے

”جو استاد پڑھاتے ہیں وہ تو یہ لوگ پڑھتے ہی نہیں۔“ منزہ نے بھی بلال کی کھنچائی کی۔

اسی دم ماں کو اندر آتے دیکھا تو ایک دم باہر نکل گیا۔

”بیٹے! لٹو کا کرو! کیوں بے چاری سیدھی سادھی خالہ کو ستاتا ہے۔“ وہ ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئیں۔

”بہت منع کرتی ہوں امی! باز نہیں آتا۔“

”ارے بدترین نہیں ہے! بس شرارتی ہے! خوش بخت بچہ ہے! اس کی فکریں اٹھانے والے موجود ہیں! بس بے فکری کی وجہ سے لاپرواہی پن ہے۔“ خالہ کو واقعی بلال سے کجی محبت تھی۔ جب ہی تو اسے کچھ کہنے بھی نہیں دیتی تھیں۔

”آپ سنا بیٹے کیا کر رہی تھیں۔“ خالہ نے روئے سخن ان کی جانب کیا۔

”بلال کی دادی کی برسی قریب ہے۔ قرآن پورا کر رہی تھی۔ ہم ان نیک لوگوں کے لئے اور کربھی کیا کتے ہیں۔“

”اے کیا بہت اچھی تھیں آپ کی ساس.....؟“ خالہ کو جیسے یقین نہ آیا۔

”ایک ڈھال..... ایک چھت..... ایک سائبان تھیں وہ میرے لئے۔“ منزہ کی امی نے ایک سرد آہ بھری۔ ”جنت مکانی میری ماں تھیں وہ ساس نہیں۔“

”اچھا.....!“ خالہ کو ایک ساس کی غائبانہ تعریف سے کچھ حیرت کچھ خوشی ہوئی تھی درندہ جس گھر جاتی تھیں زیادہ مواد ”ساس بہو“ کے رشتوں سے حاصل کرتی تھیں۔

اور خود ان کی اپنی ساس سے کبھی نہیں بتی تھی۔

”ان کی کی تو آج تک محسوس ہوتی ہے۔“

”جب آپ کو اتنا ملال ہے تو منزہ کے پاپا کو ماں کتنا یاد آتی ہوں گی۔“ خالہ نے اندازہ لگایا۔

منزہ کی نظریں بے ساختہ ماں کی سمت اٹھیں۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور دونوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے سے نظریں چرائیں۔

ایک ہفتہ بالکل خاموشی سے گزرا تھا۔

فون کی ہر گھنٹی پر اس کا دل دھڑک جاتا تھا۔ فون کی گھنٹی نہیں بجتی تھی گویا قضا کی آواز ابھرتی تھی مگر آج صبح جب فون کی گھنٹی بجی وہ کپڑوں پر اسٹری کرنے میں مصروف تھی۔ فون دانیاں نے اٹینڈ کیا تھا اور اس سے کہا تھا آپا احسن بھائی کا فون ہے۔ یہ سن کر تو اس کی ٹانگیں بے جاں ہو گئی تھیں۔

”امی کو کہو۔“ اس نے بدقت کہا تھا۔

اور جب امی نے فون پر اسے کہا کہ

”وہ اس سے کلام نہیں کرنا چاہتیں۔“

وہ اپنے خالو سے بات کرے جو رات کو آئیں گے۔“ اور انہوں نے ریسپونڈ کر رکھا تھا۔

تب سے رات کی آمد تک اس کی جان مولی پر لگی ہوئی تھی۔

اس نے ٹھیک دس بجے فون کی آواز سنی تو یقین ہو گیا کہ احسن ہی کا فون ہے۔ بھاگ کر باہر دم میں گھس گئی چند لمحوں کے وقفے کے بعد اس نے باپ کے قدموں کی آواز سنی۔ دل دھڑ دھڑ بننے لگا تھا۔

سردار صاحب نے ریسپونڈ کر لیا تھا۔

”ہیلو۔ بول رہا ہوں۔“

”میں تمہارے سلام کا جواب دینا بھی پسند نہیں کرتا۔ سنا تم نے۔“ وہ غضب ناک نظر آئے۔

”میں ہر شے ختم کر چکا ہوں۔ تم اپنی ہر قسم کی خوش فہمی دور کر لو۔“

”تم نے جبراً جو تحریر پجی سے لکھوائی ہے اس کا توڑ میں تلاش کر چکا ہوں۔ اب تم سے کورٹ میں بات ہوگی۔“

”خدا شہ ہے کہ اُلٹی جھٹکیاں لگیں گی۔“

”میاں کہنے کی حد تک ہر بات آسان ہوتی ہے۔ خیر مذاق۔“

”مجھے اتنے گواہ میسر ہیں کہ انتخاب کرنا ایک مسئلہ ہوگا۔ میں تمہاری طرح اکیلا نہیں ہوں سبھی۔“ وہ بری طرح

دھاڑے تھے۔

شہوار کی ٹانگیں کاچنے لگی تھیں۔

”تم نے جو میرے ساتھ کیا ہے میں نے اگر سبق نہ سکھایا تو نام بدل دیتا۔“ انہوں نے کٹاک سے ریسیور کر ڈیل

دے مارا۔

وہ پلٹے ہی تھے کہ کھٹی پھر بچے لگی۔

سردار صاحب نے آگے بڑھ کر پھر ریسیور اٹھایا۔

”دار پر بھی چڑھ جاؤ تو شہوار کی آواز نہیں سن سکتے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے اس سے۔ کیونکہ وہ میری اولاد ہے۔ وہی

کرے گی جو میں چاہوں گا۔ تم اگر سامنے ہوئے تو میں گولی مار دیتا۔ خبردار جو میں نے کبھی فون پر تمہاری منوس آواز سنی۔“

سردار صاحب نے ریسیور پھر کر ڈیل پر دے مارا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ ڈرائنگ روم میں ان کے کچھ دوست

آئے بیٹھے تھے۔

ورنہ وہ نوبے کے بعد اسی کمرے میں بند ہو جاتے تھے۔ شہوار انہی کے کپڑوں پر استری کر رہی تھی۔

وہ ہاتھ روم سے نکل آئی اور پھر استری کرنے میں مگن ہو گئی۔

ای بھی کمرے میں آگئی تھی۔

”احسن کا فون تھا۔ کیا کہہ رہے تھے تمہارے والد؟“ وہ خود گویا ڈر کے مارے شوہر کے پیچھے پیچھے نہیں آئی تھیں۔

”ناراض ہو رہے تھے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ظاہر ہے خوش تو نہیں ہو سکتے۔ مردوں کی اس جنگ میں ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے بری بن رہی ہیں۔ تم اگر جاوید

کیلے حانی بھر لیتیں تو یہ حالات پیدا ہی کیوں ہوتے؟“ وہ پھر ملول ہوئیں۔ ”تمہیں کیا پتا شیخ صاحب نے باپ ہونے

ہوئے بھی احسن کی کیا کیا باتیں بتائی ہیں۔ ایسے ہی تو کہا ڈپوٹ کو کمرے میں نہیں نکال دیا۔ اپنا پھل دار درخت بھی کوئی کاٹا

ہے۔ جب جوان پچاس گھر میں موجود ہیں۔

منیہ باقی تو ماں ہیں ظاہر ہے وہ تو اولاد کے عیب چھپانے پر مجبور ہیں۔ مگر ہم کس بنیاد پر اپنی بیٹی کو بھینٹ

چڑھا سکیں۔

جتنا درد انہیں اپنی اولاد کا ہے اتنا ہی ہمیں اپنی اولاد کا ہے۔ میں نے خط میں احسن کی کارروائی لکھ کر بھیج دی ہے۔

اب وہ بھی بیٹے کی حمایت نہیں کریں گی۔“

ماں بولتی رہیں شہوار خاموشی سے وارڈ روم میں کپڑے لٹکانے میں مصروف رہی۔

”سارے خاندان میں ہمارا اتنا شایا دیا ہے۔ جتنے مذاقی باتیں۔ میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔

”اب تمہیں کون بیانے آئے گا۔ کہتے ہوئے کی زبان تو نہیں پکڑی جاتی۔ ہزار وہ تمہارا قانونی و شرعی خاندان تھا مگر

اب بھر غائب رہنے کے بعد میں کسی کو کیسے یقین دلاؤں۔“

وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونے لگیں۔

”ہرے احسن..... تو بھی آباد نہیں رہے گا۔ تو نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔ میں نے تو تمہارے

اپنے کہہ دیا تھا کہ کروں احسن ہی کے حوالے۔ یہ اس کا نصیب ہے۔ کیا لڑکی ساری عمر گھر بیٹھا نہیں گے۔

گھر ان کی پھانوں والی غیرت..... انہیں ہم سب سے زیادہ اپنی ناک کی فکر ہے۔ آج بھی کوئی وکیل آیا تھا۔ دو گھنٹے

بٹار ہا جانے کیا باتیں ہوئیں۔“

شہوار کے کان تو کھڑے تھے مگر بظاہر وہ کام میں مگن رہی۔

”اے میرے اللہ.....“ انہوں نے ایک سرواۓ گھنٹی۔

ماں کو اس درجہ ڈکھی دیکھ کر شہوار کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ باہر نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آئی تو ٹیلی فون سو بج چکی تھی۔

وہ شوکر کے نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔

اچانک محسوس ہوا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹی دی لاؤنچ میں کچھ شور سا ہو رہا ہے۔ آج کل تو ویسے بھی اس کی جان سولی

لگا رہتی تھی۔

وہ ایک دم باہر آگئی۔

اور جو منظر اس نے دیکھا..... دیکھ کر چکر آ گیا۔

بغل میں چھڑی دبائے ایک سارٹ سا پولیس افسر سردار محبوب علی خان سے بات چیت میں مصروف تھا۔ اس کے

نہیں کچھ تھا جو وہ سردار صاحب کو دکھا رہا تھا۔

دو سپاہی اس کے پیچھے کھڑے تھے۔

انہی لڑاکا قسم کے تاثرات چہرے پر سجائے دو لیڈی پولیس اہلٹ کھڑی تھیں۔

”لڑکی کدھر ہے..... باہر نکالیں۔“

ایک لیڈی کی کورٹ آواز گونجی۔

شہوار کی ٹانگیں بے جان ہو چکی تھیں۔ اس میں اتنی ہمت بھی باقی نہیں رہی تھی کہ وہ بھاگ کر کسی کمرے میں بند ہو

لی۔

”بی بی..... لڑکی کو باہر لائیں۔“ لیڈی انسپکٹر اس کی امی سے مخاطب ہوئی۔

”آپ پہلے میرے شوہر کی بات تو سن لیں۔ دیکھیں وہ آفسر سے کیا بات کر رہے ہیں۔“ اس کی امی کی آواز بے حد

ترکی۔

”کبھی تمہارے شوہر کی بات سنیں۔ کبھی تمہاری لڑکی کے شوہر کی۔ ہمیں کسی بات سے مطلب نہیں۔

ہم وہی کرتے ہیں جو ہمیں حکم ملتا ہے۔“ توپ..... لیڈی انسپکٹر تھی کہ فولاد ڈھلا ہوا تھا۔

”اگر آپ اسے باہر لانے سے مجبور ہیں میڈم تو ہماری انسپکٹریہ کام خود بھی کر سکتی ہیں۔“

پولیس آفیسر..... شہوار کی اسی سے معمول کے انداز میں مخاطب ہوا۔

”کیا آپ لوگ انسان نہیں؟“

کیا آپ کے سینے میں دیں نہیں؟

کیا انسانوں کو تمنا شایانے ہوئے آپ کو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا.....؟“ وہ رو پڑیں۔

”دیکھیں میڈم..... ہم آن ڈیوٹی ہیں۔ اپنے فرائض پورے کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے کام کو پیچیدہ نہ بنائیں۔

پولیس آفیسر بڑی شائستگی سے انہیں سمجھا رہا تھا۔

”اگر آپ کی بیٹی اپنے شوہر کو خط لکھتی تو بات کمزور بھی ہو سکتی تھی۔ مگر یہ دیکھئے۔“ انہوں نے براہ راست قانون

مخاطب کیا ہے۔“

آفیسر نے فل ایکسپ کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر ان کے سامنے کی۔

”یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہماری بیٹی کی تحریر ہے“ صدے سے شاید ان کا ذہن تو ازن بگڑ رہا تھا۔

”جود خط لکھنا نامے پر موجود ہیں، وہی اس درخواست پر بھی ہیں۔ آپ ہمارا وقت ضائع کر رہی ہیں۔“ آئندہ

کاغذ موز کر جیب میں ڈال لیا۔

”بغیر کسی اجازت نامے یا بنیاد کے ہم آپ کو کیوں تکلیف دے سکتے تھے.....؟“

اس نے لیڈی پولیس کو اشارہ کیا۔ شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ یونہی وقت ضائع کرتے رہیں گے

کے عقب سے گھر والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

سیٹی کی آواز کے ساتھ۔ وہ دونوں اندر بڑھ گئیں۔

شہوار جس راہ داری میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ تار یک تھی۔ مگر لاؤنچ سے وہاں روشنی پہنچ رہی تھی۔

”ڈر شہوار..... ڈر شہوار۔“

لیڈی پولیس انسپکٹر کی کراخت آواز ابھر رہی تھی۔ جیسے کوئی میلے میں اپنا بچہ ڈھونڈ رہا ہو۔

ایک لیڈی کی نظر زاہداری میں کھڑی شہوار پر پڑ گئی۔ وہ اس کی طرف بڑھی۔ دوسری اندر سے نیلو کو اٹھا لائی۔

نیلو کی تو کھلی بندھی ہوئی تھی۔ آتے ہیں اسی سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔

شہوار کے تو جیسے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ درحقیقت وہ اپنے گھرانے کی ایسی تذلیل کا..... تصور بھی نہ

کرتی تھی۔

”تم..... ڈر شہوار۔“

”نن..... نن..... نہیں..... یہ.....“ نیلو نے کانپتے ہوئے بت بنی شہوار کی سمت اشارہ کیا۔ دونوں بہنوں کی

میں مشابہت بھی تو خاصی تھی۔

سردار صاحب کا سارا کور فرجھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ وہ پشت پر ہاتھ باندھے ہوئے ٹپکتے جا رہے تھے

آشام نظروں سے شہوار کی سمت دیکھتے جاتے تھے۔

وہ جس بات کو اپنے رسوخ کی وجہ سے بہت آسان سمجھ رہے تھے وہ بڑی مشکل ثابت ہوئی تھی۔

در شہوار کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نے تو ان کے سارے کس بل سیدھے کر دیے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید

نے اپنے نام کوئی تحریر لکھوائی ہے۔

مگر اس درخواست میں تو بیٹی براہ راست قانون سے مخاطب تھی۔

ان کو اب بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ غصے کے طوفان میں دانائی کے چراغ نہیں جلتے۔ بے عمل انا انسان کیلئے وہ

بڑی ثابت ہوتی ہے جو وہ خود اپنے پاؤں پر مارتا ہے۔ ان کی سوچ انتہا پسندی کی حدود کو چھو رہی تھی مگر قانون ان کے

مردمان تھا۔ سودہ مصلحت چپ تھے۔

آفیسر نے شہوار کے نکاح..... کی تصویر لیڈی انسپکٹر کو دی تھی۔ جسے دیکھ کر اس نے شہوار کو غور دیکھا تھا۔

”کیا اس کا میاں ساتھ نہیں ہے آپ لوگوں کے.....؟“ شہوار کی امی نے ”کسوٹی“ کی طرح شہوار کو بوجھنے پر غالباً

خاک کیا تھا۔

کہ میاں کی موجودگی میں اس طرح شائستگی کی ضرورت ہی نہیں نہ آتی۔

”بی بی چادر اوڑھنا چاہتو اوڑھ لو۔ اور کچھ لینا چاہتی ہو تو لے لو فوراً..... ہری اپ۔“ لیڈی انسپکٹر نے اپنی چھری

بلی۔

”میں کیا پوچھ رہی ہوں۔ اس کا میاں کہاں ہے۔“ اس کی امی ڈرا زور سے پولیس۔

”آپ برائے مہربانی ہمارے کام میں مداخلت نہ کریں۔ ہم انہیں خود ہی یہاں نہیں لائے ہیں۔“ آفیسر نے اچھتی ہوئی

لہر دار صاحب پر ڈالی۔ اور ڈر شہوار کے قریب چلا آیا۔

”بی بی..... یہ تحریر آپ ہی کی ہے ناں.....؟“ شاید وہ خانہ بدوی کیلئے پوچھ رہا تھا۔ مگر نہ نکاح نامے پر موجود خط کی

ہے تحریر ثابت ہو چکی تھی۔

شہوار کے اندر شاید مصلحت یا جھوٹ و بناوٹ سے کام لینے والی جس دم توڑ چکی تھی۔ اس نے غدا حال انداز میں سر کو

ہات میں جنٹل دی۔

”شاید تمہیں میرے اثر و رسوخ کا اندازہ نہیں ہے۔ آفیسر۔“ سردار صاحب کو بڑی دیر میں ایک موزوں جملہ بھائی

بہ۔

”مجھے افسوس ہے۔ مجھے اوپر سے حکم ملا۔ قلیل میری ڈیوٹی ہے۔ ہری اپ۔“ انسپکٹر نے جیسے سردار صاحب کی بات کو

نیت نہ دی۔ اور اپنے کام میں مصروف نظر آیا۔

”ای.....!“

ڈر شہوار چیخ مار کر ماں سے لپٹ گئی اور تڑپ تڑپ کر رو دی۔

”جلدی کرو بی بی۔ یہ روٹا ڈھونڈنا بند کرو۔“ لیڈی انسپکٹر کی کڑک دار آواز گونجی۔

سردار صاحب منہ پھیر کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔

گویا انہوں نے شہوار سے ہمیشہ کی لائق کا اظہار کر دیا۔

لیڈی پولیس نے شہوار کا بازو تھام لیا اور لے کر چلیں۔

”نیلو! جاؤ چادر لے کر آؤ اندر سے۔“

نیلو بھاگ کر اندر گئی اور کچھ توقف کے بعد آف دہانت خوبصورت چادر لئے چلی آئی۔

”شہوار۔۔۔ اوڑھ کر گھر سے نکلو۔“

چہرہ چھپا لو..... کسی جانے والے کی نظر نہ پڑ جائے۔ کاش تم پیچہ اوتے ہی مر جاتیں۔“ شوہر کے رویے نے ان کے



حرید اوسان خطا کرو۔ بیٹے تھے اس لئے بے تحاشہ جذباتی ہو گئیں۔

شہواری کی چٹکیاں بندھ گئیں۔

نیلو فرم جاتی ہوئی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

دونوں لیڈی پولیس اس کے دائیں بائیں تھیں۔ اسی دم دانیال اور نونل بھی اوپر سے آگئے۔ دونوں اسے ہی آن اڑ پروف بیڈروم میں تھے۔ اس لئے شاید ہنگامے کا پتہ نہ چل سکا تھا۔

عالم اب نیلو فرم نے انہیں چکا یا تھا۔

وہ دونوں حیران و ششدر اپنی آپا کو ”یونیفارمز“ کے جلو میں جاتا دیکھ رہے تھے۔

یہ انسان کی فطرت کا خاصا ہے۔

جب وہ مرنا نہیں چاہتا تو زندگی اسے خود زعمہ رہنے کے آداب سکھا دیتی ہے۔ وہ جو سرطان میں مبتلا ہے۔ اسے موت سے خوف ہے۔ تمام تر تکالیف کے باوجود حاصل حیات یہ چاہتا ہے کہ کوئی اسے زندگی کی امید دلاتا رہے۔ کوئی دلوالے کر آئے۔

جو کسی حادثے کا زخمی ہے۔

زندگی کی پیاس اسے بھی شدید ہے۔ وہ اپنا عضو کٹوا کر بھی زعمہ رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ جو دکھوں سے عاجز اسے بھی آنے والے کسی سکھ کا احتیال زعمہ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

جتنے آسمان پر تارے ہیں۔

اتنے شاید زندگی کے بہانے۔

زندگی کے راستے۔

پھر وہ تو ایک نوخیز کلی تھی۔

کیا وہ اتنی بات پر موت کو گلے لگا لیتی کہ اس کا شوہر اس سے عمر میں بڑا ہے مگر۔

یہ بھی تو کتنی پرکشش بات ہے کہ وہ شوہر کا ایک ممتاز شخص ہے۔

وہ اس گھر میں کیا آئی۔

جیسے کوئی دور افتادہ گاؤں کا باشندہ اچانک روشنیاں برساتے شہر میں آئے۔ پھر سب سے بڑھ کر وجود کے فطری تقاضے۔

وہ اپنے گھر میں بڑی تھی۔ پروقا تھی۔ اس کا مقام تھا گھر میں۔ اس لئے طبعاً سنجیدہ تھی۔ انعام علی نے اسے پروقا انداز میں اسے اپنائیت کا اظہار کیا کہ اس کا ”اصل“ مطمئن ہو گیا۔

اسے اتنے مہذب انداز میں چاہا گیا کہ اسے بہت کچھ نظر انداز کرنا پڑا۔

اتنے سہاؤ والا تیس سا انسان۔

کہ وہ بھولے لگی کہ اس کے گھرانے کی کمزوری سے قائمہ بھی اسی شخص نے اٹھایا ہے۔ اسے کتنے دن ہو گئے تھے کہ گھر میں حکمرانی کرتے ہوئے۔

انعام علی نے ایک دن بھی اس سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی تھی۔

دہانے رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے۔

گھر میں سارا دن بھی رہتے تو عمر و جوان دو لہا بننے کی بھونڈی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے کام میں مگن۔

گھر میں مصروف۔

اپنے تنہائی کے وہ لحاظ۔ جب دنیا پس منظر میں چلی جاتی ہے۔

وہ جمع دو چار کا حساب بند ہو جاتا ہے۔

جب انسان خالیتا ”اپنے“ لئے ہوتا ہے۔

وہ اس کی ذات کو باغ و بہار کر دیتے تھے۔ ہر فرق ایک موہوم کیمبر میں ڈھل جاتا تھا۔

وہ خٹک سامان بستہ سا پاک بڑس میں۔ دنیا کی گداز ترین زمین میں ڈھل جاتا تھا۔ وہ اسے ذات کا اعتبار بخشنے تھے۔

اس کی بہت ساری شکایتیں از خود رفع ہو گئیں۔ مرد باری اور سنجیدگی اس کا حراج تھی۔ اسے ہر چیز اپنے حراج سے ہم لگی۔

لال و پچھتاؤں کی کثیف فضا آہستہ آہستہ صاف ہونے لگی تھی۔

آج وہ معمولات سے فارغ ہو کر خانساں کو دوپہر کے کھانے کے پارے میں ہدایت دے کر نہادھو کر لان میں بال اٹے چلی آئی تھی۔

ہیز سٹ میں بے حد کھری کھری دکھائی دے رہی تھی۔

اسی دم چوکیدار نے گیٹ داکیا اور کوئی اندر آیا۔

وہ انگلیوں سے اپنے بال اٹھھا رہی تھی۔ ذرا چٹکی اور گردن موڑ کر دیکھا۔

لیو جنر اور پنک شرٹ میں ایک نوجوان لڑکا اسے بڑے کڑے طور کے ساتھ گھور رہا تھا۔

”آئیے۔۔۔۔۔ کس سے ملتا ہے۔۔۔۔۔؟“ ٹھیکیدار کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ سے۔“ فوراً جواب ملا۔

”مجھے۔۔۔۔۔؟“ ٹھیکیدار نے تعجب کا اظہار کیا۔

”مگر آپ کون ہیں۔ میں تو پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں آپ کو۔۔۔۔۔؟“ اس نے واقعی حیرانی سے کہا پھر مزید گویا ہوئی۔

”آپ اپنا تعارف کرایے تو شاید میں۔۔۔۔۔“

”مجھے بال کہتے ہیں۔ اور میں چناب انعام علی کا فرزند ہوں۔ مگر ان سے زیادہ ارجمند نہیں ہوں۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں سکرایا تھا۔



اسے اس وقت دیکھتی رہ گئی جب تک وہ گیٹ پارٹنرز کر گیا۔  
پھر پھر ہی تھی کہ امتحان ختم۔

معلوم ہوا کہ امتحان تو اب شروع ہوئے ہیں۔

اپنی۔ مجھے امتحانوں کیلئے تیار بھی تو کیا ہوتا۔

بک پیٹا ہے۔ ایک بیٹی ہے۔

ان کی ماں بھی تو ہوگی۔

ادلن مسلسل بارش ہو تو میری طبیعت گھبرا جاتی ہے۔

مصائب کی بوجھاؤ برساتی ندی میں ڈھل کر مجھے کہاں بہا لے جائے گی؟

وہ کسی کی پشت پر چڑھ نکائے ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

اس نے چادر کا کھونٹھٹ سا نکالا ہوا تھا مگر اس کی بے قرار اور شاکی نظریں ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

چند قدم کے فاصلے پر اسے وہ سرخ کا نظر آگئی جو احسن کی موجودگی کی علامت تھی۔

آفسر پہلے ہی اس کار کے نزدیک جا پہنچا تھا اور احسن سے بات چیت میں مصروف تھا۔ احسن نے کن اکھیدوں سے

بلو حال انداز میں آتے دیکھا۔ عجیب فائنڈی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر درآئی تھی۔

لیڈی کانشیل نے اگلا دروازہ کھولا۔

آفسر نے مسکراتے ہوئے احسن کا ہاتھ مگر خوشی سے دبا یا۔

”مگر کاری اعزاز“ کے ساتھ رخصتی مبارک۔

احسن کا بلند قبضہ شہوار کی رگ جال کو چھیدا مگر گر گیا۔

ادھر سے مرے انداز میں سیٹ پر ڈھسے گئی۔

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ احسن کا گریبان پھاڑ ڈالے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

اس نے لمن کے خواب ضرور دیکھے تھے مگر اس طرح نہیں۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر اسے دیکھ کر قہقہہ لگا رہا ہو۔

اور سردار محبت علی خان کو بچرے میں قید کر دیا گیا ہو۔

”آفسر! میں اس اتحاد پر آپ کا اہدہ مشکور ہوں اور اس کا ردوائی پر آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

”ویسے تو یہ ہمارا فرض ہے مگر اس انیشیاتی پر آپ کو سرزوار علی کا شکریہ ادا کرنا چاہئے مگر وہ آپ کے دوست ہیں اور

مست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ ڈون میٹروں یو گنڈ گئی۔“

”مس آپ گاڑی میں بیٹھیں۔“ آفسر لیڈی کانشیل کی سمت متوجہ ہوا جو ارٹ کھڑی تھی۔

”او کے سر۔“ وہ ایڑیوں پر گھوم گئی۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟“ احسن آفسر سے پوچھ رہا تھا۔

”مسئلہ وہاں کوٹ پوٹ فارم ہوتا ہے مسٹر احسن! اور میں اس وقت پوٹ فارم میں ہوں۔“

دونوں کا مشترکہ قبضہ فضا میں بلند ہوا۔

اس کے سر پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

”جی!“ اس نے انتہائی تعجب سے اس کی صورت دیکھی۔

”جی۔ شاید یہ آپ کیلئے انکشاف ہے۔“ وہ پھر استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

”آپ تشریف رکھئے۔“ ٹکلی نے خود پر قابو پاتے ہوئے کرسی کی طرف متوجہ کیا۔

”میں تشریف رکھنے کیلئے نہیں آیا۔ محض آپ کا دیدار کرنے پہنچا ہوں۔ ویسے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ روٹنائی میں کیا ہوا

کروں؟ کیونکہ میرے علم میں نہیں ہے کہ ماں کی روٹنائی کس طرح ہونی چاہئے اور اگر روٹن ماں کے روپ میں سامنے

اسے کیا پیش کرنا چاہئے۔“ بلال کا انداز بے حد کٹ دار تھا۔

”ویسے آپ کمال کی آرٹسٹ ثابت ہوئی ہیں۔ میرے پاپا کو محض متوجہ نہیں کیا بلکہ پورے کا پورا شکار کیا ہے۔ ایک

میں کو۔“ وہ طنزیہ کہہ رہا تھا۔

”آپ نہ جانے کیا سمجھ رہے ہیں۔“ ٹکلی کی آواز بلند ہو گئی۔

”جود کچھ رہا ہوں وہی سمجھ رہا ہوں۔“ وہ تنگی سے بولا۔

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ وہ پھر گھو گھو کیر آواز میں بولی۔

”آپ میرے پاپا کی نیگم ہیں۔ کیا یہ بات غلط ہے۔ اگر یہ بات غلط ہے تو اسے درست کر دیجئے۔“ وہ پھر مل

بولا۔ ”کس حیثیت سے تشریف فرما ہیں آپ؟“

وہ ناتواں انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”مگر ان کی نیگم کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”آپ تو واقعی لاعلم ہیں۔“ وہ عجب سے انداز میں ہنسا۔ ”خیر سے ہماری والدہ محترمہ حیات ہیں اور ایک صاحبزادہ

بھی ہیں ان کی۔ مسز منزہ خاور۔ دودو پیارے پیارے بچوں کی والدہ محترمہ۔ خدا حافظ۔ پاپا کو بتا دیجئے مگر ”میں“

تھا۔“

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جواس بات کا ثبوت تھا کہ احسن نے ”یونیفارم“ تک میں اپنی جڑیں پھیلائی ہوئیں ہیں۔ شہوار کے رخصت ایک سلسلہ وار بہتے رہے تھے جبکہ وہ جیج جیج کر دنا چاہتی تھی۔

”اچھا جی۔ خدا حافظ۔“

”خدا حافظ آفسر۔ زوار علی کو شکریہ پہنچانا نہ بھولے گا۔“

”بہت بہتر“ وہ پیشہ وارانہ انداز میں چلا ہوا جیج کی طرف بڑھا۔

احسن چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آیا۔

اور سیٹ سنبالتے ہوئے ڈرائور سے کھنکار کر گلا صاف کیا جیسے اسے متوجہ کر رہا ہو۔ اور اس احساس کے را اب وہ مکمل اس کی دسترس میں ہے شہوار کا کلیجہ دھک سے رو گیا۔

احسن نے چابی گھمائی۔ جیپ اس کی کار کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی۔

”اس کروفر کے ساتھ تو حسن بن طلال بھی ثروت کو لے کر نہیں گیا ہوگا۔“ احسن نے پیچھے دیکھتے ہوئے ایکسپلا اور شوٹی سے جملہ پھینکا۔

شہوار کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

چادر کے کھونٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ چمپا ہوا تھا۔ احسن کو صرف اس کی ناک نظر آ رہی تھی۔

”پردہ ہے پردہ۔“

پردے کے پیچھے پردہ نشین ہے۔

پردہ نشین کو بے پردہ نہ کر دوں تو احسن میرا نام نہیں ہے۔“

گاڑی دوڑ۔ پڑی تھی اور وہ منگٹنا رہا تھا۔

جیپ ہنوز پیچھے آ رہی تھی۔

”تمہارے پاس دائرہ لیس ہے؟ میں پیچھے آنے والی جیپ سے رابطہ قائم کر کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم سردار ما کی ریاست کی حدود سے باہر آچکے ہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں آپ لوگ واپس اسٹیشن جاسکتے ہیں۔“

وہ جی مہر کر شاید خطر نہ پاتا تھا۔

وہ خاموشی سے سسکیاں بھرتی رہی۔

احسن نے ایک کیسٹ لگا دی اس کی ایک ایک اداسے فتح مندی کا تاثر جھلک رہا تھا۔

کوئی سائبر دل کو بھلاتا نہیں

بے خودی میں بھی قرار آتا نہیں

رفیق کی دلسوز آواز گاڑی میں ابھری۔

”لا حول ولا قوت۔ یہ گیت تو تمہارے فراق میں سننے کیلئے تھا۔“ اس نے جھٹ کیسٹ نکال دی اور دوسری لگا دی

کیش کی آواز گونجنے لگی۔

جھوم جھوم کے ناچ ناچ..... ناچ ناچ آج

گاؤ خوشی کے گیت..... ہو ہو

شہوار کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ نکالی اور کھڑکی سے باہر اچھال دی۔ مگر کچھ بولی نہیں اسے وہ

ہی فرمت نہیں تھی۔

احسن نے قدرے حیرانی سے اس کی سمت دیکھا پھر مچلا ہوٹ دبا کر اسپینڈر بڑھا دی

احسن بالکل خاموش ہو گیا تھا اور بنور اس کی سسکیاں سن رہا تھا۔

جیپ ایک موڑ پر مڑ گئی تھی۔

خاصا طویل فاصلے طے کر کے وہ وہاں پہنچ گئے۔ جہاں پہلے ہی ایک بار آچکی تھی۔ احسن نے گاڑی سے اتر کر گیٹ کا ہکولا۔ پھر پلٹ کر اس کی سمت آیا۔

”تشریف لائیے۔“

وہ بے حال سے انداز میں اترنے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے چکر سے آ رہے تھے۔ احسن نے آہستگی سے اس کا بازو پکڑا اور اترنے میں مدد دینے لگا۔

کھڑے ہوتے ہی وہ لڑکھڑا گئی۔

احسن نے تشویش بھری نظروں سے دیکھا پھر سہارا دے کر اندر کی طرف چلا۔

”جس دن میں مگر رہتا ہوں اسی دن یہ دعویٰ کھات کھاتا ہے۔“ شیخ رحیم الدین تہہ بند اور بنیان میں جامہ زری افکار بے گھر میں دھاڑتے پھر رہے تھے۔

ایک تو محن میں پانی پڑا ہوا تھا۔ اس پردہ اس پانی میں سڑکڑ کرتے پھر رہے تھے۔

”وصل گئے ہیں لہاجی!“ نبیلہ نے بہت جھل سے جواب دیا۔

نائلہ بالٹی کپڑوں سے مگرے زینے طے کر رہی تھی۔

”ہونہ! کھڑے ہو تو کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھے ہو تو بیٹھے کیوں ہو؟ حد ہے اب یہ کام تو گھروں میں روزانہ ہی ہوتے ہیں۔ لہاجی کو چاہئے کہ ایک ٹائم ٹیل لگا دیں۔“

وہ کپڑے سے پڑا لے لگی۔

اسی دم ایک چنگ پانچ سے اس کے سامنے آگری۔

سفید چنگ پر بزم مار کر سے لکھا ہوا تھا۔ ”اس چنگ کے ذریعے“ مال“ کی پٹی کرائی ہے وصول کر لیں۔“

نائلہ کدل دھک سے رو گیا اس نے غصہ کر ادر ادر دیکھا بلکہ پہلے سامنے ہی دیکھا کہیں بھی کوئی نظر نہیں آیا۔

اس نے بنور چنگ کو دیکھا اس کی ذم سے ایک کاغذ پھر سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے ذم ہی پکڑ کر نوجلی۔

پھر ادر ادر دیکھتے ہوئے جلدی جلدی کاغذ الگ الگ کر کے کھولا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کاغذ پر لکھا تھا۔

”یہ حسن آپ کے کس کام کا؟ میرے نام لگا دینے میں کوئی حرج نہیں۔“

نائلہ پسینے پسینے ہو گئی۔ ایک دم اسے دھیان آیا کہ ”وہ“ اسے کہیں نہ کہیں سے ضرور دیکھ رہا ہوگا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس نے کاغذ کا ٹکڑا پرزے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیا۔ اور بڑے اعتماد کے ساتھ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”آپ نے غلط جگہ کا انتخاب کیا ہے محترم۔ ہم اس گھر میں کتنے ہی عکس سہی مگر ایسے سے نہیں ہیں۔ وہ اور کوئی گھر ہے جس کی وجہ سے یہ روایتیں نکلی ہیں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے سوچا۔

”باجی سے بھی شکایت نہیں کر سکتی کہ وہ تو قتل سے کم کوئی دفعہ ہی نہیں لگوائیں گے خود پر۔“

تیتی کے عذاب سے تو یہ آگ برساتا ہوا باپ ہی غیبت ہے۔ ورنہ تمہارے مزاج تو ٹھکانے لگوا ہی دیتی۔“ وہ ہی دل میں اسے لٹن طعن کر رہی تھی۔

وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے آئی تو ماں کو سستے کیفیت میں تخت پر بیٹھا پایا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا آپ؟“ وہ نیلہ کی سمت پٹلی۔

”خالو جان کا تارا آیا ہے۔“

”کون سے خالو کا؟“ نائلہ خوفزدہ نظر آئی۔ (کسی بری خبر کے سبب)

”سردار خالو کا۔ احسن بھائی شہزادہ کو لے گئے ہیں۔“

”ہائیں مگر کیسے؟ خالو جان کی موجودگی میں ایسا کیونکر ہو سکتا ہے وہ تو بڑے لمبے ہاتھ والے ہیں۔“ نائلہ کو جیسے یقین

نہ آیا۔

”یہ تفصیلات تو بعد میں یہ چلیں گی مگر اب معاملہ بہت بڑا گیا ہے۔“

”میرا بچہ ایسا نہیں تھا۔“ منیہ منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

”ایک یہ۔ ایک اس کا بیٹا۔ دونوں ولی اللہ ہیں۔“ شیخ صاحب نے مفید بات سن لی تھی۔ دور سے ہی جملہ پینکا۔

”ارے ناک کنوا دی ہے بد ذات نے۔“ شیخ صاحب اس کھلی شکست پر چوٹ کھائے ناگ کی طرح غضبناک نظر

رہے تھے۔

”میں پہلے ہی کہتا تھا کہ اس لڑکے کی سوسائٹی اچھی نہیں۔ ایک دن اسی طرح لڑکیاں لے لے کر بھاگے گا۔“

چٹکھا کر بولے۔

”جی جی۔“ لڑکیاں مارے غیرت کے گڑے رہ گئیں۔ شیخ صاحب تو کبھی بھی بولتے ہوئے احتیاط نہیں کرتے۔

تھے۔

”یہ سارا بگاڑ اس عورت کا ہے۔“

ان کی زبان ہمیشہ ”اس عورت“ پر آکر ٹوٹتی تھی۔

منیہ کے کان اس جملے کے عادی ہو چکے تھے لہذا وہ پھر مہر سے خاموش رہیں۔

”ابھی تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھنے ہوتا ہے کیا۔“ شیخ صاحب کمر پر ہاتھ باندھے سچ دتاب کھاتے صحن میں ٹہل

رہے تھے۔

”اس نے تو ناک کنوا دی ہے۔ انہوں نے تو قریبی رشتوں داروں کو نظر انداز کر کے بیٹی بیاہی ہے۔ اس سے

خاندان بھر میں کس قدر عزت افزائی ہو رہی ہے۔“

منیہ نے تنہی سے بڑبڑاتے ہوئے جملے دل کا پھپھوڑا شیخ صاحب اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

”پھر بھی امی! احسن بھائی نے اچھا نہیں کیا۔“ نائلہ نے ماں کی نرمی کو غلط مہنی پہناتے۔

”میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ اس نے اچھا کیا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے بڑے ہی اپنے چھوٹوں کو بڑبڑا دیں مہیا کرنے

ہیں۔

ہر چند کہ یہ چھوٹوں کی بڑائی اور سعادت مندی ہوتی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی غلطیوں کو نظر انداز کر دیں مگر ہر جگہ ایسا

نہیں ہے۔

اور میرا احسن بھی ایسا نہیں تھا۔ ٹیکلہ کی شادی نے اس کا مزاج بدل دیا ہے۔ جو ان جہان لڑکا۔ اپنی نظر سے دنیا

بچے کے قابل۔ میں نصیحتوں کے بل پر کب تک اسے زنجیریں پہناؤں؟

بہن کے دکھ اور آنے والے ایسے مزید ہولناک حادثوں کے واضح امکانات نے اس کے ذہن میں طوفان اٹھا دیے

۔ میں اس کی ماں ہوں جانتی ہوں اسے۔ پھر وہ خود بھی بہنوں کا بھائی ہے۔ جائے کہاں کہاں شو کریں کھاتا پھر رہا ہو

”مگر امی!“

”تم زیادہ ذہن پر بار نہ ڈالو۔ یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ میرا جدان کہتا تھا کہ آنے والے وقت میں شیخ

جب کو ایسے دن دیکھنے پڑیں گے۔

ہر مرد کیلئے ایما لگیم۔

اور ہر فرعون کے لئے موسیٰ۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ مجھ بے سہارا پر جو تم ٹوٹے وہ تم شے تم نے سب نہیں دیکھے۔“

ان کو جانے کیا کیا یاد آیا۔ تو انک سلسلہ وار پہننے لگے۔

نائلہ نیلہ منیہ کی تربیت یافتہ بیٹیاں تھیں۔ وہ باپ کے لئے نمرود اور فرعون کے استعارے برداشت نہیں کر سکتی

ن۔ خاموشی سے ماں کے پاس سے اٹھ گئیں۔

”اس طرح احسن بھائی کوئی کمال تو نہیں کر رہے۔“ نائلہ نے کمرے میں داخل ہو کر جل کر کہا تھا۔

”یہ ایسی برفارمنس نہیں ہے جس پر داد دی جائے۔ اس طرح ای کی کوئی مدد نہیں ہو رہی بلکہ الٹا مزید پریشانیوں میں

رہائیں گی۔“

نائلہ بے حد سچ پا نظر آرہی تھی۔

”اور شہزادہ آقا تو اتنی خور پری بھی نہیں ہیں کہ ان کی خاطر نسلوں کی جنگ مول لی جائے۔ ظاہر ہے وہ بھی بھائی جان

انصوبے میں شامل ہوں گی۔ یہ کام اکیلے تو نہیں ہو سکتا تھا۔“ نیلہ نے بھی بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اب دیکھئے گا۔ یہ قصہ ہزاروں بار ہمارے سامنے لوگ دہرائیں گے۔ بہت اچھا سپورٹ کر رہے ہیں احسن

نائلہ طحڑیہ بولی۔

”اب کیا ہو سکتا ہے۔ لیکر پیٹنے سے کیا حاصل؟“ نیلہ نے قصہ کوتاہ کرنا چاہا۔

”ایک احسن بھائی کا قصہ کیا ٹیکلہ باجی کی شادی بھی تو ”انہونی“ ہے خاندان کیلئے۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”باپ بھائی سے شکھ ہی نہیں قسمت میں نصیب ہی برے ہیں کیا کر سکتے ہیں۔“

نائلہ کی آواز رندہ گئی۔ وہ کرودت بدل کر لٹ گئی غالباً آنسو چھپانے کی کوشش تھی نیلہ خاموش ہو کر رہ گئی۔

تم اپنے ذہن کو اس طرف سے ہٹاؤ بلال۔ مجھے تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔

منزورہ نے بڑی جیسر پر جھولتے بلال کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا پیشانی سے بال سینے۔

”آپنی آپ ذرا سوچئے۔ تمنا نہیں ہے یہ ہمارا۔“

”بلو۔ میرے چاند۔ میرا امی کا تم خزانہ ہو۔ سرمایہ ہو۔ مت پرواہ کرو۔“ منزورہ کی آنکھیں بھر آئی۔

”مگر آپ! احد ہوتی ہے۔ اگر ان کو شادی ہی کرنا تھی تو اپنی ہم عمر خاتون سے کر لیتے۔ سچ آپ جتنی ہوں گی دور۔“  
 ”تم سے کس طرح ملیں؟“ منزوہ نزدیکی موڑے پر بیٹھ گئی۔ اپنے غم تو وہ بلال سے پوشیدہ ہی رکھتی تھی۔  
 ”میں زیادہ دیر وہاں ٹھہر رہی کب۔ سخت غصہ آ رہا تھا مجھے۔“ وہ بگڑے بگڑے انداز میں بولا۔  
 ”پھر بھی کچھ اندازہ ہوا ہوگا؟“

”وہ حوض کوثر میں بھی وصل کر آ جائیں تو میں انہیں پسند نہیں کر سکتا۔“ وہ بگڑ کر بولا۔  
 ”سمجھ میں نہیں آتا انہیں کیا مجبوری لاحق تھی! اچھی خاصی حسین خاتون ہیں۔“  
 ”کیا واقعی؟“ منزوہ کی دلچسپی بڑھی۔

”مگر آپ! ابندہ خواہ کتنا ہی حسین ہوا اگر اعمال نا پسندیدہ ہوں گے تو اس کی صورت بھی دیکھنے کو دل نہیں چاہے گا۔“  
 ”مگر بلال اس میں ان کا کیا قصور؟“  
 ”خوب کئی۔ قصور کیسے نہیں۔ فتنی فتنی دونوں کا شیر ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو قبول کیا ہے۔“ اس کے  
 میں استہزاء تھا۔

”بلال! ایسے انداز میں پاپا کا تذکرہ نہیں کرو بدتمیزی ہے یہ۔ بہر حال وہ ہمارے باپ ہیں۔ سر پرست ہیں۔ ہم  
 نے ہمیں کسی چیز سے محروم نہیں رکھا۔“

”انہوں نے اپنا آپ ہمیں میسر نہیں آنے دیا۔ یہ محرومی ان کی ہر لوازش پر بھاری ہے۔“  
 ”یہ غلط ہے بلو! انہوں نے تمہارے ناز اٹھانے میں کوئی کمی نہیں کی۔ گوشہ کی سڑکیں ہوں یا کراچی کے پارک  
 ایسٹ آباد دوسری کے پھاڑ بونہرہ ڈار۔ پاپا کی اگلی پکڑ کر تم ان مقامات پر اپنے نقش ثبت کر چکے ہو۔ جو انہوں نے کیا  
 وہ مت خالص کرو۔“ منزوہ نے سمجھایا۔

”سمجھ میں نہیں آتا آپ! آپ ان کی اتنی وکالت کیوں کر رہی ہیں؟“ وہ چڑ کر بولا۔  
 ”بدتمیزی نہیں کرو بلال۔ یہ ”ان“ کیا ہوتا ہے۔ پاپا ہیں وہ ہمارے۔“  
 ”وہ میری امی کے مجرم ہیں۔ میں انہیں معاف نہیں کر سکتا۔“  
 وہ ہاتھ میں پکڑا سیکرین میز پر پٹخ کر ہار نکل گیا۔

”کس بات پر بگڑ رہا ہے یہ؟“ منزوہ کی امی نے کمرے میں داخل ہو کر استفسار کیا۔  
 ”کسی بات پر نہیں امی! آئیں نہیں۔“

”کوئی تو بات ہوگی۔“ ماں نے گہری نگاہوں سے بیٹی کا جائزہ لیا۔  
 ”جی نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں۔“

”اپنے پاپا سے مل کر آیا ہے؟“ وہ افسردگی سے پوچھنے لگیں۔  
 ”جی۔ وہاں گیا تو تھا۔“

”اپنی دوسری ماں سے بھی مل کر آیا ہے۔ شاید اسی لئے پریشان ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔  
 منزوہ جڑ بنیاد سے مل کر رہ گئی۔

”امی! وہ تعجب و حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”آپ کو بتا ہے؟“ اسے بہت سارا رونا آ گیا

”ہاں۔ بھلا مجھے کیوں پتا نہیں ہوگا۔ انہوں نے مجھے اطلاع دے کر یہ کام کیا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔  
 ”بہت عرصے کے بعد وہ گوشہ پہنچے تھے صرف یہی اطلاع دینے۔“ وہ مسکرا دیں۔

”یہ تو بہت ظلم ہے امی۔ اور آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“

”آہ۔ ہاں۔“ انہوں نے گہری سانس بھری۔

”کیا فرق پڑتا ہے بتانے سے بیٹے۔ ناحق بچوں کے ذہن الجھاتا۔“

”امی آپ نے پاپا کو روکا بھی نہیں۔“ منزوہ کے عجیب سے احساسات ہو رہے تھے۔ اگرچہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ  
 اس سوسائٹی کو پاپا مود کرتے ہیں۔ اس سوسائٹی میں یہ ایسی کوئی حیرت یا شرم کی کوئی بات نہیں۔

”میں ان پر اس قسم کے حقوق جتانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔“ ان کا گلہ پھر اب کچھ سفید بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔  
 منزوہ کو نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی ماں کے دکھوں کی انتہا نہیں ہے مگر اس کی عجیب پوزیشن تھی۔ ماں کے

انٹے بھی۔ بلال کے سامنے بھی۔ اسے خود کو بھی بے حد مضبوط اور خوش باش ظاہر کرنا از حد ضروری محسوس ہوتا تھا۔  
 ”امی! آپ کو دکھ تو ہوا ہوگا۔“ اس نے ماں کی توجہ ہٹانے کو یونہی بات کی۔

”تمہارے پاپا کی دوسری شادی کا؟“ انہوں نے استغما یہ انداز میں پوچھا۔

منزوہ خاموش رہی۔

”یہ تو ایک دن انہوں نے کرنا تھا۔ رہی میرے دکھ کی بات۔ اللہ تمہارے سر پر تمہارے باپ کا سایہ قائم رکھے۔ وہ  
 رہے تھے ہی کب؟ اور بیٹی چھوڑو۔ تم کن چکروں میں پڑ رہی ہو۔ بلال کو بھی سمجھانا کہ باپ سے نہ الجھے۔ یہ ان کا حق

ہاں کیا گورت انہیں مطمئن اور خوش نہ رکھ سکے تو وہ دوسری کر لیں۔“ وہ اپنی تسبیح اٹھا کر کھڑی ہو گئیں۔  
 ”مگر امی! کوئی عمر۔ کوئی وقت۔“

”یہ سب بے کار چیزیں ہیں بیٹی۔ وقت دوسری ٹھہرا کرتے ہیں۔ ذہن پر نقش ہوا کرتے ہیں۔ جب انسان کو سب  
 مزیدادہ خوفزدہ اور مایوس کرنے والا غم ملتا ہے۔ ایسے غم کی یاد کبھی نہیں مٹتی۔

دوسرا وہ وقت۔ جب غیر یقینی حالات میں من چاہی خوشی ملتی ہے۔ ایسی خوشی ہمیشہ یاد آتی ہے۔ باقی ہر قسم کا وقت  
 ڈسنے کیلئے ہے۔

میرے ہاں بھی ایک وقت مدت سے ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اسی وقت۔ اسی زمانے میں ہمیشہ کیلئے قید ہوں۔  
 پروردگار نہ کیا قصہ ہو رہے ہیں۔ میرا دل و ذہن اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے تو تمہیں کہہ رہی ہوں کہ تم پر وہ

ل کرو۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا۔“  
 ”امی! منزوہ مسک پڑی۔

”امی آپ کا غم مجھے ناروا لے گا۔“

وہ جھک کر منزوہ کی پیشانی کو بوسہ دینے لگیں۔

”میری زندگی تم پر غماز میری بیٹی۔ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتی۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں میں  
 اور خوش ہوں۔

تم دونوں کو دیکھتی ہوں تو اپنے اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے اولاد دی۔ مجھے ماں بنایا۔ تم دونوں کے حوالے  
 مجھ پر ایک نئی اور خوبصورت دنیا کھلی۔ اب تم بھی ماں ہو۔ محسوس کرتی ہوگی کہ ماں بننے کے بعد عورت کی فکر کا زیادہ



حصہ اپنی اولاد کے بارے میں ہوتا ہے۔  
میرے ذہن پر بھی مدت سے تم لوگ سوار ہو۔ تمہارے بارے میں ٹھکر کرنا بھی ایک خوشی، ایک مصروفیت ہے۔  
”اس کی ای کتنی ذہین ہیں۔ کس خوبصورتی سے بات پلٹ دی ہے۔“ منزہ نے محبت بھرے شاکي انداز میں مار دیکھ کر سوچا۔

”ارے دلہن! یہ بلال کہاں غائب ہے؟  
ارے اس نے کیسا پریشان کیا ہے۔“ خالد انتہائی پریشان حال میں داخل ہوئی تھیں۔  
”اللہ خیر کرے۔ خیر تو ہے۔“ منزہ ٹھکر مند نظر آئی۔  
”ارے تین تصویریں۔ اے مگر تم اسے کچھ نہ کہنا۔ میں خود نٹ لوں گی۔“ خالد فوراً بات بدل گئیں۔  
”پھر بھی۔“ اب منزہ کی امی نے بھی استفسار کیا۔  
”ارے تین تصویریں لے کر چلا ہوا ہے۔ کہہ رہا تھا ایک پسند کر کے بتادوں گا۔“  
منزہ کی امی نے سر پیٹ لیا۔

”ارے آپ! آپ کیوں پرانی بچیوں کی تصویریں اس طرح دیتی ہیں۔“ انہیں برا محسوس ہوا۔  
”کہہ رہا تھا ایک پسند کر کے بتادوں گا۔ ارے اپنا پیجہ ہے۔ جانتی ہوں میں اسے اچھی طرح۔“  
”ارے۔“ خالد۔ یہ آپ نے کیا بھاڑ اچھڑوایا ہے۔“ بلال بڑی جگت میں داخل ہوا۔  
”بلال!“ منزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”آپ! اسد بھائی آئے ہوئے ہیں۔ یہیں بلالوں؟“ وہ جلدی سے بولا۔  
”ہاں۔ ہاں بلالو بیٹا ہے ہمارا۔“ منزہ کی امی پھر بیٹھ گئیں۔  
”السلام علیکم؟“ سفید شلوار قمیض میں ملبوس شائستہ اطوار کے ہمراہ اسد داخل ہوئے۔  
”چلو تین تصویریں فوراً لے کر آؤ۔“ منزہ نے بلال کو حکم دیا۔ جبکہ دونوں بزرگ خواتین اسد سے علیک سلیک مصروف ہو گئی تھیں۔

بلال نے منزہ کا مود ویکھا پھر باہر چلا گیا۔ چند منٹوں بعد واپسی ہوئی تو ہاتھ میں لٹافہ تھا۔ اس نے خالد کے ما ڈال دیا۔

”ادھر دکھا نہیں خالد!“ منزہ نے لٹافے کی سمت ہاتھ بڑھایا۔

”ارے بہت اچھے خاندان کی ہیں۔“  
”خالد کا کلائنٹ کبھی برے خاندان سے ہوئی نہیں سکتا۔“ بلال نے خراب موڈ کے باوجود گڑا لگا یا۔  
”اچھا تو چپ کر۔“ خالد نے ٹوکا۔ وہ اسد کی موجودگی کی وجہ سے تفصیلات بتانے کیلئے بے چین نظر آ رہی تھیں۔  
منزہ نے لٹافے سے تینوں تصویریں نکال کر شرارت سے اسد کے سامنے ڈال دیں۔

”اسد بھائی! شاید آپ کی چاک شدہ پبلی ان میں سے کوئی ہو۔“  
اسد نے اچھٹی ہوئی نگاہ تھنادر پر ڈالی اور لا پرواہی سے مسکرائے۔  
”بھابھی جنہوں نے ملنا ہوتا ہے وہ ایک دن مل جاتے ہیں۔ ترکیب وقت میں اس خوبصورت حادثے کا وقت مقرر ہوتا ہے تصویروں سے بات نہیں بنتی۔“

”تو کیا آپ رو بردو کھانا چاہتے ہیں۔“ خالد جلدی سے پوچھ بیٹھیں۔  
”ابھی تو میں کچھ بھی نہیں چاہتا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔  
”مگر دیکھ لینے میں حرج کیا ہے؟“ منزہ نے شرارت سے کہا۔

”ہماری بات ہے۔ عورت کوئی فٹل تو نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے گھر کی خواتین کیلئے عزت و قدر پسند کرتے ہیں تو پھر یہ سیدھا ہر گھر کیلئے مقرر ہونا چاہئے۔“

”کتنایک بچہ ہے۔ مگر بیٹے اب تم کرتی لو۔ یہی عمر ہوتی ہے۔“ خالد نے ہمت نہ ہاری۔  
”اسد بھائی! آپ کی عمر تک تو میں چار کر لوں گا۔“ بلال نے کن آنکھوں سے خالد کو دیکھا۔  
”اے ہاں۔ کرے گا یہ چار۔ تیرے تو باپ میں بھی ہمت نہیں ہو سکتی دو کرنے کی۔ اور۔“  
کمرے میں جیسے کوئی بڑا شیشہ ٹوٹا۔  
جبب سی جھن چھناک کالوں میں گونجی۔

اسد نے ایک لمبے میں بدلتا ہوا ماحول شدت سے محسوس کیا۔ جبکہ بلال باہر نکل گیا تھا۔  
خالد جان اپنی جگہ حیران پریشان تھیں کہ ان کے منہ سے آخر کیا ”سرزد“ ہو گیا ہے۔

”آؤ بیٹی! آخر سے آج کیسے آتا ہوا؟“ منیفہ نے کچن کے دروازے میں کھڑے کھڑے استقبال کیا۔  
”السلام علیکم۔ خالد جان۔ نالکہ آیا ہیں؟“

”ہاں ہاں۔ نالکہ گھر میں ہی ہے۔ آج کیسے نالکہ یاد آگئی؟“ منیفہ نے مسکرا کر پوچھا۔  
”مجھے سندھی ٹوٹی سیکھنا ہے ان سے۔ موناجی کہہ رہی تھیں کہ نالکہ آپا کو آتی ہے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ نالکہ۔“ بھی کہاں ہو۔ یہ روٹی آئی ہے۔“ منیفہ نے نالکہ کو آواز دی۔  
”بی امی!“ وہ بال سلجھا رہی تھی۔ برش اور بال ہاتھ میں تھامے چلی آئی۔

”السلام علیکم آپا! کام سے آئی ہوں آپ کے پاس“ روٹی نے مسکرا کر نالکہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔  
”ہوں بلو۔“ نالکہ کو شاید اس کی آمد پر تعجب تھا۔ جب سے یہ نئے مسائے آئے تھے یہ لڑکی دوسری بار آئی تھی۔ اس سے پہلے تو سامنا ہونے پر دیکھ کر مسکراتی تک نہیں تھی۔

”آپ کو سندھی ٹوٹی آتی ہے؟“

”ہاں۔ سیکوگی یا ہواؤ گی؟“

”سیکھنے آئی ہوں“ وہ مسکرائی۔ ”سکھا دیں گی؟“

”کیوں نہیں۔ کیا جاتا ہے سکھانے میں۔ ٹھہر دو رامیں چوٹی باندھ لوں۔“

”ماشاء اللہ آپا آپ کے بال کتنے خوبصورت ہیں۔“

منیفہ باہر چلی گئی تھیں۔ نالکہ نے جواب میں صرف ایک مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔

”باتی لوگ کہاں ہیں؟“ روٹی نے کھڑکی سے پار جھانکا۔

”بھیں ہیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔“ نالکہ نے چوٹی آگے کر کے بل ڈالنا شروع کئے۔

”آپ کے ابا جی تو نہیں ہیں مگر میں؟“ روٹی کو اچانک کچھ یاد آیا تو گھبراہٹ مئی۔

”ہیں تو گھر ہی، مگر تم بے فکر رہو۔ کچھ نہیں کہیں گے تمہیں۔“ نائلہ کے لہجے میں عیب سی فلتکی درآئی تھی۔  
 ”میں نے سنا ہے وہ لوگوں کا اپنے گھر پر آپنا پسند نہیں کرتے۔“ روہی نے گہری نگاہ سے نائلہ کو دیکھا۔  
 ”وہ تو اور بھی بہت سی باتیں ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں سنا ہے؟“

وہ تکی سے ہنس کر پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ روہی نے کچھ حیرانی سے انکار کیا۔

”چلو چھوڑو۔ کپڑا فریم وغیرہ لائی ہو؟“ نائلہ برش صاف کر کے ٹوٹے ہوئے بال لپیٹنے لگی۔

”سب چیزیں لائی ہوں۔ ہاں چھتاری نہیں ہے۔ ریشم کی ریل سے کام چل جائے گا؟“

”ہاں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ ٹھہرؤ میں یہ بیچک آؤں۔“ وہ ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے بالوں کا ”پارسل“ لے کر باہر نکلی۔

اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئی۔

”لاؤ“ اس نے ”سامان“ ہاتھ میں تھا پھر آسانی کپڑے کا ٹکڑا فریم پر چڑھایا۔ بڑے انہماک سے ریشم سوئی پرویا۔ کپڑے میں سے سوئی نکالی۔ اور روہی کو متوجہ کیا۔

”یہ دیکھو۔“

”آپا!“

”ہوں۔“

”مجھے سندھی بوٹی کا رخصتی آتی ہے۔“

”ہوں۔ ہائیں۔“ نائلہ نے روہی میں پہلے تو ہوں کہہ دیا پھر بری طرح چوکی۔

”مگر تم ہی تو کہہ رہی تھیں کہ سندھی بوٹی۔“

”جی میں نے کہا تھا مگر یہ تو صرف بہانا تھا۔ آپ سے تنہائی میں ملنے کا۔“

نائیلہ حیران پریشان اس کی صورت دیکھنے لگی۔

”میں آپ کے پاس ایک کام سے آئی ہوں۔ مگر وعدہ کریں کہ نہ ہی آپ ڈانٹیں گی اور نہ ہی چپیں گی۔“

نائیلہ کا ذہن سوچ میں پڑ گیا۔ ”تم کہو۔ تم میرے گھر میں بیٹھی ہو لہذا ڈانٹ تو نہیں سکتی۔“ وہ سوچتی نظروں۔  
 روہی کو دیکھ رہی تھی۔

”یہ آپ کا گھر تو نہیں ہے۔“ روہی مسکرائی۔

”پھر کس کا ہے؟ اور میرا کیوں نہیں ہے؟“ نائلہ کو اب قصداً رہا تھا۔

”آپ کا گھر تو وہ ہوگا جو آپ کے ”ان“ کا ہوگا۔“ اپنی دانست میں وہ چھیڑ رہی تھی۔

”اوہ!“ نائلہ نے گہرا سانس لیا۔ ”کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”پہلے وعدہ کریں ڈانٹیں گی نہیں؟“ وہ اپنی جگہ اڑی ہوئی تھی۔

”چلو وعدہ“ نائلہ نے جلدی سے کہا۔ اس کا ذہن سوچوں کے گرداب میں الجھا ہوا تھا کہ وہ ”سندھی بوٹی“

بہانے کیوں آئی ہے؟ خاص طور پر اس سے کچھ کہنے۔

”آپا! مجھے بھائی جان نے بھیجا ہے۔“

ہائلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے گہرا کرچہ چہرہ سالہ روہی کی صورت ٹٹولی اور پھر کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔  
 بنیادیں کٹھک والے کی بیامہ ہے۔

”تم تم سے ہرگز نہیں پوچھوں گی کہ کیوں؟“ نائلہ نے ناراض انداز میں فریم اس کے آگے ڈال دیا۔

”بھائی جان کہہ رہے ہیں آپ ایک بار ان کی بات سن لیں۔ آدھ آپ کو۔“

”پلیز خاموش ہو جاؤ روہی! آج کے بعد اس قسم کی گفتگو تم نے یا کسی اور نے مجھ سے کی تو مجھے مجبوراً باجی کی مدد لینا پڑے گی۔“

”آپ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے۔“

”مجھے سب اندازے ہیں کہہ دینا اپنے بھائی جان سے اول تو میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں دوسرے باجی کو اگر لڑی گئی تو سب سے پہلے ان کے ہاتھوں میں آئیں ہوگا۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ کیا چاہتے ہو؟“ نائلہ آٹھ کٹھری ہوئی۔

”میرے بھائی ایسے دیسے لڑکے نہیں ہیں آپا!“

”وہ تو میں اندازہ لگا چکی ہوں۔“ نائلہ نے ترش انداز میں اسے ٹوک دیا۔

”کہہ دینا مجھے اس قسم کے کھیل اس قسم کے مذاق پسند نہیں۔ یہ حرکت دوبارہ ہوئی تو اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔“

”آپ ناراض ہو گئیں؟“ روہی نے قدرے خفیف سے انداز میں اسے دیکھا۔

”تم بھی سمجھ لو۔“ وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی بولی۔

”اور ہاں روہی! میرا ایک پیغام پہنچا دینا اپنے بھائی کو۔“

”جی جی!“ روہی ہر تن کو ش نظر آئی۔

”اپنے بھائی سے کہنا۔ اگر ایسا ہی کوئی پیغام آپ کی بہن روہی کے نام لے کر کوئی آپ کے ہاں پہنچے تو آپ اس سے طرح پیش آئیں گے؟“

نائیلہ یہ کہہ کر چسپاک سے باہر نکل گئی۔

”سکھا دی بچی کو سندھی بوٹی؟“ صنیہ تخت پر بیٹھی ایک لگائے کچھی رہی تھیں۔

”جی ہاں!“ اس نے خود پر قابو پا کر جواب دیا۔

”ذہین بچی ہے بڑی جلدی سیکھ گئی۔“ وہ سادگی سے کہہ کر دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”روہی جلدی لگی آپا؟“ بیلا نے پوچھا۔

”نہیں۔ میں ذرا پانی پینے آئی ہوں۔ پیاس لگ رہی ہے۔“ نائلہ کے دل دو داغ میں جھکڑے چلے گئے تھے۔

فردوس گم کشہ میں بھی تو یہی اسی طرح سے میرے ہوا تھی۔

شاملی خواب۔

شاملی خواب۔

کریم خانوں میں میرا ہاتھ تھام کر چلنے والی۔

نہایت کے نشے میں ہر شاعر میرے زانو پر سر رکھ کر آنکھیں موند کر سو جانے والی۔

میری انکشاف بھری کسی بات پر کھٹکلا کر ہنس دینے والی۔

خوبصورت ماورائی درختوں کے ماورائی سایوں تلے دن نہانے کے وعدے لینے والی ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے اڑنے کو بے چین ہو جانے والی۔

مجھے ہمیشہ کی بیداری دے کر میرے ہی پہلو میں سکون بخش نیند لینے والی۔

مجھے بے چینیوں دے کر مجھ سے ہر طرح کا شکوکہ طلب کرنے والی۔

اور پھر۔

مجھے شجر ممنوعہ کے گناہ میں ملوث کرنے والی۔

اس کے بغیر تو میرا غیر ہی تیار نہیں ہوا۔

میرے غیر کا علیحدہ کیا گیا حصہ۔

یہ میرا نصف۔

یہ میرا بقایا۔

زمین پر آنے کے واقعے میں میرے ساتھ اس کا بھی تو ذکر ہے۔

اور۔

اشک ندامت بھی اس نے میرے ہی ہمراہ بہائے۔

درمانگی کے ہولناک سفر۔

دشمنوں کی پراسرار داستان۔

کوئی بھی شے تو اس کے بغیر مکمل نہیں۔

احساس تنہائی میں آدم کی روح کا پہلا تقاضا۔

پھر۔ یہ کیسے مجھ سے علیحدہ کی جاسکتی ہے۔

بے وقوف لوگ۔ احسن زمانہ۔

اسے مجھ سے الگ کرنا چاہتا ہے۔ ہونہ۔

یہ اتنا ہی خلاف فطرت ہے جتنا کہ سورج کا مشرق کے بجائے مغرب سے نکلنا۔

بظاہر سامنے اخبار دکھلا ہوا تھا۔

مگر وہ غفلت کی حالت میں لٹٹی ہوئی شہوار کو دیکھ کر نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔

اس کی دشت اور خون خرابہ کرنے والے انداز دیکھ کر احسن نے اسے خواب آور دو پانی میں ملا کر دی تھی۔ تاکہ

نیند اس کے اعصابی تناؤ کو ختم کر دے۔

رودر کو چونکہ اس کے طلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اس لئے اس نے پانی بڑی بے صبری سے پی لیا تھا۔ تقریباً

ہو گئے تھے اسے سوئے ہوئے۔

”آہ“ شہوار کی سسکاری اسے چونکا کر مٹی۔

اس نے اخبار ایک طرف پھینک دیا۔ صوفے سے پاؤں نیچے لٹکا کر سلیر پہنچے اور اس کے قریب چلا آیا۔ بیٹا

نہیں بلکہ سینے پر بازو دلیٹ کر اسی طرح کھڑے کھڑے اسے دیکھنے لگا۔

شہوار نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو خالی نظروں سے احسن کو دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ سمجھ نہ رہا

ایک دم اٹھ بیٹھی۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ لہجہ ناراض، آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”جنگ مار رہا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض؟“ وہ مجز کر بولا۔

شہوار ایک دم چونک پڑی۔ احسن کے انداز وہی تھے۔ اسے کسی قسم کا کوئی احساس ندامت نہیں تھا۔

”دیکھو مجترمہ! اب اٹھ جاؤ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر چائے پی لو۔ یہ آپ کا خادم تیار کر رہا ہے۔“

وہ نقاہت بھرے انداز میں اٹھ بیٹھی۔ دو پٹے شانوں پر پھیلا یا اور بستر سے اتر آئی۔

احسن نے وارڈروب کھول کر ایک پیکٹ نکالا اور اس کی طرف اچھال دیا۔

”اس میں ایک سوٹ ہے۔ اسی دن کا لایا ہوا جس دن آپ مجھے چمکادے کر اپنے گھر بلکہ اپنے والد کے گھر جانے

میں کامیاب ہو گئی تھیں۔“ وہ طنز یہ انداز میں کہہ کر باہر نکل گیا۔

اس نے انتہائی تحمل سے پیکٹ کھولا۔ ہنریک کا خوبصورت کاشن کا سوٹ تھا۔ وہ کپڑے اٹھا کر ہاتھ روم میں چلی

آئی۔

عجب سے احساسات ہو رہے تھے۔ کبھی مر جانے کوئی چاہتا اور کبھی مار دینے کو

احسن کی شکل سے چمکوس ہو رہی تھی۔

ٹھنڈے پانی نے دہکتی آگ کو کچھ کم کیا۔ آدھ گھنٹے کا غسل ایک گھنٹے پر محیط تھا۔ وہ ہاتھ روم سے باہر آئی تو احسن اسی

جگہ دراز اخبار چہرے کے سامنے پھیلائے لیٹا تھا۔ جہاں کچھ دیر قبل وہ لٹٹی ہوئی تھی۔

ہاتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز پر احسن نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا کر اسے دیکھا۔

”شکر ہے آپ کا غسل تمام ہوا۔ کیا ایک ماہ کا غسل اکٹھا ہی کر لیا؟“ وہ کچھ نہیں بولی۔

اس کی طرف سے پشت کے تولیے سے بال خشک کرنے میں مصروف رہی۔ پھر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ کر بال

لمٹانے لگی۔

”ہوسکتا ہے کہ زلف دراز کا سلسلہ مزید ایک گھنٹے تک طے نہ ہو۔ کیوں نہ پہلے چائے پی لی جائے۔“

وہ شاید اکتا گیا تھا۔

”آپ چائے پی لیں۔ میرا موڈ نہیں ہے۔“ وہ بھڑے ہوئے انداز میں بولی۔

”مگر مجھے تمہارے موڈ کی پروا نہیں۔“ وہ برہمی سے گویا ہوا۔

”آپ کو پروا کس چیز کی ہے؟“ وہ سختی سے کہہ کر پھر برش چلانے لگی۔

”اگر جو تم یہ سوچ رہی ہو کہ اس طرح میری زندگی ناقابل برداشت بنا دو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں جیت چکا

ہوں۔ کوئی نیا میرے نیٹ میں ہے۔“

وہ اخبار جھجک کر پھر کچھ پڑھنے لگا۔

”انسان۔ انسان ہوتے ہیں۔ کیرم کی گوشتیں نہیں۔“ وہ مجز کر بولی۔

”ہاں۔ مگر“ انسان۔“ وہ استہزاءیہ انداز میں مسکرا کر بولا اور اخبار پڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر میں ٹرے میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر کمرے میں داخل ہوا اور ٹرے کا رنڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

”شرف لائیے۔“ وہ طنز سے بولا۔

وہ اپنی کم مائیگی اور بے بسی کو جانتی تھی۔ برش رکھ کر چادر لپیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”اس گرمی میں یہ چادر کیا شکرانے کے نفل پڑھنے کا ارادہ ہے؟“ وہ جیسے چڑا ہوا تھا۔

”آپ مجھ سے اس طرح باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“ بے بسی سے آنکھیں پھرتی تھیں۔

”آپ کے انداز سے قطعی ہم آہنگ ہے میری گفتگو۔ پھر فرمائیے آپ سے کس طرح باتیں کروں؟ مجبے رومان پرور باتیں اسی وقت کی جاسکتی ہیں جب فریق ثانی اس پر آمادہ ہو۔“

”میرا یہ مطلب نہیں۔“ آنسو رخساروں پر لڑھک آئے۔ اس کے انداز سے گہرا کر جھٹ و صاحت کی۔

”آپ کا یہ مطلب تو کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔ اعتراف محبت آپ کی اداوں میں چھپا ہوا تھا۔ دو بول نکاح کی مر میں ضرور ادا ہوئے ہیں مگر آپ کی ہمت پچھانتا ہوں۔“

شہوار کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

وہ اس کے ساتھ تہا تھی۔ اس کی گفتگو کے سچ کسی مداخلت کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر ان کے سچ رشتہ۔ وہ اندر و سہم رہی تھی کہ۔

خدا جانے وہ کیا کہہ جائے۔ اگر کچھ کہنے لگے تو اسے روکا کیسے جاسکتا ہے۔

احسن نے اس کے بچے انگ دیکھے مگر صرف نظر کیا اور چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ دی۔

”یہ آپ کا گھر ہے محترم۔ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کیجئے۔ آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میری محبت کی صدا اعتراف کرتا۔ قدر کرتا میری اور ایسی سچی محبت کے حصول پر خود پرنا کرنا اور ایسے خالص ساتھی کے سامنے زمانے کا بارنا۔“

”ماں باپ کی محبتیں بھی خالص ہوتی ہیں۔ اپنی خوشی کیلئے اپنے پیاروں کو دکھ دینا۔ بدترین خود غرضی ہے۔“

وہ رو پڑی۔

”میں بات اپنے گھر والوں اور میرے والد صاحب پر فٹ کر دیتے۔ اب کیا صورت بنتی ہے؟“ اس نے پھر زور دیا۔

”دیکھ شہوار! اس اب ختم کرو۔ میں نے بہت عذاب اٹھا کر تمہیں حاصل کیا ہے۔ اب اگر تم میرا دماغ خراب کرو میں تمہارا شہر بگاڑ دوں گا۔“

اس نے بری طرح بگڑ کر پیالی ٹرے میں پھینکی اور باہر نکل گیا۔

شہوار اندر ہی اندر سہم گئی تھی۔ پھر اس سے چائے بھی نہ پئی گئی۔

کافی دیر ٹرے سامنے رکھے سوچوں میں گم رہی۔

اور زندگی کے مذاق پر ٹوکھتی رہی۔

اسے احساس تھا کہ اب وہ اپنے پاپا کیلئے بھی قابل قبول نہیں ہے۔ آگے کتواں پیچھے کھائی دالی مش تھی۔ مگر وہ اسے اس زیادتی کا مزہ ضرور پکھائے گی۔

احسن نے سمجھا کیا ہے؟ پتا نہیں پاپا امی سے کس طرح پیش آرہے ہوں گے؟ اس کا دل جیسے کسی نے بھیج ڈالا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی آئی۔

بائیں سمت کچھ کھڑ پڑ محسوس ہوئی، گردن موڑ کر دیکھا۔

احسن موٹا سا پاپا لگائے کار و محور ہوا تھا۔ اسے سگن انداز میں جیسے معمول کے حالات ہوں اور زندگی میں کوئی نئی بات نہ ہوئی ہو۔ پینٹ کے پانچے چڑھائے ہوئے تھے۔ باقی جسم پر مزید کوئی کپڑا نہیں تھا۔ بال پیشانی پر جھک آئے تھے۔ لٹو پٹو شراپ پانی میں چلت پھرت ہو رہی تھی۔

آف خدایا کتنا بے حس انسان ہے۔ کسی بھی قسم کا احساس ملامت محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس نے آزر و گی سے سوچا۔ احسن نے ٹرے اٹھائے ہوئے شہوار کو کچن کی سمت جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک سہم ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پرور آئی تھی۔

وہ بجے بجے انداز میں اور مرے مرے ہاتھوں سے کپ دھونے میں مشغول تھی کہ وہ اسی حلیے میں بھیکا بھیکا سا اس کے پاس چلا آیا۔

”کھانا باہر سے آئے گا۔ شام کا کھانا ایک دوست کے ہاں ہے۔ بے چارے نے ایڈوائس دعوت دے رکھی ہے۔

ابھی ایک دو دن تم سے کام نہیں کرنا ہے۔ سنا ہے شروع شروع میں دلہن کے بہت ناز اٹھائے جاتے ہیں۔

ایک دو دن تو میں بھی تمہارے ناز اٹھانے کو تیار ہوں۔“ وہ کچھ نہیں بولی۔ اپنے کم میں مصروف رہی۔

وہ اس کی قربت سے بھر سہم گئی تھی۔

احسن نے سیلے ہاتھ سے اس کا بازو تھام لیا اور اپنی طرف اس کا رخ کیا۔ شہوار کی جان سوکھے پنے کی طرح کانپ مچی۔

”کیا زمانے سے جیت کر تم سے ہار گیا ہوں شہوار؟“ احسن کے لہجے میں گھائل کر دینے والی ایک عجیب سی سک تھی۔ شہوار سسک پڑی۔

احسن کی ہانپوں کی پناہ گاہ بھی اس کیلئے باعث تقویت نہیں تھی اب۔ دل و دماغ جو ٹھکانے نہیں تھے۔

”تم تو ہر دم خوش رہنے والی برائی میں اچھائی ڈھونڈنے والی اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈ کر لانے والی ہو میرے عمل میں ابھی تک کوئی خیر کا پہلو دکھائی نہیں دیا تمہیں۔“

احسن نے انگلیوں کی پوروں سے اس کے انگٹک صاف کئے۔

”احسن۔ آپ نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“ وہ اس کا حصار توڑ کر بھاگ گئی اور کمرے میں آکر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

”پاپا کو کتنا شاک پہنچا ہوگا“ وہ تحریر دیکھ کر۔ ہائے مجھ سے یہ کیا سرزد ہو گیا۔“ ضمیر کی ملامت اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔

کال بیل مسلسل بج رہی تھی۔ وہ اس کے انداز دیکھ کر کچھ دیر تو سوچ میں غرق رہا پھر قمیض پہن کر دوپہر کا کھانا لینے چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو ہنوز شہوار دروازے کا پوکٹ گرائے اندر خود کو قید کئے ہوئے تھی۔

اس نے یہ ساری بدنامی۔

یہ سارے خطرات محض اسی کی خاطر تو مول لئے تھے۔ اس کی محبت میں۔

اسے تو میرے جذبات کی قدر کرنا چاہئے۔ اگر جو ماضی میں شہوار تم نے مجھے فریب دیا تھا اور تمہارے جذبات حقیقی نہیں تھے۔

تو میں تم سے نہٹ لوں گا۔“

اس نے اپنی خود سری سے مغلوب ہو کر تہیہ کیا تھا۔

”یہ اس بھری دوپہر میں کون آگیا۔ اس محلے میں نووارد ہوں۔ کسی سے علیک سلک نہیں۔ رشتے دار عالم سماج ساتھ ہیں۔ ماں، بہنیں بھائی میلوں کو سوں دور ہیں۔“

شاہد سردار صاحب مجھ سے ”نپٹے“ آئے ہوں۔ اسی زمین پر رہتا ہوں۔ پتا معلوم کر لیا ہوگا۔ اب یہ ایسی بھی بات نہیں۔“

اس نے خود ہی سے بہت کچھ فرض کر لیا اور اپنی مخصوص خود اعتمادی سے کام لیتا ہوا گیٹ کی سمت بڑھا۔  
”شاہد سردار صاحب مجھے ”شہید عشق“ کا درجہ دینے آئے ہوں رانگل کی نال سیدھی کئے ہوئے۔“ وہ تلخی سے مکر تھا۔

گیٹ داکا کیا تو جیسے بری طرح چونک پڑا۔

”السلام علیکم۔“ اس کی آواز میں ہلاکی حیرت تھی۔

”علیکم السلام۔ کیا ہمیں سے بھگا دو گے؟“ اسے گیٹ میں اڑا دیکھ کر وہ مسکرائیں۔

”اوہ آئیے پھو پھو!“

”السلام علیکم احسن بھائی!“ فیصل بھی سامنے آیا۔ فیضان عیسیٰ ڈرائیور سے منٹ رہا تھا۔ فیصل کے ہاتھ میں پھلو کے قہیلے تھے۔

وہ سب احسن کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔

احسن حیران تھا کہ پھو پھو نے اسے کیسے ڈھونڈ نکالا۔

وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

”احسن بھائی۔ آپ پہلے سے زیادہ ڈیسٹ لگ رہے ہیں۔“ فیصل نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا تمہاری نگاہ بھی آخر کار حسین ہوئی گی۔“ احسن نے بڑا انداز قہقہہ لگایا اور فیصل کی پشت چھتپائی۔

”فیضی بیٹے! تم اپنے بھائی کے گھر سے ٹھنڈا سا پانی برآمد کر کے پلاؤ۔“ ثمنینہ فیضان سے مخاطب ہوئیں۔

”میں لے آتا ہوں۔ کیوں بے چارے مہمان کو ہم پر روانہ کر رہی ہیں۔“

”چھوڑو۔ تم ٹھیکو یہاں کتے برسوں بعد تو تمہاری صورت دیکھ رہی ہوں۔ بے حد بے چینی تھی تم سے ملنے کی۔ کیا آ رہے ہو؟“

”ایک فرم میں جاب کر رہا ہوں۔ سائیڈ بزنس بھی شروع کیا ہوا ہے۔ اپنے دوست کے ساتھ اسکول سے یونیورسٹی تک ہم ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ سرمایہ تقریباً اسی کا ہے۔ محنت میری ہے وہ تو عراق میں ہے۔“ احسن نے تفصیل سے بتایا۔

”پھر تو کافی مصروف انسان ہو گئے ہو۔“ ثمنینہ مسکرائیں۔

”اب آپ یہ بتائیں کہ اس جنگل کی طرح پھیلے ہوئے شہر میں آپ نے مجھے کس طرح ڈھونڈ نکالا؟“ احسن کا انتخاب تجسس بالآخر زبان پر آئی گیا۔

ثمنینہ نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

”تو پھر مانتے ہونا ہمیں؟“ ثمنینہ نے ذرا انکار سے جتایا۔

”پھر بھی پتا تو چلے۔“ احسن نے اصرار کیا۔

”کتنے ظالم ہوں۔ ماں تک کو اپنا ٹھکانا نہیں بتایا۔“ ثمنینہ نے کھجائی کی۔

احسن ایک دم خمیدہ ہو گیا۔

”مجھے شک کا تاننا ہے ہونے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ یہ گھر بھی میرے اسی دوست کا ہے جس کے ساتھ میں بزنس کر رہا ہوں۔ ماں۔ ماں ہوتی ہے پھو پھو۔ میں اپنی وجہ سے ای کو کسی کڑے امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ میں نے انہیں پتا نہیں دیا۔ آپ اسے مصلحت کا تقاضا کہہ لیجئے۔ اب آپ بتائیے یہاں کس طرح پہنچیں۔“ وہ ہنوز اپنے سوال پر ڈٹا ہوا نظر آیا۔

”تمہارے افسر مگنی تھی۔ پہلے فون کیا تھا پتا چلا کہ تم چھینوں پر ہو۔ بڑے سدھار کئے ہیں تم نے اپنے ساتھی۔ پتا ہی نہیں بتا رہے تھے۔ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ بہت مشکل سے تمہارے ایشیونے بتایا۔ اس بے چارے کو تو خود بھی پتا نہیں تھا۔ اپنے کسی بڑے سے معلوم کر کے بتایا تھا۔“

”آپ نے میری وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی۔“ احسن کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

”اب تو اٹھائی لی۔“ ثمنینہ بزنس دی۔

”بہت بے تاب تھی تم سے ملنے کیلئے۔ اگلے ہفتے کراچی آنے کا ارادہ تھا۔ مگر سسرال میں ایک شادی اٹینڈ کرنا پڑی تھی۔ مجبوری تھی۔“

فیضان ایک گلاس پانی اور بوتل لے کر آچکا تھا۔ اس نے گلاس بھر کر ماں کو پیش کیا۔

”السلام آباد گئی تھیں؟“ احسن نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔ اب صرف ایک بھائی کے دم سے تو میرا ایک آباد ہے۔“ ثمنینہ نے کہا۔

”امی کیسی ہیں؟“ احسن کے انداز میں عجیب سا ڈکھ تھا۔

”اچھی ہیں۔ بلکہ بالکل ٹھیک ہیں۔ تمہیں بہت پیار کہہ رہی تھیں۔“

”اور باقی لوگ؟“ وہ نہ جانے کیا پوچھنا چاہ رہا تھا۔

”باقی لوگ بھی ٹھیک ہیں۔ سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ احسن گھر سے یوں تعلق نہیں توڑا کرتے۔“ ثمنینہ نے جیسے اسے سمجھایا۔

”پھو پھو! آپ کی امی سے بہت دوستی ہے۔ مجھے یقین ہے انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“ وگرنہ میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ مشکل وقت میں سب کا ساتھ چھوڑ دوں۔ پھر ان لوگوں کا جو کہ میرے سب سے زیادہ اپنے ہیں۔ میں جو اپنے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔ انہی کیلئے یہ سب کر رہا ہوں۔ پرسوں ہی اتر کے ذریعے اگے کوئی ہزار روپے بھجوائے ہیں تاکہ ان کو تنویرت رہے کہ میں ان سے دور ہو کر کبھی انہی کیلئے کام کر رہا ہوں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔ خدا نخواستہ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہیں ہے۔ بھائی صاحب کی تو عادت ہی ایسی ہے۔“

”بعض اوقات انسان اسی کے ہاتھوں سب سے بڑا ڈکھاٹا ہے جو سب سے زیادہ اپنا ہوتا ہے۔“

احسن نے پھو پھو کو مزید بولنے سے روک دیا۔ اس کے لہجے میں کرب سا تھا۔ ثمنینہ حقائق سے واقف تھیں خاموش ہو کر رہ گئیں۔

”پھر تو باجی نے شکیلہ کا مسئلہ کھڑا نہیں کیا؟“ اسے ایک دم ضروری بات یاد آئی۔



ثمینہ کی ہمت جواب دے گئی۔ فیصل اور فیضان ماں کو بغور دیکھنے لگے۔ احسن ثمینہ کی خاموشی پر کھٹک سا گیا۔

”کیا بات ہے۔ پھوپھو۔ آپ کیا سوچنے لگیں؟“ وہ بے چین نظر آیا۔

”کچھ نہیں۔“ ثمینہ زبردستی مسکرائیں۔

”لیکن کوئی بات ہے ضرور۔ آپ کے انداز سے ظاہر ہے۔ کیوں فیضی۔ تم بھی گئے ہو گے پھوپھو کے ساتھ۔ کچھ تو تمہیں بتا ہوگا؟“ اب وہ فیضان سے مخاطب تھا۔

”ای بتائیں گی۔ فیضی نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔

”گو یا کوئی بات ہے ضرور جو ای بتائیں گی۔“ احسن کو یقین آ گیا۔

”جو بات ہے آپ بتا دیں پھوپھو! اتنی آسانی سے نہیں مردوں کا خاصا سخت جان ہوں۔“ وہ ہر خند کے ساتھ بولا۔

”ٹھیکہ کی شادی ہو گئی ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

احسن نے مچلا ہونٹ دانتوں تلے دیا پھر ایک گہرا سانس سینے سے آزاد کیا۔

”تو ابھی۔ یہ مقدمہ جیت گئے۔ مگر میں بھی انہی کا بیٹا ہوں۔ میں انہیں زندگی کی تصویر کا دوسرا رخ ضرور دکھاؤں گا۔“ اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ یہ ٹھنڈک ثمینہ کی ریڑھ کی ہڈی میں اس گئی۔

”بری بات..... احسن۔ باپ ہیں وہ تمہارے۔“ ثمینہ نے ٹوکا۔

”پھوپھو! جو دھوپ میں مل رہا ہو..... سائبان بتانا کیا اس کا فطری حق نہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر۔“

”مگر وہ کچھ نہیں پھوپھو۔ روایات انسانوں کے رویوں سے مضبوطی پکڑتی ہیں۔ اگر باپ کا احترام انسانی روایات کا ایک حصہ ہے تو اس روایت میں باپ کا مرکزی کردار ہونا چاہئے۔ کیونکہ باپ سے اولاد ہوتی ہے۔ باپ اولاد سے نہیں۔“

”خدا کیلئے احسن چپ ہو جاؤ۔ ایسی باتیں نہیں کرتے۔“ ثمینہ ہٹا گئیں۔

”پھر ایسی باتیں کب کروں؟ جب یہ سارے اصول رشتے ابائی کی ڈکٹیشنر شپ کی سمیٹ چڑھ جائیں؟ زندگی میں جو کچھ آپ اور میں چاہتے ہیں۔ کیا اس گھر کے افراد خواہشات نہیں رکھتے انہیں مکمل کر زندہ رہنے سکھانے کا حق نہیں ہے۔ جو خدا ابائی کا ہے پھوپھو۔ وہی میرا آپ کا اور ان سب مظلوموں کا ہے۔“

ثمینہ ساکت بیٹھی رہ گئیں۔

وہ تیس بیس سال کا ہوش مند جوان تھا۔ اپنے دماغ سے سوچنے والا۔ اپنی نگاہ سے دیکھنے والا۔ وہ اسے بچوں کی طرح کس طرح بہلاتا تھا۔

وہ اسے باپ سے قریب کرنے کیلئے کون سی دلیل دیتا تھا کہ جس باپ کی وجہ سے وہ در ماندہ نظر آ رہا تھا۔

وہ بچپن سے اسے دیکھتی آ رہی تھیں۔ کسی بھی قسم کی اخلاقی برائی اس سے وابستہ نہیں رہی تھی۔ جس کی جرات خود مٹاؤ اور ذہانت کے چرچے بچپن سے تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں کی زد پر تھا۔

اور کس وجہ سے؟

وہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔ مگر رشتہ و مقام ایسا تھا کہ وہ احسن کے درست موقف کے باوجود اس کے حمایت کیلئے واز بلند نہیں کر سکتی تھیں۔

”پھر بھی احسن! کیسے ہی سہی۔ وہ باپ ہیں تمہارے۔“ انہوں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”پھوپھو! کمال کرتی ہیں آپ۔ کیا یہ بات مجھے معلوم نہیں؟ مگر آپ لوگ بھی کیا کریں یہاں کی معاشرتی اقدار ہی آپیں گھر کا ڈکٹیشنر نفسیاتی مریضوں کی کھپ تو تیار کر سکتا ہے۔ مگر خود کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے کلبوں پر جو رہے ہوتے ہیں۔“

”ٹھیکہ نے تمہارے نام ایک پیغام بھیجا ہے۔“ ثمینہ نے جلدی جلدی سے بات بدلی۔

احسن نے سوالیہ نظریں ثمینہ کے چہرے پر نکا دیں۔

”وہ کہہ رہی تھیں کہ میں بہت خوش ہوں۔ احسن بھائی سے کہئے گا میرا غم نہ کریں!“

”ابا جی! اگر اسے شوٹ بھی کر دیتے تو وہ یہی بات کہتی۔“ وہ سچی سے نفس آیا۔

”آپ نے دیکھا ہے موصوف کو؟“ وہ ڈھکے سے پوچھ رہا تھا۔

”سچی بات ہے کہ دیکھا ہے۔ میرے سامنے آئے تھے دونوں۔ اچھے عمر دکھائی دے رہے تھے۔ خوشحالی اور آسودگی تو ابھی انسان کو پوڑھا ہونے سے روکتی رہتی ہے۔ اچھا سویرا انسان ہے۔ اصل عمر تو اللہ ہی کو معلوم۔ ویسے آدمی بہت

ہیں اور پروقا رہے۔“

”یہ آپ مجھے بہلا رہی ہیں؟“ وہ طنز سے مسکرایا۔

”ارے نہیں۔ خدا خواستہ۔ ٹھیک ہے وہ ٹھیکہ کے جواز کا نہیں ہے۔ مگر اجڈ اور چھوڑا نہیں ہے۔ اچھے خاندان کا مالک دیتا ہے۔“

”پھر موصوف کیلئے کیا مسئلہ تھا۔ قیامت برپا کرنے کیلئے انہیں ہمارا ہی گھر نظر آیا تھا؟“

”ای جی کہہ رہی ہیں۔ ٹھیکہ ابائی کے سپینڈ بہت گریں فل سے ہیں۔“ فیصل نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور ہاں۔ ایک خوشخبری بھی تمہیں دینا ہے۔ فیضی۔ وہ مٹھائی کا ڈبہ تو ذرا ادھر لاؤ۔“ ثمینہ نے بیٹے کو مخاطب کیا۔

احسن کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ درآئی۔

(یہ پھوپھو ہمیں بہت چاہتی ہیں ناں۔ زخموں پر مرہم رکھنے کا کوئی بہانہ ساتھ لائی ہوں گی)

ثمینہ نے مٹھائی کا ڈبہ بکھولا۔

”لومنڈ میٹھا کرو۔“

”مگر میں پہلے خوشخبری سننا چاہوں گا۔“

”راجیلہ اور بیلا کے رشتے طے ہو گئے ہیں۔“

”یہ بھی کوئی نامی گرامی سا ہو کار ہوں گے۔“ احسن سر سے پاؤں تک تلخ دکھائی دیا۔ اس نے مسکرا کر فیصل کو دیکھا تھا۔

فیصل نظریں جھکا کر کہہ گیا تھا۔ البتہ فیضان اپنی شریر سی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا تھا۔ ثمینہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑیں۔

”یہ بیٹھیں ہیں ناں۔ تمہارے سامنے نامی گرامی سا ہو کار۔“ ان کی ہنسی نہیں ٹک رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ دلچسپا۔ باوقافی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مطلب یہ کہ راجیلہ کا رشتہ فیصل سے اور بیلا کا فیضان سے طے کر دیا ہے۔“

”یہ کب ہوا؟“ احسن کو سچی روحانی خوشی ہوئی تھی۔

”چند ہی دن ہوئے۔ جب میں اسلام آباد گئی تھی۔“

احسن فوراً ہی معاملے کی تہ میں اتر گیا۔ اسے ان ”بیرجنسی“ رشتوں کی وجہ فوراً سمجھ میں آگئی اس نے دل چھو بھیگی کی بے انتہا قدر محسوس کی۔

”شما تھکیسی ہے؟“ اسے فوراً اپنی بہن یاد آئی۔

”ماشاء اللہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ آج تو میں اسے جان بوجھ کر ساتھ نہیں لائی کہ گھر ڈھونڈنے میں پریشانی ہوئی تو اکیلی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”آپ نے بہت نازک مزاج بنادیا ہے۔“ احسن نے مسکرا کر پھو پھو کو گویا پھر چھیڑا۔

”اللہ نے چاہا تو ہمیشہ اسے ناز اٹھانے والے ملے رہیں گے۔“ وہ محبت سے بولیں۔

”آئیے۔ پھر کھانا دانا ہو جائے۔“

”تم پکاؤ گے؟“ ثمنینہ ہنس پڑیں۔

”ارے نہیں۔ مجھے تو آیت اور چائے کے علاوہ اور کچھ بنانا آتا نہیں۔ آپ کی آمد سے کچھ دیر پہلے میں کھانا لایا تھا اچھی خاصی مقدار میں ہے۔ اور اچھی جگہ کا بنا ہوا ہے مگر۔ پہلے میں ذرا گھر والوں کو اٹھا دوں۔“

خوشخبری سن کر خشک کا ذکھ جیسے بھل گیا تھا۔ احسن کے انداز میں پھو پھو کی قدر دانی صاف محسوس ہو رہی تھی۔

”گھر والے!“ ثمنینہ حیرانی سے پوچھ رہی تھیں۔

”کیا اسلام آباد سے کوئی آیا ہوا ہے؟“ وہ الجھن میں پڑ گئیں۔

”جو بھی ہے وہ آپ کے سامنے ہی آ جائے گا۔ آئیے میرے ساتھ۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ثمنینہ حیران پریشان اس کے پیچھے چل پڑیں۔

”گھر والو۔ اٹھ جاؤ۔ اور ثمنینہ پھو پھو کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں شریک ہو جاؤ۔“ وہ دروازے پر دستک دے کر بولا۔

شہوار جو بستر پر آنکھیں موندے چپ چاپ پڑی تھی۔ ایک دم چونک پڑی۔ اس قید خانے میں کسی اپنے کی..... جان پہچان کے بندے کی اطلاع دل بمشکل سنبھلا۔

اس نے اپنی وہی کریم لکری چادر اٹھا کر شانوں پر بچھلائی۔ پھر ایک دم ٹھک گئی۔

”شاید احسن بہانے سے مجھے باہر بلا رہے ہوں۔“ وہ پھر بیٹھ گئی۔

”آپ کہتے پھو پھو۔ شاید گھر والوں کو میری بات کا یقین نہیں ہے۔“

”مگر ہے کون۔ چتا تو پٹے؟“ ثمنینہ نے فٹنگی سے احسن کو دیکھا۔

”گھر والو۔ آواز سن لی اب دروازہ کھول دو۔“

شہوار نے ثمنینہ کی آواز پہچان لی تھی۔ بے تاب ہو کر دروازہ کھول دیا۔ ثمنینہ ہکا بکا شہوار کو دیکھ رہی تھی جو بے قرار ہو کر ان کی طرف بڑھی تھی۔



ثمنینہ نے بھی اس کا انداز دیکھ کر اپنی بانہیں کسنا دہ کر لیں۔  
شہوار ان کے سینے سے لگی بچوں کی طرح بلک کر رو رہی تھی۔  
وہ برابر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چپ ہونے کی تلقین دتا کہ میں مصروف ہو گئی تھیں۔  
بمشکل اسے لے کر کمرے میں آئیں۔ بہت شفقت سے اس کے رخسار چھپتے پھرا حسن کی سمت پلٹیں۔  
”یہ سب کیا ہے احسن؟“ ان کا لہجہ بدل گیا تھا۔  
”آئی.....! انہوں نے مجھے ساری دنیا سے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔“ شہوار نے بھرائی ہوئی آواز میں جیسے شکایت کیا۔

”احسن.....!“ ثمنینہ کا دل بیٹھ گیا۔ ”کیا کر بیٹھے ہو؟“ ان کی آواز کا پتہ رہی تھی۔  
”پھو پھو۔ جب رشتے اپنی قیمت کھونے لگیں اور مسئلہ ہار جیت کا اٹھنے لگے تو پھر یہ سب ممکن جاتا ہے۔“  
وہ دھڑلہ بارتنگا ہوں سے شہوار کو دیکھ کر بولا۔  
”اگر تم نے جذبات میں کوئی انتہائی قدم اٹھایا تو بہت بڑی حماقت کی ہے۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔  
”آپ کو تمام حالات کی شنید نہیں ہے۔ اس لئے آپ ایسا کہنے میں حق بجانب ہیں۔ آئیے کھانا کھا لیجئے۔“ اس کا ملازمین اور نازل تھا۔

”جنہم میں جائے کھانا۔ ارے اس بچی کا کیا بنے گا؟“ وہ جیسے صدے سے چور ہو گئی تھیں۔

”آپ کی یہ بچی۔ میری بیوی ہے۔“

”معاشرے میں رہنے کے کچھ ضابطے اور اصول ہوتے ہیں احسن! یہ محض سرکش ہے۔“

”ہمارے ہاں تو صرف ایک اصول رائج ہے پھو پھو۔ کہ جس کے ٹکڑوں پر پل رہے ہوتے ہیں وہ زندہ رہنے کا لہذا رواج وصول کرتا ہے۔“ اس نے تلخی سے پھو پھو کی بات کاٹ ڈالی۔

پھر اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور ثمنینہ کے شانے تھام لئے۔

”تھاق جانے بغیر فرد جرم عائد نہیں کرتے پھو پھو۔ پائیز پہلے کھانا کھالیں۔ پھر میں آپ کو حرف حقیقت سے

آگاہ کروں گا۔ آپ کو میری شہینہ چھو۔ پلیز۔“

شہینہ نے اس کے عاجزانہ اور محبت آمیز رویے کو محسوس کیا۔

(کوئی بات تو ہے۔ اگر بدلتا غی اس کی فطرت ہوتی تو میرا غیظ بھی نہ کرتا)

”پلیز چھو۔۔۔۔۔!“

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

احسن نے شہوار کو مخاطب نہیں کیا اور اسے نظر انداز کرتا ہوا پھوپھو کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا اور انہیں سیدھا کچن میں آیا۔

شہینہ اسے ادون آن کرتے دیکھ کر آگے بڑھیں۔ ”لاؤ میں خود کر لوں گی۔“

”صرف کھانا گرم ہی تو کرتا ہے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔“

”مگر خواتین کی موجودگی میں تم یہ کام کیوں کرو؟ ہوا ایک طرف۔“ شہینہ نے احسن کو ایک طرف کیا۔

”جاؤ تم شہوار کو بلا لاؤ۔ کیا وہ کھانا کھا چکی ہے؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ پھوپھو آپ اگر اسے بلالائیں تو وہ کم وقت میں آپ کی بات مان جائے گی۔“

”ٹھیک ہے میں اسے بلالاتی ہوں مگر تم تردیدیں کرو۔ ہم مل کر کھانا کھا لیں گے۔“

وہ جاتے جاتے ٹائیں اور احسن کو بچکن کے کام سے روکا۔

احسن نے ایک لٹلے کو کچھ سوچا پھر کچن سے باہر نکل گیا۔

شہینہ شہوار کو کمرے سے باہر لانے میں کامیاب ہو گئیں تو وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”آپ بیٹھیں آئی۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں آنسوؤں کا اثر تھا۔

احسن نے اس پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی پھر فیصل اور فیضان سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

شہینہ کچن سے باہر برتن لاکر بیڑ پر رکھنے لگیں شہوار کے رونے کے باوجود۔

شہوار نے کھانا گرم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ساتھ ساتھ آنسو بھی رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

شہینہ نے شفقت کے ساتھ اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔

”روؤ نہیں شہوار! مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ تم کب سے ہو یہاں۔۔۔۔۔؟“

”رات سے۔“ وہ بولی۔

”اچھا۔ رات کو آئی تھیں۔“ شہینہ کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”آئی نہیں۔ لائی گئی ہوں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”اتنا بڑا کام احسن نے کیسے کر لیا؟“ انہیں حیرت بہت تھی۔

”ان سے ہی پوچھ لیجئے گا۔“ وہ ناراض انداز میں گویا ہوئی۔

”تو تم رات سے کمرے میں بند ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟ ویسے تمہاری مرضی اگر نہیں تھی تو یہ سب کیسے ممکن ہوا؟ کیا تمہارے والدین نے احسن کے کہنے پر؟“

کردی۔۔۔۔۔؟“ شہینہ کا تجسس کمال پر تھا۔

”شہینہ کا تجسس کمال پر تھا۔“

”میں آپ کو کیا بتاؤں؟ آپ احسن سے ساری تفصیلات پوچھ لیجئے گا۔“ وہ سالن کا ڈونگا اٹھا کر باہر نکل گئی۔ شہینہ

اپنی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔

”احسن بھائی۔ ہمیں بالکل امید نہیں تھی کہ ہم یہاں شہوار بھابھی سے بھی مل لیں گے۔“ فیصل شہوار کی موجودگی پر

کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”جیت ساری باتیں خلاف توقع بھی ہوا کرتی ہیں۔ چلو تم کھانا کھاؤ۔“ احسن نے مختصر جواب دے کر اس کی طرف

انے کی طرف کی۔

”اے بھئی شہوار! اب ابھی جاؤ۔“ شہینہ نے پانی کی بوتل ٹیبل پر رکھتی ہوئی شہوار کو مخاطب کیا۔

”آپ کھائیں آئی۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس نے وہاں سے ہٹتے ہوئے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”اے بھئی۔ بھوک کیوں نہیں ہے؟ چلو بیٹھو شہوار۔ ضد نہیں کرتے۔“

”رہنے دیں پھوپھو۔ اگر بھوک نہیں ہے تو کیا ضرورت ہے۔“ احسن کا انداز میگز اہوا تھا۔

”وہ رات سے یہاں ہے۔ کمرے میں کیا من و سلوٹی ارا رہا ہے۔ جو اسے بھوک نہیں ہے؟“ شہینہ نے کرسی چھوڑ

اور احسن اور شہوار کے بیچ تناؤ کو محسوس کر رہی تھیں۔

”چلو بیٹے۔۔۔۔۔ شاباش ضد نہیں کرتے آؤ۔ میرے ساتھ بیٹھو۔“ وہ اسے بچوں کی طرح چپکار کر بٹھاتے ہوئے

شہوار ان کے سامنے مزید ضد نہ کر سکی اور تھوڑا سا سالن پلیٹ میں ڈال کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔

”طیو تو دیکھو کیا بنا کر کھا ہے۔ بال سلجھا کر چوٹی تو باندھ لی ہوئی بیٹا۔ کوئی پوڑی، نگین تک کلائی میں نہیں ہے۔“

اور یہ کانوں میں ذرا ذرا سے رنگ ڈالے ہوئے ہیں۔ خیر سے بیٹھتا ہو۔ تمہاری امی نے تمہیں کچھ تو پہنا کر بھیجا ہو

ٹھار کا دل بھر آیا۔ مگر احسن کے بدلے ہوئے رویے کے سبب وہ اپنے اشکوں پر قابو پائے ہوئے تھی۔

”نچو پلوس پارٹی احسن ہمارے ہاں لائے تھے اس نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ امی مجھے کچھ پہننے کو دیتیں۔“

”اے آئی وہ مجھے ایسے حالات میں کچھ پہننے ہی کو کیوں دیتیں۔۔۔۔۔؟ میری رخصتی ہمیشہ کیلئے ہو رہی تھی۔“

اور میڈی رخصتی تو آپ سمجھتی ہیں۔ مسلمان جنازوں پر چڑھا ہے نہیں چڑھاتے۔“

”وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔“

فیصل اور فیضان حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہے تھے۔ شہینہ کا ہاتھ پلیٹ میں ساکت تھا جبکہ احسن بدستور

لے میں مگن تھا۔

اس نے ایک نگاہ غلط شہوار پر ڈالی اور اپنی پلیٹ میں سالن ڈالنے لگا

”آپ کھانا کھائیں پھوپھو۔ یہ اس وقت کا سب سے ضروری کام ہے۔“ اس نے شہینہ کو متوجہ کیا۔

”آل۔۔۔۔۔؟ ہاں۔“ وہ جیسے کسی خیال سے چونک پڑیں۔

انہوں نے احسن کی سمت دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

لفظ ”پلوس پارٹی“ اب ان کے ذہن پر مسلسل بج رہا تھا۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا اور جیسے

مزید گفتگو کا پروگرام ملتوی کر دیا۔

کھانے کے بعد فیصل اور فیضان کو ٹینے نے احسن کے بیڈروم میں بھیج دیا تھا۔ اور خود ساری تفصیل سننے کے لیے چینی کا بر ملا اظہار کر رہی تھیں۔

تہہ قفے کے بعد ملازمہ دودھ کھلے گلاب لے کر حاضر ہو گئی۔

گلبلہ نے بالوں کا سادہ سا جوڑا بنایا تھا۔

پہنچنے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ گلاب انکانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اسے اطمینان نہ ہوا کہ پھول صحیح مقام و

پہنچا ہے۔

ہانا جیسی بارودہ کوشش میں مصروف تھی کہ انعام علی باہر آ بھی گئے۔

وہ لڑنے سے سرخ شک کرتے ہوئے اس کے نزدیک چلے آئے۔

”لاہیٹے میں لگا دیتا ہوں۔ میرا بھی اک مدت کا ارمان ہے۔“

گلبلہ کے سامنے ان کا یہ الگ روپ تھا۔ ان کے ٹھنڈے اور گیلے ہاتھوں سے اس کی انگلیاں ٹکرائیں تو وہ ساری جان

بچ گئی۔

اس نے دن کے اُجالے میں کوئی لطیف قسم کا تاثر ان کے چہرے پر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنا بیت کا یہ لمحہ زندگی کا

انگا۔

انہوں نے پھول بلکہ آدھ کھلی کلی اس کے بالوں میں انکادی۔

”مجھے آپ کی تیاری پسند آئی۔ آپ اس وقت عین میری سوچ کے مطابق ہیں۔“ وہ پھر اپنے بال خشک کرنے لگے۔

سفید بنیان اور سیاہ پینٹ میں ملبوس واقعی وہ اپنی عمر سے بہت کم محسوس ہو رہے تھے۔ ہاتھوں کی گردش کی وجہ سے

ان کی پٹلیاں تھرک رہی تھیں اور ان کی صحت مندی اور توانائی کا واضح تاثر دے رہی تھیں۔

گلبلہ نے فوراً انکا پیس جھکا لیں۔

انعام علی اس کی نظرس خود پر محسوس کر رہے تھے۔ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”کیا میں واقعی اتنا خوش نصیب ہوں کہ اپنی کم عمر اور خوبصورت بیوی کی حقیقی محبت اور توجہ پاسکوں؟“ وہ پوچھ رہے

وہ ان کے لہجے کا تاثر سمجھنے میں تو ناکام رہی مگر ان کے قریب آ کر ان کے بازو پر اپنی انگلیاں جما کر بولی۔

”میں نے آپ کو نکاح کی صورت میں قبول کیا ہے۔ اپنی زندگی آپ کے نام کر دی ہے۔ میری وفا پر اگر آپ شک

مانگے تو گویا مجھے بے موت مار دیں گے۔

مجھے سمجھنے جاتی ہوں اتنی دیر بس یہی بات یاد رہتی ہے کہ انعام علی اس دنیا میں سب سے زیادہ میرے ہیں۔

گلبلہ ایک عہد ہوتا ہے۔ میں مسلمان لڑکی ہوں میری پرورش ایک مہذب عورت نے کی ہے۔ عہد شکنی نہ میرے

پیشہ پسندیدہ ہے نہ میری تہذیب میں۔ میں دل و جان سے اسی کی ہوں۔ جس کے نکاح میں ہوں۔“

گلبلہ کو ترادفا میں اس درجہ لطف آیا کہ اسے خود پر حیرانی ہوئی کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کہہ گئی؟ اسے یہ باتیں کرنا کیسے آ

تا

”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس دن سے بلال آپ سے مل کر گیا ہے۔ آپ کا ذہن مستقل الجھا رہتا ہے۔ کیا میری

دلچسپی غلط ہے؟“ انہوں نے نفاس سے بالوں میں برش چلایا۔

”میں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ نے تو اباجی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ انہوں نے ہی ہم سے چھپایا تو آپ کا کیا

تھا

سر پہرے وہ ڈرائنگ روم میں بند تھے۔ نہ جانے کون ملے والا آیا ہوا تھا۔

ملازم ایک بار کافی لوازمات کے ساتھ اور ایک بار کوئلہ ڈرائنگ لے جا چکا تھا۔

انہیں شام کو ایک تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بھی شرکت کرنا تھی جو کسی تجارتی و صنعتی تنظیم کی طرز

منعقد کی جارہی تھی۔

پانچ بجتے ہی وہ تیاری میں لگ گئی۔

ان کے پسندیدہ کولون کے ساتھ شعل کیا پھر خاصی دیر بال سکھانے میں مصروف رہی۔ ساتھ ساتھ ملازمین کو

کاموں کے سلسلے میں ہدایت دیتی رہی۔

گاہے گاہے ڈرائنگ روم کی سمت نگاہ اٹھ جاتی تھی مگر بند دروازوں سے ٹکرا کر واپس آ جاتی تھی۔ رائل بیسول

فال درست کرتے ہوئے معاً باہر چل پھل ہی محسوس ہوئی۔ مگر پھر فوراً خاموشی چھا گئی۔

وہ پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی کہ شاید ملازمین ہوں گے۔

اس نے پھر گھڑی کی سمت دیکھا۔ وہ ان کے دیے گئے وقت کے مطابق تیار تھی۔۔۔۔۔ مگر ان کا ابھی تک باہر

ارادہ نہیں تھا۔ وہ سخت کوفت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

مگر کچھ کر نہیں سکتی تھی۔

موڈ اس قدر خراب ہو رہا تھا کہ کمرے سے باہر نکلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

وہ مضطرب انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

اسی دوران دروازہ کھلا اور انعام علی اندر داخل ہوئے۔

اسے ایک دم تیار دیکھ کر پہلے ٹھٹھے پھر جیسے فوراً ہی یاد آ گیا۔

”آپ تیار ہو گئیں؟“

مجھے بالکل بھی دھیان نہیں رہا۔ افسوس۔۔۔۔۔ دراصل یہ جیمبر آف کامرس کے چیئرمین کا بی اے تھا۔ انکیشن ہونا

ہیں ناں آج کل میں۔ آج کل ہر بزنس مین پہلے سے زیادہ مصروف ہے۔ دراصل چیئرمین۔ جیمبر میں اپنی مقبولیت کو

ہے۔ اگرچہ اس نے اپنی چیئرمین شپ کے دوران کوئی خاص ذاتی ایڈوائس حاصل نہیں کیا ہے مگر وقت بدلتے بدلتے

ہے۔“

ٹھٹھکے خاموشی سے اسٹول پر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی جانتی تھی بلا کہ جیمبر آف کامرس کے کیا

ہیں۔

مگر انگریزی اخبار الٹا پڑھنے کی کوشش میں ٹک اُلٹ جانے کی خبر سنانے والے دیوہاتی کی طرح مگر ان بلاتی رہے

”میں تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔“ وہ تیزی سے ہاتھ روم میں چلے گئے۔

شاید ملازمہ کو آواز دے کر بلایا اور لان سے سرخ آدھ کھلا گلاب لانے کو کہا۔

”مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو مستقل سوچ لگی ہے۔ آپ کے ذہن میں جو بھی سوال آتا ہے۔ وہ بڑھتی ہے۔“

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ نگاہیں چرا کر پلٹ گئی۔  
اسی دم دروازے پر دستک ہوئی۔

”کم ان۔“ انعام علی سفید شرٹ پہن رہے تھے بڑے مصروف انداز میں کم ان کہا۔ شکلیہ دم بخود کھڑی سامنے بلال بڑی خشکیوں نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔  
”السلام علیکم۔“ الفاظ وعائے مگر لہجہ ”بدوعا“ کا تھا۔

”اوہ۔“ بھی میں تمہاری امی کو بتانا تو بھول ہی گیا کہ تم آئے ہوئے ہو۔“  
”یہ میری امی نہیں ہیں۔“ وہ زہریلے لہجے میں پھٹکارا۔

”شٹ اپ!“ انعام علی برہم ہوئے۔  
”کیوں ڈانٹ رہے ہیں۔ پلیز۔“ شکلیہ کی طبیعت گھبرائی۔

”آؤ بلال بیٹھو۔“ وہ لجاجت سے گویا ہوئی۔  
”میں بیٹھنے نہیں آیا۔“ اس کا انداز انتہائی جارحانہ تھا۔

”تو پھر جاؤ۔ خدا حافظ۔“ انعام علی نے انتہائی برہمی سے کہا اور ٹاکی کی ٹاٹ بنانے لگے۔ بلال پلٹ گیا۔  
شکلیہ کی حساس طبیعت بے کل سی ہوئی۔

”بات سنو بلال، پلیز۔ دیکھو۔ بیٹھو تو سہی۔“ میں چائے بنواتی ہوں۔“ وہ اس کے تعاقب میں بوجھی۔  
”شکر یہ۔“ مجھے چائے پینا ہوگی تو میں خود بنوا کر پی لوں گا۔ یہ میرے باپ کا گھر ہے۔ ویسے آپ بہت اچھا کرتی ہیں۔“

”بلال!“ انعام علی گرے۔

”نہیں۔ نہیں۔ پلیز ڈانٹنے نہیں۔ بچہ ہے۔“ شکلیہ نے منت کے انداز میں انہیں روکا۔

”بچہ ہے۔ مگر بدتمیز بھی ہے۔ میں جانتا ہوں یہ ایسا کس کی شہ پر کرتا ہے۔ یہ جس کتب میں پڑھتا ہے میں دہار نہیں پلیز۔ بچوں کو انزام کے گھاؤ نہیں دیتے۔ پیار سے سمجھاتے ہیں۔ بیٹا ہے وہ آپ کا۔“ شکلیہ نے انہیں میں ٹوک دیا۔

انعام علی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ شکلیہ کے نازک ہاتھ ان کے سینے پر تھے بلال باہر نکل چکا تھا۔

شکلیہ کو بلال کے اس طرح جانے کا بے حد رنج تھا۔ وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑی رہ گئی تھی۔

”بدتمیزی بدتمیزی ہوتی ہے۔ اور بس۔“ انعام علی آئینے کے سامنے کھڑے کوٹ پر برش چلا رہے تھے اور آہی ہی دیکھتے ہوئے شکلیہ سے مخاطب تھے۔

”مگر ہمیں اس بات کا پتا بھی لگانا چاہئے کہ کوئی انسان ناپسندیدہ فعل کا مرتکب آخر کیوں ہو رہا ہے؟“ نگاہیں ڈرتے ڈرتے انہیں دیکھا۔

”میرے پاس اس قسم کی بے کار باتوں کیلئے وقت نہیں ہے۔ اور میں جو وقت جن کاموں میں صرف کرتا ہوں کے نتیجے میں یہ اس معاشرے کے صاحب عزت لوگ ہیں۔ انہیں سلام کرنے والوں کی کمی نہیں۔ اس معاشرے۔“

”ہیں۔ اور کیا چاہئے؟“

پہلی دن رات کی محنت ہی کا نتیجہ ہے۔ ان کی آنے والی نسلوں تک کیلئے میری توانائیاں اور وقت استعمال ہو رہا ہے۔“

”کھٹاک کھٹاک برف کیس کھول کر کچھ تلاش کرنے لگے۔“

”لیکن وہ بچہ ہے۔ وہ اپنے بڑوں کے ذہن تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“

مگر بڑے تو اس کی سطح تک سوچ سکتے ہیں ناں۔ آپ اس پر ناراض نہ ہوا کریں۔“

”میں اس پر ناراض نہیں ہوتا ہوں۔ میری ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ کوئی میری اولاد کو آگے کاربہار ہے۔“

شکلیہ خاموش ہو گئی۔ اس سے زیادہ بولنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

”اے اے.....!“ انعام علی نے کارز فیمیل سے کار کی چابی اٹھاتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔ اور خود باہر نکل گئے۔ شکلیہ نے

پتھر بڑی ہوئی چیزیں اٹھا کر اپنے اپنے مقام پر پہنچائیں اور دروازہ ہلاک کیا۔

انعام علی کا رپورچ سے باہر نکال چکے تھے اور فرنٹ ڈور کھولے اس کے منتظر تھے۔

وہ سچے تلمے قدم رکھتی ہوئی ان کی طرف آئی تو انہوں نے اس کی خوبصورت اور پردہ چال کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ ایک اطمینان ان کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

”امی۔ امی۔“ منزہ کی حالت غیر ہونے لگی۔

”امی۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“ ماں کے سرد ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھے۔

گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ ایبویٹس کے لئے فون کرنے لگی۔ معاذ خیال آیا کہ جتنی دیر میں ایبویٹس پہنچے گی اس سے پہلے اسد پہنچ جائیں گے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر تو ان کا گھر تھا۔

اس نے فوراً اسد کا نمبر ملایا اور بے ربط الفاظ میں انہیں فوراً پہنچنے کیلئے کہا۔

ریسورر رکھ کر وہ پھر امی کے قریب جا بیٹھی۔ دونوں بچوں نے الگ رونا شروع کر دیا تھا۔

پانچ منٹ سے کچھ اندر سے میں اسد وہاں پہنچ چکے تھے۔

”کیا ہوا بھابھی؟“

”پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا ہے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر سوچ کر رہے کرتے۔ ایک دم گر گئیں۔“ منزہ سامنے ایک ہمدرد کو دیکھ کر بچوں کی طرح روددی۔

”ارے یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔“ حد کرتی ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ پلیز بچوں کو سنبھالنے۔“

اسد نے فوراً جبکہ کر منزہ کی امی کو بازوؤں میں اٹھالیا تھا اور لاؤنچ سے باہر نکل گئے تھے۔

منزہ نے جلدی سے پرس اٹھایا اور نیچے مسمائی کو فون کیا کہ وہ اس کی واپسی تک اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ رکھے اور بٹا کو گھومیں اٹھا کر لفٹ کی سمت آئی۔ شکر ہے کہ بھیڑ نہیں ہے۔ اس نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔

اسد پچھلی سیٹ پر امی کو لٹا چکے تھے اور منزہ کے منتظر تھے۔

”پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا۔“ میرا تو دل گھبرا رہا ہے اسد بھائی۔“ وہ پھر رونے کو ہو گئی۔



”اوں۔ ہوں۔ بھابھی پلیز۔ یہ تو انتہائی چمکانہ فعل ہے۔ زندگی میں سخت مقام بھی آتے ہیں۔ انہیں فہم چاہئے۔“

”نہیں ہوتا مجھ سے یہ سب کچھ نہیں کرتی فس دیں۔ اب خادرا جائیں اگر ان کے تمام ڈاکومنٹ چوس لے رکھے۔“

اب فکر غصے کے طوفان میں بدل گئی اور طوفان کا رخ خادرا کی سمت ہو گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اسدا اس بات پر مسکراتے۔ مگر اب خاموشی بہتر تھی۔

”کتننا اکیلا کر کے چلے جاتے ہیں۔ میرا کوئی خیال ہی نہیں۔“ وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

”خدا انخو استہ آپ اکیلی کیوں ہیں۔ بھائی ہے بیٹے ہیں والدین ہیں میں ہوں۔“ اسدا کے انداز میں جیسے تسلی تھی

”مگر جو چیز میں خادرا کے رشتے کی وجہ سے محسوس کرتی ہوں۔ وہ تو مجھے کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ اب دیکھئے

کی حالت۔ اب ای بھی تو میری ذمہ داری ہیں۔

اللہ نہ کرے انی کو کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گی۔ آپ دیکھئے گا۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔

”آپ واقعی بہت کم حوصلہ ہیں۔ بھابھی۔“

خادرا ٹھیک ہی کہتا ہے کہ یار مجھے دہرے امتحان درپیش ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں بیوی والا ہوں دوسرے یہ کہ بیوی کم عمر ہے۔“

اسدا نے جیسے اس کی توجہ بنائی، منزہ خاموش ہو رہی۔ ماں کی حالت محسوس کر کے اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

علاقے کا جدید دور، پرائیویٹ ہاسٹل اب ان کے سامنے تھا۔

اسدا نے بڑی پھرتی اور تندہی سے سارے مرحلے نٹائے۔ وہ تو حیران پریشان بچی گود میں اٹھائے بس سب کچھا رہی تھی۔

ان لمحوں میں اسدا سے رحمت کے فرشتے سے کچھ کم دکھائی نہ دے رہے تھے۔

اس نے اتنی دیر میں ہوش مندی کا بس یہ کام کیا تھا کہ ریسپشن سے اپنی ہمسائی کو فون کیا تھا تاکہ بلال فوراً ہاسٹل سکے۔

کیونکہ گھر سے نکلنے وقت تو اسے اتنا دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ وہ اسدا سے پوچھتی وہ کہاں لے کر جائیں گے ای کو۔ وہ تو یہ سن کر ہی چکر اکر گرنے لگی کہ امی ”انتہائی نگہداشت“ کے مرحلے سے دو چار ہیں۔ اسدا اس کو تسلی و تسفی د میں مصروف ہو گئے تھے۔

”بھابھی! اگر ممکن ہے تو آپ اپنے پاپا کو بذریعہ فون مطلع کر دیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ان کی ضرورت پیش آ۔ دیے تو خطرے کی کوئی بات نہیں۔ مگر محض احتیاط کے طور پر۔“

یوں بھی انہیں اس وقت اپنی بیوی کے قریب ہونا چاہئے۔ آئی کو بھی ان کی وجہ سے تقویت محسوس ہوگی۔“

منزہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی۔

”آپ مجھے فون نمبر دے دیں۔ میں مطلع کر دیتا ہوں۔“ اسدا منزہ کی خاموشی کو نہ سمجھ سکے۔

”آئی!..... کیا ہو گیا امی کو.....؟“

بلال تیزی سے اندر آتا دکھائی دیا۔

”نہیں نہیں۔ بھی۔ ذرا آرام سے۔“ اسدا نے اسے اپنے کاندھے سے لگا لیا۔

”مجھے نہیں تو پھر آپ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ انتہائی پریشان و مضطرب نظر آ رہا تھا۔

”شاید دینی دباؤ کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ آئی بیوش ہو گئی تھیں گھر پر..... ڈاکٹر چیک اپ کر رہے ہیں۔ گھبرانے کی بات نہیں۔“

اس نے اس کا شانہ چھتیا یا اور نہایت اپنائیت سے اسے تسلی دی۔

مگر بلال کو جیسے ان کی بات پر یقین نہیں تھا۔ نگہرات ہنوز اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

”بلال۔ ایسا کرو اپنے پاپا کو فون کر دو۔ ان کی موجودگی سے آپ لوگوں کو بھی ڈھارس ہوگی۔“

”کیا امی کی حالت.....؟“

”اگرے نہیں یار۔ بات نہیں سمجھے۔ بھی جب بیوی کی ایسی کنڈیشن ہو کہ وہ ہاسٹل میں لائی جائے تو شوہر کو اس امر سے باخبر رہنا ہوتا ہے۔ اگر انہیں بعد میں پتا چلے گا کہ ایسی گڑبڑ ہوئی تھی اور انہیں نہیں بتایا گیا۔ تو وہ ناراض نہیں ہوں گے۔ آپ لوگوں پر؟“

اسدا سے سمجھاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”وہ ناراض نہیں ہوں گے۔“ وہ درشت انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”میں کر دیتی ہوں فون۔ بلال اس وقت پریشان ہے۔“ منزہ نے بات سنبھالی۔

”بھابھی! آپ بلال کو اتنا نازک نہ بنائیں۔ اسے میدان عمل میں اترنے دیں۔ ایمر جنسی قسم کے حالات سے اسے لڑنے کا موقع دیں۔ وہ مرد ہے۔ اسے حالات کے آگے سر ڈالنے کے بجائے حالات کا مقابلہ کرنا سکھائیے اسے پریشان کرنے کے بجائے اس وقت بے حد عملی ہونا چاہئے۔“ اسدا نے جیسے سمجھا یا۔

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اسدا بھائی۔ وہ بالکل بجا ہے۔ مجھے تسلیم ہے۔ چلے میں کر دیتی ہوں پاپا کو فون۔“

منزہ نے جیسے ماحول کو اپنی گرفت میں لیا۔

بچی اسدا کو تھما کر وہ پھر ریسپشن پر آئی۔

اسے احساس تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ادھر سے کیا جواب آئے گا۔

مگر بعض اوقات بھرم زندگی سے بڑھ کر اہم ہو جاتے ہیں۔

اس نے ریسپور کان سے لگا لیا۔ اسدا اس کے نزدیک چلے آئے تھے۔

”ہیلو۔“

دوسری طرف ملازمہ تھی۔

”نہیں ہیں گھر پر؟“ منزہ نے پوچھا۔

ملازمہ کہہ رہی تھی کہ وہ بیگم صاحبہ کے ساتھ کسی تقریب میں گئے ہوئے ہیں۔

”پاپا تو گھر پر ہی نہیں ہیں۔“ منزہ نے مانتھ میں پر ہاتھ رکھ کر بہت نجی آواز میں اسدا سے کہا۔

”تو بیچ دے دیں..... بھابھی۔ آخر نوشہرہ سے کراچی آتے آتے انہیں وقت تو پھر بھی لگ جائے گا۔“

”کیا امی کی حالت بہت سیریس ہے؟“ اسدا کے اصرار پر وہ جیسے متوحش سی نظر آئی۔ (اب وہ انہیں کیونکر بتائے کہ

پاپا نو شہرہ میں نہیں کراچی میں ہی ہیں۔)

”نہیں بھانجی! ایسی کوئی بات نہیں۔“ اسد جیسے زوج ہو گئے۔

(اب بھلا یہ بھی کوئی ان کے زیر ہدایت ہونے والا کام تھا۔ دونوں بہن بھائی کو تو پہلی فرصت میں خود ہی اپنے با سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا۔) اسد سوچ رہے تھے۔

”آپلی! امی کو کیا ہو گیا ہے؟“ بلال بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ فگر نہیں کرو۔ اسد بھائی کی بات ہوئی ہے۔ کہہ رہے ہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“

وہ لمحہ ترتیب وقت میں کتنا سنگین ہوتا ہے۔

جب ایک مضطرب دوسرے پریشان حال کو تسلی دینے کا ”کارنامہ“ انجام دیتا ہے۔

کافی وقت سولی پر لٹک کر گزرا تھا۔

تب کہیں جا کر یہ خوش خبری سنی تھی کراچی کو ہوش آ گیا ہے۔

ڈاکٹر نے اس خاص ہدایت کے بعد ملنے کی اجازت دی تھی کہ وہ لوگ مرلیفہ سے گفتگو نہیں کریں گے۔

دونوں بہن بھائی نہایت بے قراری سے ماں کی سمت بڑھے تھے۔

ان کی آنکھوں میں اونا دو کو دیکھ کر جیسے زندگی سمٹ آئی۔

انہوں نے لرزیدہ اور خواہ مخواہ سی منظرہ کا ہاتھ تھام لیا۔

بہشکل ان کی ٹیف سی آواز ابھری۔

”میری بیٹی بہت پریشان ہے۔“

”ہم نے انکل کو فون کر دیا ہے آئی! آپ گھر آئیں نہیں۔“ اسدان کے نزدیک آکر گویا ہوئے۔

منزلہ کی امی نے سوالیہ نظروں سے منزلہ کو دیکھا۔

وہ نظریں چرا کر بولی۔

”پاپا کو۔ امی۔“

اور وہ سادگی سے مسکرا دیں۔ اور آنکھیں موند لیں۔

پھر وہ سب ڈاکٹر کی ہدایت پر باہر آ گئے۔

ڈاکٹر اسد کو سمجھا رہا تھا۔

”آپ بہت کئی لوگ ہیں۔ یہ بیہوشی فوج کا حملہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اور ہارٹ ایک بھی اللہ نے بہت کرم کیا ہے۔“

آپ لوگوں کو چاہئے مرلیفہ کو ہر وقت خوش رکھیں۔“

(ہمارا بس چلے تو ہم خود کوچ کراچی ماں کو خوشیاں لادیں) بلال نے انتہائی کرب سے سوچا۔

صفیہ کے تومارے خوشی کے صبح ہی سے ہاتھ پاؤں بھولے ہوئے تھے۔

ان کی دور کی رشتے دار کوئی رشتے لے کر آ رہی تھیں۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ جہیز کا تو انہیں بالکل بھی لالچ نہیں ہے۔

ان کی بڑی بہو بھی بغیر جہیز کے آئی تھی۔ لڑکی والے تو دے رہے تھے۔ لڑکے والوں نے خود ہی لینے سے انکار کر

دیا تھا۔

اور اصرار کے باوجود ایک بھی چیز نہیں لی تھی۔“

بقول رشتے دار خاتون کے بڑے حسب نسب والے خاندانی لوگ ہیں۔

نبیلہ کا حلیدہ رشتے دار خاتون لڑکے والوں کو بتا چکی تھیں اور خاصی پر امید نظر آتی تھیں۔

لو کیوں میں علیحدہ جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔

مج سے گھر کی صفائی سہرائی میں مشغول تھیں۔

ناملہ نے تو فضل بھی مان لئے تھے کہ اگر نبیلہ کا رشتے طے ہو گیا ان ”شرقا“ میں تو وہ..... شکرانے کے نفل ادا کرے گی۔

اس نے بطور خاص شام کی چائے کیلئے کچھ لوازمات تیار کئے تھے۔ پورے گھر میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

یہ اور بات تھی کہ صفیہ کو آج احسن کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اگر میرا احسن بھی آج موجود ہوتا تو آنے والوں پر اس کی شخصیت کا بہت اثر پڑتا۔

میرا لائق فائق ہو نہا رہتا۔

وہ اس کی نازہ ترین کوتاہی کو نظر انداز کر کے پھر محبت سے اسے سوچ رہی تھیں۔

کتنے صبر آزا اور جان لیوا انتظار کے بعد مہمان آئے تھے۔

بعض اوقات مسلسل غم۔

انسان کو بہت راح اور بردبار بنا دیتے ہیں۔ لہذا نبیلہ انتہائی نارمل انداز میں اپنے کام و صندوق میں مگن تھی اس کا

دوہرہ قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

رشتہ لانے والی رشتہ دار صفیہ کی رشتے دار بی بی نہیں بچپن کی سہیلی بھی تھیں۔ ایک دوسرے کے بہت سے رازوں کی

بن بھی تھیں دونوں۔

محبت اور اعتماد کا رشتہ بھی استوار تھا۔

لہذا صفیہ بہت خوش امید نظر آ رہی تھیں کہ ان کی سہیلی اپنا بھی کوئی رول ضرور ادا کریں گی۔ یکے بعد دیگرے کئی

کھیل کے چہرے دیکھ کر لڑکے کی والدہ نے پوچھا۔

”ماشاء اللہ۔ کتنی بچیاں ہیں۔؟“

”اللہ نظر بد سے بچائے سات بیٹیوں اور دو بیٹوں کی ماں ہوں۔“ صفیہ نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔

”کتنی بچیاں شادی شدہ ہیں؟“ یہ ان کا اگلا سوال تھا۔

”صرف ایک کی.....“

ویسے میری ایک بیٹی میری منہ کے ہاں پرورش پا رہی ہے۔ وہ اس کی خوشی تھی۔ اس نے بہت اصرار، بہت چاہ سے

لیائی کوئی تھی۔ ماشاء اللہ شہزادی بنا کر رکھا ہوا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے، بہت اچھی۔ اس قابل ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔“ صفیہ

لیکچر میں شینے کے لئے محبت از خود چھٹک آتی تھی۔

”فخر! اس میں کچھ حصہ تو آپ کا بھی ہوگا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے جھتی ہے۔“



حادثے بن کر یہاں لوگ ملا کرتے ہیں۔

ایسا تو زندگی بھر ہو گا۔۔۔۔۔ حادثوں کے مفہوم بدل جاتے ہیں۔۔۔۔۔ مگر حادثے زندگی کا مستقل حصہ ہیں۔۔۔۔۔ چندا۔۔۔۔۔ یوں جان نہیں چلایا کرتے۔

”بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔ کہہ دو یا۔۔۔۔۔ وہ جھالٹی۔

”کیا تم میری وجہ سے ایسا کر رہی ہو؟“ نبیلہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔  
نالکہ خاموش رہی۔

”اگر تم میری وجہ سے ایسا کر رہی ہو تو حرافت کر رہی ہو۔۔۔۔۔ میں کوئی خوابوں میں رہنے والی لڑکی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتی ہوں۔

میں نے حوصلے کے ساتھ زندہ رہنا اپنی ماں سے سیکھا ہے۔

صبر و استقلال کے قرینے مجھے احسن بھائی نے بتائے ہیں۔ ان کا بھی تو کوئی دل ہے؟

چاروں سمت دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بہت محفوظ ہوں۔

اور فیلی! شادی خوشی کا بہانہ یا خوشی کی معراج تو نہیں ہے۔

ہماری ہی بھی تو شادی شدہ اور سہاگن ہیں۔۔۔۔۔ وہ تلخی سے ہنس دی۔

”انہوں نے شادی سے پہلے جو خوشی بھری زندگی گزاری۔۔۔۔۔ شادی کے بعد سے اب تک وہ ان سابقہ خوشیوں کا خراج دے رہی ہیں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

وہ رک کر ٹلٹی یہ فلمی ہنس دی۔

”اور اولاد۔۔۔۔۔ کی دولت ملنے کے بعد وہ مسلسل زندگی کو ”نکس“ ادا کر رہی ہیں۔“

”میرا دل آپ جیسا نہیں ہے۔“ نالکہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تو بناو۔۔۔۔۔ اگر زندہ رہتا ہے۔

چلو اٹھو۔ کھانا کھاؤ۔۔۔۔۔ ورنہ میں بھی نہیں کھا رہی۔“ نبیلہ نے قدرے خشکی سے کہا۔ نالکہ ناچار اٹھ کھڑی ہوئی۔  
اباجی دسترخوان پر بیٹھے آنے والوں کا پاؤں دیا اور پابنت کر رہے تھے۔

اور صفیہ کو جو رازاں سے کلام کرنا پڑ رہا تھا۔ اس اولاد کے لئے ابھی نہ جانے انہیں مزید کتنی بار تھکنا پڑا لگتا تھا۔

صفیہ نے آہستگی سے ان سے کہہ دیا تھا کہ ابھی بچیاں بیٹھیں ہیں۔ بعد میں بات کروں گی۔

کھانا خاموش فضا میں تمام ہوا۔

کھانے کے بعد برتنوں کی دھلائی کا سلسلہ شروع ہوا۔۔۔۔۔ پھر سب عشاء کی نماز میں مصروف ہو گئیں۔

ابھی ان کی نماز بھی تمام نہیں ہوئی تھی کہ اباجی کی مخصوص دھواڑ سنائی دی۔

”کہہ دینا۔۔۔۔۔ ہم ”نمبر“ سے کریں گے۔ یہ ہمارا کھر ہے۔ پنساری کی دکان نہیں۔

ارے انہوں نے چھائی لگائی تو کیوں۔۔۔۔۔ تم نے مجھے اس وقت بتایا ہوتا۔ دماغ درست کر دیتا ان کے۔

اور تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ چلو نالکہ ہی سہی۔ تین سال چھوٹی ہے وہ نبیلہ سے۔ اپنی ہی اولاد کا حق نہیں پچھانتیں؟“ اب طوفان کا رخ صفیہ کی طرف تھا۔

”ہم نے تو صبر ہی کی شادی کرنا ہے۔ کسی کو شہنا تو نہیں ہے۔۔۔۔۔ اچھے گھروں کے رشتے مشکل سے ملتے ہیں۔

بہن ہی تھی۔۔۔۔۔“ صفیہ ساٹ انداز میں گویا ہوئیں۔

تم جیسی عورتوں نے اس قسم کے لوگوں کے دماغ خراب کر رکھے ہیں۔۔۔۔۔ خدا ہیں یہ ہمارے۔۔۔۔۔؟ ہم ان کی پکیوں ناچیں بھی۔۔۔۔۔؟ وہ غضب ناک ہو کر پھر دھاڑے۔

اگر ان کی پسند ناپسند ہے تو ہماری بھی ہے۔۔۔۔۔ اگر دولت کا نشہ چڑھا ہوا ہے تو سر پر رکھ کر بیٹیں اپنی دولت کو۔

کہہ دینا اپنی جیتی آمنہ کو۔۔۔۔۔ آئندہ کوئی قصائی کی نسل کا نمائندہ میرے گھر میں قدم نہ رکھے، میرے گھر میں پھر بیکریاں نہیں۔ سناٹم نے؟

”نمبر“ سے کریں گے۔“

فریم الدین کے منہ کے آگے تو خند قہقہی۔۔۔۔۔ بولتے ہوئے تو کبھی وہ احتیاط کرتے ہی نہیں تھے۔ صفیہ ہی تو بہ تلا برا آگئیں۔

لفرض کے بعد بیچ میں مصروف تھی۔ اس نے گردن موڑ کر اینٹا کو دیکھا اور ایک گونہ سکون کا سانس لیا۔

ارے اتنا اچھا رشتہ ہے۔ بیٹی والوں کو تو اپنے اندر لپک رکھنا چاہیے۔۔۔۔۔ ایک ”یہ“ ہیں ساری دنیا کو اپنی ”رعایا“ نے ہیں۔

ہمار میں بھی اپنی ہی کر کے دیکھوں گی۔ ”ان“ کی بھلی چلائی۔۔۔۔۔ وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔  
کام بنانا تو کبھی آئے نہیں۔ بگاڑنے میں البتہ بہت مہارت ہے۔

بایک کر کے کریں گے تب جا کر کہیں فرض ادا ہوں گے۔۔۔۔۔ یہ اپنی شرائط پر اڑ رہے ہیں۔

یہ ہم سب نے قیامت کے پورے سہنے ہیں۔

اللہ سہا ایسا کام ہے جو انہوں نے بگاڑا نہ ہو۔

میرا اور بدر ہے۔۔۔۔۔ ابھی محض ان کے اقدام کی وجہ سے مجھ سے کٹ گئی ہے۔

مالک علیہ عمر بھر کا روگ۔

مکھوئی نہیں آتی، بس دھاگا توڑنا آتا ہے۔“

یہی طرح کھول رہی تھیں۔

ٹکلیاں بیس کراچی ہی میں ہے۔“ احسن کو اس انکشاف سے حیرت آمیز خوشی ہوئی۔

ہاں۔۔۔۔۔ کلشن میں ہے اس کا گھر۔“ شمینہ نے بتایا۔

آپ کی تھیں اس سے ملنے؟“ احسن کی جیسے تمام حیات زندہ ہو گئیں۔

ابھی کہاں پہلی فرصت میں تمہارے ہی پاس آئی ہوں۔ اس کے ہاں بھی جاؤں گی۔“

اگر موصوف کراچی میں رہے ہیں تو طوفان برپا کرنے اسلام آباد کیوں پہنچے؟ جبکہ کراچی کی تو آبادی بھی سب لادے۔ تو ہر خدا نداشت تھا۔

شب خون مارنے کے لئے یہاں گھر زیادہ دافر ہیں۔۔۔۔۔ وہ تلخی سے گویا ہوا۔

تم اپنی جان مت جلاؤ احسن۔۔۔۔۔ ٹکلیہ خوش ہے۔“

ابنہ۔۔۔۔۔ خوش ہے۔

پھوپھو..... یہ جو سارا سیٹ اپ..... آپ..... اپ سیٹ دیکھ رہی ہیں ناں۔ اس کا نقطہ آغاز موصوف کی ہے۔“

”ٹھیک ہے..... مگر احسن..... اس میں ان کا کیا تصور رکھتا ہے۔ وہ شخص شکلیہ کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی تولے کر نہیں گیا بھائی صاحب کی آمادگی سے وہ گھر میں داخل ہوا۔ بھائی صاحب اگر منع کر دیتے وہ کیسے آسکتا تھا، سوچو۔ اسے تو ایک ضرورت تمہارے دروازے پر لگتی..... اگر دروازہ بند کر دیا جاتا تو وہ اللہ کا بندہ کوئی اور گھر دیکھنے انعام علی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔

بھائی صاحب نے اپنے ملے جلے والوں سے کہہ رکھا تھا کہ لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے کوئی رشتہ بتائیں۔ بتانے نے بتا دیا۔

اب باقی مر طے تو بھائی صاحب کے اختیار میں تھے“ ثمنینہ نے سمجھایا۔  
”پھوپھو! آپ کے دل میں موصوف کے لئے خاصی گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔“  
”حق بات کہنا چاہیے احسن..... جب غلطی کی ابتدا ہمارے اپنے گھر سے شروع ہے تو ہم دوسرے فریق پر کیوں دھریں۔

اور پھر میں تمہیں اس لئے بھی سمجھا رہی ہوں کہ تم اس کے سلسلے میں ہر قسم کی جذباتیت سے پرہیز کرنا۔ لڑکی کا بنانے کی ضرورت نہیں۔“

”میں ان نزاکتوں کو سمجھتا ہوں۔ آپ فکر مند نہ ہوں..... ایڈریس تو ہو گا آپ کے پاس..... شکلیہ کا۔“ وہ دھڑکیں ماریا ہوا۔

”ہاں ہے۔ نوٹ کر لو۔“ انہوں نے ٹیبل سے پرس اٹھایا۔ ”فون نمبر بھی ہے۔“  
احسن نے جب سے قلم اور ایک کارڈ نکالا۔ ثمنینہ بولنے لگیں، اور وہ کارڈ کی پشت پر نوٹ کرنے لگا۔

”ارے..... یہ تو میرے آفس سے بہت قریب ہے۔“ احسن چونک پڑا۔  
”تعجب ہے، شکلیہ میرے اس قدر نزدیک ہے اور میں بے خبر ہوں۔“ وہ جیسے متاسف نظر آیا۔

”اب تم مجھے بتاؤ..... کیا قصہ ہے؟ شہوار یہاں کیوں نظر آ رہی ہے؟“ ثمنینہ نے پینٹر بدلا۔  
”یہ سب اباجی کا کیا ہوا ہے پھوپھو۔“

”مگر تمہیں اچھے وقت کا، حالات بدلنے کا قفل کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولا۔  
”ہونہ۔ حالات بدلنے کا..... خلع کی درخواست دی جا رہی تھی۔ اس کے بعد کس اچھے وقت کا انتظار کرنا

گیا تھا۔“ وہ غصے سے بولا۔  
”کون دے رہا تھا خلع کی درخواست؟ تمہارے خالو..... تمہارا نکاح شہوار کے ساتھ ہوا تھا یا خالو کے ساتھ

کی مرضی کے بغیر خلع کی درخواست کیسے دی جاسکتی تھی؟“ ثمنینہ نے اس کی بات کو چسپے پگانہ بات سمجھا۔  
”شہوار کی مرضی..... ہونہ۔“ وہ تکی سے ہنسا۔

”ان کے والد صاحب زور سے چیمیک ماریں تو محترمہ ایک گھنٹے تک کا بچہ رہتی ہیں..... اب بھی آپ ان کی بات کریں گی.....؟“ وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ”خلع“ کی بات محض دھمکی ہو..... یا محض وقتی جذباتیت۔“

ثمنینہ نے پھر ایک دلیل دی۔

”اور گھر میں تو میرا جانا ہے..... صرف شہوار کے ہاں تو نہیں جاتا تھا۔

مجھے چھوٹی خالہ نے بتایا تھا کہ سردار خالو خلع کی درخواست دینے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور ان کا موقف یہ ہے کہ جب باپ خود اپنے بیٹے کو برا کہنے پر مجبور ہے تو.....

آپ سمجھ رہی ہیں ناں پھوپھو.....؟“  
”ہاں..... ہاں..... سمجھ رہی ہوں میں۔“

”مگر تمہیں یہ ساری گندگی اپنے منہ پر ملنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ اپنی بیٹی کو مطلقہ کہلوانے میں خوشی محسوس کر رہے تھے، اور بلا تحقیق یہ انتہائی قدم اٹھا رہے تھے تو اٹھانے دیتے..... تمہیں لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟“ وہ جیسے برا مان کر بولی تھیں۔

”گھنٹا بیٹ کی طرف ہی جھٹکا ہے۔“ ثمنینہ کو اپنے پیچھے ہی کا زیادہ خیال آیا۔  
”ان کی جذباتیت سے نقصان انہیں ہی پہنچتا..... اب کیا ہے..... جو سنے گا تمہیں ہی الزام دے گا۔ کسی کو کیا پڑی ہے حقیقت کی چھان بین کرنے میں اپنا وقت ضائع کرے۔“

بہر حال..... تم نے اچھا نہیں کیا..... بلکہ دوسروں کے گناہ بھی اپنے سر لے لئے ہیں۔ کچی روٹی کی طرح کا کام ہوا۔

کھاؤ گے تو مزہ بھی نہیں آئے گا۔ تکلیف ہوگی وہ علیحدہ۔“  
”پھوپھو..... ٹھیک ہے مجھے لڑکیوں کی کمی نہیں..... مگر لڑکیوں میں اور کوئی ”شہوار“ نہیں ہے۔“

”اتنا چاہتے ہو.....؟“ وہ سب کچھ بھلا کر جیسے ہنس پڑیں۔  
”پھوپھو..... وہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنا بھی خیال نہیں کر سکتے..... جو اس سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے

ہیں۔ انہیں اپنے دعوے کی سچائی میں اس کے احساسات و جذبات کا پاس رکھ کر عملی ثبوت پیش کرنا چاہیے۔“  
”مگر..... اس کا انداز بھی تم دیکھ رہے ہو..... کیسا ہے تمہیں اس طرح انتہائی قدم اٹھا کر؟“ ثمنینہ نے گہرا تجزیہ کیا۔

”ٹھیک ہو جائے گی پھوپھو..... آج نہیں تو کل حقیقت کو پہچان جائے گی۔“  
”بہر حال..... یہ غلطی ہوئی ہے اور یہ غلطی تمام عمر تمہارا تقاب کرے گی۔“ انہوں نے جیسے بہت دکھ سے کہا تھا۔

”غلطی سردار خالو کر رہے تھے۔ اپنی بیٹی کو جذبات میں آ کر ایک مسلسل داغ لگانا چاہ رہے تھے۔“ وہ مستقل اپنی بات پراڑا ہوا تھا۔

”بھابی سنیں گی تو انہیں بہت مدد ملے گی۔“ ثمنینہ کو ایک دم صنیہ کا خیال آیا۔  
”میں نے پانی پر نقش یا نمک کا گھر نہیں بنایا ہے۔ میرے اقدام کی ٹھوس وجہ اور بنیاد موجود ہے۔ امی..... درگزر کر

دیں گی۔“  
”اتنے خوش امید ہو.....؟“

”وہ میری ماں ہیں۔ خدا نخواستہ میں نے کوئی غیر شرعی یا غیر قانونی کام نہیں کیا ہے۔ وہ میری بیوی ہے..... اور اصل

چیز نکاح ہی ہوتی ہے۔“  
ثمنینہ اس سے غلطی کا اعتراف کرانے میں ناکام ہو گئی تھیں..... زچ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔



”دیکھو..... یہ فیصل اور فیضی شہوار کے ساتھ کیا باتیں بنا رہے ہیں۔“

وہ بیڈروم میں چلی آئیں۔

”آئے آئی۔“

شہوار سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”کیا آؤں..... تم تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتیں۔“

شہوار کی آنکھیں میگ گئیں۔

”مجھے امی بہت یاد آ رہی ہیں آئی.....“ وہ گواہی دے کر آواز میں بولی۔

”دو چار بچوں کی ماں بن جاؤ گی تو پوچھوں گی، امی کتنا یاد آتی ہیں؟“

ثمینہ نے کثیف فضا کو لطیف بنانے کی کوشش کی۔

ان کی خود کجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ احسن کو کس طرح راضی کریں کہ وہ شہوار کو اس کے گھر چھوڑ آئے..... نئے سرے سے مذاکرات کا دور شروع کیا جائے۔ جس میں صیف پیش پیش ہوں۔

اگلے ہفتے انہیں قطر روانہ ہونا تھا۔

وہ عجیب قسم کے ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

یہ نکاح طرفین کی آبادی اور سب کی رضا مندی سے بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔

اگر احسن نے کورٹ شپ کی ہوتی تو اس مسئلے کا بہت آسان حل تھا کہ اس سے ہر قسم کا تعلق آسانی سے ختم کیا جاسکتا تھا۔

مگر..... سب کی خوشی کے ساتھ ہونے والا یہ نکاح کوئی کمزور بندھن نہیں تھا۔

اس تقریب میں پورا خاندان شریک ہوا تھا۔

محض شیخ صاحب کی ضد اور ان کے سب ایک آسان مرحلہ ناقابل عبور ہو گیا تھا مگر وہ اپنے بھائی کی غلطی کا اعتراف ان کے بیٹے کے سامنے کرنے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں۔ انہیں لہذا احسن کا اقدام برکھ اور درست نظر آ رہا تھا۔

مگر وہ اس کی تائید سے کتر رہی تھیں۔

کہ اس کے بعد انہیں یہ الزام بھی اٹھانا تھا کہ وہ بچوں کو غلہ راہ دکھا رہی ہیں۔ لہذا وہ خاموشی ہی کو بہتر سمجھ رہی تھیں۔

”یہ تمہاری کلانیاں کتنی سوتی ہیں۔“

آج کل تو لڑکیاں میچنگ کی قسم قسم کی چوڑیاں پہنتی ہیں۔ میری چوڑیاں شاید وحشی ہوں، مگر کام چل جائے گا۔“

ثمینہ نے اپنی بائیں کلائی سے دوسوے کی چوڑیاں اتار کر اس کی کلائی میں ڈال دیں۔

”یہ زیادتی ہے آئی..... پلیز یہ نہ کریں۔“

شہوار پریشان ہی ہو گئی۔

”کوئی زیادتی نہیں ہے..... بری بات..... ایسے نہیں کرتے۔“

احسن بھی ان کے نزدیک چلا آیا تھا۔

”جب تک احسن تمہارے لئے اچھے سے کہنے جوڑے لے کر نہ آئے، بات نہیں کرتا اس سے۔“

وہ اس کا رخسار چوم کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آئی۔“

ہوں۔“

آپ ان سے کہہ دیں، مجھے گھر چھوڑ آئیں.....“ وہ ثمینہ کے جانے کے انداز سے جیسے خوفزدہ ہو گئیں۔ ثمینہ کو اس

ما آ گیا۔

اچھر بیٹھ گئیں۔

ن کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

ایت محبت سے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

ایٹے..... یہ درست ہے کہ تمہارے ساتھ برا ہوا ہے۔ مگر جو تمہارے گھر والے کر رہے تھے۔ اچھا وہ بھی نہیں تھا۔

سے مگر کہ مجھ میں اٹکنے والی بات تھی۔

احسن کی منکوحہ ہو۔ تمہارا سب سے قریبی تعلق ہے اس سے..... وہ اپنی امانت لے کر آ گیا ہے۔ کوئی چیز چرائی

ہ۔

ہاں..... ہاں..... بچوں کی زندگیوں پیچیدہ بنا دی ہیں۔

راضی نہیں لے کر نہ آتا تو تمہارے گھر والے تمہیں خلاق دلوانے پر مجبور تھے۔

بدیہری پوزیشن سمجھو..... میں نہ احسن کے اقدام کی حمایت کر سکتی ہوں اور نہ تمہارے گھر والوں کی۔

ماہیات تو کسی قیمت پر بھی نہیں کہہ سکتی کہ کوئی اپنی لڑکی کو محض اپنی انا کی بچہ سے طلاق دلائے..... طلاق تو حلال

اشک بھی اللہ کو تاپہند ہے۔

رام سے اچھے وقت کا انتظار کرو، مجھے امید ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

بانا کی آگ بجھے گی، غصے کا طوفان اترے گا، تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ دعا کرو..... بیٹے۔“

اٹھ کھڑی ہوئیں۔

آپ جاری ہیں آئی؟“ شہوار بھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاں..... میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے، زیادہ دن تو مجھے لاہور میں لگ گئے۔“

آئی..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ انکب رخساروں پر لڑھک آئے۔

کس بات کا ڈر؟“

انکب جگ قسم کا آوی تمہارے پاس ہے۔ تمہارا بے تحاش خیال رکھنے والا ہ۔“

ہاں نے انگلیوں کی پوروں سے اس کے انکب صاف کئے۔

کھینچنے پر بازو لیے خاموش کھڑا تھا۔

پھر ہوا۔ آپ سے ایک ضروری بات کرتا ہے۔“

ہاں..... کہو..... وہ پوری طرح متوجہ تھیں۔

ہاں..... آپ ای کو میرے گھر کا کسی قیمت پر نہ بتائیے گا۔ کہہ دیجیے گا آفس میں ملی تھیں۔“

نہیں..... آئی..... آپ خالہ جان کو ضرور بتائیے گا۔“ شہوار بے قراری سے بات کاٹ کر بولی۔

لو کہہ لیں تو کم از کم مجھے اپنی خالہ جان تو مل جائیں۔“ اس کا انداز ناراضگی کا تھا۔

احسن نے ایک اچھتی سی نگاہ شہوار پر ڈالی۔

”پھوپھو! آپ میرے ساتھ آئیں۔“

”دفینی! تم لوگ یہیں بیٹھو۔۔۔ اپنی بھائی صاحبہ کے پاس۔“ اس کا انداز دلجو و قابل فہم تھا۔

اس نے ”بھائی صاحبہ“ پر خاصا زور دیا تھا۔

اور ثمنینہ کے ساتھ لاؤنج میں آ گیا تھا۔

”پھوپھو پلیز۔۔۔۔۔ آپ سنجیدگی سے میری بات پر غور کریں۔ میں اس گھر میں نہیں ہوں۔

اس وقت ہمیشہ سے زیادہ امی کی ضرورت ہے وہاں۔

اور۔

اور ابابلی۔۔۔۔۔ انہیں اس مقام پر لے آئے ہیں۔ کہ مجھے مضبوط پا کر شاید وہ ان سے رہائی تک کے!

جائیں۔

اور پھوپھو۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ وہاں پانچ لڑکیاں ہیں جنہیں آج ہمیشہ سے زیادہ امی کی ضرورت ہے

کیا اس عمر میں ان کا تماشا بننا چاہیے؟

میں شکلیہ کو کسی سمجھا دوں گا۔۔۔۔۔ یقیناً وہ اپنے گھرانے کی بہتری کے لئے میرا ساتھ دے گی۔“

”تم ان کی نگاہ سے اوجھل ہو احسن۔۔۔۔۔ بہت ظلم ہو رہا ہے ان پر۔“ ثمنینہ دکھ سے بولیں۔

”پھوپھو، میں نے ایک ایک بات بتادی ہے آپ کو۔“

”یہ محض جذباتیت نہیں ہے احسن؟“

”نہیں پھوپھو۔۔۔۔۔ معاشرے میں اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے والوں کو ان کے رویے کی بد

اداس کون ولائے گا؟“

بس پلیز، آپ میرے ساتھ تعاون کریں۔

میں کوشش میں ہوں کہ نیلرہ نائلہ کے رشتے جلد از جلد ہو جائیں۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں۔ کہ میں قائل نہیں کھیلوں گا۔

جہاں بھی اپنی بہنوں کے رشتے کروں گا۔ ان کو تمام تر حقائق سے باخبر رکھوں گا۔ مجھے خوشی ہے کہ چھوٹی

تعاون کر رہی ہیں۔

آمنہ خالہ کے ذریعے انہوں نے ایک رشتہ بھجوایا ہے۔ ڈاکٹر ہے لڑکا۔۔۔۔۔ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”ارے تم تو واقعی بہت فعال ہو۔“ ثمنینہ واقعی بہت خوش ہوئیں۔

”میں بھی کوششوں میں ہوں۔۔۔۔۔ فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔“ ثمنینہ نے اسے یقین دلایا۔

”کوئی بھی لوگ ہوں پھوپھو۔ حقیقت قطعی نہ چھپائیے۔ اس طرح کے کاموں کا انجام ہمیشہ بھیاک ہوتا۔

اور پھر خنداخو استہم نے چوری نہیں کی۔ ڈاکٹر نہیں ڈالا۔ محض ایک ہی تو مسئلہ ہے کہ والدین میں ہم آہنگی نہ

اور ہم آہنگی نہ ہونے کا سبب ایک فرد احد کی ذات ہے۔ ڈکٹیشنپ کا مسئلہ ہے۔

شہوار میرے گھر میں ہے۔

کیوں ہے؟ یہ بھی کسی سے چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں جس وقت اسے اس کے گھر سے لایا تھا۔ وہ یہ

لڑکی تھی۔ میں نے اپنے حق ورشتے کا استعمال کیا۔

سچی انسانوں کو بے موت مرنے سے بچانے کے لئے۔

آپ سمجھ گھٹیں ناں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ جیسے چونک پڑیں۔

تم فکر نہ کرو۔

میں خود بھی فی الحال ظاہر کرنا نہیں چاہتی کہ میں تم سے ملی ہوں۔

بھائی صاحب تو سننے کے ساتھ ہی مجھ پر اپنے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیں گے اور اب ایسا کوئی مسئلہ

ہونا چاہیے۔

اس لئے کہ اب اس گھر سے دہرا رشتہ ہو گیا ہے۔ اور تم سے بھائی صاحب کی اتنا کی جنگ ہے۔

میں پھر بھی تم سے یہی کہوں گی احسن۔۔۔۔۔ اگر باپ سے ہارنا بھی پڑے تو ہار جانا۔

اس لئے کہ بہر حال وہ تمہارے باپ ہیں۔

تم ہار دیا جیتو۔ ان کا مرتبہ قیامت تک کے لئے ایک جگہ قائم ہے۔

وہ جیت جائیں تو تمہارے باپ ہیں۔

وہ ہار جائیں تو تمہارے باپ ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں پھوپھو، میں باپ کے مقابل نہیں آ رہا۔ کاش وہ مجھ پر اتنا اٹھا دیجے مگر زبان کے گھاؤ سے

پھٹتی نہ کرتے۔

اس گھر میں موجود سات آٹھ زندگیوں کا مسئلہ ہے۔

میں صرف ان کی خاطر اسٹینڈلے رہا ہوں۔

گھر سے میرا نکلنا ہوا۔۔۔۔۔

شہوار کی یہاں موجودگی۔

میں ان کو کچھ احساس دلانا چاہتا ہوں۔

ظلم اور استحصال بہر حال میری برداشت سے باہر ہے۔“

ثمنینہ چپ۔۔۔۔۔ بیٹھی سنی رہیں۔ آخر ایک گہرا سانس لیا۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”پھر کبھی بیٹا۔۔۔۔۔ دھیان سے۔۔۔۔۔ مجھے تم بے انتہا عزیز ہو۔“

”آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔۔ احسن نے اعتماد سے کہا۔

”اور دیکھو۔۔۔۔۔ شہوار کو تکلیف نہ دینا۔۔۔۔۔ چھوٹی سنی ہے۔ آمرول کی جنگ میں ماری جاری ہے۔

اس وقت چھالے جیسا دل ہو گا اس کا۔ دیکھو دھیان سے۔“ احسن بہم سے انداز میں مسکرا دیا۔

ثمنینہ کو اس کی مسکراہٹ سے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی۔ مگر وہ مزید کچھ بولنا نہیں چاہ رہی تھی۔

واہل احسن کے بیڑوم میں آئیں۔

فیصل اور فیضان شہوار سے باتوں مصروف تھے۔

”چلو اٹھو بچوں۔۔۔۔۔ دیر ہو رہی ہے۔“

”آپ کیوں جاری ہیں آئی؟“ شہوار بستر سے اٹھ کر ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

ثمینہ نے اسے بے اختیار گلے لگالیا۔

”حوصلے سے کام لو بیٹا۔ یہ اب تمہارا گھر ہے۔ اکثریت کی مرضی سے تمہارا نکاح ہوا تھا۔ تم اپنے آپ کو کرنے کے بجائے، حالات کی بہتری کے لئے احسن کے ساتھ کوشش کرو۔“

پھر انہوں نے اپنا پرس کھولا۔ ایک ہزار کانوٹ نکال کر شہوار کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”نہیں۔ نہیں۔ پلیز یہ نہ کریں۔“

یہ چوڑیاں۔۔۔ بہت اچھا گفٹ ہیں۔۔۔ پلیز آئی یہ میں نہیں لوں گی۔“

”چوڑیاں تو میں نے احسن کی پھوپھی کی حیثیت سے دی ہیں۔ اور یہ تمہاری منہ دکھائی ہے، اس رشتے میرے اور تمہارے درمیان تمہاری امی کی وجہ سے بنتا ہے۔ چلو رکھو۔ بری بات۔۔۔ بات مان لیتے ہیں بیٹا۔“

ان کے قطعی انداز کے سامنے شہوار بے بسی ہی ہو گئیں۔

ثمینہ نے اسے پیار کیا اور کمرے سے نکل گئیں۔

شہوار حواس باختہ سی نگے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے چل دی۔

احسن لاؤنج سے باہر آچکا تھا۔

اس نے افسانہ خیز اس شہوار کو آتے دیکھا تو کچھ سوچ کر مسکرا دیا۔

”آئیے پھوپھو۔۔۔ میں آپ کو ڈراپ کر آتا ہوں۔“ اس نے چیخ کش کی۔

”نہیں۔ تم یہیں رہو۔۔۔ یہ کیلی گھبرا گئی۔“ انہوں نے پیش کش واپس لوٹا دی۔

”اس ماحول کا تو کمتر کم کو عادی ہونا پڑے گا۔ میرے کاندھوں پر تو یوں بھی بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔“

”نہیں بس تم رہے دو۔۔۔ ماشاء اللہ میرے دو جوان بیٹے میرے ساتھ ہیں۔“ انہوں نے مادرانہ شفقت سے

نگاہوں سے اپنے بچوں کو دیکھا۔

”مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“

”تم رہے دو۔۔۔ اچھا برا۔۔۔ خدا حافظ۔“

شہوار تری ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ثمینہ کو بے ساختہ اس پر پیار آ گیا۔

آگے بڑھ کر اس کا رخسار چھوا۔

”خدا حافظ۔ گھبرا تے نہیں۔“

وہ دونوں انہیں گیٹ کے اس پار جاتا دیکھتے رہے۔

احسن نے دروازہ سے کھٹک کر گلا صاف کیا۔ آگے بڑھ کر گیٹ بند کر دیا۔ شہوار جیسے کسی خیال سے چونک پڑی

مٹھی میں بند ثمینہ کا دیا ہوا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے تھا خدا انداز میں بولی۔

”یہ لیجئے۔۔۔ آئی نے دیے تھے یہ پیسے۔“

”آپ کو دیے ہیں۔۔۔ آپ ہی رکھیے۔“ وہ گہری نگاہ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں کیا کروں گی۔۔۔ وہ بہت بگڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔“

احسن نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

وہ بہت محبت سے بگڑی کا سوپ، امی کو پار رہی تھی۔

اور ان سے ہلکی پھلکی ہمتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

”مہیں اپنے پاپا کو نوٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ ثقاہت بھرے انداز میں بولی تھیں۔

”اسد بھائی۔۔۔ اصرار کر رہے تھے امی۔“

میں ان کے سامنے اپنے اندرونی معاملات لانا نہیں چاہتی۔ مجھے اسلٹ فیل ہوتی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”آہ۔۔۔ ہم نے کیا دیا ہے بھلا بچوں کو۔۔۔“ وہ دکھ سے بولیں۔

”ایسا نہیں سوچتے امی۔۔۔ پلیز۔۔۔“ وہ جیسے تڑپ گئی۔

”ایک چور دروازے میں دکھ کا آسب کھڑا ہے جو میرے بچوں کو اسے خوش نہیں ہونے دیتا۔“

”امی پلیز۔۔۔ مت سوچیے اس قسم کی باتیں۔ آپ ہمارے پاس ہیں۔ ہمیں یہ خوشی بہت ہے۔“ اس نے محبت سے

اگر دیکھا۔

اسی وقت کال بیل بجی۔

منزلہ نے دیکھا بلال موجود نہیں تھا۔ ملازمہ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ بالدرکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ امی۔۔۔ ابھی آئی۔“

اس نے گھڑی کی سمت دیکھا دوپہر کے گیارہ بج رہے تھے۔

دروازہ تو کھلا ہوا تھا۔ آنے والا جیسے اجازت کا طلبگار تھا۔

وہ آگے بڑھ آئی۔

سیاہ رنگ کی خوبصورت کڑھائی سے آراستہ چادر لپیٹے ایک بڑی دلکش سی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔

اس کا گلاباں کھلا ہوا سفید چہرہ سیاہ چادر سے جیسے چاند کی طرح طلوع تھا۔

”کی۔۔۔؟ منزلہ نے حیرانی سے نو وار کو دیکھا۔

”آپ منزلہ ہیں۔۔۔؟ خوبصورت لب لہا ہوئے۔“

”کی ہاں۔۔۔ مگر آپ۔۔۔؟“ وہ ابھی۔

”میں نکلی ہوں۔“

بھر پور جیسی آواز میں بولی۔

”شکلیہ انعام علی۔“



”جی نہیں..... ان کو تو میرے یہاں آنے کی بھی خبر نہیں ہے۔“  
”منزہ چونک پڑی۔“ میں سمجھی نہیں۔“

”اگر آپ اپنی امی سے مجھے ملوادیں تو میں آپ کی بے حد مشکور ہوں گی۔“  
آپ کا کیا خیال ہے، وہ مجھ سے ملنا پسند نہیں کریں گی؟ شکیلہ نے منزہ کی ہچکچاہٹ کو کچھ سمجھا۔  
”نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔ بہت صابرہ، بہت برداشت کرنے والی۔“ اس  
لہجے میں افتخار سا جھلکنے لگا تھا۔

”آئیے.....“ اس نے جیسے شکیلہ کی قربت کے سحر میں مبتلا ہو کر ”رسمک“ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شکیلہ کے چہرے پر جیسے گہرا اطمینان سا اثر آیا۔ وہ منزہ کے پیچھے چل پڑی۔  
”امی..... آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ منزہ نے ماں کو متوجہ کیا جو آنکھیں موندے جانے کس سوچ میں تھیں۔  
انہوں نے فوراً چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

ایسا چہرہ جو کسی حسن، دو گئی۔ سادہ عا ہو سکتا ہے۔

مباحث، افسار..... اور وقار..... یہی تاثرات ایک دم ذہن میں آئے تھے۔

السلام علیکم!.....

مج اذلی کا سکوت غالباً ایسی ہی آواز سے ٹوٹا ہوگا۔

”وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔“ وعلیکم السلام.....

”برائے مہربانی تکلیف نہ کیجئے ایسے ہی ٹھیک ہے۔“ شکیلہ نے انہیں اٹھنے سے روکا۔

(شاید یہ منزہ کی کوئی ہمسائی ہیں) انہوں نے سوالیہ نظروں سے بیٹی کی سمیت دیکھا۔

”کیا آپ اپنا تعارف امی سے خود کرائیں گی.....؟“ منزہ کی رگ جاں میں عجیب سا دکھ تھرک ہوا۔

”جی..... یہ مناسب ہے۔“

”میں ابھی آئی.....“ شاید منزہ ماں کے تاثرات دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی تھی۔ باہر نکل گئی۔

”میں اپنے گناہ بخشوانے کے ارادے سے آپ کے پاس نہیں آئی ہوں۔ محض انسان ہونے کے ناتے میری کچھ

مددگار ہیں..... میں عہدہ برآ، ہونے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں شکیلہ ہوں۔“

”شکیلہ..... میں نے آپ کا نام آج پہلی بار سنا ہے۔“ حیرانی اور نقاہت کا ملاملا تاثر دے رہی تھیں۔

شکیلہ چونک پڑی۔

”چند بہت اندر میرے میں آتا ہے۔ مگر صحن و دیوار پر پاؤں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں تو نام و نشان تک سے  
اکائی نہیں۔“

”میں کبھی بلال یا منزہ نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔“ وہ کچھ پریشان سی نظر آئی۔

”میرے بچے مجھے آگینہ بنا کر رکھے ہوئے ہیں..... بہت سی باتیں مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ وہ  
انہما کر گئی۔

”مگر اب میں کچھ سمجھ رہی ہوں۔ غالباً آپ انعام علی کی.....“

”جی.....“ شکیلہ نے جلدی سے ان کا جملہ تمام کرنے کی کوشش کی۔

منزہ کی آنکھوں میں شناخت کے سارے تجربات اُٹھ آئے۔

اب اس کی نگاہ سرسری اور محض مہمان نواز نہیں تھی۔

ساری محرومیاں، بے سیرت بن کر آنکھوں میں سٹ گئی تھیں۔

وہ دشت زدہ سی ہو کر شکیلہ پر بے قرار نگاہیں ڈال رہی تھی۔

”آ..... آ..... آپ.....“ وہ ہٹا کر رہ گئی۔

”جی..... اگر آپ منزہ ہی ہیں اور بلال کی بہن ہیں تو صحیح سمجھ رہی ہیں۔

منزہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ بیار ماں کا چہرہ جیسے سامنے آگیا تھا۔

”آپ کی امی موجود ہیں.....؟“ شکیلہ اس کا تذبذب نہ سمجھ سکی۔

”جی..... جی..... ہاں.....“

”آئیے تشریف لائیے۔“ فوری فیصلہ ہو گیا اور منزہ ایک طرف ہٹ گئی۔

شکیلہ کو لے کر ڈرائنگ روم میں آئی اور وسط میں رُک گئی۔ صوفے کی طرف اشارہ کر کے گویا ہوئی۔

”تشریف رکھئے۔“

”بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے اپنی امی سے ملادیں۔“ شکیلہ نے گویا بیٹھنے سے انکار کیا۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ منزہ نگاہ چرا کر بولی۔

”جی..... ملازمہ کے ذریعے پیغام ملا تھا۔“ شکیلہ نے حالات سے واقفیت کا اظہار کیا۔

منزہ جو اس کے خلاف دن رات سنگ سنگ کر سوچتی تھی اب اسے اس کے نرم اور شفیق انداز کے سامنے عجیب

یسی کا احساس ہو رہا تھا۔

”آپ کو پاپانے بھیجا ہے.....؟“ وہ سادگی سے پوچھ بیٹھی۔

شکیلہ بے ساختہ مسکرا دی۔

مہاجر ت ہوا انکشاف ہے۔ جب کہ انعام علی تو کہتے تھے..... ”وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔“  
 ”ہی..... کیا کہتے تھے.....؟“ ٹھیکہ بے مبری سے گویا ہوئی۔  
 ”پاؤں گی..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی بے خبر ہو۔“ وہ دکھ سے بولیں۔  
 ”جیسے تو آپ کا نام بھی معلوم نہیں۔“ ٹھیکہ کی آواز پر اب آنسو غالب تھے۔  
 ”ان..... ہونہ۔“ وہ خود ہی بخنی سے مسکرائیں ”آٹکھ سے اندھے نام نہیں رکھتے۔“ اور کہا لا

پہلے رکت ہر ریکے پر دن ہو گیا۔

کاشکے جلاں۔ جلاؤناں اسے..... یہ سمہاری چھوی ائی ہیں۔



منزہ نے جیسے تڑپ کر ماں کو دیکھا۔

شکیلہ کی ہلکیوں پر بھی جیسے منوں بوجھ آ پڑا تھا۔ بلال کا نام سن کر اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔

اسی دم بلال اندر داخل ہوا۔ چونکا، ٹھنکا۔ پھر جیسے ہوش میں آ گیا۔

”کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلائے آ جاتے ہیں۔ وہ آگے بڑھا۔

”بلال.....! منزہ نے جیسے اسے ڈانٹا۔ ”سلام کرو۔“

”مجھے سلام کرنا سکھا رہی ہیں آپ!..... میں کوئی سال بھر کا شیر خوار ہوں..... کہ بیٹا.....“ چام“ کرو۔“

استہزائیہ ہنسا۔

”یہ پرلے درجے کی بدتمیزی ہے..... منزہ اسے سمجھاؤ۔“

نور بانو نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ پھر ہلکی آنکھوں سے شکیلہ کی سمت دیکھا جس کا چہرہ دھواں دم

بولیں۔

”یقین کرو۔ یہ ہرگز میری تربیت نہیں ہے۔“

”امی..... یہ آپ کس کے سامنے اخلاقیات کے چراغ روشن کر رہی ہیں..... ان لوگوں کے سامنے۔“

سے اخلاقیات کا وجود سخت خطرے میں ہے؟“

وہ پردہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

شکیلہ کی آنکھوں سے دو قطرے گرے اور اس کی کالی چادر میں جذب ہو گئے۔

بالکل ایسے ہی جیسے اور بہت سے حادثے آنسو بن کر بار بار اس کے دل کی ذرخیز زمین میں جذب ہو چکے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

نور بانو گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”اجازت دیجئے۔ پھر آؤں گی.....“ وہ نگاہیں چرا کر گویا ہوئی۔

”پھر آؤں گی۔“

دونوں ماں بیٹی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

یقیناً اس کا دل غم آشا ہوتا ہے جو ستم خاموشی سے جھیلتا ہے۔

(انعام علی..... کیسے پایا ہے اس دُرتابیاب کو؟ اور کہاں سے؟) نور بانو باوجود کوشش کے اسے ٹھہرنے کے

سکیں۔

”اس کی ماں کتنے اصرار سے بلا کر گئی ہے۔ اس طرح کی تقریبات میں تو لڑکیوں کے دم سے رونق ہوتی۔“

اخلاقی ہوتی ہے۔“

”اور سب لوگ تو مجھے جتنے کل مہندی میں۔ ایک میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

ناکدہ نے کتاب چہرے کے آگے رکھی۔

”کان کھا کھائی کل روٹی..... نیلی آپا کیوں نہیں آئیں۔“ راحیلہ نے روٹی کی نقل اتاری۔

”بیٹی! تمہاری طبیعت بھی اور سی ہو جائے گی۔ اتنی مشکل سے تمہارے ابا جی نہیں جانے کی اجازت دے

اسے پیار سے سمجھایا۔

”مہندی نہیں ہے امی۔“ وہ نگاہ چرا کر بولی۔

بھونچی اٹنے اصرار اور پیار سے کوئی بلائے تو جانا چاہیے۔ بری بات ہوتی ہے۔ روٹی کھد رہی تھی اگر آج نیلی آپا

ہاتھ میں خود آ کر لے جاؤں گی۔“ نیلے نے بتایا۔

بھونکتی محبت کرتی ہے تم سے..... محبت کی قدر کرتے ہیں بیٹا۔ اتنا تو تم نے مجھے کبھی نہیں بلوایا۔“ منیہ کچھ

دہن۔

لی..... اور سب تو جا رہے ہیں..... لے کے.....“ وہ ماں کے بدلتے لہجے پر کچھ جھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

برے پاس ایسے کوئی خاص کپڑے نہیں ہیں۔ اگر بارات میں جانا پڑ گیا..... تو.....“

ایک مناسب پہنا سو جھ گیا۔

ارات پر سوں ہے۔ وہ جو احسن نے کچھ فحری چین سوٹ بھجوائے تھے تمہاری چھوٹی خالہ کے ہاتھ ان میں سے کوئی

پا۔“ منیہ نے رائے دی۔

یک ذرا سی بات کے لئے میں اتنے قیمتی سوٹوں کو برباد کروں۔“

لیا بات ہے نیلی! تم برابر بحث کئے جا رہی ہو۔ حد ہوتی ہے۔ کیوں مزاج نہیں مل رہے تمہارے؟“ منیہ خفا ہو

آپ ناراض نہ ہوں امی..... میں تیار ہو رہی ہوں۔“ وہ رد ہانسی سی ہو کر اندر کمرے میں چلی گئی۔

روٹی اور میں وہ گلابی سوٹ میں تیار ہو کر آ گئی۔ راحیلہ اور نیلی پہلے سے تیار تھیں۔

لاکاشیہ پہر تھا اس لئے وہ نہیں جا رہی تھی۔ نیلیہ گھر کی ”رکھوالی“ کر رہی تھی۔ وہ کل جا چکی تھی۔

لڑنے کو فت کی وجہ سے ہلکا سا پاؤ ڈر یا لب اسٹیک تک نہیں لگائی تھی۔ بالوں کی دہی ساہو سی چوٹی تھی۔ جو وہ عام

ناگنہا کرتی تھی۔

انوں میں تو کچھ ڈال لو۔“ منیہ نے ٹوکا۔“ شادی کا گھر ہے۔“

کیا ڈالوں.....؟“

لاہری کی جھمکیاں پڑی ہیں دراز میں۔ میں نے تو کانوں میں پھول پہن لئے ہیں۔“

لکھا کچھ بولے پھر اندر بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر میں جھمکیاں پہن کر باہر آ گئی۔ جھمکیوں نے اس کے چہرے کی کشش

بھانساؤ کر دیا تھا۔ منیہ نے فوراً اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی اور اسے ٹوکا۔

نہرہلک کرو۔ موڈ درست کرو۔ شادی میں جا رہی ہو۔“

نہرہلک بہت سارا روٹا آ گیا۔

مال کی طرف سے پشت کر کے چادر اوڑھنے لگی۔

سائیل کا گھر بیکار ہاتھ اور شور شرابے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ غالباً مہندی آ چکی تھی۔

لہجہ پرانوں کا اثر دھام سا تھا۔ اندر جانے کا راستہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس کے قدم یوں بھی ست تھے۔ ماں نہیں

لگاؤ۔ پھنس کر رہ گئی۔ عجب کو فت کے عالم میں وہ ایک طرف کو ہو گئی کہ کب موقع ملے اور کب اندر جائے۔

لہجہ ٹھیک..... کیا میں عالم خواب میں ہوں؟“ بھاری اور گھمبیر سرگوشی اتے ہیں۔ اپنے کان میں سنائی دئی۔

اس کے اپنے دل کی دھک دھک سے جیسے کانوں کے پردے لرزنے لگے۔

وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ اس کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر رووے۔ وہ اسی لئے آنا نہیں چاہتی تھی کہ یہ خواب میں مبتلا ہو جائے گا۔ پھر اس کا ازل کیسے ہوگا؟ اب وہ اہی کو کیوں کر سمجھائے۔  
ظاہر ہے پھر کسی نہ کسی طرح اباجی تک تو بات پہنچ جانی تھی۔  
جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی تھی اس کے مطابق تو یہ ”حرکتیں“ گناہ کبیرہ میں گردانی جاتی تھی جو کے چیلے سے سرزد ہو رہی تھی۔

اس کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا۔

اس نے دیوار سے ٹک لگا کر جیسے جھکن اتارنے والا گہرا سانس لیا۔ ابھی تک تھیلیوں میں پسینہ تر رہا تھا۔  
”ارے نیلی آپا..... آپ آگئیں۔ شکر خدا کا۔“ روبی ایک سرخوشی کی کیفیت میں اس سے لپٹ گئی۔  
تاکہ اس سے اس درجہ بے تکلفی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے آہستگی سے علیحدہ کیا۔

”آئیے آپا.....! یہاں بیٹھے۔“ اس نے ایک کرسی پیش کی۔

”اُمی کہاں بیٹھی ہیں؟“

وہ بیٹھے کے بجائے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”وہ تو باہر گھن میں اُمی کے پاس ہیں۔ بیلا اور ارجیلہ وہ سامنے بیٹھی ہیں۔ دو لہا والوں کی ٹیم میں۔ یعنی ہمارے۔“ وہ ہنسی۔

”آپ بھی وہیں آ جائیں۔“

”نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ وہ سرد مہر انداز میں کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

بہار دچھول برس او سیر محبوب آیا ہے۔

دیواروں میں نصب ایسپلی فائر سے اچانک گیت اٹھ پڑا۔

”کیسٹ کس نے لگائی؟ کون ہے.....؟ یہاں مقابلہ ہو رہا ہے۔“ لڑکیاں بے ترتیب لمحوں میں چیخ پڑیں

”بھائی جان ہیں، ذرا تمیز سے۔“ روبی سے شوشی سے تاکہ کو دیکھا۔

”منع کرو بھائی جان کو، چائیں ہے کہ یہاں مقابلہ ہو رہا ہے۔“ لڑکیاں چیخیں۔

”رازی! کیا ہے؟ کیوں بچوں کو ستا رہے ہو.....؟ کسی بزرگ خاتون نے ٹوکا۔“

”ممائی جان.....! یہ بے سری آواز میں سن کر میرے کانوں میں خراشیں پڑ گئی ہیں۔“

اس نے دایوم اونچا کر دیا۔ گیت خاصا آگے بڑھ چکا تھا۔

نظاروں ہر طرف اب تان دواک نور کی چادر

بڑا اثر میلا دلبر ہے، چلا جائے نہ شرما کر

ذرا تم دل تو بہلاؤ میرا محبوب آیا ہے

تاکہ کو یوں محسوس ہوا گویا ہر نگاہ اس پر ہو۔ اس کا تماشا سا بن رہا ہو۔

”رازی بھائی..... پلیز بند کریں..... درندہ لہن والے مجھیں گے کہ ہم نے ہمارے بچنے کے لئے یہ ڈرامہ کیا ہے

یاس منت کے انداز میں چیخیں۔

یوں تنگ کر رہے ہو رازی.....“ ایک اور خاتون نے جیسے گھر کا۔

وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

اسے دوران جب حشر کا منظر برپا ہوا تو وہ..... دیوار سے ٹک لگا کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔

تے خاک بھی لطف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کی آڑی تر جھمی شوخ نگاہوں نے اس کی جان پر بنا کر رکھی تھی۔

بی کے بڑے بھائی کے گرد خواتین اٹھ رہی تھیں۔ وہ بہت محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ معادہ جیسے

یہ کر سامنے آیا تھا۔

دلنے کا مل سیکنڈ کے ہزاروں حصے پر مشتمل ہوگا۔

راس کی رنگ جاں کو چھو گیا۔

ایک دعوت کیا ہوتی ہے.....؟ یہ اس کی زندگی کا اولین تجربہ تھا۔

ج سے پہلے اسے اندازہ نہیں تھا کہ نگاہیں بولتی بھی ہیں۔

ایک منٹوں تک نظریں اٹھانے کا حوصلہ نہ کر سکی۔

کا وجود جیسے نگاہوں کی بارش میں بھیگتا چلا گیا تھا۔ کافی دیر اس کے حواس بحال نہ ہو سکے۔

مقام ہوئی..... کیونکر.....؟ اسے ہوش نہ تھا۔

م کے بعد کھانے کا شور بلند ہوا..... بھیڑ کا رخ باہر کھٹنے والے دروازوں کی سمت ہو گیا۔ وہ بھی ”رلیے“ میں بہتے

لا لک کر اس کے پاس آ گئی تھی۔

ہوں.....! وہ ہکا بھکا رہ گیا۔

آئیے..... بیلا..... آپا کو ادھر لے آؤ..... آپا..... یہ دیکھئے چیز بھی رکھی ہے۔ آپ بیٹھ کر کھانا کھالیں۔“ روبی

کی کونے سے نکل آئی تھی۔

”ہم کھالیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔“ تاکہ نے آہستگی سے کہا۔

مرد روبی لٹو پیچھے کے ہمراہ دو پلیٹیں لے آئی اور ایک ایک دونوں کے ہاتھ میں تھما دی۔

”کباب، پرائیڈ اور طلوہ۔ آج کا ڈیزان اشیاء پر مشتمل تھا۔“

الٹکی جیسے ہموک چمک اٹھی تھی۔

کھانے چوری چوری ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ وہ مطمئن ہو کر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ کھانے کے

اسے پانی کی طلب ہوئی۔

”ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی.....“ بیلا..... پانی کا انتظام کس طرف ہے؟“

”آپ؟“

”آپ یہیں ٹھہریں..... میں لاتی ہوں۔“ بیلا ایک طرف بڑھ گئی۔

”پانی حاضر ہے جناب!“

دوا چانک پانی کے گلاس کے ہمراہ پیچھے سے نکل کر آیا۔

پلیٹ نائلہ کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے بچی۔

اسے لیتے ہی بن پڑی۔ کچھ کھسک بھی نہ آیا تھا کہ وہ کیا کرے۔

آپ یقیناً میری سابقہ حرکات کے پس منظر میں مجھے چپ سا انسان سمجھ رہی ہوں گی۔“ اف خدا یا۔۔۔۔۔

نزدیک آ کر اہوا تھا۔ اس پر مستزاد گفتگو بھی کر رہا تھا۔

”یقین کیجئے۔ وہ سب محض شرارت تھی۔“ وہ جیسے بات کرنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اور اسے جی بھر کا ارمان پورا کر رہا تھا۔

نائلہ کے طلق میں پانی جیسی سیال شے بھی اٹکنے لگی۔ دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔

اس نے بشکل خود پر قابو پایا۔۔۔۔۔ اور ایک نگاہ صرف ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ سرمئی شلوار قمیص میں لمبوس قرعے بنائے ہوئے تھا۔ مونچھوں سے لب مسکرا رہے تھے۔

”آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔“ نہ جانے کیسے اس کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا تھا۔ حالانکہ اس جیسی لڑکی اس جیلے کی ادائیگی آسان نہ تھی۔

”چاند سے بھی تو نہیں کھیل سکتا۔“ بر جستہ جواب آیا تھا۔

اس کی نگاہیں جیسے اس پر قہقہہ ہورہی تھیں۔

نائلہ آگے قدم بڑھا چکی تھی مگر اس نے یہ جملہ سن لیا تھا۔ اس خوبصورت تہذیب کا اثر صرف اتنا ہوا کہ گجراہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

”یہ لیجئے پانی۔۔۔۔۔ ہائیں۔۔۔۔۔ پانی مل گیا آپ۔۔۔۔۔ میں خواندہ چکرانی رہی یہاں وہاں۔“

بیلا نے جیسے تھک کر وہ گلاس اپنے منہ سے لگا لیا تھا۔

”آپ!۔۔۔۔۔! وہ جو گلابی سا زخمی دہلی خاتون سے بات کر رہے ہیں ناں، وہ روہنی کے نمردو بھائی ہیں۔ وہ جو سرگز سوت میں ہیں۔۔۔۔۔ رازی کہتے ہیں تائیں گھر والے۔ اصلی نام پتا نہیں کیا ہے۔ اور وہ جو میردن سا زخمی میں پھولوں پہنے ہوئے ہیں، وہ روہنی کی سب سے بڑی بہن ہیں۔“ بیلا نے اس کو جیسے متوجہ کیا۔

”ہوں۔“ نائلہ غائب و ماضی سے ہوں ہاں کرنے لگی۔

”وہ جو روہنی کے بھائی رازی ہیں ناں، بہت شرارتی ہیں۔ بہت تنگ کر رہے تھے گانوں کے بیچ میں“ بیلا پھر بولا۔

”ای کس طرف کھڑی ہیں بیلا۔؟“ اس نے ایک دم موضوع سے ہٹ کر سوال کیا۔

”اس طرف کونے میں عید کی امی (بھائی) کے ساتھ۔“ بیلا نے اشارہ بھی کیا۔

”آؤ۔۔۔۔۔! اسی طرف چلتے ہیں۔۔۔۔۔“ اب تو یوں بھی اسے کھانا کھانا دو بھر تھا۔

اس نے رست و ارج پر نظر ڈالی۔

صبح کے نونچلے تھے۔ دروازہ ہنوز بند تھا۔

اب تو مزید برداشت نہ کر سکتا تھا۔ سلیپر گھسیٹا ہوا بیلڈرم کے دروازے تک آیا۔ اور دروازہ وہی طرح دھڑ دھڑا اس کی حرکت میں جھلکا ہٹ کا تاثر واضح تھا۔

چند ثانیے بعد چنچنی کرنے کی آواز آئی اور دروازہ دھوا گیا۔

رہائے کریم کھڑکی چادر پریشانی تک منڈھے ہوئے کھڑی نظر آئی۔

”میرا گھر میں پڑاؤ ڈالنے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں۔ میری کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں۔ کیا بے کار سمجھا ہوا ہے۔ جاگیر دار ہوں جو بیٹھے بیٹھے روٹی مل جائے گی۔“

وہ بڑبڑاتا ہوا وارڈ روب کی سمت بڑھا۔ سامنے ایک چادر جائے نماز کے انداز میں بچھی ہوئی تھی۔ وہ اس پر جا کر بیٹھی۔

دھنک گیا۔

”یہ کن ہی نماز کا وقت ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ قدرے متعجب نظر آیا۔

پلاس بہانے تم اللہ سے قریب ہوئیں۔۔۔۔۔ یقیناً یہ سہرا میرے سر بندھنا چاہیے۔“ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر اپنے بے گناہ لٹے لگا۔

وہ دستور خاموش رہی۔

احسن کپڑے بازو پر لٹکا کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔

نظر پائیں منٹ بعد باہر آیا تو وہ بیلڈ کی چادر درست کر رہی تھی۔

”کیا ناراضگی اس قدر ہے کہ ناشتے کے نام پر ایک کپ چائے بھی۔۔۔۔۔“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر تویلے سے سرخنگ لٹے لگا۔

وہ ٹپکے سیٹ کرنے میں مصروف تھی۔

”دروازہ اندر سے بند کر کے سونا اگرچہ آپ کا اپنا صوابدیدی فعل ہے مگر ایک بات غور سے سن لیجئے محترمہ در شہوار ہا۔“

شہوار کے ہاتھوں کی حرکت کر گئی۔

”میں اپنی محنت کی کمائی چوری کی کمائی کی طرح کھانا کبھی پسند نہیں کروں گا۔ میں آپ کو جیت لایا ہوں۔۔۔۔۔ اس بالائی خوشی اب ہر خوشی پر بھاری ہے۔ تموڑی بہت عزت نفس ہم بھی رکھتے ہیں محترمہ۔“

وہ ہٹش بالوں میں چلاتے ہوئے بہت اعتماد سے مخاطب تھا۔

”امید ہے تو لہ بھر قتل میں یہ سیدگی بات سا گئی ہوگی۔ اور ایک کپ چائے کے امکانات پیدا ہو گئے ہوں گے۔“

شہوار تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

احسن اس کے جانے کے بعد ٹائی اٹھا کر ٹاٹ بنانے لگا۔ پھر بیٹ کتے ہوئے اپنے سر پہ پرتا تھا نہ نظر دوڑائی اور بچے کے سامنے سے ہٹ کر گیا اور شوڑ مہینے لگا۔ پھر اپنا سیاہ اسٹاکش سا بریف کیس اٹھا کر ڈانٹنگ کی طرف آ گیا۔ اور

لکھنؤ ٹیبل پر رکھ کر کھولنے لگا۔

منہری قلم نکال کر جیب میں اٹکایا اور رکھے ہوئے کاغذات چیک کر کے بریف کیس بند کر دیا۔

وہ چھوٹی سی شرے ہاتھ میں اٹھائے اس کے پیچھے بے آواز کھڑی ہوئی تھی۔

ٹاکر براؤن پینٹ اور لائٹ براؤن شرٹ میں اپنے مضبوط وجود کے ہمراہ بہت ڈینٹ سا لگ رہا تھا۔

اس کے وجود سے اٹھنے والی ہلکی ہلکی مہک شہوار کے گرد پیچھے گھیرا بیٹھنے لگی۔

محاسن نے اس کی موجودگی کو محسوس کیا اور فوراً گھوم پڑا۔

شہوار نے گڑبڑا کر طے جلدی سے ٹھیل پر رکھ دی۔

”سامنے بیٹھ کر بھی دیکھ سکتی ہو۔ اس میں زیادہ آسانی ہے۔“ وہ کرسی ٹھیک کر بیٹھ گیا۔ ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلنے لگی تھی۔

”چونکہ تم دلہن بننے کے موڈ میں نہیں ہو، اس لئے دلہنوں والے ناز غرے بھی ختم۔ دیکھو مین گیٹ پر اخبار پڑا ہوگا۔ اٹھاؤ۔“

وہ چائے کا کپ اٹھا کر سپ لینے لگا۔

شہوار بحالت مجبوری جیسے اپنی قسمت کو کوئی گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔ اپنی بے بسی پر جیسے نئے سرے سے روٹا جانا چاہتی تھی۔

اس نے اخبار اٹھالیا۔ جی چاہا اخبار کے کٹڑے کٹڑے کر کے ٹھیل پر بکھیر دے مگر وہ ایسا کرنے سے عاجز تھی۔ اخبار لے کر جیسے ٹھیل پر بیٹھ دیا۔

”آپ چائے نوش نہیں فرمائیں گی؟“ وہ جیسے اس کی حالت سے لطف اٹھا رہا تھا۔

”جب میرا موڈ ہوگا فرمالوں گی۔“ وہ پھٹ پڑی۔

بہتر..... وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اور اخبار کھول کر نظریں دوڑانے لگا۔ وہ چائے ناشتے کے لوازمات کے ساتھ لائی تھی مگر وہ صرف چائے پی رہا تھا۔

احسن اخبار کا کاؤ لیس صفحہ چہرے کے سامنے کئے ہوئے تھا۔ شہوار اخبار کے پچھلے حصے پر نظریں جما کر بیٹھ گئی۔ جیسے اخبار کو چیر کر راستہ بناتی ہوئی احسن کو گھور رہی ہو۔

”کیوں بسم اللہ غلط کر رہی ہیں۔ میں چلا جاؤں گا تو آرام سے پڑھ لیجئے گا۔ محترمہ..... ہو سکتا ہے آپ کو صدارت پاکستان کا کوئی تازہ آرڈیننس نظر آ جائے جس کے تحت ایک منکوحہ کو آزاد ہونے کی آسانیاں میسر آ رہی ہوں۔“

احسن نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے جیسے اسے ستایا۔

”پلیز..... احسن.....!“ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

احسن جلدی جلدی چائے تمام کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”گیٹ اندر سے بند کر لیجئے..... دو پہر کو میرا پی اوں کھانا آپ تک پہنچا دے گا۔ کیونکہ کھانا بنانے کا موڈ تو مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔“

”مجھے دیر ہو جائے گی۔ یقیناً یہ آپ کے لئے خوشخبری ہے۔ چار بجے آف ہو کر مجھے فرم جانا ہوتا ہے۔ سات بجے تک وہاں ہوتا ہوں پھر آج مجھے ضرور ٹھیکلہ کی طرف جانا ہے۔ خواہ رات ہو جائے۔“

”ٹھیکلہ کی طرف.....“ وہ جیسے سب کچھ بھلا کر چونک پڑی۔

”جی..... ٹھیکلہ کی طرف..... کیا چلنا ہے؟“ احسن نے ایک اچھتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی۔

”وہ..... وہ یہاں؟“

”ہاں کافشن میں رہتی ہے۔“

”صرف ٹھیکلہ؟“ وہ سب کچھ فراموش کر کے حیران و پریشان دکھائی دینے لگی۔

”جی نہیں..... اس کے سپینڈ بھی ہوتے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ہائیں.....!“ وہ ایک دم ہوتی سی ہو گئی..... سپینڈ!!“

”میں سمجھا تھا کہ شاید پھوپھو یا فیضان وغیرہ نے تمہیں بتا دیا ہوگا مگر تم تو بالکل بے خبر ہو۔“

”تم“ سے خطاب گویا اس کی سنجیدگی کی علامت تھا۔

”خیر..... اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے۔ اور فی الحال میں تمہیں اس سے ملا سکتی نہیں چاہتا۔ ممکن ہے وہ ویسے بھی بیان ہو۔“

گیٹ بند کر لو۔ خدا حافظ.....“ وہ گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔

وہ ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی۔

اس سے چند شکر کہ وہ حرکت کرتی وہ پھر اسے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔

وہ اندر ہی اندر ڈر گئی۔

”میں محض یہ یاد دہانی کرانے پلٹا ہوں کہ تمہارے والدین تمہیں ہمیشہ کے لئے رخصت کر چکے ہیں۔“

اور میں معرکہ سر کر چکا ہوں۔

تحریر ہنوز محفوظ ہے۔

قسمت کی آزمائش ملحوظ ہو تو اس گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پچھتاؤں کے ساتھ میں بھی تمہیں قبول میں کروں گا۔“

اس کے لہجے کی غراہٹ پر شہوار کانپ کر رہ گئی..... مگر منہ پھیر کر بولی.....

”جانتی ہوں میں۔“

میرے پاؤں کی نیچے اب زمین نہیں رہی.....“ اس کا لہجہ بھگ گیا۔

احسن گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

اور وہ گیٹ بند کرنے کی خاطر وہیں کھڑی تھی۔ لیکن دماغ اب ٹھیکلہ میں گم تھا۔

تمہائی.....

خاموشی.....

اور پھر سوچنا ذہن.....

آگئی وکشف کے سلسلے دراز ہونے لگتے ہیں.....

انسان خود پر منکشف ہوتا ہے.....

اسے اپنی ذات کے حوالے یاد آنے لگتے ہیں.....

ایک انسان.....

جو کسی کے لئے نعت ہوتا ہے.....

کسی کے لئے ملال.....

کسی کیلئے جلاپا.....

کسی کے دل کی ہوک.....

کسی کی آنکھوں کی ٹھنڈک.....

کسی کے ذہن میں رہنے کی سہولت کی طرح.....

کسی کی یاد میں جسم کے جھونکے کی مانند.....

کسی کی زندگی کا حاصل.....

کسی کی دعا کی روح.....

کسی کی دعائے نیم شبی..... کسی کی آہ سحرگاہی.....

کسی کے دل کی تابندہ لو.....

کسی کی آنکھ کا دکھ اور حیران آنسو.....

کسی کی پیشانی پر داغِ سجدہ کا باعث.....

کسی کے داغِ جگر کا سبب.....

کسی کی تمنا کا موضوع.....

کسی کی حسرت کا تمام.....

کسی کے لئے سرخوشی.....

کسی کے لئے پہاڑ جیسا دکھ.....

جیسے وہ.....

ایسے ہی بے شمار حوالوں کے جال میں مقید تھی۔

اپنی ماں کی ہر دھڑکن کی دعا تھی۔

تو بلال کی خونی بد دعا..... احساس کی صورت اسے گھیرے ہوئے تھی۔

اپنے بھائی کے لئے پچھتاوے اور ملال کا نشانہ تھی.....

انعام علی کیلئے سر مست کر دینے والی خوشی.....

وہ بیڑہ کی وحشت ناک تنہائی سے گھبرا کر ٹی دی لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

ٹی دی کھولا..... وہاں دنیا کے مصائب پر کوئی مذاکرہ چل رہا تھا۔ اس نے بیڑہ کی سے بند کر دیا اور کیسٹ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ایک مزاحیہ ڈرامے پر نگاہ ڈھیر تھی..... ان نے کیسٹ لگا لی۔

پھر واپس نکال لی۔

ایسے ہنسنے مکرانے والے کھیل تو گریڈ رنگ میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ اکیلا بیٹھ کر ہنسا آدی کتنا عجیب لگتا ہے۔ وہ جیسے

خود اپنے آپ سے مکرانی۔

پھر فریج کے ”سنبھلے گیت“ لگا کر گانے کی سر کے نیچے رکھ کر وہیں کارپٹ پر ہی دراز ہو گئی۔

بشمول ایک گیت ہی پورا ہوا ہو گا کہ ملازمہ نے اطلاع دی۔ مہمان آئے ہیں۔

”بٹھاؤ اور کھو..... صاحب آئے والے ہیں۔“

وہ بدستور اسکرین پر نظر پڑیں جمائے ہوئے تھی۔

”وہ..... جی آپ سے ملنے آئے ہیں.....“ وضاحت کی گئی۔

”مجھ سے.....!!!“ ٹکیلا کو از حد تعجب ہوا۔ ”نام نہیں پوچھا؟“

”جی..... احسن نام بتایا ہے۔“

ٹکیلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

وہ نیچے پاؤں تقریباً دوڑتی ہوئی ڈرائیگ روم میں داخل ہوئی تھی۔

آہ..... واقعی..... سامنے اس کا عزیز از جان بھائی پر شکوہ کوچ پر بڑے وقار سے فروکش تھا۔

اچانک خوشی نے اس کا اعصابی نظام درہم برہم کر دیا تھا۔

احسن اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ہر وہ آنسو جو اس نے احسن کے نام کا بچا رکھا تھا اس کے گلے لگ کر بہا دیا۔

اسے بھرا ہوا ایک ایک ملال یاد آیا.....

کہ اس کی رخصتی کس طرح ہوئی تھی.....

جیسے اس کا کوئی بڑا بھائی ہی نہ ہو۔

احسن اس کا شانہ چھتہ پتاتے ہوئے چپ ہو جانے کی تائید کر رہا تھا۔

”احسن بھائی..... آپ کا دکھ مجھے مار ڈالے گا۔“ وہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

”تم سے کس نے کہا میں دیکھی ہوں.....؟“ اس نے محبت سے ٹکیلا کا بازو تھاما۔

”آپ ہمارے جو نہیں رہے۔“ وہ بکرت رہی تھی۔

”یہ مجھ کو دنیا کا بڑے سے بڑا جادوگر بھی نہیں دکھا سکتا۔ میں تو قیامت تک تم سب کا ہوں۔“

”جب ہم آپ کو دیکھ نہیں سکتے..... مل نہیں سکتے۔“

”تم دیکھو گی انہی اور ملو گی بھی۔ بلکہ سب دیکھیں گے بھی ملیں گے بھی۔“

زندگی کی مشکلات کو جھیلنا اور کوئی حل برآمد کرنا ہی زندگی ہے۔ گھبراتے نہیں ہیں۔ ہمت سے کام لیتے ہیں۔ احسن

نے اسے خود سے الگ کر کے صوفے پر آرام سے بٹھایا اور تسلی دی۔

”جب سے مجھے پھوپھو آپ کے بارے میں بتا کر گئی ہیں۔ ایک ایک لمحہ عذاب کی طرح گزر رہا تھا۔ میں نے آپ کا

ایڈریس مانگا۔ انہوں نے دیا ہی نہیں کہنے لگیں کہ شام تک آپ خود آ جائیں گے۔ آپ کل کیوں نہیں آئے.....؟“

”کل فرم میں حساب کتاب کا دن تھا۔ بیلنس وغیرہ دیکھنے ہوتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی تھی۔“

احسن نے اسے آرام سے سمجھایا۔ ابھی وہ اسے حقیقت بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”اچھا آپ نے پھوپھو کو ایڈریس بتانے سے منع کیا تھا؟“ ٹکیلا کو تعجب سے واسے نے ستایا۔

”اس لئے کہ پہلے میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا۔“ اس نے بہن کی محبت کا رد عمل اپنے دل میں محسوس کیا۔ جیسے اس

کا وجود پھول کی مانند ہلکا ہو گیا ہو۔ اسے دنیا کی کوئی الجھن درخشاں نہ ہو جیسے جتنی ماحول میں آ گیا ہو۔ جس میں کوئی

ناگواری نہیں تھی..... وہ آسانی سا ماحول..... جہاں محض سلام ہو..... محبت ہو..... سکھ ہو۔

”آپ تو یہاں سب رشتے داروں سے ملتے ہوں گے.....“ ٹکیلا نے جیسے کچھ جانتا تھا۔

”میں ابھی تک کسی سے نہیں ملی..... جب اباجی نے کسی کو انوائٹ نہیں کیا تو میں کس طرح ان سب سے ملوں جب

کہ سب ہی قریبی رشتے دار ہیں۔“



احسن نے خشک پرایک نگاہ ڈالی۔

وہ پہلے سے زیادہ گھری ہوئی اور صحت مند لگی۔ ایک ہاتھ میں کنگن دوسرے میں سونے کی چوڑیاں، انگلیوں پر دیدہ زیب انگوٹھیاں، گلے میں چمچم کرتی سنہری زنجیر، ناک میں جگمگاتی میرے کی لوگ۔ بہترین تراش کا عمدہ لباس۔

”کیا یہ اتنی ناپختہ ہے کہ“ بھل گئی۔“ احسن نے دکھ سے سوچا۔

”میں بھی بہت عرصے سے کسی سے نہیں ملا۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔ جیسے کچھ سوچ کر بولا۔

”سردار خالو کے ہاں بھی نہیں!!!“ خشک کو حیرت ہوئی۔

”نہیں۔“ اس کا انداز قطعی تھا۔

”ای باتاری تھیں کہ خالو جان نکاح ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب اباجی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“

خشک نے چپکے ہوئے جیسے کچھ پوچھنا چاہا۔

”تمہارے خیال میں یہ ٹھیک ہے؟“ احسن مسکرایا۔

”کیا؟“ خشک نے کچھ سمجھی نہیں۔

”میری کہ یہ بندھن ختم ہو جائے۔“ وہ بولا۔

”اللہ نہ کرے۔“ خشک تو جیسے بلبل کر رہ گئی۔

”شہوار کیونکہ آپ کی پسند ہے، اس لئے اباجی آپ سے ناراض ہونے کی وجہ سے۔“

”کیا نا اہنگی میں زندگی سے کہلتے ہیں؟“ عجب سی یاسیت اس کے لہجے میں در آئی۔

بعض رشتے دار ایسے ہوتے ہیں جن کے سامنے انسان اپنے اصل سے مخاطب ہوتا ہے۔

وہ اس کی حقیقی بہن تھی۔ ماں جانی تھی۔

اس کی زندگی کے سارے رنگ۔

اس کی حیات کے تمام رویوں کی عینی گواہ۔

خشک نے محبت سے اس کا بازو دھام لیا۔

”میری عمر بھی آپ کو لگ جائے احسن بھائی۔ انشاء اللہ زندگی میں آسانیاں بھی آئیں گی۔“

احسن مسکرایا۔

”اپنوں کی فطرت تسلیاں بھی یقین سے کم نہیں ہوتیں۔“

”تم سناؤ۔ کیسی ہو؟“

”میں بہت مطمئن اور خوش ہوں۔ آپ میرا یقین کیجئے میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ محض ایک دکھ مجھے

کھانے کو۔۔۔۔۔۔ کافی ہے کہ میری ذات آپ کے لئے مشکلات کی وجہ بنی۔“

”ایسے نہیں کہتے۔“ احسن نے اسے ٹوک دیا۔

”اپنے ہونے کس لئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اپنے بھی خود غرضی دکھائیں تو ان کی اپنائیت کس کام کی؟“

اس نے بہت جاہت سے بہن کو دیکھا۔

”وہی تو میں کہہ رہی ہوں، یہ سب بلا وجہ ہوا۔۔۔۔۔۔ انعام صاحب اتنے اچھے ہیں۔ اتنے اچھے ہیں کہ میرے پاس

تریف کے لئے الفاظ نہیں۔“

احسن غور سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں بھائی۔۔۔۔۔۔ انعام صاحب اتنا خیال رکھتے ہیں۔ اتنی اچھی عادات کے مالک ہیں۔“

”ارے بھی کون آیا ہے جس کے روبرو میں سپاس پیش کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔۔؟“

اچانک ایک دروازے سے انعام علی اپنی مخصوص وضع میں بریف کیس سمیت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

خشک ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے سلام کیا اور جھک کر بریف کیس ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”وعلیکم السلام۔“ ان کی سوالیہ نگاہ احسن پر تھی۔

”انعام صاحب۔ یہ احسن بھائی ہیں۔“ خشک نے تعارف کرایا۔

”او۔۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔۔“ انعام علی کا ہاتھ بہت تیزی سے احسن کی سمت بڑھا۔

”السلام علیکم۔“ احسن نے ان کا ہاتھ دھام لیا۔

”یقین کیجئے۔ آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔۔۔۔۔۔ خشک کی گفتگو بھی آپ کے تذکرے کے بغیر تمام نہیں ہوتی۔

آپ سے شادی والے دن ملاقات نہیں ہو سکی تھی مگر خشک ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ آپ کراچی ہی میں ہو کر آتے

ہیں۔

تقریبات کے گرواڑے ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے مگر مستقل نہیں رہتی۔ آپ جیسے بیٹے سے کوئی باپ زیادہ

نرم تک ناراض نہیں رہ سکتا۔“

احسن نے چونک کر خشک کا چہرہ دیکھا۔

خشک نے نظریں چرائیں۔

کیا واقعی خشک کی اتنی انڈر سٹینڈنگ ہو چکی ہے کہ وہ انعام علی کو تمام حالات سے باخبر کر چکی ہے۔ اسے گویا حیرت کا

بھلا لگا تھا۔

”بہر حال آپ فکر مند نہ ہوں، مجھے کبھی انسانوں کے ذاتی معاملات میں مداخلت پسند نہیں رہی۔“

انہوں نے خوشگوار مود کا مظاہرہ کر کے گویا خشک کا دل جیت لیا تھا۔

وہ جیسے بھائی کا کوئی نادیہ سا بوجھ لگا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کی سابقہ اطاعت اور سلیم فطرت نے آج

بلاں دکھایا تھا کہ انعام علی نے اس کا مان رکھا تھا۔ اس کی تو ترپ یہ تھی کہ اس کا بھائی پر سکون ہو جائے۔

انعام علی نے کوٹ اتار کر خشک کو تھما دیا اور نائی کا حلقہ پھیلاتے ہوئے مسکرائے۔

”آج ڈر شاندار ہونا چاہیے۔ مہمان۔۔۔۔۔۔ صرف مہمان ہی نہیں بلکہ مہمان خصوصی ہیں۔“ انہوں نے گویا خشک کو

تاک لیا۔

”کھانا۔۔۔۔۔۔ آج میں کھانا باہر نہیں کھا سکتا۔ میرا مطلب ہے اپنی رہائش گاہ سے باہر، کیونکہ گھر پر کوئی میرا منتظر ہے۔“

خشک جاتے جاتے ٹھٹک گئی۔

”یہ آپ کی زیادتی ہوگی احسن ہمارے ساتھ۔“ انعام علی نے خاصی شہیدگی سے کہا۔

احسن نے انعام علی کو بنور دیکھا۔

شائستگی بھی تھی..... صورت بھی..... شخصیت بھی..... کشش و دقا بھی۔ اس نے ان کی پیشانی پر پڑی انہی کیر گہری نگاہ سے دیکھا۔ (میں یقین کر لوں کہ ٹکلیہ کے ساتھ زیادتی نہیں ہوئی)..... ”آپ میرا یقین کیجئے۔ میں ہانگ کہہ رہا ہوں کوئی گھر پر میرا منتظر ہے۔“

”بھائی..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... ٹکلیہ اس کے نزدیک آئی۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں، جلد ہی آپ لوگوں کے ساتھ کھانا کھاؤں گا..... انشاء اللہ..... زندگی بخیر۔ رہائش گاہ ڈھونڈ رہی ہے اس لئے فی الحال فون نہیں ہے۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اس پر آفس کا فون نمبر ہے۔ فون کر لیا کرو..... آتا جا تاں گا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ٹکلیہ کو تلی دی۔

”مگر ابھی تو آپ نے چائے تک نہیں پی۔“ ٹکلیہ آدراہ ہوئی۔

”اچھا۔ تم چائے لے آؤ۔“ اس نے رسٹ وایج پر نگاہ ڈال کر جیسے اس کا دل رکھا۔ اور فوراً باہر نکل گئی۔

انعام علی اس سے اس کے پیچھے مصروفیت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے تھے اور احسن نے انہیں پڑھنے کی کڑ میں لگا ہوا تھا۔

وہ اوجھڑا تھا..... کراب اس شخص کے ساتھ اس کی بہن کا مستقبل وابستہ تھا۔

وہ احسن کی لیاقت، ذہانت اور جدوجہد سے متاثر نظر آرہے تھے۔

”آپ بہت ادب چاہیں گے احسن..... سیلف میڈر کرڈ پر۔“

انعام علی کا کافی نیشنل قسم کے بزنس مین کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا تھا۔ بھانت بھانڈ کے انسانوں سے ملتے تھے۔

ان کا تجزیہ کوئی معنی رکھتا تھا۔

احسن کو جیسے توانائی کی تازہ ملک ملی۔

”شکریہ۔ میں اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے اچھی امید ہی رکھتا ہوں۔“ وہ انعام علی کی موجودگی میں پہلی بار بلیک کر مسکرایا۔

اس نے پھر غور سے انعام علی کو دیکھا..... اور ڈرائنگ روم میں نظریں دوڑانے لگا۔

(روئے اور لہجہ.....)

انسان کی زندگی پر کتنا طاقتور اثر ڈالتے ہیں۔

اباجی..... آپ کا رویہ یہ نہ ہوتا تو شاید یہ کام اچھے ماحول میں ہو جاتا.....؟)

(میں اپنی ماں کو کب تک نظر انداز ہوتا دیکھوں)

”غیرت.....؟ بڑی گہری سوچ ہے.....؟“

انعام علی کی آواز نے جیسے اسے چونکا دیا۔ اسی دم ٹکلیہ ملازمہ کے ہمراہ داخل ہوئی۔

”یہ چائے کے روپ میں تم مجھے ڈنکر کر رہی ہو.....؟“

احسن نے جی ہونئی ٹرائی کو توشیٹل بھری نظروں سے دیکھا۔

”اکیلے ہیں آپ اس شہر میں..... چنانچہ کب کھانا کھاتے ہوں گے، کب چائے لیتی ہوگی۔ اس پر اتنا ڈھیر سا کام۔“

ٹکلیہ بڑی چاہ سے چائے بنانے لگی..... اور کچھ نہ کچھ لینے پر اصرار کرنے لگی۔

”میاں سے گھر پہنچنے میں تیس منٹ ضرور لگ جائیں گے۔“

”گھر پر آپ کا کوئی دوست ہے.....؟“ ٹکلیہ نے دریافت کیا۔

”ہوں۔“

”کیا وہ اکیلے میں ڈرتے ہیں جو آپ جلدی کر رہے ہیں؟“ وہ پھر گویا ہوئی۔

احسن نے ایک نظر انعام علی کی سمت دیکھا۔ پھر ٹکلیہ کی طرف متوجہ ہو کر مسکرا دیا۔

ہاں..... کچھ کچھ ڈرتا تو ہے بے چارہ۔“

”ارے.....! ٹکلیہ بچوں کی سی سادگی سے ہنس پڑی۔

”پھر وہ آپ کے دوست کیسے ہوئے.....؟ کیونکہ سنا ہے انسان جیسا خود ہوتا ہے۔ ویسا ہی دوست بناتا ہے۔“

”یونہی بھانے سے مجھے بتا رہی ہیں کہ ان کا بھائی بہت بہادر ہے۔“ انعام علی نے بھی بڑی احتیاط سے مذاق میں لایا۔

ٹکلیہ مسکرا پڑی۔

احسن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بے قرار نظریں پھر رسٹ وایج پر دوڑ پڑیں۔

”آپ بالکل اچھا نہیں کر رہے احسن بھائی۔ میں نے تو ابھی جی بھر کر آپ سے باتیں بھی نہیں کیں۔“ وہ شاکی انداز لائی۔

”پھر ملیں گے انشاء اللہ!“ احسن نے دلاسا دیا۔

”بات یہ ہے کہ معاملہ آپ کے دوست کا ہے ورنہ ہم ہر قیمت پر آپ کو روکتے۔“

انعام علی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

دونوں میاں بیوی اسے خدا حافظ کہنے اس کی گاڑی تک آئے۔

ٹکلیہ نے جیسے ترسی ہوئی نظروں سے اس کی دور دوری ہوئی گاڑی کو دیکھا تھا۔

اس نے پھوپھو کو محض اس لئے منع کیا تھا کہ مبادا ٹکلیہ پریشان ہو جائے یا اس کے لئے کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے۔

وہ چاہتا تھا کہ پہلے وہ انعام علی سے مل کر حالات کا جائزہ لے پھر ٹکلیہ کو کافی تازگی خیریں پہنچانے یا نہ پہنچانے کا فیصلہ لیا جائے۔

واقعی پھوپھو اور فیصل و فیضان نے وعدہ نبھایا تھا..... اور ٹکلیہ کو نہیں بتایا تھا کہ وہ شہوار کو گھر لا چکا ہے۔

ثمینہ نے عہد کی پابندی یوں بھی کی تھی کہ احسن پر اعتماد تھا کہ وہ کچھ سوچ کر ہی منع کر رہا ہوگا۔ خاص طور پر انہیں ٹکلیہ کا بھی خیال تھا۔ واپسی پر احسن نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ جب وہ جائے گا تو شہوار کو ساتھ لے کر جائے گا۔

اس وقت وہ بہت اسپنڈ سے گاڑی چلا رہا تھا۔

شہوار کی بزدلی کو مد نظر رکھتے ہوئے قسم قسم کے دابے پریشان کرنے لگے تھے۔ گھر کا گیٹ سامنے آیا تو اس نے دم لایا۔

نفل بجا بجا کر اس کا گونگنا آکر مگیا۔ مگر اندر کوئی روئل ظاہر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یہ البتہ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ

گھر کی تمام لائیس آن تھیں۔ تقریباً چھ منٹ بعد کھڑ پڑ ہوئی۔ گویا وہ اب آ رہی تھی۔

اتنی دیر اگر زندگی میں کوئی اور لگتا (دروازہ کھولنے پر) تو شاید وہ طوفان کھڑا کر دیتا۔ مگر یہاں صورت حال تھی۔

”کون ہے؟“ اس کی نرم سی آواز ساعت سے نگرانی جو کچھ لرز بھی رہی تھی۔ اب اسے ستانے کا موڈ بن گیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

”کون ہے؟“ اس مرتبہ آواز کچھ بلند تھی۔

”اچسن چپ کھڑا رہا۔

بلکہ اب اس نے گیٹ پر انگلی سے دستک بھی دی۔

”اچسن صاحب سو رہے ہیں۔“ غالباً وہ وار کو جتا رہی تھی کہ وہ گھر کے اندر اکیلی نہیں ہے۔

”وہ کھڑے کھڑے کیسے سو سکتے ہیں محترمہ۔“ اچسن نے نچلا ہونٹ دبا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کھٹ کھٹ..... کھٹناک..... گیٹ کھل گیا۔ اور وہ اٹھ پاؤں اندر دوڑ گئی۔

اچسن گاڑی اندر لایا۔ گیٹ بند کیا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے دوسرے سے ٹائی ڈھیلی کرتا ہوا اندر بیٹا میں داخل ہوا۔

وہ پھر جائے نماز نما چادر پر بیٹھی ہوئی لی۔ چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ غالباً خاموشی سے آنسو بہائے جا رہے تھے۔

اچسن کے دل کو کچھ ہوا۔ مگر خود پر قابو پا کر بدستور شرارت بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

”بیچھے زمین کا چھوٹا سا قطعہ بے کار پڑا ہے۔ خانقاہ بنوا دوں تمہارے لئے۔“

اچسن اس کے نزدیک چلا آیا۔ اس کی خاموشی اسے اب بہت محسوس ہوئی۔

”شہوار!۔“ اس نے پکارا۔

اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

”شہوار!۔“ اچسن دوزانو بیٹھ گیا۔

شہوار نے زاویہ نہیں بدلا۔

اچسن نے آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

شہوار نے نہایت تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”ہاتھ نہیں لگائیں مجھے۔“

”تمہارا تقدس مجروح ہوتا ہے ہاتھ لگانے سے تو نہیں لگاتا لیکن یہ روٹا دھونا تک۔“

”کیوں لائے ہیں آپ مجھے۔ کس بات کا انتقام لے رہے ہیں؟ میں اس قید تہائی میں پڑی سزی رہوں؟“

رات کو آ رہے ہیں۔ اور شاید روز آئیں گے۔ اتنا دیر ان علاقہ چاہے ڈر کے مارے میرا دل بند ہو جائے۔ کیا مل جا۔ گا آپ کو اس طرح۔“

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

”یہ تمہاری دھاندلی کی سزا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ آیا تھا۔ تمہیں موقع دیا تھا کہ اپنا حق استعمال کرو۔

گھر پہنچتے ہی تمہارے تیور بدل گئے۔ اگر تم ہمت دکھاتیں تو اس قسم کے حالات کی نوبت ہی نہ آتی۔

میرا خلق تھا۔ تم میری خاطر دو لفظ منہ سے نہیں نکال سکتی تھیں۔

اپنا جان سے مارنے کی دھمکیاں فون پر سنوائے لگیں۔ میں غیر طریقے سے ہار تو برداشت کر سکتا ہوں۔ دھاندلی

میں نے میرے جذبات کو محض تماشا سمجھا۔ بزدلی کی بھی حد ہوتی ہے۔

پھر میں یہ سمجھوں کہ نکاح سے قتل کے تمہارے انداز محض دھوکا اور فریب تھے اور میری اور موت کا مسئلہ بن گئے۔

میں نے جنہیں بہت بھیا تک ذلتوں اور ندامتوں کے احساس سے بچانے کی خاطر یہ سب کیا۔ دھاندلی نہیں۔ تم

میرے جذبات کو محض تماشا سمجھا۔ بزدلی کی بھی حد ہوتی ہے۔

پھر میں یہ سمجھوں کہ نکاح سے قتل کے تمہارے انداز محض دھوکا اور فریب تھے جو میری زندگی اور موت کا مسئلہ بن

میں نے جنہیں بہت بھیا تک ذلتوں اور ندامتوں کے احساس سے بچانے کی خاطر یہ سب کیا۔ اس لئے کہ میں

بہ بزدلیوں میں چاہتا تھا۔ تمہاری طرح ڈرامہ نہیں کر رہا تھا۔ تمہارا شہر اذاق۔ کسی کی زندگی پر بن گئی۔

ملاقات کرنے سے پہلے نہیں تو مذاق کرنے کے بعد ہی بتا دیا کرتے ہیں کہ یہ مذاق تھا۔ جو کچھ بزرگ کر رہے تھے اگر

کی باتوں بنیاد ہوتی تو میں سب سے پہلے سر جھکا دیتا۔ مگر محض مفروضوں پر انسانوں سے کھیلا جا رہا تھا۔ میں نے حقیقت

مناکر کرنے کا فیصلہ کیا کہ مجھے خود سے زیادہ تمہاری فکر تھی۔

مگر میں نے جنہیں غلط سمجھا۔ تم وہ نہیں ہو۔ بچتا رہا ہوں تم سے نکاح کر کے نہیں تمہارے فریب میں آ کر۔“

شہوار کے آنسو ختم گئے تھے۔ وہ ساکت بیٹھی اسے شعلہ اگلنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے آنسوؤں کا الٹا اثر ہوا تھا۔

”تمہیں کس سے ڈر نہیں لگتا؟“ وہ پھر شروع ہو گیا۔

”اندھیرے سے، تمہائی سے، والد صاحب کی جھینک سے۔ دادا ناتا کے کھٹکانے سے محرم میں سڑک پر گزرنے

لے اتنی جاہلوں کی آوازوں سے لال بیک سے چھٹکی سے۔ گاڑی کی تیز اسپینڈ سے۔ مسجد سے اچانک ہونے والے

کی اعلان کے آغاز سے۔ اچانک لائٹ چلے جانے سے۔ الاں سے۔ فلاں سے۔“

وہی طرح برس پڑا۔

شہوار کانپ کر کھڑی ہو گئی۔ بے شک وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

”آپ اس طرح مت ڈانٹیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”اوہ۔“ اچسن سر تھام کر گرنے کے انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ڈانٹ سے یا مجھ سے۔“ وہ بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔

”دونوں سے۔“ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

”کیسا کرو۔ کہیں سے مجھے کوئی پتھر لا دو۔“

”کی کیوں۔“ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ جیسے حواس ساتھ چھوڑے ہوئے تھے۔

”اے پیڑ میں ماروں گا۔ یا لٹی کہاں پھنسا ہوں۔“ وہ اٹھ کر ہاتھ روم میں بند ہو گیا تھا۔

چھ منٹوں بعد کپڑے تبدیل کر کے باہر آ گیا۔

”جو کچھ ہے گھر میں گرم کرو۔ صرف تمہاری وجہ سے ایک پر تکلف ڈنر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔ پتا تھا مجھے۔ کہ خوف کھایا

ہاں ہو گا۔ ڈر پیا جا رہا ہو گا۔ اور اس غذا سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔“ وہ ٹائٹ سوٹ کی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے اس

سے مخاطب تھا۔ وہ خورباہر نکل گئی تھی۔ ایک عجیب حالت بے بسی طاری تھی۔

کھانا لگا کر وہ اس کے خراب موڈ کے باعث ڈر کے مارے بغیر کبھی کھانے بیٹھ گئی تھی۔

”بات نہیں.....“ اس نے بڑی ہمت سے اس کی سمت دیکھا۔

”جودل چاہے سناؤ..... بات یاصلوات.....“ وہ بیزار کن انداز میں گویا ہوا تھا۔

”میں امی کو فون کرنا چاہتی ہوں۔“

”اب وہاں کوئی تمہارا فون نہیں سنے گا۔“

”امی سن لیں گی۔“ نو والد اس کے حلق میں اٹکنے لگا۔

”کوئی سننے دے گا تو سنیں گی۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”تم انہیں فون کرنا کیوں چاہتی ہو.....؟“

”میں انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہتی ہوں۔“ وہ سادگی سے کہہ بیٹھی۔

”مجھے تم سے اس سے زیادہ کی امید بھی نہیں ہے..... حاصل حیات یہ ہے کہ میں نے فریب کھایا اور میں اکیلا رہا۔“

”اگر..... زندگی میں تم نے مجھے اپنی وفا..... نام نہاد وفا کا یقین دلانے کو کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو۔“

”اسخان ختم..... تم پر کبھی جا چکیں۔“

وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

شہوار دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گئی۔

”احسن.....!“ اس نے جاتے ہوئے احسن کو آواز دی۔

وہ رک گیا۔

شہوار اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔

”پلیز آپ کھانا کھائیں..... میں آپ کو سمجھا نہیں سکتی مجھ میں اتنی صلاحیت نہیں ہے۔“

”اب میں تمہارے کسی فریب میں آنے والا نہیں۔“

نہ سادگی کے فریب میں، نہ مصومیت کے۔ نہ آنسوؤں کے۔ نہ اس بھولی صورت کے۔ “وہ دوسری سمت سے

قدم بڑھانے لگا۔

”نہیں پلیز۔ آپ کھانا کھائیں۔“

”کھا چکا ہوں میں۔ ہوا ایک طرف۔“

”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔“ وہ پھر روہانی ہوئی۔ ”احسن! میں نے آپ سے کسی بات

لے کبھی اصرار نہیں کیا۔ خدا کے لئے احسن مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔“

”آپ سے میرے تعلق کو چار دن ہوئے تو وفا کے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے والدین سے تو میرا برسوں کا اور خد

تعلق ہے۔ انہیں مجھ سے کیا امید کرنا چاہیے۔ بتائیے؟

”شہوار..... میں تمہیں محض ذاتی مطلب برآری کی خاطر بیاہ کر نہیں آیا ہوں۔ مجھے اصول و قوانین تو ذکر

بازی کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بھڑکنے والا دم چلا جگ لگائی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ لیکن ان واقعات کا ظہ

حالات میں ہوا۔ تمہارے دماغ میں یہ بات نہیں آتی۔

مکرور ہو..... میری دسترس میں ہو، اس لئے میں طاقت کے استعمال سے گریز کرتے ہوئے تمہارا بازو پکڑ کر ایک

پہن کر ہا ملکہ تمہاری بات مان رہا ہوں۔

لیکن اپنے ذہن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھرج دو کہ مجھے تم پر یا تمہارے خلوص پر اعتماد ہے۔

ب صرف بات سمجھی گی۔

ہو سکتا ہے وہ بھی نہ سمجھے..... تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرا تماشایا..... اب اگر تم کہو تو میں تمہیں طلاق کے کاغذات کے

نہارے والدین کے پاس پہنچانے پر تیار ہوں..... اتنا بڑا قدم تو میں نے تم پر مجبورے کی وجہ سے اٹھایا تھا۔ اب

برساعتی نہیں رہا اور میں ان سے یہ بھی کہنے کا حوصلہ رکھتا ہوں کہ میں غلط تھا۔ شہوار درست تھی..... اس لئے کہ مجھے

پہن تھا کہ مصوم چہرے دھوکا بھی دیتے ہیں۔

اس کے لہجے میں شائستگی در آئی۔

”احسن!“ ایک دم شہوار اس کے بازو سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”وہ ب طلاق کی باتیں کر رہے تھے، تو بھی میرے دل میں امید کی شمع روشن تھی کہ آپ ان کے لئے مشکلات کھڑی

کر لیں گے۔ مگر ایسا نہیں کریں گے مجھے آپ پر اندھا بھروسہ تھا..... کہ آپ کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ میں نے آپ

پاکے بہت سے مردوں سے زیادہ خود اعتماد مضبوط سمجھا..... جیسے کوئی اوتار..... اس اندھے یقین کو اندھیرے میں شمع

رہن چلایا۔ کہ احسن کبھی مجھے دھوکا نہیں دیں گے۔

کبھی مجھے چھوڑیں گے نہیں..... وہ کوئی حل نکالے بغیر دم نہیں لیں گے۔

وہ مصائب کے طوفانوں میں کبھی مجھے اکیلا چھوڑ کر راستہ نہیں بدلیں گے..... مگر..... آج آپ نے میرا مان توڑ دیا۔

پاٹنا پاک لفظ آپ کی زبان پر آیا تو کیوں.....؟

اس کا مطلب ہے کہ مجھ سے جدائی آپ کے لئے سناخ نہیں ہو سکتی۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تین مردوں کی جنگ

مجھے محض آلہ کار بنایا گیا۔ میرے نقصانات کا کسی کو بھی احساس نہیں ہے۔ کیا میں انسان نہیں ہوں.....؟

وہ دلی طرح رورور کر کہہ رہی تھی۔

احسن کو تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے کیونکہ اب وہ بے ہوش ہو کر اس کے بازوؤں میں آ رہی تھی۔

مغیہ نے بارات دو لیے میں اس پر زور نہیں ڈالا تھا کہ وہ چلے۔

کیونکہ مہندی والے روز انہوں نے اسے بے حد چپ چپ دیکھا تو ان کا نرم دل ٹرپ سا گیا تھا کہ ناحق زبردستی

بچے کو حصص تو ماں کو سوا تکلیف ہوتی ہے۔

بچے خوش ہوں تو ماں ان سے زیادہ خوش ہوتی ہے۔

اور وہ تو ان کی بڑی خود اعتماد بیٹی تھی..... حوصلے دینے والی۔ ہمت بڑھانے والی۔

ناموافقت کو برداشت کرنے والی۔

اس کو چپ و افسردہ دیکھ کر انہیں بے حد ملال ہوا تھا کہ خواہ مخواہ ڈانٹ بھی دیا اور زبردستی بھی کی۔ لہذا اب پھر انہوں نے

اسے ہمسائوں کے حوالے سے نہ کوئی بات کی نہ چلنے کو کہا تھا۔ اباجی کی بھی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد لگ ہوئی تھی۔ بقول ان

کے۔

”لوگ شادیوں میں کھانا کھاتے ہیں یا سحری کراتے ہیں۔ سرے احسان کرتے ہیں بلا کر۔“  
ان خیالات کی روشنی میں ظاہر ہے، وہ شادیوں میں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا کھانا گھر پر تیار کرنا ضروری  
نائلہ کو یہ آؤ بہت تھی۔

لہذا اندوہ مچی۔ نہ سڑپ کر دینے والے واقعات مزید ہوئے۔

شادی کو مشکل ہفتہ ہی گزرا تھا کہ روہی کی امی اپنی تندر کے ہمراہ بہت اچانکیت کا مظاہرہ کرتی ان کے ہاں آئیں۔  
صفیہ، احمر کا کرتا سی رہی تھی بلکہ آخری پُڑے رہی تھیں۔ سی تو دن ہی میں لیا تھا۔ لڑکیاں اپنے اپنے گھر  
میں مگن تھیں۔

اباجی عشاء کی نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔

صفیہ نے مسکرا کر پڑون کو خوش آمدید کہا۔ خیریت دریافت کی۔ صفیہ کو یہ خاتون اچھی لگی تھی۔ کچھ ضرورت سے  
بھی سیدھی سادھی تھیں۔

”گھر میں اتنے دن شادی کا ہنگامہ رہا۔ اب بیٹا بوسیر کو گئے ہوئے ہیں۔ روہی ان کے ساتھ میری بہن کے  
چلی گئی۔ مگر کٹ کھانے کو ڈرتا ہے۔“

”آپ نے اچھا کیا کہ چلی آئیں۔“ صفیہ اخلاق سے گویا ہوئیں۔

”بچیاں..... سوئیں کیا.....؟“

ارے نہیں۔ ابھی سے کہاں..... نماز وغیرہ پڑھ رہی ہوں گی۔“

اسی دم نیلہ نے اندر آ کر مہمان خواتین کو سلام کیا۔

”جیتی رہو۔“ دونوں خواتین کو سلام کیا۔

”جیتی رہو۔“ دونوں خواتین نے دعا دی۔

”یہ بڑی سے چھوٹی ہے ناں؟ آپ نے بتایا بھی تھا شاید..... دراصل ہم اس گھر میں نئے آئے ہیں جان بچا  
ہوتے ہوتے ہوتی ہے۔“

”جی..... جی ہاں..... یہ بڑی سے چھوٹی ہے۔“

”کیا نام بتایا تھا روہی نے۔“ وہ بڑا داز بلند سوچ رہی تھیں۔

”روہی نے.....؟؟؟“ صفیہ حیران ہوئیں۔ ”ویسے اس کا نام نیلہ ہے۔ انہوں نے مشکل آسان کی۔

”بہت پیار ہے روہی کو آپ کی بچپن سے۔ اب کیا تمہارا کمر بات کروں۔ سیدھی بات ہے کہ ہم نیلہ کو اپنی بیٹی

چاہتے ہیں۔ سارا حملہ آپ کی بچپن کی تعریف کرتا ہے۔ میرا بیٹا ہے سرفراز نام ہے اس کا۔ آپ نے تو دیکھا ہی ہے۔“

گھر میں سب اسے رازی کہتے ہیں۔ اب کے ساتھ بڑنس کرتا ہے۔“

صفیہ حیرت آمیز خوشی کو چھپانے میں جیسے ناکام ہو رہی تھیں۔



دل ہی دل میں حیران بھی تھیں کہ بہت ساری تفصیلات کو نظر انداز کر کے وہ رشتہ مانگ رہی تھیں۔

(جب نیلہ کا معاملہ طے ہو جائے گا تو یقیناً ڈاکٹر کا رشتہ نائلہ کے لئے اس کے اباجی منظور کر لیں گے۔ اف خدا ایاتی  
آسانی سے مسئلہ ہوں گے خواب میں بھی نہ سوچا تھا) صفیہ کو اپنی خوش بختی کا جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آپ کی قدر افزائی ہے۔ مگر آپ تو جانتی ہیں کہ ان معاملات میں تھیلی پر سروس نہیں جمانی جاسکتی۔ میں نیلہ کے ابا  
کیا سے بات کروں گی۔ پھر نیلہ کی چوبھی بھی ہیں قطر میں۔ ان کی رائے بھی لیتا ہوگی۔ آپ کو جواب کے لئے انتظار کرنا  
پڑیگا۔“

صفیہ نے سلیقے سے انہیں سمجھایا۔

”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں..... آپ بر طرح سے قہقہہ کریں۔ ہر زاویے سے سوچیں یہ آپ کا حق ہے۔ ہم من  
ہاں اپنی کے لئے انتظار بھی کر لیں گے۔“

رازی کی امی نے بھی تسلی آمیز جواب دیا۔

”ارے بھئی نائلہ..... کہاں ہو..... اگر نماز سے فارغ ہو گئی ہو تو چائے وغیرہ لے آؤ بیٹی۔“

صفیہ نے نائلہ کو آواز دی۔

اچھا امی۔! نائلہ کی آواز آئی۔

نیلہ چائے تیار کر چکی تھی۔ اباجی شام کو پھل لائے تھے۔ اس نے وہ بھی رکھ لئے اور احمر سے سٹ وغیرہ بھی منگوا لئے  
تھے۔

اس نے رازی کی امی کی بات سن لی تھی۔ بہت خوشوار دھڑکنوں کے درمیان اس نے چائے کا اہتمام کیا تھا۔

نائلہ نے اس کے چہرے پر بکھرے رنگ دیکھے تو ذرا الجھی مگر کچھ بھی نہیں۔ بس تیار چائے لے کر کمرے میں چلی  
گئی۔

سیاہ چکن کی چادر میں سے اس کا بے ریا خوبصورت سا چہرہ جیسے شمع کی مانند روشن تھا۔

”بچیاں آپ کی سب پیاری ہیں۔ ماشاء اللہ۔“ ہمسائی نے بڑے پیار سے شفقت سے نائلہ کو دیکھا۔

”اللہ کا کرم ہے۔ بس اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔“ صفیہ انکساری سے گویا ہوئیں، نائلہ نے چائے بنا بنا کر پیش



کرنا شروع کی۔

اس بات کا تو آپ اطمینان رکھیں کہ لڑکے کو کوئی لت نہیں ہے۔ مگر یہ البتہ میں نے سنا ہے، کبھی کبھار ہلی لیتا ہے مگر میرے سامنے کبھی نہیں ہلی۔ بس کام سے کام رکھتا ہے۔ مگر سے کبھی بلا وجہ باہر نہیں رہا۔ ماشاء اللہ اسی کی محنت ہے ہمارا کاروبار پھیل رہا ہے۔

ہر ماں اپنے بچے کی تعریف کرتی ہی ہے مگر آپ یقین کریں، میں بالکل بھی مبالغہ نہیں کر رہی ہوں۔ "رازی کی آنکھیں جیسے یقین دلایا۔

منفیہ مسکرا دیں۔ "اللہ مزید توفیق دے جو اپنی اماں کو راضی رکھنے میں کامیاب ہے۔ وہ یقیناً خوش بخت ہے۔" نائلہ کے ہاتھ میں چمچ کا پینے لگا۔

(یہ کیا ہو رہا ہے؟) اس کی ہستی اچھل پھٹل ہونے لگی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا وہ کوئی نا سمجھ بچی تو نہیں تھی۔ معالاس کے ذہن میں کونسا سال کا۔ نیلہ کے حیا آمیز انداز وہ تو مہمانوں کے لئے خود چائے لے کر جاتی ہے۔ آ اس نے نائلہ کو آواز دے کر بلایا اور چائے لے جانے کو کہا۔

وہ دھشت زدہ سی ہو کر باہر نکل آئی۔ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچنا نہیں چاہتی تھی۔ خود فریبی اس وقت کی سب سے اہم ضرورت تھی۔

آہستہ آہستہ اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ رازی کی ایک ایک حرکت قلم کی طرح اس کے ذہن کے پردے پر چل رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس واقعے کو کیا نام دے۔  
رازی کی انی اور ان کی ہندواہیں بھی چلی گئیں مگر وہ چھت پر ٹپکتی رہی۔ پلٹ پلٹ کر اس کی نظریں روہی کے گھر کا طواف کر رہی تھیں۔ اور کوئی سر ہاتھ آ کر نہیں دے رہا تھا۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔  
آخر کار وہ شل اعصاب کے ساتھ نیچے آ گئی۔

سامنے اباحی پلنگ پر صحن کے پتوں سے چھ دراز تھے، بیڑ مثل فین فل اسپینڈ سے چل رہا تھا۔  
نزدیک ہی منیفہ موڑے پر بیٹھی ہوئی ان سے کچھ کہہ رہی تھیں۔

"ارے بالکل انجان لوگ ہیں۔ ہم ہر طرح سے اپنی تسلی کریں گے۔" وہ بے نیازی سے گویا ہوئے۔  
منیفہ جل کر رہ گئیں۔ اس بات کی تو خبر وہ خود بھی قائل تھیں۔ مگر جان یوں چلی تھی کہ ٹھیکہ لکھ کر جیسے انہوں نے رشتے

داروں میں بیاہا تھا۔

"ظاہر ہے، وہ تو کریں گے ہی۔ مگر لوگ واقعی ایسے دکھائی دے رہے ہیں۔"

"مطلب کے وقت سب ایسے ہی بن کر ملا کرتے ہیں۔"

خیر..... دیکھیں گے تو کسی۔ آگے اللہ مالک ہے۔ شیخ صاحب نے خلاف توقع بہت پرسکون لہجے میں کہا۔

منیفہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مبادا اگلی بات پر "لہجہ" ہی بدل جائے۔

نائلہ ایک مستقل سوچ کی کیفیت میں تھی۔ مگر جان میں جا کر خاموشی سے سمیٹ سناٹائی میں لگ گئی تھی۔

منیفہ..... خوشی سے نہال اس کے پاس چلی آئیں۔

"میں بھی تم سو گئیں۔"

"میں چھت پر تھی۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

اسے صدمہ نہیں تھا۔

اسے دکھ نہیں تھا۔

بلکہ وہ تو حیران و پریشان تھی کہ یہ تماشا کیا ہے؟

"ایک خوشخبری ہے تمہارے لئے۔" منیفہ جیسے کسی کو خوشی میں شریک کرنے کے لئے بے چین تھیں۔

سائے امی..... بہت دن ہو گئے کوئی خوشخبری نہیں سنی۔" اس نے ایک جار کا ڈھکنا اچھی طرح جما کر بند کیا اور لے کر پرتا ہوا۔

"روہی کی امی نیلہ کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ روہی کا چھوٹا بھائی تو تم نے شاید دیکھا ہو۔"

بہت اچھا بچہ ہے۔ میں جتنے دن بھی ان کے ہاں تقریبات میں گئی بہت ہی آؤ بھگت کی اس نے بچھا جاتا تھا آگے، جان خالہ جان کہہ کر۔"

"اچھا..... نائلہ کے لیوں پر ایک تسخرانہ مسکراہٹ لہر کی طرح ابھر کر معدوم ہو گئی۔

"ہاں بھئی..... مجھے تو وہ بچہ اپنے اخلاق کی وجہ سے بہت بھایا تھا۔ اس نیت سے بہر حال میں نہیں سوچا تھا۔ یہ سب ہکی بات ہوتی ہے۔

تمہارے اباجی راضی ہو جائیں تو میں سوچ رہی ہوں کہ تمہارا معاملہ بھی انشاء اللہ طے ہو جائے گا۔ پھر تمہاری اور نیلہ ٹائی سادھی تھی کرویں گے۔ راحیلہ اور بلال کی ایک ساتھ ہو جائیں گی۔ انلا کا بھی اللہ کوئی سبب پیدا کر دے گا۔

ارے اللہ بڑا صبر یار ہے۔ یہ ہم انسان ہی جلد بازی ہیں، وہ خوشخبری سنا کر ہوائی قلعة بناتی واپس چلی گئیں۔  
لے لیکن کی لائٹ بند کی اور واپس آ گئی۔

"کب تم سو جاؤ بیٹی! سارا دن ہو گیا ہے تمہیں کام کرتے۔" منیفہ اسے تاکید کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔  
نائلہ کا لہجہ اور چال دونوں ہی میں محسوس کی جانے والی تبدیلی تھی۔

وہ اپنے اور بہنوں کے مشترکہ کمرے میں آئی تھی۔  
ایرو پاور کے نیلے بلب کی روشنی سے کمرے میں پراسراریت سی چھائی ہوئی تھی۔

ایلا سینے پر کتاب اٹائے اپنے مخصوص بے فکر انداز میں سو رہی تھی۔ نائلہ نے آہستگی سے کتاب اٹھا کر ٹھکانے پر رکھ

لے جو تکہ نہیں نہیں آ رہی تھی اس لئے نگاہ خواہ وہ ادھر ادھر بھٹک رہی تھی۔

ملا اور راحیلہ غالباً ایک دوسری سے باتیں کرتے کرتے سوئی تھیں بالکل ایک دوسرے سے لگی سو رہی تھیں۔

اچھا خاصا کشادہ اور کھلا کرانو جوان لڑکیوں کی موجودگی سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔

معالاس کی نظر نیلہ پر پڑی۔ وہ بنور نائلہ کو دیکھ رہی تھی۔

دم سے روشنی میں بھی اس کا چہرہ جیسے دک رہا تھا۔ نائلہ نے ایک دم نظر چرا لیا۔

"کیا بات ہے نہیں نہیں آ رہی؟"

"مہول۔ سوچ رہی ہوں کچھ پڑھ لوں کالج میں ٹیسٹ شروع ہونے والے ہیں۔" اسے فوراً معقول بات سوچ گئی۔

”آج خبر تو ہے، خند کیوں نہیں آ رہی؟ تمہارا تو سونے والوں میں پہلا نمبر ہوتا ہے؟“ نیلہ کچھ حیران ہوئی۔  
”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے آپ!“ وہ بے معنی انداز میں مسکرا دی۔  
”چھوڑو..... پڑھائی..... جس کام کی تکمیل مشکوک ہو، اس پر کیا وقت صرف کرنا۔ ڈاکٹر صاحب تمہارے پڑھ چکے ہیں۔“ نیلہ کے لہجہ میں ایک خوبصورت کھٹک تھی۔

نائلہ بری طرح چونک پڑی۔ ”ڈاکٹر صاحب!“ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔  
”ارے بھئی۔ وہی آسٹریلیا کے اسپیشلسٹ۔ وہ سرگوشی کرتے ہوئے مسکرائی۔  
نائلہ نے بغور نیلہ کو دیکھا۔

امید کی شمعیں۔ بے وجہ بھی نہیں جلا کر تھیں۔  
لحوظ میں تصور کی نوری سال طے کر چکا تھا۔ مستقبل جیسے کسی اور جہاں سے طلوع ہوا چاہتا تھا۔  
اسے محبت نہیں ہوئی تھی۔

حتیٰ کہ ادراک بھی نہیں ہوا تھا۔  
مکراس کی جمیل جیسی زندگی میں کسی نے پتھر جو مارا تھا۔

اس کا ارتعاش تو معدوم نہیں ہوا تھا۔  
پھر یہ نیا پتھر.....

ارتعاش تیز ہو گیا تھا۔

دو ارتعاش..... دوز او بے..... انداز۔

لہروں کے موضوعات الگ تھے۔ یعنی ان کے دو مختلف کناروں سے ان کا آغاز ہوا تھا مگر اب وہ ایک جان تھی۔  
ارتعاش..... انتشار میں ڈھل چکا تھا۔  
وہ کتاب اٹھا کر نیلہ کی سمت پلٹی۔

”آپ! مفروضوں کے سبب سے تبدیلی لانا حماقت ہوتی ہے۔“

”کیا بایو ہے یہ؟“ نیلہ الجھی۔

”حقیقت پسندی.....“ وہ مختصر گویا ہوئی۔

”خوشی ڈھونڈنے سے زیادہ بھی تو ضروری کام ہو سکتے ہیں آپ!“ وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

جب دکھ نہ ہو.....

جب رنج نہ ہو.....

جب خوشی بھی نہ ہو.....

تو ایک ہی کیفیت باقی بچ رہتی ہے۔

اور وہ ہے۔ ”حیرانی۔“

اور حیرانی۔ سرگردانی لاتی ہے۔ کتاب تو کسی صحرا کا استعارہ تھی جس میں بھٹک بھٹک کر اسے کسی سرے کو ڈھونڈنا۔  
وہاں کے کمرے کی سمت چلی آئی۔

انگلی سے دستک دی۔

”کون.....؟“

”میں ہوں امی..... نائلہ۔“

”آ جاؤ.....“

اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”امی! میرے ٹیٹ ہونے والے ہیں۔ مجھے پڑھنا ہے۔ میں چھت پر بیٹھ کر پڑھ لوں؟“

اس نے اس لئے اجازت طلب کی تھی کہ مبادارات گئے چھت پر جانے کو وہ مناسب نہ سمجھیں اباجی کی طرح۔

”باہر والے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ لو۔“ منیہ بھی غالباً شوہر کی وجہ سے ہچکچاتی تھی۔

”وہاں بہت گھٹن محسوس ہوگی۔ پلیز امی۔“

منیہ نے اس کا بے تاثر چہرہ دیکھا۔ پھر سوچ کر بولیں..... ”اچھا!“

نائلہ پلٹ گئی..... صحن میں اباجی کے خزانے کو گنج رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں زینے طے کرنے لگی کھلی چھت پر پہنچ کر

مانے گھر اسانس لیا۔

لائٹ اس نے پہلے ہی جلادی تھی۔ بجھی ہوئی بان کی چار پانی پر وہ مگرنے کے انداز میں لیٹ گئی۔

سر پر تاروں بھرا آسمان مسلا تھا۔ وہ تار تار ڈھونڈنے لگی۔

سامنے پڑوسیوں کی بند کھڑکیوں کے اس پار اس کا زہن جا بچا تھا۔ اس شوخ کی ایک ایک ادائیگی کے کوئٹے بن کر

پک رہی تھی۔

تمام تر سوچوں کے باوجود اس کی عقل کوئی سراپا پکڑنے سے قاصر تھی۔ اس نے یہ سب کیوں کیا؟

کیا اس لئے کہ میں نے اسے بایو کیا؟ کیا وہ اپنی شکست کا انتقام لے رہا ہے؟ سرائل گیا تھا۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ نائلہ نے گھر اسانس لیا۔ اب اسے نیلہ پر ترس آ رہا تھا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے دو آنکھیں اسے گھور رہی ہوں۔

وہ آڈی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ ہڑ بڑا کر اٹھ گئی۔

سامنے والوں کی بالکنی کی ٹیوب چلی ہوئی تھی۔ وہ گرل پر کہنیاں جھانے جھکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

نگاہ ملنے پر وہ بڑے دلچسپ انداز میں مسکرایا تھا۔

مسکراہٹ میں بے تکلفی اور پناہ کا ملا جلا تاثر تھا۔

مسکراہٹ کی زبان میں بہت خوبصورت گفتگو تھی۔

نائلہ کا دماغ محوم گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب زور سے پٹنگ پر مٹی اور جیسے بھاگ کر زینہ طے کرنے لگی۔

”خالہ!“

”میرے چاند.....“ وہ چھالہ کترتے ہوئے نہال ہو کر گویا ہوئیں۔

”ایک خاتون ہیں اگر آپ ان کا رشتہ تلاش کر دیں گی تو اللہ میاں آپ کو بہت ثواب دیں گے۔“

”اے..... ہے۔ بتا تو سکی ہے کون؟“ وہ مستعد ہو کر بیٹھ گئیں۔

”لو کی نہیں ہیں۔ خاتون ہیں..... طلاق ہو گئی تھی بے چاری کو..... میاں اچھے نہیں نکلتے بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ ناں

”درست ہاں کہ رہا ہوں۔“ بلال نے مسکراہٹ دبا کر اسی انداز میں جواب دیا۔  
 ”کہاں دیکھا تھا اس بد ذات نے تیرے خال کو؟“ وہ غصے سے کانپنے لگی تھیں۔  
 ”خالو پارک میں سیر کرنے جاتے ہی ہیں، آپ کو پتا ہے۔“  
 ”اچھی طرح پتا ہے اور یہ بھی پتا چل گیا کیوں جاتے ہیں۔ جھیلے بنے پھرتے ہیں۔ دھلے اچلے کپڑے میں دھومو رہتاؤں اور یہ دوسروں کو پرچا تے پھرتے ہیں۔ اگر تو نے اس کھوئی کا نام بھی میرے سامنے لیا یا ذکر کیا تو مجھ سے برا بنی نہ ہوگا۔ میں کہے دے رہی ہوں۔ سنا تو نے؟“ وہ بری طرح بگڑ کر بولیں۔  
 ”ہاں کل سن لیا۔“ وہ معصومیت سے بولا۔  
 ”مگر خالہ یہ تو بڑے ثواب۔“

”ارے چپ کر..... سو ت عذاب ہی ہوتی ہے۔ کوئی ثواب دواب نہیں اس راہ میں۔“  
 مگر ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ گلے پڑا دھول بھانا ہی پڑتا ہے۔ وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا۔  
 ”ارے میں تو پھاڑ کر رکھ دوں ایسے دھول کو۔“ وہ بگڑ کر بولیں۔  
 ”اور دیکھ زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بد ذات مجھے بوڑھی کہہ رہی ہے۔ غموں نے سر سفید کر دیا ہے۔ ورنہ لڑی عمر ہے میری۔ بس تو مجھے اس کا ٹھکانہ بتا دے۔ میں خود ہی منٹ لوں گی۔“  
 ”چھوڑیں خالہ۔ غلطی ہو گئی بے چاری سے۔“  
 ”غلطی۔ ہونہ۔ آج تیرے خالو سے تو بات کر کے رہوں گی۔ مجھے خرچہ دیتے وقت تو تاکید کرتے ہیں کہ بھی پیسے ہیں اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ دوسری کرنے کے چاؤ چڑھ رہے ہیں۔ وہ نامراد کیا گھاس کھا پیے۔ قصور بہر حال ”ان“ کا بھی ہے تیرا تو بڑا احسان ہے میرے بچے تو نے مجھے یہ سب بتا دیا۔“  
 ”ارے نہیں خالہ..... احسان کیا، یہ تو میرا فرض تھا۔“ انکسار و شرم کا کامیاب مظاہرہ ہوا۔

”نام کیا ہے اس عذاب کا؟“

”چھوڑیں خالہ! کیا فائدہ معاف کر دیں بے چاری کو۔“

”معاف تو میں اچھی طرح کروں گی۔ خیر، میں تیرے خالو سے سب اگلوں کی۔ تو فکر نہ کر۔“

”خالو بتا دیں گے؟“ بلال نے تعجب سے پوچھا۔

”بتائیں گے؟ صرف پچھلا ہی نہیں بتائیں گے۔ بلکہ پیشگوئیاں کرنے لگیں گے۔“ وہ دانت پیس کر بولیں۔

”بلال؟“ منترہ نے اندر آ کر اپنا سر پیٹ لیا۔

”یہ شرارت انسان دہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان لڑائی کرانی جائے۔“

خالہ آپ اس کی حرکتوں سے واقف ہیں۔ پھر بھی ہر بار یقین کر لیتی ہیں؟“ منترہ نے جیسے زج ہو کر کہا تھا۔

”ارے۔ مرد ذات ہے، باہر پھرتا ہے میں نے کہا۔ کیا خبر ہی جی کہہ رہا ہوں۔“ خالہ ایک دم چونک کر حواسوں میں آگئی۔

”بلال دے پاؤں باہر نکل رہا تھا۔“

”ظہر ذرا۔ بتائی ہوں تھیں۔“

ایک دم کال بیل بجی تھی۔

دھیان دوسری سمت منتقل ہو گیا۔ ”دیکھو بلال کون آیا ہے؟“ منترہ نے بلال سے کہا اور خود ڈرائیونگ روم میں جھانک

کہ پیاز کی بوری میں سے کچھ پیاز اچھے نہیں نکلتے۔ بارغ میں نکلنے والی ایک ہی پھل کا سناڑا ایک جیسا نہیں ہوتا۔“  
 ”ارے آگے تو بول۔“ خالہ بلال کے فلسفے سے عاجز آ گئیں۔  
 ”وہی تو بول رہا ہوں۔ اسی طرح میاؤں کی بوری سے کوئی کوئی میاں خراب نکل آتا ہے۔  
 یہ میں آپ کو بچا رہا ہوں تاکہ وہ بے قصور ثابت ہوں۔ ان کے میاں خراب نکلے بہت خالام تھے۔ کھانے دیتے تھے۔“

”اے..... بے ایسا شقی آدمی تھا۔“ خالہ نے جی بھر کر تاسف کا اظہار کیا۔

”ایسا دیا۔ اتنی خوبصورت ہیں کہ جب بیٹھی ہوئی ہوں تو لائٹ جلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”اچھا! خالہ کا جذبہ شوق بوا ہوا۔“

”ارے عورت خوبصورت ہوتو اس کا رشہ لٹ ہی جاتا ہے۔ چاہے وہ طلاق یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ لوگ دوسرے بنالیتے ہیں۔ مگر تو بس ہی جاتا ہے۔“ خالہ نے مطمئن انداز میں کہا۔  
 ”پیسہ دیر سے بھی کافی ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہوا۔ کتنے لوگوں نے مجھ سے چپکے سے کہا ہے کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں چنگی بجا کر ادوں کی شادی۔ بس تو ان سے ملا دے۔“

”گویا خفیہ شادی کرائیں گی؟“ بلال نے تدرے ناراضگی سے پوچھا۔

”ارے جب شادی ہو جاتی ہے تو پھر خفیہ نہیں رہتی۔ خالہ نے سمجھایا۔

”عورت کو سوت برداشت کرنا ہی پڑ جاتی ہے۔ گلے پڑا دھول بھانا ہی پڑ جاتا ہے بیٹے!“

ان کے اطمینان کا وہی عالم تھا۔

”اچھا.....؟“

”اور کیا..... ارے تو ہرج کیا ہے۔ کسی کا بھلا ہی ہوتا ہے۔“ انہوں نے انگلی کی پور پر چونا لگا کر چانا۔

”اچھا ہوا آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب میں آپ سے بلا جھجک ہر بات کر سکتا ہوں۔“ بلال۔ سانس لیا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... میرا بیٹا ہے تو تو۔“ انہوں نے لاڈ کیے۔

”تو پھر بات یہ ہے ایک بار ان خاتون نے ہمارے خالو جان یعنی آپ کے شوہر نامدار کو دیکھا تھا۔ ویسے وہ آ بھی جاتی ہیں۔“

خالہ جان پانا چنانا بھول گئی تھیں۔ ہونٹ ہو کر بلال کو دیکھ رہی تھیں۔

”وہ خاتون مجھ سے کہنے لگیں کہ بلال! یہ خالہ تو خاصی بوڑھی ہیں۔ ان کے میاں ماشاء اللہ جوان نظر آتے ہیں۔ چاہتی ہوں کہ چلو، میں ہی انہیں کوئی خوشی دے دوں۔ خوبصورت تو ہیں ہی۔ ساتھ ہی نہایت شریف بھی ہیں۔ طلاق

بعد میرا تو مردوں پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا ہے۔“ مگر خالو کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”اس شخص پر تو شرافت ہے۔“

خالہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

”کیا بات کہ رہا ہے لڑکے؟“ ان کی برہمی قابل دید تھی۔



اس نے گاڑی سے اتر کر گیت کھولا تو وہ بے تکلف انداز میں آگے بڑھ گئی۔

احسن جس وقت کمرے میں آیا تو وہ غسل..... میں مصروف ہو چکی تھی۔ وہ نوکرانی کو بلانے پر دوسرے کمرہ چلا گیا۔ جب وہ نوکرانی سمیت گھر میں داخل ہوا تو وہ سیلے بال برآمدے میں کھڑی کھڑی تھی۔

”یہ خاتون اس گھر کی صفائی سہرائی کریں گی۔ کیا آپ انہیں کام سمجھانا پسند فرمائیں گی۔ اس سے قبل جو مقررہ آتی تھیں، وہ جا چکی ہیں۔“

احسن یہ کہہ کر اندر بڑھ گیا۔

”آپ یہاں نئے آئے ہو؟“ پٹھانی نے دلچسپی سے شہوار کو دیکھا۔

”ہوں۔“ وہ ہوں کر کے رہ گئی۔

”نئی شادی ہے؟“

شہوار خاموش رہی۔ وہ بالکل سادہ لباس میں تھی۔ اسے پٹھانی کا سوال چونکا گیا۔

”ماتھے پر لکھا ہے میرے؟“ وہ ہلکی سی ہنسی ہنس کر پوچھنے لگی۔

”بال بچہ نہیں ہے ناں کوئی۔“ پٹھانی نے وضاحت کی۔

شہوار نے گہرا کرادھر ادھر دیکھا۔

(وہ جو کبھی دعائیں ہو سکتی تھیں اب میرے لئے بددعا بنیں ہیں۔)

”اچھا تم جا کر صفائی کرو۔“ اس نے فوراً ٹالا۔ جب کرلوگی تو دیکھوں گی کہ کیسی صفائی کی ہے۔“

کچھ دوا اور انجکشن کا اثر۔ کچھ نیند پوری نہ ہونے کا سبب تھا اسے شدت سے خواہش ہوئی کہ وہ آنکھیں موند کر جائے۔ غسل کی وجہ سے غنودگی خود کر آ رہی تھی۔

نوکرانی صفائی کر رہی تھی اس لئے لاؤنج میں بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ احسن کی بیڈروم میں موجودگی اس لئے مشکل پھر کوئی تکرار کوئی خطرناک صورت حال درپیش ہونے کا خطرہ تھا۔

بیڈروم میں آئی تو احسن بیڈ پر دراز بنا لبا سونے کے موڈ میں تھا۔

اندروں داخل ہوتے ہوئے ایک لٹلے کے لئے نگاہ ملی۔ وہ کترا کر وارڈرو ب کی طرف بڑھی، ایک بیڈ شیٹ نکال کر کارپٹ پر بچھائی اور احسن کے برابر سے تکیہ اٹھا کر اپنا بستر سیٹ کیا پٹیکے کی اسپینڈ بڑھائی۔ اور اپنے عارضی بستر پر دراز ہو گئی۔

”وہ جو خاتون صفائی کے لئے آئی ہوئی ہیں۔“ صفایا“ بھی کر سکتی ہیں۔ یہ بعید از امکان نہیں ہے۔ آج پہلا ہے۔“

”مجھے نہیں پتا۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔“ وہ جیسے مجر کر بولی۔

احسن کو اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس کے موجودہ احساسات سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ خود بھی رات بھر جاگا جاگا ہوا تھا۔ مگر سلیپر پاؤں میں ڈال کر ناچار باہر نکل گیا۔

ایک گھنٹے بعد جب ملازمہ چلی گئی تو وہ گٹ بند کر کے نیند کے بے حال اپنے کمرے میں واپس آیا تو وہ ہاتھ پاؤں چھوڑے ہوئے بے سدھ سو رہی تھی۔

سونے کے انداز میں ہلاکی لا پرواہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ مسکرا دیا۔

بیٹا وہ اپنا اعتبار قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شہوار کی بے نیازی اس کا ثبوت تھی۔

لورہ بانو نے انعام علی کی خاموشی محسوس کی اور ایک نگاہ ان پر ڈالی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ وہ کچھ دیر بعد کھٹکھٹا کر گویا ہوئے۔

”زعمہ ہوں۔“ وہ یاسیت سے گویا ہوئیں۔

”کھیلنا آتی تھیں یہاں؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔

لورہ بانو چونک پڑیں۔ آیا انہیں بتائیں یا نہیں کیونکہ کھیلنے نے خود کہا تھا کہ انعام علی کو بتانے بغیر آئی ہے۔

”ان کے آنے یا نہ آنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ انہوں نے بچا حلا جواب دیا۔

”وہ بہت ناگس لیڈی ہے، مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں!“ انعام علی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

لورہ بانو نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ جو جوا آٹھ دن ہوئے تھے۔ کھیلنے کو ریفقہ حیات بنے ہوئے اور انعام علی براہر ہے تھے۔

انہوں نے ایک عمر کٹ کیا تھا۔ راستے پھر بھی بے نور تھے۔

”یقیناً یہ آپ کی خوش نصیبی ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”مگر بلا ل میرے لئے برا ٹام کڑی ایٹ (مسائل پیدا کر رہا ہے۔“

”میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔“ وہ سرد آہ بھر کر بولیں۔

”تمہارا اس پرائز ہے اگر مخلصانہ کوشش کرتیں۔“ وہ چپ ہو گئے۔

ہر الزام کی طرح نور بانو نے یہ الزام بھی اپنے ظرف میں گم کر دیا۔

یقین دلائے کے سارے سر طے ہو چکے۔ میں بے بس ہوں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئیں۔

”تم بے بس نہیں ہو۔ تمہارا بیٹا تمہاری طاقت بن رہا ہے۔“ وہ خشک لہجے میں غرائے۔

”حالانکہ میں نے اسے کبھی انسانوں سے کھیلنے کی تربیت نہیں دی۔“ نور بانو نے مستحکم لہجے میں وضاحت کی۔

”تمہارے خون سے اس کی پرداخت ہوئی ہے۔ خون کا اثر ہی تربیت کی بنیاد ہوتا ہے۔ وہ قدرے ناراضگی سے لپ۔

”بھلا صرف میرا ہی بیٹا نہیں، وہ آپ کی بھی اولاد ہے۔“ نور بانو نے یاسیت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”تم لوگوں کی وجہ سے کھیلنے کی طور پر پریشان ہو سکتی ہیں اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جب کہ۔“ وہ رک گئے۔

”جبکہ وہ پرنسپلٹی پیڑیڈ سے گزر رہی ہے۔“ وہ نگاہ چمک کر بولے۔

”مبارک ہو آپ کو۔“ وہ بے معنی انداز میں مسکرا دیں۔ انہیں وہ دن یاد آگئے جب منظر ہونے والی تھی۔ ان کی ساس

پاکی خوشی سے زمین پر ٹک نہیں رہے تھے۔ لیکن انعام علی نے ان سے کہا تھا۔

”تم مسئلہ ہو نور بانو۔ تمہارے وجود سے میرے لئے مسائل ہی جنم لیں گے۔“

”بھلاں سے کہو۔ وہ دوش کی دوا کرے۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ گویا دھمکی دے رہے تھے۔

”میں اسے سمجھاؤں گی مگر خدا رات اپنے جیتے جی تیم نہ کیجے گا۔ وہ جیسے تڑپ کر بولیں۔

”کیا اس نے کھیلنے کو کچھ کہہ دیا ہے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔



”اسے کہو۔ وہ ٹھیکہ کی رسیٹ کرے۔ اور میری غیر موجودگی میں کبھی گھر نہ ٹھہرے۔“ انہوں نے حکم دیا۔  
 ”بہتر۔ میں اسے کہہ دوں گی۔ ان کا انداز ہمیشہ کی طرح منہاسیت آمیز تھا۔  
 ”یاد رکھو، بلال کی وجہ سے جو کچھ بھی ہوگا میں اس کا ذمہ دار نہیں سمجھوں گا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کوٹ کی  
 میں پچھٹو لئے گئے۔

پھر ایک چپک نکال کر نور بانو کی سمت بڑھایا۔  
 ”یہ رکھ لو۔“ ان کے انداز میں سرد مہر ہی بدستور تھی۔  
 ”منزہ کو دے دیجئے گا۔“ وہ حسب سابق ہنچکی نہیں۔  
 ”یہ تمہارا ہیڈنگ ہے۔“ انہوں نے چپک بستر پر پھینک دیا۔  
 نور بانو نے اٹھا کر نیکے کے نیچے دبا دیا۔  
 ”منزہ! نور بانو نے آواز دی۔

جی امی! وہ فوراً موجود ہوئی جیسے کہ منتظر تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر پر اڑائی تھی اور ایک باپ پر۔  
 ”اپنے پاپا کے لئے چائے کافی وغیرہ لے کر آؤ بیٹے!“ وہ تاکید انداز میں بولیں۔  
 ”چائے یا کافی پاپا؟“ اس نے آرام سے پوچھا۔ ساتھ ساتھ وہ ان کا چہرہ بھی پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
 ”کافی۔“ میں ڈرائیونگ روم میں ہوں۔“ انعام علی نے قدم بڑھا کر۔  
 ”ای بھی تو پیس کی۔ اس کا مطلب تھا ماں، باپ دونوں ساتھ کافی پیئیں۔  
 ”ضرور پلاؤ۔۔۔ اپنی امی کو بھی۔“ میں نے جہیں روکا تو نہیں ہے۔ وہ قدم بڑھاتے چلے گئے۔ منزہ نے ماں کی  
 نہیں دیکھا۔ اور انعام علی کے پیچھے پیچھے خود بھی کمرے سے باہر چلی گئی۔  
 انعام علی ڈرائیونگ روم میں پہنچے تو بلال بھانجے کو کارپٹ پر لٹائے اس سے شرارتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس  
 نیچے ہی نیچے آتے ہوئے باپ کو دیکھا اور بھانجے کو گود میں اٹھا کر کھڑا ہوا اور اسے زور سے ہوا میں اچھالا  
 بے بی کدھر ہے؟“ وہ ونائی کو پوچھ رہے تھے۔

”ہماری ملازمہ سودا سلف لینے جاتی ہے تو پر ام میں بٹھا کر اسے بھی سیر کر ادیتی ہے۔ منزہ نے بلال کے بچا  
 جواب دیا۔“ میں اتنی دیر میں دوسرے کام کر لیتی ہوں۔“  
 ”تم بچی کے لئے گورنس کیوں نہیں رکھ لیتیں؟“ وہ تازہ اخبار اٹھا کر آرام سے بیٹھ گئے۔  
 ”میرے پاس بہت نام ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے پاپا۔“ وہ جاتے جاتے پلٹ پڑی۔  
 ”پاپا دوپہر کے کھانے میں آپ کے لئے کیا خاص چیز بناؤں؟“ اس نے محبت سے پوچھا۔  
 ”میں۔۔۔ دوپہر کو کھانا نہیں کھانا بیٹا۔ صرف فروٹ جوس لیتا ہوں۔“  
 منزہ نے تفصیلی نظر باپ پر ڈالی۔ کتنا خیال رکھنے لگے ہیں اپنا۔  
 ”ماشاء اللہ۔“ اس نے انعام علی کی قابل رشک محبت دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔  
 ”اہل جوس بنالوں پاپا!“  
 انعام علی منع کرتے کرتے رک گئے۔ آخر وہ ان کی بیٹی تھی۔  
 منزہ بہت چاہ سے پوچھ رہی تھی۔ اور جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”اچھا! اگر اتنا رکاز جس ہو تو بہتر ہے۔ ورنہ جو تمہاری مرضی۔  
 منزہ کافی بنانے چلی گئی۔

”نکچن میں آئی تو نور بانو وہاں موجود تھیں۔

”کیا تمہارے پاپا چلے گئے؟ کافی نہیں پی؟“

”ابھی ہیں۔ میں نے روک لیا ہے۔ کہ آج لٹچ ہمارے ساتھ کر لیں۔ مگر پاپا تو لٹچ ترک کر چکے ہیں۔ صرف جوس  
 پیئیں۔“ وہ ماں کی سمت دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

”امی۔ پاپا کیا کہہ رہے تھے آپ سے؟“ وہ کریم جھپٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں۔“ وہ برز دھیمہ کرنے کے لئے اودن پر جھک گئیں۔

پھر سیدھی ہو کر اس کی سمت دیکھے بغیر گویا ہوئیں۔

”میرے نیکیے کے نیچے چپک رکھا ہے۔ بلال کو دے دینا، وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کر اے گا۔ اور اپنے پاپا سے کہو  
 کہ وہ آرام کر لیں۔ اور دیکھو کافی میں مٹھاس زیادہ نہ ہو۔“

منزہ کو روٹا آ گیا۔

”اس کی امی ہمیشہ ہی سے ایسی تھیں۔ یوں ہی کرتی رہی تھیں۔ پاپا ناراض ہوں گے۔

اتنی خدمت گزار یوں کا انہیں جو صلہ مل رہا تھا۔ وہ ہمیشہ سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے کافی تیار کی۔ پاپا کو پیش کی اور ماں کی تاکید کے سبب کہہ دیا کہ وہ آرام کر لیں۔

”میں دن میں بستر کے قریب بھی نہیں جاتا ہوں۔ ویٹ بڑھ جاتا ہے بیٹے۔“

بلال نے بڑے طنز سے مسکرا کر بہن کی جانب دیکھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ واقعی وہ اپنا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ اس کے اثرات واضح تھے۔ ان کا پیٹ بھی نارمل  
 ملا۔ اور چہرہ بھی چمکدار۔ ہاتھ پاؤں کی جلد بھی شفاف تھی۔ حالانکہ اس عمر میں تو جلد ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور سام کھلے ہوئے  
 نظر آتے ہیں۔

بلال کب سے بیٹھا ہوا تھا مگر انعام علی نے اس کو ایک بار بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔

منزہ کو یہ بات بہت محسوس ہو رہی تھی۔

”بلال! پاپا کو اپنی مارکس شیٹ تو دکھاؤ۔“ آخر اس نے راستہ نکالا۔

”پاپا میری مارکس شیٹ دیکھنے نہیں آئے ہیں آپ!“

انعام علی نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ وہ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے اخبار کو اچھی طرح پھیلانے ہنوز مگن تھے۔

منزہ نے بلال کو گھورا تو وہ جھلا کر باہر ہی نکل گیا۔

انعام علی نے پھر بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔

کیا پاپا کو بلال سے بالکل بھی محبت نہیں رہی؟ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

وہ ان کے قریب آئیں۔

”کتنے دن لگ جائیں گے۔ خاور کو وہاں ہی میں؟ انہوں نے گردن موڑ کر منزہ کو دیکھا۔

”تقریباً تین ماہ مزید لگ جائیں گے۔“ اس نے فارل سے باپ کو فارل سا جواب دیا اور ایک سکوت دونوں کے

درمیان پھر حائل ہو گیا تھا۔

شور کے معنی ہوں نہ ہوں۔

سکوت کے معنی البتہ ہوتے ہیں۔

غور کیا جائے تو سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

یہ باتیں آپ بھی بنا سکتے تھے۔ وہ ناراضگی سے بولی۔

ذرا سوچ کر تے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بے چین ہوئی۔

”کہاں ہے ٹکلیہ کا گھر۔ اتنی دیر ہو گئی ابھی تک نہیں آیا؟“

”گھر خود چل کر گاڑی کے نزدیک نہیں آئے گا۔“

حد سے زیادہ بدگمانی بھی ستم ہے۔ سب سے بڑا محرکہ تمہیں اپنے گھر لانا تھا۔ یہ سر ہو چکا اب تو ہر بات بہت معمولی

اور چھوٹی ہے۔

میرا گھر ایک سرے پر اور ٹکلیہ کا دوسرے سرے پر ہے ظاہر ہے دیر تو لگے گی۔

کراچی جیسا وسیع شہر جس کے دوسروں کے درمیان دنیا کی آباد ہیں۔

مطمئن رہو۔ کوئی دھوکا نہیں ہو رہا تمہارے ساتھ۔

وہ اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔ احسن نے بھی اس کی طرف اچانک دیکھا تھا۔ نظر ملنے کا مکمل ہوا تو اس کا دل بے اختیار

دھڑک گیا۔ اس نے فوراً نظر چرائی۔

”تم نے مجھ سے کبھی انگا نہیں ملائی۔ اتفاقاً دیکھا تو دیکھ لیا۔ نہ شادی سے پہلے نہ شادی کے بعد حالانکہ ہم دنیا کے

مضبوط اور قریب ترین رشتے سے منسلک ہیں۔ کیا میری آنکھیں بہت بھیا تک ہیں؟“

وہ احسن کی بیوی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ وہ اس سے اس قسم کی گفتگو کرنے کا حق محفوظ رکھتا تھا۔

(تمہاری تو ساری تولیاں تمہاری آنکھوں میں سمت آتی ہیں۔ مجھ میں تاب نہیں)

وہ سر جھکائے سوچ رہی تھی۔

”اس میں بھی کوئی عیب ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ضرورت بھی کیا ہے۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”یہ تو اب میرا کام ہے کہ تمہیں آخری حد تک ضرورت مند بنا دوں۔ اور تمہاری ہر ضرورت کی تکمیل میرے ذریعے

ہو۔“

”ضروریات اللہ تعالیٰ پوری کرتا ہے۔“ اسے غصہ آ گیا۔

”مگر اس نے مجازی خدا بھی بنائے ہیں۔“ احسن کا قبچہ بہت جاندار تھا۔

”چلے جناب!“ معا اس نے گاڑی روکی۔

”یہ رہا گھر۔“

شہوار نے بے حد تعجب سے پر شکوہ سے گھر کی سمت دیکھا۔ نیم پلیٹ پڑھی۔

”الغلام علی کون ہیں؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

”ٹکلیہ کا الغلام ہیں۔“ برجستہ جواب آیا۔

چوکیدار نے گیٹ وا کر دیا۔

”تیکم صاحب ہیں مگر پر؟“ احسن نے چوکیدار سے دریافت کیا۔

”جی جناب۔“ وہ مودبانہ گویا ہوا۔

دوسرے ملازم کے ذریعے پیغام بھجوایا۔

اس نے دوپہر کو کھانا نہیں کھا یا تھا رات کو بھی اس نے انکار کر دیا۔

حتیٰ کے احسن کے خراب موڈ کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ وہ عجب الجھن میں پڑ گیا تھا۔

اس کے دل میں کیا ہے؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

کافی دیر ٹی وی کے سامنے غائب و غایبی کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم کچھ سوچ کر اٹھائی وی بند کیا اور اس کے

قریب چلا آیا۔

”اٹھو!“ وہ پر حکم لہجے میں گویا ہوا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”چلو۔ تمہیں ٹکلیہ سے ملاؤ۔“

”ہائیں۔“ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔

اور چادر لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

احسن نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور رست و اچ کلائی میں ڈالنے لگا۔

”انسان کو مینے میں ایک آدھ مرتبہ منہ دھولیتا چاہیے۔ وہ اس کے اجاڑے لیے پر چوٹ کر رہا تھا۔

شہوار نے جیسے سنا ہی نہیں۔۔۔۔۔ اور باہر نکل گئی۔

احسن نے گھر لاک کیا۔ گاڑی نکالی وہ پہلے ہی باہر نکل کر کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اڑتی پڑتی نگاہ اس پر ڈال لیتا تھا۔

”پروگرام کا ایجنڈا مگر بکریا نہیں؟“ مونچھوں تلے اس کے لب مسکرا رہے تھے۔

شہوار نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں؟“

”جوابات سمجھ میں نہ آئے، اس کا جواب کیسے دیا جاسکتا ہے؟“ رات تم نے مجھے خوش کر دیا۔ چلو کسی بہانے پتا تو چلا

کہ محترمہ ہمارے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہیں۔

”رکھتی تھی۔“ وہ تیزی سے بات کاٹ کر برزی سے گویا ہوئی۔

”خیر، چلو یہ بھی کم نہیں۔ ماضی ہی میں سہی۔ کبھی آپ کی نگاہ میں اہمیت رکھتے تو تھے۔“ وہ بار بار منے والوں میں سے

نہیں تھا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے، پروگرام کا ایجنڈا کچھ اس طرح ہوگا۔ سب سے پہلے تو رونا دھونا ہوگا۔ پھر میری شکایات

کا سلسلہ ہوگا۔ شاید درمیان میں پھر رونے دھونے کا آئٹم ہوگا۔ غالباً آخری آئٹم یہ ہوگا کہ ٹکلیہ سے دریافت کیا جائے

گا۔ کہ اس کی شادی اچانک کیوں ہوئی؟ کسی کو خبر کیوں ہوئی؟“

۱۰. باہر کی سمت بڑھا۔

”میں کہہ نہیں سکتی تھی۔ شکلیہ بات یہ ہے جب پاپا خلع کی درخواست اور دوسرے کاغذات تیار کر رہے تھے تو انہوں

”میں کہہ نہیں سکتی تھی۔ شکلیہ بات یہ ہے جب پاپا خلع کی درخواست اور دوسرے کاغذات تیار کر رہے تھے تو انہوں

”اگر شہوار نے ہمارے فیصلے کے خلاف آواز نکالی تو میں خود اسے احسن کے دروازے پر چھوڑ کر آؤں گا۔ اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔“

اب تم بتاؤ میں تو بزدل سی لڑکی ہوں۔ حالات کے چیلنج سے منسنے کا حوصلہ مجھ میں کہاں ہے۔ اس کی آواز ہلکا ”نمر..... ہو تو پھر بھی سب کچھ کیا۔“ شکلیہ نے ناسف سے کہا۔

”سچ شکلیہ.....! مجھے یہ احساس مار ڈالے گا، کہ میری وجہ سے میرے گھرانے کی اہلسنت ہوئی۔“ اشک پھر احسن بھائی بہت ذہین ہیں۔ انہوں نے خالو جان کے قطعی انداز کو بھانپ لیا ہوگا۔ ورنہ وہ صبر سے مزید لیتے مگر کوئی انتہائی قدم نہ اٹھاتے..... اتنا مجھے یقین ہے کہ جو کچھ ایک مرتبہ وہ اسی سے کہہ رہے تھے کہ کم از کم ناکل کے بعد ہی وہ تمہیں لائیں گے۔ وہ تین بہنوں کی رخصتی تک انتظار کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بجائے نکاح کا مضبوط بندھن باندھنے کے حق میں تھے۔ اور تمہاری وادی کی خواہش پر فوراً تیار ہو گئے تھے۔

”مگر شکلیہ میری وجہ سے میرے گھرانے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ سوچو تو سہی۔“

”انسان کے اپنے عمل ہی میں جزا و سزا چھپی ہوتی ہے۔“ شکلیہ نے آڑے ترچھے انداز میں اسی کے گھرا۔

دارنظر بھرایا۔

”جی نہیں..... یہ سب رجم خالو کی وجہ سے ہوا ہے۔ تمہیں کیا پتا وہ کتنے لمبے لمبے خط لکھتے تھے۔ احسن کے خالو کبھی بچا کے نام کبھی امی کے نام..... یہاں تک کہ ایک دن میں نے سوچا کہ کیا وہ کبھی باپ ہیں؟“

”نمر سردار خالو تو بھائی کو بچپن سے جانتے ہیں۔ تم لوگوں کے گھروں میں کھیلے ہیں وہ۔“ شکلیہ مطمئن نہ ہوئی۔

”اب تم اسے میری قسمت کی خرابی کہہ لو۔ انہوں نے تحقیق کرائی تو پتا چلا کہ احسن نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دیا ہے۔ بچا کے نزدیک احسن کے بگڑنے اور بھٹکنے کا یہ واضح ثبوت تھا۔

وہ امی سے کہتے تھے۔

”دیکھتا م نے..... کتنا خود غرض اور غیر ذمہ دار ہے۔ باپ کا ہاتھ پٹانے کے بجائے مشکل وقت میں باپ! چھوڑ دیا۔ کس قدر ناخلف نکلا۔“

پھر وہ امی پر برسنے لگتے تھے کہ انہوں نے اس رشتے کی پر زور حمایت کیوں کی تھی۔ جب کہ امی میرا جھکاؤ دیکھتیں۔“

شکلیہ اس کی رازدار تھی۔ وہ اس سے ہمیشہ بلا جھجک ہر بات کرتی آئی تھی۔

اسی دم ملازمہ نے آکر مدخلت کی۔

”بیگم صاحبہ! احسن صاحب کہہ رہے ہیں ان کی بیگم نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔“

”شہوار.....!“ شکلیہ نے اسے فہمائشی انداز میں گھورا۔ ”کیوں اپنے آپ کو جیتے جی مار رہی ہو؟“

کتنی بڑی بات ہے۔ اس بات سے احسن بھائی کس قدر پریشان ہوں گے۔ ٹھہرو..... میں کھانے کا انتظام ہوں۔ دیر نہیں لگے گی۔ مگر تم ایک کام کرو۔“

شہوار نے نظریں اٹھا کر سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”میرے میاں آتے ہوں گے۔ تم میری نگاہ بھائی ہو۔ پلیز اپنا حلیہ درست کر لو۔“

”میرا دل کچھ بھی کرنے کو نہیں چاہتا۔“ وہ ہیزا سے انداز میں گویا ہوئی۔

”میری خاطر۔ میری بات مان لو۔ پلیز شہوار..... وہ تمہیں اس حال میں دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ اب دیکھو ناں ایک اٹھیں حقیقت نہیں بتا سکتے ناں۔“

”تم کہیں جا رہی تھیں؟“ اس نے شکلیہ کے سر پرے پر نظر ڈالی۔

”جا نہیں رہی تھی۔ آئی تھی۔ ساتھ والوں کے بچے کی برتھ ڈے تھی۔“

اس نے اپنا ایک نیا سوٹ نکال کر شہوار کے سامنے ڈال دیا۔

”یہ نہیں کرو شکلیہ پلیز..... کپڑے میرے ٹھیک ہیں۔ میں ہکا سامیک اپ کر لوں گی۔ بس.....“

”یہ بالکل نیا ہے، کل ہی مل کر آیا ہے۔ اتار نہیں ہے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”اب میں تمہارا دوسرا مطلب نہیں سونگی۔ پلیز اٹھو ناں..... شاباش۔“

وہ مجبور سی ہو گئی۔

کا ہی ہنر انتہائی نفیس اور سبک کپڑے سے تیار شدہ لباس تھا۔ خوبصورت تراش تراش تھی۔ اس پر بہت اٹھ رہا تھا۔ شکلیہ نے بہت چاہ سے اس کا ہمراہ اسٹائل بنایا۔ سوسائٹی مودو کرنے کی وجہ سے وہ ان چیزوں میں خاصی ایکسپرت ہو

گئی تھی۔

چمک دار شانگ پمک لپ اسٹک لگائی..... تو شہوار نے فوراً اعتراض کیا۔

”یہ بہت تیز ہے۔“

”ارے چھوڑو..... بکریز کپڑوں پر بہت چنچا ہے۔“

صاف سے منہ دھو کر سر میں تیل ڈال کر چوٹی گوندھنے والی شکلیہ میں انتہائی جلدیلیاں آچکی تھیں۔

”تم کتنی بدل گئی ہو شکلیہ!“ وہ اپنی حیرانی بھجپانہ لگی۔

شکلیہ مسکرا دی..... ”وقت بدل دیتا ہے۔ بلکہ بدل کر رکھ دیتا ہے۔“

اس کی ناکہ میں سونے کی خوبصورت لوہنگ ڈالی۔ کانوں سے رنگ اتار کر بڑی بڑی چاندی کی بھٹکیاں پہنائیں۔

”آف..... کیا غضب ڈھا رہی ہو..... خالی پیٹ.....“ وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔

”ایک منٹ ٹھہرو..... میں کھانا لگواتی ہوں۔ انعام صاحب بس آنے ہی والے ہیں۔“

”تمہیں بہت محبت ہے انعام صاحب سے۔“ وہ نہ جانے کیوں پوچھنے لگی۔

”ضمیر کا تقاضا ہے..... ویسے بھی وہ بہت اچھے ہیں۔“ وہ کتنی ہوئی باہر نکل گئی۔

شہوار کر کے سجاوٹ و آرائش پر نگاہ دوڑانے لگی۔

معاً اس کی نظر فریم میں جڑی ایک تصویر پر رک گئی۔ جو بیڈ کے سر بائے لگی ہوئی تھی۔ تصویر بکڑ تھی۔ اس لیے چہرہ تو گلابی نظر آ رہا تھا۔ وہ غور سے تصویر دیکھنے لگی۔ برابر ہی میں شکلیہ کی تصویر تھی۔ وہ پھر انعام علی کی تصویر غور سے دیکھنے لگی۔ یہ

کوئی نوجوان تو نہیں ہے..... بہر حال شکلیہ کا ہم عمر بھی نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جم گیا۔ اسی لمحے شکلیہ اندر داخل ہوئی۔

”شکلیہ..... یہ..... کون ہیں؟“ اس نے انعام علی کی تصویر کی سمت اشارہ کیا۔

”انعام صاحب کے بیڈروم میں ان کے علاوہ کس کی تصویر ہو سکتی ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”واقعی.....“ وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

”واقعی.....“ شکلیہ پھر مسکرائی۔ ”کیوں کیا! اچھے نہیں ہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

شہوار نے پلٹ کر شکلیہ کا چہرہ بغور دیکھا..... اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی منفی تاثر نہیں تھا۔

”نہیں..... بہت اچھے ہیں.....“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی تھی۔ ”مگر.....“

”مگر.....؟“ شکلیہ کو تو معلوم تھا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ مگر وہ مگرے آگے جانا چاہتی تھی۔

”کیا تمہاری اور ان کی عمر میں خاصا فرق نہیں ہے.....؟“ بالآخر وہ کہہ بیٹھی۔

”ہاں..... ہے تو..... مگر انہیں اپنی بیوی کو خوش رکھنا اور مطمئن کرنا آتا ہے۔ وہ ایک کامیاب شوہر ہیں۔ میرا خوش ہوں۔“ وہ مسکرا دی۔

”کس کی پسند سے ہوئی ہے یہ شادی.....؟“ وہ گم سم سمی تھی۔

”ہمارے ہاں فیصلے کرن کرتا ہے۔ تم لا علم نہیں ہو۔“

”گویا یہ خالوجان کی چوٹس ہیں۔“ شہوار نے گہرا سانس لیا۔ اب وہ بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔ باہر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

”غالباً انعام صاحب آگئے ہیں..... آؤ.....“ شکلیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”بھوک سے یقیناً تمہارا اندام حال ہوگا۔ کھانا بالکل تیار ہے..... پہلے انعام صاحب سے ملا دوں، پھر کھا

گا۔“ وہ اسے لے کر لاؤنج میں چلی آئی۔ جہاں انعام علی اور احسن گفتگو کر رہے تھے۔

احسن نے شہوار کو لپچی سے دیکھا۔ وہ ایک دم بدلی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

”السلام علیکم.....“ شکلیہ نے حسب معمول سلام کیا۔ پھر شہوار نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا۔

وہ انعام علی کو بچوں کی سی حیرانی اور تجسس سے دیکھ رہی تھی۔

انعام علی نے ذرا چونک کر شہوار کی سمت دیکھا۔

”آپ انہیں بغیر تعارف کے بوجھ ہی نہیں سکتے۔“ شکلیہ مسکرائی۔

”ایسا نہیں ہے۔ غالباً یہ احسن کی مسز ہیں۔“

”ہیں.....! شکلیہ حیران ہوئی پھر ایک دم ہنس پڑی۔“ آپ کو احسن بھائی نے بتا دیا ہوگا۔“

”جی نہیں..... مجھے احسن نے تو نہیں بتایا۔ البتہ ان کی آنکھوں نے بتایا ہے۔“ وہ بہت بڑا وقار انداز میں مسکرائی۔

شہوار کو اس جملے پر ذہن و شرم آگئی۔ وہ باوانتہ شکلیہ کی اوٹ میں ہو گئی۔

”انعام صاحب..... پلیز آپ چیچ کر لیں..... ہماری اس مہمان کی بھوک بڑا بل ختم کرتا ہے۔“ انعام علی اس

بات سمجھے تو نہیں البتہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ چاروں کھانے کی میز پر تھے۔ جب انعام علی نے شکلیہ سے پوچھا تھا۔

”بھئی، آپ نے تو کبھی نہیں بتایا کہ احسن اپنی مسز کے ساتھ آباد ہو چکے ہیں۔ ہاں، یہ معلوم ہوا تھا کہ احسن صاحب

”نکاح شدہ“ ہیں۔“

”خاصی پڑیچ اسٹوری ہے، آرام سے بتاؤ گی۔“ وہ مسکرا کر گویا ہوئی۔ احسن نے اس کا اعجاز اور اطمینان مس

کیا۔ جیسے اسے انعام علی سے کوئی خوف یا خطرہ نہ ہو..... جیسے انعام علی اس کے اثر میں ہوں۔

ب۔ وہ شہوار کو زبردستی اصرار کر کے کھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔

شہوار کو بے اختیار بار بار دیکھ رہا تھا..... اور سوچ رہا تھا۔

وہ خوش نظر ہے..... یا واقعی شہوار خوش رو اور خوش انداز ہے۔

عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ جب روٹی اپنی ماں کے ہمراہ آئی۔

منیفہ بڑی کاٹ رہی تھیں، روٹی اور اس کی امی کو دیکھ کر پُر تپاک انداز میں انہیں۔ بہت عزت سے انہیں بٹھایا

نہایت دریاغشہ کی۔

مگر انہوں نے نوٹ کیا کہ روٹی بھی خلاف عادت سنجیدہ ہے اس کی ماں کے تاثرات بھی اس روز سے مختلف ہیں جس

لہذا درشت لائی تھیں۔

خیلہ تو نہیں دیکھتے ہی کوئے کھدرے میں گھس گئی۔ لیکن نالکہ انہیں سلام کر کے وہیں آس پاس کام میں مصروف تھی۔

اس نے تو روٹی سے سلام کے علاوہ بات ہی نہیں کی..... اس کا دل رازی کے نام تک سے متفر تھا۔ اس لیے متعلقین بھی

متوہ تھے۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے روٹی کی امی آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”بھئی! ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ مگر آپ کی شرافت اور دھیمے پن سے حوصلہ ہوا ہے کہ اپنے دل کی بات

کہہ سکیں۔“

”در اصل، بھئی! بات یہ ہے کہ میں آپ کی بیٹی نالکہ سے رشتہ کرتا ہے..... میرے بچوں کی خواہش ہے۔ روٹی نے کہا

فا پڑی سے چھوٹی..... میرے دھیان میں نہیں رہا کہ آپ کی ایک بیٹی شادی شدہ ہے۔ ایک تو بچوں سے زیادہ ملنا

بٹانہ نہیں ہوا، اس لیے نام بھی ادھر کے ادھر مل جاتے ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں، آپ سے معافی مانگنے کے لیے تیار

ہوں۔ مجھے تو آپ کی سب بچیاں پیاری لگی ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ۔ برائے ماننے گا۔ نالکہ کے لیے میرے بیٹے نے کہا

ہے۔“





الہانے کسی گفتات کیلئے کشت نہیں کیا تھا۔

میرے بیٹے نے نائلہ کے لیے کہا ہے..... میں آپ پر یہ بات کبھی ظاہر نہ کرتی مگر مجھ سے جو بھول چوک ہو گئی

واسن نہیں پھیلا یا تھا۔

جو کچھ ہوا تھا..... از خود ہوا تھا.....

سوچ پر جو رہائی چھائی تھی، اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ.....

وہ واقعات جو..... فطری جذبات کے حق میں جارہے تھے، ایک دم خلاف ہو گئے تھے۔

اب خواہ نیکہ کا رشتہ رازی سے ہو بھی جاتا تو اسے مطلق چھوڑنا لگتا.....

کیونکہ وہ ایک تو ہیں آمیز احساس سے آزاد ہو چکی تھی۔

اس کی ”دو شیزگی“ کا مان سلامت تھا۔

اس کے ”منتخب“ ہونے کا اعزاز برقرار تھا۔

اُس نے نہایت ہلکی ہلکی کیفیت میں چائے بنائی..... روٹی کی ماں کا ایک جملہ اس کے جذبات میں پلچل چار

”نانکے کے لیے میرے بیٹے نے کہا تھا.....“

”انتخاب“ کا اعزاز دینے والا اس کے وجود میں سرایت کرنے لگا تھا۔

اس کا جی چاہا..... روٹی کی ماں جلدی سے چلی جائے اور اسے فی الفور تنہائی میسر آ جائے۔ پھر وہ آئینے

دیکھے۔

اب سے پہلے اسے آئینے کی افادیت کا احساس نہیں ہوا تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ آئینہ دیکھ کر مانگ سیدی

جائے۔

یا پھر یہ کہ کل احتیاط سے ڈالا جائے تاکہ پھیل نہ جائے اور دونوں آنکھوں میں ایک سا لگے۔

گھر کے گئے بندھے، آمرانہ قسم کے ماحول میں سوچ کی اثران محدود رہی تھی۔

وہ آئینے میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ وہ ”منتخب“ ہے۔

جبکہ وہ نیکہ کو ہمیشہ سے خود سے زیادہ خوش شکل سمجھتی رہی تھی..... پھر وہ دونوں ایک نکمال کے ”سکے“

تھیں..... اچھی خاصی مشابہت تھی دونوں میں..... تھوڑا بہت فرق تھا..... نیکہ کا قد بھی اس سے اونچا تھا۔

اور رنگ میں بھی گلابی پن تھا۔

اور وہ دن میں اس سے زیادہ مرتبہ ”محبت“ پر بھی رہتی ہے.....

اسے ”انتخاب“ کا سبب جاننے کا اشتیاق ہو رہا تھا.....

کس قدر بے خبری کی زندگی گزر رہی تھی..... شاید ایسے ہی کسی واقعے کے سبب شاعر بے ساختہ کہہ اٹھا تھا۔

خس کو خود میں و خود آراو کر دیا

کیا کیا میں نے اظہار تمنا کر دیا

اسے نہ جانے کیسے یہ شعر یاد آ گیا..... جبکہ اس سے پہلے تو اسے کوئی شعر یاد ہی نہیں آتا تھا اور وہ پورے

ماحول سے بے نیاز ایک انویسی کیفیت میں گرفتار چائے لے کر باہر چلی آئی..... وہ چائے خود اس لیے لائی تھی کہ

کرنا چاہتی تھی، اس نے یہ گفتگو نہیں نہیں ہے اور وہ تمام صورتحال سے لاعلم ہے۔

کیونکہ اسے ماں سے جواب آرہا تھا۔ اسے احساس تھا صنفیہ اس کی سمت ضرور متوجہ ہوں گی۔

نئی آپا، آپ بھی ہمارے ساتھ چائے پیئیں.....“ روٹی اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

نانکے نے ماں کی سمت ٹرے رکھتے ہوئے یوں ہی دیکھ لیا تھا..... اور وہ ساری جان سے کانپ کر رہ گئی۔ اب تک تو وہ

لچلے بطن تھی کہ اس سارے واقعے میں اس کا کوئی دوش یا کوئی شعوری حصہ نہیں تھا۔

مغیب کی نگاہوں میں سمجھتی تھی..... انہوں نے نگاہوں کے ذریعے اسے وہاں سے فوراً چلے جانے کا حکم دیا تھا۔

”میں ذرا کچن میں مصروف ہوں.....“ وہ زبردستی اور معذرت خواہ انداز میں مسکرائی۔ اس سے قبل کہ روٹی یا اس کی

کی کچن کہیں، وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

ماں کے انداز پر اس کا دل بڑی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ دوپٹے سے ہتھیلیوں کا پسینہ پونچھنے لگی تھی۔

”گوشت میں سالاد ڈال دیا نیلی.....؟“ ”نیلے! اچانک کچن میں داخل ہو کر پوچھ رہی تھی۔

”ڈال رہی ہوں آئی.....“ وہ گڑبڑا کر مستعد ہو گئی۔

”چلو میں ڈال دوں گی، تم مہمانوں کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔“ وہ سادگی سے کہہ کر جارہا تارنے لگی۔

”امی! میں ان کے پاس..... ہماری کیا ضرورت ہے؟“ ”وہ چھٹا ہوا حسن اور ک اٹھا کر پینے کے ارادے سے سل کی

مست بڑھتے ہوئے سنبھل کر بولی۔

”مگر روٹی بھی تو ہے۔“ ”نیلے! کچن چلی۔

”پھر کیا کریں؟“ ”وہ کچھ جھلا کر بولی تھی۔

نیلے ایک دم بچ سی ہو گئی..... نانکے کو یہ دھیان نہیں رہا کہ نیلے ابھی اصل واقعے سے لاعلم ہے اور وہ ان لوگوں سے

خوش ہے..... اور اس کے خیال میں نانکے کو بہن ہونے کے ناتے اس قسم کے خاص مہمانوں کے ساتھ خاص رویہ اپنانا

چاہیے تھا۔ اب وہ اس لیے چپ ہو گئی تھی کہ مزید اصرار سے دل کی قلعی کھلتی سو جواب آڑے آ گیا۔ بہر حال اسے نانکے کے

طوفا انداز پر توجہ ضرور تھا۔ نانکے جیسی حساس اور ذمہ داری لڑکی کی یہ ”مجرمانہ“ غفلت تھی، نیلے کے نزدیک۔

مغرب کی اذان سے چند لمحے قبل روٹی کچن کے دروازے ہی میں آکھڑی ہوئی۔

”اچھا جی..... ہم جارہے ہیں۔“ وہ مسکرا کر دونوں کو باری باری دیکھنے لگی۔

نیلے نے قدرے جھینپ کر اس کی سمت دیکھا۔ مدھم مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔

”اچھا..... خدا حافظ.....“

”خدا حافظ روٹی.....“ نانکے نے پیشانی سے لٹیں پیچھے کرتے ہوئے بہت نرمی اور ملائمت سے خدا حافظ کہا تھا۔ شاید

ہلکی بار روٹی سے وہ اتنی نرمابست سے ہمکلام ہوئی تھی۔

”نی! اللہ! تو آپ سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ ہمارے ہاں آئے گا۔“ نیلے کی اس کی طرف پشت تھی، اور روٹی نانکے

سے مخاطب تھی..... اپنی عمر کے حساب سے بہت نراکتوں سے بے بہرہ تھی اور شرارت کے موڈ میں تھی۔

نیلے نے دھڑکتے دل کو قابو میں کیا۔ (مجھ سے نہیں..... مگر نانکے سے تو کہہ سکتی ہو)۔ اس نے سوچا۔

مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

نانکے نے باہر آکر ادھر ادھر دیکھا..... صنفیہ برآمدے کے کونے میں لگے ہوئے عین کے سامنے کھڑی دھو کر رہی

تھیں۔

نانکے جھپاک سے ہاتھ روم میں غمس گئی۔

”ہائے اللہ..... امی اس وقت نہ جانے کیا سوچ رہی ہوں گی.....“ عجیب سے خدشات جاگنے لگے۔

شکیلہ نے شہوار کو روک لیا تھا۔

اُسے ڈھیروں باتیں شہوار سے کرنا تھیں۔ بہت سے راز و نیاز محفوظ تھے، وہ مختل کرتا تھے۔

اس نے تو بھائی کو بھی بہت اصرار سے روکا تھا۔ مگر وہ مجھدار سے پہلو بچا گیا تھا۔ ابھی وہ انعام علیؑ

”مخالفت“ بھولا نہیں تھا جو اس نے بہت شدت سے کی تھی۔ لہذا وہ انعام علیؑ کی محل سرا میں قیام کے بارے میں بھی پسند نہ کرتا تھا۔

اس گھر میں اس کی حقیقی بہن تھی۔ وہ قدرتی جذبوں کے سامنے بے بس تھا۔ اسے سے ملنا اس کی ”پیدا آئی مجبور تھی۔

وہ تو شہوار کو بھی وہاں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا مگر شہوار کی نیت دیکھتے ہوئے اس نے یہ ناگواری برداشت کر لی تھی۔

شکیلہ کے تو پاؤں خوشی کے مارے زمین پر نہیں رک رہے تھے۔ اس کی مدارات میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی۔ زمانے بھر کی باتیں کی تھیں پھر بھی عجیب سی تشنگی باقی تھی۔

اگلے روز وہ اسے سیر کرانے بھی لے گئی۔ ڈرائیور ہمراہ تھا۔ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر نئے جہانوں میں گم ہو کر گئیں۔ سیر سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اصل مقصد تو ایک دوسرے کی قربت تھا۔ دونوں ہی ایک بے یقینی کی کیفی

سے دوچار تھیں۔ شکیلہ الگ سب سے کہتی ہوئی تھی۔

اور شہوار علیحدہ سب سے دُور تھی۔ تمام قریبی رشتوں سے متعلقین سے۔

شہوار نے اپنی ساری افتادہ بلا اس کے گوش گزار کر دی تھی۔

شکیلہ نے اپنی زندگی میں آنے والی تبدیلی کے اسباب سے اس کو حرف حرف آگاہ کر دیا تھا۔

یہ ملاقات دونوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔

دل کی بھڑاس نکلی تو طبیعتیں بھی ہلکی ہو گئیں۔

لیکن شہوار کے دل میں ایک خلش بدستور موجود تھی کہ شکیلہ نے اپنے بھائی کی زیادتی کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی۔

جبکہ وہ خود رشتے داروں سے دُور رہتی اپنے گھرانے سے منسلک ہے۔ جیکہ تو آباد ہے۔

حالانکہ شکیلہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ تنہائی کا شکار ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ اس کی بہنیں یا امی اس کے پاس رہنے کے لیے آئیں اور اس کے لیے تو اس کا دل تڑپتا ہے مگر باجی پتا نہیں کن مصلحتوں کی خاطر سب کو دُور دُور رکھ دیا ہے۔

شکیلہ نے بتایا تھا کہ انعام علیؑ کو اس کا جلدی جلدی سے جانا پسند نہیں اور باجی شادی کے بعد صرف ایک مرتبہ آئے

بھی آدھ گھنٹہ کے لیے اور وہ صرف دو مرتبہ گئی۔

شاید اس نے یہ تفصیل اس لیے بھی شہوار کو بتائی تھی تاکہ شہوار کو یہ جان کر تقویت پہنچے کہ وہ بھی کم و بیش اسی طرح حالات سے دوچار ہے۔

نہن جب دوسرے دن بھی لینے نہ آیا تو شہوار کا دل کاپٹنے لگا کہ خدا معلوم اب کون سا امتحان درپیش ہے۔ اس پر

”تھا کہ ان دونوں میں اس کا فون بھی نہیں آیا تھا۔

انعام علیؑ آج کہیں ڈنر پر مدعو تھے۔ اس لیے وہ دونوں ہی کھانے پر موجود تھیں۔

شکیلہ اس سے باتیں کر رہی تھی مگر وہ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔

”کہاں گم ہو؟“ شکیلہ نے اس کی غیر حاضر دماغی کو بھانپ لیا تھا۔

”آج تیسری رات ہو گئی۔“ اس کے منہ سے اچانک بلا ارادہ نکل گیا۔

شکیلہ کا تہقہ بے ساختہ تھا۔

شہوار اس معنی خیز تہقہ کی وجہ سے بُری طرح جھینپ گئی۔ ظاہر ہے، دونوں ایک دوسرے کی دوست اور ایک دوسرے

دلوں سے خوب واقف تھیں۔

”ارے۔۔۔ اللہ۔۔۔ یہ تم بولیں؟“ شکیلہ بدستور نہنیں رہی تھی۔

”میرا مطلب ہے۔۔۔“ اسے شکیلہ کے شریرے تہقہ پر پرونا سا آگیا۔

”دیکھو ناں۔۔۔ بن بلائے مہمان کوئی اس طرح تھوڑا ہی ٹھہرا کرتے ہیں۔“ اس نے بہر حال اپنی بات مکمل

”بھئی میں مطلب و مطلب بالکل نہیں پوچھ رہی۔ بات گھمانے پھرانے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔“ شکیلہ کو

سہانے میں بہت لطف آ رہا تھا۔

”یقین کرو۔۔۔“ وہ منت سے کچھ کہنے لگی۔

”چلو یقین کر لیا۔“ شکیلہ نے بات کاٹ دی تھی۔ ”اور تم سے کس ستم کرنے کہا کہ تم مہمان ہو۔ ہم تمہیں اپنائیت

کے مقام کی انتہا پر لا رہے ہیں اور تم ہو کہ خود کو مہمان سمجھنے پر اڑ گئی ہو۔“

اسی وقت ملازما اندر داخل ہوئی۔

”بی بی۔۔۔ احسن صاحب آئے ہیں۔“ روئے سخن شکیلہ کی طرف تھا۔

شہوار کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔

ایک نئے طرز کی دھڑکن سے آشنائی ہوئی۔

ہر دھڑکن جیسے برقی روبن کر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا۔

ہر واہمہ، ہر خدشہ جیسے جاوے کے زور سے ہوا ہو گیا تھا۔

اعصاب شکن تناؤ سے نجات کے بعد طبیعت کس طرح بحال ہوتی ہے، یہ نیا تجربہ بھی زندگی کی کتاب میں رقم ہو گیا

تھا۔

اگرچہ وہ اس سے ناراض تھی۔

شاک کی تھی۔

برکت تھی۔

مگر۔۔۔

جانے پتا بھی تو وہی آخری تھی۔

مسلل اعصاب جسکں واقعات و حالات نے اسے حد درجہ بزدل بنا دیا تھا۔ ہلکی سی تبدیلی کے آثار تک سے ہولنے لگتا تھا۔

والدین سے دوری کے سرچلے ابھی طے نہیں تھے۔ احسن کی دودن کی بے خبری اسے خواہ مخواہ سی سہاڑی تھی۔

”بہنیں نے آؤ۔“ شکیلہ نے ملازمہ سے کہا تھا۔

چند لمحات کے وقفے کے بعد بھاری سی چاب ڈانگ ہال میں سنائی دی۔ شہوار کے ہاتھ میں نوالہ تھا۔ سر ہوا تھا۔ مگر شکیلہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم بھائی۔“

”وعلیکم السلام۔“ احسن کا لہجہ نارمل نہیں تھا۔ شہوار بے دیکھے ہی اس میں ”اتر“ کہتی تھی۔ لہذا اسے نگاہ اٹھا دیکھنا ہی پڑا۔ وہ تبدیلی کا سبب آنکھ سے دیکھنا چاہتی تھی۔ آواز سے تو وہ تبدیلی انداز محسوس کر چکی تھی۔

سیاہ شلوار سوٹ۔ سیاہ رنگ بھی سیاہی کی انتہاؤں کو چھوٹا ہوا۔ بڑی ہوئی شیو۔ سرخ آنکھیں۔ سیراز انداز۔

”کیا ہوا بھائی؟۔۔۔۔۔ آپ کی طبیعت؟۔“

”پرسوں سے بخار میں پڑا ہوا ہوں۔“

سارا بد دعاؤں کا اثر ہے۔۔۔۔۔ گھڑی گھڑی سی شہوار پر نگاہ پڑی تو مزاج میں از حد خوشنوازی تبدیلی آگئی۔ شہوار نے نگاہ اٹھا کر دی۔

”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ آپ پرسوں سے بخار میں مل رہے ہیں؟۔۔۔۔۔“ شکیلہ تڑپ کر رہ گئی۔ اس کو وہ وقت بھی یاد تھا جب معمولی سی حرارت پر ماں سے لے کر سب بہنیں اس کی تار داری میں جت جاتی تھیں۔

ساری زندگی اسی طرح گزری تھی کہ ہر چیز کہنے سے پہلے تیار ہی تھی۔

شکیلہ رو پڑی۔

”میری وجہ سے میرا بھائی اتنی تکلیف میں ہے۔۔۔۔۔ گھر کی عذاب ناک تنہائی اور بیماری۔۔۔۔۔ پھر کوئی پوچھنے والا کون نہیں۔“

”ارے۔۔۔۔۔ یہ رو تا کس خوشی میں بھی؟۔۔۔۔۔“ وہ واقعی سمجھ نہیں پایا۔

جب ہی جیرانی سے پوچھ رہا تھا۔

شکیلہ کرسی چھوڑ کر اس کی کرسی کے قریب آکھڑی ہوئی۔

دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں اور احسن کی کلائی تھام لی۔

”اُف۔۔۔۔۔ ابھی تک بخار ہے۔۔۔۔۔ دو آنکھیں لی۔“

”لی تھی بھئی۔ اتنے سے بخار پر یہ روانہ ہونا زندہ ہوں بھئی۔“ وہ شکیلہ کا شانہ چھپھا کر مسکرایا۔

احسن بھائی۔۔۔۔۔ شکیلہ نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔ ”ابھی باتیں منہ سے نکالنے پر بھی جیب سے کچھ نہیں جاتا۔“

”ای کو چتا چلے گا کہ آپ بیمار اور تنہا ہے، ان کا قول ہی بھٹ جائے۔“

”خدا نہ کرے۔ تم میری امی کو کبھی اس طرح کی خبریں پہنچانا بھی نہیں۔ میں پر امید ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مرنے ضرور دے گا کہ میں اپنی ماں کے کسی طرح کام آسکوں۔“

کیا انسان بیمار نہیں ہوتے؟۔۔۔۔۔ وہ بہن سے پوچھ رہا تھا۔

”گھر آپ کو کس انداز میں پرورش کیا گیا، اس لحاظ سے تو یہ آپ کے لیے سخت امتحان کا وقت ہے۔“

”انسان وہی کامیاب ہوتے ہیں جو ہر طرح کے امتحان سے گزرنے کا فیصلہ اور تدبیر رکھتے ہیں۔ تم سب کی ناز داریوں نے مجھے نکالنا ہے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو بھلا ہو کچھ لوگوں کا۔۔۔۔۔“

کوہ کن بنا کر رکھ دیا۔۔۔۔۔ اس نے منہم سے انداز میں مسکرا کر شہوار کی سمت دیکھا۔ ”اب تو لائف از دی اسٹریٹ کی موہ بن رہے ہیں، ہم لوگ۔“

شہوار کو پتا تھا یہ جیلے اس کے لیے ہیں۔

اس لیے وہ سر جھکائے پانی کے گلاس کی سمت بے تاثر انداز میں دیکھتی رہی۔

”بھائی آپ نے کچھ کھایا یا بھی؟۔۔۔۔۔“ شکیلہ کو جانک خیال آیا۔

”افسوس ذمہ داروں کی موجودگی کے باوجود میری ذمہ داری ہی ہو ابھی تک۔۔۔۔۔“ اس نے تاسف سے کہہ کر شہوار کی مت دیکھا۔

”غصہ ہے۔ میں آپ کے لیے کوئی ہلکی سی چیز تیار کرتی ہوں۔“

شکیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ بس اب چلیں گے، دیر ہو رہی ہے۔“

”ایسے کیسے چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ پتا نہیں ان دونوں میں آپ پر کیا گزری، کیسے رہے، کیا کھایا یا؟۔“

وہ بولتی ہوئی باہر چلی گئی۔

ہاتھ میں پکڑی ہوئی کمرنگ سے کھیلنے ہوئے وہ اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ شہوار کو اس کی نظریں محسوس ہو رہی تھیں۔ اس لیے نگاہیں اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

”صرف دو دن مجھ سے دور رہیں اور چہرے پر خاصا نور آ گیا۔۔۔۔۔ سوچتا ہوں تمہیں چاہہ کر ظلم ہی کیا تم پر۔۔۔۔۔ اچھی بھلی بچوں جیسی بے خبر زندگی گزار رہی تھیں۔ اور میں نے تمہیں بڑے ہونے کا احساس دلادیا۔ بہت بچھتا رہا ہوں۔ ویسے کیا حال ہے؟۔“ اس کے لبوں پر شریزی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”ٹھیک تو تم ہو، غلط تو میں ہی ہوں۔“

اس کے لہجے کی گھیرتا سے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ایسے لمحات اس کی زندگی میں بار بار آئے تھے وہ جب بھی روایتی مخاطب سے ذرا آگے بڑھنے لگتا۔۔۔۔۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے تھے۔ اس خیال سے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی کہ خدا معلوم یہ بے لگام کیا کہہ بیٹھے۔ کوئی دارفہ سا جملہ

اس کی تاب سے زیادہ۔۔۔۔۔

”میں دیکھتی ہوں، شکیلہ کیا کر رہی ہے۔۔۔۔۔“ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ شکیلہ کا گھر ہے۔ اتے تو یہاں کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتا ہے۔ خواہ تم یہاں ہو یا نہ ہو۔“

”کبھی وہ سوتو جو میں کہتا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ اس کی حالت سے حظ اٹھانے لگتا تھا۔

”اتنا کچھ تو سننا ہے۔۔۔۔۔“ وہ مات کا رخ بدل کر ماحول تبدیل کرنے لگی۔

”وہ مگر کبھی نہیں سنا..... جو خزانے کی طرح تمہارے لئے میرے دل میں محفوظ ہے۔  
وہ باز نہیں آیا۔

وہ ایک دم باہر نکل گئی..... اور سامنے سے آتی ہوئی شکیلہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی  
”الٹی خیر.....“ شکیلہ نے اس کے شانے تھام لیے..... ”کہاں بھاگی جا رہی ہو؟“  
تم ابھی تک احسن بھائی سے اتنا گھبراہتی ہو..... جبکہ اتنے دنوں سے ساتھ ہو.....  
شکیلہ نے جانچ لیا تھا کہ اس کا رویہ احسن کے ساتھ کیا ہے۔  
”کیوں ستاتی ہو میرے بھائی کو؟“ وہ شرارت سے ہنس پڑی۔

”میں ذرا چادر اوڑھ لوں.....“ اس نے بات بنائی۔  
”ابھی سے..... ابھی تو بھائی سوپ پیئیں گے..... گرم گرم ہے، دیر لگے گی؟“

”پھر کیا ہے؟“ وہ زبردستی شکیلہ کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی جہاں اس کی چادر وارڈروب میں رکھی تھی۔  
بیڈروم میں آکر وہ دم سے بیڈ پر بیٹھ گئی..... اور گہرا سانس لیا۔  
”میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے احسن کے سامنے اتنی گھبراہٹ کیوں ہوتی ہے۔ زندہ تو نہیں کھا جائیں  
مجھے۔“

معاً اس کی نظر سر ہانے رکھے فون پر پڑی..... سکس ٹوائٹ..... ایک نمبر نے جیسے اسے بے اختیار کر دیا۔  
اس کے ذہن میں دوڑنے بھاگنے لگے۔  
آج پھر وہ احسن کے ساتھ چلی جائے گی۔  
قید تہائی کا سلسلہ..... از سر نو.....

خدا معلوم اب اس کے نصیب میں اپنے پیاروں کو دیکھنا۔ ان سے ملنا ہے یا نہیں۔ کتنا اچھا موقع ہے۔ میں اپنی  
کی آواز تو سن سکتی ہوں.....

دو دن تو ہمت کرنے اور ارادہ باندھنے ہی میں گزر گئے تھے۔

مگر اب دل بے اختیار ہور ہا تھا..... قیامت جو پھر سر پر اکٹھی ہوئی تھی۔

چند منٹ گزرے تھے کہ شکیلہ نے تشریف بھری نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

”شکیلہ..... میں امی کو کون کر لوں۔“ اس کی آواز بہت مدھم تھی۔

”ارے..... یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟..... میں تو خود سوچ رہی تھی۔ تم خالہ جان کو کون کیوں نہیں کر رہی ہو۔  
ماں کا دل تو بہت نرم ہوتا ہے۔“ شکیلہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر گویا تسلی دی۔

”احسن بھائی سوپ پی رہے ہیں۔ تم کروا ملیتان سے..... میں ابھی آئی.....“

وہ پھر باہر چلی گئی.....

شہوار نے کانچے ہاتھوں سے ریسورٹھا کر کان سے لگایا۔ اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔

نمبر پیش کر کے وہ جیسے دم سادھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ٹیل ہو رہی تھی۔

پھر کسی نے ریسورٹھا ڈھایا.....

”ہیلو.....“ دوسری طرف نونل تھا.....

بھائی کی آواز سن کر جیسے وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔ ”ہیلو..... نونل..... میں بول رہی ہوں..... شہوار.....“  
اس کی آواز کانچے لگی تھی.....

اسلام علیکم آپا.....“ نونل کی آواز میں حیرت بھی تھی اور مسرت بھی.....

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”امی ہیں.....؟“ اس نے خود پر قابو پر کر پوچھا.....

”جی ہیں..... ایک منٹ ہولڈ کریں، ابھی بلاتا ہوں.....“ اسے بھی جیسے ماں کو بتانے کی جلدی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کی امی کی آواز ابھری۔

”ہیلو.....“ ان کی آواز بہت افسردہ اور نحیف تھی۔

”آہ..... اس کی امی..... اسے جیسے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔

”اسلام علیکم امی.....“

علیکم السلام..... کیسی ہو؟“ اس کی امی کے انداز والہانہ دوا نہ نہیں تھے۔ عجیب سی سرد مہری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا  
پہننے لگا۔

”امی.....“ وہ سسک پڑی۔

”امی..... یقین کریں جو کچھ ہوا اس میں میری مرضی شامل نہیں ہے، نہیں تھی۔ امی میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں  
.....“

”اب یقین دلاؤ یا نہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا..... یہ تو حقیقت سے بعید بات ہے کہ جو کچھ ہوا وہ تمہاری مرضی کے  
لاف تھا۔ ایس پی جب ہمارے دروازے پر آیا تو اس کے ہاتھ میں تمہارا تحریر کردہ خط تھا جس میں تم نے قانون سے مدد  
لگی تھی۔“

شہوار جنہیں کم از کم اپنی بہن نیلوفر کا ہی خیال کر لیتا چاہیے تھا۔ کیا اس کا گھر نہیں بننا چاہیے۔ ”اُن کی آواز رندہ گئی۔

”امی..... کاش آپ لوگوں نے مجھے صفائی کا موقع دیا ہوتا..... آپ کو کیا معلوم میں نے خط کن حالات میں لکھا  
نہا..... مجھے احسن کی قید سے رہا ہونے کی جلدی تھی..... صرف آپ لوگوں کی خاطر..... کاش امی، آپ میرا یقین کر

مل.....“ وہ رورور کر رہی تھی۔

”مجھے کیا معلوم تھا کہ احسن حد سے گزر جائیں گے.....“ وہ بہت آہستگی سے گفتگو کر رہی تھی۔

”میں اگر یقین کر بھی لوں تو تمہارے پاپا قیامت تک تمہارا یقین نہیں کریں گے۔“ دوسری طرف وہ بھی رور رہی  
تھیں۔

”امی..... آپ کو اور پاپا کو مجھ سے اس قسم کے اقدام کی امید نہیں ہونی چاہیے تھی۔ آپ میرے والدین ہیں۔ مجھے  
دلکے ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ کی عزت میری کسی بھی خوشی سے زیادہ اہم ہے۔ آپ لوگ اپنے خون سے اتنی  
جلدی بدگمان ہو گئے۔“ اس کے آنسو بدستور بہہ رہے تھے۔

”جو کچھ ہوا شہوار..... بہت ہی بُرا ہوا..... میں تمہارے باپ کے سامنے تمہاری وکالت نہیں کر سکتی..... اپنا بڑھاپا  
خواب نہیں کر سکتی..... کیا اس عمر میں دنیا کو خود پر ہنداؤں.....؟“



”اچھا۔۔۔“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اور شہوار کی طرف کالاک کھول دیا مگر دروازہ دلا۔

ہوار نے خود دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔ پھر دروازہ بند کر لیا۔

سن نے اس کی سمت ایک نظر بھی نہیں ڈالی تھی۔

ہوار نے چوری چوری اس کی سمت دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں اب بھی شعلے دھبے رہے تھے۔

جی ہوئی شیو۔۔۔ اور سرخ آنکھیں ایک عجیب پر اسرار سا دکھائی دے رہا تھا۔ شہوار کو جھرجھری سی آگئی۔

وہ بونٹ کھینچے ہوئے خامی آہستہ رفتار سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

بیک چوک پر ٹنٹل سرخ ملا تو اس نے تیزی سے ایک مگریت۔ گاڑی اور گاڑی کے شعلے مکمل طور پر نیچے کر دیے۔

اس کی خاموشی شہوار کے لئے سوہان روح تھی۔ ”کہیں انہوں نے میری باتیں تو نہیں سن لیں؟“

آنکھ بال بال میں وہ اسے جس کیفیت میں چھوڑ کر گئی تھی۔ اب وہ کیفیت اور تاثرات نہیں تھے۔

سن لئے اس کا کلیجہ اچانک خدشات کے تحت کانپ رہا تھا۔

مکمل زرد ہو کر سبز ہوا۔ گاڑی حرکت میں آ گئی۔

شہوار نے ایک مرتبہ پھر اس کی سمت دیکھا۔

ہونٹوں میں مگریت دبائے وہ بدستور ہنڈ اسکرین پر نظر پڑا۔ جہانے ہوئے تھا۔ اور اس میں ہمت نہیں تھا کہ اسے

گاڑی مسلسل چلتی رہی۔

شہوار نے محسوس کیا کہ آج وہ کسی اور راستے سے گھر جا رہا ہے۔ خاصے پر رونق علاقے کے بعد دیگرے گزر رہے

بلکان کے گھر کے راستے تو اس ذات ویران سے ہو جاتے تھے۔

وہ راستے کی تبدیلی پر حیران ہی تھی۔ معادہ چوک پڑی۔ یہ تو اس کے اپنے گھر، اپنے میکے کا راستہ تھا۔

اس نے گھبرا کر اس کی صورت دیکھی۔

”کک۔۔۔ کہاں جا رہے ہیں ہم؟“ وہ ہکا بکا کر رہی تھی۔

احسن ہنوز خاموش تھا۔ اس نے جواب دیا نہ کوئی تاثرات۔

چونچوں کے بعد ہی احسن نے سر وار محبت ملی کے کیٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔

”یہاں۔۔۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟“ وہ دھل کر پوچھ رہی تھی۔

”تمہارا سب کچھ یہیں ہے۔“ اس نے غروراً جواب دیا۔

”مگر اب یہ دروازہ میرے لئے بند ہو چکا ہے۔“ وہ کانپ رہی تھی۔

”جب تم ان کے لئے اتنے شدید جذبات رکھتی ہو تو یہ بھی زیادہ دیر تمہارے لئے پتھر نہیں بن سکتے۔“ وہ خون آشام

میں پھنکارا۔

”آپ کو اس طرح میرا متاثر ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ وہ جیسے پھٹ پڑی۔

”تمہیں میرا متاثر ہونے کا حق ہے تو مجھے کیوں نہیں؟“ وہ پھر کر بولا تھا۔

”اے خود غرض۔۔۔ اتنے بے حس ہیں آپ۔۔۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ وہ برہمی کی انتہا کو چھو رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں محترمہ۔ کہ رحم بہت اچھی چیز ہے۔ مگر دھوکے بازوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب آپ

”ای۔۔۔ میری صرف یہ تنہا ہے کہ کاش میں مر جاؤں۔ مگر مرنے سے پہلے آپ کا اور پیار کا یقین حاصل کر لوں۔“

ای۔۔۔ میں آپ کا خون ہوں۔۔۔ آپ لوگوں کے ساتھ یہ ظلم کرنے کا تصور بھی میں نے نہیں کیا تھا۔۔۔ مجھے

اور صرف آپ کی پرواہ ہے۔۔۔

میری شادی احسن سے ہوئی یا کسی اور سے۔۔۔ مجھے آپ کی خوشی مقدم رکھنا تھی۔۔۔ اگر آپ لوگ میری شادی

اور کر دیے تو میں آپ کی خوشی کی خاطر ایسا بھی کر لیتی۔ احسن کے رشتے سے آپ بھی خوش تھیں اس لئے۔۔۔“

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے دوسری طرف کسی نے ریسرور جھین کر زور سے کریڈل پر دے مارا ہو۔ رابطہ منقطع

چکا تھا۔

وہ آنسو بھری نگاہوں سے ریسرور کو گھورنے لگی۔۔۔ اسے یقین تھا کہ پاپا کے سوا امی کے ہاتھ سے کوئی اور ریسرور

چھین سکتا تھا۔۔۔

ہائے اللہ۔۔۔ امی کسی نئے عذاب سے دوچار نہ ہو گئی ہوں۔ اس کی نظروں کے سامنے سرور محبت علی کا پر جلال

گھو۔۔۔ اس نے بے دم سے انداز میں ریسرور دیکھ دیا اور چادر سے آنکھیں پوچھنے لگی۔ اسے ماں کی فکر لاحق

تھی۔

وہ ٹھٹھاں سے انداز میں پلٹی تو جیسے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

”اس دروازے کے پتھوں بچ کھڑا اسے جن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اداس کے لئے صریحاً اجنبی تھی۔

ان آنکھوں میں شعلوں سے اثرات تھے۔ اتنے شدید کہ اسے اپنا وجود سلگتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے چادر بھی طرح لپیٹی۔ اس کے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے تھے۔ اسے احسن کی نگاہوں سے خوف محسوس ہو

لگا تھا۔

وہ پلٹ گیا تھا وہ بھی سرے سرے قدموں سے اس کے پیچھے چلی آئی۔۔۔ ٹھیکہ ملازمہ کے ساتھ مل کر کھانے کی

صاف کر رہی تھی۔

”اچھا بھئی ٹھیکہ۔۔۔ احسن کی سپاٹ آواز ابھری۔

”تھوڑی دیر اور پھر جاتے۔ انعام صاحب آتے ہی ہوں گے۔“

”بہت دیر ہو جائے گی۔ پھر طیس گئے انشاء اللہ۔۔۔ احسن کا لہجہ ہنوز بے تاثر تھا۔

”بھائی۔۔۔ شہوار کو جلد لایے گا۔“ اس نے تاکید کی۔

”اب تو تمہارے پاس ہمارا انڈرٹیس ہے۔ تم بھی آ جایا کرو۔ ای کوئی اٹال میرا پتا نہ پتا۔۔۔ میں نہیں چاہتا

مالیات اتنے خلاف ہو جائیں کہ سٹیک نہ پائیں۔ تم جانتی ہو بھائی کی طبیعت۔“ اس نے بھی یمن کو تاکید کی۔

”جانتی ہوں بھائی۔۔۔“ وہ انصر دگی سے بولی۔

”اچھا شہوار۔۔۔ اس نے شہوار کو گھگھایا۔ جو ہر اسماں ہی نظر آ رہی تھی۔

”خدا حافظ۔۔۔“

”خدا حافظ۔۔۔“ شہوار نے بھی آہستگی سے جواب دیا۔

ٹھیکہ گیٹ تک انہیں رخصت کرنے آئی تھی۔

”بھائی یہ جو کار پر الٹو دے کیڈنک ہے، وہ بال بیک۔ اب ضرور کراتے جائیں۔“

اس گاڑی سے فی الفور اتر جائیے۔“ وہ بھڑک اٹھا۔

”اب اس گھر میں میرے قدم نہیں جاسکتے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔ اس لئے کروئے زمین پر صرف یہی تمہارا گھر ہے۔ فوراً اتر جاؤ، میں ابھی فون کر کے یہاں مانگ لوں گا۔ اپنی غلطی اور جرم کا اعتراف کر لوں گا۔ تمہاری بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اپنی پوری توانائی خر دوں گا۔۔۔۔۔ اب برائے مہربانی آپ میری گاڑی سے اتر جائیے۔“

”میری گاڑی۔۔۔۔۔“ آن کی آن میں وہ ایک دم ابھئی بن گیا تھا۔

اب آپ اتر جائیے۔۔۔۔۔ بیل بجائیے۔۔۔۔۔ تب تک میں موجود ہوں گا۔“

”خدا کے لئے احسن۔۔۔۔۔ آپ تو مجھے سمجھتے۔۔۔۔۔“ وہ جیسے نوپ کر کہہ رہی تھی۔

”تم نے تو مجھے کسی قابل ہی نہیں چھوڑا۔۔۔۔۔ کاش میں کچھ خدا کے لئے ہی کر لیتا۔ آخرت ہی سنور جاتی۔

رہی سمجھنے کی بات تو بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔۔۔۔۔“ بھڑکتے جذبات میں وہ دو دن پہلے اعتراف جو شہوار کی سے سرزد ہوئے تھے، جل کر بھسم ہو چکے تھے۔

احسن کے ذہن میں فی الوقت ماضی کی کوئی تصویر نہیں تھی۔

”آپ اتنے شقی۔۔۔۔۔ اتنے ظالم۔۔۔۔۔ اتنے خود غرض۔۔۔۔۔ اتنے بے حس ہیں۔۔۔۔۔ کاش مجھے ادراک ہو جاتا۔ آپ کو سزا کرنا شایاں کر بھی خوش نہیں رہ سکتے۔“

”میں اب کسی نامعقول خوشی کا آرزو مند نہیں ہوں بے فکر ہو۔“

وہ اس کی بات کاٹ کر بگڑ کر گویا ہوا تھا۔ ”بدعائدیں نیچے اتر کر بھی دی جاسکتی ہیں۔ کیا میں خود اتار دوں؟ وہ بے غضب ناک نظر آیا۔

شہوار نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔

”آپ قطعی قابل محبت نہیں ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ آپ سے جتنی نفرت کی جائے کم ہے۔“

احسن نے سگریٹ کا باقی ماندہ کلزا آخری کش لے کر باہر اچھال دیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

”میں جارہی ہوں احسن۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے، شاید آپ کو نہ ہو۔۔۔۔۔ کیونکہ میں سردار محبت علی کی بیٹی ہوں۔

مجھے یہاں کھڑے ہو کر بھی ان کی رائے نقل کی تال اپنی طرف ابھی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

بہت شکریہ۔۔۔۔۔ شاید آپ کے اس عمل کے نتیجے میں مجھے زندگی کے بوجھ سے نجات مل جائے۔ میرے خاندان کا بر بادی کا ذمہ دار آپ ہی کے سر پہن۔“

وہ بڑے اعتماد سے کہتی ہوئی اتر گئی۔ مگر دروازہ بند نہیں کیا۔

احسن نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ دُور سے بند کیا۔

”میں نے ظلم کیا۔۔۔۔۔ دھوکا دیا۔۔۔۔۔ ہونہر۔۔۔۔۔ یہ تو اسی طرح ہے جیسے ایک چور دوسرے کو چور کہے۔“ وہ شہوار کے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ نظروں کا سفر طے کر رہا تھا۔

شہوار نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ بلکہ اس کی چال میں پہلی بار وہ عجیب سا اعتماد دیکھ رہا تھا۔

اس نے کال بیل کا بٹن پش کیا تھا۔۔۔۔۔ اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

چند ثانیے بعد گیٹ وا ہوا۔ گیٹ کھولنے والا نفل تھا۔

میں نے گاڑی فوراً آگے بڑھا دی۔

نہ خیال تھا، اس کی موجودگی سے شہوار کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اس کی غیر موجودگی شہوار کے گھرانے کے افراد میں نرم گوشہ پیدا کر سکتی تھی۔

”اب بڑا دھوکا کھا کر بھی میرا جی تو ازن کس طرح قائم ہے؟“ وہ خود سے پوچھ رہا تھا۔ ”یہ سب تمہاری خاطر تھا۔ تمہاری محبت نے مجھے فیصلے کی ناقابل شکست طاقت مہیا کی تھی، اب پردہ ہٹا ہے تو کچھ باقی نہیں ہے۔“ وہ آنکھ میں جیسے بھر بھر جل رہا تھا۔ تمہاری بد نصیبی کہ تم نے یہ دھوکے بازی میرے ساتھ کی۔۔۔۔۔“

ٹیکسی سے ڈرائنگ روم کی سیٹنگ تبدیل کرنے میں مصروف تھی۔ اگرچہ اٹھانے اور رکھنے کا سارا کام نوکر کر رہے رہتے پھرتے ہی نڈھال ہو گئی تھی۔

اگر استانے کے لئے وہ اپنے بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔ آنکھیں موندے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ملازمہ نے اطلاع دی۔ کہ چھوٹے صاحب آئے ہیں۔

بال۔۔۔۔۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ انعام علی کی غیر موجودگی میں اسے بلال سے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔

وہ اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں ہیں؟“ اس نے دریافت کیا۔

”لاؤنج میں قلم لگا کر دیکھ رہے ہیں۔“ ملازمہ بتا کر پلٹ گئی۔

ٹیکسی دوپٹہ پورے وجود پر پھیلا کر باہر آ گئی۔

لاؤنج میں آئی تو دیکھا بلال ریوٹ کنٹرول ہاتھ میں لئے اسکرین پر نظریں جمائے گاؤں کیجیے کے سہارے نیم دراز

بال نے اچھٹی نظر اس پر ڈالی تھی اور انجان بن گیا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ ٹیکسی نے اسے مخاطب کیا۔

بلال اس کے سلام کرنے پر کچھ چونکا تھا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹیکسی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

”کیسے ہو؟“ وہ احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھ کر مخاطب ہوئی۔

”ویسا ہی۔۔۔۔۔ جیسا روز پیدائش تھا۔۔۔۔۔ لہجے میں تھی تھی۔

ٹیکسی چپ سی ہو گئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر وال کلاک دیکھا۔ دس بج رہے تھے۔

”ماشا کر دے؟“ وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تھوڑی دیر بعد ناچ کا وقت ہونے والا ہے میں زندگی بھر بغیر ناشتے کے نہیں رہا۔ اگر والد صاحب مجھ سے بری نہیں تو میری امی میرے لئے بہت ہیں۔“ وہ جانے کیا جتا رہا تھا ٹیکسی کے خاک بھی پلے نہیں پڑا۔

”کیسی کوئی بات نہیں۔ تمہارے پاپا تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ ٹیکسی نے انعام علی کے لئے اس کے دل میں

پائی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”اے کیوں پر بڑی استہزاء یہی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”اچھی بات ہے۔ انسان جس کا کھانے اسی کا گانا چاہیے۔ اس نے ٹی وی کی آواز اونچی کر دی۔  
 ٹکلیلہ جیسے گڑ گڑ رہی تھی۔ وہ اس بدتمیزی پر احتجاج کرنے کا بھی حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ چند ثانیے وہ چپ ہو کر رہ گئی۔  
 دوپہر کے کھانے پر کیا خاص چیز کھانا پسند کرو گے۔“ اس نے تمام تر توانائیاں مجتمع کر کے اپنے آپ کو سنبھالایا۔  
 بلال سے مخاطب ہوئی۔

”کیونکہ کھانا بٹلر بناتا ہے۔ اس لئے میں اسے بتا چکا ہوں۔“ بلال نے اسی اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

”ای کیسی ہیں تمہاری؟“ ٹکلیلہ نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔

”حالات آپ کے حسبِ منشاء ہیں۔ ہنوز بیمار ہیں۔“ دوسرا انداز میں کہہ رہا تھا۔

”الٹنہ کر کے جو میرا یہ منشاء ہو.....“ ٹکلیلہ نے قدرے افسردگی سے کہا۔

”ان بے چاری نے میرا کیا بگاڑا ہے جو میں اس قسم کی خواہشات کروں۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”مگر آپ نے تو ان کا سب کچھ لگا کر رکھ دیا ہے۔“ وہ تلخی سے گویا ہوا۔

”آپ نے غالباً پاپا کے ذریعے بیچ بھجوا دیا تھا۔ کہ ان کی غیر موجودگی میں یہاں نہ آیا کروں، کیوں؟

یہ میرا گھر ہے۔ جب میری مرضی ہوگی، آؤں گا۔ آپ یا پاپا میری ذات سے منکر ہو کر دیکھئے۔ اگر یہ ممکن ہو  
 کے لیے میں چند گاریاں از رہی تھیں۔

”میں اپنی بہن کے ہاں اس لئے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوں کہ خاور بھائی ملک میں نہیں ہیں۔ جب وہ آ جائے  
 میں مستقل طور پر یہاں آ جاؤں گا۔ اگر آپ کو یہ پسند نہ ہو تو کہیں اور انتظام کر لیجیے گا اپنا۔“ وہ روڈی کی کہہ کر پھر لڑا

”یہ تمہارا گھر ہے۔ تمہارا پورا حق ہے اس گھر پر..... اس میں میری پسند اور ناپسند کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ تم آ  
 آ جاؤ یہاں۔“ ٹکلیلہ اس کی گستاخی پر آنسو بھری ہوئی آنکھ کھڑی ہوئی۔

بلال نے کوئی توجہ نہیں دی۔ چہرے پر ابدتہ خشک تاثرات کا جال بچھا تھا۔

ٹکلیلہ کچن کی صورت حال کا جائزہ لینے چلی آئی۔

دکھ اور رنج لبو میں گھل کر رہ گیا تھا۔ اسے رونا آ رہا تھا مگر وہ ضبط کئے ہوئے تھی۔ بٹلر تینوں سے استنبو ہوئے  
 تھا۔

سارے کچن میں بیٹھتے ہوئے موت کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

ٹکلیلہ کو پتہ نہ آ گیا.....

ایک زور کی الٹائی آئی.....

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی ہاتھ روم میں گھس گئی تھی۔

ملازمہ نے جواسے دوڑتے ہوئے دیکھا تو خود بھی اس کے پیچھے دوڑی۔

سارا کھانا پیاتے کی صورت اس نے ہاتھ روم میں الٹ دیا تھا۔

تے دور تے نے اس کا حال خراب کر دیا تھا۔ پیلے پیلے دائرے آنکھوں سے سامنے ناچ رہے تھے۔

وہ دیوار تھا جسے کھڑی تھی۔ مگر ٹانگیں مسلسل کانپ رہی تھیں۔

ملازمہ نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ کم عمری پشیمان لڑکی تھی۔ اس لئے ایک دم حواس باختہ سی نظر آنے لگی تھی  
 کھا کر، مرنے والا کہ وہ ٹکلیلہ کا سارا بوجھ خود پر اٹھائے بمشکل اسے بستر تک لائی تھی۔

پیشی کے ڈھیر کی طرح بیڈ پر ڈھے گئی۔ اور ملازمہ بلال کی سمت دوڑ گئی۔  
 چوٹے صاحب..... بیگم صاحب کو آ کر دیکھو..... بہت برا حالت ہے۔“  
 لڑکی جیسے جھٹکا سا لگا۔

رہبر ایک دم سر دھیر انداز میں گویا ہوا

”کیا ہوا؟“

آپ چل کر دیکھو۔ برا حالت ہے۔“ وہ پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

ل نے ریسیوٹ کنٹرول کا بٹن پیش کر کے ٹی وی آف کر دیا۔ اور اچھے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

بازو کا پیچھے وہ اس کے بیڈ روم میں آیا تھا۔ مگر ٹکلیلہ پر نظر پڑتے ہی چونک اٹھا تھا۔

بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑے ہوئے لیٹی تھی۔ چہرے پر زور کی سی گھنڈی ہوئی تھی۔

بلنگٹ ڈال دو اور۔“ بلال نے ملازمہ کو حکم دیا۔

رخو وہاں کھڑا ہو کر ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔

چوٹے صاحب..... بیگم صاحب بے ہوش تو نہیں ہو گیا؟“ ملازمہ نے ٹکلیلہ کے بے حس و حرکت دیکھ کر تشویش کا  
 اظہار کیا۔

ال نے ریسیور رکھ کر ٹکلیلہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی اور جھک کر اس کی کلائی تھام لی۔ پھر گہرا سانس لے کر سیدھا ہو

آ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے نزدیک ترین ڈاکٹر کو کال کیا تھا۔ ملازمہ کو کہہ کر باہر نکل آیا تھا۔ اور کبھرے

لیٹ لٹھکانے پر لگانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے

میں لگایا جا سکتا تھا۔

اردی ہی آرکائیٹ بند کر دیا۔ گویا اس نے اپنا پروگرام موقوف کر دیا تھا۔

مدد منت سے کچھ کمی کا فرق نہ گزرا تھا کہ ڈاکٹر آ گیا تھا۔

ال اسے لے کر خود ٹکلیلہ کے بیڈ روم میں آیا تھا۔

ٹکلیلہ بے دم تھی۔ بے ہوش نہیں تھی۔ بس جیسے بھر پور تے کی وجہ سے اس کی ساری توانائی خیز کر رہ گئی تھی۔

الٹر چیک اپ کے بعد سیدھا ہو گیا۔ ایک آنکھیں دیا۔ ٹکلیلہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”کوئی گھبراہٹ والی بات نہیں ہے..... آپ اچھی طرح فردنگ کیا کریں۔

آپ نے اس سے قبل چیک اپ کرایا ہے؟“ ڈاکٹر ٹکلیلہ سے مخاطب تھا۔

ٹکلیلہ نے اثبات میں گردن سے اشارہ کیا۔

آپ کی اینیڈنٹ ڈاکٹر.....“

”ڈاکٹر عزیز.....“ ٹکلیلہ نے خائف آواز میں بتایا۔

”دیکھیں بہت ہے۔ آپ اپنا خیال رکھا کریں۔ ڈون میٹر.....“

بلال جو شاید کسی وجہ سے باہر تھا، پھر دروازے کے بیچ میں آ کھڑا ہوا تھا۔

”الپ.....“ ڈاکٹر ٹکلیلہ کی سمت اشارہ کر کے رشتہ پوچھ رہا تھا کہ اسی مناسبت سے کوئی بات کی جا سکے۔

نکالنے نے نظریں موڑ کر بلال کی طرف دیکھا۔

”بیٹا ہے ہمارا۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ مبادا ڈاکٹر کچھ بلال کے سامنے ہی کہہ دے۔

ڈاکٹر نے قدرے حیرانی سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”اچھی بات ہے۔ آپ اپنا خیال کیجئے۔“ اوس کے.....“ سنبھل کر گویا ہوا اور اپنا سامان اٹھانے لگا۔

”واٹس ٹریل ڈاکٹر.....“ بلال نے کانٹ لے لیے میں ڈاکٹر سے بظاہر لاپرواہی سے پوچھا۔

”کوئی نہیں.....“ وہ مسکرا دیا۔ “ٹھیک ہو جائیں گی۔“ بلال اٹنے پاؤں مڑ گیا۔

ڈاکٹر چلا گیا تھا۔

اور شکیلہ..... اپنی کلائی پر بلال کی انگلیاں محسوس کرتے ہوئے بے یقینی سے سوچ رہی تھی۔ کیا واقعی بلال کے

اس کے لئے منجائش پیدا ہو گئی ہے۔ ورنہ اس کی آنکھوں میں تو اس نے نفرت دیکھی تھی کہ اس کے مرنے سے

کوئی فرق نہ پڑتا۔

گویا اس کی محنت رنگ لاری تھی۔

ایک طمانیت بھرا احساس اس پر چھا گیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اسے کیا ”عارضہ“ لاحق ہے۔ اور وہ ڈیڑھ دو گھنٹے میں سنبھل جائے گی مگر جب بلال ڈاکٹر کو

تھا تو وہ اس لئے چپ رہی تھی کہ اسے اچھا لگ رہا تھا۔

اس نے دراز سے ایک سرخ ٹوٹ نکال کر ملازمہ کو دیا۔

”چھوٹے صاب کو دے دو۔“ اس نے فیس کی نیت سے دیا تھا۔

”بومیری جب میں ہے۔ وہ بھی ”صاحب“ ہی کا دیا ہوا ہے۔“ بلال کی آواز پر شکیلہ نے چونک کر دیکھا۔

کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اور پھر پرانی وضع میں تھا۔

مگر اب شکیلہ اس کے رویے کو سرسری لے رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل اس نے ایک اچھا مظاہرہ دیکھا تھا۔

قبول آج ہمارا سلام ہو جائے

نظر نظر سے ذرا ہمکلام ہو جائے

نوجوان کی آواز کا چاؤ کمرے میں پھیل گیا۔

نانکھ نے احسن کا بھیجا ہوا خوبصورت ٹوائن دن شپ ریکارڈر آن کیا تھا۔ اور ریڈیو کی سوئی یونچی جھمانے لگی تھی

خوبصورت نغمے نے اسے سوئی نکالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور اب وہ دھلے ہوئے کپڑوں کی تہہ بناتے ہوئے خود

ساتھ مگنکٹا نے لگی تھی۔

صفیہ دروازہ بند کر کے کمرے کے سامنے سے گزری تھیں۔ انہوں نے کبھی قدرے حیرانی سے مگنکٹا کی

دیکھا تھا۔ یہ اس گھر کا انقلابی واقعہ تھا۔ انہیں یاد نہیں پڑتا تھا کہ انہوں نے کبھی اپنی کسی بیٹی کو مگنکٹا سے ہونے سے

”نانکھ۔“ تمہارے بابا ہی گھر پر ہیں.....“ انہوں نے گویا تنبیہ کی۔

”آواز دھمی کرو۔ اور یہ شپ ریکارڈر چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے ہی لئے رکھا ہے۔ تمہارے بابا

پڑ گئی تو کیا پوچھیں گے نہیں کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ خودخواہ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ مگر کی ہر چیز ویسی لاتے ہیں۔“

انہوں نے کبھی کھلا پیٹ نہیں دیا کہ یہ کہہ سکیں کہ یہ قیمتی شپ ریکارڈر ہم نے خریدا ہے۔

نیکان کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لئے لہجہ بھی معمول سے ہٹ کر تھا۔

ایک جیسے کسی گہری نیند سے جاگی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے ماں کی سمت دیکھا۔ دل کے چور نے سہاسا دیا اور

لہجہ بہت محسوس ہوا۔

مراہی..... میں نے اس لئے چلا یا تھا کہ احسن بھائی نے خط میں لکھا تھا، یہ گھر کے لئے ہے۔ احمر کے لئے ہے۔

نہ جلدی سے ہلک نکال دیا۔

”وہ ڈی طرح لکھتا ہے۔ اگر چہ وہ تم لوگوں کی شادی بہاد کی نیت سے کچھ نہ کچھ رقم بھیجتا رہتا ہے۔

مردوسری چیزیں جو بھیجتا ہے۔ وہ بھی پیسوں ہی کی آتی ہیں۔ اس لئے اٹھا کر رکھ دو جی ہوں کہ وقت پر کام آئیں

اس کے کھنے سے کیا ہوتا ہے۔ بچہ ہے میرا..... پیسہ بنانے کی مشین تو نہیں ہے۔ تم لوگوں کو خود ہی احساس کرنا

ہے خدا معلوم کون سی گھڑی ہوگی۔ تمہارے باپ پلاٹا کھائیں گے۔ اور میں اپنے چاند کی صورت دیکھوں گی۔ اب

مل ملتی ہے۔ میرا صبر راپٹاں نہیں جائے گا۔“

”موجودہ سے ہٹ گئی تھیں..... اور احسن ان کی ہستی پر پھر چھا گیا تھا۔

بلال نے شپ ریکارڈر دوبارہ پیک کرنا شروع کر دیا۔ جیسے ماں کی دلجوئی کر رہی ہو۔ اسی دم احمر کتابیں لئے ہوئے

اٹل ہوا۔

”دیر ہو گئی بیٹا؟“ صفیہ نے محبت سے پوچھ کر دیکھا۔

”ہی ای..... وہیں اکیڈمی ہی میں دیر ہو گئی تھی۔“ احمر نے کتابیں رکھ کر ماں کو جواب دیا۔

”احسن کو فون کیا تھا بیٹا؟“

”ہی ای..... پچھلے ہفتے کیا تھا تو کہہ رہے تھے بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو بتایا بھی تھا میں نے۔ آج کیا تو پتا چلا بھائی

نہا دن سے آفس نہیں آ رہے۔“

”ہائے اللہ.....“ صفیہ کے ہول سا اٹھنے لگا۔ “اللہ کرے خیریت سے ہو۔

پہلے تو ہمارے پاس اس کا نمبر نہیں تھا۔ پتا نہیں اس میں اس نے کیا مصلحت ڈھونڈی تھی۔ شاید وہ تمہارے بابا جی کی

لٹا کے سبب احتیاط کر رہا تھا۔“

”ہاں..... اس نے لکھا بھی تو تھا کہ امی خدا کے لئے جذبات میں آ کر میری وجہ سے کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے گا کہ

میں بڑھاپے کا تڑپا شبنم بن جائے وقت کا انتظار کیجئے۔ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکلے گا۔“

”اگر اسی بات نے تو میرے قدم روک رکھے ہیں کہ جوان بیٹوں کا ساتھ ہے ورنہ میں اس سے ملے اسے دیکھے

دیکھتی کی؟“ اہائے شیخ صاحب خدا تمہیں سمجھے۔“ انہوں نے ہونٹ کاٹ کر جیسے اٹک روکے۔

”مگر اب میرا دل جا رہا ہے۔ کم از کم آواز ہی سن لوں..... نمبر دے دو مجھے کسی دن موقع نکال کر کر آؤں گی۔“ وہ

مراہی کی نظر آنے لگی تھیں۔

”ابو احمہ کے پاس شروع سے تھا۔ وہ تو احسن کے کہنے پر چھپائے ہوئے تھا کہ اس نے کہا تھا امی فون پر بات کریں

انڈر وئیں گی، بے چارہ ہو جائیں گی۔

ایک ایک روز احمر نے غلطی سے کہہ دیا تھا کہ بھائی جان کا نمبر ہے میرے پاس۔ اسے دھیان نہیں رہا تھا کیونکہ کافی

وقت گزار رہا تھا۔

اب منیہ ہر بختے اسے چپکے سے کچھ رقم دے کر کہتی تھیں۔ کہ وہ احسن کی خیریت معلوم کر آئے۔ احمر کی غصہ کی گفتگوں کر انہیں کچھ سکون آ جاتا تھا۔

”چلے گا می۔ آپ میرے دوست کے ہاں سے کر لیجیے گا۔“

”کیا کرنے کے پروگرام بن رہے ہیں صاحبزادے؟“ شیخ رحیم الدین سر پر ہی تو آ کھڑے ہوئے تھے۔ منیہ گم ہو گئی۔

”کیا صاحبزادے۔۔۔ میرا مطلب ہے بڑے اور ہونہار صاحبزادے سے رابطہ قائم کیے جا رہے ہیں؟“ نے اگر چہ ان کی گفتگو کا صرف یہ آخری جملہ نہ تھا۔ مگر ان کا ذہن اندازے لگانے میں بہت تیز تھا۔

انہوں نے غور سے نالندہ اور احمر کے دھواں دھواں چہرے دیکھے۔

”ارے بھئی، فون وون سے تمہاری کیا تسکین ہوگی۔۔۔ تم دو جوڑے اٹھا کر ہمیشہ کے لئے کیوں نہیں چلی جائیں۔“

ناہنجار کے پاس۔۔۔ وہ بہت چپا چپا کر بول رہے تھے۔

صفیہ خود کو سنبھالے پرسکون سے کھڑی تھیں۔

”بہت زیادہ گمان بھی گناہ ہوتے ہیں شیخ صاحب۔۔۔ جاؤ احمر تم اپنا کام کرو۔“

انہوں نے احمر کو جیسے رہا کیا۔

”نالندہ۔۔۔ تم روٹی ڈال لو۔۔۔ اندھیرا ہو گیا ہے۔“

وہ خود اتنا کھدھار ہے کہ راجھی طرح آپ کا مزاج کھتا ہے۔ اپنا تو اتنا پتا تک نہیں دیا اس نے۔“

صفیہ کو اس وقت پرسکون ماحول کی بہت ضرورت تھی۔ ان کی ذرا سی بے احتیاطی لڑکیوں کے حق میں وبال تھی۔ اس لئے وہ کڑوے گھونٹ بھر بھر ماحول کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

”پھر احمر دوست کے ہاں سے کیا کر دار رہا تھا؟ وہ ہونہار کھوکھ تھا۔“

”بات تو فون کی ہو رہی تھی۔ یہ درست ہے۔ مگر سردار بھائی کو فون کرنے کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔“

”کیوں بھئی، اب کون سا تماشائی رہ گیا ہے۔ تمہارے بیٹے نے تو فلک میں نشان گاڑ دیے ہیں۔“

بیٹے نے زخم دیے ہیں۔ تم تک چھڑ کوگی؟“ وہ جیسے ان کے دل پر نشانے باندھ رہے تھے۔

”ارے وہ تمہاری سگی بہن ہے۔ کچھ تم کرو اس پر۔“

”میں۔۔۔ ذرا معلوم کرنا چاہ رہی تھی کہ۔۔۔“

”کہہ کتنے لوگ ان پرنس چکے ہیں۔ اور کتنے باقی ہیں ان پر ہنسنے کے لئے۔ یہی ناں؟“ وہ غضب ناک ہوا۔

بات کاٹ دی تھی۔

”خدا کے لئے شیخ صاحب۔“ وہ عاجزی ہو گئیں۔

”تم کو تو لازم ہے کہ ایسی اولاد پر چار حرف بھیجو۔ اور قیامت تک دودھ نہ بخشو۔ اس کے تصور سے بھی اس طرح۔“

کر دجیسے ناپاک ہونے کا خدشہ ہو۔ نف ہے۔ ہونہ۔“

وہ پشت پر ہاتھ باندھ کر، بولتے بڑبڑاتے باہر نکل گئے۔

صفیہ آقا اندھ کوٹے سے تیز کر رہی تھیں۔

رچوہ احسن کے اس اقدام کے حق میں نہیں تھیں جو اس نے شہوار سے سلسلے میں کیا تھا مگر وہ اس کا پس منظر بھی دیکھ رہا تھا۔ ان کے دل کو یقین تھا کہ شیخ صاحب کے الجھائے ہوئے ماحول میں اس سے زیادہ کی بھی امید کی جاسکتی ہے۔

ان ہی کا بیٹا ہے۔ انتہا پسندی اسے ورثے میں ملی ہے۔

شہوار کی طور پر انہیں کچھ سکون سا محسوس ہو رہا تھا کہ احسن اب تنہا نہیں ہے۔ یقیناً شہوار اس کا خیال رکھ رہی ہوگی۔

ان کے تو اپنے خواب کر چکی کر چکی ہوئے تھے۔

اپنے ہاتھوں سے لانے کے خواب۔۔۔

نہ بھانجی کو سہاگن کے روپ میں اپنے گھر میں چلے پھرتے دیکھنے کے خواب۔۔۔ بیٹے کی بارات۔۔۔ دولہا کی

نے کا اعزاز۔۔۔ کیا کیا خواب انہوں نے نہیں سچائے تھے۔

لوں کی ہلاکت خیز آندھیوں کے بیچ یہ خواب انہیں تقویت بخشا کرتے تھے۔

مگر وہ ہر طرح سے شیخ صاحب کو اور سردار بھائی کو ان تمام حالات کا ذمہ دار سمجھتی تھیں۔

شیخ صاحب کے بھڑکانے کے باوصف یہ سردار محبت علی کا فرض بننا تھا کہ وہ صفیہ سے تمام معاملات پر گفتگو کرتے،

معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔

بہنوں نے وہی حقیقتیں معلوم کرنے کی جدوجہد کی جو احسن کے خلاف تھیں اور خلاف بھی صرف گھر کے اندرونی

نیکی جہت تھیں۔

ان کو کیا یہ فکرات کم تھے کہ روٹی کی ماں نے بھی حالات کو پیچیدہ بنانے میں اپنا کردار ادا کر دیا تھا۔ وہ کل شام سے

نہ موقع کی مناسبت سے بات کا بہانہ تلاش کر رہی تھیں۔

اور پیچیدگیاں پھر عود کر آ گئی تھیں۔

نالندہ بول لگاتی، نہ بات یہاں تک پہنچتی۔

وہ لاتے دلوں سے صبر و ضبط سے حالات کو سدھارنے میں لگی ہوئی تھیں۔ شیخ صاحب کے سامنے بھولے سے بھی

کا نہ کر نہیں کرتی تھیں۔

مرف اس لئے کہ شیخ صاحب کچھ ٹھنڈے پڑیں تو وہ گفتگو کر کے حسب منشاء نتائج حاصل کریں۔

آخر تک تک بیٹیاں بیٹھی رہیں گی؟

ماں انہیں نالندہ کی گفتگو سے یاد آگئی۔ اس کے بدلے بدلے انداز یاد آ گئے۔

کھن نالندہ کو یہ تمام واقعات معلوم تو نہیں ہیں۔

کیا اس معاملے میں اس کا کوئی حصہ تو نہیں ہے۔ انہیں طرح طرح کے دہم ستانے گئے۔

انہیں ایک دم وحیان آیا۔

کے جب وہ رازی کے رشتے کے سلسلے میں اسے بتا رہی تھیں کہ نبیلہ کے لئے آیا ہوا ہے تو اس نے اس طرح کے

تجربیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا جس طرح بیلا اور ارحیلہ کے سلسلے میں کیا تھا۔

نور ان رشتوں پر ان کے ساتھ بیٹھ کر رات گئے تک باتیں کی تھیں۔

کے سب کچھ پتا ہے؟

نور تو کبھی روٹی کے ہاں نہیں گئی۔ مہندی والے روز بھی وہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر لے گئی تھیں۔ رازی بھی کبھی ان



کے گھر نہیں آیا۔۔۔۔۔

اس محلے کی لڑکیوں کی ہمت نہیں پڑتی تھی شیخ صاحب کی وجہ سے کہ وہ اس گھر میں بے دھڑک آجائیں۔  
وہ تو پھر لڑکا تھا۔

پھر اس نے کس طرح نائلہ کے لئے اتنا قطعی فیصلہ کر لیا؟

سوچ سوچ کر ان کے اعصاب شل ہو گئے۔

تو وہ تھک کر بستر وغیرہ لگانے میں مصروف ہو گئیں۔

نبیلہ اور نائلہ دونوں مل کر رات کی روٹی پکایا کرتی تھیں۔ پہلے خشک لہ اور نائلہ پکاتی تھیں۔ ایک وقت کا سارا  
انٹیلال کرتی رات کرتی تھیں۔ اور دوسرے وقت کا نبیلہ صبح کا ناشتہ منیہ ہمیشہ سے خود ہی تیار کرتی تھی کیونکہ سب  
جاتے تھے اور صبح اپنی تیاریوں میں مصروف ہوتے تھے۔

وہ اتنی بیٹیوں کی ماں تھیں مگر برابر ان کے ساتھ گلی پر رہتی تھیں۔ انہوں نے کسی کام کا بوجھ لڑکیوں پر نہیں ڈالا  
اور کام کی تقسیم اس طرح کر دی تھی کہ سب ہی مطمئن اور ہلکے پھلکے رہتے تھے۔

اس وقت نبیلہ اور نائلہ کھڑی ہوئی روٹیاں پکارتی تھیں اور باتیں بھی کر رہی تھیں۔  
نائلہ کیونکہ خواب سے جاگ چکی تھی اس لئے نبیلہ کے سامنے کچھ چوری چوری تھی۔ اور اپنے آپ کو ملانہ

تھی۔

مجھے صرف یہ ہی یاد رہا کہ کسی نے مجھے جانا۔۔۔۔۔ اور یہ بھول گئی کہ جو کچھ وہ اس کا اثر نبیلہ پر کیا ہوگا؟ وہ سوچ  
کسی بدترین خود غرضی ہے۔۔۔۔۔ اس نے نبیلہ کی سمت دیکھا۔

”کن سوچوں میں ہو؟“ نبیلہ مسکرائی۔ تب اسے یاد آیا کہ نبیلہ کل سے اب تک معمول سے زیادہ مسکرائی۔  
دل جیسے کٹ گیا۔

”یہ آپ نے کیا قیامت اٹھائی ہے؟“ وہ دل ہی دل میں روٹی کی ماں سے مخاطب ہوئی۔

”کچھ نہیں آپا۔۔۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔۔۔ اس نے روٹی اتار کر دوسرے خان میں محفوظ کی۔

”یہ کل روٹی کی امی پھر آئی تھیں۔۔۔۔۔ خیریت؟“ نبیلہ جیسے تھک گئی تھی انتظار کر کے کہ نائلہ اس سے اس خام  
پر بات کرے۔

نائلہ کا دل جیسے بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ کتنے تکلیف دے مر حلقے ہونا باقی ہیں۔۔۔۔۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟

”پتا نہیں آپا۔۔۔۔۔ شاید ایسے ہی آگئی ہوں۔“ اس نے نظر پچا کر جلدی سے بیڑا بنانا شروع کر دیا۔

”امی نے تو جواب کے لئے انہیں انتظار کرنے کو کہہ دیا تھا۔“ نبیلہ سے دوستانہ ماحول میں ہر بات کر لیتی تھی  
”میرے خیال میں وہ جواب کی وجہ سے تو نہیں آئی تھیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو امی تو یہ نہ کہ ضرور کرتے

نے نبیلہ کی تو بے پروائی ہوئی روٹی جلدی سے بیٹکنا شروع کر دی۔

نبیلہ خاموش ہو گئی۔

”آپا۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھو؟“ نائلہ کچھ ہچکچا رہی تھی۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ ہنکارے کی صورت میں اجازت ملی۔

”آپ کو کیسے لگتے ہیں، روٹی کے گھر والے؟“

جو صورت سادہ رنگ نبیلہ کے چہرے پر آ کر ظہر گیا۔

”ہی۔۔۔۔۔ یہ تو بڑے ہی بہتر جاتے ہیں کہ کیا اچھا ہے، کیا برا ہے۔ ہمارے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔“ اس نے  
ایکایا۔

”آپ کے بھی تو کچھ خیالات ہوں گے۔ کوئی رائے ہوگی ان لوگوں کے بارے میں؟“

”ہی کوئی رائے نہیں۔۔۔۔۔ میری امی بہت سمجھدار ہیں۔ مجھے ان کا ہر فیصلہ قبول ہے۔ جس کو وہ اچھا کہہ دیں،  
وہ ایک وہ اچھا ہے۔ جس کو برا کہہ دیں، وہ برا ہے۔۔۔۔۔ پس۔“

”بڑی سادہ ان ہیں آپ۔“ نائلہ زبردستی مسکرائی۔

”آپ جتنی ہیں۔“ پیچھے سے اینٹلا کی آواز آئی۔ ”اس قدر تا بعد از جو ہیں۔“

”اں چٹک پڑیں۔۔۔۔۔“

”یہ کیا بزرگ روڑیوں بنی جاسوسی کر رہی ہو؟“ نبیلہ جھینپ گئی۔

”یہ تو امی ابھی آئی ہوں۔ امی کہہ رہی ہیں جلدی سے کھانا لگا لو۔“ وہ شرارت سے مسکرائی تھی۔

”اں۔۔۔۔۔ غافٹ پیلا کے ساتھ مل کر لگاؤ۔۔۔۔۔ آج ایک بڑا اچھا ذرا رہا بھی آئے گا۔“

”یہ بڑی مستعد ہو گئی۔

”یہ سے رہا نہیں جا رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنے ذہن کو بوجھ سے جلد از جلد آزاد کر دینا چاہتی تھی۔

تاتے تو ٹھیک طرح سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔

لحائے کامر حل تمام ہوا۔

”ایکائی دی دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔ تو منیہ ٹی وی کی آواز کی وجہ سے محبت پر نماز پڑھنے چلی گئیں۔ آج وہ  
ات کے موڈ میں تھیں۔ ان پریشان کن حالات میں اللہ ہی کی مدد پر نظر جا کر ٹھہرتی تھی۔ اسی کے بھر دے سے کچھ  
دیکھ گئی۔

”نہیں لگ کر۔۔۔۔۔ خشک لہ سے دوری۔۔۔۔۔ ہر چند کہ اس کی سکون بھری زندگی کی خبریں انہیں ملتی رہتی تھیں مگر بے دیکھے دل  
اگر روٹی کی ماں کی پھیلائی ہوئی پیچیدگی۔۔۔۔۔ اور اس کے مقابل شیخ رحیم الدین کا قطعی اور حتمی انداز زندگی۔

لہ کے اعصاب جھٹکنے لگے تھے۔

”پاسے خضوع و خشوع سے عبادت میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”نائلہ وہ نماز کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے روٹی کے گھر کی بالکنی میں کسی کو کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ مگر اندھیرا  
سکے سب پہچان نہیں سکی تھیں۔

”نبیلہ وہ چار شیش پڑھ چکیں، تب بھی کوئی وہیں کھڑا تھا۔

”نائلہ کہ جب وہ چار فرض پڑھ کر رنج میں مصروف ہو گئیں۔

”لکھنؤ موجود تھا۔

”نائلہ نے کون سا کتاب یا اخبار پڑھنا تھا جو روشنی کی ضرورت ہوتی۔ اس لئے لائٹ نہیں جلائی تھی۔ نماز کے لئے  
نائلہ روشنی کافی تھی۔ اماں کی راتیں چل رہی تھیں۔ تاروں کی روشنی بڑھی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

”نائلہ سامنے بالکنی کی ٹیوب چلی۔۔۔۔۔ ریلنگ پر کھدیاں جمائے رازی سلسل ان کی چھت کی سمت متوجہ تھا۔ ادھر بالکنی  
”نائلہ۔۔۔۔۔ اور ان کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

ناہ اللہ بہت خوبصورت ڈیزائن والا ہے تم نے۔“ پھر اصرار دہر دیکھ کر گویا ہوئی ”ایک سوئٹرا حسن کا بھی بنا دیتا۔“  
 بابا!۔۔۔ آپ اون لاد بیجے گا میں منافات تیار کر دوں گی۔۔۔۔۔ احسن بھائی بہت خوش ہوں گے۔“ اسے بھائی کے  
 پیسے نئی زندگی ملی۔

یوں سا ہونا چاہیے؟“ وہ نالکہ سے پوچھ رہی تھیں۔  
 سن بھائی پر تو تمام ہی رنگ اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے سال جو آپ نے ان کا بلیک سوئٹر تھا کتنا چٹا تھا ان پر۔۔۔۔۔“  
 ماہا! اللہ۔۔۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے۔ وہ تو جو بہن لے جتا ہے نالکہ بیٹے۔۔۔۔۔ جب یہ سب لوگ سو جائیں  
 اری بات سننا۔ میرے کمرے میں آ جانا۔“  
 نے قدرے چونک کر ان کی شکل دیکھی۔ ”خیریت امی۔۔۔۔۔؟“  
 نا ایک ضروری مسئلے پر صلاح دشورہ کرنا ہے۔“ وہ آہستگی سے کہتی ہوئی اپنے کمرے کی سمت پلٹ گئیں نالکہ کی  
 ناکا ملی تھا اور سلاخیاں ایک دوسرے سے الگ۔ وہ جاتی ہوئی ماں کو بخور دیکھ رہی تھی۔

ہائے اسے یوں دیکھا جیسے اس کے وجود پر شبہ ہو۔  
 ہائے جاتی کار کو دیکھا۔  
 ہا۔۔۔۔۔!!!!“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر شہوار کو دوبارہ دیکھا۔  
 لخت حیرانی خوف میں بدل گئی۔ گیٹ لائٹ کی روشنی میں وہ اس کے تاثرات بخوبی دیکھ سکتی تھی۔  
 ا۔۔۔۔۔ میں ہوں تمہاری آپا۔۔۔۔۔ راستہ دو۔۔۔۔۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔  
 لہجے ہوش میں آ گیا۔ اور ایک دم مستعدی سے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے دروازے میں مضبوطی سے ڈٹ

گیا۔ نہیں۔۔۔۔۔ پلیز آپا۔۔۔۔۔ اس نے کڑیل جوان بھائی کو سراپا خوف پایا۔  
 کیا نہیں نہیں۔۔۔۔۔؟“ وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔  
 کون ہے نوفل۔۔۔۔۔؟“ معاس نے باپ کی آواز سنی۔  
 لے جیسے اسے مکمل اپنی اوٹ میں لے لیا۔۔۔۔۔ کوئی نہیں بابا۔ میرا دوست ہے عرفان۔“  
 مار ساکت کھڑی نوفل کی ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔  
 سائے سے ہٹو نوفل۔“ وہ جیسے کسی خیال سے چونک پڑی۔  
 نہیں آپا۔۔۔۔۔ آپ اندر داخل نہیں ہو سکتیں۔۔۔۔۔ اگر واقعی آپ کو ہم سے تھوڑی بہت محبت ہے۔“ وہ قطعی انداز میں

کہہ رہی تھی۔  
 نوں کیوں نوفل۔۔۔۔۔؟ وہ جیسے بے دم ہو کر رہ گئی۔  
 سوال کا جواب آپ کے پاس موجود ہے آپا۔“ وہ پست آواز میں کہہ رہا تھا۔  
 غراب میں آگئی ہوں نوفل۔“ وہ رونے کو ہو گئی۔  
 لکی نالکہ نہیں آپا۔“ وہ بے چارگی سے گویا ہوا۔  
 کمرے پاس کوئی بنا نہیں ہے نوفل۔ میں کہیں اور نہیں جا سکتی۔“ آخرا شک بے قابو ہو ہی گئے۔

انہوں نے اپنی تمام تر قوت اردی کو مجتمع کر کے بغیر رکھتیں ادا کیں۔  
 لیکن نماز مکمل ہوتے ہی ان کی نگاہیں پھر سامنے اٹھ گئیں۔۔۔۔۔ سامنے رازی ہنوز موجود تھا۔  
 وہ جائے نماز اٹھا کر منڈیر تک چلی آئیں۔۔۔۔۔ سامنے گھر کی جلتی ہوئی روشنیاں ان کے چہرے پر پڑیں۔  
 بظاہر وہ جائے نماز تہہ کرنے میں مصروف تھیں مگر توجہ مکمل طور سامنے تھے۔  
 ان کے روشنی میں آتے ہی رازی ایک دم اندر پلٹ گیا تھا۔ اور بائیں کی شوب بھی بند ہو گئی تھی۔  
 وہ آہستہ آہستہ زینہ طے کرنے لگیں۔  
 ایک زینہ وہ اپنے باطن میں بھی طے کر رہی تھیں۔  
 ایک طرف ان کی قوت فیصلہ بحال ہوئی تو دوسری طرف نئے امتحان کا مرحلہ تھا۔  
 کاش ڈاکٹر کی والدہ نبیلہ کو پسند کر لیتیں تو نالکہ کا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہو جاتا۔  
 وہ نیچے آئیں تو ڈرامے کا اختتامی منظر چل رہا تھا اور لڑکیاں پورے خضوع و خشوع سے اسکرین پر نظریں

تھیں۔  
 نالکہ ”ناظرین“ میں بھی بچے بچے ہنسی ہننگ میں مشغول تھی۔ منیہ نے کھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔  
 انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اسے ڈرامے سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔ ہاتھ تنگ میں مصروف تھے۔ مگر غائب  
 کے چہرے سے ظاہر تھی۔  
 ”نالکہ بیٹے!“

”جی امی۔“ وہ جیسے کسی خواب سے چونک اٹھی۔ وہ گویا۔۔۔۔۔ صبح سمجھ رہی تھیں۔ اسے تو ان کی آمد کی بھی خبر نہ  
 ”کتنی بات ہے ابھی۔۔۔۔۔؟“ ان کا اشارہ سوئٹر کی طرف تھا۔  
 ”ابھی تو ایک آستین باقی ہے امی۔“ وہ دوبارہ مصروف ہوتے ہوئے گویا ہوئی۔  
 وہ اس کے نزدیک چلی آئیں۔

نوفل نے جیسے ہی طرح چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپا.....!!!“

”ہاں نوفل..... سچ کہہ رہی ہوں۔“

نوفل گیٹ سے باہر آ گیا اور پیچھے سے گیٹ بند کر دیا۔

روشنی کی سمت نکلائی کر کے اس نے وقت دیکھا۔

”آئیے.....!“ اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

”ہائیں.....“ اس نے کڑ بڑا کر نوفل کو دیکھا۔

”مگر کہاں.....؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”خدا کے لئے نوفل..... تم تو میرے اپنے ہو۔ مجھے مزید در بدر نہ کرو۔“ وہ منت سے بولی۔

”آپا..... آپ میری اپنی ہیں تب ہی تو کہہ رہا ہوں میرے ساتھ آئیے۔ پلیز آپا.....“

اس نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیے۔ شہوار ناچار اس کے پیچھے ہوئی۔

ایک طویل سڑک دونوں نے طے کی تھی اور غالباً دو تین گلیاں..... پھر نوفل ایک عمارت سے سامنے ٹھہر کر

شہوار نے عمارت پر نگاہ دوڑائی..... ”شفق ان کیڈی.....“ بڑا سا بورڈ عمارت کی پیشانی پر چسپاں تھا۔

”ایک منٹ آپ یہیں ٹھہریے آپا..... میں ابھی آیا۔“

نوفل اندر چلا گیا۔ اور چند منٹوں بعد ہی واپس آ گیا..... ”آئیے آپا۔“

شہوار حیران اور پریشان اس کے پیچھے چل پڑی۔

نوفل فوراً ہی ایک کمرے میں داخل ہو گیا..... غالباً یہ آفس تھا۔ بڑی سی آفس ٹیبل سامنے ہی تھی جس

ٹیبل لیسٹ اور دیگر دفتری لوازمات قریب سے سجے تھے۔ ٹیبل کے ایک طرف ریو الویگ چیزے، دوسری طرف

کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ بھی موجود تھا۔

نوفل نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا اور پنگھلا چلا دیا۔

”مجھے سر دی لگ رہی ہے نوفل، اسے بند کر دو۔“ شہوار نے اپنے اندر حرارت بڑھتی ہوئی محسوس کی تھی۔

کر پنگھلا بند کر دیا۔

”آپا..... اب آپ اطمینان سے مجھے ہر بات، ہر واقعہ بتائیے۔“ وہ اس کے نزدیک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”جب احسن بھائی آپ کو اتنے اہتمام سے لے گئے تھے اور ایک قطعی فیصلہ ہو گیا تھا تو پھر..... اب.....“

ہے.....؟“

وہ سوال جو دیر سے اس کے ذہن میں متحرک تھا لبوں پر آ گیا۔ شہوار نے ہونٹ کاٹ کر جیسے انک روکے

”احسن کا اقدام میری مرضی کے خلاف تھا نوفل..... میں ان کے ساتھ ایڈ جسٹ نہیں ہو سکتی تھی۔“

ذات سے وہ خوشی مل سکتی تھی۔ جو وہ چاہتے تھے۔“

”مگر آپا..... آپ بابا کو جانتی ہیں، ان کا مزاج مد نظر رکھتے ہوئے آپ کو سمجھوتا کر لینا چاہیے تھا۔“

وہ اس سے خاصا چھوٹا تھا مگر بڑے بزرگ کا انداز میں اسے سمجھا رہا تھا۔

”میں دن رات ضمیر کی لعنت ملامت سن کر کس خوشی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتی تھی۔“ وہ کرب سے کہہ رہی

”نوفل ججک کر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔“

”ہاں..... کیا..... مگر.....؟“ نوفل کی ادھوری بات اسے بے چین کر گئی۔

”حسن بھائی کی کامیابی آپ کے تعاون کا نتیجہ تھی۔ معاف کیجئے گا آپا.....“

”میں سے یہ سب کہتے ہوئے حیا آ رہی تھی۔“

لی عاقبت نا افسانہ..... غلٹ، جذباتیت..... اور احسن سے کچھ بلند توقعات نے مجھ سے یہ غلطی سرزد کرائی

پہل کو مجھ سے سرزد ہوئی۔ مجھے احسن سے اس درجہ ہستی کی امید نہیں تھی نوفل..... میں نے تو محض اس قید سے

فرجٹ میں ایک فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اس وقت اس فیصلے کی ہولناکی کا اندازہ نہیں تھا۔“

”میں نے نظریں چرا رہی تھی۔“

اب کیا ہوا.....؟“ نوفل کے چہرے پر ہلاکی تشویش تھی۔

”میں مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ یہی میری بے گناہی کا ثبوت بھی ہے۔ اگر اس خطا میں میری دلی رضا

ماہوتی تو میں..... ان کے ساتھ نباہ نہ لیتی.....؟“ وہ جیسے بھائی پر اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہ رہی تھی۔

”آپا..... میں آپ سے پورے یقین سے کہہ رہا ہوں آپ بابا کو کسی طرح بھی قائل نہیں کر سکتیں۔“

نوفل دیر پہلے جو آپ نے فون کیا تھا۔ آپ کو اندازہ نہیں..... بابا نے گھر میں قیامت برپا کی..... انہوں نے

بابا کو نہ کہا۔ کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی کہ وہ امی کا ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیتے۔ آپ کا فون اٹھینا کرنے پر بھی پابندی

ارٹے دہل کر نوفل کا چہرہ دیکھا۔

”تو میں نے اور دانیال نے معاملہ سنبھالا۔ شاید کچھ اثر نیلو فر آپ کی روئے دھونے کا ہوا ہو..... بابا اپنے آپ

نے.....“

بابا کچھ اثر میری بے چارگی کا بھی ہو جائے نوفل۔“ وہ آرزوگی سے گویا ہوئی۔

”آپ کس خواب میں ہیں..... آپ کو ہم سب کی خاطر قربانی دینا ہی ہوگی۔“

”اں..... میں مرنے کے لئے تیار ہوں..... نوفل..... مجھے اب اس سے آگے کچھ نہیں سو جتا۔ بابا مجھے مار

اٹھ سکون مل جائے۔“ وہ جیسے ہنسی ہوا۔

”حسن اور بابا..... ایک خیر سے اٹھے ہوئے دو وجود ہیں نوفل..... میں احسن کے پاس کسی قیمت پر نہیں جاسکتی

بابا کے ہاتھوں کا کسی اور بھانے موت منظور ہے۔ مگر میں ضمیر کی خلش کے ہمراہ احسن کے ساتھ زندگی نہیں گزار

سکتا.....“

”مگر آپ کو معاف نہیں کریں گے۔ ان کی غیرت وانا کا مسئلہ بن چکا ہے۔ ان کی جنگ اب براہ راست

مائل سے ہے۔“

”نوفل رہے..... مگر میں احسن کے پاس نہیں جاؤں گی۔“

”احسن شش ماہ پرست اور خود دار ہے تو میں بھی سردار محبت علی خان کی بیٹی ہوں۔“

”لے لے لے مجھے میں عزیمت دار آتا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے والی ڈر شہوار نہیں تھی..... ڈری ڈری..... ردی ردی۔“

”کیا آپ نے باضابطہ تعلق ختم کر لیا ہے؟“ نوفل اس کے قطعی اعداد کے بعد انتہائی پریشان نظر آنے لگا۔  
 ”جو چاہے سمجھ لو۔“ وہ ناراضگی کے انداز میں گویا ہوئی۔  
 ”میرا مطلب ہے آپ۔ احسن بھائی نے آپ کو.....“  
 ”نہیں۔ فی الحال ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیا تمہارے لیے یہ بہت نہیں کہ میں کسی بھی قیمت پر  
 نہیں جاؤں گی۔“ وہ سختی سے گویا ہوئی۔

”آپ..... میں اپنا گھر بناؤں گا تاں تو اسے بھٹ آپ کے لئے کھلا رکھوں گا۔ میں جانتا ہوں میری آپ  
 کے لئے کاغذ نہیں خرید سکتی۔ میں آپ کی بے گناہی پر یقین کرتا ہوں میری زندگی کا بہت سا حصہ آپ کے ساتھ  
 میں آپ کے حراج اور فطرت کے ہر ہر روپ سے واقف ہوں۔  
 مگر..... وہ رک گیا۔

”مگر.....؟ وہ جو نوفل کے منہ سے اپنے بارے میں مثبت رائے سن کر عجیب سی طاقت محسوس کرنے لگی  
 کانپ کر رہ گئی۔  
 ”مگر آپ..... اب آپ کے جانے سے سب سے زیادہ نقصان امی کو پہنچے گا۔ کیا آپ کو یہ منظور ہوگا؟  
 چہرے پر نوجوانی کی چمک کے بجائے ٹھنڈی کا دھواں تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔

”ہاں..... یہ تو جیسے پتا ہے۔ اس معاشرے کا مرد ایک تڑپ پتہ محفوظ رکھتا ہے۔ اور جہاں اسے ہار کا  
 دیتا ہے۔ وہ یہ کارڈ استعمال کرتا ہے۔ میں اپنی امی کو اپنے پیارے بہن بھائیوں کو کسی امتحان میں نہیں ڈالتا  
 راہ دکھاؤ نوفل میں اب کہاں جاؤں؟..... یہ یاد رہے کہ میں احسن کے پاس جانے کے بجائے فٹ پاتھ  
 کروں گی۔“

آپ..... سنا ہے ٹھیکہ بائی کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ خالو جان کی مرضی اور پسند سے۔“  
 نوفل بہت دھیمی آواز میں اس سے بات کر رہا تھا۔  
 ”اور یہ بھی کہ وہ بھی کراچی میں رہتی ہیں۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے..... میں ٹھیکہ کے پاس چلی جاؤں؟ ٹھیکہ میری بہن تھی مگر اس کے شوہر ہم  
 نئے اور اجنبی ہیں۔ وہ ان کا گھر ہے۔ اور یوں بھی میں ٹھیکہ کے پاس جانا پسند نہیں کروں گی۔ اس کی تمام  
 اپنے سفاک اور بے رحم انسانیت سے عاری بھائی کے ساتھ ہیں۔“  
 وہ بے حد سخت ہو گئی۔

”مگر آپ یوں کب تک گزارا ہوگا..... نہ باپ..... نہ شوہر..... آپ آپ کا وہ مجھے زندگی بھر خوش نہیں  
 گا۔“ نوفل کی آنکھیں بھج بھج گئیں۔  
 شوہار تو جیسے تڑپ اٹھی۔

”میں تمہاری بہن کب ہوں؟ میں تو مسائل کا انبار ہوں۔ میرے پیارے بھائی۔“  
 اس نے نوفل کا ہاتھ بہت پیار سے تمام کر بڑے کرب سے کہا۔

”کیا واقعی آپ..... اب زندگی بھر مجھ سے نفرت کرتے رہیں گے؟“ وہ انتہائی حسرت سے بھائی کا  
 پوچھ رہی تھی۔

آپ..... مجھے اس وقت صرف یہ فکر ہے کہ میں آپ کی جائے پناہ کہاں تلاش کریں..... ایک منٹ..... میں ذرا  
 ن کر دوں۔ بغیر اطلاع کے آ گیا ہوں۔ وہ سخت پریشان ہوں گی۔“  
 سے معاف آ دیا۔  
 فوریہ انیس سال کے لڑکے کے چہرے پر آقا ناہرس طے ہو رہے تھے۔  
 ہاتھ کفوں کرنے لگا۔

امی.....! میں اپنے دوست کے ہاں سے بول رہا ہوں۔“  
 دوسری طرف فون ماں ہی نے اٹھایا تھا۔

”مجھے امیر منی آنا پڑا۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔“  
 ”آپ نہیں جانتیں، وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ گھر پر بھی نہیں آیا۔“  
 ”آپ پریشان نہ ہو جائیے گا۔ مجھے دیر ہو سکتی ہے۔“

”سوری امی..... مجھے دھیان نہیں رہا..... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“  
 شوہار رنگ و حسرت سے نوفل کو ماں سے جھگڑا م نہ کچھ ہی تھی۔  
 اسے اٹھایا، ایک ہی دم بڑے نقصان کا احساس ہوا۔

جی چاہا دھاڑیں مار مار کر رو دے۔  
 مگر اس نے بہت ضبط کیا۔

نوفل اس کے قریب تھا..... اس کے دل کو عجیب سی تقویت حاصل تھی۔ مگر یہ سوچ بھی آ رہی تھی..... اس کا ساتھ بھی  
 ہیک.....؟

نوفل فون بند کر کے پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ..... صرف ایک محل ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ میری بات مان لیں۔“  
 شوہار نے ذرا ڈر کر نوفل کی شکل دیکھی۔

”آپ! اس کے علاوہ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔“  
 ”کھو.....“ شوہار کا دل ڈوبنے لگا۔

”آپ مفید خالہ کے پاس چلی جائیں۔“  
 ”نہیں..... نہیں..... احسن سمجھیں گے.....“ وہ جیسے بڑک کر بولی تھی۔

”مجھے نہ سمجھے ان کو..... جو چاہے۔“

مگر آپ جب آپ ان کو احسن بھائی کی تمام ”کارگزاری“ بتائیں گی تو وہ آپ کے لئے بہت کچھ کر سکیں گی۔  
 لیکن ہے وہ باپا کا آپ کے حق میں کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور آپ ہر خوف و خطر سے نجات پا کر ہمارے  
 لا آ جائیں۔ یقین کیجیے اس وقت صرف وہی آپ کے بہت کام آ سکتی ہیں۔“

شوہار کے دل میں اس کی تجویز اتر رہی تھی۔ مگر وہی کا راستہ وہاں سے آسان ہو سکتا تھا۔  
 ”مگر میں نے تو ابھی اتنی دور کا سفر نہیں کیا۔ نوفل.....“ اسے نئی پریشانی لاحق ہوئی۔

”میں یہاں سے آپ کو پلٹیں میں بھادوں گا اور اگر کو اس کے دوست کے ذریعے پہنچ بھیج دوں گا۔ وہ انیر پورٹ

سے آپ کو لے جائے گا۔

آپا..... فیصلہ جلد کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو یا پانچ بجے بھی گھر سے نکال دیں۔ بہت دیر ہو جائے گی۔“

شہوار نے غور سے نوفل کی شکل دیکھی۔ اس کی وجہ سے اس کا بھائی سخت مشکل میں تھا۔ اسے ترس آ گیا ہے بچنے والے نقصان میں حصہ دار تھا مگر ہر بات بھلائے اس وقت اس کے ساتھ تھا۔ اسے بھائی پر ٹوٹ کر پیا (پاپا)..... آپ باپ ہیں اور مجھے نہیں سمجھتے..... اور یہ بھائی ہے.....

”ٹھیک ہے نوفل..... میرے پیارے بھائی میں تمہیں مزید پریشان نہیں کروں گی۔ جو تم کہو گے میں کروں اگر چہ اندیشے مجھے ہولناک ہے۔“

”گھر نہ کریں آپا..... انشاء اللہ صفیہ خالہ آپ کے بے حد کام آئیں گی۔ وہ بہت مہربان اور سمجھدار ہیں۔ کھڑا ہوا۔

”آپ ایک منٹ ٹھہریے میں عرفان سے کچھ پیسے لے کر آتا ہوں۔ یہ اکیڈمی عرفان کے بڑے بھائی ہے۔ وہ کسی کورس کے سلسلے میں امریکہ گئے ہوئے ہیں ان کی غیر موجودگی میں عرفان ہی یہاں کا انتظام چلا رہا ہے۔ اکانومی کی سیٹ تو ملنا مشکل ہوگی۔ فرسٹ کلاس میں البتہ ضرور مل جائے گی۔

وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں کہہ کر آ کر بڑھا۔

”نوفل.....! شہوار نے اسے پکارا۔

وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

تم اتنی ساری رقم عرفان کو کس طرح واپس کرو گے.....؟ کو یہ چوڑیاں رکھ لو۔“

وہ ٹہینہ کی دی ہوئی چوڑیاں کلائی سے اتارنے لگی۔

کیا کر رہی ہیں آپا..... دے دوں گا کسی نہ کسی طرح۔ مرد ہوں آپا۔ کچھ نہ کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے بہن کے سے جیسے دکھ ہوا تھا۔ ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

شہوار صوفے پر بیٹھ کر دروازے کو کھولنے لگی۔

اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں گھوم رہا تھا۔ اچھی طرح سبق سکھاؤں گی۔ احسن!

تم نے مجھے کنزرو اور بزدل سمجھ کر ہی تو یہ ستم توڑا ہے۔ اس کا دل بھرا آیا۔

پانچ دس منٹ کے وقفے کے بعد نوفل آ گیا تھا۔

”آئیے آپا۔“

شہوار جلدی سے کھڑی ہوئی..... اچھی طرح چادر لپیٹی..... اور نوفل کے پیچھے چل پڑا۔

راہداری میں چند لڑکے کھڑے تھے ان میں سے ایک آگے بڑھا۔

السلام علیکم۔

یہ میری آپا ہیں عرفان۔

شہوار نے زبردستی مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔

”یہ چابی نوٹوفل.....“ عرفان نے کی رنگ اس کی سمت بڑھائی۔

تھیں گس اے لوٹ عرفان۔ نوفل نے شکریہ ادا کیا۔

کیا تم نے عرفان کو سب کچھ بتا دیا ہے؟ شہوار نے پوچھا۔

نوفل عرفان کی بایک دھکیل کر باہر لا رہا تھا۔ ایک نکلے کو روک گیا۔

سب کچھ تو نہیں..... بس یہ کہہ دیا ہے کہ کچھ انٹرنل پر ابھڑ ہیں۔

شہوار نے گہرا سانس لیا۔

نوفل نے بایک اشارت کی۔ شہوار اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ راستے بھر دونوں نے بہت کم بات کی تھی۔

نوفل بکٹ لینے گیا تو وہ ٹرینل کے ریٹنگ پر بازو کا کرادھر ادھر دیکھنے لگی۔

انسانوں کا جم غفیر..... ہنوز موجود تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں رات نہیں ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صفیہ خالہ اس سے امتحان میں ملیں گی.....؟

کہیں ایسا نہ ہو کہ اندازے غلط ہو جائیں..... اور وہاں بھی مایوسی ہی خضر ہو۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔

انہی خیالات کے بیچ اس ستم گر کا تصور بھی آ جاتا تو وہ نفرت سے مٹھیاں بچھنے لگتی۔ میں صرف اپنے ماں باپ کے

ہاں آنے کے لئے اپنی خالہ کے پاس جا رہی ہوں۔ مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہے احسن۔

اگر میرے پاس متبادل راستہ ہوتا تو میں کسی صفیہ خالہ کے پاس نہ جاتی۔

اگرچہ یہاں سے سمندر بہت قریب ہے۔

مگر میں کیوں مروں؟ اس سے تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ میری ماں میرے بہن بھائی نئے زخم سے دوچار ہوں گے۔

میں انہیں خود سے وابستگی کی اتنی کڑی سزا کیوں دوں.....؟

میں تمہیں کیوں نہ سزاؤں.....؟ اس سے ہزار گنا زیادہ جتنا تم نے مجھے ستایا ہے۔ اگر میں مرجاؤں گی تو میرے پیچھے

بے پناہ آستان رہ جائے گی کہ میں مجرم تھی۔

میرے پیاروں کے لئے عمر بھر کا طعنہ۔

میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔

ہمیشہ آزمائش کے لمحوں ہی میں انسان کو اپنی صلاحیت و حوصلے سے آگاہی ہوتی ہے۔ اسے احساس ہوا۔ وہ اتنی کنزرو

لا رہے جتنا خود کو سمجھتی رہی ہے۔

خاصی دیر ہو چلی تھی۔ اسے نوفل پر ترس آنے لگا۔

میری وجہ سے میرا بھائی کتنی مصیبت میں ہے۔ بے چارہ۔

”آپا.....!“ معاس نے نوفل کی آواز سنی۔

وہ چونک کر مڑی۔

”یہ لیجئے بکٹ۔“

شہوار نے بکٹ ہاتھ میں لے لیا۔

”میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اسے کہاں رکھوں.....“ شہوار نے بے بسی سے بھائی کی طرف دیکھا۔

اوہ..... نوفل کو بھی جیسے اس مسئلے نے پریشان کر دیا۔

آپ کے پاس برس نہیں ہے؟ نوفل کو حیرانی ہوئی۔

قیدی کو روٹی، پانی اور کوٹھری ملتی ہے۔ وہ ہونٹ کات کر بولی۔ میں احسن کی قید سے چھوٹ کر آ رہی ہوں۔



بڑا کی سیدی سادی عورت ہیں۔

”کیا چوک ہوگئی؟ شیخ صاحب ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئے۔“

”وہ اصل..... نالکہ کارشہ..... لائی تھیں۔“

انہیں پہلی فرصت میں منع کرو۔ وہ آئندہ میرے گھر میں قدم نہ رکھیں شیخ صاحب آنا فنا آگ بگولا ہو گئے جس کا اندازہ مفید کو پہلے ہی تھا۔

آپ پوری بات تو سنیں۔

سن لی پوری بات۔ ان کے حق میں تمہاری دو کالت مجھ پر کوئی اثر نہیں کرے گی۔ سن لیا۔

ان سے غلطی ہوگئی۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ وہ تو بے چاری بہت شرمندہ ہو رہی تھیں۔

ہم سے بھی غلطی ہوگئی کہ ہم نے ان کی بات سن لی۔ جو لوگ دوسروں کا تماشہ بناتے ہیں، ہم ان کو اپنے گھر میں ایک منٹ برداشت نہیں کر سکتے کہہ دینا بڑی بی بی سے صاف صاف۔

شیخ صاحب! ذرا غور کریں..... اگر ہم بھی کچھ کرتے رہے تو کیا بنے گا ان بچیوں کا؟ وہ زوج سی ہو گئیں۔

میں بے غیرت نہیں ہوں کہ دوسروں کی شرائط پر اپنی بیٹیاں انہیں دے دوں۔ میری لڑکیاں صیب دار نہیں ہیں۔ مجھے کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں۔

نوروز باللہ..... شیخ صاحب یہ گمان میں شامل ہے۔ اللہ سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔

مانگو..... اچھی بات ہے۔ مگر میں اپنی بچیوں کے معاملات میں خود ہی رہوں۔ وہ بکرا اٹھے..... بحث کرنے کی ضرورت نہیں مجھ سے۔

آپ بچیوں کے معاملات میں خود ہی رہیں۔ یہ کوئی بتانے کی بات نہیں مگر ہمیں یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے..... کہ بطور انسان ان کے احساسات بھی ہیں جن کا پاس کرنا تمام والدین کی ذمہ داری ہے۔ صنفیہ نے ہنوز دھیمے پن سے انہیں سمجھایا۔

کیا مطلب؟ وہ اپنے شادی بیاہ کے معاملات خود طے کریں گی؟ وہ چونک کر بھر بھڑک کر گویا ہوئے۔

میرا یہ مطلب نہیں۔ صنفیہ جلدی سے بولیں۔

ایک تو تمہاری ایک بات میں ہزار مطلب ہوتے ہیں۔ وہ برہمی سے گویا ہوئے۔

میرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اس طرح کے رویوں سے ان سے زہنوں پر ایسے اثرات مرتب نہیں ہوں گے۔ وہ ہالنے کی بچیاں نہیں..... بڑھی لکھی ہوش مند، سمجھ دار لڑکیاں ہیں۔

کیا انہیں شک ہے کہ ہم ان کا بھلا نہیں چاہتے؟ شیخ صاحب نے کڑے طور سے انہیں دیکھا۔

وہ بے چاریاں کیا کہیں گی مگر ماں ہونے کے ناتے مجھے ان کے احساسات کی فکر رکھنا چاہیے۔

فکر نہیں کرو۔ وہ میری اولاد ہیں۔ ان کے احساسات تمہاری سوچ کی طرح نامعقول نہیں ہو سکتے۔

ہو بھی سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ میری بھی اولاد ہیں۔ صنفیہ بھی خود پر پڑتی چوٹ سے حق رکھیں۔

صاف صاف کہو..... کیا کہنا چاہتی ہو؟ شیخ صاحب ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

دیکھیں یہ نیا دور..... نیا وقت ہے۔ وہ باتیں جو پہلے.....

اصل بات کرو۔ شیخ صاحب نے بات کاٹ دی..... زندگی میں پہلی بار ان کی ذہن میں کچھ خدشات کھلبلائے

نفل نے پینٹ کی بچلی پاکٹ سے اپنا پرس نکالا۔ کچھ رقم اسی میں رہنے دی اور پرس شہار کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہے تو مردانہ پرس، مگر مجبوری ہے۔ چادر میں چھپا لیجئے گا۔

آپ! آپ لاؤ شیخ میں چلی جائیے۔ غلاٹ صبح چار بجے کی ہے۔ میں آخر کونوں کر دوں گا۔ آپ گھر آئیے نہیں۔ اگر کاغذ لٹ کر لیجئے۔ کوئی مسئلہ ہو تو عرفان کونوں کر دیتے گا۔ بلکہ ایک نمبر اس کے گھر کا بھی نوٹ کر لیجئے۔ کیونکہ اکیلا چار بجے کھلتی ہیست۔

نفل نے اسے دوفون نمبر بتا دیے۔

آپ! اب میں چلوں گا۔ ورنہ پایا.....

”ہاں ہاں..... تم جاؤ نفل..... رات خاصی گہری ہو چکی ہے۔ فکر نہیں کرو۔ میں بالکل نہیں گھبراؤں گی تم پر چار ہوتا۔

اب وہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ نفل کے شانے پر رکھ دیا۔ آنکھیں ڈبڈبائیں۔

مجھے صاف کر دینا نفل.....!

کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! یہ آپ کی زندگی کا چیلنج ہے۔ یہاں سب اپنے اپنے چیلنج سے مشغول ہیں۔ سب کو اللہ کا راستہ دکھاتا ہے۔

اسے نفل پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ اس کے حافظے میں تو وہ بھی نفل تھا جو چھوٹی باتوں پر بھی حیرانی کا اظہار کرتا تھا۔ معصوم اور بے وقوف سا۔

اسلام آباد پہنچ کر مجھے ایک مرتبہ فون ضرور کیجئے گا۔ میں سات بجے تک اکیڑی ہوتا ہوں۔ خدا حافظ آپ! وہ شہوار پر ایک افسردہ نظر ڈال کر پلٹ گیا۔

خدا حافظ۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ دل جیسے نیچے..... بہت نیچے ڈوبتا جا رہا تھا۔

صنفیہ نے دل کڑا کر کے شیخ صاحب کو مخاطب کیا تھا۔ میں کہہ رہی ہوں، سن رہے ہیں.....؟

”ہوں..... ہوں.....“ شیخ صاحب نے ان کی طرف دیکھے بتا بے زاری سے ہنکارا بھرا۔

ماشاء اللہ ہماری کئی بیٹیاں ہیں..... ایک ایک کر کے بہا ہیں گے تو ہی یہ فرض ادا ہو سکیں گے۔

تمہارا کیا خیال ہے، مجھے یہ سب معلوم نہیں.....؟ وہ اکڑ..... انداز میں کہہ کر پھر اس کتاب کی سمت متوجہ ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں تھی۔

میرا یہ مطلب نہیں..... آپ آگے بھی تو سنیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ بیٹھاس لہجے میں بھر بھر بولیں۔

سناؤ..... سن رہا ہوں..... ان کا انداز ہنوز لا پر دانی کا مظہر تھا۔

وہ ہمسائی آئی تھیں ناں..... رشتہ لے کر.....

”کیا ہو گیا انہیں.....؟ وہ تیوری پر بل ڈال کر صنفیہ کو دیکھنے لگے۔“

”اللہ نہ کرے کہ انہیں کچھ ہو..... کل کی خبر ہو.....“ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں کہ وہ نبیلہ کارشہ لے کر آئی تھیں۔

”پھر.....؟“ شیخ صاحب نے نظر کا چشمہ بائیں ہاتھ سے اتار کر صنفیہ کی طرف دیکھا۔

ان بے چاری سے ذرا سی چوک ہوگئی۔ نئی ہیں ناں یہاں۔ ہماری بچیوں کے نام انہیں ٹھیک سے یاد نہیں ہوں۔

تھے۔ وہ بیوی کی تمہید سے کھٹک رہے تھے۔

دراصل مہائی کے بقول ان کے لئے تو ہماری سب بچیاں برابر ہیں۔

تین سو ساٹھ چلتی عورت کے میں گواہ ہوں۔ خیر آگے کہو۔

وہ ہلکا لگانے سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔

میں لڑکیوں کے ساتھ ان کے ہاں شادی میں لگی تھی۔ وہاں ان کے لڑکے نے نالکہ کو دیکھ لیا تھا۔

شرم کر دھنیا۔۔۔۔۔! تم نے یہ بات اپنے منہ سے میرے سامنے نکالی تو کیوں؟

شیخ صاحب دھاڑ کر پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

لڑکے نے رشتہ بھجوا دیا ہے۔ شیخ صاحب۔۔۔۔۔ اس نے کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیا۔

صنفیہ کو دو ٹوک بات اس لئے کرنا پڑی کہ شیخ صاحب کے سامنے آئیں بائیں شاہیں کرنا اپنا مقدمہ ہی کمزور کر کے متروک تھا۔

اس لڑکے کی اتنی جرات کیسے ہوئی کہ اس نے ہماری بیٹی کو دیکھتے ہی رشتہ بھجوا دیا۔ ریوڑیوں کی طرح بیٹری لڑکیاں۔۔۔۔۔ نو دو لپٹے کہیں کے۔ ارے اس نے سمجھا کیا کہ ہم ایسے گرے پڑے ہیں جو چاہے منہ اٹھا کر رشتہ مانگنے آجا۔ اور پھر بیٹیوں کا تماشا بنائے کہ ”یہ“ نہیں ”وہ“۔۔۔۔۔ وہ نہیں ”یہ“

بکرا منڈی سمجھا ہے میرا گھر۔ ہماری لڑکیاں کھانے جا رہی ہیں کسی کے گھر، کوئی بوجھ ہیں جو روکھی سوکھی میرے کھائیں گی۔ مگر میں اپنے گھر کا تماشا بنانے والوں کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں ایسے لوہڑ لڑکے کو اپنی بیٹی نہیں دے جئے لڑکیاں دیکھنے کی بری عادت ہو۔۔۔۔۔ سمجھیں۔۔۔۔۔

یہ دلیل انکار کے لئے روزی نہیں ہے۔ لڑکا خوش شکل ہے۔ والدین کا چہیتا ہے۔ خوش حال ہے۔

اسے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ صنفیہ کو غصہ آ گیا۔

پھر یہاں کیوں جھک مار رہے ہیں وہ لوگ۔۔۔۔۔؟

اور ہاں۔۔۔۔۔ خبردار جو آئندہ غیروں کے ہاں تم لڑکیوں کو لئے کر گئیں۔ آج کل کسی کا بھروسہ نہیں۔ اب آئیں

میری طرف سے انکار کر دینا۔ صاف کہہ دینا شرفاء کے طریقے نہیں ہوتے کہ وہ گھڑی گھڑی بات بدلے لے رہیں۔

صنفیہ جان چکی تھیں وہ اپنی اذیل طبیعت سے اس وقت مجبور ہیں اور کچھ نہیں سنیں گے۔ لہذا وہ باہر نکل گئیں مگر انہوں نے ہار نہیں مانی تھی۔

یوں بھی شیخ صاحب کا رد عمل ان کے لئے خلاف توقع نہیں تھا۔

نالکہ جو ساتھ کے کمرے میں کان لگائے گھڑی تھی جلدی سے بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس کمرے میں اصرار تھا جو اس وقت انگش فلم دیکھنے میں مشغول تھا۔

یہ کام تو قیامت تک نہیں ہو سکتا رازی۔

اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔ نہ میرے حق میں نہ آپا کے حق میں۔

اس لئے کہ یہ عجیب و غریب تانے بانے سے تیار رشتہ۔۔۔۔۔ کسی کے حق میں بھی خوشی کا یا سیر نہیں بن سکتا۔

مجھے انوس ہے رازی! تم اپنی چائی کے باوجود ہار رہے ہو۔

نالکہ نے فیصلہ کن سوچ اپنا کر اپنا جو دیک دم ہلکا چھلکا کر لیا اور دوپٹہ سر پر جما کر باہر آ گئی۔

آپا۔۔۔۔۔! مجھے تو آپ نائٹ وائچ میں لگتی ہیں۔ سارا گھر سو جاتا ہے آپ نہ جانے کیا کرتی رہتی ہیں؟

اگر نے اسے گم صم ساد کچھ کر مخاطب کیا۔

وہ اس کے بال بکھر کر ہنس پڑی۔۔۔۔۔ ختم نہیں ہوئی ابھی فلم۔ آواز اہستہ کرو۔ اباجی ناراض ہوں گے۔

اگر نے اس کی بات سنی ان کی کردی تھی۔ اور دو بارہ اسکرین پر نظریں جما کر بیٹھ گیا تھا۔

تم سوئیں نہیں نالکہ۔۔۔۔۔؟ صنفیہ اچانک نمودار ہوئیں۔

سورہی ہوں امی۔۔۔۔۔

اگر نیند نہیں آ رہی تو چلو باتیں کر لیتے ہیں دونوں ماں بیٹی۔ وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھیں۔

نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نیند تو مجھے سخت آ رہی ہے۔ نالکہ نے فوراً گھبرا کر کہا۔

بہت اچھا کیا امی آپ نے مجھ سے باتیں کرنے سے اباجی سے بات کر لی۔ آپ اتنی بڑی ہیں۔۔۔۔۔ سمجھ دار اور تجربہ دار ہیں۔

ارہیں۔

خدا معلوم مجھ سے کہاں چوک ہو جاتی۔۔۔۔۔

اور آپ بھید پا جاتیں۔

بھرم رہ گیا۔

ابھی مجھے دو چار روز خود پر قابو پانے دیں۔۔۔۔۔ امی۔

سانجہ۔۔۔۔۔ بہر حال مجھے زندگی بھر یاد رہے گا۔

کہ میں بھی کسی قابل تھی۔

کچھ دینے کی حیثیت رکھتی تھی۔

میرے پاس بھی دینے کو کچھ تھا۔

اس کے باوجود میں نے خالی ہاتھ لوٹا دیا تھا۔

خزانہ اگرچہ میرے پاس تھا۔

مگر چابی گم تھی۔

کیا سوچ رہی ہو؟ صنفیہ کی گہری نظریں یوں بھی آج کل نالکہ کا احاطہ کئے رہتی تھیں۔

کچھ نہیں امی۔۔۔۔۔ وہ شینا گئی۔

سوچ رہی ہوں کالج جاؤں یا نہیں۔۔۔۔۔ صبح کو۔۔۔۔۔ کیونکہ آج کل پڑھائی تو ہونے لگی رہی۔

جب پڑھائی نہیں ہو رہی تھی تو رہنے دو۔ خواہ خواہ جھک رہی ہوگی۔

جی۔۔۔۔۔

کیا بات ہے۔۔۔۔۔ کیا تم پریشان ہو۔۔۔۔۔؟ صنفیہ اس کے گوگردیے سے الجھ گئیں۔

نہیں تو امی۔۔۔۔۔ اس نے گھبراہٹ کی شکل دیکھی۔

مجھے لگتا ہے۔۔۔۔۔ تم میں روز والی بات نہیں ہے۔ حتیٰ کہ جب میں شام کو نون پر ٹھیکید سے بات کر کے آئی تو بھی تم نے

اباجی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ جب کہ اس سے پہلے تو تمہارے سوالات ہی ختم ہو کر نہیں دیتے تھے۔

اُپ ٹو ٹو منہ نہ ہوں امی۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔

اللہ ہمیشہ ٹھیک رکھے..... اچھا..... ذرا میرے ساتھ آؤ، تم سے دو ایک ضروری باتیں کرنا ہیں۔ یہاں اسر ظلم دیکر ہے۔

وہ اسے لے کر گھر کے کونے میں بے چھوٹے سے کمرے میں آگئیں۔

نانکہ حیران پریشان ان کے پیچھے چلی آئی تھی..... نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک رہا تھا..... وہ تخت پر اس کے مقابل بیٹھ کر انتہائی سہمے ہوئے انداز میں ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔  
آنکھوں میں سہم۔

نیم والہ۔

سر پر اچھی طرح جھایا ہوا دوش۔

ضنیہ کو بے اختیار پیار آ گیا..... انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

پریشان کیوں ہو..... ایسی کوئی خاص بات نہیں..... میں ہوں ناں ابھی تمہارے جسے کی پریشانیوں اٹھانے کے لئے۔

نانکہ کے دل کو کچھ قرار آیا.....

میں سوچ رہی ہوں کہ..... کہ خیر سے شکلیہ کے ہاں خوشی ہونے والی ہے۔ میں جاؤں یا جنہیں بھیج دوں۔ تم ذرا ذرا دار ہو۔ نیلے کے ہاتھ پاؤں جلدی پھول جاتے ہیں۔ اس نے بھی فون پر یہی کہا کہ امی ہو سکے تو نیلی کو بھیج دیجئے گا۔

تمہارے ابا جی تو شاید کسی کو بھی بھیجنا پسند نہ کریں۔ مگر وہاں میری بچی بہت اکیلی ہے۔ شکوہ کر رہی تھی جانتی ہوں میری بیٹیاں بہت سمجھ دار ہیں۔

صاف بات یہ ہے بیٹی میرا دل انعام علی کی طرف سے صاف نہیں ہے۔ لاکھ میری بچی خوش ہے۔ میں جانتی ہوں میری بیٹیاں بہت سمجھ دار ہیں۔

بیان بدلنے کے بعد فیصلہ بہت آسان ہو گیا تھا۔ یعنی کہ سیدھے سیدھے انہیں صاف جواب دے دیا جائے کیونکہ اس عمل میں نیلے کا خواہ تماشہ ہے۔ میرے نزدیک میری تمام بچیاں برابر ہیں۔ مگر.....

(اف تو ب..... کتنا خطرناک ہے یہ "مگر" بالکل کا دل بردی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔

مگر یہ راستہ رازی نے اپنی ماں کو دکھایا ہے۔ کیا تمہیں رازی کے اس عمل کی پہلے سے خبر تھی؟

امی..... ای لکھنے کو تو جیسے نالکہ کو سانپ ہی سوگھ گیا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں نیلی تمہارے باپ کے بتائے ہوئے اس گھر کے سسٹم کی وجہ سے باپ ہی پر سے نہیں ماں پر سے بھی تمہارا اعتبار اٹھ گیا ہو۔

خدا نہ کرے امی..... آپ کا تو اعتبار ہے کہ آپ کے لئے تو جان بھی دے سکتی ہوں..... یہ ان لوگوں کا یکطرفہ فیصلہ ہے۔ میں بالکل بے قصور ہوں..... یقین کیجئے۔

مارے شرم کے نالکے کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

اگر ان کو انکار میں جواب دے دیا جائے؟

امی..... آپ کا جودل چاہے فیصلہ کریں..... مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس قصے میں۔

شاباش..... مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ میری بیٹیاں مجھ سے مایوس ہو کر اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتیں۔ اپنی دیکھی ماں کو

نوں کی دلدل میں نہیں اتار سکتیں۔

ان پر مٹی لکھی عورت ہوں نیلی۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو بوسہ جھگڑے ہی اولاد کی ضد میں راستہ چلنے لگی ہیں۔ بچوں اور والدین کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور ہمیشہ کی بے اعتباری اور قابضے پیدا کرتی ہیں۔

والدین کو تو اس طرح ہونا چاہیے کہ بچے ساری دنیا میں سب سے زیادہ اعتبار ان پر کریں۔ والدین کے وجود سے تو بقوت کا احساس ملنا چاہیے نہ کہ محض کا۔

بچوں کا با اصول زندگی کا عادی بنانا چاہئے۔ نہ غیر فطری بندش۔ اور ہمارے مذہب کے مطابق تو ہر انسان کو ہر برت سی آزادی میسر ہے۔ مگر مذہب کو جاننے کی کوشش ہی کون کرتا ہے۔ اس کے اندر تو انسانوں کے لئے سکون اور ہی خوشی ہے۔

اگر رازی نے رشتہ نہ بھجوا یا ہوتا تو میں تم سے اس طرح کی بات کبھی بھی نہ کرتی مگر کیونکہ اس نے باقاعدہ پیام بھجوا یا اس لئے میرا فرض بنتا تھا کہ میں معاملے کی تہہ میں اتروں۔ نا اہستگی میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھوں..... خواہ خواہ کے اسے ہاتھ لگیں۔ سہر حال نیلی تھوڑی بہت غلط بیانی تم نے کی ہے۔

جی..... امی.....؟

ہاں..... جنہیں سہر حال رازی کے گھرانے کے بارے میں علم تھا کہ وہ تمہارے بارے میں کیا سرچ رہے ہیں۔ خیر اس سے مجھے اطمینان ہوا ہے کہ تم نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو مجھے میری نظریوں میں گرا دیتی..... کہ میرے بچے بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ ان کی ماں ان کے کسی کام کی نہیں..... اور تمہارے باپ کے طعنوں کی شاید حد نزدیک آئی..... میں نے اپنی طرف سے کوشش کی تھی کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہو جائے۔ شادی تو تمہاری کرنا ہی ہے۔ لیکن.....

مفید اس درجہ آزا خیال بھی نہیں تھیں کہ بیٹیوں کو بر تلاش کرنے کی آزادی دے دیتیں۔

چونکہ شیخ صاحب کی قائم کردہ محکمہ زندہ فضا انہیں ہولایا کرتی تھی۔ احسن کی خود مری تو اس مردانہ معاشرے میں کھپ

نا تھا۔

مگر خدا خواستہ لڑکیوں کی اس قسم کی خود مری کسی دور میں بھی قائم نہ مند نہیں ہو سکتی اور کئی سلسلیں اس طے کا بوجھ اٹھانے

الذمہ دار ٹھہر سکتی ہیں۔

مگر مجھے یہ خیال رہ رہ کر آتا ہے کہ انعام علی نے شیخ صاحب کی کم مائیگی کو ہوشیاری سے اپنے حق میں استعمال کیا

ہے۔ وہ میرے نزدیک موقع شناس اور کاروباری ہیں۔ میری پھول سی بچی۔

اور جب میرا دل صاف نہ ہو تو میں کسی سے بھی بات چیت نہیں کر سکتی۔

جس انداز میں شادی ہوئی ہے اور جن حالات میں ہوئی ان کے مطابق تو مجھے یا تمہارے ابا جی کو وہاں افسہ توڑتے

دے بھی غیرت آتا چاہیے۔

کم از کم مجھے..... کیوں کہ اس شادی کی، اس شادی کے دولہا کی سب سے بڑی مخالف میں تھی۔

ہر چند ٹھیکہ کی سکھ بھری زندگی نے میرے ذہن سے بہت بوجھ اتار دیا ہے مگر مجھے پتا ہے اس نے اپنے آپ کو ڈھال

لا لیا ہے۔

زمانہ چہرہ دیکھتا ہے۔

چہرہ مٹوتا ہے۔

ماں تو ماں ہوتی ہے۔

اسے تو اولاد کے دل کی خبر ہونا چاہیے۔ اسے تو دل مٹونا چاہیے۔

اعلیٰ ظرف انسان زندگی کے تمام دکھ جھیلے ہوئے بھی ہمیشہ یہی کہا کرتے ہیں کہ ”سب ٹھیک ہے۔“ جب کہ ٹھیک نہیں ہوا کرتا۔

جب میرا دل ہی صاف نہیں انعام علی کی طرف سے تو میں دن رات ان کے سامنے کیسے رہ سکتی ہوں۔

پھر ظاہر ہے، دوسری صورت یہی ہے کہ میں تم میں سے کسی کو بھیج دوں۔ نہیں بھیجوں گی تو وہ کڑھک۔

ای۔۔۔۔۔ آپ بلو آؤ (نیل کو) بھیج دیجئے گا۔۔۔۔۔ ان کی باجی سے زیادہ اثر اسٹینڈنگ ہے۔ باجی بھی ان سے بہتر خوش رہتی ہیں اینلا وغیرہ تو لاہر واپس۔۔۔۔۔ خواہ خواہ باجی پر برڈن ہوگا۔۔۔۔۔ بس آپ بلو آؤ یا کو بھیج دیجئے گا۔

ہاں۔۔۔۔۔ اسی کو بھیج دوں گی۔۔۔۔۔ ابھی تو تمہارے ابا جی کو آرام کرنا ہوگا۔۔۔۔۔ خدا معلوم کیا سوچ ہے ان کی۔

بچوں کا کہیں آنا جانا پسند نہ بچوں سے کسی کا ملنا جلنا پسند۔ اور ہاں ایک بات اور کرتا ہے تم سے۔ وہ جیسے کسی خیال۔۔۔۔۔ چونک کر بولیں۔

جی۔۔۔۔۔ نائلہ نے ان کی سمت غور سے دیکھا۔

وہ روہی کی ماں آئی تھیں ناں۔

جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ نائلہ کا دل دھڑکا۔

انہوں نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔

نائلہ دل ہی دل میں بہم گئی۔۔۔۔۔ (آگئی ناں بھروہی بات)

جب وہ پہلے سن آئی تھیں تو انہوں نے نیلہ کے رشتے کے لئے کہا تھا۔ اب وہ تمہارے لئے کہہ رہی ہوں۔ کہہ ناں ہیں غلطی سے نیلہ کا نام لئے بیٹھیں تھیں۔ اصل میں تو نائلہ کے لئے آئی تھیں۔

نائلہ کی نظریں جھکی رہ گئیں۔

بہت شرمندہ ہو رہی تھیں۔ تمہارے لئے اصرار کر رہی ہیں۔ مگر تمہارے ابا جی نے انکار کر دیا ہے۔

میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے بغور نائلہ کا چہرہ دیکھا۔

میں کیا کر سکتی ہوں امی۔۔۔۔۔ آپ بڑی ہیں۔ اب جو فیصلہ کریں گی، وہ اچھا ہوگا۔۔۔۔۔

ایک بات پوچھوں بیٹی۔۔۔۔۔ خیال نہیں کرتا۔۔۔۔۔ اور جج جج بتا دینا یہ سوچ کر کہ میں تمہاری ماں ہوں۔

دنیا میں اللہ کے بعد سب سے زیادہ تمہاری خیر خواہ۔

جی امی! نائلہ کی آواز کاٹنے لگی۔

انہیں شخ صاحب کی مکمل قسم کی آمریت سے ہمیشہ سے خوف آیا کرتا تھا۔۔۔۔۔ جو اپنے نگہداشت انسانوں کو کل پرزوا سے چلنے والے رو بوٹ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھے۔

عزت کی شدید خواہش بھی انسانوں کو برداشت کی غیر معمولی طاقت دے دیا کرتی ہے۔ جو انہوں نے آج تک اپنے اندر محسوس کی۔

مگر اب اولاد کے معاملات اہمیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ مستعد اور چوکس ہو رہی تھیں۔

ہاں جی جی کہ وہ نائلہ کو بہلا تا چاہتی تھیں۔ تاکہ وہ کسی ذاتی خلفشار میں مبتلا نہ ہو جائے۔

روہی درمخروبی۔

بہی درمخروبی۔۔۔۔۔ بے حد خطرناک ہوا کرتی ہے۔

اسب وہ اتنی نرم ہو رہی تھیں۔

اسب وہ اس کا دل مٹول رہی تھیں۔

ارباب سے کے جواب نے انہیں ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

ا۔۔۔۔۔ اس سارے قصے میں بلو آؤ کا جو تماشا بنا ہے۔۔۔۔۔ میں اس گھرنے کی بہت سنگین غلطی سمجھتی ہوں۔

بی بی، میں تو تکلیف اور دکھ دے کر میں کسی خوشی کو حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ خواہ اس میں میرا کتنا بڑا نقصان نہ ہو رہا ہو۔۔۔۔۔ فی الحال تو ایسا بھی نہیں ہے۔

نائلہ نے نہایت خود اعتمادی سے ماں کو واضح جواب دے دیا۔

غیہ نے بے ساختہ نائلہ کی پیشانی چوم لی۔

بری بی بی بالکل دھکی ہے جیسا میں اسے سمجھتی ہوں۔۔۔۔۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔

جا انہیں محسوس ہوا جیسے کال بیل بجی ہو۔

نائلہ نے کمرے اتنی رات کو کون آ سکتا ہے۔

ابا پر نظریں تو احمر ہوئی دروازہ کھول رہا تھا۔

بائوں اپنی اپنی جگہ کھڑی ہو کر احمر کے پلٹنے کا انتظار کرنے لگیں۔

احمر کی سے بات چیت میں مصروف تھا۔

کون ہے بیٹا؟ وہ مضطرب نہ کر سکیں۔

ایک منٹ امی۔۔۔۔۔

بھروسے نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اس کے قریب ہی چلی آئیں۔

امی۔۔۔۔۔ نائلہ کا فون آیا تھا کراچی سے۔

امی خیر۔۔۔۔۔ اتنی رات کو۔۔۔۔۔

بھابی جان۔۔۔۔۔ آ رہی ہیں۔ صبح صبح پہنچیں گی یہاں۔ وہ خود جیسے کچھ سوچ رہا تھا۔

کو بھابی جان؟ وہ واقعی نہیں سمجھیں۔ اتنے بڑے خاندان میں نہ جانے کتنی ”بھابی جان“ تھیں۔

نائلہ بھابی۔۔۔۔۔

ہائیں ہوا راکیلی۔۔۔۔۔!!! صنفی انتہائی حیرانی سے گویا ہوئیں۔

مگر شوہر تو احسن کے پاس تھی پھر نائلہ؟ وہ سخت پریشان ہو گئی تھیں۔

کیا پیغام آیا ہے؟

کیا کہ شوہر بھابی علی الصبح پہنچ رہی ہیں۔ میں انہیں ایر پورٹ سے لے آؤں۔ احمر نے جواب دیا۔

اچھا۔۔۔۔۔ صنفی پر ہنوز حیرانی کا اثر تھا۔

نائلہ علیحدہ ہلکا پھلکا کھڑی تھی۔

میں کی لڑکی بتاتی تھی۔ اس کے تو پاؤں کی دخول بھی نہیں ہے وہ صدر والی۔ خالہ نے منظر کو مخاطب کیا۔  
میں نہیں آؤں گا مغلوں کے چکر میں..... مجھے بھی ”رنگون“ میں دبا دیں گے۔  
نور بانو مسکرا دیں..... بلال کی وجہ سے ان کے ہونٹ مسکراتا نہیں بھولے تھے۔  
اور کیا دبا دیا ہے مغلوں نے رنگون میں؟

ہاں کیا چھوڑا ہے دبانے کے لئے..... نہیں نہیں..... وہ نیلے کپڑوں والی صحیح ہے۔ وہ اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔  
ارے بالکل جوڑی نہیں ہے تیرے..... خالہ نے نہایت غصے سے کہا۔  
مجھے جوڑ توڑ والی..... چاہیے بھی نہیں۔

آپ نہیں سمجھائیں گی اسے۔ خالہ نے بے بسی سے بانو کو مخاطب کیا۔

کیا سمجھاؤں، مجھے تو اصل بات معلوم ہی نہیں۔ انہوں نے نہایت محبت سے بلال کو دیکھا۔

نیلے کپڑوں والی۔ کے نام پر تو آپ کے کان کھڑے ہونا چاہیے تھے۔ آخر آپ ماں ہیں۔ خالہ کو نور بانو کے سکون پر  
پتا تھا۔

کان تو ہوتے ہی کھڑے ہیں۔ کیا کان بیٹھے بھی ہیں خالہ.....؟ بلال نے شرارت سے دریافت کیا۔

آئیں بائیں شائیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ دلہن، اس سے پوچھو کون تھی وہ نیلے کپڑوں والی؟

کون تھی وہ بلال.....؟ منظرہ نے خالہ کو دل رکھنے کو پوچھ ہی لیا۔ اسے یقین تھا کہ ضرور خالہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

میں آج ہی درخواست ٹائپ کر کے وزیراعظم سیکریٹریٹ بھجوا رہا ہوں کہ آئندہ بیس سالہ منصوبے میں خواتین و  
رات کے چلنے کے لئے الگ الگ سڑکیں وقف کی جائیں..... اور اس منصوبے پر آنے والی لاگت کا نصف خالہ کی  
بخاش سے وصول کیا جائے۔ خدا معلوم کون مظلوم تھی نیلے کپڑوں میں..... نہ جانے کس کی شامت نے دھکا دیا تھا جو  
بے ساختہ آکھڑی ہوئی تھی۔

کاش میں اس کا چہرہ ہی دیکھ لیتا جو مفت میں بدنام ہو رہی ہے۔

بلال نے سرو آہ بھری۔

ارے خالہ..... صدر میں تو کھوے سے کھوا چلتا ہے۔ شام کو تو خاص طور پر..... آفس جانے والی خواتین.....

رات..... ان کی چھٹی کا وقت ہوتا ہے۔ پھر گاڑیوں کا اخروہام کہ روڈ کراس کرنا ایک مسئلہ..... کوئی بے چاری کھڑی ہو  
اس کی گاڑی کے انتظار میں یا سڑک پار کرنے کی وجہ سے۔

ایسا نہیں ہے اپنا بلال..... آپ اطمینان رکھیں۔ منظرہ نے مسکرا کر ان کو تسلی دی۔

منظرہ اپنے بیٹے کو کپڑے پہنانے میں مشغول تھیں..... نور بانو خالہ کے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں بات چیت کرنے کے  
ساتھ۔

خالہ کی اندر سے گھر کے گلے بندھے ماحول میں ایک الجھل سی بڑپا ہو جاتی تھی۔

اور سائیں، اکبر علی کی دلہن کیا کر رہی تھیں.....؟ نور بانو نے خالہ کی بھوکا حال دریافت کیا۔

کہنا کیا نہیں سیکے کے پھیروں ہی سے فرصت نہیں۔ خالہ نے منہ بنایا۔

اک دم کال بیل بجی تھی اور گفتگو کا سلسلہ ختم کیا تھا۔

دروازہ بلال نے کھولا تھا۔ منظرہ نے اسے ایک دم پیچھے ہٹنے ہوئے دیکھا تھا۔

گھر اتنی صبح تم جاؤ گے کیسے؟ اتنی صبح تو گاڑی ملنا مشکل ہے۔ اگر وہ اکیلے ہے تو بہت پریشان ہوگی  
پریشانی نے ستایا۔

ای..... علی ڈیکوریشن والے سے بات کر لوں؟ اس کے ہاں سے گاڑی کا انتظام ہو سکتا ہے۔ پیسے تو ڈبل  
احمر نے فوراً مل بتایا۔

اگر ایسا ہو سکتا ہے۔ تو ضرور کرو۔ صفیہ نے کہا۔ خواہ کتنے پیسے لگیں۔

میں ابھی آیات کر کے۔ احمد دروازہ کھول کر فوراً باہر نکل گیا۔

الہی خیر کرنا..... بچی یہاں اکیلے کیوں آ رہی ہے؟ احسن کے بجائے پیغام فونل نے کیوں دیا؟

پہرے مالک میں اتنے امتحانوں کی بھلا کہاں طاقت رکھتی ہوں۔ صفیہ بری طرح ہول رہی تھیں۔

ای..... پتا نہیں کیا بات ہے۔ میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔

ہاں..... اللہ خیر کرے۔

ارے کیا تم لوگوں کی ابھی رات نہیں ہوئی.....؟ شیخ صاحب کی کمراری آواز گونجی..... غالباً ان کی کھڑ پڑ  
آکھ کھل گئی تھی۔

ہاں..... ہاں..... سو رہے ہیں..... بچے پڑھ رہے تھے۔ صفیہ جلدی سے پولیس۔

ہاں..... ساری حکمت بس اسی گھر پر برسر رہی ہے۔ ان کی بڑ بڑا ہٹ سنائی دی۔

انہیں تو ہوا بھی نہیں لگتی چاہیے اس پیغام کی..... سارا حملہ چگا کر رکھ دیں گے۔ صفیہ سرگوشی میں بولی تھیں۔

وہوں نے ایک گونہ سکون کا سانس بھرا صفیہ نے نہایت آہستگی سے دروازہ بند کیا۔

آتی ہوئی نیند بھی اس فی افتاد کے باعث رخصت ہو گئی تھی۔ صفیہ کاجی چاہ رہا تھا کہ صبح آٹا نانا ہو جائے۔

جاؤ..... تم دونوں سو جاؤ اب۔ پھر وہ امر کی سمت متوجہ ہوئیں وہ میں صبح ساڑھے چار بجے جگا دوں گی جنہیں۔

تو کیا آپ کا سونے کا ارادہ نہیں؟ نائکہ کے کسی سوچ سے جاگ کر پوچھا تھا۔

نہیں..... نہیں لیٹ رہی ہوں میں بھی (لو بھلا..... اب نیند کہاں.....) ایک سوال ذہن میں لٹو کی طرح گرا

تھا۔

احسن کے بغیر تھا.....

کیا یہ احسن کا باپ سے صلح کی طرف ایک قدم ہے.....؟

مگر اندر سے نفی میں جواب مل رہا تھا۔

وہ اپنے بستر پر آکر آنکھیں موند کر لیٹ تو گئی تھیں۔ مگر وہ ذہن کو ایک پل قرا نہیں تھا۔

تجھے..... کل میں نے صدر میں دیکھا تھا۔ وہ نیلے کپڑوں میں کون تھی تیرے ساتھ.....؟

خالہ نے برقعہ بھی نہیں اتارا تھا اور شروع ہو گئی تھیں۔

ارے خالہ آتے ہی بیٹھنا چھوڑ دیا۔ بلال نے گھبرانے کی کامیاب ایجنٹ کی۔

دیکھ بلال..... یہ کوئی اچھی راہ نہیں چل رہا تو..... انہوں نے خبردار کیا۔

ارے کسی کام کی بھی تو نہیں وہ..... لوٹوؤں کی طرح کٹے ہوئے بال..... ہڈیوں کا پچھر نرا۔ دلہن وہ جو میں نے



اس سے قبل وہ پوچھتی تھیلی اندر آ چکی تھی۔

السلام علیکم۔ اس نے سب کو مشعر کہ سلام کیا تھا۔ آج بھی وہ سیاد چار میں اپنا سر ابا چھپائے ہوئے تھی۔ نور بانو جو اسی کا چھوٹا بھائی تھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ آگے بڑھ کر تھیلی کا استقبال کیا تھا۔

یہ کون ہیں بہن؟ خالہ نے گم سم ہی منظرہ کو مخاطب کیا۔

یہ ہماری دور کی رشتے دار ہیں۔ بلال نے بلند آواز سے بتایا تھا۔ اس کے لہجے میں ہلاکی پیش تھی۔

ارے یہ تو ماشاء اللہ خاصی خوبصورت ہیں۔ شادی شدہ ہیں؟ خالہ نے دلچسپی سے دیکھا۔

ارے خالہ۔!

بلال..... فالتو باتیں نہیں کرتے۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔ منظرہ نے فوراً ٹوک دیا۔ اس خیال سے کہ جانے دو کہ بیٹھے۔

بلال وہیں ڈٹا رہا۔

سنا نہیں بلال..... چلو اٹھو..... یہاں سے اپنا کام کرو۔ منظرہ نے پھر اسے گھورا۔

وہ منہ بنا کر وہاں سے چل پڑا۔

شادی شدہ ہیں آپ؟ خالہ کی سوئی ہنوز اپنی جگہ لگی ہوئی تھی۔

جی ہاں خالہ۔ یہ شادی شدہ ہیں۔ منظرہ نے جیسے بہت اکتا کر کہا تھا۔

خیر سے۔ خیر سے، اس عمر میں تو لڑکیاں اپنے گھروں ہی میں ہونا چاہئیں۔ خالہ کو دلی خوشی ہوئی تھی یہ سن کر۔

کیا کرتے ہیں آپ کے دولہا؟

تھیلی نے نور بانو کی طرف دیکھا۔

کچھ تو کرتے ہی ہوں گے بے چارے..... لاؤ اسے مجھے دو منظرہ..... تم چائے بنا لو..... انہوں نے بچے کا ہاتھ بڑھائے۔

منظرہ نے بیٹے کو ماں کی گود میں دے دیا اور ڈرائنگ روم سے باہر جانے کے لئے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ

تیل بچا ابھی۔

اس نے خود ہی جا کر دروازہ کھولا تھا..... سامنے اسد کھڑے تھے۔

اسے اسد کو سامنے دیکھ کر پر غلوص سی گئی خوشی ہوئی۔

السلام علیکم اسد بھائی..... کہاں سے تشریف آ رہی ہے صدیوں بعد.....؟ آئیے آئیے۔ اس کے انداز میں گلہ

اسد مسکراتے ہوئے اندر آ گئے۔

تھیلی ایک دم پٹپٹا گئی تھی سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر۔

تھیلی کو گڑبڑا تا دیکھ کر اسد بھی اپنی جگہ شرمندہ ہو گئے تھے۔

خالہ اسد کو دیکھ کر بڑے دارفتہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔

السلام علیکم..... ولیم السلام کے تاجدارے..... خالہ کی قلقل کرتی تھی۔ نور بانو کی دعائیں۔ کمرے میں چپے

پوری طاقت سے دوڑنے لگی تھی۔

اسی شور شرابے کو سن کر بلال واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا تھا۔

اسد نے بے ساختہ اسے بڑے پر جوش انداز میں گلے لگایا تھا۔ کیسے ہو یا.....؟

اسد کیونکہ خاصے وقفے کے بعد آئے تھے اس لئے استقبالِ انداز شدت لئے ہوئے تھا۔

بھالی..... میں بیٹنے کے لئے نہیں آیا ہوں..... بس ایک بڑی..... بہت بڑی خوشی شہیر کرنے آیا ہوں۔

(خاور کے بغیر کوئی بڑی خوشی ہو ہی نہیں سکتی) منظرہ بے دلی سے مسکرا دی۔

تھیلی فریڈے نائٹ خاور ہمارے آپ کے درمیان یہاں ہوگا..... انشاء اللہ..... ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے یہ

اڑیسو کیا ہے۔ اس نے تو مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ آپ کو نہ بتاؤں۔ وہ فریڈے کو نائٹ کو اچانک خوشی دینا چاہتا تھا۔

رہی نے آپ کو بہت دنوں سے سخت پریشان اور الجھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا یہ ظلم ہے..... آپ کو اس نے

تلاش سے پریشان کر رکھا ہے۔ آپ کو سات دن لگا تا خوش رہنا چاہیے۔

منظرہ کے وجود میں تو جیسے نئی زندگی دوڑ پڑی تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ اسد مذاق نہیں کر رہے۔ نہ والی بھی خوشی نے

ہا کپڑہ جگہ کر رکھ دیا۔

تھیلی اس شور شرابے سے گھبرا کر منظرہ کے بیڈ روم میں چپکے سے اٹھ کر چلی گئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈرائنگ روم

بٹانا چھایا گیا تھا۔ آواز میں بند ہو گئیں تھیں۔ وہ اٹھ کر باہر نکلتی جا رہی تھی کہ بلال اندر چلا آیا۔

بہت اچھا کیا آپ نے کہ خود اٹھ آئیں اس محفل سے کیونکہ اس محفل میں آپ کے نام کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

تھیلی خاموش رہی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ہمیں اس بات کی مطلق پروا نہیں ہے کہ آپ ہم سے ملتی ہیں یا نہیں تو آخر

پہ پہ تکلیف کیوں کرتی ہیں.....؟ آپ کی میاں آنے والے ہیں آئندہ بیٹے۔ ہم ان کو نہیں بتانا چاہتے کہ ہمارے باپ

کوئی تازی ترین دوسری بیگم بھی ہیں۔ نہیں اچھا لگتا ہمیں..... سن رہی ہیں آپ.....؟ امید ہے کہ اس گھر میں یہ آپ کا

فری دورہ ہوگا..... اور آپ کبھی بھول کر بھی یہاں.....

بلال..... انور بانو کی کا بچی آواز سنائی دی۔

بلال نے ماں کی آواز کی سمت دیکھا۔

ایک لمحے کو وہ بھی چکرا گیا تھا۔

نور بانو کے ہمراہ دروازے میں انعام علی بھی کھڑے ہوئے تھے۔



کہہ دیا ہے۔ ہوئی غلطی..... تاکہ ہے۔ شکلیہ نے انہیں بھر تھام لیا۔  
 مگر یہ سارے بچکانہ فعل میرے اور تمہارے ہی لئے کیوں؟ میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ اسے اپنے لئے ڈھال  
 بال بھی تم سے معافی مانگیں گے۔ انہوں نے پھر ایک جھکے سے شکلیہ کو ایک طرف کیا۔ بلال اپنی جگہ سے ایک انچ  
 ہٹا تھا۔

مجھے نہیں چاہیے معافی..... کچھ نہیں ہوا میرے ساتھ۔ پلیز انعام صاحب! شکلیہ نے سنبھل کر پھر انہیں تھام لیا۔  
 میں کہہ رہا ہوں: شو میرے سامنے سے..... انعام علی بری طرح دھاڑے۔ ایک لمحے کو شکلیہ بھی خوفزدہ ہو گئی۔  
 شکلیہ نے پھر بھی انعام علی کو ایک انچ آگے بڑھنے نہیں دیا۔

بلال! پلیز، آپ بلال کو لے کر کمرے سے باہر چل جائیے۔ اس نے جلدی سے نور بانو کی منت کی۔  
 میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ پاپا جو سزا دینا چاہتے ہیں، دے لیں۔ بلال نے پھر جڑ کر کہا۔  
 پڑ شکلیہ کو انعام علی پر قابو پانا دہر ہو گیا۔

پاپا پلیز.....! اچھے سے منہ کی بھی روتی ہوئی صدا آئی۔  
 مگر اب انعام علی اپنے آپ میں نہیں رہے تھے۔  
 شکلیہ مشکل ان کو سنبھالے ہوئے تھی۔

آپ کو اللہ کا واسطہ۔ آپ کہہ کر بولے کہ اگر آپ نے بلال پر ہاتھ اٹھایا۔ شکلیہ نے رو ہانسی ہو کر ان کی منت کی۔  
 انعام علی ایک دم ڈھیلے پڑ گئے..... اور شکلیہ اور بلال پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔  
 میں تمہیں عاق کردوں گا تو اب کی اولاد..... ساری جائیداد تھیم نہانے کے نام کردوں گا۔ مگر بھوئی کوڑی نہیں دیں  
 ان سے میرا.....

شکلیہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

باج سے ہمارا بیٹا ہے اور کل بھی..... بچوں کے ساتھ بچے تو نہیں بن جاتے..... یہ کم عمری کے سبب آپ کے ذہنی  
 انکسین تنگی نکلتا۔ مگر آپ تو اپنے معیار سے نیچے نہ آئیے۔ دو گزر کر دیں۔ سمجھ آ جائے گی تو پھر ایسی باتیں نہیں کرے

تم جو چیکے چیکے ان سے ملتی رہی ہو، اس میل غلاب نے کام دکھایا ہے۔ اب تم ابھی انہی میں سے ہو۔ باقی ہو یہ دشمن  
 اکرے۔ تمہیں ان کے ان لوگوں کے مفادات عزیز ہیں اور تمہیں ان سے ہمدردی ہے تو ہوا انہی کے ساتھ.....  
 یہ گھٹت اسی طرح مجھے عمر بھر ڈستی رہے گی۔

انہوں نے انگلی اٹھا کر نور بانو کی طرف اشارہ کیا۔  
 نور بانو نے جیسے کرب سے ہونٹ کاٹ لئے۔

اُن ان کا منصوبہ میری آنکھوں کے سامنے مکمل ہو گیا۔ میں نے جنہیں منع کیا کہ ان سے میل ملاپ مت رکھو..... مگر تم  
 اُن سے بھڑک دیا۔

شو میرے کہنے میں ہیں نہ تم۔

شکلیہ کا کانٹہ کھوٹے انعام علی کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر قبل جو حادثے کی غارت چرچائی تھی اس کا سارا ملکہ شکلیہ پر ہی  
 لڑا تھا۔

شکلیہ نے بھی بدحواس ہو کر انعام علی کی سمت دیکھا تھا۔

نور بانو کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔

انعام علی انتہائی غصے کے عالم میں بلال کی سمت بڑھے تھے مگر نور بانو ان سے زیادہ تیزی سے دونوں باپ پر  
 دربان آکھڑی ہوئی تھیں۔

نہیں..... نہیں..... بچہ ہے..... انعام علی..... خدا کے لئے..... ان کا لہجہ قہر تھا۔

یہ بچہ..... ہے..... اور تم اس کی ماں ہو۔ تمہیں تو میں خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ سب کیا بھرائی تمہارا  
 تمہارے..... ہاتھوں بے وقوف دہ بچے کا جو تمہیں جانتا نہ ہو..... جیسے کہ یہ محترم۔

انہوں نے غصہ ناک آنکروں سے شکلیہ کی سمت دیکھا۔ انعام علی کا یہ انداز اس کے لئے غصہ تھا۔ وہ ساری جانا  
 کانپ کر رہ گئی۔

بہنو ایک طرف۔ انہوں نے نور بانو کو ایک جھکے سے پرے کر دیا۔ مگر شکلیہ بجلی کی تیزی سے دونوں کے در  
 آکھڑی ہوئی۔

نور بانو بائیں ٹھیک کہہ رہی ہیں انعام صاحب..... بچہ ہے یہ..... پلیز.....

اس نے جتنی انداز میں انعام علی کے شانے سے تھام کر انہیں اگلی حرکت سے باز رکھا۔

اپنے خاندان کی سب سے اہم ذات میں ہوں شکلیہ بیگم۔ اور آپ کے لئے کافی ہوں۔ آپ کو بہت شوق  
 میرے گھرانے سے مراسم مضبوط کرنے کا..... یہ آپ کے کسی کام کے نہیں ہیں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی اتنی  
 کیسے ہوئی کہ اس نے اپ کی تو بہن کی..... وہ شکلیہ کے ہاتھوں کو جھٹک کر اسے ہٹانے لگے۔

تم بھی انہی کا حصہ ہو۔ انہی کے ساتھ رہو۔ اگر یہ تمہیں ساتھ رکھنے سے انکار کر دیں تو اپنے والد صاحبؑ جانا میرے گھر میں پاؤں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

وہ تیزی سے دروازہ کھول کر جو منظر نے احتیاط سے بند کر دیا تھا باہر چلے گئے۔  
شکیلہ تو جیسے سناٹے میں آگئی تھی۔

اس نے بے یقینی کی کیفیت میں باہر نکلتے انعام علی کو دیکھا تھا۔  
جب سے اس کی شادی ہوئی تھی انعام علی نے اسے کبھی تم سے مخاطب نہیں کیا تھا۔  
آج صرف تم سے ہی مخاطب نہیں کیا بلکہ قطعی فیصلہ بھی سنا گئے۔  
دو دم سادھے کھڑی تھی۔

بلال سر جھٹک کر ایک میگزین کھول کر بیٹھ گیا تھا۔  
نور بانو نے نہایت محبت سے شکیلہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔  
بیٹھ جاؤ شکیلہ..... گھبراؤ نہیں..... وقتی جذباتیت ہے جو سراسر بلال کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے۔ ہم نہیں اپنی  
دیران نہیں کریں گے۔ تمہیں سب کچھ کھونے نہیں دیں گے۔ منظرہ..... پانی لاؤ اپنی چھوٹی امی کے لئے۔  
باجی..... شکیلہ کی آواز کانپ رہی تھی۔  
ہاں..... ہاں..... بولو.....

باجی..... میرے والد صاحب تو انعام علی سے بھی زیادہ سخت گیر ہیں..... میں کہاں جاؤں.....؟ چھوٹے  
والی شکیلہ کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔  
گھبراؤ نہیں۔ حوصلہ کرو، کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گی۔

انہوں نے پیار سے شکیلہ کو گلے لگا لیا۔ نہایت شفقت سے اس کے رخسار اپنے دوپٹے سے صاف کئے۔  
مگر شکیلہ کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔  
مکن حالات میں اس کی شادی ہوئی تھی۔

اسے اپنے گھر کا عظیم ترین نقصان یاد آرہا تھا۔  
اس کا عزیز از جان..... بھائی..... اور ماں کی تڑپتی ہوئی ممتا۔  
وہ نور بانو کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

تاجہ نگاہ پھیلے ہوئے مرغزار

ان مرغزاروں میں چوکڑیاں بھرتی ہوئی ہر نی.....

ہو چوکڑی اس کی سرخوشی کا استعارہ.....

مگر..... ایک "ازلی ہیم" اس ہر نی کی زندگی سے زنجیر ہوتا ہے۔

اور واقعی کبھی کسی شکاری سے سامنا ہو جائے۔

کوئی گھائی راہ پڑ جائے۔

جس کی گولی پاس سے گزر جائے۔

ہر نی کا کچھ تادم مرگ دھک دھک ہی کرتا رہتا ہے۔

پینہ لگنے والی گولی ایک عذاب ناک یادداشت ہوتی ہے۔

مرغزاروں کی ایک حد ہوتی ہے۔

ہر نی انہی حدود میں رہتی ہے۔

پھر بھی وہ اپنے حصے کی سرمستی و خوشی ان ہی حدود سے کشید کر لیتی ہے۔

چپے کہ وہ خود.....

باپ کی آمرانہ حد بندیوں کے باوجود۔

ماں کے پرفضا باغ و بہار اور تقویت دینے والے وجود سے.....

ابھی ماحول میں کوئی نہ کوئی سرخوشی کشید کرتی رہی تھی۔

زندگی کو ایک خفیہ گھات میں چھپا ہوا شکاری۔

اور رازی کی آمد کسی بارود کی گولی سے کم تو نہیں تھی۔

سنسناتی ہوئی جیسے کان کے پاس سے گزر گئی تھی۔

ایک عذاب ناک یادداشت۔

کہ دل ہنوز سوکھے پتے کی طرح کانپتا تھا۔

شہوار کی آمد کی خبر نے اس کی بھی نیند اڑا رکھی تھی۔

کتنی دیر سے بستر پر کرشمین بدل رہی تھی۔ شہوار کی آمد کے بارے میں سوچ سوچ کر جب اعصاب تھک گئے تو ذہن

اناد میں آچھنسا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ باجی کبھی راضی نہیں ہوں گے۔

اسے یہ سوچ کر دیکھ ہوتا تھا کہ رازی اس ناکامی سے کیسے نمٹے گا۔

رازی کی سچائی اور اس کے عملی قدم نے چپکے سے ایک نرم گوشہ اس کے قلب میں بنادیا تھا..... اسے خود بھی پتا نہیں چلا

یہ سب کیسے ہو گیا۔

اسے خواہ مخواہ کا ایک احساس جرم لاحق ہو رہا تھا۔

وہ خود کو رازی کے دکھ کا ذمہ دار محسوس کر رہی تھی۔

مگر اس کی کیفیت اس قیدی کی طرح تھی جس کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق پڑا ہو۔

اور وہ اپنے دوسرے ساتھ قیدی کی تکلیف محسوس کر رہا ہو۔ مگر اس کی بیڑیاں کھولنے سے مجبور ہو۔

آہ..... اس نے صبح کاذب کا اجالا کھڑکی سے جھانکتے دیکھا اور ایک آہ خود بخود اس کے سینے سے آزاد ہوئی۔

معاف سے برآمدے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک پڑی۔ سامنے نگاہ کی بیلا، راحیلہ، انیلا ایک

اسے سورہی تھیں۔

نبیلہ اس کے برابر میں انتہائی غفلت کے عالم میں سو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ لفاف سے نکل کر نیچے لٹک رہا تھا۔

باہر قدموں کی آواز معدوم ہو رہی تھی۔

وہ آہستگی سے بستر سے نکل آئی..... اور شمال اٹھا کر لیٹ لی۔ پھر نبیلہ کی سمت آئی۔ انتہائی احتیاط سے اس کا ہاتھ

خلاف کے اندر کر دیا۔ اسے یقین تھا باہر ہی ہوں گی جو پریشانی کی وجہ سے سو نہیں سکی ہوں گی۔ کمرے سے باہر  
ہیں سرد ہوا کے جمونے نے اس کا سواگت کیا۔

جسم میں پھر بری سی دوز گئی۔

صفیہ تہجد کی نیت سے وضو کر رہی تھی۔

وہ ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

صفیہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور دوبارہ وضو میں مصروف ہو گئیں۔ فارغ ہو کر اس کی سمت پلٹیں۔

نیند نہیں آرہی بیٹا؟

جی امی..... میں سمجھ گئی تھی کہ آپ ہی ہوں گی۔ اس لئے اٹھ آئی کہ آپ کے لئے چائے بنا دوں۔ سردی بھی

ہے۔

اللہ میری بیٹی کو ہر طرح کا سکھ دے..... نیند نہ بھی آرہی ہو تو اس سردی میں خلاف سے باہر آنا بھی خاصی بہت

ہے۔

انہیں اپنی سعادت مندی بیٹی پر پیارا گیا۔

میں بھی سو نہیں پائی۔ شواری کی طرف سے فکر لگی ہے۔!! ان کے چہرے پر پھر گہرا غم چھا گیا۔

مجھے بھی اسی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ اللہ کرے سب خیریت ہو۔

”آمین“ صفیہ نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

ناکھ جائے بنانے کچن کی طرف بڑھ گئی۔

بہت دل سے چائے بنائی..... اللہ میاں اب رحم کرنا میری امی پر۔ اب انہیں کوئی نیا حادثہ درپیش نہ ہو۔ بہت

ہیں۔ میری امی۔ ناکھ جائے بناتے ہوئے پھر سوچ میں گھر گئی تھی۔

چائے لے کر وہ دبے آواز قدموں سے ان کے کمرے میں آئی۔ بیزرید و پار کا بلب آن تھا۔ اماجی اپنے بستر

جہاں سے بے خبر گہری نیند میں پٹکے پٹکے خراٹے لے رہے تھے۔ وہ بالکل چت سوئے تھے۔ انتہائی آرام و حال میں

صفیہ ایک کونے پر بیچھے تخت پر نماز میں مصروف تھیں۔ ناکھ کھڑی رہی۔ انہوں نے سلام پھیرا اور اس کی سمت دیکھا۔

امی اچائے فلاسک میں لے آئی ہوں تاکہ ٹھنڈی نہ ہو جائے۔ اس نے فلاسک کی سمت اشارہ کیا۔ اور اسی

بغیر چاپ پیدا کچھ باہر نکل گئی تھی۔ صفیہ نے جاتی ہوئی ناکھ کو دیکھا۔

ہاتھ دعا کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ اور ان ہاتھوں میں ناکھ کا وجود جیسے پھول بن کر جا ہوا تھا۔

پانچ بجے میں کچھ دیر باقی تھی۔ تب انہوں نے خاموشی سے احقر کو بگا دیا تھا۔

اٹھو بیٹا..... نماز میں تو ابھی دیر ہے مگر تم تو تیار ہو کر ہنگامہ نہ بنائے۔ وقت سے پہلے ہی امیر پورٹ پہنچ جاؤ تو بہتر

ہی اکیلی ہے کہیں پریشان نہ ہو۔

احقر کو جگا کر وہ اس کے لئے ناشتہ بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ ناکھ کو تاکید کر آئی تھیں کہ اب وہ باہر نہ آئے۔

کر لیں گی جو کچھ بھی کرنا ہوگا۔

ناکھ کے وجود سے ان کو دردِ سر ہٹا کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے ان کو کوئی طاقت در ساتھ حاصل ہو۔

اللہ نے مجھے اتنا کچھ تو دے رکھا ہے۔ میں محرومیاں ہی کیوں گنوں اس کی مہربانیاں کیا کم ہیں۔

احساسِ تشکر ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

اچرنے جب تک غسل کیا اور ناشتے سے فارغ ہوا فجر کا وقت بھی قریب آ گیا تھا۔

تم نہیں جلدی سے امیر پورٹ چلے جاؤ۔ یہاں سے فاصلہ خاصا ہے۔ نماز کا وقت راستے میں ہو جائے گا۔ وہیں کہیں

نماز میں نماز پڑھ لیتا۔

صفیہ توجیسے یوں چاہتی تھیں کہ احقر کو امیر پورٹ پر پہنچ جائے۔

امی ابجانی جان اسلام آباد امیر پورٹ سے دریافت نہیں ہوں گی۔ وہ تو پلین کی آمد کے بعد ہی ہمیں دستیاب ہوں

وہاں کی بے چینی دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔

امی آپ بھی چلیں ناں۔ آپ کو دیکھ کر بھالی جان کو نوری خوشی حاصل ہوگی۔

اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔ بس میں کیا جاؤں تمہارے اباجی بھی الاطم ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ شوہار کے سامنے

لالہ بدھ کی ہو۔ اللہ کرے وہ خیریت سے گھر آئے۔

دواٹھ گئیں۔ احقر کو تم تھائی اور اسے دروازہ تک رخصت کیا۔ وہ چاہتی تھیں احقر صاحب کے جاگنے سے بیشتر

گھر سے نکل جائے۔

اچرنے جانے کے بعد وقت تیزی سے سرکا پتا ہی نہ چلا۔ سب لوگ نماز و تلاوت میں مصروف ہو گئے تھے۔ صفیہ اور

لوپ تھیں۔ انہوں نے شوہار کی آمد کے موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ نبیلہ البتہ ایک عجیب قسم کی تبدیلی فضا سے جیسے

لگ رہی تھی۔

کیا بات ہے، آج احقر ابھی تک نہیں آیا نماز پڑھ کر.....؟ وہ ناشتا بنانے کی نیت سے کچن میں داخل ہوئی اور ماں

ہاکی سوال کر دیا شیخ صاحب تو سو اسات بچے تک گھر سے نکل جاتے تھے۔ صفیہ دعائیں کر رہی تھیں کہ شوہار شیخ

احقر کے روانہ ہونے کے بعد ہی آئے تو اچھا ہے کہ وہ احقر کی بیوی ہے اور احقر..... پتا نہیں وہ اکیلی کیوں آرہی

آنا ہوگا۔ وہ اپنے خیال سے چونک کر نبیلہ سے گویا ہوئی۔

شیخ صاحب کے معمولات میں ان کا ساتھ دیا۔ جلدی جلدی ناشتہ پہنچایا۔ ہاتھ پاؤں خواہ خواہ چھو لے جا رہے تھے۔

ناکھ عجیب سے مست سی ہو رہی تھی۔ بار بار اس کی آنکھیں دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔

نبیلہ کو وہ روزانہ سے مختلف دکھائی دی تھی مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

ہاتھیں احقر کہاں چلا گیا امی! ابھی تک نہیں آیا۔ اسے پھر تشویش ہوئی۔

اچرنے۔ صفیہ کے منہ سے یونہی نکل گیا۔

اُمی..... نبیلہ نے اس عجیب و غریب جواب پر ماں کی شکل دیکھی۔ صفیہ چائے بنا رہی تھیں۔

گیامی کو احقر کیسلی میں نظر آ رہا ہے۔ اسے ہنسی آگئی۔ مگر اس کی ہنسی میں فکری آ کرش تھی۔

لفنی کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ احقر شیخ صاحب گھر سے نکلے احقر باہر گاڑی رکھنے کی آواز آئی۔ صفیہ توجیسے دھڑ دھڑ

ناکھ ایک تیر کی طرح دروازے کی سمت بڑھی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی سب ہی اس کے پیچھے دھڑکی تھیں۔ شوہار نیچے

اتر آئی تھی۔ احمد ردا یور سے کچھ کہہ سن رہا تھا۔ شہوار نے دروازہ کھلتے ہی تیزی سے قدم بڑھائے تھے۔ اجازت ویران سی شہوار کو دیکھ کر صفیہ کے پیروں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی تھی۔ کسی انہونی کے خیال سے انہیں چکر سا آنے لگا تھا۔ شہوار اندر داخل ہوتے ہی ان کے بازوؤں میں سا گئی تھی۔ اور گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ نہ سلام نہ دعا۔۔۔۔۔

اور یہ تسلسل کے ساتھ گریہ اوزاری۔

صفیہ کا دل جیسے کوئی ٹھنسی میں لئے پھنچ رہا تھا۔

انہوں نے شہوار کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

خیریت تو ہے نا بیٹی۔۔۔۔۔؟

معا شہوار سنبھل گئی۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ اسے خود پر قابو رکھنا چاہیے۔ ان بے چارے سیدھے سادے

کیوں ایک دم پریشان کیا جائے۔

اس بے درد کے دکھڑے رونے کے لئے تو عمر پڑی ہے۔

شہوار نے فوراً آنکھیں پونچھ لیں۔

السلام علیکم خالہ جان۔۔۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھا تو دل بھر آیا۔ وہ محبوب سی مسکراہٹ کے

گویا ہوئی۔

صفیہ مگر اس کے چلے اور انداز سے کھٹک رہی تھیں۔

بھابی جان! ذرا آگے بھی نظر ڈالیے۔ پوری بنالین گاڑ ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ احمد نے اہل

باختہ سی بہنوں کی سمت توجہ دلائی۔

سب باری باری اس سے گلے ملیں۔

نبیلہ نے ماں اور ناملہ سے فحشی سے گلہ کیا کہ اتنی بڑی بات سے اسے کیوں لاعلم رکھا گیا۔ جب کداس نے کہا

بھی تھا کہ احمد کہاں ہے۔۔۔۔۔؟

حد کرتی ہیں بلوآ یا۔۔۔۔۔ یہ کوئی چھپانے والی بات ہے۔

جب رات کو خبر آئی تو سب لوگ سوچکے تھے۔ میں امی اور احمد جاگ رہے تھے۔ اب کیا سب کو جگا کر خبر

بھابی جان نے تو بہر حال صبح ہی آنا تھا تاں۔ صبح میں اور امی اباجی کی وجہ سے خاموش تھے۔

ناملہ نے شہوار کی چادر تہہ کرتے ہوئے رسان سے پوری صورت حال سمجھائی۔

ہائے جے جی! آپا ہمیں جگا کر خبر کر دیتیں۔ ہم تھوڑے سے گانے ہی گا لیتے۔ راجیلہ نے مصحوبیت سے فحش

کیا۔

اور ڈھول جھیں اباجی لا کر دیتے۔ ناملہ نے جل کر کہا۔

شہوار نے گلے سے لپٹا ہوا دوپٹہ پھیلا کر سر پر اوڑھ لیا تھا۔ صفیہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔

کپڑے اگرچہ شہوار کے قیمتی اور خوبصورت تھے مگر چہرے سے کسی قسم کی خوشی اور سکون کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اب

تھا جیسے وہ کئی دنوں کی بیماری کے بعد ابھی ہو۔

ہا جان! آپ اکیلی کیوں آئی ہیں۔ ہم نے سنا تھا۔۔۔۔۔ بیلا شروع ہوئی۔  
نے فوراً ٹوکا۔

بات ہے؟ سانس تو لینے دو اپنی بھابی کو۔

سامان۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کپڑے وغیرہ نہیں تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔؟

خالہ جان میرے پاس صرف یہ سامان ہے۔

ہاں۔۔۔۔۔ آپ یہ پرس لیتی ہیں۔۔۔۔۔ بیلا بھر بول پڑی۔

ارنے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہی۔

شہوار کے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئی اور بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

بھئی ہیں۔۔۔۔۔ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے۔ اور ہمیں بھی کہ بھابی جان تو یہاں نہیں آ سکتے شاید اسی لئے انہوں نے

ایکجا ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا یہاں آ کر۔ آپ کو دیکھ کر ہم بھابی جان سے بھی مل رہے ہیں اور آپ سے

بھئی مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نبیلہ کو کس طرح خاموش ہونے کی تلقین کریں۔

ابا۔۔۔۔۔ بھابی جان بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ بھابی جان آپ غسل کر کے ناشتہ کر لیجئے۔ پھر آرام کیجئے گا۔

ہاں سے بعد میں ہوں گی۔ ناملہ نے پھر صورت حال سنبھالی۔

احمد دروازے میں انکا ہوا ماں کو بلارہا تھا۔

ہاں کے قریب پہنچیں تو وہ باہر نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس طرح کہ کمرے میں موجود افراد کی نظر اس پر اور

پڑ سکے۔

پلیز آپ سب سے کہیں کہ وہ بھابی جان سے سوال جواب نہ کریں۔ انہوں نے مجھے کچھ بتایا تو نہیں مگر

اؤنچ سے باہر آئیں تو وہ رو رہی تھیں۔ حالانکہ انہوں نے اس وقت مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی

تہ بھر انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ بس اتنا پوچھا تھا کہ نونہل کا بیج کتنے بجے ملا تھا؟ میں نے بھابی جان

نے میں پوچھا تو کہنے لگیں پلیز اس وقت خاموش رہو۔ امر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

بھئی پیشانی پر لکیریں مہری ہو رہی تھیں۔ ایک مہر انگڑان کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ وہ احمد کی گفتگو کا ایک ایک

نہ سن رہی تھیں۔

رہے میں واپس آ کر انہوں نے لڑکیوں کو تتر بتر کر دیا۔ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کام بتا دیا اور شہوار کو غسل کے لئے کہا۔

لہا وہ جو تم نے اپنا نیا سوٹ سیا ہے ناں کاٹن کا۔۔۔۔۔ وہ شہوار کو دے دو۔

جاتے جاتے پلٹ پڑی۔

ہا جان آپ اتنی دور سے آئیں اور کپڑے بھی نہیں لائیں۔ اس کی حیرت انتہائی تھی۔

امفیہ کو بیلا کی مداخلت پر غصہ آ گیا۔ کیا کہا ہے میں نے تمہیں؟

بھئی ہوں امی۔ وہ بدستور استعجاب کی کیفیت میں تھی۔

لہنے جلدی سے نیا سوٹ نکال کر استری کی اور شیمیز وغیرہ کے لوازمات کے ساتھ ساتھ باتھ روم میں لٹکا دیا۔



جس وقت شہوار غسل میں مصروف تھی حنفیہ نے سبز چٹائی کی ایک مثال نہ جانے کہاں سے برآمد کی تھی۔ اور ہاتھ کے سامنے پھیلا کر گویا ہوئیں۔۔۔۔۔

یہ میری شادی پر میری امی نے جینز میں دی تھی۔ اس پر تلے کا سچا کام ہے۔ آج کل اتنی دبیر چٹائل کہاں ملتی ہے۔ پر ذرا انگلی سی استری ہو پھر دو۔ شہوار غسل۔۔۔۔۔ سے فارغ ہوتا ہے اور حادثہ بنا۔ اس کی چادر اور کپڑوں سے اندازہ ہو کہ کراچی میں ابھی سردی کم ہی ہے۔ اور دیکھو کس سے زیادہ باتیں نہ کرنا۔ اصل معاملہ جو بھی ہے دیر سویر معلوم ہو ہی گا۔

امی میں بھی کچھ دیر سوئیں گی۔ نالکھ نے بھائی کی۔

ہاں تم بھی ایسا کرو غسل کر کے سو جاؤ۔ نیند اچھی آئے گی رات بھر جاگی ہوئی ہو۔

شہوار نے برائے نام ناشہ کیا۔ بلیں میں دو حیروں لوازمات سیلتے سے ناشتے کے نام پر سامنے آئے تھے۔ وہاں بھی صرف ایک کپ چائے پانی تھی۔ بال اگر چہ اس نے سلجھائے تھے مگر گیلے ہونے کی وجہ سے کھلے چھوڑ دیے حنفیہ نے اسے گرم بستر پر لٹا دیا۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

اب تم آرام کرو۔ میں جانتی ہوں تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ کسی قسم کی فکر اور پریشانی اپنے آپ پر مسلط کر ضرورت نہیں۔ تم میری اپنی بچی ہو۔ میرے ہوتے ہوئے خود پر وزن رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ تم نے مجھ نہیں کہا۔ کچھ نہیں بتایا مگر تم تمہاری اچانک آمد مجھے بہت کچھ سمجھا رہی ہے۔ مسئلہ خواہ کوئی ہے اور کیسا ہی ہے تم رہو۔ آرام سے سو جاؤ۔ نالکھ بھی نہا کر یہیں آ کر سو جائے گی۔ وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گئیں۔

شہوار کے ذہن و دل سے جیسے واقعی منوں بوجھ سرک گیا تھا۔

اسے حنفیہ خالہ کے ہمیں مین اپنی ماں کا لٹس ملا تھا گویا۔ کچھ اس درجہ سکون کا احساس ہوا کہ چند لمحوں ہی گہری نیند میں ڈوب چکی تھی۔

منزہ پانی کا گلاس ماں کو تھا کہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ غالباً وہ باپ کو روکنا چاہتی تھی یا وہاں موجود اور اسد کے تاثرات دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہاں انعام علی تھے اور نہ خالہ۔ البتہ اسد گہری سوچ میں مستغرق مگر میٹ کے کمرے آ کس لے رہا تھا۔

منزہ ٹھک کر رک گئی۔

اسد نے ایک لمبلے کے لئے نظریں اٹھائیں اور پھر جھک لیں۔

یہ آپ کے والد صاحب تھے بھائی؟ وہ نظریں جھکائے جھکائے پوچھ رہے تھے۔

تھے نہیں۔۔۔۔۔ وہ آہستگی سے گویا: دوئی اور اسد کے قدموں میں کھیلنے ہوئے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھالیا۔ آپ نے کبھی تذکرہ نہیں کیا کہ یہیں اسی شہر میں رہتے ہیں۔ ان کا لہجہ شاکی سا تھا۔ منزہ خاموش رہی۔

جو لوگ لائق اعتبار نہ ہوں ان سے واقعی اپنی باتیں چھپانا چاہئیں۔ میں خادو کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا رہا ہوں۔ منزہ جانتی تھی وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بس نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھتی رہ گئی۔

پاپا کی اونچی آواز آپ کے علاوہ خالہ نے تو نہیں سنی۔۔۔۔۔؟ منزہ کی آواز بھرا گئی۔ ہمدردی کے احساس سے؟

نہ لکھنے لگے تھے۔

ہیں۔۔۔۔۔ وہ ان کی آمد کے فوراً بعد اٹھ کر چلی تھیں۔ اسد نے سر جھکا کر جواب دیا۔

ہو آپ نے کیا کیا؟ اس نے اسد کی طرف پشت کر کے اپنے اشک صاف کئے۔

جب سنانے والے ہی قضا نہیں تھے تو میں ہر طرح سے بے قصور ٹھہرتا ہوں۔ جیسے شرمندہ تھے۔

جب یہ محترمہ نہیں تھیں تب بھی میرے والدین اسی طرح ایک دوسرے سے دور تھے۔ وہ شکستہ سے لہجے میں گویا

تم آپ کی والدہ تو بے حد ناکس خاتون ہیں۔ اسد کو شدید حیرانی ہوئی۔

ماری دنیا یہی کہتی ہے سوائے پاپا کے۔ وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

اس کی کوئی وجہ تو ہوگی ناں۔ معاف کیجئے یہ سراسر آپ کی ذاتیات میں مداخلت ہے۔ انہوں نے سوال کے ساتھ اظہار شرمندگی بھی کیا۔

کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ آپ بھی ذاتیات ہی ہیں اسد بھائی۔ منزہ نے آہستگی سے کہا۔

تم آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ معہ ہم ان کی اولاد ہو کر بھی حل نہیں کر سکے۔ امی اس سوال پر ہمیشہ خاموش ہو جاتی ہیں۔ اپنے پوجنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے جواب دیا۔

اٹئی۔۔۔۔۔!! ان کو درحقیقت حیرانی ہوئی۔

اٹئی۔۔۔۔۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ ان کے رویے یہی دیکھے ہیں۔

غور۔۔۔۔۔ بیٹے تم اندر ٹھیکہ کے پاس بیٹھو۔۔۔۔۔ میں تمہارے پاپا کے پاس۔

نور بانو تیزی سے بولتی ہوئی اندر آئی تھیں مگر اسد کو کچھ کر یک دم خاموش ہو گئیں۔

اے! اسد بھائی۔۔۔۔۔ خادو کے بھائی ہیں۔ بہت ہو چکی پر وہ داری کہیے آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ منزہ کچھ تلخ سی نظر آئی۔ حاف کرنا بیٹا۔۔۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ نور بانو خفیف سی دکھائی دیں۔

کوئی بات نہیں خالہ جان۔ میں چلا جاتا ہوں۔ اسد نے بہت تدریس سے صورت حال سنبھالی۔

لہذا اسد بھائی۔ آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ اسد بھائی نے سب کچھ سن لیا ہے اور میں نے بتا دیا ہے کہیے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟

نور بانو ایک نظر اسد کی طرف دیکھا پھر اپنی برہم سی بیٹی کو دیکھا۔

تم تمہارے پاپا کے پاس ضروری کام سے جا رہی ہوں۔

”اٹئی!“ امی کو روکیے اور ”ضروری کام“ سے کہیے کہ وہ اپنے پہلے خود حل کرے۔

لال نے پیچھے سے آ کر سخت برہمی سے کہا تھا۔

اُچپ رہو بالال۔۔۔۔۔ تمہاری اور صرف تمہاری وجہ سے میں ایک اور گھرے گڑھے میں گرنے لگی ہوں۔ وہ غریب لڑکے اسے تو شاید ٹھیک اندازہ بھی نہیں کہ وہ کس دہال میں گھر گئی ہے۔ تم نے اگر مجھے لے جانے سے انکار کر دیا

ال کا مطلب یہ نہیں کہ میں جانیں سکتی؟ باہر کرائے کی سواریاں بہت ہیں۔

لال! تمہارے بیچنے نے مجھے دوہری مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ وہ شدید ناراضگی سے گویا ہوئیں لالہ راج چادر لپیٹ کر باہر کی سمت بڑھیں۔

ظہریے خالہ جان..... آپ جہاں جانا چاہتی ہیں میں بچپنا دیتا ہوں۔

اسد چاہیاں اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

نہیں بیٹا..... تمہیں تکلیف ہوگی۔ وہ تکلف سے بولیں۔

بیٹا بھی کہتیں ہیں اور تکلف بھی کرتی ہیں۔ اسد نے شکوہ کیا اور ان کے پیچھے چل پڑے۔

منزہ..... شکلیہ کا خیال رکھو..... اس کی دلجوئی کرو۔ وہ باہر نکل گئیں۔ منزہ بھاگ کر بالکنی جا کھڑی ہوئی۔

دو تین منٹ کے وقفے کے بعد اس نے اسد کی سرخ گاڑی سڑک پر گاڑیوں کے جھوم میں گم ہوتے دیکھی تھی۔

اسد باہر گاڑی ہی میں تھے۔ نور بانو نے انہیں اندر چلنے کو کہا بھی مگر وہ طرح دے گئے۔

نور بانو اندر داخل ہونے لگیں تو چونک کر اصرار کرنے لگا۔ اسد کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا..... اور چونک کر اصرار کیا۔

نہیں بچپنا۔

ام آپ سے عرض کیا۔ صاحب گھر پر نہیں ہے۔ آپ پھر تشریف لانا۔

اسد گاڑی سے اتر آئے۔

یہ تمہاری مالکن ہے خان۔ وہ قدرے ناراضگی سے گویا ہوئے۔

امارا مالکن بالکل جوان ہے۔ ام اپنا مالکن بچپنا ہے امارا نظر کمزور نہیں اے۔

جواب خان بھی ناراض نظر آیا۔

تم بلال کو پہچانتے ہو؟ اسد نے دوسرا انداز اختیار کیا۔

بلال.....؟ ہاں..... وہ امارا چھوٹا صاحب اے۔ خان نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

تم نے کبھی غور کیا کہ بلال کی ماں تمہاری مالکن ہیں اور وہ بھی تمہاری مالکن ہیں یہ بلال کی والدہ ہیں؟

یہ بھی تمہاری مالکن ہیں۔ بلکہ یہ تمہاری مالکن ہیں اور وہ بھی تمہاری مالکن ہیں یہ بلال کی والدہ ہیں۔

بوڑھا کان پہلے چونکا اور پھر جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اور نور بانو کو دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔

ام سمجھا..... سمجھ گیا آپ بلال کی والدہ ہے۔ اور یہ کہہ کر گیٹ وا کر یا۔ ام پہلے دیکھا نہیں۔ معاف کرنا۔

نور بانو کے کیچے سے ایک ٹیس انچی۔ انعام علی جس نے تمہارے بچے پال کر جوان کر دیے۔ تمہارا ملازم اس

نک نہیں۔ جب کہ میں تمہاری خاندانی بیوی ہوں جسے سینکڑوں باراتیوں کے ہمراہ تم لے کر گئے تھے۔

اسد دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھے تھے۔ نور بانو نے بھی اصرار نہیں کیا تھا کہ نہ جانے انعام علی انہیں اپنا کونسا

دکھائیں۔

یہ تو بتا چل گیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں پہنچے۔ لامحالہ انہیں انتظار کرنا تھا۔ وہ جاتے جاتے پھر پٹیشن۔

بیٹا..... انعام علی نہ معلوم کب آئیں۔ تمہیں خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔ جب وہ آ جائیں گے تو ان کا ڈرائیور مجھے

کردے گا۔ تمہارا بے حد شکر یہ۔

آپ بھی کمال کرتی ہیں خالہ جان۔ شکر یہ کس بات کا۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو بلال کو فون ضرور کر دیجئے گا۔ انہو

تاکید کی نور بانو کی نظر بھی کی بجلی گئی۔

یہ پرایا خون..... آن کی آن میں جیسے ان کی آپ بیتی جان گیا تھا۔ (آہ)

بلک ہے تم فکر نہ کرو کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ..... وہ پلٹ گئیں۔

ان کی چال بے حد ست تھی۔ اسد انہیں جاتے ہوئے بغور دیکھ رہے تھے۔

چوں ہی وہ اندر غائب ہوئی اسد نے گاڑی بڑھا دی تھی۔ ان کا رخ اپنے گھر کی طرف نہیں تھا بلکہ گاڑی مناسب

تھانے کے گھر کی طرف ہی رواں تھی۔ گاڑی کی رفتار ان کی ذہنی کیفیت کی عکاس تھی۔

رواؤ کا پر وقار، سادہ حسین چہرہ ان کی نظروں سے سامنے بار بار آ رہا تھا۔ اتنے رکھ رکھاؤ والی..... عالی ظرف۔

یاد رکھاری کا جیکر۔ اتنی مکمل سی عورت کے ہوتے ہوئے انعام علی کو دوسری شادی کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

پر طہانیت اور پر سکون اطوار اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ یہ عورت جھگڑا کرنے میں پہل نہیں کر سکتی۔

بلکہ خیرے پر واضح فعل کی روشنی ملتی تھی جو مقابل کو بھی جھگڑے پر نہیں اکسا سکتی تھی۔

اسد کا تمام علم تجربات، ذہانت اور مردم شناسی کی صلاحیت یہاں پر آ کر ہار مان رہی تھی۔

بیٹا خانو نے بھی منزہ کی تاکید ہی پر ان سے یہ بات چھپائی ہوگی۔ مگر نہ اسد کے سامنے تو اس کے پیٹ میں بڑی

دلی بات نہیں رکھی تھی۔

خانوں دنوں ٹریننگ سے فارغ ہو کر ہی تو فوشیرہ گیا ہوا تھا۔ اپنے ایک کزن کی بارات میں..... اور واپس آیا تو

عہ بلا جھک راز دل کہہ بیٹھا تھا۔ کہ وہ فوشیرہ کے گلی کوچوں میں لٹ کر آ گیا ہے۔

پارہیں نے اب سے قبل اتنی مالدار لڑکی اور اس قدر عاجز و مسکین نہیں دیکھی۔

عاجز اور مسکین کی اصطلاح پر اسد نے مہر پور قبیلہ لگا یا تھا۔

مٹانے محبوب کے ساتھ عاجز و مسکین کی اصطلاح پہلی بار سنی ہے۔ محبوب کے صفاتی ناموں میں اچھا اضافہ ہے۔

ذاتی سے کہا گیا اپنا جملہ بھی یاد آیا۔

جس کی ماں اپنے تمام ہنر کے باوجود ٹھکرائی ہوئی عورت، ہواس کی بیٹی اعتماد سے عاری، سبھی ہوئی کبوتری کی طرح ہو

لجب کی تو کوئی بات نہیں۔ اسد نے ایک موڑ بہت آہستگی سے کاٹا۔

ان کی محرومی۔ بیٹی کو کشش بن گئی..... اچھا نقصان پورا ہوا تھا۔ انسانوں کے رویے کے پیچھے دوسرے انسانوں کے

اٹا ہوتے ہیں۔ ایک کا عیب دوسرے کا ہنر بن جاتا ہے۔

کیا غم ظریفی ہے..... وہ جیسے خود بخود مسکرا دیے۔ استعجاب یہ اور تحیر مسکراہٹ.....

ماتے خاور کا اپار ٹھنٹ دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے گھر انسان لے کر تھوڑی سی اسپرید بڑھائی تھی۔

ایک کے دونوں چکے تھے۔ شہوار دار نالہ هنوز گہری نیند سو رہی تھیں۔ تب صغیر نے کہا تھا کہ انہیں سونے دو تم لوگ

لٹاؤ۔

نہا حیلہ نے حیرانی اور کوفت کے ملے جلے احساس کے تحت ماں سے کہا تھا۔

لٹاؤ..... شہوار بھابی ہماری بھابی کی حیثیت سے پہلی بار ہمارے گھر آئی ہیں۔ ان کے بغیر ہی کھانا کھالیں؟

نہایت تھکی ہوئی ہے۔ نالہ بھی رات بھر کی جاگی ہوئی ہے میرا دل نہیں اٹتا کہ انہیں اس مٹھی نیند سے جگاؤں۔ ابھی

اسے مس گئی تو نالہ تو کھٹکے پر کسمکسی بھی تھی۔ مگر شہوار تو لگ رہا تھا مہینوں کی جاگی ہوئی تھی۔ بالکل بے خبر ہاتھ

اٹکے ہوئے بے سدھ سو رہی ہے مت جگانا سے تم لوگ کھانا کھا لو تمہاری بھابی تمہارے پاس ہی ہے۔

ان کا ذہن پھر کسی کنویں میں اترنے لگا۔

اندرونی تشکرات کی شہادت ان کی پیشانی کی گہری لکیریں دے رہی تھیں۔ کھانا انہوں نے برائے نام کھا تھا۔ ظہر کی نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ شیخ صاحب کہہ گئے تھے آج وہ پانچ بجے تک ہی لوٹیں گے۔ مگر نہ رات کا وقت تک وہ آ جاتے تھے۔

شہوار ان کے کمرے میں سو رہی تھی۔ انہیں اس طرف سے بھی پریشانی تھی۔ کہ وہ شہوار کو شیخ صاحب کے ساتھ ”بیان“ کے ساتھ لائیں۔

ظاہر ہے یہ بات تو انہیں معلوم تھی کہ احسن شہوار کو زبردستی لے گیا تھا۔ اس پر شیخ صاحب نے تبصرہ بھی کیا تھا۔ محفوظ رکھنے کے عادی نہیں تھے فوراً حساب چکانا ان کی سرشت تھی۔

صفیہ کو خاصی لعن طعن کرنے کے بعد انہوں نے کہا تھا۔

احسن اپنی کارروائی میں قیامت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر شہوار کی اپنی مرضی شامل نہیں ہوتی۔

صاف ظاہر تھا کہ ان کے ذہن میں شہوار کا کیا مناجیح بن چکا ہے۔ اس مناجیح ہی کی وجہ سے شہوار کا ان سے ہار

دھماکے سے کم نہیں ہو سکتا تھا۔ شہوار کے چہرے پر چھائی یا سیت اور ویرانی اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ اسے اس

ہمدردی کی سخت احتیاج ہے۔

لفظ رعایت اور احتیاط شیخ صاحب کی لعنت سے خارج تھے۔ ابھی وہ اس ادھیڑ بین میں تھیں کہ رازی کی اسی

کے ہمراہ چلی آئیں صفیہ نے انہیں دیکھ کر ایک گہرا سانس لیا۔ آج کی تاریخ میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

حد سے بڑھے غم تو میں مسکرا دیا

تفسیر بن کر وہ ناچار مسکرا دیں۔

ولیکم السلام بہن..... وہ براخلاق مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر سلام کا جواب دے رہی تھیں۔

وہ انہیں کچھ دینے کا مصرعیں تو کیا ہوا۔ ان کی عزت افزائی تو ان کے اختیار میں تھی۔ وہ انہیں لے کر ڈرائنگ

آ گئیں۔

وقت تو دوپہر کا ہے اور آرام ہے مگر بہن کیا کروں میرے گھر کے شوق کا عالم نہ پوچھئے۔ میری گھر کے تودر

جیسے ہر وقت نالکہ نالکہ کرتے رہتے ہیں۔ ردی کی اسی کا شوق با قابل بیان نظر آتا تھا۔

نبیلہ جو ساتھ کے کمرے سے کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی حق وقت میں رہ گئی..... نالکہ..... نالکہ

(بڑی بی اگر اس طرح ساری زندگی نام غلط ملط کرتی رہیں)

صفیہ سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

میری بہو بہت دنوں سے میرے لئے گئی ہوئی تھی۔ آئی تو صبح شام نالکہ کا نام سننے کو ملا کہنے لگی ائی مجھے

ملائیں۔

صفیہ نے اس بار بھی نظریں نہیں اٹھائیں۔

کیا کر رہی ہے نالکہ؟

سو رہی ہے۔ رات میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی میری وجہ سے جاگتی رہی ہے..... اس لئے.....

نبیلہ نے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے برتن واپس دسرخوان پر رکھ دیے تھے۔

حقیقت بڑی بی اور صفیہ نالکہ ہی کی بات کر رہی ہیں۔ کیونکہ سو تو وہی رہی ہے۔

ابھی یہ سب کب اور کیسے ہو گیا.....؟ ایک مرتبہ پھر ٹھکرائے جانے کے احساس سے اس کے اعضا بے جان سے

اٹھ کر میں تعمیرات اتنے دے پاؤں کیسے آنے لگے ہیں کہ اسے کانوں کا خبر نہ ہونے پائی۔

چاہ..... چاہ..... خیر تھوڑی دیر میں تو اٹھ جائے گی۔ اللہ کا شکر ہے رازی نے ایسی لڑکی کو پسند کیا جو مجھے بھی دل سے

لائے۔ اگر بچے ایسی لڑکیوں کو پسند کر لیں جو ماں باپ کو نہ بھائی تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔

یلہ سائے میں رہ گئی۔ بات صرف رشتے ہی کی نہیں رازی کی پسند کی بھی ہو رہی تھی۔ آوہ..... اسے تین چار روز پہلے

اپنی اودھ گرج چنگ یاد آئی جو ان کے بند کمرے میں محدود تھی۔

اے بڑے جیلے اگر چاس کے کانوں نے سنے تھے مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پاتی تھیں۔ اس نے جیسے اپنی تمام تر توانائی بجمع

برتن اٹھائے۔ مگر جیسے اٹھ نہیں پاتی تھی۔ راجیلہ کو سامنے پا کر برتن اسے تھما دیے۔

پا اچر بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔ انیلا باجی پوچھ رہی ہیں چائے کے ساتھ کیا رکھیں..... کس سے منگا لیں؟

اسے کب کو بکڑے بنائے کیونکہ بھی رکھے ہوئے ہیں۔ وہ جو شام کے لئے کبابوں کا قیصر رکھا ہے۔ اس میں سے تھوڑا

لے میں آ کر تھل دوں گی۔ جاؤ جلدی کرو..... شاباش۔

بہر خواں بیٹھتے ہوئے بے تاثر انداز میں ہدایات دے رہی تھی۔

جلد پلٹ گئی تھی۔

بالکل ان تعمیرات سے باخبر ہے.....؟

ہا آپ نے شیخ صاحب سے بات کی تھی.....؟ رازی کی امی نے دریافت کیا..... ان کی بے چینی اس بات کی

کی کہ واقعتاً اس رشتے میں ان کی اپنی مرضی شامل ہے۔

پہلی پہلی پر سرسوں جمانا چاہتی ہیں اور اس رشتے کے دوران جو کچھ ہوا وہ بھی آپ سامنے رکھیں۔ میں کوشش

اٹھ کر شیخ صاحب قائل ہو جائیں۔

لب یہ کہ شیخ صاحب قائل نہیں ہو رہے؟ رازی کی والدہ نے فوراً بات پکڑی۔ اور صفیہ کی بات کاٹ دی تھی۔

پہلوئی بھگنے جس طرح اس معاملے میں اتار چڑھاؤ آئے ہیں۔ اب جانتی ہیں۔ پھر مردوں کے مزاج۔

بات اٹھائی و آشنائی سے صورت حال سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ درحقیقت رازی کے رشتے سے ایک دم

ٹھما چا رہی تھی۔ ایک امید افزا سوچ کہ ممکن ہے خدا کوئی بہتری کی صورت پیدا کر دے اور صورت حال بدل

نا خوشخبری نہ سہی امید ہی دلا دیتے۔ رازی کی والدہ جیسے بچہ کر رہی تھیں۔

یہ سب میری اختیار سے باہر نہ ہوتا تو آپ کو ممکن ہے خوشخبری ہی سننے کو ملتی مگر میں ان کے باپ کے سامنے مجبور

اٹھائیں۔

اٹھائیں کر رہی ہوں بلکہ میں تو صرف مہلت مانگ رہی ہوں کہ میں اپنی پوری کوشش کروں گی..... شیخ صاحب

نامیں قائل کرنے کی۔ رازی کے والد سے کہیے کہ وہ خود بھی شیخ صاحب سے موقع مناسب دیکھ کر ملاقات

لے لیا جی طرف سے بھی کوشش کریں۔ صفیہ نے ایک اور تجویز پیش کی۔

ضرور..... میں آج ہی ان سے کہوں گی۔ دراصل ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ جب رشتہ لے جائیں گے  
 بھی ہماری طرف آئیں گے۔ بات بڑھے گی۔ مردوں کی آپس میں ملاقات ہوگی۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔  
 اپنی نند سے بھی مشورہ کرنے کا ذکر کیا تھا۔ ان کی بابت بھی بات نہیں دہرائی۔  
 رازی کی والدہ جیسے آج بہت کچھ سوچ کر بلکہ ”سبقت“ یاد کر کے آئی تھیں۔  
 دیکھئے ناں..... اگر آپ ناموں کے سلسلے میں مغلطہ نہ کرتیں تو ایسا سب کچھ نہ ہوتا۔ یعنی آنا جانا شرور  
 نگر..... بات ہی ایسی ہوگئی۔ صفیہ رک گئیں۔

میں نے تو آپ سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ بہن! رازی کی امی نے جیسے بے بس ہو کر کہا تھا۔  
 بات یہاں تک پہنچی تو سارا مہرہ نیلہ نے کھڑے کھڑے حل کر لیا۔ اب اسے مطلق شوق نہیں تھا کہ  
 سنے۔ وہ بہنوں کا ہاتھ پٹانے بہن میں چلی آئی تھیں۔

مگر اب اس کا دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے غائب دماغی کی کیفیت ظاہر تھی۔  
 جن لوگوں کا نصیب مجھ جیسا ہو گا وہ اس صورت حال کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہوں گے.....؟

جس طرح کامیاب اور بڑے لوگوں کی سوانح حیات لکھی جاتی ہے اس طرح مجھ جیسے بد نصیبوں کی سوانح  
 جانی جائے تاکہ بد نصیبوں کو بھی زندگی گزارنے اور جینے کا بہانہ مل سکے۔ کوئی روشنی کی کرن، کسی امید کی ضوالت  
 حاصل کر سکے۔

جس طرح بڑے انسان بننے کے شوقین اپنے پیش روؤں کی سوانح پڑھ کر اپنے اندر جوش اور دلولہ پیدا کر  
 اپنے شخصی نقائص دور کر کے خود کو پالش کرنے کی..... کوشش کرتے ہیں تاکہ وہ کامیابی میں ان سے بھی جا  
 نکل سکیں۔

اسی طرح بد نصیبوں کی سوانح تاریخ میں بھی اس بات کا ذکر ہونا چاہیے کہ جب کوئی انسان کامیابی کے  
 کسی چھوٹی سی خوشی کا خواہشمند ہو اور اسی کے لئے ترستار ہے۔

جب کوئی انسان بار بار ٹٹکرایا جائے۔

جب خیالات اور جذبات بھی دوسری سوچ کے ماتحت ہوں۔

جب اس کے فعل و عمل آزاد نہ ہوں۔

جس کی سوچ رجن رکھی ہو۔

جس کے ہاتھ پاؤں تابع ہوں۔

جو ایک سر بریدہ کی طرح کا وجود رکھتا ہو کہ جیسے اس کے جسم پر سہری نہیں۔

سر.....

جس پر پیشانی بھی ہوتی ہے۔

انادھر درکا علاقہ سی نشان..... انسان کے نصیب کا استعارہ.....

سر..... جس کے ساتھ چہرہ اور اس چہرے پر ناک بھی فٹ ہوتی ہے۔

غیر مت و وقار کا دوسرا نام۔

معاشرے کے ایسے سر بریدہ اور سر کٹے انسانوں کی سوانح..... جو پیشانی اور ناک دونوں سے محروم ہوں

بے لگ..... تب ایسے کڑے وقت میں بد نصیب لوگ کیا کرتے تھے؟ مرنے کے علاوہ۔  
 چوں کی سوانح سے اور کوئی احساس ملے نہ ملے۔ یہی بہت کہ دل کو تسلی ہو کہ ہم سے زیادہ بھی قسمت کے مارے  
 بچے ہیں۔

کامیابی کی کشش سے بے نیاز.....

ہر ایک خوشی..... اور

بدلتا ہوا.....

سوچ کی ایک گھڑی کے لئے ترستے مر گئے۔

اس وقت شدید خودکشی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی تھی..... اس کا جی تو بھر بھر آ رہا تھا۔

ہاتھ کی فوٹیت سے حسد نہیں ہو رہا تھا..... بلکہ اپنے سرد دکنے جانے کا شدید احساس تھا۔

پہچنے سے یہ احساس بھی کہ اگر نالکہ کو رازی نے پسند کیا ہے تو وہ نالکہ سے پہلے ہے..... بد شکل و بد ہیت بھی

پانے میں زمین میں وہ نہیں رہتی۔ پھر وہ اپنی دراز قاسمی کے باوجود نظر کیوں نہیں آتی تھی؟

بے پروہ نالکہ کے سامنے احساس تو ہیں۔

میں ضرور منہ بک دکھائی دے رہی تھی مگر..... اس وقت اسے خود پر ترس کھانے کے علاوہ کائی کام نہیں سوچ رہا

بک رازی کی امی اور بھابی موجود ہیں۔ صفیہ کا دل تیزی سے دھڑکتا رہا..... کہ نہ جانے کب شیخ صاحب

الہیاتی عادت کے مطابق ان کے سامنے ہی کوئی بے احتیاطی کر بیٹھیں۔

لا کی بھابی بہت بے چین تھیں نالکہ کو دیکھنے کے لئے۔ مگر صفیہ نالکہ کو سامنے لانے سے کتر ا رہی تھیں کہ جو کام

پہنچا نظر نہیں آ رہا تھا اس کو مزید پھیلانے سے کیا حاصل۔

نارن ساس بہ بھی جیسے صفیہ کی الجھن سمجھ چکی تھیں۔ پھر جب انہوں نے اپنے اصرار کے جواب میں صفیہ کی ٹال

مالکی تو کیجئے ہوئے چہروں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

بھڑکی بات کا یقین کریں۔ میری بات کا یقین کریں۔ میری طرف سے کوشش میں کمی نہ ہوگی۔ باقی اللہ بہتر

ہوئے۔ میری اپنی طرف سے مناسب جواب دینے کی کوشش کی تھی۔

سکھاتے ہی شہزاد اور نالکہ کو جگایا تھا۔

لیٹیے۔ تمہارے خالو جان آتے ہوں گے۔ اب اٹھ جاؤ اگر سونا چاہتی ہو تو اصرار کے کمرے میں سو جاؤ وہ بالکل

مہرہ شہزاد اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ مگر جیسے ابھی پوری طرح جاگی نہیں تھی۔ خالی خالی نظروں سے صفیہ کو دیکھنے لگی۔ کیا

بغض خانہ جان۔

نگرے ہیں بیٹے۔

ایک دم چونک کر ہوش میں آگئی چارنج گئے.....؟

سونا..... ہو تو دوسرے کمرے میں سو جاؤ۔ ورنہ نہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔ انہوں نے پیار سے اس کے سر

پر ہاتھ پھیرا۔

شہوار بستر سے نیچے اتر آئی..... اور صفیہ کی بھاری مثال اچھی طرح لپیٹ لی۔ بہت دیر سوئی ہوں اب کیا سو رہا ہوں۔  
ناگلا ان دونوں کی بات چیت کے دوران جاگ گئی تھی۔ فوراً بستر سے نکل آئی تھی۔

اباجی آگے کیا امی؟ بستر سے اترتے ہی پہلا سوال یہ ہوا تھا۔

نہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔ تم لوگ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھا لو۔ غاف۔

اب جی نہیں آئے مگر روبرو کی امی آئی تھیں کافی دیر بیٹھ کر گئی ہیں۔ ایلا بھی کمرے میں آ چکی تھی۔ اس نے ہاتھ دھو کر کھانا کھا لیا۔  
خبر سنائی تھی۔

ناگلا پاؤں میں چپل اڑس رہی تھی۔ ایک سیکنڈ کو اس کی حرکت رک گئی۔

اس نے صفیہ کی سمت دیکھنا چاہا۔ مگر نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ سر نہ اٹھا سکی۔ پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔  
شہوار کو ساتھ لئے ہوئے اس کے پیچھے نکل آئی تھیں۔

ناگلا اور شہوار منہ ہاتھ دھوئے اور بال باندھنے میں لگ گئیں تو صفیہ جلدی جلدی ان کے لئے کھانا گرم کرنے لگی۔  
نبیلہ انہیں تنہا کام کرتے دیکھ کر ہاتھ بٹانے چلی آئی۔ کیونکہ صفیہ کی عادت تھی کہ وہ کووی کام میں لگ جاتی تھی۔  
ہاتھ بٹانے کے لئے آواز نہیں دیتی تھیں۔ جوں جوں وقت سرگ رہا تھا۔ صفیہ کو ہولارہا تھا۔

ابھی شیخ صاحب کو شہوار کی آمد کی اطلاع دینے کا ”اہم ترین“ کام باقی تھا۔ اور دوسری طرف ان واقعات کو بار بار دہرائی تھی۔  
کی بے چینی جن کی وجہ سے شہوار یہاں نظر آرہی تھی۔

ظاہر ہے شیخ صاحب کو اطلاع دینے سے پہلے انہیں خود تمام واقعات کا علم ہونا چاہیے تھا۔  
تب ہی شہوار کی موجودگی ان کے لئے قابل برداشت بنائی جاسکتی تھی۔ انہوں نے نبیلہ کے ساتھ مل کر احرا کے

میں کھانا کھا دیا تھا۔  
کھانے پر انہوں نے شہوار کی وجہ سے تھوڑا سا انتہام کیا تھا۔ احسن ان کی کمزوری تھا۔ ان کی رگ جال

قریب..... ان کا قلب..... ان کے احساس کی شدت۔  
اور شہوار ان کی سبکی بھانجی ہی نہیں احسن کی زندگی کا ایک حصہ تھی۔ اس کے لئے ان کے جذبات ”خصوصی“ تھے۔

جب تک احسن ان کی زندگی میں خصوصی اہمیت کا حامل تھا وہ شہوار سے بدگمانی یا بے اعتنائی کا عمل روا نہیں رکھتے تھے۔  
تھیں۔

شہوار کو گم سم دیکھ کر نہیں اگرچہ طرح طرح کے وہم ستارے تھے۔ مگر وہ ہر طرح کے وہم کو مسترد کر کے مسئلہ  
فریبی کے عمل سے گزری تھیں۔ یہ اور بات ایک احساس پوری طاقت سے دل میں جگہ بنا چکا تھا کہ شہوار کی موجودگی

معمول کا واقعہ نہیں ہے۔  
دو کھانا اندر پہنچا کر انہیں تو ناگلا پانی کا جبک لئے چلی آرہی تھی۔

چپکے سے گویا ہوئی..... اباجی آگے ہیں امی۔  
ہیں..... ہاں..... اچھا اچھا..... جب تک میں نہ کہوں شہوار کو یہاں سے لے کر مت نکلتا میں بیٹھی رہتا۔

وہ چونک کر پھر قدرے گھبراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ ناگلا نے دروازہ بند کر لیا۔  
شیخ صاحب برآمدے میں کھڑے ہوئے اپنے ہمراہ لائے ہوئے چند بڑے بڑے لفافے نبیلہ کو ساتھ لے کر

میں سے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ شیخ صاحب کے ذاتی کام ہمیشہ خود کرتی تھیں بیٹیوں سے نہیں کرتی تھیں۔  
ہیں۔ پلپر پلک کے نیچے سے کھٹکا کر سامنے رکھے پھر کپڑے نکالنے لگیں۔ شیخ صاحب اندر آ گئے تھے۔

وہ بھی، ہم کہاں کونوں کھدروں میں گھسی رہتی ہو۔ ان کی پانٹ دار آواز گونجی۔  
آپ کے کپڑے نکال رہی ہوں کھانا کھائیں گے.....؟

پرانی وقت ہے کھانا کھانے کا۔ وہ اپنی اتار کر پلنگ پر بیٹھ گئے ہوئے حسب عادت خشک انداز میں گویا ہوئے۔  
پڑے میرے ٹھیک ہیں۔ کپڑے دوپڑے نہیں بدل رہا میں۔ صبح کے لئے تیار کر دینا بس۔

وہاں سنو، آج شام کے کھانے پر کوئی اچھی چیز بنالینا۔ کچھ لوگ نبیلہ کے سلسلے میں آرہے ہیں۔ انہیں شادی کی  
بدلی ممکن ہے لڑکی پسند آنے کی صورت میں وہ آج ہی بات۔ ملے کر جائیں۔ اچھے خاندانی لوگ ہیں۔ وہ تین عورتیں

ہیں اور شاید مرد ہوں گے۔  
انہوں نے پلنگ پر بیٹھ کر پاؤں سے جراثیم کھینچے ہوئے نہایت اطمینان سے اطلاع دی۔

صفیہ نے ایک دم پلٹ کر شیخ رحیم الدین کی سمت دیکھا تھا۔  
پانچواں وقت سے پناہ مانگ رہی تھیں کہ شکلیہ کے بعد آئندہ کبھی شیخ صاحب کسی بیٹی کا پر خوردار ڈھونڈ کر لائیں۔

ایلی خیر۔ کای زمین پر اکثر انسان میری طرح ہر قدم پر امتحان سے دوچار ہوتے ہوں گے.....؟ یا صرف میں  
کا دل بھرا آیا۔

لے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے خود کو سنبھال کر نہایت سنجیدگی سے شیخ صاحب کا چہرہ دیکھا۔  
نارجم الدین کو سوال و جواب کے عمل سے سخت چرمحوس ہوتی تھی۔ وہ تو آمر مطلق کی طرح حکم پر عمل درآمد

ماتھے تھے۔  
بندہ پر ایک اچھتی سی نگاہ ڈال کر نہ جانے کس نیکی کے صدمے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

لگاؤ کی آتیس تیس سال۔  
بندے کے جیسے اوسان بحال ہوئے۔

پہلے دیکھا ہے یا صرف سنا ہے.....؟ ایک خدشے نے پھر سر اٹھا دیا۔  
لوگ کھاتا ہوں صفیہ بیگم کھاس نہیں.....

فلیک دم چپ سی ہو گئیں۔  
لاگتی ہو تم..... بڑا لائق لڑکا ہے۔ باہر سے پڑھا ہوا ہے۔ باپ بھائیوں کا مشترکہ کاروبار ہے۔ نو دو لپٹے نہیں

لیٹاں رکھو۔  
بڑا گویا بہت خوشی ہوئی وہاں قدرے حیرانی بھی۔

بہاں قدر خصوصیات ہیں تو ہم پلہ لوگوں میں رشتہ کیوں نہیں کر رہے.....؟ ان کے منہ سے نکل گیا۔  
ناکھٹب ماں کی طرح خراب ہو، یہ کوئی ضروری تو نہیں۔ شیخ صاحب زبان سے انگارہ بٹھا اور صفیہ کے دل پر

نہاں تیس سال کا معقول صورت پڑھا کھلا..... دو تین صفیہ کو یقین آ کر نہیں دے رہا تھا۔  
بھلائیے لوگ شیخ صاحب کو کہاں مل جاتے ہیں.....؟ محلے میں تو سلام کر کر دکھائی نہیں دیتے۔ صفیہ ہنوز سوچ میں

تھی۔



مستغرق تھیں۔ شیخ صاحب پینگ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے تھے۔ گویا منیہ کو اشارہ تھا کہ وہ ان سے مزید کوئی بات نہ کریں۔

منیہ آہستگی سے باہر چلی آئیں۔

اب ان میں جیسے چالبی سی بھر گئی تھی۔ چند لمحوں کے لئے تو وہ شہوار کو بھی فراموش کر بیٹھی تھیں۔ وہ جیسے چاہتی تھی کہ وقت جلدی سے قریب آ جائے کہ وہ بھی یقیناً بھر خوشی آزماد کر سکیں۔۔۔۔۔ کہ کیا ہوتا ہے وہ سرور جب۔۔۔۔۔ انسان اپنا خواہش کی تکمیل ہوتے دیکھتا ہے۔

سراب و خواب سی زندگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے خود ہی دھول ہو کر رہ گئی تھیں۔

وقت بہت کم تھا۔ وہ تیزی سے نالکدی کی سمت آئی تھیں۔

نالکدے جیسے بے تاب نظروں سے ان کا چہرہ پڑھنا چاہتا تھا۔

ابا جی سے بات کر لی آپ نے امی؟

تم کیوں فکر مند ہو؟ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ شہوار اپنے گھر میں ہے۔ اس وقت تو تمہارے ابا جی نے اپنا کام سمجھایا ہے۔ کچھ لوگ نیلے کے سلسلے میں آ رہے ہیں۔ تصویر کشی تو تمہارے ابا جی نے ایسی کی ہے کہ میں ابھی سے کہہ بیٹھی ہوں خدا کرے جیسا تعارف ہے، وہ لوگ ایسے ہی ہوں۔

وہ لوگ رات کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ فنانس کام میں لگ جاؤ۔ پھر وہ شہوار کی سمت پلٹیں۔

بہٹی! گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اگر چہ ہوتو چپکے سے احمر کے ساتھ جا کر ماں کو فون کر آؤ۔ اسے لے جا جائے گی۔ احسن کو کرنا۔

خالہ جان! شہوار نے خوب کران کی بات کاٹ دی۔

میں کسی کو فون نہیں کرنا چاہتی۔ کوئی نہیں ہے میرا نہ ماں نہ باپ نہ احسن۔۔۔۔۔ اگر میں مر بھی جاؤں تو احسن کو میرا جنازہ پر بھی نہ آنے دیجئے گا۔ نفرت ہے مجھے اس نام سے۔ وہ نہ بانی انداز میں گویا ہوتی تھی۔

منیہ جو باہر کی سمت قدم بڑھا چکی تھیں۔۔۔۔۔ بوکھلا کر واپس پلٹیں اور اب ہکا بکا شہوار کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

ہائیں کیا مطلب؟ وہ کم گوئی شہوار کو اس انداز و حالات میں دیکھ کر واقعی حیران و پریشان ہو گئی تھیں۔

میں کب سے منتظر ہوں کہ اس گھر کا کوئی بھی فرد مجھ سے پوچھے کہ میں اس در پر کیوں پڑی دکھائی دے رہی ہوں؟ کسی نے نہیں پوچھا اب تک۔

وہ منہ ڈھانپ کر ہلک ہلک کر رو دی۔

منیہ کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ اس کے نزدیک بیٹھ گئیں اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

میں نے تو فوراً اس لئے نہیں پوچھا کہ خدا معلوم کیا بات ہے۔ ظاہر ہے یہ تو میں جان سکتی ہوں کہ تم غیر معمولی ماں ہیں میں یہاں آ سکتی ہوں۔ سوچ رہی تھی کہ ابھی تک اتر جائے تو آرام سے پوچھوں گی۔ احسن نے اگر تمہارے

زیادتی کی ہے تو۔۔۔۔۔

خالہ جان۔۔۔۔۔ جیتے جی مار دیا ہے انہوں نے۔ وہ ہچکچوں کے درمیان بولی۔

منیہ کے پاؤں کے نیچے سے جیسے زمین سرکے لگی تھی۔

احسن۔۔۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جو کسی شیخ صاحب چھوڑ دیں گے وہ تم پوری کر دو گے۔ تم جیسے مخلص کے لئے مہیا

ابھی سفید کر رہی ہو۔۔۔۔۔؟

تم نے میرا خیال نہیں کیا۔۔۔۔۔ اپنی ماں کا۔۔۔۔۔ کیا کیا ہے تم نے اس بچی کے ساتھ۔۔۔۔۔؟

اب کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ سرائی زور سے چکرایا کہ آنکھوں کے سامنے چنگاریاں سی اڑتی محسوس ہو گئی تھیں۔

دن رات کے غم ان کے دل سے زندگی قطرہ قطرہ نمودار ہوتے تھے۔ اب ان میں کہاں طاقت تھی کہ وہ یقیناً و اعتبار اور کے پر فخر اڑتے دیکھتیں اور خاموشی سے سہ جاتیں۔

بعض اوقات سیلاب کے منہ زور ریلے میں بند کا سب سے مضبوط نظر آنے والا ستون پہلے ٹوٹتا ہے۔

پارٹ میں چھت وہاں سے ٹپکنے لگتی ہے، جہاں سے پہلے کسی ٹپکی ہوتی۔ بعض اوقات گا کہ ابی وہ کان پر ٹھکا جاتا ہے اور اعتبار و یقین کے مرحلے طے کیے ہوتے ہیں۔

ارے احسن۔۔۔۔۔ ایک کراہ ان کے سینے سے اے ابلی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔

شہوار ایک دم خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔ اور جیسے احساس جرم سے چور نظروں سے بے ہوش خالہ کی سمت دیکھا

آنسو غم گئے تھے۔ بلکہ راستے ہی میں انک گئے تھے۔

سب کی سب انہیں ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگیں۔

شہوار ان کی پابندی جا کر فرس پر بیٹھ گئی۔ اور پاؤں حمام لئے۔

خالہ جان۔۔۔۔۔ پلیز ہوش میں آئیں۔

اب کوئی نیا الزام میرے سر نہ آ جائے۔ اٹھیے۔ پلیز۔۔۔۔۔ مجھے محسوس کیسے۔ مجھے کو بسے۔

جھانپنے بڑوں کے لئے دکھ ہو۔

مشغول اور مہربانوں کے لئے لعنت ہو۔ اسے زندگی بھر خوش رہنے کا کوئی حق نہیں۔

وہ منیہ کے پاؤں پر سر رکھے ہلک ہلک کر رو رہی تھی۔

خالہ جان۔۔۔۔۔ اٹھیے۔ مجھے کوئی اتنی بڑی بات کہیں کہ میں صدمے سے مر جاؤں۔

پڑو کی کون ہے؟ شیخ رحیم الدین کی گر جدار آواز کو ٹپکی تھی۔

کمرے میں روشنی بھی زیادہ نہیں تھی اور شہوار کا چہرہ بھی منیہ کے پاؤں پر جھکا ہوا تھا۔

وہ بڑا کر سیدھی ہو گئی۔ السلام علیکم خالو جان۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

شیخ صاحب ایک لمحے کو جیسے محمد ہو گئے تھے۔ یوں بھی ان کا ذہن سویا ہوا تھا۔ ماں کو بے ہوش دیکھ کر بیلا دیوانہ وار لڑکھائیں بلالائی تھی۔

ہاں۔ انہوں نے ایک لمبی ہوں کے ساتھ شہوار کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

خوب۔۔۔۔۔ تو سفارت کار بھیجا گیا ہے۔ وہ مجبور تھے۔ ان کی زبان کو تیر برسانے کی عادت تھی۔

شہوار اپنے سلام کا عجیب و غریب جواب پا کر دم سادھے کھڑی تھی۔

میں پوچھتا ہوں تمہیں اس گھر میں داخل ہونے کی جرات کیسے ہوئی؟ یہ شیخ رحیم الدین کا گھر ہے بی بی۔

لوہلاں کا نہیں۔۔۔۔۔ کہ پک اونچی۔۔۔۔۔ کام چھوٹے۔ میں اپنی بن یا ہی بیٹیوں کو تمہاری صحبت نہیں دے سکتا۔

برعریٰ کے پردوں میں سٹ کر بیٹھنے والی بچیاں ہیں۔ سردار۔۔۔۔۔

خالوجان! خدا کے لئے۔ شہوار نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی۔

آپ کو اللہ کا واسطہ..... میرے ناکردہ گناہوں کی کچڑ بس مجھ پر ہی بھسکیے۔ میرے ماں باپ صرف اسے گناہگار کہہ دیرے ماں باپ ہیں۔ اس سے زیادہ ان کا قصور نہیں۔ آپ کو حق ہے جیسا چاہے مجھ سے سلوک کیجئے۔ مگر میرا والدین۔ جس کے ساتھ تمہارا تعلق ہے۔ کیا وہ تمہارے لئے کافی نہیں.....؟ ہم تمہارے کسی کام کے نہیں ہیں۔ وہ فخر ناک دکھائی دیے۔

میں اس ناخبر کار کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتا۔ اس سے وابستہ کسی چیز کو دیکھنے تک کار وادار نہیں ہوں۔ بھرتم خواہاں آدھا گھر ہو۔

آپ اگر ان کا نام زبان پر ایک دفعہ لانا نہیں چاہتے تو میں ہزار بار لانا پسند نہیں کرتی..... کوئی تعلق نہیں ہے میرا ان سے۔

شہوار جو کبھی ان کے سامنے ”جی“ اور ”ہوں“ سے زیادہ نہیں بولی تھی کسی بری طرح پھٹ پڑی تھی۔

شجریم الدین نے ابھی ہوئی نظریں بیوی پر دوڑائیں۔ اصر کہاں ہے؟

باہر گیا ہوا ہے۔ شاید پڑھنے۔ نائلہ نے جلدی سے کہا۔

ہاں۔ پڑھنے..... اس کی پڑھائی ختم نہیں ہوتی..... اتالیق لگے گا بادشاہوں کا..... باہر گھومنے کے بہانے بنا لئے ہوئے ہیں۔ لے کر آتا ہوں ڈاکٹر کو۔ تب تک تم پانی کے چھینٹے وغیرہ مارو۔ ہاتھ جبر سہلاؤ۔ وہ عجیب رنگا شہوار پر ڈال کر باہر نکل گئے۔

وہ سب..... ماں کے گودوں پھیلیوں سے چٹ گئیں۔

مگر صفیہ کو ہوش آ کر نہ دیا۔

وہ سب ماشاء اللہ اتنی تھیں کہ شہوار کو خالہ پر ہاتھ رکھنے کی جگہ ہی نہ ملی۔

وہ ایک طرف کھڑی ہو کر ان سب کی کاروائی دیکھنے لگی۔

ان تمام باتوں کے ذمہ دار تم ہو احسن..... میں نہیں.....

خالہ کی کیفیت سے جو احساس جرم بار بار ڈنکے لگتا تھا۔ بلا آخر اس نے جھلا کر اس کا رخ ہی موڑ دیا۔

میں کیا کروں.....؟

مجھے پہلے سے ان تمام باتوں کا علم ہو جاتا تو..... میں احسن کی شکل پر نگاہ ڈالنا بھی کفر سمجھتی۔

احسن نے ایک بار اسے شانوں سے تمام لیا تھا۔ اس دن کی حرکت اس کے دل کا ناسور بن گئی تھی۔

اسے اپنے وجود کے اس حصے سے کراہیت آنے لگی تھی..... کاش میری زندگی میں یہ وقت نہ آیا ہوتا۔

کاش میں اس بے رحم کے سامنے سے بھی دور رہتی۔

مجھے نفرت ہے تمہارے نام سے..... تمہارے وجود سے حتیٰ کہ تمہارے سامنے سے بھی..... اس کی لہر بس میں نہر دوڑنے لگا تھا۔

شجریم الدین اندر داخل ہوئے۔

اپنی ماں پر کوئی چادر وغیرہ ڈال دو۔ اور سب دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ وہ سب چونک پڑیں۔ مارے بوکھلاہٹ

کھیل تک ڈالنا بھول گئی تھیں۔ نائلہ نے کبل ماں کے گلے تک پھیلادیا تھا۔

لو سب تیزی سے باہر نکل گئیں۔

پتہ منٹ یا کچھ دقت گزرا ہو گا کہ ڈاکٹر چلا گیا..... صفیہ کو ہوش آچکا تھا۔

شہوار سمیت تمام لڑکیاں ان کے کمرے میں دوبارہ آ گئیں۔ صفیہ نیچے کے سہارے بیٹھی تھیں۔ ان کی نظریں ٹٹولتی

آواز شہوار کے چہرے پر تنگ گئیں۔

شہوار اوجھڑاؤ بیٹا..... ان کا انداز اس جرنیل کی طرح تھا جو اپنی تمام صلاحیت میدان کارزار میں صرف کرنے کے

پہلے ہار گیا ہو۔

شہوار ہچکچاتی ہوئی ان کے قریب پہنچی۔

صفیہ نے اس کا ہاتھ تمام کراپے قریب پہنچی۔

صفیہ نے اس کا ہاتھ تمام کراپے قریب بٹھالیا۔

شاید میرا نون سے دوری..... گھر سے بے گھر ہونے کے عمل نے میرے بچے کی صلاحیت چھین لی ہو۔ وہ ایسا تو نہیں

ان کی آواز آنسوؤں میں ڈوبنے لگی۔

وفا کی ہر ماں کے پاس شاید بچے کی بے گمانی یا کوئی نیکوئی جواز ہوتا ہے۔ شہوار نے لہجے کی کڑواہٹ پر قابو

لے ہوئے بہر حال دل کی بات کہہ دی۔ وہ اندر سے بھری ہوئی تھی۔

گھمری ہوئی تھی۔

خالہ کی طبیعت اسے محتاط تو کر رہی تھی۔ مگر اس کے اندر کالا واکسی مصلحت کی خاطر رکسنے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہو رہا

نہ۔

صفیہ ایک دم چپ سی ہو گئیں۔

جب وہ چھپیں لے ہی گیا تھا تو پھر..... ان کی آواز میں نہایت دھمی تھی۔

وہ مجھے میری مرضی کے خلاف لے کر گئے تھے۔ میں نے احتجاج کیا تو مجھے چھوڑ دیا۔

خدا بخوات..... صفیہ کا دل پھر ڈوبنے لگا۔

کاغذ دے دیا..... چھپیں.....؟ ارے احسن یہ کیا غضب کیا۔ سات بہنیں ہیں تیری.....

ساری زندگی دکھ مجھے روندتے رہے ہیں۔ اب مکافات عمل سے بھی گزرنے کی سزا باقی ہے۔ ادھر میرے خدا!

خالہ جان! ابی الحال انہوں نے مجھے کاغذ و اغذ نہیں دیا ہے۔ شہوار خالہ کی حالت کے پیش نظر جلدی سے بولی۔

اس قدر مشکل سے حاصل کی گئی چیز اتنی آسانی سے کیسے چھوڑ دی اس نے۔ صفیہ حیران تھیں۔ وہ شہوار کے چہرے پر

ہلکا سا رنگاں ہیں ڈال رہی تھیں جو ان کے شانے سے سرنگائے ویران ی بیٹھی تھی۔

خالہ جان! امی اور دوسرے گھر والوں کے ساتھ میری وفاداری پر انہیں اعتراض تھا۔

ان کا خیال تھا کہ مجھے بیوی ہونے کے ناطے ہر قسم کے غلط اقدام میں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔ جو میرا ضمیر مرکز بھی

لگا کر رکھتا۔

خالہ جان! آپ بھی مجھے نکال دیں۔

میں مزید دھکے کھانے کے لئے آمادہ ہوں مگر احسن کے پاس جانے کے لئے نہیں..... کم از کم اس میں میرا ضمیر مرکز

مطمئن ہے۔ کم از کم اس طرح میرے والدین کو میری بے گناہی کا یقین تو آ سکتا ہے۔ بلا خردہ رو پڑی۔  
صفیدہ دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ بلاشبہ یہ سانحہ ان کی زندگی کا عظیم سانحہ تھا۔  
کہ زندگی کے بہت سے بحر انوار میں۔

ان کے سامنے قیادل راستے اور ترجیحات موجود ہوتی تھیں۔ جن سے حالات کی سختی کم محسوس ہوتی تھی۔  
مگر اس وقت وہ قطعی خالی الذہن تھیں۔ شیخ صاحب کے سامنے احسن کی کھلم کھلا حمایت۔

اس کی ذات پر اعتماد۔ اور امان۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔ اب خیر نہیں تھی۔ یقیناً شیخ صاحب سارے حجاب  
چکانے کو بے تاب ہو رہے ہوں گے۔ ان کے کلیجے میں ٹیس سی انگی۔  
انسان کی قسمت خراب ہو تو اسے خوشی کبھی راس نہیں آتی۔

اب دیکھو ہمارے ہاں بہمان آنے والے ہیں۔ ہر معاملہ چو پٹ پڑا ہے۔

میں اپنی بچیوں کے معاملات میں اس قسم کی بد شکوئی قطعی برداشت نہیں کر سکتا۔

شیخ صاحب حسب توفیق مگر جے برستے داخل ہوئے تھے۔ شہوار ایک دم ڈر کر خالہ سے الگ ہو گئی۔

تمام لڑکیاں الگ ہڑا کر کھڑی ہو گئیں۔ مہمان۔۔۔۔۔!!! وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

شیخ صاحب! آپ اطمینان رکھیں۔ جس وقت مہمانوں کو کھانا کھانا چاہیے انہیں اسی وقت ملے گا۔ وہ ہتھیار پھینک کر  
اس کی طرف اک قدم بڑھا کر بولیں۔ مبادا شہوار کے سامنے کسی قسم کی بد مزگی ہو۔

مگر برائے مہربانی اب آپ کو کوئی بات شروع نہ کریں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے ایک طرح سے  
استدعا کی تھی۔

اس معاشرے کی حساس اور ذمہ دار ماں۔ جو تمام موافق حالات صرف اس لئے برداشت کرتی ہے کہ اسے اپنی اولاد  
کی خوشی ہر قیمت پر درکار ہو رہی ہے۔

وگرنہ یہاں ان عورتوں کی کبھی تو کوئی نہیں جو اپنی ذاتی اتنا اور ذاتی سکھ کی خاطر اپنی اولاد کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مصائب  
کے جنگلات میں بھٹکتا چھوڑ دیتی ہیں۔

کہہ کی کو شوہر پسند نہیں آیا تو اس نے آگے جا کر اپنی پسند وھوٹلی اور پرانا تعلق توڑ لیا۔ ایسی عورت کی تو اولاد بھی  
پاؤں لگی زنجیر نہیں بن پاتی۔

یا پھر کسی بے بنیادی بات ہی کو انا کا مسئلہ بنا کر علیحدگی حاصل کر لی۔ اور اپنی اولاد کے لئے ہمیشہ کے لئے طلاق یا نہ  
ماں کا ٹائٹل حاصل کر لیا۔

ایسا طعنہ۔۔۔۔۔ حساب اور جیتے جاگتے انسان کی صلاحیتوں کو کھانے کے لئے کافی ہے۔

ایسی ماؤں کی جھکی جھکی آنکھوں والی۔۔۔۔۔ بے قصور مگر شرمندہ شرمندہ سی اولاد۔۔۔۔۔ کتنے عذاب کا شئی ہے۔  
انسانوں کی جذباتیت سے کتنے انسانوں کا اخصال ہوتا ہے۔

زندہ مگر شرمندہ سے انسان۔۔۔۔۔ کہ ماں تو غیرت کا سب سے بڑا عنوان ہوتی ہے۔

طلاق ایک گالی ہے۔۔۔۔۔ اس معاشرے میں۔ جب ہی تو حلال ہونے کے باوجود اللہ کو پا پسند ہے۔

گالی یا نہ ماں۔۔۔۔۔ رحمت نہیں رحمت بن جایا کرتی ہے۔

یہی وجہ تھی۔

میں کا منوں پر چل کر شیخ رحمہ اللہ میں کی رفاقت کا حق ادا کرنے کو تیار تھیں۔ مگر اپنی بیٹیوں کے لئے عمر بھر کا طعنہ بننے کو  
انہیں نہیں۔ زندگی میں کئی بار ایسے مرحلے آئے تھے کہ وہ اور شیخ صاحب ایک لمحے میں غیر ہوتے ہوتے رہ گئے تھے۔  
میں نے کمال چابکدستی سے۔ صفیدہ کا گلا گھونٹ دیا تھا اور ماں کو زندہ رہنے دیا تھا۔

جو عورت ایسے مراحل سے سرخرو گزرتی ہے۔ وہی تو ماں کو زندہ رہنے دیا تھا۔

جو عورت ایسے مراحل سے سرخرو گزرتی ہے۔ وہی تو ماں ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی جوان بیٹیاں ان کی  
راتیاں محسوس کرتی تھیں۔ اور ماں کے قدموں میں بکھرے کو تیار رہتی تھیں۔

ہاتھ بیٹے! ایسا کرو گھر والوں کو ملنا کدیں پندرہ آدمیوں کے لئے بریانی بنا لو۔۔۔۔۔ میرا سر پکرا رہا ہے بیٹے! اور نہ میں  
ہمارا ساتھ دے سکتی۔

ای! آپ آرام کریں۔ کوئی بات نہیں ہم کر لیں گے سب کچھ۔ مگر آ کون رہا ہے۔۔۔۔۔؟ ناملہ نے پیار سے ان کے  
اٹے تمام کر پوچھا۔

تمہارے ابا جی کے ملنے والے ہیں۔ نیلہ کے سلسلے میں آ رہے ہیں۔

نیلہ کے دل پر جیسے آری سی چلی تھی۔ (ہونہہ)۔۔۔۔۔ کیا اب یہاں آئے دن یہ ڈرامے ہوتے رہیں گے۔ وہ بولی تو  
میں دل ہی دل میں کڑھتی باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلنے کا انداز غیر معمولی تھا جو ناملہ اور صفیدہ نے بخوبی محسوس کیا تھا۔

بیلا اور رحیلہ کو کہو، یہ سلا دینا لیں گی۔ کہابوں کا قیمہ رکھا ہے۔ انیلا سے کہنا۔ کہاب وہ بتا لے گی۔ ایک گھنٹے میں کھانا  
پارہو جائے گا تو ڈوڑی سی کھیر بنالینا۔ اگر وقت ہو تو گرنہ احمرے کو کی مٹھائی منگو لیا۔ وہ تھک کر جیسے لیٹ گئیں۔

میں اور ناملہ کھانا تیار کر لیں گے خالہ جان! آپ بالکل ٹکرنہ کریں۔ شہوار اٹھ کھڑی ہوئی۔

نہیں بیٹم آرام کرو۔ یہ لوگ کر لیں گی۔ صفیدہ بولیں۔

خالہ جان۔۔۔۔۔ میں اسے آپ کی محبت سمجھوں یا ایسا ہی گریز جو میرے والدین کی طرف سے مجھے درپیش ہے؟

صفیدہ نے ہنر شال میں لپٹی شہوار کو محبت سے دیکھا۔

مجھے علم نہیں کہ دوسرے لوگ تمہارے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ مگر اپنے بارے میں کہہ سکتی ہوں۔ تمہیں نقصان ایک  
لوح سے میرے ہی وجود سے پہنچا ہے۔ لہذا اتادان بھی میرے ذمے ہے۔ میں نے سات بیٹیوں کو ختم دیا ہے۔ وہ

حقیقت دونوں بیٹیوں کی ماں ہوں۔

ایک احسن کی دلہن ایک احمر کی۔۔۔۔۔ ہے نہیں تو کیا انشاء اللہ وہ بھی دن آ جائے گا۔

خالہ جان۔۔۔۔۔ خالہ بھی تو ماں ہی ہوتی ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ جائے پناہ کی تلاش میں آپ تک آئی ہوں۔

مجھے احسن کے حوالے سے آپ کی بیٹی بننا منظور نہیں۔

وہ بے رحم انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

صفیدہ ششدر رہی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

انہوں نے تو شہوار کو کبھی اس توڑ سے بولتے دیکھا ہی نہیں تھا۔ نیلوفر کے مقابلے میں تو وہ گوشتی ہی محسوس ہوتی تھی۔  
ان نے اور ناملہ نے نیلہ سے اذہاد اصرار کیا تھا کہ وہ کپڑے تبدیل کر لے مگر وہ نہیں مانی تھی۔ اور برابر ان کے ساتھ  
کام میں لگی ہوئی تھی۔

نالکھ نے زیادہ اصرار کیا تو ڈانٹ دیا تھا۔ بس خاموش ہو جاؤ گی۔

(کیوں کیا کپڑے بدلنے سے قسمت بدل جاتی ہے؟)

کیا میری بات بھی نہیں مانو گی؟ شہوار نے نرمی سے اس کے شانے چمکے۔

بھابی جان..... میں نے صبح ہی بدلے ہیں۔ پلیز..... اس نے چہرے پر اتنی قطعیت تھی کہ کوئی بھی مزید اصرار ہمت نہ کر سکا۔

(میں کون سا تمہارے بھائی کے ساتھ ہوں۔ یا تم لوگ رخصت کر کر لائے ہو؟ بھابی جان۔ بھابی جان۔ ہونہ۔ سر پیٹھ لگتا ہے یہ لفظ سن کر میرا)

نئی آپا..... آپ کو امی بلارہی ہیں۔ ایٹلا اچانک پیچھے سے آ کر گویا ہوئی۔ نالکھ نے فوراً ہاتھ روکے اور تیزی سے جی امی.....؟ اس کے چہرے پر فکر اور لہجے میں جھٹکتی تھی۔

ادھر آؤ..... ایک ضروری بات کرنا ہے تم سے۔ منیہ بولیں۔

نالکھ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

دیکھو، میری بات سن کر دل میں کوئی خیال نہ کرنا۔ منیہ نے اس کی پیشانی سے بال سینے۔

جی.....؟ نالکھ کا دل دھڑک گیا۔

کوشش کرنا کہ تمہارا ایٹلا کا سامنا مہمانوں سے نہ ہو۔

گھمراہی.....! ظاہر ہے، وہ تو مرد حضرات ہی ہوں گے۔ ہم ویسے بھی ان کے سامنے نہیں جاتے۔ اسے ماں کی تانے الجھن ہوئی۔

نہیں..... عورتیں بھی ہیں۔ دعا کرو اچھے لوگ ہوں۔ نیلکھ کا معاملہ ساتھ خیریت کے منٹ جاتے تو پھر تمہارے ہا یقیناً رازی کے رشتے پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

نالکھ اٹھ کھڑی ہوئی (آپ تو مجھے خواب نہ دکھائیے امی) ٹھیک ہے امی! آپ بے فکر رہیے۔ وہ آہستگی سے؟ ہوئی واپس مگن میں آ گئی۔

کیا کہہ رہی ہیں امی؟ نیلکھ نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

کچھ نہیں۔ نالکھ نے بہم سا جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

(نالکھ کے مقابلے میں جیسے امی مجھے تو کوئی حیثیت ہی نہیں دیتیں۔ چنانچہ کیوں؟) وہ آذر دگی سے سوچنے لگی۔ عجیب نوعیت سی طاری رہتی تھی۔

جیسے احساسات پر برف سے آ پڑی تھی۔ آج گھر میں اگر چہ اس کے نام کی رونق تھی۔ مگر اس پر غفلت کوئی اثر نہ وہ محض روبرو کی طرح ہر احساس سے عاری اپنے کام میں مگن تھی۔ اس نے ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا تھا کہ کون لوگ اور کب تک آئیں گے۔ کہاں سے آ رہے ہیں۔ بیٹلانے اس کے ساتھ ہلکی مذاق کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی سرد نے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ چپ سی ہو کر کھسک گئی تھی۔

معاف ہر شور سا اٹھا۔

شجریم الدین کی آواز سے خاصا جوش و خروش ٹپک رہا تھا۔

بڑا پر تپاک انداز تھا جو نصیب سے شاذ غیاب دیکھنے میں آتا تھا۔ مگر نہ ٹھوکر سے تو دروازہ کھولنے کی عادت تھی۔

آپا..... دو عورتیں ہیں اور ایک لڑکی بھی ہے۔ سچ اتنی پیاری ہیں کہ کیا بتاؤں لڑکی شادی شدہ لگ رہی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں۔ ایک چھوٹی سی بچی ہے اور ایک لڑکا ہے گود میں۔ بیٹا بے ربطی تھی۔

مگر..... میں بھی دیکھ کر آتی ہوں۔ ایٹلا اپنا کام چھوڑ کر بھاگے گی۔

تم اپنا کام کرو۔ کوئی ضرورت نہیں۔ دعا کرو کہ اگر اچھے لوگ ہوں تو آپا کا رشتہ ہو جائے۔ پھر ساری عمر دیکھتی رہنا۔

نالکھ نے ایٹلا کو اٹھنے سے باز رکھا۔

ایٹلا جھام کی طرح بیٹھ گئی۔

کمانے سے پہلے تو چائے کا بھی ایک دور ہوگا..... کیوں؟ اور سنو تم ایٹلا کو کیوں روک رہی ہو۔ جانے دو اسے

ہر جگہ بیٹھ گئی۔ شہوار نے نالکھ کی ٹوک پر قدرے تعجب سے کہا تھا۔

لاؤ میں سالا بھونتی ہوں۔ تم چائے بنا کر شروع کرو۔ شہوار نے لڑکیوں کی رہنمائی کی۔ ان لمحات میں وہ اپنی افتاد لگ کر میں مدغم ہو چکی تھی۔

آپ کو نہیں پتا بھابی جان! امی کی ہدایت کے مطابق ہی کر رہی ہوں۔ اپنی طرف سے منع نہیں کر رہی ہوں ورنہ مجھے مزاحم ہو سکتا تھا۔ خود سوچے۔

نالکھ جان نے منع کیا ہے؟ شہوار نے حیرانی سے نالکھ کی طرف دیکھا۔

جی..... وہ اختصار سے بولی۔

کیوں؟ تعجب ہنوز برقرار تھا۔

انجی سے پوچھ لیجئے گا۔ میری خیال میں جب گھر میں کی لڑکیاں ہوں اور ایک سی نظر آ رہی ہوں تو نمبر سے نمٹانے لے شاید ایسا ضروری ہو جاتا ہے۔ بیٹا اور ارا حیل کی تو بات طے ہو چکی ہے۔ ان سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

نیلکھ نے قدرے چونک کر اور مڑ کر نالکھ کو دیکھا۔

گویا تم بھی نہیں جاؤ گی؟ شہوار نے پوچھا۔

جی، میں بھی نہیں..... مگر آپ جا سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ تو ہماری بھابی ہیں۔

نہیں۔ شہوار نے تنگی سے نالکھ کی بات کاٹ دی۔ میں صرف تمہاری خال زاد بہن ہوں۔

ہاتھ اس کے برابر خستہ انداز پر خاموش ہو کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شہوار سے ایک ایک تفصیل پوچھے۔ کہ لڑکی یہاں تک کیسے آ گئی۔ مگر وقت نامناسب تھا خاطر خواہ جواب حاصل ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لہذا خاموشی

ملنے کا نام میں مصروف رہی۔

تھوڑی دیر بعد بیٹا پیغام لے کر آگئی کہ بلو آپا کے ہاتھ چائے امی کے کمرے میں بھجوا دیں اور احمر کے ہاتھ مردوں لکھا اس کے آدھے کھٹے بعد لگائیے گا۔

نالکھ اور شہوار جلدی جلدی چائے کی تیاری میں مصروف ہو گئیں۔

آپا..... پلیز..... بال تو بنا لیجئے۔ نالکھ نے گویا درخواست کی۔

دیکھو..... تم مجھے تنگ نہیں کرو۔ ورنہ میں چائے لے کر بھی نہیں جاؤں گی۔ نیلکھ نے ڈانٹنے کے انداز میں نالکھ کو ٹوکا۔

شہوار کو نیلکھ کے رویے سے الجھن تو ہو رہی تھی مگر مصطفیٰ خاموش تھی۔

بھابی جان! آپ آپا کے ساتھ چلی جائیے گا چائے لے کر وہ ہدایت دینے سے باز نہ آئی۔

نے افسردگی سے جواب دیا۔

ہاں..... کیا ہے..... آپ مجھے وہاں چھوڑ کر کیوں آگئیں؟ نبیلہ اندر داخل ہوتے ہی جھلائی۔  
مگر خالہ جان تو ہیں۔ شہوار بھی وہ برامان گئی ہے۔ جلدی سے بڑی سادگی کے ساتھ وضاحت کی۔  
پکی بات اور تھی۔ مجھے ان کے سامنے بیٹھ کر چائے بھی بنانا پڑی اور انٹی سیدی می باتیں بھی سننا پڑی۔ وہ عجیب  
ہی بولی۔

یہی؟ نائلہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے نبیلہ کی شکل دیکھی۔

اٹلا تو مجھے پتا نہیں۔ وہ پشت کرتے ہوئے برتن اٹھانے لگی۔ ایک شرمیلا سا تبسم اس کے ہونٹوں پر باوجود ضبط

نہا۔

طہیناں کی سانس نائلہ کے سینے سے آزاد ہوئی۔

لہلہا کر جلدی جلدی کھانا سجانے کے انتظام میں تندی سے مصروف ہو گئیں۔

پٹھی ہوئی جلدی جلدی راستہ بناری تھی۔ اب جوش و جذبہ سوار ہو گیا تھا۔ پورے وجود میں جیسے بجلی سودوڑنے لگی

رچا دل دم کر رہی تھی۔ نبیلہ سالن میں مدغم تھی۔ اس کے بھی کام کا انداز بدل چکا تھا۔

اسے نکھری لٹیں سینے کا بھی خیال آ رہا تھا۔

پوشہ درست کرنے کا بھی۔

یار ہاتھوں سے لاشعوری طور پر قص کی شکنیں بھی درست کر چکی تھی۔

بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کمرے میں واقعی کوئی بہت اچھی  
فہمی۔

نائلہ کی نظر اپنے دائیں جانب پڑی ننھے ننھے کالے شوز۔ اس نے چونک کر شوز سے اوپر دیکھا۔ خوبصورت سی

ماتن چار سال کی معصوم سی بچی مگر کمر سب لڑکیوں کو باری باری دیکھ رہی تھی۔

بھی دروازے میں کیوں رک گئیں۔ نائلہ کو اس کی معصوم سی شکل پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ مگر وہ آگے نہیں بڑھی  
اکر مگرانی رہی۔

اپنے عذاب آپ کی ہونے والی رشتے دار ہیں؟ نائلہ نے نبیلہ کو چھیڑا۔

بڑھنچ کر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔

مے پارو..... تم یہاں آ کر کھڑی ہو گئیں؟ میں ہاتھ روم میں دیکھ کر آ رہی ہوں۔

بخوش باش سی لڑکی دروازہ دھکیل کر اندر ہی چلی آئی۔

نائلہ دم نکھری ہو گئی۔ السلام علیکم وہ جلدی سے بولی..... انیلا بھی پلٹ کر سلام کرنے لگی۔

اٹلا..... تو اصل اجتماع یہاں ہو رہا ہے۔ وہی تو میں سوچ رہی تھی کہ سنا تو یہ ہے کہ ماشاء اللہ بھرا گھر ہے مگر نظر کوئی

نہا۔

بلوہ بھابی سے تو تعارف ہو چکا۔ آپ دونوں کی تعریف؟ لڑکی بہت خود اعتماد اور خوش اخلاق دکھائی دے رہی

ٹھیک ہے چلی جاؤ گی۔ شہوار نبیلہ کے انداز کی وجہ سے خاصی ڈری ہوئی تھی۔ فوراً ہابی بھری۔

انیلا..... کیا واقعی عورتیں اچھی ہیں؟ انیلا نے معصومیت سے اپنی بے چینی ظاہر کی۔

جج آپ..... بہت اچھی ہیں۔ باراتی بن کر آئیں گی تو بہت اچھی لگیں گی۔ وہ چچکا نہ شوخی سے کہہ کر نفس دلی۔  
اچھا زیادہ شور نہیں کر۔ نبیلہ نے پھر ٹوک دیا۔

چائے تیار ہو گئی تو ایک بڑی بڑے نبیلہ نے اٹھائی اور ایک شہوار نے۔ نبیلہ سادہ کپڑوں میں تھی۔

جب کہ شہوار سادہ کپڑوں کے علاوہ بھاری کام کی محلی شال بھی اوڑھنے ہوئے تھی۔ تھی تو وہ بھی دو شہزہ ہی مگر

کی شال اور سونے کی چوڑیوں کی وجہ سے بیاہتا سی نظر آ رہی تھی۔ نبیلہ کے مقابلے میں دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی  
میں داخل ہوئیں۔

تو مہمان خواتین کی نظرس نہایت اشتیاق سے ان کی طرف اٹھی تھیں۔

السلام علیکم..... دونوں نے نیکے بعد دیگرے سلام کیا جس کا نہایت پر جوش مشترکہ جواب آیا۔

یہ میری بیٹی نبیلہ ہے جس کا میں ابھی ذکر کر رہی تھی۔ تیسرا نمبر ہے اس کا میرے بچوں میں..... بیٹا میرا

ہے۔ اس کے بعد ماشاء اللہ پانچ بیٹیاں ہیں اور پھر دوسرا بیٹھا ہے۔ اس کے بعد کی ایک بچی میری نندہ نے گود لے

پھر ایک اس سے چھوٹی ہے۔

دونوں چھوٹی بچیوں کا رشتہ ان کی بھوپھی کے ہاں طے ہو چکا ہے۔ دراصل لڑکے انہی کی عمروں سے میل کھا

پئے ہیں ابھی۔

اور ہاں..... یہ میری بہو ہے..... میری چھوٹی بہن کی بیٹی بھی ہے۔ گویا میرا گھر اس کامیکہ بھی ہے اور سسرال

نہ جانے کس مشکل سے مسکرائیں۔

شہوار کے لئے یہ تعارف کسی عذاب سے کم نہیں تھا..... وحشت ہوتی تھی اسے اس رشتے سے۔

ماشاء اللہ بہت پیاری ہے آپ کی بہو..... بزرگ خاتون نے تعریفی کلمات ضروری سمجھے۔

بس اللہ تعالیٰ سب کی بچیوں کے نصیب پیارے بنائے۔ صفیہ نے جانے کیوں آہ کھینچی تھی۔ شہوار فوراً کر

باہر نکل گئی تھی۔

اسلام آباد آتے ہوئے اس کے دہم و گمان میں نہ تھا کہ یہاں اس کے مسئلے سے بھی اہم مسئلہ موجود ہوں گے

جو اس کی پریشانی تک پر حاوی ہو جائیں گے۔

اس کا خیال تھا وہ خالہ جان کو تمام تفصیل بتانے کے بعد درخواست کرے گی کہ وہ اس کو اس کے والدین کے گھر

پہنچانے کے لئے اپنی صلاحیت، تجربہ اور رشتہ روئے کار لائیں۔ مگر یہاں تو ماحول ہی سوچ کے برعکس ملا تھا۔ یہ

آپادھالی پڑی ہوئی تھی۔ اور اسے آپادھالی میں شریک ہونا پڑ رہا تھا۔

بھابی جان! کیسی لگیں وہ سب خواتین.....؟ وہ وہاں کچن میں آئی تو نائلہ نے بے قراری سے سوال کیا۔  
اچھی ہیں۔ اچھے گھرانے کی لگ رہی ہیں۔ وہ اپنی سوچ سے چونک کر بولی۔  
اللہ کرے بس اب آپا کر گھر بس جائے۔ نائلہ نے دل سے دعا کی۔  
تاکہ آپ کا بھی جلدی نمبر لگ جائے۔  
ارے نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل آپا کے ساتھ کئی بار زیادتی ہو چکی ہے۔ مجھ سے مزید کچھ اور



تھی۔ اور بہت شوشی سے نالکہ اور انیلا کو کچھ رہی تھی۔

جی مجھے نالکہ کہتے ہیں اور یہ مجھ سے چھوٹی انیلا ہے۔ بیلا اور راحیلہ سے تو آپ مل ہی چکی ہوں گی۔ نالکہ کا بوا کر نہایت اعتماد سے جواب دیا۔

اچھا..... تو آپ دونوں ابھی تک کیوں نہیں ملیں ہم سے..... وہ شوشی سے کھلکھلائی۔

ہم یہاں کام میں مصروف تھے۔ سو چاہتا کھانے پر تو ملاقات ہوئی جائے گی۔ نالکہ کو بروقت جواب سوچ کر دیا۔

”کھانے وغیرہ کا تو آپ نے تکلف کیا۔“ وہ روایتی انداز میں گویا ہوئیں۔

”کوئی تکلف نہیں کیا۔ کھانے کا تو وقت ہے ہی۔“ وہ بھی رسمی انداز میں گویا ہوئی۔

پڑھتی ہیں آپ؟ اس نے نالکہ کو سر سے پاؤں تک اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا۔

نالکہ کو ان نگاہوں سے جیسے خوف آنے لگا۔ حلق سوکھنے لگا۔

مجھے تو پڑھنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔ بس امی زبردستی کر رہی ہیں۔ میرا تو دل چاہتا ہے بس گھر میں رہوں۔

پڑھوں اور سوتی رہوں کام دام سے بھی خاص دلچسپی نہیں ہے۔

نبیلہ نے آہستگی سے نظریں اٹھا کر نالکہ کو دیکھا۔ درحقیقت سب سے زیادہ وہی گھر میں متحرک رہتی تھی۔

اسے نالکہ کے اس جذبے پر بے اختیار پیارا آ گیا جس کے تحت وہ گھٹ بیانی سے کام لے رہی تھی۔

کوئی بات نہیں لڑکیاں عمو ایسے بھی کرتی ہیں۔ مگر جب ذمہ داریاں پڑتی ہیں تب ان کے جوہر کھلتے ہیں۔

مسکرائی۔

آؤ بیٹا۔ وہ بچی کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئیں۔

نالکہ نے ایک گہرا سانس لیا۔

خدا کا شکر..... غالباً محترمہ بہانے سے ہمارا کچن دیکھنے آئی تھیں۔ نالکہ پھر بیٹھے ہوئے بولی۔

امی کہہ رہی تھیں ناں ایک دفعہ لوگ بچن سے گھر والوں سے سکڑاپے کا اندازہ لگاتے ہیں۔

وہ ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ مگر اندر ہی اندر دل کا پ رہا تھا۔ اسے اس لڑکی کی نظروں کی جیہٹوں پر ہنوز محسوس تھی۔ اس نے نبیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کسی سوچ میں گم تھی۔

بھابی جان! کیا خیال ہے کھانا لگا دیا جائے؟ اس نے فضا کا تاثر ختم کرنے کے لئے شہوار کو مخاطب کیا۔

خالہ جان سے پوچھ آؤ۔ شہوار نے مختصر جواب دیا۔

بھابی جان ایک بات نہوں برا تو نہیں مانو گے۔ انیلا نے نہ جانے کیا کہنے کے لئے اجازت طلب کی اور نبیلہ اور

بھی اس کی سمت دیکھنے لگیں۔

آپ امی جان کو خالہ جان کیوں کہتی ہیں؟ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

اس لئے کہ وہ میری خالہ جان ہیں۔ شہوار نے قدرے تعجب سے انیلا کو دیکھ کر جواب دیا۔

مگر وہ آپ کی ساس بھی تو ہیں۔ وہ شرارت سے مسکرائی ہمارے ہاں ساس کو امی جان کہنے کا رواج ہے۔ مجھے تو

اچھا لگتا ہے۔ جب کوئی بہو اپنی ساس کو امی جان کہتی ہے۔ وہ ہنس۔

شہوار کا جی چاہا کوئی تلخ بات کہہ کر اسے چپ کرادے مگر مصلحتاً مسکرا کر بولی۔

تم اپنی ساس کو امی جان ہی کہنا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

پائیز اگر چپ ہوئی۔

وہ وہ ہیں آپ بھابی جان۔ یہ کیا بات ہوئی؟

چاچوڑا اس قصے کو کھانا لگاؤ تلافی..... اس نے طرح دے کر قصہ کوتاہ کیا۔

کالے کی مصروفیات شروع ہوئی تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

پہلے تک کہ مہمانوں کے جانے کا وقت آ گیا۔

منو کو نالکہ نے چونکہ بتا دیا تھا کہ ایک مہمان خاتون ان سے کچن میں ملاقات کر کے چاچکی ہیں اس لئے نالکہ اور

بائوں کو خدا حافظ کہنے باہر آ گئی تھیں۔ پھر صفیہ نے بھی کوئی تاثر نہیں دیا۔ ملاقات کی خبر سن کر بلکہ وہ خاصی مطمئن

نظر آ رہی تھیں۔

مہمانوں کے جاتے ہی وہ بہت خوش خوش نالکہ کے پاس آئی تھی۔

لگتا ہے آزمائش ختم ہوگئی۔

نالکہ چونک پڑی تھی۔ وہ کیسے امی؟

واہ! رشتہ ڈال گئے ہیں۔

کالی..... نالکہ شوشی سے زور سے بول پڑی۔

تعلیقات تو وہ لوگ تمہارے اناجی سے پہلے ہی طے کر چکے ہیں صرف لڑکی دیکھنے کا مرحلہ باقی تھا۔

نہارے اباجی کے آفس میں کوئی برنی صاحب ہیں، انہی کے رشتے دار ہیں یہ لوگ۔ کہہ رہے تھے لڑکی ہمیں بہت

لگے۔ خاص طور پر اس کی سادگی نے بہت متاثر کیا۔

”اچھا امی!!!“ نالکہ نے انتہائی مسرت کی لہریں اپنے وجود میں اترتی محسوس کیں۔

امی بس آگے اللہ اچھا ہی کرے۔ لڑکا کسی فرم میں نہیں ہے۔ کہہ رہی تھیں فرم تو اگرچی چھوٹی سی ہے مگر

لب سا تھوڑا ہی رہتے ہیں، اس لئے گھر میں خوشحالی ہے۔ لڑکے کے والد بھی بزنس کرتے ہیں۔ تین بیٹیوں کی شادی

کے ہیں۔ ایک لڑکا بھی شادی شدہ ہے۔ دو اس سے چھوٹے ہیں۔ یہ جو ساتھ آئی تھیں ایک لڑکے کی ماں دوسری

لڑکی تیسرے سب سے بڑی شادی شدہ بیٹی تھی۔

نالکہ پر ایک سرخوشی کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اس کے کام میں مزید پھرتی آ گئی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ پہلی فرصت

بیک وقت فوری سنائے اور اس کا مطمئن سا چہرہ دیکھے۔

اگلے دو مہمانوں کے جانے کے بعد کچھ بیڑوں میں ابھی ہوئی تھی کہ اباجی کی پانٹ دار آواز سنائی دی۔

اسے بھی صفیہ!

لگا۔! کسی کو نے سے صفیہ کی ”جی“ سنائی دی۔

ٹھوکر ساتھ لے کرے میں آؤ۔

نالکہ کا دل دھک دھک کرنے لگا یا الٹی ہماری تو کوئی خوشی خالص نہیں ہوتی کہ ہمارا بھائی ہم سے دور ہے۔ جیسے لگتا

نہیں ہوئے زمانے گزر گئے۔

انہی ہماری بھی صبح خوبصورت ہوتی تھی۔

کہہ دے سویرے کھڑے کھڑے مضبوط دیوار جیسے بھائی پر نظر پڑتی تھی۔

ہماری تو دیواری ٹوٹ گئی۔

ہماری شام میں چراغاں ہوتا تھا۔

بھاری بھاری قدموں کی دھمک..... جیسے شام کا راگ سنتے تھے۔

کیسی آفت بج جاتی تھی۔ سارا گھر بھاگتا دوڑتا نظر آنے لگتا تھا۔

صفیہ سب سے زیادہ ہاتھ پاؤں پھلائے ہوتی تھیں۔

ارے احسن کے کپڑے لٹکا دیے۔

دیکھو بھائی کے لئے چائے بناؤ۔

ارے یہ احسن کے کمرے سے ریڈیو کون اٹھالا یا تھا۔ ہزار بار کہا ہے کہ اس کے کمرے کی چیز ابھر ادرہ

ارے یہ اخبار اس کے کمرے میں رکھا آئی۔

اس کا خط آیا تھا..... کمرے میں رکھا دیا تھا؟

ارے کوئی فلا نا اس سے ملنے آیا تھا بتا دیا.....؟

گویا عجیب چہل پہل نظر آنے لگتی تھی۔ اباجی کی آمد پر تو سب کو سانپ سونگھ جاتا تھا مگر احسن کی آمد

زندگی دوڑنے لگتی تھی۔

آہ..... نالکھ کے سینے سے ایک ہوک جی اٹھی۔

اباجی..... جتنی دھوپ میں لاکھڑا کیا ہے آپ نے ہمیں۔ چند اشک اس کی آنکھوں سے خاموشی سے پڑ

شہوار اس کے پیچھے کھڑی برتن اٹھا رہی تھی۔ حالانکہ وہ سب مل کر اسے کام سے باز رکھنے کے لئے ٹوک

”نیللی۔ خالو جان کیوں بلار ہے ہیں.....؟“ خوف کے لہجے سے ہوا یہ تھا۔

”پتا نہیں.....“ نالکھ کی آواز گلو گھر تھی۔

شہوار چونک کر اس کے سامنے آ گئی۔

تم رو رہی ہو..... مگر کیوں؟ وہ حد درجہ پریشان نظر آئی۔

”کچھ نہیں بھابی جان..... آپ کو دیکھ کر اپنا بھائی شدت سے یاد آ رہا ہے۔“

شہوار کے وجود میں کڑواہٹ گھل گئی۔

”تم مجھے اپنے بھائی سے منسوب کر کے مت سوچو۔ صرف اپنی خالہ زاد بہن سمجھو۔“ وہ رکھائی سے کہہ کر

ہونہہ بکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو حقیقت ہے وہ تو ہے۔ نالکھ نے دکھ سے سوچا۔

صفیہ غالباً آہستگی سے چلتی ہوئی اسے ہی بلانے آرہی تھیں۔ شہوار بیٹی آؤ تمہارے خالو جان بلار ہے

لے کر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

شیخ رحیم الدین پشت پر ہاتھ باندھے ٹھہر رہے تھے۔ دونوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر رک گئے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ حکم ہوا۔

شہوار جلدی سے بیڈ کے کونے پر ٹپک گئی۔

تم یہاں کیوں آئی ہو.....؟ تمہارا پروگرام کیا ہے؟ انہوں نے انتہائی ترشی سے سوال در سوال کیا۔

”گھر جانا چاہتی ہوں۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بھٹک گیا ہوئی۔

”گھر.....؟“ انہوں نے منہ پھیر کر تنگی سے پوچھا۔

”میرا صرف ایک گھر ہے۔ میں سردار محبت علی خان کی بیٹی ہوں۔ مجھے میری بیٹی شناخت واپس لوٹا دی

کی آواز بھر آ گئی۔

”.....؟“ شیخ صاحب واقعی متعجب نظر آئے۔

ہوش رہی۔

اپنی مرضی سے احسن کو چھوڑ کر آئی ہو۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

اپنی مرضی سے ان کے ساتھ گئی ہی نہیں تھی تو مرضی سے چھوڑنے کا کیا سوال؟“

بہنہ لکے

”جی ہو صفیہ.....؟“ وہ فاخرانہ انداز میں اور قدرے استہزائیہ انداز میں صفیہ سے مخاطب ہوئے۔

چہرہ دھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ آف پہلے طعنوں کی آج تھی اب طعنوں کے جہنم بھڑکیں گے۔

شہوار بے خبر۔ تجھے کیا پتا تیرے..... سچ مجھے کس جہنم میں اتاروں گے

بہنہ بردستی لے کر گیا تھا۔“

”.....! شہوار کو ٹوٹ کر حیا آئی۔ (میری چادر تار تار کر دی ہے تم نے احسن)

بہار بابا تو بہت بیچنے والا آدمی ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟“ وہ مشتہ نظر دوں سے شہوار کو گھور کر بولے۔

الات اس موڑ پر آ گئے تھے کہ شہوار کو حرف حرف سچ بتانا پڑا۔

ہم الدین کرسی پر بیٹھے انتہائی انتہاک سے سُن رہے تھے۔ اور صفیہ کے پاؤں سے زندگی لہر لہر خارج ہونے

بہنہ نہیں چلتا تھا کہ آگے بڑھ کر شہوار کے منہ پر ہاتھ رکھ دیں۔ اور کہیں کہ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ گوشتی بن

لیے نہیں کہ میرے بیٹے کی رسوائی ہو رہی ہے بلکہ اس لئے کہ مجھے چند سانس زندگی کے لئے مزید چاہئیں کہ

ماگو میری ضرورت ہے۔ اور تمہاری داستان ختم ہوگی۔

ہماری بد بختی کا نیا دور شروع ہوگا۔

راہستہ آہستہ موقع محل کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ”سنسن“ کرتے ایک ایک بات بتاتی چلی گئی۔ شیخ

لقے وقفے سے ہنکارا بھرتے اور دایاں ابرو چڑھا کر صفیہ کی سمت دیکھتے اور وہ یوں ہو جاتیں جیسے دور کہیں وہ بیٹا

ابو جس میں ان کی جان مقید ہو۔

”تم نے پرچا لکھا ہی کیوں.....؟“ وہ ہنوز مشکوک نظر آئے۔

ماہر قیمت پر ان کی قید سے رہائی چاہتی تھی اور مجھے امید تھی کہ احسن کو شش کے باوجود کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکیں

ہب کی رسوائی کا سبب ہو۔ کہ بہر حال وہ ہم ہی میں سے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اس وقت وقتی جذباتیت سے

میں میرے جانے کے بعد ٹھنڈے دل سے سوچیں گے تو کوئی دانشمندانہ قدم ہی اٹھائیں گے۔“

لہجہ کے پاس دانش ہی نہ ہو۔ اس سے اس قسم کی توقع رکھنا اصل میں انھوں کی جنت میں رہنا ہے۔“

انہوں نے بڑے طنز یہ انداز میں صفیہ کی سمت دیکھا۔ صفیہ کی نظریں نڈاٹھ سکیں۔

”تو بھی سن لیں تم نے اپنے صلاح الدین ایوبی کی داستانیں۔ ہم کافر ہیں اور وہ ہمارے خلاف“ جہاں ہیں۔

ارے بھی تمہیں بڑا ناز۔ بڑا فخر تھا اپنے شیر جوان بیٹے پر۔“

”شیخ صاحب خدا کے لیے۔“ صفیہ سر ایا احتجاج بن گئیں۔ ”وہ میرا ہی نہیں آپ کا بھی بیٹا ہے۔“

”لا حول ولا قوۃ۔ ائی لعنت بھیجتا ہوں میں ایسی اولاد پر۔ جو خاندان کو سر عام نیلای میں لگا دے۔ غمراہ اسے میرا بیٹا کہا۔“ وہ بری طرح بگڑ گئے۔

شہوار نے چونک کر شیخ صاحب کی شکل دیکھی۔ اسے اسی درجہ تقویت ہوئی جیسے معر کے میں تہارہ جانے والا کو اچانک کوئی اپنا ساتھی سپاہی نظر آ جائے۔

”تم اپنے باپ کے گھر کیوں نہیں گئیں؟“ شیخ صاحب پھر شہوار کی سمت متوجہ ہوئے۔

”پاپا نے کہہ دیا ہے۔ کذاب میں وہاں قدم نہیں رکھ سکتی۔ وہ اسی خطا کی وجہ سے مجھ سے بدگمان ہیں۔ جو زبردستی مجھ سے لکھوایا تھا۔

”آپ یہ حوالہ ختم کرو دیجیے۔“ وہ رودی۔

”خدا نہ کرے۔ ہمارا بھی بچپن کا ساتھ ہے۔“ صفیہ تڑپ کر بولیں۔

”ٹانگ میں ناٹور ہو جائے تو کاٹنا پڑ جاتی ہے۔“ شیخ صاحب برہمی سے بولے۔ احسن کو نیچا دکھانے کا ہاتھ آ رہا تھا۔

”بچی بے قصور ہے۔ ہمیں اس کے بڑوں کی حیثیت سے اس کے عذاب اپنے سر مول لینا چاہئیں۔“ مزہ بولیں۔ وہ شیخ صاحب کے عزائم بھانپ چکی تھیں۔

”مگر یہ خود اس ناٹجوار کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں ہے۔ سنائیں تم نے؟“ وہ گرج کر بولے۔

”بچی ہے۔ عقل نہیں ہے ابھی۔ مگر اس کے بڑوں کو تو ہوش کے ناخن لینا چاہیں۔ یہ آگ بھی دراصل اس نے ہی بھڑکائی ہے۔ ٹھنڈا کرنا بھی ان ہی کی ذمہ داری ہے۔“ صفیہ اپنے غصے پر قابو پا کر رسائیت سے بولیں۔

”میں سمجھاؤں گی احسن کو۔“

”ہونہر۔ بڑھے طوطے پڑھاؤ گی؟“ وہ تمسخرانہ انداز میں بولے۔

”بچے بیچے ہوتے ہیں۔ انہیں سمجھانا بڑوں ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ تلخی سے گویا ہوئیں۔ حد ہوتی۔ نشتروں کی۔

اور ہاں یہ تم نے بالکل درست کہا کہ یہ آگ بڑوں ہی کی بھڑکائی ہوئی ہے۔ اس ناخلف کی سب سے بڑی۔

”بڑی“ تو تم ہو۔ تمہاری شہ اور اس کے عیبوں کی پردہ پوشی نے ہی ہمیں ان ذلتوں میں پھنسا دیا ہے۔ سب

ذمہ دار تو تم ہو۔

بس آخری بات سن لو۔ جو اس بچی کا فیصلہ ہے وہی میرا بھی ہے۔ کیونکہ میں کسی طرح بھی اسے اپنے گھر میں دے سکتا۔ میری اپنی بچیوں کے لیے مسئلے کھڑے ہو سکتے ہیں۔

بہت بات تھا تمہیں اپنے اپنے بیٹے پر کردہ تمہارا بوجھ بانٹے گا۔ گرہ میں جو تھے وہ تو عذاب دیے ہی دیے۔

ہوا ہے۔

پچھ خوف خدا کریں شیخ صاحب۔ ہمارا بھی بچپن کا ساتھ ہے۔ یہ بے چاری کہاں جائے گی۔ سب سے بڑھ کر یہ ارکی ذمہ داری۔“

چنانچہ یادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ پرسوں وہ لوگ جواب لینے آئیں گے۔ فی الحال میں سونا چاہتا ہوں۔

ایرامیٹ کر لیتا۔ تماشا گھر بنا رکھا ہے۔

سے سکون ہی نہیں ہے زندگی میں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میرا کوئی بیٹا ہی نہ ہوتا۔

رے اپنے گھر کے بکھیرے کیا کم ہیں؟ اب میں اس کی بیگار بھی بھروں۔ بڑا مجھے قالینوں پہ چلا رہا ہے۔ گھر میں

لا رہا ہے۔ ناخلف۔ ناٹجوار۔ آوارہ۔“

بڑا بڑا ہوتے ہوئے بستر پر لیٹ گئے۔

یہ نہ شہوار کو اشارہ کیا۔ دونوں آہستگی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئیں۔ انہوں نے محبت سے شہوار کا شانہ

تھپاتا نہیں بیٹی۔ زندگی میں امتحان بھی آتے ہیں۔ انشاء اللہ تمہاری مشکل آسان ہوگی۔ نیک رہو۔ دعا لیتی رہو۔

الہ کے الفاظ ساون کی پہلی پھوار کی طرح اس کے وجود پر اترے تھے۔

میں دیکھ کر تمام ملازمین حواس باختہ سے ان کی طرف بڑھے تھے۔

اپنی صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔“ ایک ملازم نے مودبانہ انداز میں کہا۔

”معلوم ہے مجھے۔“ وہ نرمی اور سکون سے گویا ہوئیں۔

”تمہارے صاحب کا بیڈروم کس طرف ہے؟“ انہوں نے ملاحت سے پوچھا۔

”جی۔؟“ وہ سہم چوکنے ہو گئے۔

”آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھو بیگم صاحب۔ صاحب آنے والا ہے۔“ نوجوان پٹھان ملازمہ نے بھی بہت

اسے کہا۔ ہر چند شک کی نظروں سے وہ بھی دیکھ رہی تھی۔

وہ زندگی میں پہلی بار کراچی نہیں آئی تھیں۔ مگر جب کبھی وہ آیا کرتی تھیں تو یہ گھر اور یہ ملازمین نہیں تھے۔ ان دنوں ملی مستقل نوشہرہ ہی میں ہوا کرتے تھے اور وہ اپنے اپنے رشتہ داروں سے ملنے ملائے سال ڈیڑھ سال میں یہاں آیا

تھیں وہ انعام علی کے اس گھر میں پہلی بار آئی تھیں۔ انہیں یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

آج کسی مجبور کی خاطر وہ حوصلہ مضبوط کر کے یہاں داخل ہوئی تھیں تو ایک ملازم انہیں شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے

النا پر پھر دے رہا تھا۔ دل میں جیسے کہیں خنجر چلا تھا۔

لہو کی ایک بڑی دھارا اندر ہی اندر بھل بھل بہہ نکلی تھی۔

وہ ان سب کو نظر انداز کرتی ہوئی کچن میں چلی آئیں۔

جہاں لکٹ بڑی تندہی سے مصروف تھا۔ ”کیا بنا رہے ہو آج کے کھانے پر؟“

لاؤ۔ غالباً تم کبھی بھون رہے ہو۔ بہت محنت لیتی ہے یہ ڈش۔ سارا ذائقہ اس کی ٹھنڈائی پر منحصر ہے۔ لاؤ میں بخود

اتم کوئی اور کام کر لو۔“

نہ جانے کیوں ان کا دل چاہا یہاں کام کرنے کو۔ لکٹ نے تعجب سے ان کی سمت دیکھا۔ یہ اپنائیت یہ بے تکلفی۔

”گھبراؤ نہیں بھٹی۔ میں تمہارے صاحب کی رشتے دار ہوں۔ قریبی۔“  
نور بانو پھسکی سی ہنسی ہنس کر ڈراتر بھی ہوئیں تو چونک پڑیں لیکن کے دروازے سے کچھ فاصلے پر انعام  
کیس سمیت کھڑے تھے۔



ہاں نہیں۔

..... بازار میں گزرتے ہوئے کسی سے مل جائیں۔

..... دوران سفر یونہی نلکرا جائیں۔

ہنس کی دھمکیل۔ جیسے ہجوم میں نلکراؤ۔

سات اپنے ہی کسی ضروری کام میں مگن رہیں۔

ن تیز ہونہ دم۔

ل میں کوئی تغیر واقع نہ ہو۔

مانے گھوم کر برز بہت دھیمہ کر دیا۔

ما تو کیفیت یوں تھی۔

وئی مسافر بھگ کر کسی جنگل میں جا نکلے۔

ب سمت باہر نکلنے کا راستہ دکھائی دے۔ ”خواہ ہونہ۔“

سر پٹ دوڑنا شروع کر دے۔ مگر دوڑنا چلا جائے اور یقین سے خالی ہوتا جائے کہ منزل ہنوز دور ہے بلکہ

۔ ہر راستہ سراب ہو۔

لنے کا جو راستہ بھی اختیار کرے وہ اسے پہلے سے بھی زیادہ تباہ و تارک مٹے میں پہنچا دے۔

ہے ہی کسی جنگل میں برسوں سے بھگ رہی تھیں بلکہ مایوسی کی آخری حد کو چھو کر۔

سایہ دار درختوں کی چھاؤں سے سمجھوتا کر کے۔۔ جنگل ہی ”جائے“ کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔

انعام علی پلٹ کر اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے۔

حاضر ملازم حیران و ششدر تھے کہ صاحب کے گھر میں جس خاتون کو پہلی مرتبہ دیکھا صاحب اس سے بات کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کوئی تاثر نہیں دیا۔

حالانکہ انہیں اس خاتون کی موجودگی کی بات کرنا چاہیے تھی جب کہ انہیں لاؤنج ہی میں بتا دیا گیا تھا۔ اور اب ان خاتون ہی سے لازماً کرنا چاہیے تھی جو ان کے بچن میں اپنا استحقاق استعمال کر رہی تھی۔

انعام علی کی خاموشی اور ان کی پلٹ جانا ان سب کے لیے اچھا بھلا تھا۔ تھک ہار کر وہ پھر نور بانو ہی کی سمت متوجہ ہوئے۔ نور بانو نے چادر درست کی اور باہر نکل آئیں۔

وہ آہستگی سے انعام علی کے بیڈروم تک آئیں اور انگوٹھی سے دستک دی۔

”میں ہوں۔“

نور بانو ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوئیں اور دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔

”انہیں اس لیے تو وہاں نہیں چھوڑا کہ خالی جگہ پر آپ آجائیں۔ اگر یہ جگہ خالی ہوگئی تو بھی آپ.....“

”میں کسی کی جگہ کو بڑھنے کی خواہش مند نہیں ہوں۔“ نور بانو نے نہایت نرمی سے ان کی بات کاٹ دی۔

انعام علی کوٹ اتار کر بستر پر ڈال چکے تھے۔ اب ہاتھ ٹائی کی ناٹ پر تھے۔ نور بانو کے پرسکون انداز پر ایک لٹلا کے ہاتھوں کی حرکت رکی۔

”پھر.....؟ آپ کی تشریف آوری کی وجہ؟“ ان کی تلقینی صرف نور بانو ہی برداشت کر سکتی تھیں۔ کیوں کہ وہ اس عادی ہو چکی تھیں۔

اگر پہلی بار کوئی ان کی اس تنہی کا سامنا کرتا جس میں صدیوں کا زہر گھلا محسوس ہوتا تھا تو شاید صدمے سے مر جاتا۔

”میں صرف اس لئے آتی ہوں کہ آپ سے یہ عرض کر سکوں۔ کہ ہرے بھرے کھیت کی کٹائی کے دوران گھا پونس اور کوڑا بھی کٹ جاتا ہے۔ مگر کوڑے کرکٹ اور گھاس پھونس کے ساتھ کوئی اپنا سرسبز کھیت کبھی نہیں نوچتا۔

ہم تو گھاس پھونس ہیں۔ انعام علی۔ اپنا کھیت مت اجاڑیے۔

”آپ فیصلہ کرتے ہیں خود مختار سہمی مگر یہ ضمانت نہیں کہ فیصلہ درست نہیں بھی ہو۔ کسی مظلوم کو واہنگی کا خواب نہ تو۔“

(ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ دل ٹوٹے اور اثر نہ ہو) ان کی آنکھوں سے دھمونی ٹوٹ کر گرے۔

”میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے وراثت میں مکافات عمل کے ڈکھ لیں۔ انعام علی آپ میرے دونوں بچوں کو عاز دیں مگر۔ اسے لے آئیں۔ میں زندگی بھر آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔“ نور بانو کی آواز بھر اگئی۔

”اب میرا اور ان کا جھگڑا ہے۔“ انعام علی نے ٹائی اتار کر ایک طرف ڈالی۔

”وہ ابھی آپ کو نہیں جانتی۔ کم عمر ہے۔ اس کے دل سے مت کھیلے۔“ انہوں نے التجائی۔

”اس سے اتنی ہمدردی؟ تعجب ہے۔“ انعام علی استہزائیہ انداز میں مسکرائے۔

”اس سے ہمدردی کہاں، اپنی غرض ہے۔ میں کسی کی بھی آہ اپنے بچوں کے سر نہیں لگانا چاہتی۔“ وہ شکستہ انداز گویا ہوئیں۔

”اس پر عذاب ہماری وجہ سے آیا ہے۔ اس کا تو صرف انشا تصور ہے کہ وہ آپ سے وابستہ ہے۔ نباہ رہی ہے۔“ وہ جی سے گویا ہوئیں۔

”نباہ رہی ہے؟ کیا مطلب؟ اس نے تم سے کچھ کہا؟“ انعام علی کے ذہن میں ٹھک کا ناگ سرسرا یا۔

”گناہ ہے، اس نے اپنی مرضی سے تو شادی نہیں کی۔ اس کے والدین نے جہاں کر دی اس نے سر جھکا دیا۔ مگر پڑ۔“

چھوڑیے اس سارے قصے کو..... آپ اسے لے آئیے۔ یوں بھی ان دنوں آپ کا فرض ہے کہ اس کا خاص خیال لیں۔“

وہ اس طرح ہچکچا کر گویا ہوئیں جیسے وہ اپنے شوہر سے نہیں بلکہ نامحرم سے مخاطب ہوں۔

انعام علی کے دل میں ایک نرم گوشہ بیدار ہوا۔ وہ بستر پر بیٹھ گئے۔ اور کچھ سوچنے لگے۔

”سوچنے کا وقت نہیں ہے انعام علی۔ وہ رورور کر جان دے دے گی۔“ پلیز۔“

”میں اپنے بچوں کا ہر حق معاف کرنے کو تیار ہوں۔ مگر آپ اسے دکھ نہ دیں۔ خدا معلوم کس ہستی سے آئی ہے۔ ان کی کوئی اسفل عادت اسے لگتا ہے چھو کر نہیں گزری۔ میرا اس کا کیا رشتہ ہے۔ بے وقوف کو احساس نہیں۔“ وہ پھینکی سی لہجی دیں۔

انعام علی ٹھیکلہ کی تعریف نور بانو کے منہ سے سن کر جیسے گم مہم ہے رہ گئی تھی۔

یہ عورت میرا ہر جتنیہا رکھ کر دیتی ہے۔

یہ مجھے انتقام کی آگ کبھی بجھانے نہیں دے گی۔ مگر میں اسے معاف بہر حال نہیں کر سکتا۔

یہ عورت نہایت ہوشیار ہے..... مگر مجھے اسے ناکام کرنا ہے۔

یہ نہیں کی سیتا، ساراہ بن جائے مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ شدید۔

وہ اپنے آپ سے جنگ کر رہے تھے۔ نور بانو ہنوز کھڑی ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔

کل تک انہیں انعام علی سے حد درجہ خوف محسوس ہوتا تھا۔

مگر اب وہ ہر قسم کے خوف سے بے نیاز تھیں۔

ہر شے کا دینے والا۔

سمانے والا۔ احساس ان کی ٹھیکلہ سے شادی کے بعد اپنی موت آپ مر چکا تھا۔ وہ نہایت مطمئن اور پرسکون انداز لہری تھیں۔

”تم اس گھر میں کیوں آئیں؟“ انعام علی نے اپنی جھلاہٹ کا رخ موڑا۔

”اتنی دیر سے آنے کی وجہ تو بیان ہو رہی ہے۔“ وہ بے چارگی سے گویا ہوئیں۔

(جب آپ کے دل میں نہیں تو گھر میں آنے کا فائدہ؟)

انعام علی دیر کیوں؟ ہر شے سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے اب اٹھیے۔“ ان کی آواز پر آنسو غالب آئے۔ فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

انعام علی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی پیشانی پر لکیریں گہری ہو رہی تھیں۔ انہوں نے انعام علی کو باہر آتے دیکھ کر ایک لمحہ لپٹا لیا اور پوری طرف بڑھ گئیں۔ جیسے انہیں یقین ہو چکا تھا کہ انعام علی ٹھیکلہ کو واپس لانے کے لیے آمادہ ہو



جائیں گے۔

وہ پورچ میں آکر گاڑی سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔ انعام علی آہستگی سے چلتے ہوئے گاڑی کی سمت آئے۔ چوکر نے گیت واکر دیا۔

انعام علی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو نور بانوان کے برابر کار وازہ کھول کر نہایت اعتماد سے بیٹھ گئیں۔

انسان اس وقت ہچکچاتا ہے۔ اس وقت خوفزدہ ہوتا ہے، اس وقت سوچ سوچ کر قدم اٹھاتا ہے۔

جب وہ زندگی کو حسین بنانے کے لیے خواب رکھتا ہے اور خوابوں کی تکمیل کے لیے شرائط تسلیم کرنے پر آمادہ ہوتا ہے وہ اپنے خواب فروخت کر کے اُس سواگر کی کیفیت میں پہنچ چکی تھیں۔ جس کا تمام سامان فروخت ہو چکا ہو اور اپنے سامان کی نگہداشت کی فکر سے رہائی مل چکی ہو۔

انہیں یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخری بار کب انعام علی مگر جیسے خواب میں۔۔۔ کیا رشتہ ہے ہمارا۔۔۔؟ ہمارے بیچ احرا کا سمندر دوڑتا ہے، مگر اس احساس کا کوئی نام نہیں۔ انہوں نے ایک سرود آہ کھینچی۔

انعام علی ان سے یوں لا تعلق تھے جیسے وہ گاڑی میں تباہ ہوں۔

اسی خاموشی میں وہ خاور کے پار ٹنٹ کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ انعام علی نے گاڑی روکی۔

”میں یہیں ہوں۔ شکلیہ کو بیچ دو۔“ انہوں نے انجمن بند کر کے اپنی طرف کا شیشہ اتارنا شروع کر دیا۔

نور بانوان اتر کر لفٹ کی سمت بڑھ گئیں۔

اوپر پہنچیں تو شکلیہ کو نہ حال انداز میں بستر پر لیٹا پایا۔ منزہ دونوں بچوں کو لیے اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ نظر نہیں آیا۔

”ہلال کہاں ہے۔؟“ انہوں نے منزہ کو مخاطب کیا جو انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور سوالیہ انداز میں انہیں رہی تھی۔

”اندر کمرے میں ہے۔ امی! پایا۔۔۔“

”چپے گاڑی میں شکلیہ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ انہوں نے بیٹی کی بات کاٹ کر جواب دیا اور شکلیہ کے قریب آئیں۔

”واقعی!!!“ منزہ کو جیسے یقین نہیں آیا۔

(کوشش کی کامیابی اور ناکامی کا تعلق بہر صورت تقدیر سے ہے۔ وہی کوششیں۔۔۔ جو میرے حق نہ جائیں تو ناکام اور وہی کسی اور کے لیے ہوں تو کامیاب۔ صریحاً نصیب ہے اپنا پنا)

”واقعی۔۔۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے بیٹا۔ غصہ اتر بھی جاتا ہے اگر نصیب اچھا ہو۔“

وہ سادگی سے مسکرائیں۔ اس مسکراہٹ کا کرب صرف منزہ ہی سمجھ سکتی تھی کہ وہ ان کی بیٹی تھی۔

”اٹھو شکلیہ۔۔۔ چادر اوڑھو۔ آج کے واقعے سے سبق سیکھو اور آئندہ ہمارے لیے اتنی حساس مت ہونا۔ ورنہ کچھ کھو بیٹھو گی۔“

انہوں نے شکلیہ کو بازو سے تھام کر اٹھایا۔ اس کی چادر۔ اپنے ہاتھ سے درست کی۔ اس کا پرس اٹھا کر تھمایا۔ اور خود لے کر آگے بڑھیں۔

”خدا حافظ منزہ۔!“ نور بانو سے لے کر چپے آئیں۔ انعام علی نے اس کی سمت کار وازہ کھول دیا۔

دل کا دروازہ کھلا ہو تو ہر دروازہ کھل جاتا ہے۔ ابھی بیس منٹ پہلے جب وہ انعام علی کے پورچ میں تھیں تو انعام علی کی طرف کار وازہ کھولنے کا دھیان تک نہیں آیا تھا۔

ان کا دل عادی سے انداز میں پھر کی پاتال میں اتر آ۔

قلیل آہستگی سے بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔

انعام علی شکلیہ کی سمت جھکے اور کھڑکی کے ذریعے نور بانو سے مخاطب ہوئے۔

”ہلال کے ساتھ آپ کی اٹل شرائط۔۔۔ محض اس وجہ سے ہیں کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ اس نے میرے وجود سے جنم لیا۔ یوں بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ ماں باپ کے دل تو بہت فرخاں ہوتے ہیں۔

وہ واپس پلٹتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

جب سے نیلہ کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی۔

گھر کا تو جیسے ماحول ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ منیہ ایک الگ ادھیڑ بن میں مگن نظر آتی تھیں۔ شیخ رحیم الدین نے منیہ کو نموس رقم تمنا کر کہا تھا کہ بس۔ جو کرنا ہے اسی میں کرتا ہے۔ منیہ نے اپنی از حد بڑھی ہوئی مصروفیات کو دیکھ کر بار بار کے مسئلہ کو دیکھا تھا۔ ان کا دماغ نہ جانے کتنے خانوں میں بنا ہوا تھا۔

اور آج جیسے تو حد ہو گئی تھی۔

وہ شہزادی اکی کوکون کرنے احمر کے ساتھ گئی تھیں مگر سردار علی خان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ وہ احسن سے متعلق کسی اسے بات کرنے کے روادار نہیں ہیں اور منیہ جیسے نمبر کر رہی تھیں۔ احمد ان کا سفید پڑتا ہوا چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

”امی! آپ احسن بھائی سے بار کر لیجیے، اچھا موقع ہے اور ان کو بتائیے کہ ان کے وجہ سے ہم کس قدر مشکلات سے رہیں۔“ احمر کے لہجے میں نہ جانے کیسی بخشنی در آئی تھی۔

منیہ نے چونک کر دیکھا۔

ایک اینٹ کمزور پڑ جانے تو پوری دیوار ہی کھوکھلی محسوس ہوتی ہے۔ اُف اس طوفان میں میرے بچے بھی ایک سے سے ہزاروں لاکھوں کوس کے فاصلے پر جا کھڑے ہوں گے۔ میرا تو گھر ہی ٹوٹ چکا۔ میں کس خواب میں بیٹھی۔

روڈ کی ایک ٹیس ان کے سینے میں اٹھی۔

”میں تو اس سے براہ راست ملنا چاہتی ہوں! اس لیے کس بات تو ہو۔۔۔“

”آپ ان کو آپا کی شادی کی اطلاع دے دیجیے اور بھائی جان کے بارے میں بھی بتا دیجیے اور بھائی کے بارے میں نیے اور ان سے کہہ دیجیے کہ وہ ہیں یا نہیں ہیں۔ ہمارے لیے ایک ہی بات ہے۔“

احمر نے پھر تکی سے کہا۔

”میں اُن جذباتی لوگوں میں سے نہیں ہوں بیٹے جو طرم بنانے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے ہیں۔ میرے بچے نے کس وجہ نا حالات میں گھر چھوڑا۔ بھولی نہیں ہوں۔“

”امی۔ آپ کب تک بھائی جان کی غلطیوں کی وجہ دوسروں کو ٹھہراتی رہیں گی۔؟ انہوں نے غلطیاں کیں مسلسل۔“

”تم بچے ہو احمر! مت بولو۔“ انہوں نے جیسے ڈانٹ کر احمر کو چپ کرادیا

جس لڑکی کو رسوا کر رہے ہو۔ کل کو اسی کو تم اپنے گھر کی مالکین بنا کر لوگوں سے کس طرح عزت دلاؤ گے.....؟“  
 میں نے اس کو گھر میں بسانا ہی نہیں ہے۔“  
 ٹوں۔ ٹوں۔ رابطہ منقطع ہو گیا تھا اور تیل ہونے لگی تھی۔  
 ”اوپر ہی نہیں آ رہی۔“ صفیہ نے اصرار کی سمت دیکھا۔

انسانی جو قص کہ رابطہ منقطع ہونے کا دھیان ہی نہیں آیا تھا۔ بلکہ احسن کے آخری جیلے میں ان کی تمام تر توجہ ایک کر رہ

انہوں نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کان سے لگایا پھر کریڈل پر ڈال دیا۔ ”بھائی جان نے فون رکھ دیا ہے۔ اگر کریڈٹ نہیں تو پانچ منٹ انتظار کر لیجیے۔ یہاں کا فون نمبر ہے ان کے پاس۔ اگر لائن کٹ ہوئی ہے تو وہ نمبر ملا لیں

اگر کمرے سے باہر چلا گیا اور فون کے چار جزو دوست کی والدہ کو تھا کر واپس آ گیا۔

منہ اس زاویے سے بیٹھی تھیں۔ فون خاموش تھا۔

”میں نے آپ سے کہہ دیا تا اُمی! بھائی نے فون خود بند کیا ہے۔“

”حقیقہ گم غصہ سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔“

اُن کے لب جیسے سل گئے تھے۔ گھر تک آتے آتے انہوں نے احمر سے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

مدے کے گہرے احساس نے جیسے انہیں منجمد کر دیا تھا۔

ہم تو ان کی روح میں اُتری ہوئی تھی۔ اس نے دوری سے دیکھ لیا تھا۔ اور جان لیا تھا کہ وہ کس حال میں کیا سُن کر آئی ہیں۔

انے شہر اور کوبھی بتا دیا تھا کہ اسی احسن بھائی کونون کرنے لگی ہیں۔ مگر اس نے اس ”خبر“ پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں دیا۔  
 فیملی نے ماحول کا جو دھڑونے کی خاطر لڑکیوں کو کام بتانا شروع کر دیا۔

ہاں مجھے آج کل لڑکیاں بے حد مصروف ہو گئی تھیں نیلہ کے دوپٹے، قمیض اور شلواروں پر بہت خوبصورت کام بننا رہی تھیں لیکن اسے دیدہ زیب کڑھائیاں کر رہی تھیں جن کو اگر بازار میں خوابا جاتا تو ہزاروں روپے لاگت آتی۔

لب کھراچی ان کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ وہ اور ناملہ ایک دوپٹے پر سسلے کا کام کر رہی تھیں۔ کام سے فارغ ہوتے ہی ہڈے لکڑیٹھ جاتی تھیں۔

ایلا می شادی میں دن بہت کم رہ گئے تھے۔

عرب کی نماز میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا۔ نائلہ صبح دعوائے گئے کپڑے اتارنے کے لیے جھٹ پر چلی گئی۔ اب وہ اٹکا جھٹ پر جاتی تھی۔

بہت تو اس کے خوابوں کی بنیاد بھی تھی۔ اس پر آتے ہی جیسے روزِ نِکھل جاتے اور ایک فلم سی ذہن کے پردے پر

اللہ تعالیٰ کی قسم! کہ سامنے نظر نہ پڑے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ بالکنی میں کھڑا اس کا راستہ دیکھتا ہے۔  
اللہ تعالیٰ نے کپڑے ایک چار پائی پر ڈھیر کرنا شروع کر دیے۔

”بات کراؤ اس سے۔ نیل کی شادی کے بعد مجھے بہر حال اس سے نمٹنا تو ہے جب میں ہوں اس سے غصے والی۔“

وہ احمر کے دوست کے ہاں سے فون کر رہی تھیں۔

احمر نے نمبر ملایا۔ چند لمحے ریسورکان سے لگائے رکھنے کے بعد ماں کی طرف بڑھایا۔

”بھائی جان بول رہے ہیں۔“

صفیہ کی حالت عجیب سی ہوئی۔ سب کچھ ذہن سے اڑن پھو ہو گیا۔

”صالح“

”کہاں؟ احسن؟“

دوسری طرف احسن کی پیشانی پر ہونے والی ممکنہ لگبیر۔

”اسلام علیکم۔ امی۔“

”و-علکم السلام۔“ صفیہ

بے اختیار ہو رہا تھا۔ وہ جیسے رو دیئے کوٹھیں۔

”آپ ٹھیک تو ہیں نا امی۔؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”جس ماں کو تمہارے جیسا بیٹا ملا ہو۔ وہ ٹھیک نہیں

اسن کو معنیہ کا انداز بے حد محسوس ہوا۔ وہ اپنی ماں کے لیے بے حد محاسن تھا۔ ان لے سچے اور مزاج کے ہر موسم۔ واقف تھا۔

”امی! آج آپ کے لہجے میں بہت ہی نئی بات ہے یا میں محسوس کر رہا ہوں۔؟“

”تم نئے نئے کام کرو۔ اور مجھ میں نئی بات پیدا نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے۔؟ ماں ہوں تمہاری۔ بلکہ غریب؟“

”کہاں؟ کس سے۔؟“ احسن جو ماں کے تبدیل شدہ انداز پر متفکر سا ہورہا تھا یک دم چونک کر پوچھنے لگا۔

”اللہ کا شکر ہے۔ اچھے لوگ ہیں۔ احسن کیا کہیں احساس ہے تم سے دوری میرے لیے کتنا بڑا عذاب ہے۔“  
کی آواز بھر اگئی۔

”میں نے بھی آپ کی آن پر خود پر ہر خوشی حرام کی ہے امی۔ جو میرا فرض اور غیرت کا تقاضا ہے۔“

”میرے بیٹے۔ باقی کے کام جو تم نے کیے، انہوں نے تو میرے وقار میں چار چار چاند لگا دیے ہیں۔“ انہوں نے انتہائی دکھ سے اس کی بات کاٹی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ (حالانکہ وہ سمجھ گیا تھا۔)

”تمہاری ایک کوتاہی اس وقت گھر میں ہے اور مجھ سے، میری طاقت سے زیادہ ہے۔“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھ پایا۔“ احسن کا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا۔ (کیا وہ وہاں پہنچ گئی۔) میں تو خود اسے اس دروازے پر اتار کر آیا تھا۔)

”میں شہوار کی بات کر رہی ہوں۔ کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ.....؟ احسن! غیرت مند تو ہر رشتے کے لیے عہ

بہترے تہہ کرنے لگی۔ مگر ایک خوف اسے ہرست سے گھیرے ہوئے تھا۔  
"مکمل شام تک انشاء اللہ دوپٹہ مکمل ہو جائے گا۔" شہوار کیلے ہاتھ اپنی مثال سے پونجی اندر چلی آگئی۔  
"انشاء اللہ....." وہ غائب دماغی کی حالت میں بولی۔

خالہ جان کہہ رہی ہیں کہ نیلے کی شادی پر سب رشتے دار جمع ہوں گے۔ دونوں خالائیں تو ضرور آئیں گی۔ تب وہ میرا مسئلہ ان کے سامنے رکھ کر ان سے تعاون کے لیے کہیں گی۔ چھوٹی خالہ کی بات پایا بہت مانتے ہیں۔ شاید وہ کچھ کر سکیں۔"  
"سوچتے ہوئے۔ کہہ رہی تھی۔

"ہوں۔" نائلہ نے ہنکارا بھرا۔  
"مگر میرا تو تمنا شاہے گا ناں۔" وہ یاسیت سے کہتی ہوئی اس کے ساتھ کپڑے تہہ کرنے لگی۔  
"ہوں۔" نائلہ نے پھر ہنکارا بھرا۔

اب شہوار نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔  
"کہاں غائب ہو.....؟"

"کہیں نہیں (ہر شخص پر گویا اس کے حصے کی آفت نازل ہے) سن رہی ہوں آپ کی بات۔"  
"مگر مجھے تو محسوس ہو رہا ہے جیسے تم اس وقت سخت الجھی ہوئی ہو۔ کوئی بات ہوگئی ہو۔؟ شہوار نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ارے نہیں بھائی۔ میں کہیں نہیں الجھی ہوئی۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"کیا احسن نے خالہ جان سے کوئی بات....."

"اس موضوع پر تو میں نے کوئی بات ابھی تک ہی نہیں۔" نائلہ نے شہوار کی بات کا ٹی۔

"مگر شاید آپ کو انتظار ہے کہ احسن بھائی اور امی کے درمیان کیا بات چیت ہوئی.....؟" اس نے شرارت سے شہوار کو دیکھا۔

نکاح سے پہلے شکلیہ نبیلہ اور نائلہ کی یہی لطیف سی شرارتیں اس کے پورے وجود کو گدگدایا کرتی تھیں۔

مگر اب اس قسم کی شرارت اس کی رگوں میں زہر بن کر دوڑنے لگتی تھی۔

"مجھے کوئی انتظار نہیں۔ جس راہ چلنا ہی نہیں اس کے کوس کیا گنا۔ میں تو تمہیں پریشان دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ کیونکہ خالہ جان نے احسن کو فون کیا تھا اور احسن ان لوگوں میں سے ہیں جو لوگوں کے لیے مسئلے پیدا نہیں کرتے بلکہ خود ہی مسئلہ ہوتے ہیں۔" اس نے غایت درجہ چڑک کر کہا۔

"میرا بھائی تو بہت ٹائس ہے۔ لوگوں نے تو ان سے زندگی کا ہر شکھ جھین لیا ہے۔ میں ان کو جانتی ہوں۔ بہت ملازمت گزارا ہے ان کے ساتھ۔" نائلہ نے یاسیت سے کہا۔

شہوار کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ مگر وہ خاموش رہی۔ وہ احسن سے علیحدگی چاہتی ہے۔ یہ بات ابھی لوگوں کو معلوم نہیں تھی۔

دونوں کے ہاتھ متحرک تھے اور لب خاموش۔



ایک دوپٹہ جیسے چٹنی میں اٹک گیا۔ اس نے جھکا دیا تو پھٹ گیا۔ وہ افسوس کے عالم میں دوپٹہ پھیلا کر دیکھنے لگی۔  
اتنا خوبصورت دوپٹہ۔ دکھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔  
وہ بے دم سے انداز میں پلنگ پر بیٹھ گئی۔ دوپٹہ هنوز اس کے ہاتھ میں تھا۔ امی کو کتنا محسوس ہوگا۔ ممکن ہے ڈانر پڑے اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔

رات کی پرسکون غموں میں رو رہا ہوں کہ سو نہیں سکتا  
حسین آرزوؤں کے کھل بنانا ہے دل جو آ بارہ نہیں سکتا  
مہدی حسن کی پُرسوز آواز ابھر گئی تھی۔

نائلہ کا دل اچھل کر قحط میں آگیا۔ اس نے چپکے سے سامنے دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں کہاں باگنی کی ریل پر نکائے بے جھجک اور بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ رازی کی نگاہوں میں دیکھتی۔  
اس نے کپڑوں کا ڈھیر سیٹا شروع کر دیا۔

نئے کی آواز بدستور ابھر رہی تھی۔ یقیناً اس نے یہ حرکت اسے متوجہ کرنے کے لیے کی تھی اور حالاً دل نئے کے اندر سے ظاہر تھا۔

وہ کپڑوں کا ڈھیر بازوؤں میں اٹھا کر پلٹی تو جیسے پاؤں تلے زمین سرکے لگی۔ شیخ رحم الدین زینے کے قریب کمر تھے۔ بازو پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ نہایت گہری سوچ میں گم سامنے ریلنگ کی سمت دیکھ رہے تھے۔  
رازی غائب تھا اور نئے کی آواز بھی رک گئی تھی۔

نائلہ کا ہنپتی ہوئی آگے بڑھی۔

"بھئی! وہ تمہاری ماں نے تمہارے پاس کچھ رقم رکھوائی تھی اس میں سے کچھ پیسے چاہیں۔ تم تو یہاں آکر بیٹھا گئیں کپڑے اتار رہی تھیں یا ڈھیر رہی تھیں۔" ان کے سادہ لہجے نے بھی نائلہ کے وجود میں حشر برپا کر دیا۔  
وہ کچھ نہیں بولی۔ دونوں نے آگے پیچھے چلتے ہوئے زینہ طے کیا۔

صفیہ نے دونوں کو نیچے آنا دیکھا۔

"صبر تو ہے ہی نہیں طبیعت میں اس نے نیچے ہی آنا تھا۔" انہیں شیخ صاحب کی بے صبری یاد آگئی۔

"بیٹی..... تین ہزار روپے اپنے اباجی کو دے دو۔"

"جی۔۔۔ اچھا امی۔" وہ آہستگی سے کہتی ہوئی بہنوں کے مشترکہ کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

اندر ہی اندر دل ہنوز سوکھے بچے کی طرح کانپ رہا تھا۔

"کیا! اباجی نے رازی کو کو کیا کیا؟"

مگر جب وہ اوپر آئے تو میری تو اس طرف بیٹھ تھی۔

اللہ کرے رازی ان کی جھلک دیکھتے ہی اندر چلا گیا ہو۔

مگر..... پھر وہ باگنی کی طرف کیوں دیکھ رہے تھے۔

جوں جوں سوچتی تھی اس کا حال غیر ہوتا جاتا تھا۔

مگر میں تو۔۔۔ آف اباجی نہ جانے کیا سوچ رہے ہوں گے۔ اگرچہ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں۔ اس نے پیسے کا

انٹلا کے ہاتھ باہر بھجوا دیئے۔

”ہاں۔ یہ بہر حال تمہارا فرض ہے۔ اس میں تمہاری اپنی بھی عزت ہے۔ اور سناؤ شہوار کسی ہے۔؟“  
”ٹھیک ہوگی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”سہا مطلب۔؟ ہوگی سے کیا مراد۔؟ ابھی تک لڑائی ہے۔؟“  
”والی ہمیشہ کے لیے ختم..... ہو چکی ہے۔“ اس کے چہرے پر سایہ سالہرایا۔  
”یہ بہت اچھی بات ہے۔ کیا تمہارے خالو جان کا غصہ اتر گیا۔“  
”ابھی جو چیز چڑھتی ہے اترتی نہیں۔“ وہ ہنسا۔

”کیا پہیلیاں بھجوا رہے ہو۔“ وہ اس کی ہنسی سے الجھ گئیں۔ ”وہ تمہارے آرام کا تو خیال رکھتی ہوگی۔“  
”بہت بجا آرام کیا ہے اس نے۔“ احسن کے لہجے میں تختی درآئی۔  
”چلو چھوڑو۔ یہی زندگی کے رنگ ہیں۔ وہ بھی مجھے بہت پیاری ہے اس لیے کہ وہ تمہاری ہے۔ اور جو شے تمہاری  
بہت زیادہ ہماری ہے۔ ویسے وہ ہے ہی بہت اچھی۔“  
”لہجہ کے لہجے سے محبت چھلک رہی تھی۔“

”اچھا سے میرا سلام اور پیار ضرور دینا۔ فیصل وغیرہ انگرام میں مصروف ہیں پھر بھی میری کوشش ہوگی کہ ایک دو دن  
لے پاکستان ضرور پہنچوں۔ بلکہ مجھے تو یہ شادی انیڈ کرنے کی بہت بے چینی ہے۔“  
”شہوار کو بھیج دو ناں۔ کون سا بھائی جان اسے نکال دیں گے۔ کیا پتا اسی بھانے۔“  
”بھیج دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔“ اس نے پھوپھی کی بات کاٹ کر قدرے ناراض لہجے میں کہا۔  
”کیا مطلب۔؟“ وہ پھوپھی سی رہ گئیں۔

”اب میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر وہ میری ”ہٹ لسٹ“ میں سرفہرست ہے۔ میں اُسے کسی صورت معاف نہیں  
کاں۔“  
”بات طویل ہو جائے گی پھوپھو۔ چند دنوں بعد انشاء اللہ آپ آئیں گی تو سب کچھ پتا چل جائے گا۔ بہر حال اب  
”شہوار بند کر دیجیے پلیز۔“  
”لہجہ نے عجیب سی کیفیت میں اس سے دو ایک باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔“

آج انیلا ساتھ نہیں تھی۔ اس نے صفیہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ لڑکیوں کو اپنی بھی تو تیاریاں کرنا ہوتی  
تھیں کہ وہ پتا تھا کہ شادی کے نزدیک کیوں نہ ہو اسے کافی چٹھیاں کرنا ہوں گی۔ اس لیے وہ فی الحال باقاعدگی سے کالج  
لے کے موڈ میں تھی۔

پچھلے دو سب بینس اکٹھی اسکول جاتی تھیں۔ اب وہ اور انیلا قریبی کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ اور راحیلہ کا انیڈیشن حال  
نہ دھڑکے کالج میں ہوا تھا جو ذرا نا صاف تھا۔  
”کیونکہ اکیلے آنے جانے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے چال میں لاپرواہی اور اعتماد نہیں تھا۔ وہ بہت احتیاط سے چلتی  
تھی۔ شاپنگ آ رہی تھی کہ چرچر کی آواز کے ساتھ ایک گاڑی ذرا تڑپتی ہو کر اس کے سامنے رک گئی۔  
”اگر محتاج ہو کر نہ چل رہی ہوتی تو ممکن تھا کہ نکر جاتی۔ چھوٹی سی سوزوکی تھی وہاں کار کی تھی بہر حال گاڑی تو تھی۔“

”ہیلو..... اوہ اسلام علیکم!“  
”کیسی ہیں آپ.....؟“  
”بالکل ٹھیک ہوں۔ بھائی جان کی طرف سے نیبلہ کی شادی کا کارڈ ملا ہے ابھی ابھی۔ فوراً تمہیں..... فون کر رہی  
ہوں۔ کون لوگ ہیں؟ کیسے ہیں۔“

”تمہینہ کے لہجے کے خدشات تاروں پر دوڑتے احسن کے دماغ تک منتقل ہو گئے تھے۔“  
”آپ کہ تو تمام صورت حال پتا ہے۔ بہر حال ای کا فون آیا تھا۔“  
”فون آیا تھا۔ کیا کہہ رہی تھیں بھائی جان؟“ تمہینہ کے انداز میں بے پناہ جلت تھی۔  
”ان کے انداز سے لگتا تھا وہ اس رشتے پر مطمئن ہیں۔“ احسن نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔  
”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ بھائی جان کی طرف سے تو کسی نہ کسی انقلاب“ کا دھڑکا لگا ہی رہتا ہے کچھ پتا چلا کہ  
”مرد ہوا ہے یہ رشتہ۔؟“ تمہینہ واقعی بہت پریشان تھیں۔  
”میری اُن سے زیادہ۔“ فیصلی بات نہیں ہوئی۔ میں تو جیسے اب ان کے لیے ہوں ہی نہیں۔ یوں سمجھیں۔“  
”اللہ نہ کرے جان۔“ استحان ہے ختم ہو جائے گا۔ یقین کر دوں رات تمہارے لیے دعائیں کرتی ہوں۔“ تمہینہ  
جیسے تڑپ گئیں۔  
”آمین۔“

”اب تو صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ قہوڑا بہت مالی تعاون کر سکوں۔ اباجی تو خیر ایک پائی کے روادار نہیں ہیں۔  
”تھر وہاں کوڈرافٹ بھجوا رہا ہوں۔“

اس نے بس اچھتی ہی نظر ڈالی تھی اور ایک طرف کو ہو کر قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ ”معاف کیجیے گا۔“

اور نائلہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ سو فیصد رازی کی آواز تھی۔

وہ ٹھٹھک کر رک گئی اور بے اختیار اس کی سمت دیکھا۔

”مجھے آپ سے نہایت ضروری بات کرنا ہے پلیز۔“

”مگر بات کرنے کا یہ طریقہ نہایت غیر معقول ہے۔“ نائلہ کو جج غصہ آ گیا۔

”میں دنوں سے موقع کی تلاش میں تھا۔ آپ کیا سمجھتی ہیں میں یہ موقع کونادوں گا؟ پلیز تشریف رکھیے۔“ رازی

انداز میں قطعیت تھی۔

”آپ ہوش میں تو ہیں؟“ غصے سے نائلہ کی شریانیں ایلنے لگیں۔

”بالکل ہوش میں ہوں۔ بے فکر رہیے رہزن نہیں ہوں۔ اپنی چیزوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ لوٹا نہیں جاتا۔“

”مگر آپ کا یہ عمل شرافت کے کس زمرے میں آتا ہے۔“ وہ چیخ کر بولی۔

اور قدم آگے بڑھایا۔

اگر آپ نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں آپ کا ہاتھ تمام لوں گا۔“ رازی نے دھمکی دی۔

”آپ یہ حماقت نہیں کر سکتے۔ یہ ایک باروق سڑک ہے۔“ وہ استہزاء ایہ انداز میں مسکراتی مگر دل میں ڈر

”میری جیب میں آپ کی تصویر ہے جو ہمارے یہاں شادی کی تقریب میں کھینچی گئی تھی۔“

اگر آپ نے مدد کے لیے لوگوں کو طلب کیا تو میں آپ کی تصویر دکھا کر مددگاروں سے پوچھوں گا کہ آپ کی تصویر

جیب میں کیسے آئی؟“ وہ بے خوفی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ اس حرکت کے بعد آپ میرے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اتر جائیں گے۔ میری

سے گر جائیں گے۔“ نائلہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوف زدہ انداز میں کہا۔

”خدا خواستہ میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ مجھے بہت ضروری بات کرنا ہے آپ سے اور بس۔“

منٹ درکار ہیں۔ میرا عمل برا ہے مگر یوں سمجھ لیجیے کہ بعض اوقات صحت حاصل کرنے کے لیے بے حد کڑی دوا لگ

ہے۔

نائلہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے پاس مکمل تیاری ہے۔ بے بسی کی آخری حد کو چھو کر اس نے فرنٹ سیٹ

جھٹکے سے کھولا اور بٹھ گئی۔

دل کو یہ یقین تو ہو گیا تھا کہ وہ واقعی اس سے صرف بات کرنا چاہتا ہے۔ گذرے واقعات بھی اس کو یقین دلا

معاون تھے۔

رازی نے ڈرائیونگ سیٹ بہت غلٹ کے انداز میں سنبھالی۔ ”شکریہ“ اس نے نائلہ کی سمت دیکھ کر کہا

تھا۔

نائلہ کا خوف سے بُرا حال تھا۔ اس نے چادر پیشانی تک کھینچی لی تھی اور سر جھکا رکھا تھا۔

”پلیز نائلہ! اس درجہ خوف زدہ ہو کر مجھے میری نظروں میں نہ گرایے۔ سخت مجبوری ہے۔ یقین کیجیے۔“

اُترنے والا ڈیپریشن طاری ہو چکا ہے۔ میری صحت میرا کاروبار ایک چیز متاثر ہو کر رہی ہے۔“

”ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں۔“ کانپتے لبوں سے بے ساختہ جملہ پھسل گیا تھا۔

”اگر آپ کے پاس سڑک پر ایک کرن کی صورت نمودار ہوئی اور غائب ہو گئی۔“

”جی تو ہو گئی۔“ اس نے گاڑی لمبی سڑک پر ڈال دی تھی۔

نائلہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

”ضروری بات۔“ میں بیٹھ کر اس نے ایک مرتبہ بھی رازی کی سمت نہیں دیکھا تھا۔

”آپ پہلے خود کو سنبھالیے۔ مجھے اس وقت بہت خوبصورت خواب لاحق ہے۔“

”چیکنگ (CHEATING) ہے۔“ وہ نارنگی سے گویا ہوئی۔

رازی نے ہنسنے لگی۔ ”میں مسکراہٹ ضبط کی۔“

نائلہ۔ پلیز میری بات غور سے سنیں اور پورے ضبط و تحمل کے ساتھ۔“

نائلہ خاموش رہی۔

”آپ کو سب حالات واقعات کا یقینا علم ہے۔ انتہائی مناسب اور شریفانہ طریقہ یہ تھا کہ میں آپ کو اپنے بزرگوں

زنجیر پر پوز کرتا۔ سو میں نے کر دیا۔ میری والدہ ایک سادہ مزاج خاتون ہیں ان سے چوک ایسی تو نہیں تھی کہ جس کا

لہو ہو سکتا۔ اتنی ہی بات کا مقدمہ بنا دیا ہے آپ کے والد صاحب نے۔ اور میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ اپنی جگہ

پیدا نہیں ہو سکتی۔ اب صرف یہ صورت ہے کہ آپ اپنے بزرگوں پر دباؤ ڈالیں۔“

”میں یہ کام ہرگز نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟ کیا میری ذات میری محبت آپ کے لیے نہایت غیر اہم ہے؟ وہ ایک دم ٹھنک سا گیا۔

”یہ عمل میرے گھر کے ماحول سے متصادم ہے۔ بس میں اس سے زیادہ نہیں کہوں گی۔“ اس نے بہت سے ہلکتے

ہاتھ اپنے سینے کی دیواروں میں دفن کر ڈیڑھے۔

”میری ہنسی نکھر جائے گی۔ شاید دنیا میں آپ کو کوئی مجھ سے زیادہ نہ جانا سکے۔“

نائلہ مارے حیا کے نظریں نہ اٹھا سکی۔

زندگی میں پہلی بار انتہائی میں وہ خوبصورت جملہ سن رہی تھی جس میں الہ عمر کے سارے رنگ جذب ہوتے ہیں۔

دل کی دنیا میں ظالم برپا ہو گیا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔

”مجھے کوئی امید دینیجیے نائلہ۔“

”اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیے۔ محض آج کو زندگی کا حاصل نہ سمجھئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے بھی اچھا سا تمی دے گا۔ پھر

بوسہ بھول جائیں گے۔“ نائلہ نے اعتماد سے کہا۔ بہت اچھی امید دلائی تھی۔ رازی کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

”میں کسی بزرگ کی خانقاہ میں اقوال زریں سننے کا پروگرام ہرگز بنانا نہیں آیا تھا۔ آپ کو میرا خیال کرنا چاہے

معلوم کو محسوس تو کیجیے۔“

”سوری مسٹر سرفراز۔ میں آپ کو فریب دے کر۔ زندگی بھر کے لیے ضمیر کی ملامت نہیں خرید سکتی۔ پلیز آپ اس قفسے

لٹا جائیے یہ دنیا بے کراں ہے، ممکن ہے آگے بہت کچھ ہو۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”پلیز اب مجھے میرے

پہ پاؤں دینیجیے۔“

”کیا ممکن ہو کہ آپ کا انتخاب کوئی اور ہو اور واقعی یہ سب میری غلٹ اور.....“

”آپ کم از کم مجھے اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتے۔“ نائلہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔



”اپنے خاندان میں ہمارا گھر نہ وہ واحد گھر نہ ہے جو دو سو سال پرانے انداز لئے ہوئے ہے۔ ہمارے ہاں ہر  
کی باتیں کھڑکروانی جاتی ہیں۔“

”میری زندگی تباہ ہو جائے گی نائلہ۔ غور تو کیجیے۔“ وہ یاسیت سے کہہ رہا تھا۔

”آپ نے کیا دیکھا ہے مجھ میں۔ میں تین ہزار۔ نچوہ پانے والے باپ کی بیٹی ہوں۔ جس پر پے در پے پٹنیاں  
بو جھ ہے۔“

میں ایک دست بستہ اور مجبور عورت کی بیٹی ہوں۔

ہم ایک رو بوٹ ہیں۔ ریوٹ کنٹرول دوسرے کے ہاتھ میں ہے میری شکل بھی کوئی۔ خاص نہیں ہے قیام  
واجبی ہے۔ بتائیے کیا خاص بات ہے مجھ میں۔“

وہ جیسے پھٹ پڑی۔ انک سلسلہ وار اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

”آپ خود کو میری نظر سے دیکھیں نائلہ تو آپ کے ہوش اڑ جائیں۔ ورنہ یہ دنیا اتنی جاہل ہے کہ مصر کے بازار  
میں بھی چند نیار کے عوض بیچ دیا جاتا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“ اس نے چادر سے آنسو پونچھ ڈالے۔

”گویا سنی لا حاصل۔“ وہ جیسے راگھو چلا۔

”تلفی۔“ نائلہ نے پورے یقین سے کہا۔

”آپ مجھے غلط راستہ دکھا کر اپنا مقصد کھور ہے ہیں۔“ نائلہ نے بھڑک کر بات کاٹ دی۔

”میں عالم دیوانگی میں ہوں۔۔۔۔۔ اور دیوانگی میں بہت کچھ مخاف ہے۔“

”مگر میں دنیا میں کسی کی بھی حتیٰ کہ کسی کی جان کی قیمت پر بھی اپنی ماں کے لیے اندھیرے نہیں خرید سکتی۔“ نائلہ  
نہایت واضح جواب دیا۔

”میری ماں دنیا کے مظالم ترین لوگوں میں شامل ہے اور میں اس کی خاطر اپنی خواہشات اپنے خواب اپنی خواہشات  
کیا اپنی زندگی بھی قربا کر سکتی ہوں۔“

”آپ کتنی بلند ہیں۔ نائلہ اور۔۔۔۔۔ کیا کہوں۔“

آہ آپ جتنی بلند ہیں۔ میں اتنا محروم۔۔۔۔۔ اس نے گاڑی واپسی کے لیے موڑ دی۔ سات آٹھ منٹ بے حد خانہ  
سے گزر گئے۔

رازی گا ہے گا ہے اس کی سمت دیکھ لیتا تھا۔ ”آخری خواہش“ کے طور پر۔۔۔۔۔ رازی نے اُسے اسٹاپ پر اتار دیا تھا۔  
نائلہ ایک مطمئن مگر غمگین کیفیت میں راستہ طے کرنے لگی۔

اس کا ذہن ہنوز گاڑی ہی کے ماحول میں گردش کر رہا تھا۔

عجیب سے ملال تھے مگر ضمیر مطمئن تھا۔

اچانک اسے آگے چلنے والے کا دھیان آیا۔ اس کی تو روح جیسے فنا ہو گئی شیخ رحم الدین معمول سے کم رفتار میں  
سے آگے چل رہے تھے۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ

سب دن مار مار کر شروع ہوتی ہے

بادل چٹ کر نہیں دیتے۔

چھانچوں چھانچہ بر ستاپانی۔ پہلے دل بہلاتا ہے پھر۔ وحشت بن جاتا ہے۔

سورج کا جگر مسلسل لاحق ہو۔ تو جیسے زندگی چمک کے معنی بھولے لگتی ہے۔

مگر۔۔۔۔۔ پھر ایک روز یوں ہوتا ہے۔

سورج بے جب کھڑکی کھلتی ہے تو باہر ایک چمکیلی صبح۔ صبح ازل کی کوئی یاد دو ہراتی نظر آتی ہے۔

اس درو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی سنہری ہو گئی ہو۔ سانس کا ایک ایک تار سنہری ہو گیا ہو۔

پھر آسمان پر روشنی مخصوص زادے سے ٹوٹ کر سات رنگوں کا راستہ بناتی ہے۔ یہ سات رنگ جیسے ”ابد کا زینہ“ محسوس  
ہوتے ہیں۔

دل اس زینے پر رقص کرتا ہوا۔

کسی نادرا کی جہان میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

کچھ احساسات آج کل اسی طرح کے ہو رہے تھے

اور جس روز سے اس نے اس ”منظر“ کی تصویر دیکھی تھی اس روز سے تو دل کے دھڑکنے کا انداز ہی بدل گیا تھا۔

اس نے اپنے جہیز کی تیاری میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ وہ گھر کے ضروری امور نمٹاتی رہتی تھی۔ صفیہ اور بہنیں ہی  
تیار یوں میں مگن تھیں۔

اے بعض لمبے دکھ بھی محسوس ہوتا تھا۔

اتنی سچی اور مخلص محبتوں سے دور ہو جانے کا دکھ۔

بعض اوقات تو یہ دکھ اس قدر بڑھنے لگتا ہر خوشی ہر ایک لطیف احساس پر چھا جاتا۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر بری طرح  
رونے لگ جاتی تھی۔

اسے اس طرح روتا دیکھ کر بعض اوقات صفیہ بھی بے قابو ہو جاتی تھیں۔ پھر نائلہ اور انیلا بھی شریک ہو جاتیں اس  
”انجمنی انک باری“ کے ماحول میں شہوار کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ صورت حال سے  
کبھی نئے؟

بہر حال نیلہ پر یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ اس سنگر سے میل آسان نہیں ہوتا۔ لڑکی۔۔۔۔۔ خاص طور پر مشرقی ماحول  
کی حامل لڑکی شادی سے پہلے گویا دو دھاری تلوار پر چلتی ہے۔

انجمنی و انجان لوگوں سے ہمیشہ ہمیشہ کا ملاپ۔

پھر ان کے اطوار و رویوں کا خوف۔

دو دم اپنے پیارے ماں باپ بہن بھائی سے دور ہو جانے کا افسوس ناک احساس۔ اس قدر متضاد سوچیں گھیرے رہتی  
تھیں کہ وہ دن بدن کمزور دکھائی دینے لگتی تھی۔

ہر وقت جیسے ایک الجھن رہنے لگتی تھی۔

انجمنی بھی وہ سارے کپڑے دھو کر فارغ ہوتی تھی کہ دروازہ کھلا۔ نائلہ اور شیخ صاحب آگے پیچھے داخل ہوئے۔

”السلام علیکم“ نائلہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے مخصوص انداز میں سب کو سلام کیا۔

ایک کدات گہری ہوئی۔ سارا گھر سو گیا، کچھ بھی نہیں ہوا۔  
 لے لے اطمینان کا گہرا سانس لیا اللہ کا شکر اس کے وجود میں جیسے نئی روح دوڑنے لگی تھی۔  
 بارہوں کے دفنی تآؤ کے بعد جب اعصاب پر سکون ہوئے تو نیند بھی ٹوٹ کر آئی۔

پاپا! اب تم اتنے بھی بچے نہیں ہو کہ تمہاری اتنی واضح غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں۔ تمہیں اپنے باپ کے مزاج  
 طرح علم ہے۔ اگر خدا خواست کچھ ہو جاتا ہے چاری کا اس سارے قصبے میں کیا تصور نکلتا ہے۔ ابھی اپنے پاپا کو  
 بلوران سے معافی مانگو۔ بلکہ پہلے ٹھیکہ سے مانگو۔  
 ہنس خوشی میں.....؟ کیا لگتی ہیں وہ ہماری؟“ وہ تو جیسے ہنرک اٹھا۔

باپ! غیر انسانی زندگی کا حصہ ہونا چاہئے۔ یہ انسانوں اور رشتوں کے درمیان بلا تفریق ہونا چاہئے۔ اگر کوئی  
 نامہ میں تم سے بڑا ہو تو تمہارا فرض ہے اس کی عزت کرنا۔ اور پھر وہ تو تمہارے باپ کی منکوحہ ہے۔  
 مجھے ہر اس چیز سے چڑ ہے جو آپ کی توہین یا دکھ کا باعث ہو۔ بس میں صرف اتنا جانتا ہوں۔  
 تم نے کس نے کہا کہ دیا کہ مجھے اس کی ذات سے ڈکھل رہا ہے۔ میں تو اب خوش اور مطمئن ہوں کہ تمہارے باپ کی  
 میں اطمینان اور خوشی کی بے حد کی تھی اللہ نے ٹھیکہ کی صورت میں یہ کی پوری کر دی۔ ان کی نکھری ہوئی زندگی میں  
 لایا آیا۔

اور آپ..... کیا ”غم برف“ ہیں۔ آپ کو کسی سکون اور خوشی کی ضرورت نہیں۔“ وہ تکی سے کہہ کر صوفے پر دراز ہو  
 باخفاہر نظریں دوڑانے لگا۔  
 ”مجھے اللہ نے تمہاری اور منزہ کی شکل میں دو پیارے پیارے بہلاوے دیئے تھے میں گن ہو کر مجھے کسی کی کا دھیان  
 مانا تھا۔“

”جب ہم اپنے باپ کیلئے خوشی نہیں بن سکتے تو پھر ان کے آگے پیچھے کیوں بھریں؟ کیوں ان سے معافیاں  
 مانگے؟ تو جیسے بہت عمدہ دلیل ہاتھ لگ گئی۔  
 ”یہ تم نے کس نے کہا کہ وہ تمہاری ذات سے بے نیاز ہے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اور منزہ کو میرے کہنے کی سزا بخشی  
 اکی گروہ میری صورت ہر دم تمہارے ساتھ تو نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کے اپنے کام دھندے ہیں، پھیلا ہوا کاروبار

لال اور منزہ دونوں چونک پڑے۔

”آپ نے کیا کیا ہے امی.....؟“ منزہ کا دل جیسے خوف سے سمٹ گیا۔

”آپ کہہ رہی ہیں کہ میرے ”کہنے“ کی..... کیا ہے آپ نے؟“

”کوئی نہیں! ایسی کوئی بات نہیں جو جتنا ضروری ہو۔ مجھے کوئی غلطی مجھ سے ہو گئی ہوگی۔ اندازاً کہہ رہی ہوں۔“ وہ  
 لاسے بولیں۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ میں اتنا تحمل اور سکون ہے۔ آپ کی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ پاپا کا مزاج نازک ہے

نبیلہ کو محسوس ہوا جیسے ناکلہ بے حد خوف زدہ ہو۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ خلاف معمول بہت پرسکون دکھائی  
 دے رہے تھے۔ جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا انہوں نے وہ نبیلہ کو تھمایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔  
 نبیلہ چیزیں اپنے ٹھکانے پر پہنچا کر بڑی بے تابی سے ناکلہ کے پاس پہنچی۔

”کیا بات ہے نبیلی..... اباجی کیا تمہیں لینے کا کالج پہنچ گئے تھے؟“ اس کے انداز میں حیرانی تھی۔ کیونکہ آج سے کل  
 ایسا تو نہیں ہوا تھا۔

”نہیں تو..... شاید اسٹاپ سے ساتھ ہوئے تھے“ اس نے اپنے اندر ایک خوفناک سہم اترتا ہوا محسوس کیا۔ ہوش  
 تھوک نکل کر بولی۔

”اودہ میں کبھی.....“ نبیلہ نے جیسے مطمئن انداز میں آزادی سے سانس لیا۔

”کیا بات.....؟ تمہاری طبیعت خراب ہے“ نبیلہ اس کا اتر اتر چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”نہیں نہیں تو.....“ وہ ہڑبڑا کر جیسے چونک پڑی۔

”اباجی کیا کر رہے ہیں آپ.....؟“ اس کی آنکھیں سبھی ہوئی صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

”غیریت..... کوئی کام ہے تمہیں ان سے؟ اپنے کمرے میں ہیں“ نبیلہ جو مطمئن ہو کر واپس پلٹ رہی تھی۔ پھر الجھ  
 رہ گئی۔

”نہیں کوئی کام نہیں آج اباجی جلدی نہیں آگئے؟“

”تمہاری اطلاع کیلئے عرض ہے کہ اباجی چھٹیوں پر ہیں۔ ظاہر ہے اتنا سارا کام انہوں نے ہی کرنا ہے۔ امر  
 بہر حال ابھی بچہ ہی ہے ناں..... اباجی تو دس بجے کے قریب بازار گئے تھے۔“

”اچھا اچھا..... ای کہاں ہیں؟“ نہ جانے کیوں دل بے حد پریشان تھا۔

”اپنے کمرے میں ہوں گی، تم بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھا لو۔ پھر آرام سے سو جاؤ۔  
 ایک دو گھنٹے کیلئے فریش ہو جاؤ گی۔ آج تمہاری پسند کا کھانا ہے۔ ابھی نہیں بتا رہی دیکھو گی تو خوش ہو جاؤ گی۔ غاف  
 جاؤ۔“ وہ اسے گویا ترغیب دیتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کبھی وہم آ رہا تھا۔ اباجی نے دیکھ لیا۔

پھر سو جتی نہیں۔ اگر دیکھ لیتے تو اس وقت اس گہری چھت نیچے اور زمین اوپر ہو چکی ہوتی۔

مگر وہ چپ بھی تو ہیں یہ تو خلاف معمول بات ہے وہ چپ کیوں ہیں؟ پریشان خیالی کی دلدل تھی اور وہ گویا اس مٹا  
 دھنسی جاری تھی۔

بہ شکل کپڑے تبدیل کئے، کھانا دقتی پسند ہوا مگر خوف سے اس کی ہموک اڑ چکی تھی۔

ہائے اللہ! کہیں اباجی نے دیکھ تو نہیں لیا۔

یہ ایک جملہ تھا جو گویا اس کے اعصابی نظام اور خون کے دوران میں ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔

اس نے زندگی میں کبھی اس پائے کا دفنی تآؤ برداشت نہیں کیا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک گھڑی جیسے گن گن کر لے  
 ہو رہی تھی۔

”تم کس بحث میں پڑ رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں تمہیں۔ وہ تمہارے باپ ہیں۔ انہیں خوش رکھنا ان کی ہر گز ضرورت ہے۔ چلو اٹھو فون کرو۔“

”ای پلیز“ آپ مجھے کوئی مار دیجئے کھانے میں زہر دے دیجئے مگر میں یہیں نہیں کروں گا“ اس نے تیز آواز سے نور بانو نے بہت غور سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھیں اور بلال کے سر ہانے آکر بیٹھ گئی۔ اس کی سے پیار سے بال سینے۔

”میرے چاند..... ماں باپ کے آپس میں کیا تعلقات ہیں۔ ان میں کون غلام ہے کون مظلوم بچوں کو اس سرور کا نہیں ہونا چاہئے۔ ماں باپ دونوں اپنے بچوں سے سچا پیار کرتے ہیں۔ ان کی خوشی اللہ کی خوشی ہے اور بچہ ملاحت سے آزاد اللہ کو خوش رکھنے والے کام کرتے ہیں ان کی زندگی بجائے خود خوشی بن جاتی ہے۔ دیکھو وہ تمہارے ہیں۔

تم سے بے پناہ پیار کرتے ہیں۔ اتنا کہ تمہیں اندازہ نہیں۔ ایک مرتبہ جب تم بہت چھوٹے تھے شاید دو سال کے، ہم لوگ پہاڑ پر تمہاری دادی اماں کے پاس گئے ہوئے تھے۔ ایٹ آباد میں ان دنوں سخت برقرار ہو رہی تھی تم ماشاء اللہ بہت صحت مند تھے مگر نہ جانے کیا بے احتیاطی ہوئی کہ تمہاری طبیعت بگڑ گئی۔ دس گیارہ بجے تک تو تم تمہاری دادی گھریلو انداز کے علاج معالجے میں لگے رہے مگر جب تمہاری طبیعت کسی طرح نہ سنبھلی تو ہم دونوں ہمارے پریشان ہو گئے۔

تمہیں دراصل تمہاری دادی اپنے پاس سلاتی تھیں۔ اس لئے تمہارے پاپا کو غم نہیں تھا کہ تمہاری طبیعت کب خراب ہے اور یوں بھی وہ اپنی نیند اور آرام کے سلسلے میں بے حد حساس واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے ہماری ہمت نہیں کہہ جگاتے۔ جب انہوں نے مجھے کمرے میں نہ پایا تو شاید یہ سوچ کر کہ کہیں امی کی طبیعت خراب نہ ہو باہر آ گئے۔ منزہ انہیں دکھائی نہ دی ہوگی۔ کیونکہ وہ میرے ساتھ سوئی تھی۔ ان کا اتنی گہری نیند میں اٹھ کر آنا اس بات کی علامت یا تو وہ اپنی ماں سے سخت محبت کرتے ہیں یا اپنے بچوں کو عتاب پاکر پریشان ہو گئے ہیں۔“ (مجھ سے تو انہیں اتنی بات نہیں سکتی تھی کہ وہ ایک لمحے کو غم نہ کریں۔

”جب انہوں نے تمہاری حالت دیکھی تو مجھ پر برس پڑے کہ بتایا کیوں نہیں۔ کبل اوڈھ کر حواس باختہ سے ہر طرح تمہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تھے وہ منظر میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اپنی اولاد انہیں اپنے آرام سے زیادہ عزیز ہے اس روز ثابت ہو گیا تھا۔ ورنہ انہیں اپنا آرام اس درجہ عزیز تھا کہ وہ بڑے بے بڑا نقصان برداشت کر سکتے تھے آرام کے مخصوص گھنٹے وہ کسی بھی قیمت پر قربان نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اس روز انہوں نے تمہاری خاطر رات کا لی کرنا میری روح مطمئن ہو گئی تھی یہ دیکھ کر خدا تیرا شکر ہے۔ میرے بچوں کا میری بد نصیبی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”پھر وہی بات۔ آپ تو اتنی اچھی ہیں پھر پاپا۔“

”مرضی ہے بیٹا ان کی۔ تمہیں اس سے کیا سروکار.....؟ وہ تمہارے باپ ہیں تم سے بے پناہ محبت کرتے ہیں تمہارا فرض ہے کہ ان سے محبت کرو۔ انہیں خوش رکھو۔ ان کی عزت کرو۔“

”مگر میرا دل نہیں مانتا۔ وہ آپ کے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں؟“ اس نے پھر ضد سے نور بانو کی بات کا مذاق اڑایا۔

”بلال! اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تم سے عمر بھر کلام نہیں کروں گی۔“ انہوں نے اب قدر سے ارادہ اظہار کیا۔

میری بات ہے بلال..... اتنے دنوں بعد تو امی کی طبیعت سنبھلی ہے۔ تم انہیں مسلسل ہرٹ کر رہے ہو۔“ منزہ نے پوچھا ہو کس کی کھچائی کی۔

بلال اٹھ بیٹھا۔ ”امی.....!“

”ہوں“ نور بانو کے انداز میں ناراضگی تھی۔

”امی..... میں صرف پاپا سے سوری کہوں گا“ اس نے پھر ضد کا انداز اختیار کیا۔

نور بانو نے فی الحال اس کو ہی غنیمت جانا۔

”چلو ان ہی سے کرلو۔“

بلال بے دلی سے چلتے ہوئے فون تک آیا۔

”ہیلو..... پاپا ہیں۔ کیا کر رہے ہیں۔“

”نہیں نہیں..... مجھے صرف پاپا سے بات کرنا ہے۔“ وہ ترشی سے بول رہا تھا۔

”ہیلو.....“

”السلام علیکم.....“ اس کے انداز میں سخت مجبوری تھی۔

”مجھے افسوس ہے پاپا۔ میری وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ آئی ایم ریلی سوری پاپا“ یہ کہہ کر اس نے کھٹاک سے پیر کر دیا۔

”کم از کم ان کا اگلا جملہ تو سن لیتے۔“ نور بانو جو نہایت مستعدی سے اس کا کلام سن رہی تھی اس غلٹ پر سرزنش کے انداز میں بولیں۔

وہ کئی ان کی کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”بے حد ضدی ہے۔“ وہ بیٹی کی طرف دیکھ کر گویا ہوئیں۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر مزید گویا ہوئیں۔

”منزہ..... میرا خیال ہے تم نے جاؤ رات بہت ہو جائے گی۔ اسدا آنے والے ہیں۔ بلال اور اسدا چلے جائیں گے۔ اللہ کرے خیریت سے خدا واسپے گھر آئیں۔“

”اور ہاں دیکھو خداور کی غیر موجودگی میں میں تمہاری ضد کی وجہ سے اتنے دن یہاں ٹھہر گئی۔ خداور آجائیں گے تو میں فوراً واپس چلی جاؤں گی۔ اب تم ضد نہ کرنا۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ سنا تم نے؟“

”والدہ کے گھر میں دنوں پڑے رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا“ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی غالباً نماز کی نیت سے باہر نکل گئی۔

نمن چارون حرید خاموشی سے گزرے تو نائلہ نے ایک گونہ سکون کا سانس لیا۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ نہیں ہوا جو وہ لگتی۔ اب تو شادی میں کل چھ دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ تیاریاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ شہینہ چھو بھوکا بھی تارایا

اندہا ہلات سے ایک دن قبل پہنچ رہی تھیں۔

ملات کو بھی عموماً دیر سے سویا جا رہا تھا۔

آج بھی وہ سونے والوں میں آخری تھی۔ کچن کا دروازہ بند کیا اور ہاتھ پونچھتی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو چونک

الگ لگائی کے کمرے کی لائٹ ہنوز روشن تھی۔ حالانکہ وہ بہت دیر ہوئی سو نے کیلئے جا چکے تھے۔

معا اس کے کانوں میں صفیہ کی بلند آواز پڑی۔

”آہستہ بولو! بابائی کی برہم آواز سنائی دی۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ یا الہی! اب کیا ہو گیا۔ وہ ان کے کمرے کی کھڑکی کے نزدیک چلی آئی۔

”ہوش کی دوا کریں شیخ صاحب!“ صفیہ کی ناراض آواز سنائی دی۔

”میں ہوش میں ہوں۔ تمہاری بے ہوشی نے تو آج یہ دن دکھایا ہے۔ بس میں نے فیصلہ نہ دیا ہے“ ان کی آواز

ترشی جھلک رہی تھی۔

”یہ نہیں ہوگا۔ نبیلہ پر اس کا انتہائی برا اثر ہوگا۔ میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔“ صفیہ جیسے چیخ پڑیں۔

”اگر تم یہ نہیں ہونے دو گی تو یاد رکھو چند دنوں بعد سر پکڑ کر روؤ گی“ وہ بھی ادنیٰ آواز میں چیخے۔

”جب ان لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں تو تمہیں کیا ہے۔ ان کی عورتوں کو نائلہ ہی پسند آتی تھی مگر میں نے ہی کہا تھا کہ

نمبر سے کریں گے۔“

”اعتراض کی کیا بات ہے۔ بات تو نبیلہ کی ہے۔ آپ ذرا سکون سے سوچئے۔“ نائلہ کے پاؤں تلے سے زمین

گئی۔

”اب سوچنے کا وقت گزر گیا“ شیخ صاحب نے صفیہ کی بات کا ٹ دی۔

”جب اسے سارا قصہ پتا چلے گا تو وہ سمجھو تا کرے گی۔ سمجھ دار ہے“ شیخ صاحب نے اپنی منطق جھاڑی۔

”آپ کو پتا ہے کیا تمنا شاگدے گا؟“ صفیہ جیسے ہنسی ہوئیں۔

”تم نے اور تمہارے بیٹے نے کیا کم تمنا شاگدے بنایا ہوا ہے؟“

”شیخ صاحب! نبیلہ کی زندگی برباد ہو جائے گی۔“ صفیہ جیسے ہنسی ہوئیں۔

”اور اگر یہ نہ ہوا جو میں کہہ رہا ہوں تو اس گھر کی ایک ایک لڑکی کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ بے وقوف عورت

کیوں نہیں۔“ وہ دھاڑے۔

”وہ سمجھ رہی ہوں۔ میں یقین دلاتی ہوں کہ کچھ نہیں ہوگا۔ میں نائلہ سے بات کروں گی“

”وہ بزرگ ہے ہماری؟“ شیخ صاحب نے پھر برہمی سے بات کاٹ دی۔

”وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ میری بچی ایسی نہیں“ دہر دیں۔

نائلہ کا دل بیٹھ گیا (یا الہی! کیا ہو رہا ہے)

”میری آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں؟ جاؤ جا کر اس سے پوچھو۔ وہ تمہیں بتائے گی کہ میں غلط کہہ رہا ہوں یا صحیح؟“

”اوہ“ نائلہ تو جیسے بے ہوش ہونے لگی۔

”میرے دفتر میں میرے دوست نے بتایا تھا کہ اگر چہ نبیلہ ہی کے لئے ہمارے ہاں آئے تھے مگر عورتوں کو نائلہ

گئی تھی۔ مگر مردوں نے اپنی بات نہ بننے کیلئے اس قسم کی بات نہیں کی۔“

”ارے میں کہتا ہوں۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو۔ اس گھر سے اس کی رخصتی جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے“ وہ چیخے

کر بولے۔

”تو پھر آپ رازی کو ہاں کہہ دیجئے۔ اس طرح دونوں ہی اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں گی۔“ صفیہ نے جیسے

سے کہا۔

رازی..... ہونہ..... میں اس ناچکار کو بیٹی دوں گا۔ جو سڑکوں پر میری عزت کو اچھا لٹا پھر رہا ہے۔ وہ سورج پھٹا ہوا

اجب بھی نہیں ہرگز نہیں۔ میں اس کو داماد بناؤں گا جس کی میرے دل میں عزت ہوگی۔ سنا تم نے؟“

”یہ تو خواہ کی ضد ہے“ صفیہ رونے لگیں۔

”خدا سہی..... اب یہ میری ناک کا مسئلہ ہے۔“ وہ سختی سے بولے۔

”آپ کا تو ہر مسئلہ ہی ناک کا ہوتا ہے“ وہ ہنرک کر بولیں۔

”جی ہاں“ وہ بھی جواب میں ہنرکے۔

”ہاں یہی کی کرنا تھی تو پھر ڈاکٹر کا رشتہ کیا برا تھا..... آپ ہی نے بچ لگائی تھی کہ نمبر سے کریں گے۔“ صفیہ ہار نہیں

رہی تھیں۔

”اس وقت صورت حال کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اس میں اس لڑکی کو اس گھر نہیں برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا دل

ہا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ جاؤ۔ اب مجھ سے زیادہ بحث نہ کرو اور صبح سب کو بتا دینا کہ شادی نبیلہ کی نہیں بلکہ نائلہ کی

رہی ہے“

”شیخ صاحب! اللہ کے واسطے..... کوئی تو خوشی ہمیں دیکھنے دیں۔ کون سے جنم کا انتقام لے رہے ہیں آپ مجھ

سے۔“ صفیہ لا چاری سے بولیں۔

”دیکھو صفیہ..... دو ہی راستے ہیں، ایک یہ کہ شادی نائلہ کی ہوگی دوسرا یہ کہ میں زہر کھالوں..... بہت شاندار اولاد

ارک ہے تم نے۔ میری پگڑی سڑکوں پر اچھا لٹا پھر رہی ہے۔“

”شیخ صاحب! یہ کسی کے حق میں بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

”چپ کرو صفیہ۔ اب اچھے برے کا وقت گزر گیا۔ میں نے ان لوگوں سے بات کر لی ہے۔ کہہ دیا کہ نبیلہ کی طبیعت

بلک نہیں ہوتی۔ میں ان لوگوں کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔“

”گویا بیٹی کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ایشیں جن دیں؟“ صفیہ غضب ناک ہو گئیں۔

”میں تم سے عاجز ہوں صفیہ۔ ہر بات میں بحث کرنا تمہاری عادت ہے۔“ وہ ہنرک اٹھے۔ ”میں نے کہہ دیا کہ اس

اطلاق ہو رہا ہے اور آپ لوگوں کو شادی کی جلدی ہے۔ وہ اس بات پر خوشی سے رضامند ہیں۔ اب تم خاموش ہو جاؤ۔

ب کچھ طے ہو چکا ہے۔“

”شیخ صاحب! آپ نے اگر ایسی کوئی بات دیکھ لی تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟ میں نائلہ سے پوچھتی تو۔“

”پھر کیا ہوتا؟ وہ استہزائے انداز میں بولے۔“

”ممکن ہے.....“

”کچھ بھی نہیں۔ میں نے اس لڑکے کو چھت پر گانے بجاتے دیکھا۔ یہ اور تھی۔ میں نے اس کو اس کی گاڑی میں

دکھا۔ ارے کیا میرا دماغ پھر ہوا ہے؟ بے وقوف عورت۔ جاؤ۔ اس سے پوچھو۔ اپنے سر کی قسم دے کر پوچھو کیا میں غلط

کہہ رہا ہوں۔ مگر یہ بات یاد رکھو اب کچھ نہیں ہوگا۔ جسے کو نکاح نائلہ کا ہوگا۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو میں وہ کچھ کر ٹیٹوں گا

جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ سب تمہاری لا پرواہی کا نتیجہ ہے۔ اب خدا کیلئے یہاں سے چلی جاؤ۔“ وہ غالباً لیٹ

گئے تھے۔

نائلہ مشکل اپنے آپ کو کھینچتی ہوئی برآمدے تک آئی اور ایک موڑ سے پڑھ گئی۔

پورا بدن پسینے میں بھجک چکا تھا۔  
اس نے چھت پر لٹکتے نکلے کود کھٹا۔ جی چاہ رہا تھا دوپٹے کا پھندا بنا کر اس میں لٹک جائے۔  
ایسی تجارت۔ کہ خسارہ ہی خسارہ۔  
اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔  
صفیہ دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ اور اسے بے دم سا بیٹھا دیکھ کر ٹھٹھکی گئیں۔ مزید قریب آئیں۔  
”نالکھہ!..... کتنی اجنبیت! کتنا تکلف تھا ان کے لہجہ میں۔ نالکھہ کی تو جیسے روح پرواز کرنے لگی۔“  
”نالکھہ!“ انہوں نے پھر پکارا۔  
اس نے خالی خالی آنکھیں اٹھا کر ماں کی سمت دیکھا۔  
”کیا کر رہی ہو یہاں.....؟“ ان کے انداز میں ہنوز اجنبیت تھی۔  
”ای۔۔۔۔۔! وہ ان کے پاؤں پر بھجک گئی۔“  
”مجھے جان سے مار دیجئے..... امی! میں وہ نہیں جو ثابت ہو رہی ہوں۔ وہ بچکیوں سے رو پڑی۔“  
”گویا تم نے سب کچھ سن لیا..... کیا مل گیا تمہیں یہ سب کر کے؟ ہر شخص میرا اعتماد ریزہ ریزہ کرنے پلٹا ہے۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔  
”ای! کوئی مجھ سے اصل بات نہیں پوچھے گا۔ کوئی اعتبار نہیں کرے گا مگر آپ تو سن لیں۔ خدا کی قسم امی میں ایسی ہوں۔“

”کہاں گئی تھیں تم رازی کے ساتھ؟“ صفیہ نے نہایت آہستگی سے پوچھا۔  
”کہیں بھی نہیں..... آپ آرام سے بیٹھیں امی۔ میں آپ کو ایک ایک بات بتاؤں گی۔“  
صفیہ نے اس کے چہرے کی سمت دیکھا جس پر مرونی چھائی ہوئی تھی۔ ان کا دل پیسنے لگا۔  
وہ اس کے سامنے موڑھے پر بیٹھ گئیں۔  
نالکھہ نے حرف حرف بتا دیا۔  
صفیہ کا خون کھول اٹھا۔

”میں رازی کی ماں بلکہ باپ سے بات کر دوں گی۔ کیوں دوسروں کے گھروں میں آگ لگاتے پھر رہے ہیں.....“  
”ای! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔ میرا آپ کو جو بتایا۔ حرف حرف حقیقت بتایا۔“  
ای..... اباجی جو کچھ کرنے جارہی ہے وہ نہیں ہونا چاہئے۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔  
”ان کو سمجھانا یا ان کو فیصلہ بدلنے پر آمادہ کرنا ناممکن ہے۔ ان کے ساتھ جو زندگی میں نے گزاری ہے اس۔“  
میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے۔“

”نالکھہ!“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”جی امی!“ نالکھہ نے امید بھری آنکھوں سے ماں کی سمت دیکھا۔

”بہتر یہی ہے کہ اس گھر میں سب سے پہلے تمہارا ہی مسئلہ حل ہو۔ اس سے قبل کہ تمہارے اباجی ایسے دیسے کے کہ میں تمہارا ہاتھ تھما دیں۔“  
”ای!.....!“

”بس..... اب تم ایک لفظ نہیں بولو گی۔ نبیلہ کچھ دار ہے حقیقت جان لے گی تو..... خیر..... اب تم آرام کر دو۔ میں تمہارے اباجی کا یہ فیصلہ زندگی میں پہلی بار زل سے قبول کیا۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

لڑنے بھٹی بھٹی آنکھوں سے صفیہ کو جاتے ہوئے دیکھا۔  
ناکی چائیاں اتنی بے اثر ہوں گی۔  
ناکالوس اس طرح رائیگاں جائے گا۔  
لڑنے بھٹی خواب میں بھی نہیں سو چا تھا۔  
عازرا لگا جیسے وہ کچھڑ میں کھڑی ہو اور نبیلہ اس کے منہ پر تھوک رہی ہو۔  
نالکھہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے جیسے اس کے چہرے پر کراہیت کا اظہار کر رہا ہو۔ حالانکہ اس نے تو صفیہ کو ایک ایک بات بتائی۔  
نالکھہ کا وہ حصہ تو بطور خاص دہرایا تھا جس میں اس نے رازی کے سامنے اپنی ماں کیلئے لازوال محبت کا اظہار کیا۔  
نالکھہ لے گیا تھا کہ صفیہ کے دل میں اس کے لئے لطیف ترین گوشے پیدا ہوں۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ صفیہ تو قطعی ارجا بچی تھی۔  
نالکھہ کو راز وجود خوف سے کانپنے لگا۔ صبح کے تصور ہی سے اسے ہول آنے لگا۔ سب سے زیادہ روح فرسا احساس یہ تھا۔  
ناکی گھروں میں ہمیشہ کیلئے اپنا مقام کھو چکی ہے۔ خواہ شادی کہیں ہو وہ باپ کی نظروں سے گر چکی ہے۔  
ناکی کے پاس میں گرنا جا رہا تھا۔  
نالکھہ آپ کو مشکل کھینچتے ہوئے بستر تک آئی تھی۔ آنسو جیسے کسی خود کار نظام کے تحت آنکھوں سے بہے جا رہے۔  
نالکھہ وہ بے آواز رو رہی۔ معا اس کی نظر نبیلہ کی سمت اٹھی جو کسی مدھر پسینے میں گم ہو چکی سی مسکان سجائے



”آپ میری بات کا جواب دیجئے“ نالکہ نے رخساروں سے اشک صاف کئے۔

”تم بہت سمجھدار باہمت اور عملی لڑکی ہو۔ بہت پیاری بہن ہو اور بس“ نالچا نیلہ کو کچھ نہ کچھ تو کہتا تھا۔

”آپ کے خیال میں کیا میں خود غرض اور مدد ہے۔“ ”ہاں“ ”اس نے نیکی لی۔

”آج تک ایسا مظاہرہ تم نے کیا تو نہیں“ نیلہ نے بہت احتیاط سے جواب دیا۔

”تو خدا کیلئے کوئی ایسا انتظام کیجئے کہ یہ بات اباجی کی سمجھ میں آجائے اور وہ بھی آپ کی طرح میرا یقین کر لیں۔“ وہ

بہرہ زد ہوئی۔

”مگر بات بتاؤ ہوا کیا ہے؟“ شہوار کو عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔

”آپ! میں آپ کو سب کچھ کیسے بتاؤں؟ آپ کو میری صورت سے بھی نفرت ہو جائے گی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر

رہے گی۔“

نیلہ اس کے برابر جا بیٹھی۔ اور اس کا سراپے سینے سے نکالیا۔ اس کے بالوں پر پیارے بوسہ دیا۔

”نیلہ! تم اتنی اچھی ہو کہ میرا دل جانتا ہے۔ میں تم سے کیوں نفرت کرنے لگوں گی۔ پاگل ہوں کیا؟ چلو بتاؤ کیا

بات ہے۔“

”آپ! اس دن اباجی میرے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تھے تو آپ نے پوچھا تھا کہ نیلی اباجی تمہیں لینے کالج پہنچ

مے تھے کیا۔“

”ہاں! ہاں! پھر؟“ نیلہ کو فوراً یاد آ گیا۔

”اسی دن کی بات ہے“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”مگر کیا بات ہے؟“ نیلہ سے اب صبر دھڑ بھر تھا۔

نالکہ نے دھیرے دھیرے ایک ایک بات ایک ایک حرف بتا دیا۔

نیلہ کے لئے تو یہ بات کسی زلزلے سے کم نہیں تھی۔ البتہ شہوار چپ بیٹھی رہی۔ اس پر بھی اس قسم کی قیامت نازل

ہوئی تھی جب احسن اسے زبردستی لے گیا تھا۔ لہذا وہ اتنا نہیں چونکی جتنا کہ نیلہ چونکی تھی۔ لیکن ایک گہرا سانس بڑا باہمی سا

اس کے سینے سے خارج ضرور ہوا تھا۔

نیلہ کا تومہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔

”مگر تم اس کے ساتھ بیٹھیں کیوں؟“ کیا کر لیتا وہ؟“ وہ ناراضگی سے گویا ہوئی۔

”بتایا تو ہے میں نے آپ کو اس کے تصور بہت خطرناک تھے۔ محض اپنے گھر کی عزت کی خاطر یا شاید میری بزدلی

تھی۔“

”لیکن اب جو اباجی کر رہے ہیں۔ اگر مجھے علم ہو جاتا کہ یہ سب ہوگا تو میں اس دن سڑک پر اپنا تماشہ بولتی مگر

بھی اس کے ساتھ نہ بیٹھتی۔“

”کیا کر رہے ہیں خالو جان۔“ شہوار کا دل دھڑکا۔

”کاش میں یہ بات ہونے اور بتانے سے پہلے مر گئی ہوتی۔“ نالکہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اباجی نے مجھے اس

کی گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔“

نیلہ کا تو جیسے واقعی سانس جیسے کہیں انک گیا۔

جانے کس ماورائی جہاں کی سیر کر رہی تھی۔ سینے میں ناقابل برداشت قسم کی ٹپٹپٹیں اٹھیں۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی

وہیں بیٹھ کر چھوڑا اور نیلہ کی سمت آئی۔

”آپا! اس نے نیلہ کا بازو دھرایا۔“

”ہوں!“ نیلہ نے دوسری طرف کروٹ بدلی۔

”آپا! پلیر آپا! اٹھیں! اس نے نیلہ کا بازو پھر آہستہ سے دھرایا۔

”کیا ہے؟“ اس کی نیند بہت گہری تھی۔ ٹوٹ کر نہیں دے رہی تھی۔

شہوار جو آج کل صلیب پر سویا کرتی تھی نالکہ کی ہلکی سی آواز پر جاگ گئی تھی اور حیران و ابھمی ہوئی نظر آئی۔

دیکھ رہی تھی۔

”آپا! خدا کیلئے اٹھئے جب ساری عمر کی نیند لگتی تو اتنی سی دیر کا سونا کیا معنی؟ اٹھئے آپا! وہ رہو پڑی۔

نیلہ جیسے ایک دم ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

اس نے انتہائی خوفزدہ انداز میں پٹنگ کے پاس فرش پر بیٹھی نالکہ کو دیکھا تھا جو بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

”کک! کیا ہوا؟“ وہ دیے ہی جلد گھبرا جاتی تھی۔ مارے خوف کے جیسے اس کی آواز بھی ٹھٹھٹ لگتی تھی۔

”آپ میرے ساتھ! برابر والے کمرے میں چلئے۔ بہت ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔“

”ہائیں! نیلہ کی تو جیسے روح پرواز کرنے لگی۔

”اتنی رات کو! کیا ہو گیا!؟ وہ ایک دم بستر سے اتر آئی۔“

”کیا بات ہوئی ہے نیلی؟“ شہوار اب چپ نہ رہ سکی۔ اس کی اپنی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ نالکہ نے جبکہ

دیکھا۔

”آپ بھی آجائے بھابھی جان!۔“ وہ اتنی غافل تھی کہ بغیر دوپٹے کے ہی باہر نکل گئی تھی۔ شہوار اور نیلہ

کے پیچھے دوڑ پڑی تھیں۔

وہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو نالکہ ان سے پہلے ایک صوفے پر ڈھپے چکی تھی۔

”غیریت تو ہے نیلی! اتنی رات کو کیا ہو گیا۔“ نیلہ کی جیسے جان نکل رہی تھی۔

”جو ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو جاتا ہے۔ اس میں رات دن کی قید تو نہیں ہوتی“ اسے اپنے اشکوں پر قابو نہیں تھا۔

شہوار نیچے بیٹھ گئی اور آہستگی سے اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے۔

”ہوا کیا ہے؟ بتاؤ ناں۔“

”آپا! صبح سب کے سامنے آپ میرے منہ پر تھوکیں گی۔ اتنا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں جو کہنا ہے؟

ابھی کر لیجئے۔“ وہ سسکیاں دبا کر بے شکل گویا ہوئی۔

نیلہ کا دل پہلے سنا پھرا اسی قوت سے پھیلا۔

”ہوا کیا ہے؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اچھا پہلے یہ بتائیے۔ آپ کی میرے بارے میں کیا رائے ہے؟“

”ہائیں! نیلہ کو اس کا سوال بالکل بے نکاح اور عجیب سا لگا تھا۔

”اتنی رات کو رائے مانگنے کیلئے یہ کچھ کیا ہے۔ بے وقوف سیدھی سیدھی بات کرو۔“ وہ سخت الجھن میں

”ہائیں..... واقعی.....!!!!“

شہوار کے کانوں میں چند دن پیشتر شیخ صاحب کا کہا ہوا جملہ گونجا..... ایک مفرد و ساجملہ تھا۔  
”یہ میرا گھر ہے سرداروں کا نہیں کہ پگ اونچی اور.....“

(ہم انسان کہاں کہاں اور کیسے کیسے اپنے اپنے قرض اتارتے ہیں۔ جب ہمیں اپنی تقدیر اختیار نہیں تو۔ تو اپنا زہر پر بس کیوں نہیں کرتے..... ہمارے لفظ ہم ہی سے کھیلے ہیں۔ ہم غوری نہیں کرتے)  
”پھر..... پھر..... نبیلہ کے تو حواس جواب دینے لگے تھے۔ کہاں شیخ صاحب پودا سو کھنے پر گلا توڑنے والے۔ معقول باتوں پر طوفان اٹھانے والے۔ کجا کہ اتنی بڑی بات۔ وہ جو نہ کریں کم ہے۔  
”کیا کہہ رہے ہیں اباجی؟“ وہ سخت خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔

”وہ..... حشر اٹھا رہے ہیں۔ میں کیسے آپ کو بتاؤں؟ حالانکہ یہ بات بتانے کیلئے میں نے آپ کو جگایا ہے۔“  
”نہیں نہیں..... بتاؤ تم..... ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔“ نبیلہ نے ہم کراس کی طرف دیکھا۔  
”نالکہ کے زار و قطار رونے سے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بات بہت بڑی ہے۔  
”کیا احسن بھائی کے گھر چھوڑنے سے بھی بڑی؟“  
”کیا شکیلہ باجی کی شادی کی بات سے بھی بڑی؟“  
”آپا!“

”ہاں ہاں..... کو پولیز.....“

”بتاؤ نالکہ..... آخر بتانا تو ہے ہی۔“ شہوار بھی بے مبرے پن سے بولی۔

”آپا..... آپ ہمیشہ کیلئے مجھ سے نفرت کرنے لگیں گی۔“ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

”اتنی بد عقل بھی نہیں ہوں میں، کیا تمہیں جاننی نہیں ہوں..... پاگل۔“ نبیلہ نے پیار سے اس کا شانہ تپتھپایا۔  
”نالکہ کو اس کے اس عمل سے عجیب سے تقویت ہوئی۔ کچھ حوصلہ ہوا۔

”آپا.....! مجھے کہ آپ کا نکاح نہیں میرا ہوا ہے۔“

نبیلہ نالکہ کو اپنے بازوؤں میں سینے ہوئے تھی۔ ایک دم گرفت و جمل پر مچی۔

”مطلب..... میں سمجھی نہیں۔“ وہ واقعی سمجھی نہیں تھی۔

شہوار الگ ہکا بکا اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

”جن سے آپ کا رشتہ طے ہوا تھا وہاں اباجی میری بات کرائے ہیں۔“

نبیلہ کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

”کس نے کہا تم سے؟“ شہوار نے منہ جھل کر اس سے پوچھا۔

”میں نے اباجی اور امی کی باتیں سنی ہیں اور پھر امی نے بھی اباجی مجھے فیصلہ سنایا ہے۔“

”امی نے؟“ سوال سے زیادہ حیرت تھی۔

”امی کہہ رہی ہیں کہ اگر ایسا نہ ہوا تو اباجی کسی ایسے ویسے کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دے دیں گے۔ خدا کیلئے آپا کچھ سمجھئے۔ مجھے ایسا ویسا منظور ہے مگر یہ سب منظور نہیں جوابا اباجی کرنے جارہے ہیں۔“

نبیلہ کی تو گویائی اور سماعت دونوں جواب دے چکی تھیں۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے شہوار کو کھورنے لگی۔

”راستی خالو جان بات کرائے ہیں؟“ شہوار کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے بھابھی جان۔ پھر امی نے مجھ سے بات کی ہے۔“

”بہت بڑی بات ہے۔ عجیب سا تماشہ! یہ نہیں ہونا چاہیے۔“ شہوار مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جان کا احساس نہیں کہ نبیلہ کیلئے مسئلہ ہو جائے گا۔“ وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔

”رض محال اگر انہیں تم پر اعتبار نہیں رہا تو تمہارے بیروں میں زنجیر باندھ کر وہ دو تین ماہ میں تمہارا رشتہ کہیں اور

ہیں۔ یہ کیا آفت ہے؟“ وہ جیسے خود سے الجھ کر مخاطب تھی۔

”اس طرح وہ اپنے شدید غصے کا اظہار تو نہیں کر سکتے۔ رازی سے فوری بدلہ تو نہیں لیا جاسکتا۔“ نبیلہ جیسے پاتال

لا۔

”یہ سب تقدیر ہے تو.....“

”ری بے کسی تقدیر ہے، ان کا اختیار تقدیر ہے بالکل بھی تو ازن نہیں جو تو ازن نہ رکھتا ہو وہ خدا کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

”رہا ہوگا۔ آپا.....!“

”بے پھر کر نبیلہ سے مخاطب ہوئی۔ اور اس سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔

”ٹا؟“ نبیلہ نے دیر ان آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔

”میں میں نکاح کے وقت انکار کر دوں؟ تو.....؟ وہ ایک دم غضب ناک نظر آئی۔

”ایسا ہرگز نہیں کرو گی۔ کسی قیمت پر نہیں۔ کیونکہ ہمارے ساتھ صرف اباجی ہی نہیں ایک ڈکھی اور ایثار پیشہ ماں

بھین ہیں بھائی ہیں..... تم یہ عمل محض اس لئے کرنا چاہتی ہو ناں تاکہ میں تمہیں بے قصور مان لوں۔ تو میں حلف

تیار ہوں کہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔“ نبیلہ نے نہایت آہستگی سے کہا۔

”پا۔ پولیز آپا..... بس سمجھئے۔ مجھے کچھ کرنے دیجئے۔“

”یار کو لگی تم؟“ پندرہ منٹ کا ڈرامہ ایک گھنٹے کا بنا دو گی بس.....؟ آخر کار ہوگا وہی جوابا جی نے سوچ لیا ہے۔“

”سکرانی۔“

”ماں میں تمہارا بھلا ہوگا اور نہ میرا۔ بلکہ بات اتنی مجڑ جائے گی تو برسوں نہ سنبھلے گی۔ جذباتیت کے دور ایسے کا ہر

نار کو کھوکھلا ہوتا ہے۔

”ناکوش ہو جاؤ اور جو رہا ہے ہونے دو۔“

”ہا.....! وہ دم بخود نبیلہ کی شکل دیکھنے لگی۔“ ایسے ہی.....؟“

”اں“

”نماز ہر کھالوں کی دیکھ لیجئے گا۔“

”پھر تو ہمارے سارے گھر کا بھلا ہو جائے گا..... ہو نہ ہو..... ہر ہلاکت شہادت نہیں ہوتی۔ اطلاع عرض ہے۔“ نبیلہ

نماز میں بولی۔

”مما آپ کے خواب اجاڑ کر کیسے.....؟“

”تمہارا اس میں کوئی دوش نہیں ہے نبلی۔ یہ میرا انصیب ہے۔ جس طرح تم امی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر سکتی

اگر میں بھی تم سب کی خاطر بڑے سے بڑا عذاب برداشت کر سکتی ہوں۔“

نالہ اور شہوار شاکت وصامت نبیلہ کو دیکھ رہی تھیں۔

”یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے سینے میں اس وقت حشر برپا نہ ہو..... یہ پتھر کی تو نہیں.....“ نالہ نے فر دیکھا۔

”ایسے نہیں دیکھو مجھے اور سو جاؤ۔“ وہ ایک دم تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ نالہ اور شہوار نے ایک دہر دیکھا۔

”وہ چاہے خود کو کتنا مضبوط ظاہر کرے..... نیلی..... قیامت تو ٹوٹی ہے۔ اس پر۔ کس قدر لاعلاج کا..... اس وقت۔“

شہوار کا جیسے دل کٹ گیا۔

”اسی تو کہہ رہی ہوں بھابی جان۔ چاہے اباجی مجھے جان سے مار ڈالیں، میں ان کے فیصلے پر کروں گی۔ وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

”خالہ! یہ میری بد نصیبی ہے کہ میں کئے مدینے میں نہیں جاسکا ورنہ میں آپ کیلئے آپ کی فرمائشیں خاور غسل سے فارغ ہو کر تولیے سے سر گڑتے ہوئے لاؤنج میں چلے آئے۔

”اے کوئی بات نہیں تمہارا تو آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ آجائے گی۔“

”کوئی نہیں لگے گا آنا جانا۔ بہت ہو گیا۔“ منزہ چائے لے کر اندر داخل ہوئی اور قطعی انداز میں بات کا۔

”ایسے نہیں کہتے ناشکری ہوتی ہے۔ یہ تو اللہ نے خاور میاں کی روزی کا بہانہ بنایا ہے۔“ خالہ نے سر زلٹا کر کہا۔

”اب جو چاہے کوئی کہے۔ یہ جا کر دکھائیں۔“ منزہ نے ٹرے نیبل پر رکھ دی

”تو پھر دکھاؤں جا کر.....؟ تم جانتی ہو مجھے دیے بھی چیلنج قبول کرنے کا بہت شوق ہے۔“ خاور مسکرائے۔

منزہ کی آنکھیں بھر آئیں..... ”آئے دیر نہیں ہوتی جانے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔“ وہ ناراض نا بنانے لگی۔

”ذہن تمہاری غیر موجودگی میں بالکل اجاڑ نظر آتی ہیں۔ میرے منہ میں خاک۔ کہہ کہہ کر میں نے چوڑیاں ڈلوائی تھیں۔ تم انہی کی بات رکھ لو۔ کوئی اور کام دیکھ لو یہیں کہیں۔“

”نیک عورتیں ایسی ہوتی ہیں خالہ، کہ صرف اپنے شہر کے لئے سنگھار کرتی ہیں۔“ خاور نے گویا منزہ کا ہونہ۔

”آپ اتنی لمبی نیکی کریں تو پتا چلے۔“ وہ بکری

خاور خالہ کی طرف سے پیٹھ کے منزہ کے مقابل بیٹھ چکے تھے۔ اس کی طرف جھک کر آہستگی سے بولے۔

”یقین کرو..... تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی اتنی لمبی نیکی کرتا ہوں۔ جن دنوں ہم پورٹ پر ہوتے ہیں شیونہیں بنانا ویٹس تک کی طرف دیکھنا گناہ سمجھتا ہو۔ کیونکہ وہ بلا کی حسین ہوتی ہیں۔ سخت جبر کرتا ہوں سے ایمانی ہوگی۔“

خاور کے چہرے کے ہر زاویے سے شرارت بھوٹ رہی تھی۔

”مجھے کیا پتہ کتنی بے ایمانی کرتے ہوں گے۔ جب ہی تو گھر آنے کا دل نہیں چاہتا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوا

بال کی طرف بڑھی۔

”اسد میاں نظر نہیں آئے۔ ٹھیک تو ہیں ناں؟ خالہ کو اسد کی بہت فکر رہتی تھی۔ وہ ان کے “کیرئیر کا حصہ

وہ بہت دیر سے گئے تھے..... بلال اور اسد بھائی ہی تو لینے گئے تھے۔“ انہیں “وہ اپنی مخصوص سادگی کے

تج ہیں کہ محترمہ کو میرا بہت انتظار ہوتا ہے۔ میرے استقبال تک کو تو پہنچتی نہیں۔ رات میں گھر آیا تو سو رہی

ام کیا ہے میں نے۔“

پہیں..... یہ تو دیوانوں کی طرح تمہاری راہ دیکھتی ہیں۔ غلط کہہ رہے ہو۔“ خالہ نے بالکل بھی یقین نہیں کیا۔

پہیں نے ان کے ہاتھوں میں مہندی لگوائی تھی۔ آج کل کی تو کنواریاں ان سے زیادہ سنگھار کرتی ہیں۔“

انہرہ کے مہندی سے سرخ ہاتھ دیکھے۔ اس رنگ میں جو جذبے تھے وہ پوری لطافت کے ساتھ خاور کے قلب

نے۔

”ہاں آپ نے لگوائی تھی۔ بھی یہ تو زبردستی کی ناں آپ نے۔“

ہاں..... کیوں زبردستی.....؟ تمہارے ساتھ کیا نکاح زبردستی ہوا تھا.....؟“ وہ برامان کر بولیں۔

نے تو یہی سنا ہے۔“ خاور نے اٹھ کر در پہنچے کے پردے سر کا بے۔

پہاں جھڑکنے والی بیوی تو نصیب سے ملتی ہے خاور میاں۔ قدر کرو اس کی..... ورنہ..... یوں بھی ہوتا ہے۔“

د اندر چلی آئیں۔ خالہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

پہاں اچائے پیچھے ناں ہمارے ساتھ۔“ خاور نے ساس سے نظیما کہا۔

پہاں نے ہی آئی ہوں۔ تمہارے ساتھ۔ ماشاء اللہ آج تو منزہ پہچانی نہیں جا رہی۔ کیا کہیں جا رہے تم لوگ.....“

نہجرت سے گویا ہونیں۔

اور بڑے آویزے پہن کر منزہ عام دنوں سے یکسر مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جو رنگ

کی رنگ جاں میں طمانیت کا احساس بن کر اتر رہے تھے۔

لہا خاور کے کو لیک ہیں چائے پر بلایا ہے انہوں نے..... میں آپ کو بتانے بھی گئی تھی مگر آپ کا کرہ اندر سے

..... میں سو رہی تھی۔ رات کو بہت دیر سے سوئے تھے ناں۔ نیند بہت آ رہی تھی۔ بچوں کو لے جا رہی ہو؟“

لہلے جا رہی ہوں گڑیا کو آپ سنبھالنے گا، کہیں جا کر وہ روتی بہت ہے۔“ منزہ نے کہا۔

گندہ ایک خوش مزاج باپ کی بیٹی ہے۔“ خاور مسکرائے۔

پہنوش مزاج دو سر دل کو توڑ لاتا ہے۔ ناں“ وہ خاور کے قریب کھڑی تھی۔ چپکے سے کہہ کر لاؤنج سے باہر نکل

بننے کی خواہش کے باوجود حفظ مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف مسکرا دیے تھے۔

لڑکی دیر بعد لاؤنج میں اپنا پرس اٹھائے ہوئے اور بچے کے دیگر لوازمات کے ساتھ داخل ہوئی تو اسد کو موجود

لانگ تنگ سے تیار بیٹھے تھے۔

”السلام علیکم اسد بھائی“ اس نے بے حد سرت سے سلام کیا۔

”علیکم السلام۔ مزاج بخیر.....؟“ اسد مسکرائے۔

”بالکل بخیر ہیں۔“ وہ بشارت کے ساتھ مسکرائی۔

”چائے پیچھے گایا کافی.....؟“

”فی الحال کچھ نہیں۔ اس وقت میں صرف ضروری اطلاع کی غرض سے حاضر ہوا ہوں جسے کو جو آپ پر دو گرام تھادہ کینسل۔ اسلام آباد میں میرے فرسٹ کزن کی شادی ہے۔ ہم لوگ پرسوں روانہ ہو رہے ہیں خاور نہیں ہیں پھر۔“

”سیاب“ یہیں ہیں۔ منزہ نے بات کاٹ دی۔ خاور اور اسد ایک دوسرے کی سمت دیکھ کر مسکرا دیئے۔

”آپ نے تو کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اپنے کزن کی شادی دادی کا۔ کیا اچانک.....؟“

”بالکل اچانک..... کل تک مجھے بھی پتہ نہیں تھا..... بڑی ایمر جنسی میں ہو رہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”واپسی کب تک ہوگی؟ خاور نے دریافت کیا۔

”جیسے کو بات ہے۔ اب ولیمہ پنا کر ہی واپسی ہوگی۔“

”بیٹے! اب اپنا معاملہ بھی نپالو۔“ خالد سے آخر ہرمانا گیا۔

”وہ تو سنا ہے آپ نپٹائیں گی۔“ اسد مسکرائے۔

”ارے ہزار جان سے تم حامی تو بھرو۔“ خالد نہال ہو گئیں۔

”اچھا میں چلتا ہوں..... اوکے۔“

”تھوڑی دیر تو بیٹھو یا!“ خاور نے اصرار کیا۔

”تم اپنے پروگرام پر عملدرآمد کرو۔ ویسے ہی لیٹ ہو رہے ہو۔ خدا حافظ۔“ وہ بغیر کچھ سے باہر نکل گئے اور خاور بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ منزہ نے آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کو گود میں اٹھالیا۔

شادی کے مہمانوں میں سب سے پہلے شکیلہ کی آمد ہوئی تھی۔

سارے گھر میں جیسے پائل جگ مچی تھی۔ وہ صبح ہی آئی تھی۔ سیاہ اور زرد پھول دار سوٹ میں ملبوس دونوں ہا سونے کی چوڑیاں پہنے وہ بہت تازہ و دکھائی دے رہی تھی۔ صحت بھی بہت اچھی ہو رہی تھی، گھر میں جن کو حادثے کے بارے میں علم نہیں تھا ان کی خوش دیدنی تھی۔ وہ شکیلہ کی آمد پر پھر پور خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ گھر رونق سی اتر آئی تھی۔

جب کہ نالکہ کمرے سے باہر نکل نہ آئی تھی صغیر اسے کئی بار بلانے لگیں تھیں۔ مگر وہ ہر بار آ رہی ہوں کہہ بدل لیتی تھی۔ حتیٰ کہ شکیلہ خود اسے ڈھونڈتی ہوئے وہیں چلی آئی۔

”اے محترمہ۔ رت چکا کر کے سوئی ہوئی نہ پوری نہیں ہو رہی۔“ اس نے آتے ہی نالکہ کے ایک دھپ چڑا نالکہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور شکیلہ کے گلے لگ گئی۔ آنسو بے ساختہ بہہ نکلے۔

”ارے..... رے..... کیا..... نیلہ کے جیسے کام بھی تم خود کر رہی ہو۔“ اس نے ہنس کر نالکہ کی پشت پر ہا مگر نالکہ کے آنسو نہ رُکے۔

”بائی اڈر ادھر ادھر بھی دیکھیں۔“ راحیلہ کی آواز آئی۔

شکیلہ نے پلٹ کر پیچھے دیکھا..... ”ارے..... ارے۔“ وہ میرے خدا۔ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔“ اس نے زرد میں ملبوس زرد زردی شہوار کو سرت آمیز حیرت سے دیکھا اور آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔

”مخبر حسن بھائی آگئے۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ بہت اچھے موقع پر یہ سب کچھ ہو گیا۔

کہاں ہیں احسن بھائی۔ آپ لوگوں نے کیوں نہیں بتایا تھا۔“ وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھی تھی۔

”بائی! احسن بھائی نہیں۔ صرف بھابھی جان.....“ نیلا نے جیسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

”ہائیں.....! مگر.....“ وہ ٹھیک کر شہوار کو گھورنے لگی۔

”کیا اباجی نے صرف.....“ وہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ابھی آپ کو سب کچھ بتا چل جائے گا۔“ انیلا نے اسے پرسکون کرنا چاہا۔

”مگر.....؟“ وہ ہنوز حیران پریشان نظر آتی۔

”ابھی تو تم نے بہت ساری نئی خبریں سننا ہیں۔ آرام سے بیٹھو تو سہی۔“ صغیر نے ایک گہری نظر نالکہ پر ڈال کر کہا

فری اچھی تو ہیں نا مائی.....؟“ شکیلہ نے تشویش بھری نظروں سے مال کو دیکھا۔

”میں ذرا ناشتہ بنالوں..... بہت سارے کام نپٹانے ہیں۔ گیارہ بجے تمہاری خالائیں اور ماموں مائیاں بھی پہنچ

نا ہیں۔“ صغیر کہتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

”آپا! کتنا مزہ آئے گا۔ چھوٹی ممانی تو بہت مزے لگاتی ہیں۔ اب شروع ہوں گے اصل میں شادی کے ہنگامے وہ تو

انہی بہت اچھے لگتی ہیں۔“ انیلا پر ایک عجیب سی سرخوشی کی کیفیت طاری تھی۔ اور وہ براہ راست نالکہ سے مخاطب

لگا۔

”بائی! آج تو مایوں کی رسم ہے..... انیلا آپ ہی ہم کام دام نہیں کریں گے۔ بس چھوٹی ممانی کے ساتھ گانے گائیں

یہ۔“ نیلا نے قطعی فیصلہ سنایا۔

”بھئی تم نے کام سے بچنے کا نہایت ہی غیر معقول بہانہ بنایا ہے۔“ شکیلہ ہنس کر بولی۔

”پرانے وقتوں میں ڈیوڑھی میں میرا شین دھرنا مار کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اب بیلا بیٹھے گی۔“ انیلا ہنسی۔

”صرف میں ہی نہیں چھوٹی ممانی بھی۔“ نیلا نے فوراً وضاحت کی۔

شہوار صغیر کے ساتھ ہی باہر نکل گئی تھی۔ شکیلہ نے ادھر ادھر دیکھا اور نالکہ کے قریب چلی آئی۔ ”کچھ بتاؤ تو شہوار

ناجی یہاں کیسے..... نظر آ رہی ہیں۔ سچ مجھے تو بہت بے چینی ہو رہی ہے۔“

”پتہ چل جائے گا۔ بس یہ سمجھ لیجئے“ اچھے حالات میں یہاں نہیں آئیں۔“ وہ پڑمردہ انداز میں دوبارہ پتنگ پر بیٹھ

لگا۔

”کیا بات ہے نیلی طبیعت خراب ہے تمہاری.....؟“ شکیلہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اور حالات سے کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ وہ سخت الجھن میں پڑ گئی تھی۔

”کہہ تو دیا باجی..... ابھی تھوڑی دیر بعد امی آپ کو حرف بتا دیں گی۔ اطمینان رکھیں۔“ وہ قدرے تلخی سے گویا

ہوئی۔ شکیلہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔ پھر کچھ سوچ کر گویا ہوئی۔

”تم اس طرح کیوں بیٹھی ہو..... لگتا ہے تمہاری طبیعت واقعی ٹھیک نہیں۔“

”جی“ بالآخر نائلہ کو کہنا پڑا۔ شکیلہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔

نبیلہ کی خاموشی شکیلہ کو اس لئے عجیب نہیں لگی کہ اس کے خیال میں اسے گھر سے جدائی کے خیال نے چپ لگا دی تھی۔  
ناشتے کی مصروفیات کے دوران صغیہ دوبارہ آکر نائلہ کو بلا گئی تھیں مگر وہ بس سے مس نہ ہوئی۔ پھر صغیہ نے بھی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کی۔

تیسری مرتبہ وہ اس کے پاس آئیں تو وہ سو رہی تھی۔ غالباً رات بھر جاگنے کے بعد کا یہ قدرتی عمل تھا۔  
پھر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ وہ خود میں ہمت پیدا کر رہی تھیں کہ نبیلہ کو جلد سے جلد ہی صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ مگر جب بھی اس کی سمت دیکھی تھیں ہمت جواب دے جاتی تھی۔  
تب انہوں نے سوچا وہ شکیلہ کو کھانسی سے آگاہ کر دیں، پھر وہ خود نبیلہ کو سمجھا دے گی۔ یہ فیصلہ کر کے وہ ذرا پرسکون ہو گئی تھیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب سے پہلے انہوں نے شکیلہ کو شہوار کی موجودگی کے اسباب سے آگاہ کیا۔ کیونکہ بہت ابھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

اور تمام حقیقت سن کر شکیلہ کی ایک ایک خوشی جیسے بے رنگ سی ہو گئی تھی۔ اسے نئے حالات کی تکلفی کے احساس نے چپ سی لگا دی تھی۔  
پھر اس نے کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔

صرف نائلہ کے بارے میں پوچھا کہ آیا واقعی اس کی طبیعت خراب ہے ورنہ وہ بے وقت کیوں سو رہی ہے۔ کیونکہ اس نے چھو ابھی تھا اور گھلے گھلے لگایا تھا۔ بخار وغیرہ ٹائپ کی تو کوئی چیز اسے محسوس نہیں ہوئی تھی۔  
صغیہ نے اسے فی الحال ٹال دیا تھا۔ ڈھیر دن مہمان پہنچ رہے تھے۔ وہ ان کے انتظامات میں مصروف ہو گئی تھیں۔  
دوسرے ان کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔

ضروری کاموں میں شہنہک ہو کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ یہاں تک کہ کراچی کے مہمانوں کا قافلہ پہنچا۔  
پھر وہ ہاؤس پر گھر مچی کے توبہ ہی بھلی۔ یہاں وہاں سامان اور انسان دکھائی دینے لگے۔ بچوں کی چیخ و پکار علیحدہ تھی۔ پھر صغیہ کی سب سے چھوٹی بھادج کی شوخیاں بڑی خالہ آتے ہی اپنے شوہر سے کسی بات پر الجھ پڑی تھیں۔ وہ بے چاری خاموشی سے ان کے دلائل سن رہے تھے۔ یہ الگ ہنگامہ تھا۔

”حضرات! ایک تروتازہ لطیفہ.....“ چھوٹی ممانی اپنی بچی کو نہلا کر تولیے میں لپیٹ کرے میں داخل ہوئیں تو کمرے کی صورت حال پر انہیں برحکم لطیفہ یاد آ گیا۔

”چھوٹی ممانی..... جلدی سے سنائیں“ انیلا نے سخت بے چینی ظاہر کی۔  
”لطیفہ یہ ہے۔“ انہوں نے بھیگی ہوئی کبوتری جیسی بچی کو پلنگ پر ٹکا تو ہونے لگا۔  
”نفسیات کے ایک پروفیسر لکچر دے رہے تھے کہ جو شخص غلط نقطہ نظر رکھے اور ہار مان لے وہ عقلمند ہوتا ہے اور جو شخص صحیح نقطہ نظر رکھے کے باوجود ہار مان لے؟“

انہوں نے سوالیہ نظروں سے شاگردوں کی سمت دیکھا۔  
”وہ شوہر ہوتا ہے۔“ ایک شاگرد نے جواب دیا۔  
کمرے میں بے ساختہ کئی قہقہے ابل پڑے۔  
”اے چھوڑو۔ وہ تمہارے میاں ہوں گے۔ یہ ایسے نہیں۔ میرا تو نام ہی انہوں نے ”غلط“ رکھا ہوا ہے۔“

بھی میری بات مان لیں۔“ بڑی خالہ جل کر بولیں۔

پچھلے عرصہ جاری تھا کہ شیخ صاحب آگئے اور ماحول خاصا پر تکلف اور خاموش سا ہو گیا۔ سب ہی رشتے داران اپنے اپنے کمرے میں بیٹھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ آجانا نہیں تھا۔ عموماً تقریبات ہی کے مواقع پر اس طرح اکٹھا ہونے کا بہانہ تھا۔

باب جبران سے تھے کہ شیخ صاحب کا رویہ خلاف توقع بہت بدلا ہوا تھا۔ یعنی خشکی اور سرد مہری میں بے حد واضح ہوا رہی تھی۔

منہ بظاہر گھر کے کام کاج میں مصروف تھیں مگر ابھی انہیں ایک دشوار گزار مرحلے سے گزرنا تھا۔ پہلا امتحان تو یہ تھا کہ نئے خیر جلدیلی کی خبر نبیلہ تک پہنچانی تھی۔

پھر جو تمام خونی رشتے دار ”نبیلہ“ کی شادی میں شرکت کی غرض سے آنے ہوئے تھے انہیں ”دھول“ کی تبدیلی کی باگنی دینا تھی۔

کئی بہت وزنی آڑ بھی ڈھونڈنا تھی۔ کوئی ایسی تاویل جو ”ہضم“ ہو سکے۔  
پر سب سے بڑھ کر شہوار کا گھمبیر مسئلہ۔ شہوار تو ایک کونے میں چھپی تھی۔ اس کی حالت بہت غیر تھی۔ بہر حال اسے اب اور ماموں کا تو سامنا کرنا تھا۔

اب اور شہوار جو تازہ ترین تھی وہ تھی ”نائلہ“ کی ہٹ دھرمی..... وہ نہ کمرے سے باہر آئی تھی اور نہ ہی کچھ کھایا پیا تھی کہ مہمانوں کو سلام کرنے کے لیے بھی کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ ترقی ڈانٹ اور ناراضگی وہ ہر حربہ اس پر لگاتے۔ مگر وہ بس سے مس نہ ہوئی۔

اب انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس مرحلے سے شیخ صاحب خود نہیں گئے۔ وہ صرف پیغام رساں کا کردار ادا کریں۔  
پھر وہ شہوار کو لینے چلی آئیں۔

الگ کمرے بدلے لیں ہوئی تھی۔ شہوار ایک دوپٹے کو خوبصورت سی شلیپ دے کر ٹاٹک رہی تھی۔  
”ہلے.....“ جل کر اپنی خالہ کو سلام تو کر لو۔“ انہوں نے شفقت سے شہوار کے سر پر ہاتھ رکھا۔  
”نائلہ! لگ رہا ہے خالہ جان۔“ اس کا دل کاٹنے لگا۔

”کس چیز سے.....“ بیٹے وہ سب تمہارے اپنے ہیں..... جس طرح تم سردار بھائی کی اور ہماری..... عزت ہو اسی لگا لگی ہو۔“ انہوں نے رسائیت سے سمجھایا۔

نائلہ غور و فکر سے کہنے لگی۔ ”خالہ جان..... پتا نہیں وہ سب کیسے کیسے سوال کریں گے۔“ وہ واقعی بہت شرمسار اور خوفزدہ لگ رہی تھی۔

”تم میری بیٹی ہو..... میں کیوں تمہارا تماشا بننے دوں گی، پھر وہ انسان میرا کیا لگتا ہے جو میرا میری بیٹی کا تماشا بنائے؟“

نائلہ جان میری جان نکل رہی ہے۔ بڑے ماموں بھی ہیں.....؟“ وہ ہنوز سہمی ہوئی تھی۔  
”تمہارا قصور کیا ہے؟ غلطی احسن نے کی ہے۔ مجھے اس کی ماں ہونے کے ناتے تاوان ادا کرنا ہے۔ کسی کی مجال نہیں۔“  
”خوبیہ شہناش..... ایسے نہیں کرتے جو بدلتی ہے جھیلنا ہوتی ہے۔“ وہ اسے چپکار کر پکار کر آخر بڑے کمرے میں لے گئیں۔



ایک لمحے کو تو جیسے سب ہی ہوتے ہو گئے تھے۔ اس درجہ متحیر ہو گئے تھے۔ کہ اس کے سلام کا جواب نہ دیتا۔ بھول گئے تھے۔

”صفیہ۔۔۔ یہ شہوار۔۔۔ بڑے ماموں نے اپنے حواس پر سب سے پہلے کنٹرول حاصل کیا۔“ تو گویا شیخ صاحب نے بیٹے کو معاف کر دیا۔۔۔ ”بالا خر وہ اس نتیجے پر پہنچے۔

”ظاہر ہے ناخن سے گوشت جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔“ بڑی ممانی نے بھی۔۔۔ ذرا مضبوط اعصابی اور حاضر دماغی مظاہرہ کیا۔

”مگر احسن ہے کہاں۔۔۔؟ دکھائی نہیں دیا۔۔۔“ چھوٹی خالہ جو احسن سے بے پناہ انیت محسوس کرتی تھیں احسن غیر موجودگی کا دھیان انہیں سب سے پہلے آیا۔

”مگر بھی یہ تو۔۔۔ معجزہ ہے کہ رحیم بھائی اپنا فیصلہ بدل ڈالیں۔“

صفیہ سے چھوٹی بہن شہوار کی امی تھیں۔۔۔ ان سے چھوٹی حفصہ تھیں اور ان سے چھوٹی رمیصہ تھیں۔ جنہیں سب بچرا خالہ کہتے تھے شیخ صاحب کے لیے قحب کا اظہار حفصہ خالہ نے کیا تھا۔

”رحیم بھائی کی ”ہاں“ آج تک ”نہ“ میں اور ”نہ“ ہاں میں بدلتے ہم نے تو نہیں دیکھی۔

”کیوں رمیصہ۔۔۔؟ انہوں نے۔۔۔ چھوٹی خالہ سے تائید چاہی۔

”پوری بات تو سن لو حفصہ۔۔۔“ صفیہ ان کے نزدیک بیٹھ گئیں۔

”شہوار احسن کے ساتھ نہیں آئی ہے۔“

”مگر عائشہ باجی نے تو ہمیں بتایا تھا۔۔۔“ چھوٹی خالہ پر خاصی تشویش اور غلبت سوار تھی۔

”انہوں نے جو بھی بتایا ہوگا ٹھیک بتایا ہوگا۔ مگر آپ باجی کی تو بات سن لیں۔“ شہوار کی دوست نما ممانی نے انہوں کوک دیا۔

”بھائی جان۔۔۔ قصور اولاد کرتی ہے ٹھکانا والدین کو جھگڑتا پڑتے ہیں۔ میں بھی بھگت رہی ہوں۔۔۔۔۔ پائیاں! کہنا زبیب بھی نہیں دیتا ہے یا نہیں۔ مگر حقیقت کچھ اس طرح سے ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ بیٹھنوں کی لڑائی میں جھگڑا نقصان۔

یہ بچی تو خواہ خواہ پس گئی ہے۔۔۔ شیخ صاحب سردار بھائی اور احسن سب اپنی اپنی ہند کے پکر ہیں۔ بلکہ ممانی ہوں کہ سارا قصور میرا ہے۔ نہ میں خلیک کی شادی کی مخالفت کرتی نہ احسن کو یہ وقت دیکھنا پڑتا۔

آخر پہلے بھی تو شیخ صاحب تھے اور وہی احسن تھا۔ ہزار زیادتیوں کے باوجود کبھی باپ کے سامنے نہیں آیا۔ کبھی کہ جواب نہیں دیا۔۔۔ وہ میری خاطر حساس ہوا تھا سراسر بھگت رہا ہے۔“ ان کی آواز بھر مائی۔

”مرد ذات ہے میں اس کی عقل و دماغ یاد دل پر پھرے کہاں تک بٹھاتی۔۔۔؟ اب آپ جو کہیں۔ شیخ صاحب با تھے کہ اس کا شہوار سے نکاح ختم ہو جائے۔ وہ جند میں لے گیا تھا۔ غصے اور جذباتیت میں عقل تو بہت پیچھے رہ جاتی۔ اب شہوار نے اس عمل پر تائید کی ظاہر کی کہ وہ ماں باپ کی مرضی کے بغیر اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو وہ واپس نہ پہنچا گیا۔ شرف بچیوں سے کہاں اس قسم کی باتیں برداشت ہوتی ہیں۔۔۔ پریشانی یہ ہے کہ سردار بھائی نے شہوار داخلے پر پابندی لگا دی ہے۔ یہ نہ ادھر کی رہی یہ ادھر کی۔۔۔ بھلا ہو نفل کا بچے نے بڑی ٹھنڈی دکھائی جو شہوار کو اسلئے بھیج دیا۔۔۔۔۔ خدا نخواستہ اگر بچی کو کچھ ہو جاتا۔۔۔ آگ نہ لگ جائے ایسی ہند اور غرور کو جو انسان کی جان بچا

”مگر احسن سے تو میری حال ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے تو بالکل بھی ظاہر نہیں کیا کہ شہوار اس کے پاس نہیں چھوٹی خالہ کے منہ سے بلا ارادہ نکل گیا۔

”اب ملا تھا احسن تم سے؟ بڑے ماموں نے چونک کر چھوٹی خالہ کو گھورا۔

وہ ایک دم شپا گئیں۔ کیونکہ بڑے ماموں نے سب کو تائید کی ہوئی تھی کہ وہ احسن کے ٹھکانے کی خبر ملتے ہی اطلاع لے لیں۔

”یہی ہی کھڑے آیا تھا۔ زیادہ بات ہی نہیں ہو پائی۔“ وہ جلدی سے بھائی کو مطمئن کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

”مگر صفیہ باجی۔۔۔ بچی کے ساتھ بہت زیادتی ہو گئی ہے۔ حفصہ خالہ کو جیسے شدید دھچکا لگا تھا۔ کمرے میں چند لمحوں لیے خاموشی چھا گئی۔

گلجی جو کمرے کے دروازے میں خاموش سے آکھڑی ہوئی تھی۔ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

”آؤ ٹھیک وہاں کیوں کھڑی ہو گئیں۔“ چھوٹی خالہ نے اسے مخاطب کیا۔

”وہ آہستہ سے چلتی ہوئی ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

”ہاں دکھائی نہیں دے رہی کہاں ہے؟“ بڑی ممانی کو یک دم خیال آیا۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سوری ہے۔“ صفیہ نے آہستگی سے دریافت کیا۔

”تم نے شہوار کے بارے میں کیا سوچا ہے۔۔۔؟“ بڑے ماموں نے صفیہ سے دریافت کیا۔

”شادی سے فارغ ہو کر کراچی جاؤں گی۔ بات کروں گی اس سے۔“ صفیہ نے دکھ سے کہا۔

”آخرب وہ چاہتا کیا ہے۔۔۔؟“ صفیہ خالہ نے پوچھا۔

شہوار ایک دم اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

”یہ تو اس سے مل کر ہی پتا چلے گا۔ بہر حال شہوار کو بسانا ہے۔ ٹھیک کر لوں گی اسے۔“ صفیہ نے قطعی انداز میں کہا۔

”معاملہ بہت اچھا کیا ہے صفیہ!“ بڑے ماموں کے چہرے پر گہری شکلیں ان کی فکر مندی غماز تھیں۔ صفیہ ایک گہری لہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آج شام تو غالباً ماموں ہے۔ ایشن وغیرہ کو نہ دھنیا لیا؟ چنبیلی کا خالص تیل لائی ہوں ایشن میں ڈالنے کے لیے مہندی لائی ممانی سے لی ہے۔ یہ پچھلے دنوں وہ ہندوستان سے لے کر آئی تھی۔ بہت رچتی ہے۔“ حفصہ خالہ نے اپنا ایک ٹکڑا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”مگر آج کل تو ڈیزائن بنانے کا رواج ہے۔ لڑکیاں سادہ مہندی کہاں لگا رہی ہیں باجی۔“ چھوٹی ممانی نے انہیں

”ہائین“ یاد دلایا۔

”مگر ہم بناتی رہیں ڈیزائن۔ مجھے تو دلہن کے ہاتھ میں سادہ مہندی ہی بھلی لگتی ہے۔ اور میں تو نیلہ کے ہاتھ میں خود لگاؤں گی۔“ حفصہ خالہ نے قطعی فیصلہ سن کر نہ جانے کیا کچھ بیک سے نکالنا شروع کیا۔

”آپ تو آئی ہی نہیں تھیں شادی میں، میں نے تو ششو کو بھی سادہ مہندی لگوا ہی تھی۔“ انہوں نے صفیہ کی طرف ہنسنے لگا۔

”نئے ایک دن پہلے پہنچیں گے باجی۔“

”اللہ نے مجھے نیک اور سعادت مند بنایا دی ہیں۔ میرے ہر دکھ کا مداوا کیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو میری بیٹی کا نصیب بہت بلند ہوگا۔“ انہوں نے نیلے کی پیشانی پر بوسہ دیا۔  
 ٹھیکہ ہوتی بنی کبھی ماں کی طرح دیکھ رہی تھی کبھی نیلے کی طرف۔  
 ”امی..... خدا کے لیے مجھے تہہ کچھ بتائیں۔“

جب صفیہ نے سامنے والے پردہ سبوں کی آمد۔ رازی کا رشتہ۔ اور ”نازہ ترین“ ایک ایک بات ٹھیکہ کو بتادی۔ اور ٹھیکہ کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔  
 ایک ایک حس پر جیسے برف سی گر پڑی تھی۔  
 ”امی..... آپ کس کس کو اور کیسے مطمئن کریں گی.....؟“ وہ جیسے کنویں کی گہرائی سے گویا ہوئی تھی۔ اور ایک ٹک نیلے کو دیکھ رہی تھی۔ اب اسے نائلہ کے مستقل ٹینگ پر لینے رہنے کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی۔  
 ”مگر کچھ ہو بھی تو نہیں سکتا۔ تمہارے ابا جی سب کچھ لڑکے والوں سے ملے کر چکے ہیں۔“  
 ”مگر امی! یہ چھوٹی سی بات تو نہیں ہے۔“ ٹھیکہ کو جیسے قرار نہیں آرہا تھا۔  
 ”میری شادی جس طرح ہوئی کسی کو بھی نہیں بلایا گیا۔ وہ بھی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ جتنی یہ ہے۔ یہ نہیں ہوتا پاپے۔ نیلے کے مستقبل کا سوال ہے۔“ ٹھیکہ کسی طرح بھی نئی حقیقت قبول کرنے پر آملاؤ نظر نہیں آ رہی تھی۔  
 ”شاید میں بھی کبھی اس پر تیار نہ ہوتی۔ بات یہ ہے کہ لڑکے والوں سے ہر بات ملے ہو چکی ہے۔ نئی بات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم انہیں جواب دے دیں کہ ہم اپنی کوئی سی بھی بیٹی نہیں دے رہے۔ چار دن پہلے آتی بارات کو منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نیلے، نائلہ، اور انیلا کے لئے ہر دروازہ بند کر دیا جائے۔  
 تم اپنے ابا جی کی عادت جانتی ہو اب وہ نائلہ کے حق میں کوئی فیصلہ بھی عقل سے نہیں جذبات سے کریں گے۔ یہ گمراہ نہ ہوا اچھا ہے۔ نیلے کا نہ ہی نائلہ ہی کا کسی ایک کا تو بھلا ہو جائے۔  
 بیٹے..... مجھے ابھی چار بنیاں اور بیٹیاں ہیں..... تمہارے ابا جی نے کوئی راستہ ہی نہیں چھوڑا۔ کہ میں کچھ اور ہوتی..... بچہ میرا..... مجھ سے دور ہے..... کوئی ایک پریشانی.....؟“  
 ”ابا جی! آپ امی کو پریشان نہ کریں..... جو ہو رہا ہے ہونے دیں..... پلیز..... نیلے یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔  
 ”امی..... لوگ کیا کیا باتیں بتائیں گے۔“ ٹھیکہ بے حد پریشان تھی۔  
 اب جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ تم نائلہ کو سنبھالو۔ ناس نے ناشتا کیا ہے نہ دو پھر کا کھانا کھایا ہے۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے امی۔ اب آپ خالہ وغیرہ کو کیا بتائیں گی۔ کیا رازی والی بات بتا دیں گی.....؟“  
 ”خدا نخواستہ۔“ صفیہ نے فوراً ٹھیکہ کی بات کاٹ دی۔  
 ”کوئی نہ کوئی بات بنانا ہوگی۔ تمہارے ابا جی سے ”ملے“ کر کے ہی بتاؤں گی۔ ایسا نہ ہو میں کچھ کہوں اور وہ کچھ لڑے۔“

”امی! کیا یہ ہو رہا ہے..... میں کس قدر خوش خوش آئی تھی۔ ٹھیکہ کی آنکھیں بھر آئیں۔  
 صفیہ نے اس کا شانہ چھپھا کر گویا اسے پرسکون رہنے کی ہدایت کی اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ابھی انہوں نے لہلوں کے بہت سے کام پھینا تھے۔

”اچھی بات۔“ صفیہ غائب و مافی کی کیفیت میں مبتلا تھیں اور اسی طرح ہی باہر نکل گئیں۔  
 ”چلو میٹھ! اٹھن گوندھو..... ایک تو نگر رہا ہے۔ شام بھی سر پر کھڑی ہے۔“  
 شام کے تصور نے جیسے ہر شخص میں نئی روح پھونک دی تھی۔ ہر ایک متحرک نظر آیا۔

صفیہ بمشکل موقع نکال کر ٹھیکہ اور نیلے کو لے کر اپنے کمرے میں آئی تھیں۔  
 ٹھیکہ ان کے پراسرار انداز پر پریشان نظر آئی مگر نیلے کے چہرے پر گہرا سکوت تھا۔ وہ بہت پرسکون نظر آ رہی تھی اسے اچھی طرح پتا تھا کہ صفیہ کی بات کرنے والی ہیں۔  
 وہ کافی دیر تو سر جھکا کر مناسب الفاظ سوچتی رہیں۔ ان کے دل کی عجیب حالت تھی۔ بات شروع کرنا چاہتیں مگر نزل کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے قوت گویائی کھو بیٹھتیں۔  
 ”کیا بات ہے امی.....؟ آپ پریشان ہیں۔ کیا پیسے وغیرہ کا مسئلہ ہے.....؟“ ٹھیکہ سے آخر نہ ہا گیا۔  
 ”نن..... نہیں نہیں..... پیسے دیسے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے ابا جی نے انتظام کر لیا ہے جھیر وغیرہ کا۔ پھر اس نے بھی سمجھائے ہیں۔ وہ تو بھیجتا رہتا ہے..... اللہ کا احسان ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں۔“  
 پھر کیا بات ہے؟“ وہ ابھی..... وہ جب سے آئی تھی ان میں کچھ عجیب سی بات محسوس کر رہی تھی۔  
 ”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیسے بات شروع کروں۔“ صفیہ نے جیسے بے بس محسوس ہو کر رہا تھا۔  
 ”بابی..... امی شاید بات شروع ہی نہ کر سکیں۔“ نیلے نے آہستگی سے کہا۔  
 صفیہ اس کے انداز پر چونک پڑیں۔  
 ”امی..... آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں..... مجھے علم ہے..... نیلی نے رات ہی مجھے اٹھا کر بتا دیا تھا۔“  
 صفیہ کا ایک لمحے کو نہ کھلا کھلا رہ گیا تھا۔  
 ”کیا بتا دیا تھا.....؟“ وہ سر جھکا کر پوچھنے لگیں۔ جیسے ان میں ہمت نہیں تھی کہ نیلے کا چہرہ دیکھتیں۔  
 ”وہی جو آپ کے منہ سے نہیں نکل رہا۔“  
 ”بیٹی..... تمہارے ابا جی نے مجھے بتائے بغیر سب کچھ بالائی بالا کر لیا۔ جیسے کہ وہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔“  
 امی..... اجتنے امتحان آپ کی زندگی میں آئے اور آ رہے ہیں۔ میں نے تو امتحان کا ایک حصہ بھی نہیں گزارا۔ ہم دیکھ بیچتے ہیں تو آپ بادل کی طرح ہم پر سایہ کرتی ہیں۔ ہمارا دل بھلاتی ہیں ہمارے لال ملاتی ہیں۔  
 مگر آپ خود کتنی تنہا ہیں..... کوئی دکھ میں آپ کا سایہ نہیں بنتا۔ چاروں طرف کی جنگ آپ تنہا لڑتی ہیں۔  
 میرا کوئی دکھ بھی آپ کے دکھ سے بڑا نہیں..... میں آپ کو کسی الجھن میں نہیں ڈالوں گی۔ میں آپ کی مشکل بڑا اضافہ نہیں کروں گی..... جو آپ یا ابا جان کہیں گے وہی ہوگا۔“  
 صفیہ نے اس کا سر سینے سے لگا لیا اور بے اختیار ہو کر رو دیں۔  
 ”بلو..... میری پیاری بیٹی..... میرا بس ملے تو اپنی جان وادار کبھی تجھے خوش رکھوں..... مگر اس وقت میری مشکل ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔  
 ”امی! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ جو ابا جی کر رہے ہیں کرتے دیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو خدا معلوم وہ نیلی۔ ساتھ کیا کر بیٹھیں۔ امی..... وہ بالکل بے تصور ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔“



اپ بھوچھو کو چائے پلا دیں بس باقی کام میں خود کر لوں گی۔" نائلہ نے پھر تلخ لہجے میں کہا۔ ٹھیکہ اٹھ کر چلی گئی۔  
 پادھی اُم تم بھی پیچ کر لو۔ تھوڑا سا ناشتا ضرور کرنا، تم نے بلیں میں بھی کچھ نہیں لیا تھا۔"

بننے لگا یا اسے ٹالا تھا۔  
 فی خوشی اور جاؤ سے وہ آئی تھیں مگر یہاں کی تبدیل شدہ صورت حال نے گویا انہیں سب کچھ بھلا دیا تھا۔ نائلہ نے  
 وہی انہی بتایا جو درحقیقت پیش آیا تھا اور جو ہر ایک کو بتایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔  
 بھوچھو انہیں غرض محال میں مجرم تھی تو میرے لئے ہی سزا مقرر ہونا چاہئے تھی۔ بلو آپا کا اس میں کیا قصور نکلتا ہے؟" وہ  
 اُٹھی۔

غش شک کی بنیاد پر انہوں نے یہ سب کیا ہے پھر شک بھی بے حد مضبوط ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھی جانے  
 لگ چھٹا نہیں سکتے۔ وہ تو اپنے وہم اور گمان تک کو حقیقت کہتے ہیں۔ پھر یہ واقعہ تو چشم دید ہے وہ تو فیصلے سنانے  
 لگے ہیں۔ چھان چھک تو ان کا شعبہ ہے ہی نہیں۔ درحقیقت وہ تم سے بہت بدگمان ہو چکے ہیں۔ رازی کے ساتھ  
 بچہ کر وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تم ان کے اختیار اور حد سے باہر ہو گئی ہو۔ اسی لئے انہوں نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے۔"  
 بننے نہایت ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کیا تھا۔

لیہا مذاق ہے یہ زندہ انسانوں کے ساتھ؟" نائلہ کی آواز پر آنسو غالب آ گئے تھے۔  
 مجھے تو ان لوگوں پر خیرت ہو رہی ہے۔" ثمنینہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

لیا نام ہے لڑکے کا۔ ہاں باہر مرتضیٰ۔ لڑکا ہے یہ ڈی ہے۔ اس دور میں تو عجوبہ ہی ہیں اس قسم کے لڑکے۔ گھر  
 لائی زندگی کے فیصلے کر رہے ہیں اور بدل بھی رہے ہیں۔ اور اس کا کوئی رد عمل ہی نہیں ہے۔ تعجب ہے۔ سنا ہے  
 مے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اس قسم کے گھرانوں کے لڑکے تو خاصے آزاد واقع ہوتے ہیں۔ میں تو سخت حیران  
 ہاں کیا تم نے تصویر وغیرہ تو دیکھی ہوگی۔" انہیں یکدم جیسے کوئی نیا خیال آیا۔  
 لہے نظریں جھکا لیں۔ "پتا نہیں۔"

بننے نے گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور خاموش ہو گئیں۔  
 نام اٹھا کر مے میں داخل ہوئی۔

اٹلا۔ باہر کی تصویر ہے تمہارے پاس۔ میرا مطلب ہے گھر میں؟

مے جیسے کوئی شک ستانے لگا تھا۔ اوہ وہ لڑکا دیکھنے کیلئے خاصی بے چین نظر آ رہی تھیں۔

مے بھوچھو! ایک منٹ ٹھہریں ابھی لائی۔" وہ واپس پلٹ گئی۔

بھئی وہ جس لڑکی پر بخوشی رضامند ہو گئے تھے پھر اس کی بہن پر آدمی۔ پتا نہیں کیا کہا ہے بھائی جان نے۔ اور خدا  
 یہ لوگ ہیں؟" وہ سخت فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

لہے ہی گزرے تھے اٹلا ایک لفافا چھپانے کے انداز میں لے کر چلی آئی۔

بھئی! بد رکھو کے کی تصویر بھیجی تھی یا آرتی اتارنے کو۔" وہ بڑے سائز کی تصویر پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ لفافے ہی سے  
 نے تصویر کے سائز کا اندازہ لگا لیا تھا۔

لہے بے مبری کے انداز میں تصویر نکال کر دیکھنے لگی۔

نائلہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ بلکہ اچھا خاصا ٹھیک ٹھاک ہے۔" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

ہو گئیں۔ مگر فحش پر احسن کا جو انداز تھا اس کی روشنی میں شہوار کی موجودگی، ذہن میں بہت سے سوال پیدا کر رہی تھی۔  
 نے صفیہ کی سمت سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ان کا سوال سمجھ گئیں۔

"دم لوشینہ! بہت کی خبریں تمہاری ہنڈی میں ہیں۔" وہ نگاہ پڑا کر کہتی ہوئی انہیں لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔  
 ثمنینہ حیران پریشان ان کے پیچھے چل پڑی تھیں۔

صفیہ نے مختصر آساری روئیداد انہیں بتادی۔ ثمنینہ تو جیسے سنانے میں آگئی تھیں۔  
 "یہ تو شہوار کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ اس کا کیا قصور ہے۔ احسن اتنا نادان تو نہیں تھا۔" انہیں سخت مدد

اب کیا ہوگا؟

"شادی کے بعد جاؤں گی میں۔ لگاؤں گی اس کے دماغ ٹھکانے۔ شیخ صاحب تو کبھی اس بات کی اجازت  
 دے گے۔ مگر ٹھیکہ کے ہاں خوشی ہونے والی ہے۔ اسی بہانے چلی جاؤں گی۔ خیر تم فکر نہ کرو ٹھیک ہو جائے گا۔ تم  
 ٹھکان اتار دو نہادھو لو۔ ابھی اور بھی باتیں باقی ہیں۔"

وہ کمرے سے باہر چلی گئیں اور، ویلا سے کہا کہ وہ اپنی بھوچھو کو نائلہ کے پاس لے جائے۔ میں ٹھیکہ کو بھیج رہی  
 شاید ان میں ہمت نہیں رہی تھی شاید ٹھک گئی تھیں، وضاحت کر کر کے۔

نائلہ بھوچھو کی کوساٹے دیکھ کر دیوانہ وار اٹھی ثمنینہ نے بھی بازو داکر دیئے تھے۔ نائلہ ان کے سینے سے لگی  
 رو رہی تھی۔ ثمنینہ اسے دلا سے اور تسلیاں ضرور دے رہی تھیں مگر ان کی سوالیہ نظریں بیلا کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"ای! آپ تو کہہ رہی تھیں بلو آپا کی شادی ہو رہی ہے؟" نائلہ جوان کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ حیران ہوا  
 رہی تھی۔ نائلہ نے یہی طرح رو رہی تھی۔ ثمنینہ کو اس پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔

"نبلی چندا..... ایسے نہیں روتے، بڑی بات بیٹا۔"

"دیکھ لیجئے گا بھوچھو۔" میں مر جاؤں گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ثمنینہ نے چونک کر اس کا ہوا  
 اسی دم ٹھیکہ اندر چلی آئی تھی۔ ٹھکانی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں نئی تبدیلیوں کے سبب خاصی بدلی ہوئی تھی۔

"انعام علی نہیں آئے۔" ثمنینہ نے اصل سوال کرنے سے پہلے یونہی عام سے انداز میں پوچھا۔  
 "آج دوپہر کو پہنچ رہے ہیں۔ بارات اٹینڈ کر کے رات کو واپس چلے جائیں گے۔ مصروف بہت ہیں آج کل۔"

"اچھا۔" ثمنینہ "اچھا۔" کہہ کر یکدم ہپ ہو گئیں۔  
 "ٹھیکہ! باجی! شادی تو بلو آپا کی۔"

"اچھا تم ہپ ہو جاؤ گی۔" ثمنینہ نے ٹھیکہ کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے نائلہ کو درمیان میں ٹوک دیا۔ حالانکہ  
 "بہ" کو جاننے کے لیے سخت مضطرب تھیں۔

"باجی! آپ لوگ تو بھوچھو کو نہ جانے کیا باتیں اور چھپائیں۔ میں خود بتا دوں گی۔" نائلہ کے لہجے میں  
 سرد مہری اور ترشی تھی۔

"اور پھر آپ کو پتا ہے۔ ہم لوگ بھوچھو سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتے۔ بات اس سے چھپائی جاتی ہے  
 کوئی خطرہ ہوتا ہے۔"

ثمنینہ نے قدرے پریشانی اور خاصی حیرانی سے نائلہ کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے کا  
 جانے کیا بات ہے۔ نبیلہ کی جگہ نائلہ کو دیکھ کر وہ پہلے ہی دہل گئی تھیں۔

ایک تو انعام علی اس کے سر پر سوار تھے۔ دوسرے مہمانوں کی سوالیہ نظریں۔ وہ خاصی الجھی ہوئی اور پریشان تھی۔ یہی اس سے نائلہ کے پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

اور نائلہ پر ایک نہ ٹوٹے والا سکوت طاری تھا۔ چھوٹی خالہ کے ہنسی مذاق چھوٹی ممانی کی شوخیاں، شوہار کی بدحواسیاں ہنسی بات کا کوئی اثر نہیں تھا۔

پھر حصہ خالہ نے آکر اطلاع دی کہ نکاح کیلئے مرد آرہے ہیں۔ کمرہ خالی کر دو۔ نائلہ نے متوحش نظروں سے پھو پھو لڑکھایا جیسے کوئی جانور رنج ہونے جا رہا ہو۔

ثمینہ نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”گھبرائے نہیں بیٹا، ہمت سے۔“

مغنیہ نکاح خواہن دیکھ کر اور گواہوں کے اندر جانے کے بعد دروازے پر کھڑی کانپ رہی تھیں ہر آواز پر بری طرح ہلکتی تھیں۔ یوں جیسے کسی بری خبر کا احتمال ہو۔

گواہوں میں چھوٹے ماموں اور انعام علی شامل تھے اور دیکھ بڑے ماموں بنے تھے۔

”ہائلہ! دلکش رحیم الدین آپ کو پچاس ہزار ہر مقل کے عوض باہر مرتضیٰ ولد مرتضیٰ حسن کے نکاح میں دیا جاتا ہے آپ کو قبول ہے؟“

نکاح خواہ کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔

”ہاں کہو نائلہ۔“ ثمینہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی مگر وہ تو پتھر کا بت بنی ہوئی تھی یا پھر جیسے بہری ہو گئی تھی۔

”بیٹے! زور سے بولنے تاکہ یہاں موجود گواہ بھی سن لیں۔“ نکاح خواہ نے تاکید کی۔

مگر نائلہ کے بستہ لبوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔

رحیم الدین جو پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔ مارے پریشانی کے یہاں سے وہاں تک ایک ٹہل لگائی پھر مغنیہ کے گرد بی زبان میں گویا ہوئے۔

”تم جاؤ اس کے پاس۔“

مغنیہ وحشت زدہ سی خورانی اس کے پاس آگئیں۔ ثمینہ نے کھک کر ان کیلئے جگہ بنائی۔ اس کی طبیعت دراصل بہت اچھی ہے۔“ ثمینہ نے جیسے کھسکا کر انعام علی کی طرف دیکھا تھا۔

”نائلہ!“ مغنیہ نے آواز دی۔

”بیٹہ! ہاں کہو۔“ وہ اس کے کان میں کہہ رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ دیا۔

انکھ میں مائی کی آوازیں گزندگی بیدار ہوئی اور وہ جیسے کسی خواب سے جھکی۔

”جی! اس کی آواز ابھری۔

لہجہ باریک باریک کے بعد ایک ”جی“ بہت واضح تھا۔ سن نے سب لیا۔

نکاح خواہ نے فارم دستخط کیلئے اس کے سامنے کر دیا۔ اور نشان دہی کی۔

بالک سلامت کا شور بلند ہوا۔

”ہمارے شوخ صاحب!“ نہ جانے کس کی آواز تھی۔

نائلہ بے ہوش ہو کر مغنیہ کی ہانپوں میں آ رہی تھی۔

نائلہ نے ایک لمحے کو بھی نظر نہیں اٹھائی۔ بہنوئی کے روپ میں اس تصویر کو اس نے نہ جانے کتنی بار غور اور دلچسپی دیکھا تھا۔ حفظ تھی یہ تصویر اسے آنکھوں کے اثرات سے لے کر خوبصورت مائی پن تک اسے ازبر تھی۔

وہ کیونکہ ہر جذبے سے عاری دل لئے بیٹھی تھی۔ اس وقت بھی کوئی دھڑکن کی دھمن اس کے نام کی۔ نہیں جس کی انہوں نے نائلہ پر ایک نظر ڈال کر تصویر دوبارہ لٹھانے میں ڈال دی۔

”بظاہر تو ڈی بھی نہیں لگ رہا۔ تم ہی کہو ایٹھا۔ اتنے آرام سے ان لوگوں نے بھائی جان کی بات مان لی۔ مجھے؟“

براؤن بالوں والی بیوہ سی ایٹھا کو انہوں نے غور سے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا۔

”شاید وجہ یہ ہو کہ ان کی گھر کی خواتین نے نیلی آپ کی پسند کیا تھا مگر اباجی ان کے مردوں سے کہہ چکے تھے کہ سے کریں گے۔“

”اوہ!“ ثمینہ نے ایک گہرا سانس لیا۔

”ان کے ہاں کی خواتین تو بہت خوش ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یا پھر غلط فہمی کر رہیں۔ کل ہی تو آپ کی منداؤں پر پتا نہیں کس کام سے۔ امی کو پتا ہو گا۔ تھوڑی دیر ہی بیٹھی تھیں۔ بڑی خوش باش دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے کچھ نہیں۔“

”اس تبدیلی کے بارے میں بھائی جان لوگوں کو کیا دلیل دیں گے؟ خاص طور پر قریبی رشتے داروں کو؟“

”پتا نہیں۔ امی کو ہی پتا ہو گا۔“ ایٹھا نے سادگی سے کہا۔ ”اور پھر اباجی لوگوں کی پرواہ ہی کب کرتے ہیں۔“

”نیلی بیٹا! تم ذہن پر بوجھ نہیں ڈالو۔ یوں سوچو اللہ کو یہی منظور تھا۔ میں دیکھتی ہوں بھابھی جان کیا کر رہی؟ انہوں نے نائلہ کے سر پر تسلی دینے کے انداز میں ہاتھ رکھا تھا۔

نائلہ نے بے تاثر نگاہیں سامنے دوپار پر مرکوز کر دیں۔

شام بھی جیسے آفت کی طرح اچانک نازل ہو گئی تھی۔ پتا بھی نہیں چلا تھا وقت گزرنے کا۔

دیکھ کر مہمان بھی آچکے تھے جن میں حصہ خالہ کے بچے اور انعام علی بھی شامل تھے۔

ثمینہ نے زبردستی ایٹھن کا ایک ”دور“ اور چلا کر نائلہ کو نہانے کیلئے بھیج دیا تھا۔

مغنیہ نے انہیں خاص تاکید کی تھی کہ وہ نائلہ کے ساتھ ساتھ ہی رہیں۔

نبیلہ نے جس صبر برداشت اور حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا اسے دیکھ کر ان کا دل جیسے پھٹ رہا تھا۔ وہ ہر کام میں آگے تھی اور یہ بات کہ اس کا چہرہ بھی کسی قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔

مغنیہ نے اسے ہدایت کی تھی کہ جب تک نکاح نہ ہو جائے وہ نائلہ کے سامنے نہ جائے۔ مبادا اس کی ذہنی جائے اور کوئی نئی مشکل آکھڑی ہو۔

نائلہ انعام علی آمد کے بعد اپنی افتاد میں گھر گئی تھی۔ اور انعام علی کے ”ترے پانے“ میں مصروف ہو گئی تھی۔ تیاری بھی کسی مرحلے سے کم نہیں تھی۔

جس وقت بارات کی آمد کا غلغلہ ہوا۔

ثمینہ نائلہ کے بال بلبھا رہیں تھیں چھوٹی خانہ اس کے ہاتھ پاؤں میں ٹہل پاش لگانے میں مصروف تھیں۔ انعام علی سے ”فارغ“ ہو کر اپنی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔



میک اپ یوں بھی اس کا ہلکا تھا۔ اس لئے بری طرح رونے سے سب ڈھل گیا تھا۔ اس کی نند نے سب سے ایک ایک طرف توجہ دی۔  
وہ بہت پیار سے اس کو سنوار رہی تھی۔

بچے، بچیاں اس کے بیڈ پر لے ہوئے تھے۔ اور کسی دلچسپ تماشے کی طرح اس کا دیدار کر رہے تھے۔  
وہ ایک دم خالی الذہن تھی۔ اسے قطعی ہوش نہیں تھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ آنسوؤں کی ایک لہر تھی جو پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

گاڑی میں اس کی ساس' نند اور دو خاتون تھیں۔ باہر مرتضیٰ گاڑی خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ وہ لوگ بے تحاشہ بھی کر رہے تھے، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔  
نندہ باہر مرتضیٰ کی آواز سن کر متوجہ ہوئی تھی۔

اس کے ذہن کی سرکین پر صرف ایک چہرہ چکا ہوا تھا اور وہ تھا "نبیلہ" کا چہرہ۔  
اس کے کان میں صرف اس کی آواز سن رہے تھے۔  
"نبیلی، نبیلی، چندا، نبیلی گڑیا۔ نائلہ۔"

اس کا سوا گت کیسے ہوا؟ کس نے اس سے بات کی۔ کس نے اسے پیار کیا۔ کس نے اس کا شرارہ سنبھالا۔  
یہ کھٹک کیا۔ اسے کسی چیز کا احساس نہیں تھا۔  
وہ تو جیسے کل کی گڑیا تھی۔

اس میں بیٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ گاڑی کے سے ٹیک لگا کر لپٹی تو تھکے ہوئے اعصاب فوراً ہی نیند کی آغوش میں گئے۔

نجانے کیا دقت ہوا ہوگا۔ جب کسی نے اس کا رخسار جھپٹایا۔

اس پر ایک بے خبری کی کیفیت طاری تھی۔ بڑے آرام سے کروٹ بدل کر چہرہ سوجھی مگر اپنے بازو پر گرز کرتے ہی جیسے حواس ایک دم جاگ گئے۔

اس کی نند کی لطیف سی سرگوشیاں گویا تعاقب میں چلی آئیں۔

وہ ایک دم بڑا کر اٹھ بیٹھی اور کانپتے ہاتھوں سے دوپٹہ درست کیا۔  
بے ساختہ نظریں اٹھ گئی تھیں۔

سیاہ کوٹ بیڈ پر پڑا ہوا تھا سرخ نائی اور سفید شرٹ سے اوپر ایک چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھپٹا دیں۔  
"بھئی، مجھے اپنی بہن کی پسند پر بہت اعتماد ہے۔ بہت انڈر سٹینڈنگ ہے ہم دونوں میں۔ میں صبح کو اس کا شکریہ ادا کروں گا۔"

نائلہ کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔

"میں بڑا قطعی قسم کا انسان ہوں۔ بے کار تکلفات میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ آپ کے حسن بے بہا کی قدر افزائی ہے۔ قبول کیجئے۔"

اس کا ہاتھ تمام کر خوبصورت سی آنکھی پہنا دی گئی۔

نائلہ ساکت و صامت بیٹھی رہی وہ نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔

یہاں تک کہ لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔

ہاتھ نے فوراً اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جو چند لمحات قبل باہر مرتضیٰ کے ہاتھ میں تھا۔  
آنکھی بہت خوبصورت اور جیتی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ آف وہاٹ دیواروں کے ساتھ سرخ دیز کار پٹ کرے اہل میں عجیب شانہ پیدا ہو کر رہا تھا۔ کمرے میں سامان کا جھوم نہیں تھا۔ جوتے بھی تھے وہ ضروری اور معقول تھے۔  
ابھی وہ جائزہ بھی نہ لے پائی تھی کہ وہ شب خوانی کے لباس میں لمبوس اس کے نزدیک چلے آئے اور نیم دراز ہو کر اپنی گاڑی پر نکادی۔

"آپ بھی پہنچ کر لیں،" ایزی ہو جائیں، میں ذرا آج کی "ڈوز" لے لوں، "وہ ایک پٹیا کھول رہے تھے، لہجہ غیر معمولی اس لئے نائلہ نے چونک کر ان کے ہاتھوں کی سمت دیکھا۔ پٹیا میں سے مہکتا ہوا پان بڑا ہوا تھا۔

"یہ عام پان نہیں ہے۔ اس میں "جادو کی پری" بند ہوتی ہے۔ اسے کھانے کے بعد ہم دو آؤٹ فلائی نئی دنیا میں سفر لے ہیں۔ یہ میں اس لئے تیار ہا ہوں کہ میری کسی تبدیلی پر آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ میری پرائیویسی کی بات ہے اور اب میری پرائیویسی کا حصہ ہیں۔"

دو ٹیبلٹیں سے زیادہ اس وقت اپنے پان کی سمت متوجہ تھے۔

صبح کو جب لڑکیاں نائلہ کو لینے گئیں تو شیخ صاحب نے حکم صادر کر دیا کہ صرف ٹیمپ اور چھوٹی خالہ ناشتالے کر جائیں اور صرف ٹیکسی ہی ان کے ساتھ جاسکتی ہے۔

لڑکیاں جھگ کی طرح بیٹھ گئیں کہ کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔

ٹیمپ نے ایٹلا کی سفارش بھی کی مگر شیخ صاحب نے قطعی انداز میں انکار کر دیا۔

لو تو جیکے تھے تینوں پہرہ دھرتیا رہیں اور احمر کے ساتھ نائلہ کے سرال پہنچیں۔

تینوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ ٹیمپ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ایسا لہا ہوا تھا جیسے نائلہ کے سرال والے بھول گئے ہوں کہ وہ لوگ کس مقصد کے تحت آئی ہیں۔

"ہم ساری تھیں، ابھی ابھی جگا کر آئی ہوں غسل سے فارغ ہو جائیں تو آپ لوگوں کو ان کے پاس لے چلیں۔ جب تک آپ چائے پیجئے۔ بالآخر نائلہ کی نند نے ان کی الجھن رفع کی۔

"اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" ٹیکسی کے اعصاب پر نامعلوم سا خوف سوار تھا۔

"بالکل فکر نہ کریں، بہت اچھی طبیعت ہے، بہت ٹاکس ہیں ہمارے بھائی جان۔" نائلہ کی نند شرارت سے ہنسی۔  
"وہ تھیں بھی مسکرا دیں۔"

آدھا گھنٹہ مزید گزارا جب جا کر کہیں وہ نائلہ کے کمرے میں پہنچ پائیں۔ ٹیمپ کو بہت جلد تھی غالباً وہ سب سے آگے چلی۔

وہ کمرے میں داخل ہونے لگیں تو باہر مرتضیٰ بڑے دھڑ دھلائے سے باہر نکل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر رز کے۔ بہت ٹی سے سلام کیا، ٹھیک طرف ہٹ کر انہیں راہ چھوڑ دیا۔

ٹیمپ نے تیزی سے اندر داخل ہو گئیں۔

بات ہیں۔" وہ آنسو روک کر بولی۔

اچانک جواز تھا کہ تینوں ایک دم چپ سی ہو کر رہ گئیں۔

"پھر تم روئیں کیوں.....؟" چھوٹی خالہ زیادہ دیر خود پر مضبوط کر گئیں۔

"مجھے آپ کا خیال آ گیا تھا۔ یہ ٹیکس انجی کیلئے بنوایا گیا تھا۔"

لینہ نے اپنی نگاہ اس پر ڈالی..... اور جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر اس کرگردن پر موجود نشانات پر ٹانگہ پاؤں چمڑے کے

آپس تو رات کو تقریب سے واپس آ کر جھٹ کپڑے تبدیل کر کے منہ دھوئے ہوئے آنکس نہیں آتا۔ زیور پہنے

ہو گئیں.....؟

لینہ نے واضح کر دیا کہ وہ نائلہ کے جواب سے مطمئن نہیں ہے۔

یاد مابہر تفتی اندر چلے آئے۔

"کیا ناشتا کچ کی صورت میں کرنے کا پروگرام ہے.....؟" وہ سامنے صوفے پر مسکراتے ہوئے بیٹھ رہے تھے۔ غمینہ

بت گہری نظروں سے ان کی سمت دیکھا۔ سفید پیش شلوار اور سیاہ لیدر کے سپر پہنے ہوئے وہ نہایت باوقار دکھائی

دے تھے تازہ شیو کی تیلاہٹ اور بالائی لب پر چھائی ہوئی مونچھوں سمیت چہرے میں ہلاکی جاوید تھی۔

پراسٹائل میں بھی اہتمام واضح تھا۔

ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی کھاری ہوں۔ ان پر کوئی کہانی "دار" ہو رہی ہو اور اس کہانی کا عنوان ہو "مہذب

ہیں آپ جیسی اساتذہ آئینوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔" مابہر تفتی غمینہ کو اپنی جانب غور سے دیکھتا پا کر مسکرائے۔

ایٹکس ہلے لوٹ "غمینہ سنبھل کر مسکرائیں۔

کچھ بھی تھے۔ بلا کے پراعتماد دکھائی دیتے تھے۔

یاد ناشتے کی ٹرائی دھکیلتی ہوئی نائلہ کی نندا اندر آ گئی۔

بھائی.....! بھائی جان کا تو آدھ دن کا روزہ کرادیا آپ نے۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

اگر ہمارے ہاں کے سہمان یں کر بہت بے تاب سے ہیں کہ آپ کے میکے والے آپ کو لینے آئے ہیں۔ وہ کہہ

لا ابھی تو ہم نے ٹھیک سے دہن کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ خاص طور پر ہمارے اسد بھائی تو ہم سے سخت ناراض ہیں کہ

بھائی سے تعارف کیوں نہیں کرایا گیا۔"

ابھی تم بیچ دو اسد کو یہیں۔" مابہر تفتی نے بہن سے کہا۔

پچھلے آپ ناشتہ تو کر لیں.....

"تم بلا اسد کو۔ ان کی آمد سے ناشتہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

نائلہ نے ٹرائی بیڈ کے ساتھ لگا دی اور ایک کرسی کھینچ کر مقابل رکھ دی۔

"آجائیں بھائی جان..... میں بھیجتی ہوں اسد بھائی کو۔"

ابھی ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ آپ لوگ ناشتہ کریں۔" وہ تینوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

دکڑے سے باہر آنے لگیں تو نائلہ کی نندا ایک اساتذہ سے مراد کو ساتھ لے کر آتی دکھائی دی۔

نائلہ ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے چم کر تانہ روزی سوٹ پہنے بیٹھی تھی اور انگلیوں سے کیلے بال سلجھارہی تھی۔ آج میں ان تینوں کو اندر آتے دیکھا تو سر پر دوپٹہ بجا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بے ساختہ سے انداز میں غمینہ کے بازوؤں پر

گئی اور زار و قطار رو پڑی۔

"ارے بھئی رات کو رو تا تو با معنی تھا۔ اب کس سلسلے میں..... بہت بُری بات نکلی.....!"

غمینہ اسے چپ کر رہی تھیں مگر اس کے اشک رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ اسے تھامے ہوئے بیڈنگ لا

اور آہستگی سے بٹھا دیا۔

تینوں اس کے سامنے ہی بک گئیں۔

ٹھیکہ بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"بری بات اس طرح نہیں روتے۔ کیا سوچیں گے تمہارے سرال والے۔ چپ ہو جاؤ اب۔"

چھوٹی خالہ نے بھی ٹوکا۔

"ٹھیکہ! تم اس کے بال بناؤ ناشتا بھی کرنا ہے ابھی اس نے دس بج رہے ہیں۔"

ٹھیکہ فوراً اس کے بال سلجھانے میں مصروف ہو گئی اور آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیا ملا.....؟"

نائلہ نے سیدھا ہاتھ سامنے کر دیا جس میں کئی انگلیاں بھی ہوئی تھیں۔ ٹھیکہ نے نئی انگلی پہچان لی۔

"مبارک ہو....." وہ اسی طرح آہستگی سے بولی تھی۔ نائلہ نے اپنا ہاتھ پھر گود میں رکھ لیا تھا۔

"لاؤ تمہارا ہلکا سا میک اپ کر دوں ویسے تم اس سادہ چہرے کے ساتھ ہی غضب ڈھارہی ہو۔ ماشاء اللہ دلہنا۔

روپ آیا ہے اللہ نظر بد سے بچائے۔"

وہ اس کا میٹھی بیک آگے رکھ کر مطلوبہ اشیاء تلاش کرنے لگی۔

ہلکی سی کلینجنگ کریم لگا کر جب وہ میک اپ اس کے چہرے اور گردن پر استعمال کرنے لگیں تو ایک دم چونک پڑیں۔

"یہ تمہاری گردن پر نشان کیسے ہیں؟" وہ گردن سے کچھ نیچے نظر آنے والے نشان کو بغور دیکھنے لگیں اور ہلکا ارادہ

سے چھو لیا۔

نائلہ کے منہ سے بے ساختہ "سی" کی آواز نکلی..... چھوٹی خالہ بھی چونک گئی تھیں۔

"گلتا ہے تم نے بہت تنگ....." وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئیں۔ وہ اگرچہ اس کے ساتھ شرارت کر رہی تھیں مگر انداز

اندروہ نہایت تشویش میں مبتلا ہو رہی تھیں۔

"یہ کیا ہے نکلی.....؟" ٹھیکہ کے ہاتھوں کی گردش رُک گئی تھی۔

نائلہ نے ایک دم دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا اور مٹھ مٹھ کر رو دی۔

تینوں دم بخود سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

"نکلی..... ہم تمہارے اپنے ہیں۔ کوئی بات ہے تو ہمیں بتاؤ۔" غمینہ کا دل تڑپ سا گیا۔

"کچھ نہیں چھو پھو....."

"کیسے کچھ نہیں..... ٹھیکہ! ایک دم اس کے سامنے آ گئی۔" کیا ہے یہ.....! "وہ جیسے سخت الجھن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

"وہ رات کو میں زیور پہنے پہنے سوئی تھی۔ وہ جو اب کی طرف کا ٹیکسلس ہے اس کا ڈیزائن بہت ابھرا ہوا ہے۔"

دہریہ کی سادہ سی شرارت نے بھی نائلہ پر کوئی اثر نہ کیا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔  
نائلہ کی بڑی سی چادر نیچے لٹک رہی تھی۔ باہر نے آگے بڑھ کر اندر کی۔ اسد کا جائدار قبضہ اتار بے ساختہ تھا کہ باہر  
نائلہ کی جانب کراہ کر ایک دم پیچھے ہو گئے۔

پھر اسد کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔  
”ہیچس کے تمہیں بھی کبھی..... ادھار رہا۔“  
”تو پھر میں احتیاطاً ان سے کہہ دوں گا کہ..... چادر نہ بہنیں۔ اسد نے برجستہ کہا۔  
”اوسب کی سب دونوں کی جیل بازی سے محفوظ ہو کر مسکرا پڑی تھیں۔ سوائے نائلہ کے۔

منیہ نے شہوار کیلئے بطور خاص ویسے کے دن کیلئے خوبصورت ساسوٹ تیار کر لیا تھا۔ احسن ہی کے بھیجے ہوئے پیسوں  
انہوں نے شہوار کیلئے کئی سوٹ سینڈلیں اور ایک نازک ساسوٹے کا سیٹ خریدا تھا۔  
اس کے لئے گجرے منگا کر فرنیچ میں رکھ چھوڑے تھے۔ اپنی چاندی کی پازیب پالش کرائی تھی اور شہوار کو پہننے کی  
پکی تھی۔  
”کھو.....“

”وہ تو خود مختار ہیں۔ سب سے زیادہ انہیں شہوار کو ڈرتے رہی تھیں۔ اس کی موجودگی سے جیسے وہ خود کو احسن کے قریب  
سوس کر رہی تھی۔

جس سہاگن کا مرد اس کی زندگی میں رنگ نہ بھرے اس کا دل چھالے کی طرح ہوتا ہے۔ عورت کی زندگی کا یہی موڑ  
ہے جب یا تو وہ سیراب ہو جاتی ہے یا ہمیشہ کیلئے بھج جاتی ہے۔“ وہ نہایت ڈکھ سے اپنا ہی کوئی تجربہ بیان کر رہی تھیں۔  
”نیلہ تو حقیقت حال سے الف سے ہی تک واقف تھیں۔ بہادری کی طرف صرف دیکھ کر رہ گئیں۔  
نائلہ کی نند اور اسدا سے لینے آئے تھے۔

منیہ نے دیکھا کہ نیلہ نائلہ کو خود اٹھانے لگی تھی۔  
نائلہ گہری نیند سے جاگی تو نیلہ کو خود پر جھکا پایا۔  
”اٹھو نیلہ.....! وہ لوگ تم کو لینے آ گئے ہیں۔“  
نائلہ سستی سے لیٹی ٹکڑا کر اسے دیکھتی رہی۔

”آپا.....!“  
نیلہ..... جاتے جاتے ڈک گئی۔  
”کوہر آئیں۔“

نیلہ اس کے قریب چلی آئی۔ ”ہوں.....؟“  
نائلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”یہاں انہیں آپا۔“  
نیلہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”آپا اگر آپ کو پتا چلے کہ آپ اپنا ہی درجے کی خوش نصیب ہیں تو.....؟“  
نیلہ کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ایک لمحے کو آئی اور غائب ہو گئی۔

”آئی..... یہ ہمارے اسد بھائی ہیں۔ ہماری پھوپھی جان کے اکلوتے صاحبزادے۔ اسد بھائی یہ نائلہ بھابی  
بہن ہیں اور یہ پھوپھی اور یہ سب سے چھوٹی خالہ۔“  
نائلہ کی نند نے تینوں سے تعارف کرایا۔

اسد ٹکیلا کو دیکھ کر چونک پڑے تھے۔ پہلے تو انہیں کچھ یاد نہ آیا۔ کافی غور کے بعد وہ حیاں آیا۔ کل وہ انعام علی کو  
کی تقریب میں دیکھ کر بھی قدرے حیران ہوئے تھے۔ پھر وہ سوچ کر رہ گئے تھے کہ ہوگا دلہن سے کوئی رشتہ۔  
بڑی ہنگامی حالت میں ذرا دیر کو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں کے ذہن اس ملاقات کو بھولے ہوئے تھے  
چونکہ وہ اس روز نور بانو کو وہاں چھوڑ آئے تھے۔

اور کئی راز ان پر آشکار ہوئے تھے اس لئے وہ ان کے چہرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکے تھے۔ ٹکیلا کتر آ کر آگے  
گئی تھی۔

اس کا دل کاپنے لگا تھا۔ وہ اس کے گھر کے بھیدی تھے۔ شیخ صاحب نے منیہ سے غلط بیانی کی تھی کہ انعام علی کی  
بیگم داغ مفارقت دے چکی ہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

جب ٹکیلا ہی نے گھر میں کوئی ذکر نہیں کیا تو وہ بھی خاموش ہی ہو رہے تھے اور اسے بیٹی کی ”سمجھ داری“ پر غور  
رہے تھے اور انہیں تشویش اس لئے بھی نہیں تھی کہ انعام علی نے شیخ صاحب کو بتا دیا تھا کہ ان کا اپنی بیوی سے کوئی تعلق  
ہے اور شیخ صاحب نے اپنے طور پر اس کی تصدیق بھی کرائی تھی۔

ٹکیلا نہایت فکر مند سی نظر آئے لگی تھی۔ اگر کسی طرح امی کو ساری حقیقت کا پتا چل گیا تو ان پر تو نئے سرے  
قیامت گزرے گی وہ سوچ رہی تھی۔

انعام علی تو علی الصبح کراچی روانہ ہو گئے تھے ورنہ وہ ان سے کہہ سن کر ہلکی ہو جاتی۔ وہ تینوں ڈرائنگ روم میں آ کر  
گئی تھیں مگر ٹکیلا کا ذہن مسلسل اسد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔  
احمر ایک کونے میں مستقل ایک میگزین کو لے گئے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد نائلہ اپنی ساس کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ کریم کلر کی چادر اوڑھے ہوئے تھی اور  
ساہر اس کے ہاتھ میں تھا گویا بالکل تیار تھی۔

”چار بجے لینے آ جائیں گے ہم۔ ظاہر ہے شام کیلئے بھابی کو تیار کرنا بھی کرنا ہوگا۔“  
نائلہ کی نند نے پیچھے سے آ کر کہا۔

”چار بجے.....!!!!“ نالہ نے قدرے پریشان ہو کر اپنی نند کی شکل دیکھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ گھر جا کر بہت  
سوئے گی۔

رات سے اب تک وہ مسلسل جاگ رہی تھی۔

”چھ بجے تک آجائے گا آرام سے.....“ نند نے کہا۔

”لیکن بھابی کو پارلے کر بھی جانا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں آئی! دلہن کی تیاری میں کتنی دیر لگتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔“ نند نے اس کی مشکل سمجھی۔

ٹکیلا اور نائلہ کی نند دلہن کو تھامے ہوئے گاڑی تک لائیں۔ اسدا اور باہر مرتضیٰ وہاں پہلے سے موجود تھے۔  
”بھابی..... باہر کو ساتھ ہی لے جائیے۔ ورنہ یہ ہمیں یہاں پریشان کریں گے۔“ اس نے مسکرا کر نائلہ سے کہا

”آپ! میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ مگر آپ میرے سر کی قسم کھائیں کہ آپ کسی سے بھول کر بھی نہیں کریں گی۔“

نبیلہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔  
”کہو۔“

”نہیں پہلے وعدہ کریں۔“

”اچھا چلو وعدہ۔“

”آپ! میں قسم کھا کر کہتی ہوں، آپ بہت لگی ہیں۔“

”میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں کیا۔؟ پھر کیوں بہلا رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں آپ سے سچ کہہ رہی ہوں آپ!۔۔۔۔۔“

آپ کی بہت بڑی بچت ہو گئی ہے۔ آپ باہر مرتضیٰ کی ظاہری شخصیت پر نہ جائیں۔۔۔۔۔ اس کی آواز بھرا گئی۔  
نبیلہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

”پتا نہیں کس نیکی نے آپ کو بچالیا ہے آپ!۔۔۔۔۔! اشک نائلہ کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

”صاف بات کرو نبیلی۔۔۔۔۔ ورنہ میرا ہارٹ ٹپل ہو جائے گا۔“

نائلہ نے اپنی آستین اوپر تک کھینچی۔ ”یہ دیکھیں۔“

بازو کے اوپر کی جے پر سرخ نشان تھے۔

”آپ! وہ ایک اذیت پرست نفسیاتی مریض ہیں۔ اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ بس میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ یوں سمجھیں کہ پلا آف پیرس۔۔۔۔۔ کے ڈیکوریشن میں پیتل کی پتری چڑھی ہوئی ہے۔ اور۔۔۔۔۔“

”اور کیا۔۔۔۔۔؟“ نبیلہ ایک دم حواس باختہ نظر آئی گئی۔

”اور جب ان کو نشہ چڑھتا ہے تو وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر بری طرح رو پڑتی۔

”نشہ۔۔۔۔۔!“ نبیلہ کے تجسس ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”آپ کو قسم ہے آپ!۔۔۔۔۔ آپ گھر میں کسی کو نہیں بتائیں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری ماں ہی ہم سے چھن جائے۔ اگر کوہنہ چل گیا تو اس بار وہ ابائی کو معاف نہیں کریں گی۔

میں آپ کو بھی ہرگز نہ بتاتی۔ صرف اس لئے بتا رہی ہوں تاکہ آپ کو اپنی خوش نصیبی کا یقین آئے اور آپ کا اہمال ہو۔۔۔۔۔ اور آپ خوش رہنے لگیں۔“

”یہ تو بہت بڑا دھوکا ہے! آئیں ذرا باہر صاحب کی بہن صاحبہ میرے سامنے۔“ نبیلہ تو جیسے کسی طوفان کی زد میں آ گئی۔

”آپ!۔۔۔۔۔ دیکھیں۔۔۔۔۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔“ نائلہ نے اس کا ہاتھ تھام لی۔

”مگر کیا تم انسان نہیں ہو؟ میں بچ گئی تو کیا تم نہیں پھنس گئی ہو۔۔۔۔۔؟ کیا تم انسان نہیں ہو اور پھر سارے قصے میں تم کیا قصور ہے؟ تم بھی تو اتنی ہی بے قصور ہو جتنی کے میں۔ ان لوگوں سے بات صاف ہونی چاہئے۔ یہ تو گویا عمر بھر کا راز ہے۔“

”مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ ہمارے گھرانے کا ایک بار پھر تباہی ہو جائے۔“

”مگر آپ نے کسی سے ذکر کیا تو میں آج کے بعد پھر یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔ چاہے وہ کٹ کر میرے نکلے۔ اس نے قطعیت سے کہا۔

ماگ کی طرح بیٹھ گئی۔

”ہوئے ہیں وہ ذرا سے باز لوگ۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں گہرا کرب و دکھ صاف محسوس ہو رہا تھا۔

”تم یہاں آئیں اور یہیں کی ہو گئیں بلو۔۔۔۔۔! وہ لوگ جلدی کا شور مچا رہے ہیں۔“ شہوار باہر ہی سے بولتی ہوئی داخل ہوئی۔

”تم کثافت تیار ہو جاؤ۔“

غضب ہے۔ کل شام سے ایک ہی تکرار۔۔۔۔۔ تیار تیار۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔!۔۔۔۔۔

جی۔۔۔۔۔ ہم سے اداکاری۔۔۔۔۔ اتنا شاندار سادہ لہا پاکر بہت اتر رہی ہو۔

”اے اے! گدا لیا۔ نبیلہ باہر نکل چکی تھی۔

”اس کے ہاتھ تھام لے۔“ پلیر بھیجا جان!۔۔۔۔۔

”یہ کپڑے کپڑے ٹھیک ہیں۔ پانگل نہیں ہوں میں جوڑے پر جوڑا بدلتی رہوں۔۔۔۔۔ اور آیا کون ہے؟“ وہ باہر نکلتے

پ کے دیور صاحب ہیں اور وہی آپ کی ذمہ دار صاحبہ! باہر صاحب ویسے کے انتظامات میں مصروف تھے۔

”میں سے مسکرائی، نائلہ باہر نکل گئی۔

”وہ لہا والوں نے اچھے خاصے افراد بلائے تھے اس لئے صفیہ نے محلے کے خاص خاص گھروں میں تمام افراد کو بلوایا تھا۔

”لیا بھیجی کے ساتھ آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا کبیرہ تھا۔ غالباً وہ نائلہ کی تصاویر تارنے کا پروگرام بنا

والے کالوں میں آویزے ڈال کر سہارے بالوں میں نکال رہی تھیں۔

”سگی سے سلام کر کے ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ غایت درجے کی اجنبیت اس کے اعزاز سے صاف محسوس ہو

ل آئیں بیٹا؟“ صفیہ نے اخلافا چوہا۔

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ روبی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”ماکے انداز پر خاموشی ہو کر رہ گئیں۔

”خارجس پر سنہرا کام بنا ہوا تھا! کی ساڑھی میں لمبوس صفیہ اور دونوں سے خاصی مختلف نظر آ رہی تھیں۔ ایک بار لیت اب ان کے چہرے سے چھلکنے لگی تھی۔

”کے داماد کی اس قدر تعریف ہوئی تھی کہ وہ واقعی طور پر بہل ہی گئی تھیں۔

”ضرور بہن لیٹا بہت اچھی لگیں گی۔“ انہوں نے شہوار کو ہدایت دی اور اپنے اگلے کسی کام میں مصروف ہو

گئیں۔

انہوں نے نیلہ کو چلنے کے لئے نہیں کہا تھا مگر انہوں نے دیکھا کہ وہ زرد رنگ کے خوبصورت لباس میں تیار نظر آتیں۔ اور کل کے مقابلے میں خاصی چاق و چوبند دکھائی دے رہی تھی۔ ان کو قدرے اطمینان کا احساس ہوا۔ گھر میں سے شیخ صاحب کے علاوہ سب ہی ویسے میں جا رہے تھے۔

دولہا والوں کے ہاں پہنچے پہنچتے نونج گئے تھے۔ رنگ و نور کے سیلاب میں نائلہ اور باہر مرتضیٰ سامنے ہی سٹیج پر بیٹھے تھے۔ فلیش کے جھماکوں میں دوری سے تھے۔

صغیفہ نے دیکھا۔ روٹی تیزی سے اسٹیج کے قریب پہنچ گئی تھی اور مختلف زاویوں سے نائلہ اور باہر مرتضیٰ کی تصاویر لگی تھی۔ جانے کیوں ان کا دل چاہا کہ اسے روک دیں اور اسے گلے سے لگا کر کہیں ”بیٹی اب کیا فائدہ.....؟“ مگر پھر خود ہی انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

نائلہ کے چہرے پر میکے والوں کو دیکھ کر عجیب سی جگہاٹ نظر آئی۔ مگر جیسے ہی روٹی پر نگاہ پڑی اس کی آنکھیں بجھ گئیں۔

روٹی اسٹیج پر چڑھی۔ نائلہ کے چہرے پر ہنسنا سا آگیا۔

ہائیں طرف باہر بیٹھے تھے۔ روٹی دائیں طرف اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔

”بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ۔ مبارک ہو۔“

نائلہ کی جھکی نظر سن نہ اٹھ سکیں۔

”ہمارے ساتھ زیادتی کا ملال شاید آپ کو نہ ہو کہ آپ کے دولہا بہت پیارے ہیں۔“

”کیا آپ لوگ بھی امیدواروں میں شامل تھے؟“ باہر مرتضیٰ نے مسکرا کر پوچھا۔

انہوں نے روٹی کی سرکشی سن لی تھی اور فوراً روٹی کی بات اچکی تھی۔

کتنے ہوشیار اور چوتھے تھے کہ ایک دم بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔

نائلہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز کر رہ گیا۔

کتنی لا پرواہ اور احمق ہے یہ روٹی..... اسے جیسے غصہ آ گیا تھا۔

کم عمر ہے اسی لئے اتنی لاابالی اور کم عقل ہے۔ یہ بھی کوئی موقع ہے ان باتوں کا.....؟

”یقیناً ان امیدوار کا آپ سے کوئی قریبی تعلق ہوگا۔ وہ محفل میں شریک تو نہیں ہیں؟ کہیں ان کی نظر نہ لگ

ہاری بیگم کو۔“

باہر مرتضیٰ شرارت سے کہہ رہے تھے مگر نائلہ کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

اسے یقین تھا کہ روٹی کا اگلا جملہ کسی مصلحت اور..... عقل سے عاری ہوگا۔ اس نے آہستگی سے روٹی کا ہاتھ

اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

”آئیے امی..... آپ اس طرف آ جائیے..... ہمارا شو تو ختم ہوا اب آپ لوگ تھوہر بنو ایسے۔“ باہر

کھڑے ہو کر صغیفہ کو متوجہ کیا۔

”حالانکہ دل تو نہیں چاہ رہا تھنے کا۔“ انیلا نے چھیڑا۔

آپ کو میرے دل کی خبر کیسے ہوئی؟“ وہ بھی برجستہ بولے۔ ایک قہقہہ پڑا۔

”اے امی..... پلیز.....“ انہوں نے پھر سانس کو متوجہ کیا۔

”نہیں..... آپ بیٹھیں بیٹا.....“ وہ رواداری سے گویا ہوئیں۔

آپ کمزری ہیں اور میں بیٹھوں.....؟ آئیے پلیز.....“ وہ انکساری سے کہہ رہے تھے۔

یہ تہذیب کا نمائندہ..... یاصف اول کا اداکار.....؟ نائلہ کا دم کھٹنے لگا۔

پاری ساڑھی میں شکیلہ بھی اسٹیج پر آگئی تھی۔

”شکیلہ تم بیٹھو..... نیلہ کہاں ہے.....؟“ انہوں نے ادھر ادھر دکھا۔

مرتضیٰ اسٹیج سے نیچے اتر چکے تھے۔

بیس منٹ سے نیلہ کا نام نکلتے ہی انہوں نے اس طرف دیکھا جہاں صغیفہ دیکھ رہی تھیں..... نائلہ نے فوراً ہی ان کی

نوٹ کی تھی۔

”آگے بڑھی.....“ السلام علیکم۔“ اس نے باہر مرتضیٰ کو سلام کیا۔

اس کے سامنے نوٹ گئے۔

”ہم السلام..... مزاج بخیر.....“ وہ جانچتی ہوئی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ نائلہ اس دم اپنے

نوکھلی معنی نہ پہنا سکی۔

صغیفہ نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی۔ فوراً اسے پکارا تھا۔

”..... ادھر آ جاؤ..... شکیلہ کے پاس۔“

نہمہاں بھی نیلہ اور باہر مرتضیٰ کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگے تھے۔ نیلہ فوراً اس کی آواز پر آگے بڑھ گئی تھی۔

مرتضیٰ نے ابھی تک نیلہ کے موضوع پر اشارتاً بھی کوئی بات نہیں کی تھی اور اس نے تو ابھی تک خود سے باہر کو

لیا ہی نہیں تھا۔ بلکہ ان کی اکثر باتوں کا جواب ہاں ہی میں دیا تھا۔

امی..... نائلہ نے پہلو میں بیٹھی ہوئی شکیلہ کو آہستگی سے مخاطب کیا۔

”ہاں۔“ شکیلہ نے پیار بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا آج میں آپ لوگوں کے ساتھ گھر نہیں جا سکتی.....؟“

”کیوں.....؟“ شکیلہ حیران ہوئی۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

مگر جو آرام جہیں اپنے پڑسکون بیڈروم میں ملے گا وہ آج کل گھر میں تو نہیں مل سکتا..... کیونکہ گھر تو مہمانوں سے

ہے۔“

ملایک دم چپ سی ہو گئی۔ پھر ذرا دیر بعد گویا ہوئی۔

”پلو پلو کہاں ہیں..... پلیز انہیں بلا دیں۔“

ہائیں پھو پھو تو کس کس سے ملتی پھر رہی ہیں۔ ابھی تو ہمیں تھیں۔ نظر آئیں تو بیلو والوں کی۔“

پلیز نے جواب دیا۔

”مالی جان بھی انہی کے ساتھ ہیں۔ تم نے دیکھا انہیں..... قیامت ڈھا رہی ہیں۔“

ملایک دم کہتے کہتے رک گئی۔ ایک دم رک گئی۔ ایک پہاڑ جیسا ڈکھل پڑا۔



احسن بھائی..... گھر کا اہم ترین فرد..... اہم ترین موقع پر پاس نہیں تھا..... اس کا دل بھرا آیا۔ ایک دم اٹھ کھڑی  
 ”کہاں جا رہی ہیں.....؟“ نائلہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
 ”ابھی آتی ہوں پھوپھو کو لے کر۔“ وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔  
 بعض اوقات خوشی بھی بہت بڑا قریب نظر ہوتی ہے۔  
 جیسے ہم سب بہنیں اس وقت چچماٹے لمبوس میں خوش نظر آ رہی ہیں۔  
 امی بھابی جان کوئی جان سے سنوار کر نہ جانے اپنی کس شش آرزو کی تکمیل کر رہی تھیں۔  
 خالائیں اور پھوپھو مسکرا مسکرا کر جیسے یقین دلارہی ہیں کہ بحران گزر گیا ہے۔ اب تو بس خوشی ہی خوشی ہے  
 عمل اس کی سوچ سے مختلف ہے۔

اور میں..... شکلیہ نے سرد آہ بھر کر ادھر ادھر ٹھینے کو تلاش کیا۔  
 وہ ایک طرف کھڑی باہر مرتضیٰ کی والدہ سے گفتگو کرتی نظر آئیں۔  
 سادہ سا جوڑا بنائی آسانی پلین ساڑھی میں لمبوس بہت باوقار نظر آ رہی تھیں۔ باہر مرتضیٰ اپنی والدہ سے  
 مشابہت رکھتے تھے۔  
 شکلیہ اپنا دونوں کے نزدیک چلی آئی۔  
 ”چچی بات ہے۔ مجھے آپ کی بھادج کے رکھ رکھاؤ اور سادہ مزاج نے پہلی ملاقات ہی میں متاثر کیا تھا۔“  
 وہ ٹھینے سے کہہ رہی تھیں۔

”پھوپھو! آپ کو نائلہ بلا رہی ہے۔“ شکلیہ نے ٹھینے کو متوجہ کیا۔  
 ٹھینے نے فوراً اسٹیج کی طرف دیکھا۔ ”معاف کیجیے گا۔ ابھی آئی۔“ وہ فوراً نائلہ کی سمت بڑھ گئیں۔  
 ”آپ تو غالباً کراچی میں ہوتی ہیں۔“ باہر کی والدہ مہر افروز نے شکلیہ کی سمت روئے سخن کیا۔  
 ”جی.....“

”سرال میں ہی ہیں۔“  
 ”جی نہیں..... الگ گھر ہے۔“ شکلیہ نے جیسے کترا کر جواب دیا تھا۔  
 ”نائلہ کو بھی تنہا رہنا ہوگا..... باہر کے والد مستقل پنڈی میں رہتے ہیں۔ ظاہر ہے میرا گھنا بھی انہیں کے سا  
 کاروبار تو ایک ہی ہے۔ مگر شامیں کئی ہیں۔ مجھے باہر کی وجہ سے بہت پریشانی رہتی تھی۔ اب نائلہ آگئی ہے تو بے  
 ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

ابھی وہ دونوں باتوں میں مصروف تھیں کہ باہر بھی وہیں چلے آئے۔  
 اور چند لمحوں بعد ٹھینے بھی۔  
 ”آپ سے ایک بات کی اجازت درکار ہے۔“ ٹھینے آتے ہی مہر افروز سے مخاطب ہوئیں۔  
 ”جی.....“

”اگر آج ہم نائلہ کو اپنے ساتھ لے جائیں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“  
 ”بھئی، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے..... یہ تو آپ باہر سے پوچھیے۔“ وہ مسکرائیں۔  
 مگر آج تو وہ ویسے بھی تھک گئی ہوں گی۔ میں صبح کو خود لے آؤں گا۔“ باہر نے جلدی سے کہا۔

اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... اس لیے.....“  
 پر وہ انہیں بالکل نہیں جانتا چاہیے بلکہ آرام کرنا چاہیے..... کیوں امی.....؟“  
 اگر وہ خود جانا چاہتی ہے تو کوئی حرج نہیں۔“ مہر افروز نے فراخ دلی سے کہا۔  
 فہرے..... میں بات کرتا ہوں۔“ باہر مرتضیٰ نائلہ کی سمت بڑھ گئے۔  
 لڑیلا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ باہر مرتضیٰ کو اپنی سمت آنے دیکھ کر پُپ ہو گئی۔  
 ایک منٹ پلین.....“ باہر مرتضیٰ نے اپنی ایک کزن کو پہلو سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کے اٹھنے ہی اس کی خالی  
 جگہ پر بیٹھ گئے۔  
 آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....؟“

جی.....“  
 آئے پھر.....“  
 نے گھبرا کر ان کی سمت دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کہاں.....؟  
 ڈاکٹر یہاں بہت قریب ہے۔“

مگر مجھے تو صرف شدید تھکن کا احساس ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ گھبرا کر گویا ہوئی۔  
 پہلا مکمل جملہ تھا جو اس نے باہر مرتضیٰ کے سامنے بولا تھا۔  
 نائلہ..... جب وہ افراد کسی معاہدے کے پابند ہوتے ہیں تو معاہدے کی کچھ اہم شقیں اپناتے ہیں۔ جن کی پابندی  
 ان کی روح ہوتی ہے۔  
 بات ہمیشہ کے لیے لوٹ کر لیجیے کہ آپ کو میں کبھی بھی اس گھر سے باہر رات گزارنے کی اجازت نہیں دوں  
 ”وہ تمام گاہ جہاں آپ ٹھہرنا چاہتی ہیں۔ آپ کے والدین کا گھر ہی ہو۔“  
 لڑکے کے ہاتھ برف ہونے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی بھیڑیا شکار قریب دیکھ کر تیز تیز سانس لے رہا  
 اسے پکڑ سا آگیا۔

”مجھے پورا یقین تھا کہ تم یہیں ملو گے.....“ اسد کیسرہ تھاے ہوئے اسٹیج سے بہت قریب کھڑے تھے اور شرارت سے  
 ہے تھے۔  
 باہر میں بھابی کے کلوز اپ بنانا چاہتا ہوں، تاکہ تمہیں خفے کی صورت میں پیش کر سکوں۔“  
 لہلہانے کیسرہ سنبھال کر ارد گرد کے افراد کو ہنسنے کا اشارہ کیا۔

اگر تو جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر گاہے گاہے فلیش پڑ رہی تھی مگر اسے جیسے کوئی احساس نہیں  
 تھا کہ اسد نے آگے بڑھ کر خود اس کا آئینہ درست کیا۔ مگر اسے کسی بات کا احساس نہیں تھا۔  
 لب لکھا ختم ہوا..... کون اس کے پاس اس آیا۔ کس نے کیا کہا۔ اس کے اعصاب پرتو جیسے برف گر گئی تھی۔  
 ٹھینے اس سے جانے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے سر کی جنبش سے منع کر دیا تھا۔ نیلہ جیسے اس کی  
 لکھتی تھی۔ دکھ سے اس کا دل جیسے شق ہونے لگا تھا۔ وہ فوراً ہال سے باہر چلی گئی تھی۔  
 کرا لی خواتین اسے اس کے بیڈروم میں چھوڑ گئی تھیں۔  
 لڑکے حلق میں جیسے کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے رو پہلی شرارے میں الجھتی گرتی بیڈروم ریفریجریٹر تک آئی

تھی۔

فرخ کھولتے ہی اس نے بوتلوں کو چھو کر دیکھنا شروع کیا کہ کون سی بوتل سب سے زیادہ ٹھنڈی ہے۔  
فرخ میں پانی کی بوتلوں سے زیادہ دواؤں کا شاک تھا۔ اس نے پُر تجسس نظروں سے ایک ایک ڈبیا انگڑا کر شروع کی۔

مگر میں تو ڈھالے نہیں ہیں۔ جو کچھ آپ دیتے ہیں۔ اسی میں سے بچاتی ہوں۔ بُرا بھلا وقت پوچھ کر تو نہیں آتا۔“  
بی بی بولیں۔

”کچھ اور گرم شہوار کو لے جا رہی ہو تو اس کا انتظام کر کے ہی آنا۔۔۔۔۔۔ واپس لانے کی ضرورت نہیں۔“  
منیہ نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش ہو رہی۔

شیخ صاحب بنگلہ کرانے ایر پورٹ چلے گئے تو انہوں نے اپنا اور شہوار کا مختصر سامان چیک کیا۔ ساتھ ساتھ لڑکیوں کے سامنے کال سلسلہ بھی جاری رکھا۔

ٹیلی کی طرف سے ایک نگری جوگ گئی تھی اس کی گھبراہٹ علیحدہ تھی۔

شہوار اپنی واپسی کی خبر سن کر اسی طرح بے تاثر تھی۔ اسے جیسے قطعی یقین تھا کہ اس کے ساتھ جو بھی آئندہ ہوگا اچھا ہوگا۔

لڑکیاں اس کی واپسی کا سن کر اداس ہو رہی تھیں۔

”اللہ کرے اب آئندہ جب ہم ملیں تو ہمارے ساتھ احسن بھائی بھی ہوں۔“ منیہ نے دُعا کی تھی۔

شہوار کے ہونٹوں پر ایک لٹلے کوچ سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ ”ہونہ۔۔۔۔۔۔ پتا نہیں کن پسندوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ۔“  
منیہ تو کام دھام چھوڑ چھاڑ جائے نماز سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔ اور ٹھیکہ کے لیے دعاؤں میں مصروف تھیں۔

شیخ صاحب رات آٹھ بجے واپس ہوئے تھے۔ ٹائٹ کوچ سے روانہ ہوئی تھی۔ لہذا رات کالی ہونا تو لازمی تھی۔

شہوار جب منیہ کے ساتھ گھر سے باہر آ رہی تھی تو اس کا دل کانپ رہا تھا۔ خدا معلوم اب اگلی منزل، اگلا مرحلہ کیا ہوگا؟

منیہ تو پلیٹوں میں بھی شیعہ پڑھنے میں مصروف ہی تھیں۔ جب کہ شہوار کا سفر مستقبل کے اندیشوں میں کٹا تھا۔

شیخ صاحب نے اطلاع کی تھی اس لیے ریسو کرنے کے لیے انعام علی بہ نفس نفیس موجود تھے۔۔۔۔۔۔ انہوں نے منیہ کے ساتھ شہوار کو دیکھ کر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا اور ان کا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر ان کے آگے آگے چل دیے۔

”میرا خیال ہے انعام علی آپ ہمیں پہلے ٹھیکہ کے پاس لے جائیں۔“ منیہ نے اپنی بے چینی ظاہر کی۔

”وہ ایمر جنسی میں ہیں، ملاقات تو نہ ہو سکے گی۔ پہلے آپ گھر ہی چلیے۔“

”کوئی خطرہ کی بات تو نہیں ہے؟“ ان کا دل ایمر جنسی سن کر ہی ڈوبنے لگا۔

”آپ دُعا کیجیے۔۔۔۔۔۔ ان کا انداز متشکر سا تھا۔ وہ گاڑی بھی خاصی رفتار سے ڈرائیو کر رہے تھے۔

منیہ پر غایت درجے کی گھبراہٹ طاری ہو چکی تھی۔ وہ بھرمنہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگی تھیں۔

اُنکے گھر پر چھوڑ کر اور موجود ملازمین سے تعارف کرانے کے بعد وہ گویا لے پاؤں واپس ہاسٹل چلے گئے تھے۔

منیہ پہلے تو ادھر ادھر بولاٹی بولاٹی سی پھرتی رہیں۔ پھر شہوار کو آرام کرنے کی تاکید کر کے جائے نماز بچھا کر بیٹھ لیا۔۔۔۔۔۔ ایک عرصہ کا دکھا ہوا دل تھا بھر بھرا رہا تھا۔ وہ دہلی دہلی سکیوں کے ساتھ دعائیں کر رہی تھیں۔

شہوار انہیں دیکھ کر خود بھی گہرا دکھ محسوس کر رہی تھی۔ کیسے سو سکتی تھی۔

مگر میں آئی خانسا ماں نہ جانے کدھر تھا اس نے خود ہی تلاش کر کے جائے تیار کی اور ایک کپ لے کر منیہ کے پاس آئی۔

”خالہ جان۔۔۔۔۔۔ چائے پی لیجیے۔“

ٹھیکہ تو انعام علی کی ہدایت کے عین مطابق ویسے کے اگلے ہی دن کراچی جانے والی پہلی پرواز سے کراچی روانہ تھی۔

ثمنیہ ایک دو روز کے لیے اپنی سرال یعنی لاہور روانہ ہو گئی تھیں۔ باقی مہمان بھی ان کے آگے پیچھے ہی رہے۔ منیہ گھر کی درستی میں گئی ہی تھیں کہ شیخ صاحب نے اطلاع دی کہ ٹھیکہ ہاسٹل میں داخل ہے۔ انعام علی کا فورا

تھا۔ یہ سنتے ہی ان کے تو ہاتھ پاؤں بھول گئے۔ انتہائی غیر متوقع اطلاع تھی۔ ان کا تو پروگرام تھا کہ اس کے ہاں دلا سے بیس پچیس دن پہلے جائیں گی۔ اور اسی بہانے پہلے احسن سے ملیں گی پھر اپنے بہن بہنوئی سے جو احسن کے ساتھ ان سے بھی سخت خفا تھے۔ ناملکی شادی میں عدم شرکت اس شکل کی کا واضح ثبوت تھا۔

”پھر آپ میری اور شہوار کی سیٹ بک کرادیں۔“ منیہ نے فوری فیصلہ کیا۔

”شہواری؟ مگر کیوں۔۔۔۔۔۔“

میں اسے سردار بھائی کے پاس پہنچا کر آؤں گی۔ اور قاعدے قانون کے مطابق۔۔۔۔۔۔

”آپ کے صاحبزادے تمام ضابطے پورے کر چکے ہیں۔۔۔۔۔۔ غالباً آپ کو یاد نہیں۔“ شیخ صاحب نے طنز میں یاد دلایا۔

”مگر کیا یہ بچی ساری زندگی اسی چوکھٹ پر گزارے گی۔۔۔۔۔۔ مسئلے کا کوئی حل بھی تو نکالنا ہے۔ بس اس کی بیوا

بگ کرادیں۔“

”انعام علی نے تمہیں ایمر جنسی میں بلوایا ہے۔ ٹھیکہ کی حالت بے حد خراب ہے۔ تمہیں جہاز سے جانا ہوگا۔ شادی سے فارغ ہوا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کس قدر اخراجات۔۔۔۔۔۔“

”آپ فکر نہ کریں۔۔۔۔۔۔ آپ پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔ پیسے ہیں ہمارے پاس۔“

وہ ان کی بات کاٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو ہاتھ میں کچھ رقم تھی۔

”یہ لیجیے۔۔۔۔۔۔ ڈھائی ہزار ہیں۔۔۔۔۔۔“

”کہاں سے آئے؟“ شیخ صاحب کی ہنسی تن گئیں۔

منفیہ نے ایک گہری سانس لے کر کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”تم آرام کرو بیٹے.....! آجکل سے طبیعت خراب نہ ہو جائے خدا خواستہ۔“

وہ گھٹنوں پر بوجھ ڈال کر جیسے طوئے کر باکھڑی ہوئی..... اور ٹکیلہ کے بیڈروم میں چلی آئی۔ اطراف نظر ڈالنے اسے یہاں گزار ہوا ایک بیل یاد آ رہا تھا۔ جو اس شقی اور سنگر کے تصور کے بغیر مکمل نہیں تھا۔ اس نے تھکے تھکے انداز اپنا ایک سوٹ نکالا اور غسل کرنے چلی گئی۔

جب انسان پراگٹھلے لمے کا کوئی عکس واضح نہ ہو تو جیسے اس پر عارضی موت سی طاری ہو جاتی ہے۔ غسل سے فار تھی کہ کال بیل بج اٹھی۔

کون آیا ہے، یہ دیکھنے کے لیے ملازمین موجود تھے۔ مگر حالات کچھ اس قسم کے تھے گھر میں بچنے والی گھنٹیاں اسرار سے پوشیدہ محسوس ہوتے تھے۔ ہر گھنٹی خواہ وہ فون کی ہو یا اطلاعی کسی خبر کا پیش خیمہ تھی۔

لہذا وہ دوپٹہ شانوں پر پھیلا کر سگیلے بالوں کو قیمتی گیت کر طرف بھاگی تھی۔ سورج بس نکلنے ہی والا تھا۔ عجز سینے والی تھی۔

آف..... اس نے ایک اذیت کے عالم میں جیسے آنکھیں بند کر لیں۔

سامنے وہی تو تھا.....

جس پر بھر دے کا خوفناک انجام وہ دیکھ رہی تھی۔

وہی جس نے ذلتوں کی سیاہی اس طرح ملی تھی کہ وہ اپنی شناخت کھور ہی تھی۔

وہی..... جس نے کس شقاوت کے ساتھ زمین و آسمان کے بیچ اسے تنہا کیا تھا۔ جس نے ہمیشہ کے لیے محبت ہی اس کا اعتبار ختم کیا تھا۔

سفید شلوار قمیص میں وہ صبح ہی کا کوئی جو محسوس ہو رہا تھا۔

وہ نفرت سے منہ موڑ کر تقریباً بھاگتی ہوئی ٹکیلہ کے بیڈروم میں واپسی آئی تھی۔ اس ملال کے ساتھ کہ ایک کے لیے..... سبھی اس سے نظری کیوں.....؟ اس کا چہرہ دیکھا ہی کیوں۔

”کون ہے شہوار.....؟“ اسے اپنے عقب میں منیفہ کی آواز سنائی دی تھی۔

”چنانچہ خالہ جان.....! کون ہے۔“ اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

اور دوسری طرف احسن پہلے شہوار اور پھر ماں کو دیکھ کر چکر اکر رہ گیا تھا۔

منیفہ بے یقینی کی کیفیت میں جیسے بناسانس لے لے اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

ایک پل میں جانے کتنی تصویریں ان کے ذہن کی اسکرین پر نمودار ہوئیں۔

وہ محنت مند سا بچہ جو ان کے بازوؤں میں دیکھ کر کتنی مائیں رشتہ کرتی تھیں یا جو ان سے دور ہونے کے پھوٹی تحریر میں انہیں پیار بھرے خط لکھتا تھا یا پھر وہ جو شیخ صاحب کی چیخ و پکار اور لعن طعن پر انہیں بازو کے گھیر لے کر حرف تسلی دیتے ہوئے کسی سنہرے رستے کا سنگ میل محسوس ہوتا تھا۔

وہ جو ان کے مجبور آنسو محبت اور احترام سے پونچھے ہوئے اپنے وجود کی طاقت کا احساس دلاتا تھا..... اور آئے دنوں کے لیے ان میں حوصلہ پیدا کرتا تھا..... اور جو ان کے پنداران کے اپنے غرور کی خاطر گھر سے بے گھر ہوا تھا۔

وہ اس کو سامنے دیکھ کر اس کا ہر عجب، ہر خطا، ہر تصور بھول گئیں۔

اس کا سراپے سینے سے لگا کر کس طرح بے کلم ہو کر روئی تھیں۔

”میری روح میری زندگی میں ختم ہو رہی ہوں۔ تیری دوری مجھے لمحہ نادر ہی ہے۔ مجھے انگاروں پر لہا کر اتنا ہلاتا ہے نگر ہے۔“

احسن خدا کے لیے اب مجھ سے دور نہ ہوتا.....“

احسن نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے جیسے اذیت کا کوئی بیل صراط طے کر رہا تھا۔

”امی پلیز.....“

”اب کہیں نہ جانا احسن.....!“

”میں آپ ہی کا ہوں امی، دوری دزدیکی یہ تو زندگی کے معمولات میں شامل ہے۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔“

یہ۔ اس دوران میں نے کوئی بات ایسی کی جس سے آپ کو شبہ ہو کہ میں اپنے گھر کو فراموش کر بیٹھا ہوں.....؟

”میں جہاں ہوں۔ جیسا ہوں، جو ہوں آپ ہی کا ہوں..... آپ کیوں فکر مند ہوتی ہیں؟“

وہ اپنے مخصوص انداز میں منیفہ کو تسلی دے رہا تھا۔

ایسی ہی تسلیوں کا سلسلہ جب سے اس نے شروع کیا تھا۔ منیفہ نے ہرے سے زندہ ہوئی تھیں اور شیخ صاحب کے ب دشتاب سے بے نیاز رہنے لگی تھیں۔

احسن کا اٹھتا ہوا وجود، اس کے عزائم..... اس کا مبر ضبط، اس کی قلبی کارکردگی نے منیفہ کے حوصلے جو ان کر دیئے

ایک لائق بیٹے کی ماں ہونے کا احساس ان کی طمانیت کا باعث بنا رہا تھا۔

مگر جیسے یہ چارون کی خوشی تھی،

فرقت و جدائیوں کے بھی مزاج ہوا کرتے ہیں۔

ایک جدائی آنے والی کسی واضح خوشی کا پیغام ہوتی ہے۔

ایک فراق آئندہ کے کسی خوش انجام ملاپ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اور.....

ایک فرقت بڑی مبہم و مشکوک ملاقات کا محض آسرا ہوتی ہے۔

ایک جدائی دائمی مفارقت کی سی ہوتی ہے۔

جس میں پھٹنے کے لیے کوئی معقول جواز نہیں ہوتا۔ علیحدگی کی کوئی عاقلا نہ دہ نہیں ہوتی۔

پندار کا نظرنہ آنے والا شیشہ سنبھال کر نہ چاہنے کے باوجود..... ایک دوسرے کی رگ جان بنے رہنے کی خواہش کے نوجوانی کا سحر سامنے ہوتا ہے..... جب کہ

قربت کی پیاس بھی اتنی شدید ہوتی ہے کہ حد نہیں۔

وصل کے آب کی تلاش میں پندار کی انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں۔

مگر وصل آب..... انا کے کسی سراپ کا خواب ہوتا ہے۔

اس کے پندار کی انگلیاں لہو لہان ہو چکی تھیں۔ مگر غیرت و خودداری عارضے کی طرح لاحق ہو تو چارہ گرمی کی ہر صورت

ان کی پر تمام ہوتی ہے۔

”امی..... صبح اور غلط کا فیصلہ ایک دن ضرور ہوگا..... حشر ہوگا ایک دن امی..... ہمارے کشت خاں نہیں جائیں گے۔“ وہ صنف کو محبت سے بہلا رہا تھا۔

”مگر کب؟ کب احسن.....؟ تم تو میری مغل پونجی ہو۔ عمر بھر کی کمائی ہو۔ میرے نصیب میں کیا بھی ہے کہ میں تم۔“ ارے چاند چہرے کو دیکھنے کے لیے ترستی ہوں؟ تمہارے تایا تمہیں لے گئے تو میں کس طرح راتوں کو بے گل پھرتی تم؟ تمہاری آسودگی اور سکون کی خاطر وہ پتھر بھی میں نے اپنے سینے پر رکھ لیا تھا۔

”مگر اب..... اب مجھے چین نہیں آتا..... تم مجھے گناہ دے گے احسن۔!“ وہ مسلسل رورہی تھیں۔

”اللہ نہ کرے امی..... محض آپ کے وجود کی طاقت تو ہے جس نے میرے اندر فولا دیا ہے۔ محض آپ کی ذات تو رہے کہ مجھے دھوپ بھی سایہ محسوس ہوتی ہے۔“

احسن نے ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور ان کے دونوں ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیے۔

”تو اولاد کے امتحان سے نہیں گزرا احسن..... تجھے یہ نہیں پتا کہ کسی آگ ہوتی ہے۔“ وہ کرب سے کہہ رہی تھیں۔

”امی آپ کے حوصلے مجھے منتقل ہوئے ہیں۔ مجھے کمزور نہ بنائیے..... وہ مجھمبیر اور آہستہ آہستہ آواز میں ان۔“

”کلام تھا۔“

”امی! آپ جیسی لطیف مزاج عورت کو جب اباجی کے ساتھ میں نباچے اور برداشت کرتے دیکھتا تھا تو اپنی مراد اُگنی کی آپ سے کم محسوس کرتا تھا۔“

سفر حوصلے سے کٹ جانے دیں۔ میں کہیں ہوں، آپ کے نام آپ کی ذات سے جدا نہیں ہوں۔“

احسن تو بڑے نازوں سے پلا ہے..... میں اگر پھولوں کی طرح تجھے سنبھالتی تھی تو تیرے مہربان تایا ابانے۔“

”یہ تو بھائی..... یہ کھنا نایاں..... تو کس قدر بے آرام ہے..... میرا دل روتا ہے۔“

”چھوڑ دے سب کچھ..... میرا وجود بے روح ہو رہا ہے۔“

”امی..... آپ تو بہت ہمت والی ہیں۔“

”مگر تو میری کمزوری ہے۔“ وہ آنسو پونچھ کر گویا ہوئیں۔

”بس امی! تھوڑی سی ہمت اور..... قدرتی فیصلہ ہونے تک..... پلیز امی.....“

”آہ.....!“ صنف خالی خالی آنکھوں سے دیوار تنگے لگیں۔

احسن اٹھ گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک گلاس پانی لیے ان کے پاس چلا آیا۔

صنف نے گلاس اس کے ہاتھ سے لیا۔

”شکیلہ کے بارے میں کوئی اطلاع آئی.....؟ انعام بھائی نے اطلاع بھیجوائی تھی۔“

احسن نے بات کا رخ موڑا تو صنف جیسے کسی..... خواب سے چونک پڑیں۔

”ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی شہوار۔!“ انہوں نے چہرہ موڑ کر شہوار کو آواز دی۔

اندرا شہوار کی جان سلگ کر رہ گئی۔

کیا امید رکھی جائے خالہ جان سے جو بیٹے کو سامنے دیکھ کر سب کچھ بھول گئی ہیں۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

”شہوار.....!“ انہوں نے دوبارہ آواز دی۔

احسن نے تاثر چہرہ لے کر اٹھ کھڑا ہوا..... ”میں لان میں ہوں امی..... فون وغیرہ آئے تو مجھے بلوا لیجئے گا.....“ اس نے سائیکل سے اخبار اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

پشائی کسی کام سے لاؤنج میں آئی تو صنف نے اس سے کہا کہ وہ شہوار کو بلا کر لائے شہوار سب کچھ سن رہی تھی۔ ایک جھٹکے سے اٹھ کر باہر آگئی۔

”جی خالہ جان!“ اس کے انداز میں تکی سی تھی۔

صنف نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا..... پھر بڑے تحمل سے گویا ہوئیں۔

”ریمہ اور خضہ کے فون نمبر تو تمہیں معلوم ہوں گے..... بڑے ماموں تو تمہارے شاید نہ آئیں۔ اب ادھر ملنے لانے والے کون ہیں مجھے پتا نہیں۔“

شکیلہ کے لیے ختم وغیرہ کالوں..... دعائیں، اللہ کے کلام میں بڑا اثر ہے۔ دیکھو تو ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔“ وہ فکر مندی کے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

”انعام بھائی کی غیر موجودگی میں..... خالہ جان کہیں وہ برآمد نہیں۔“

”اس وقت وہ مشکل میں ہیں۔ اور کیا شکیلہ کے رشتے داران کے رشتے دار نہیں.....؟“

بہی تو بہانہ ہے تمہاری خالائیں کس قدر ناراض تھیں۔ میں نے انہیں سمجھا تو سمجھ گئیں۔ جس شادی میں ماں کا کوئی گھر نہیں تھا تو پھر خالائیں تو دور کی بات..... ہیں۔ آہ..... عبید (صنف کے چھوٹے بھائی) کو میری شکل کا احساس ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ کوئی شکایت نہیں کی۔ البتہ تمہارے بڑے ماموں ذرا مشکل ہی سے کوئی بات سمجھتے ہیں۔ انہیں اطلاع نہ دینا..... کیونکہ احسن بھی موجود ہے۔ نازک موقع ہے خواہ مخواہ بد مزگی ہوئی تو ماحول اور خراب ہوگا۔“

شہوار..... اسی طرح کھڑی سوچتی رہی..... جانے کیا۔

”شہوار.....!“ صنف نے اسے متوجہ کیا۔

”جی خالہ جان.....“

”ادھر میرے پاس آؤ بیٹی.....“ صنف نے تسبیح ایک طرف رکھ دی۔

شہوار آجسکی تان ان کے قریب بیٹھ گئی۔

صنف نے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں سیٹ لیا۔

”خالہ سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں..... تم میری اپنی بیٹی ہو، میری اپنی بیٹی..... تم کم عقل اور جذباتی ہو، اپنا انداز بھلا نہیں سمجھ رہی ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔“

”خالہ جان..... آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ میں ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ مجھے نفرت ہے۔“ وہ ان کے کاندھے سے سر ہٹا کر رو پڑی۔ گویا زخم ہرے ہو چکے تھے۔

”ہاں میں اس سے کہہ دوں گی۔ مگر تم روؤ نہیں..... مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“

صنف کے لہجے میں اتنی محبت اور حلاوت تھی کہ شہوار کے آنسو ایک دم رک گئے۔

”دیکھو بیٹا! یہ مشکل وقت ہے۔ تمہیں اس وقت میرا ہاتھ ملانا چاہیے۔ میرے لیے جس طرح شکیلہ، نبیلہ اور نائلہ ہیں اسی طرح تم ہو۔ کیا تم یہ سوچتی ہو کہ میں تمہارے ساتھ خاموشی سے زیادتی ہوتی دیکھتی رہوں گی۔ تم تو میرے

انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

صفیہ کے اس عمل سے شہوار کو عجیب تقویت سی۔ محسوس ہوئی۔

”جاؤ تم اپنی خالادوں کو فون کر دو۔ میں تو چاہتی ہوں کہ آیت کریمہ کا فتم کراؤں مگر یہاں اتنے لوگ ہوں گے نہیں۔“

شہوار لاؤنج کے ایک سرے پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

عالمی اس نے پہلے رمیصہ کو رنگ کیا تھا۔

”آج ہی۔۔۔ جی خالہ جان کے ساتھ۔۔۔ شکلیہ ہاسپٹل میں ہے۔ آپ کو ہلاری ہی خالہ جان جی۔۔۔ پتا بہت آسان ہے۔“ وہ پتا سمجھانے لگی۔

صفیہ نے پشمانی سے کہا۔ وہ باہر سے احسن کو بلالائے۔ شہوار کو ان کے اس عمل کی خبر اس لیے نہ ہو سکی کہ وہ ان کی طرف سے پشت کیے ہوئے تھی۔

چند لمحوں بعد ہی احسن اخبار رول کیے ہوئے اندر چلا آیا۔ اس نے ایک اچھتی نگاہ فون کرتی شہوار پر ڈالی اور صفیہ کے قریب چلا آیا۔

”جی امی۔۔۔“

”ابھی تک انعام علی کا فون نہیں آیا۔ کیا تمہیں اس ہاسپٹل کا علم ہے جہاں شکلیہ داخل ہے؟“

وہ اب تشویش میں مبتلا ہو چکی تھیں۔

”جی نہیں۔۔۔“

”پھر کیا بات ہے۔۔۔ اللہ خیر کرے۔“

”جی خالہ جان کے ساتھ۔۔۔ شکلیہ ہاسپٹل میں ہے اس لیے۔ جی خالہ جان یہیں ہیں۔ اس وقت۔۔۔ جی بس اور خالہ جان ہیں۔“ وہ احسن کا نام گول کر گئی۔ ”آپ چھوٹی خالہ کے ساتھ آجائیں۔“

”اگر وہ فون کر رہی ہوں گے تو آنکج ہی مل رہا ہوگا۔“ احسن نے بے تاثر لہجے میں صفیہ کو متوجہ کیا کہ فون اس وقت مصرف ہے۔

شہوار نے فوراً ریسورر کھ دیا تھا۔ ریسورر کچے ہی تھنٹی جی تھی۔

اس سے قبل کہ شہوار ریسورر اٹھاتی۔ احسن نے آگے بڑھ کر ریسورر اٹھالیا تھا۔

وہ اس کے اتنے قریب آکھڑا ہوا تھا کہ اس کی مخصوص خوشبو اس کے اطراف پھیل گئی تھی۔

ایک نفرت و کراہیت کا زہر تھا جو اس کی نرس میں اتر گیا تھا۔

جب کہ احسن اس بات سے قطعی بے خبر، بے نیاز نظر آ رہا تھا کہ وہ دور سے یا نزدیک۔

”آپریشن ہو چکا۔ جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں یہیں ہوں امی کے پاس ہوں خطرے سے باہر نہیں ہے۔ ادوہ۔۔۔ میں

ہا ہوں المودو میڈیکل سینٹر۔۔۔ آپ امی سے خرو بات کر لیجیے۔“ اس کے چہرے پر فکر مندی کا تاثر واضح تھا۔

صفیہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

”جی۔۔۔ میں صفیہ بول رہی ہوں۔“

دوسرے طرف انعام علی بتا رہے تھے کہ ڈیڈ بے بی کو جنم دینے کے بعد شکلیہ اس وقت موت وزیت کی کشش میں مبتلا

”آپ فوراً میری بچی کا صدقہ اتار دیں انعام علی!“ صفیہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔

”امی۔۔۔ اہت سے۔۔۔“ احسن نے ان کا شانہ تھپتھپایا۔

”میں احسن کے ساتھ آ رہی ہوں۔“ وہ بے قراری سے گویا ہوئیں۔

”ملنے نہیں دے رہے تو کیا ہوا۔ مجھے پل پل کی خبر تو رہے گی۔“

”امی۔۔۔ جب آپ شکلیہ سے مل ہی نہ سکیں گی تو پھر۔۔۔ جیسے ہی وہ ہوش میں آئی میں آپ کو خود آکر لے جاؤں۔ احسن نے تسلی دی۔

”آپ یہاں۔۔۔ دُعا کیجیے۔“ وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لے کر شہوار کے سامنے سے گزرتا ہوا باہر پٹا گیا۔

شہوار تو اسے دیکھ کر کڑوی ہورہی تھی۔

اپنی جان جلا رہی تھی۔

بچاؤ تباہ کھارہی تھی۔

مگر احسن کا رویہ اس طرح تھا جیسے وہ موجود ہی نہ ہو۔۔۔ سوائے ماں بیٹے اور نوکروں کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔

وہ اس کے دجود سے قطعی بے نیاز تھا۔

جب کہ شہوار کا جی چاہ رہا تھا کہ صفیہ احسن کو بے نقطہ سٹائیں۔۔۔ بُرا بھلا کہیں۔۔۔ اس کی شکل دیکھنے سے انکار لڑیں۔

مگر ان سب باتوں میں سے ایک بھی نہ ہوئی تھی۔ لہذا اس کا کلیئر ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔۔۔ وہ مسلسل انگاروں پر لوٹ جاتی تھی۔

وہ تو یہ ہوا کہ رمیصہ خالہ اور حفصہ خالہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ چلی آئیں اور صفیہ نے فوراً قرآن خوانی کا انتظام کیا۔

یہاں لاؤنج میں سب بیٹھ گئے۔ آدھ ایک گھنٹے بعد چھوٹی ممانی اور ماموں بھی چلے آئے۔ شکلیہ کے پُر شکوہ گھر کو واپسی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ یاد آتے ہی کہ جس کی شان و شوکت پر رشک کر رہے ہیں۔ جس کی نسبت سے وہ یہاں موجود

ہا وہ اس وقت موت و حیات کے امتحان میں مبتلا ہے۔

وہ سب خصوص و خشوع سے اس کی زندگی کے لیے دعاؤں میں مصروف ہو گئے۔

صفیہ سے یہ سب کچھ اور بے طلب محبت کرتے تھے۔

اس لیے کہ صفیہ نے اپنی دبی سے کبھی کسی کو اپنی مشکل میں نہیں کھینچا تھا۔ بڑی وضع داری اور خود داری سے اپنی مشکل کو نکالی، بھلا تھا۔

سب جانتے تھے کہ شیخ صاحب کی سگت میں زندگی گزارنا بجائے خود ایک مرحلہ ہے مگر صفیہ نے کبھی اپنے بہن بھائیوں سے کسی قسم کی اعانت نہیں چاہی تھی۔ خود داری کی انتہا تھی۔ اس لیے وہ ان کی نگاہوں میں بہت باوقار و معتد ار

تھا۔ ایک خاموش قسم کا عرب ان کی شخصیت سے جھانکتا محسوس ہوتا تھا۔۔۔ شاید اسی لیے ان سے اور ان کے بچوں سے بے پناہ محبت کی جاتی تھی۔ ان کے دکھ اور الم کو اپنے ہی دکھ کی طرح محسوس کیا جاتا تھا۔

خانساں دو پہر کے کھانے کے لیے صفیہ سے پوچھ رہا تھا۔



”میاں کیسا کھانا اور کہاں کا کھانا..... جودل چاہے پکا لو.....“ وہ سخت پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔

”خالہ..... اگر اچھا سا آئٹم ہو تو ہمارے لیے.....“

خاور..... شرارت سے منہ کو دیکھ رہے تھے۔

”یار! تم نے بھابی کی جان جلانے کا ٹینڈر منظور کرا لیا ہے..... دور رہتے ہو..... تو جلاتے ہو۔ پاس ہوتے ہو تو جا رہو۔“ اسد مسکرا دیے۔

”اور آتا کیا ہے انہیں.....“ وہ چمک رہی تھی۔

”اے..... لو.....! اتنا بڑا جہاز چلاتے ہیں..... اور کیا آئے گا.....؟“ خالہ نے تعجب سے منہ کو دیکھا۔

”جی تو لگے ہوتے ہیں جہاز کے آگے.....“ اسد نے ٹکرا لیا۔

خاور نے بے ساختہ ہتھکڑیاں لگایا تھا۔

”چھوڑیں انہیں..... یہ بتائیے اسلام آباد میں وقت کیسا گزرا..... شادی کسی رہی.....؟“ منہ نے بات کا زور ملا۔

”بہت انجوائے کیا۔“ اسد کو ساتھ ہی جیسے کچھ یاد آ گیا۔ مگر وہ خاموش رہے۔ انہیں ٹکلی کی بابت بات کرنا مناسب معلوم نہ ہوا۔

”آپ کی بھابی کسی ہیں.....؟“ منہ پوچھ رہی تھی۔

”بہت ٹائس..... بابر کو گفٹ کرنے کے لیے میں نے اہم تیار کی ہے۔ دکھاؤں گا۔ آپ کو۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہماری چھوٹی جان مطمئن اور خوش ہیں۔ بابر اسلام آباد میں تھا ہوتے تھے۔ وہ خاصی پریشان رہتی تھیں۔ کبھی پنڈی کبھی اسلام آباد میں دو حصوں میں شہر ہوئی تھیں۔ ویسے وہ بھابی کی والدہ کی اور بھابی کی تعریف کر رہی تھیں۔

دراصل ہماری چھوٹی جان بہت کراؤس سے گزری ہیں..... شاید اطمینان انہیں بہت انتظار کے بعد ملا ہے۔

”کس قسم کے کراؤس.....؟“ منہ پوری دلچسپی سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”پھر کبھی بتاؤں گا۔“ وہ خالہ کی طرف دیکھ کر بولے۔

”یہ کراؤس کیا ہوتا ہے.....؟“ خالہ کے اندر کھلبلی سی ہوئی..... کہ خدا معلوم ان سے کیا چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے۔

”یہ کاغذ سے بنتا ہے خالہ، خاصا بڑا ہوتا ہے۔“ خاور نے نہایت سنجیدگی سے انہیں سمجھایا۔ ”اس کے باوجود اس میں سے گزرنا مشکل ہوتا ہے۔“ وہ مزید گویا ہوئے۔

”نام کیا ہے آپ کی بھابی کا؟“ منہ نے دریافت کیا۔

”نائلہ.....!“

”آف! بہت پیارا نام ہے۔“ نائلہ، نام سن کر ایک بہت پیاری سی لڑکی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ ”منہ کے انداز میں حقیقی مسرت تھی۔“

”خالہ..... نوٹ کر لیں..... نام اگر نائلہ ہو تو بہت ہی اچھا ہے.....“ خاور نے جیسے خالہ کو ایک اور پوائنٹ نوٹ

ایک  
منہ نے غصے سے خاور کو کھڑا۔

”بھابی پلیز! اچھی سی چائے تو پلدائیے.....“ اسد نے فرمائش کی۔ ایک طرح سے سفید جینڈا لہرایا۔ منہ اٹھ گئی۔

”بھئی خاور میاں، تم دلہن کو اتنا نہ ستایا کرو۔“ خالہ نے خاور کو جیسے زیادتی کا احساس دلایا۔

”ابن اس مرتبہ آخری چکر ہے۔ پھر آپ کی دلہن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مطمئن کر دوں گا۔“

”پھر جا رہے ہو.....؟“ خالہ چونکیں۔

”ظاہر ہے۔ ہر کام کے اپنے اصول و قواعد ہوا کرتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ آپ ایک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ بیٹھ

ایک۔“

”کب تک جاؤ گے.....؟“ اسد نے خاور کی طرف دیکھا۔

”ابھی تو ہوں ایک ماہ تک۔“

منہ نہ جانے کس کام سے آئی تھی۔ ایک دم ٹھنک گئی۔

خاور نے ابھی تک اس کو اپنی روانگی کی تاریخ نہیں بتائی تھی۔

”بھتے تو آپ کہہ رہے تھے.....“ منہ چیخے ناراض ہو کر واپس پلٹ گئی۔

”تم نے بھابی کو نہیں بتایا تھا.....؟“ اسد نے جیسے خاور کی خبر لی۔

”ہاں! میں نے نہیں بتایا تھا کہ کل کی فکر میں وہ آج کی خوشی بھی تنوایدیں گی۔“

”ایک منٹ یار..... ذرا دیکھتا ہوں درجہ حرارت کیا ہے.....“ خاور مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھے تو منہ وہاں

نہیں تھی..... بیڈروم میں آئے تو وہاں نہیں تھی۔ یقیناً ہاتھ روم میں ہوگی۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ بری طرح رو رہی تھی۔

”کیا بات ہے یار..... تم ایک کو ایذا نہ عورت ہو۔ کیا تم میرے مسائل نہیں سمجھتیں۔“

”کو ایذا نہ عورت کیا انسان نہیں ہوتی۔“ وہ جھلا پڑی۔

خاور نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”ذمیرہ کیوں نہیں دیکھتیں کہ ہماری زندگی میں کتنا حسرت ہے۔ دور یوں دفتر توں کی اس آنکھ چھوٹی نے ہمیں پہلے سے

یاد دیا کہ دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔“

”آپ کے لیے ہو گا حسن..... اس لیے کہ آپ نے آج تک مطمئن اور پرسکون زندگی گزاری ہے۔ میں ازل سے

اُسو رہوں۔ عجیب تو ہات اور دوسوں میں گزری ہے میری زندگی۔“

میری زندگی میں تھی خوشی صرف آپ کے نام سے آئی ہے۔ وہ ہم سے اپنی دی ہوئی ایک ایک مراعت و سہولت

لکھ لے لیں۔ مگر آپ اب نہیں جائیں گے۔“ اس کے انداز میں انتہا اور قطعی پن تھا۔

”یا آخری بار ہے۔ میری زبان کا اعتبار کرو۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

”کہہ تو دیا نہیں..... مجھے کسی وعدے کا اعتبار نہیں۔“

”یار.....! اب اتنا بھی رسوا نہ کرو..... کم از کم میرے ”وعدے“ کی شان میں توبہ نہ لگاؤ۔ ایک وعدہ کیا تھا ناہ کر نہیں

لکھا.....؟“

”محض جیت لینے کی خوشی حاصل کرنے کا ایک بہانہ تھا یہ وعدہ..... آپ کو میرے دکھ کا احساس تک نہیں۔ آپ کی

آنا مطمئن ہو چکی۔ اب میں یہاں رہوں یا کہیں اور۔ آپ سے دور رہوں یا نزدیکی، آپ کی بلا سے۔“  
وہ بڑی طرح گڑبڑی ہوئی تھی۔

”یہ میری سخت توہین ہے..... مگر مجھے تمہارے جذبے کی شدت کا اندازہ ہے۔“ خاور کو جیسے اس کے خیالات سے دلی رنج ہوا تھا۔

”تم مجھے اس دیا لگی سے چاہتی ہو..... مجھے احساس ہے۔ لیکن ڈیر انسان اگر عملی نہ ہو تو وہ زندگی سے اپنا جائزہ وصول نہیں کر پاتا۔

تمہیں خواب کی دنیا سے باہر آ کر میری مضبوطی بننا چاہیے..... میں کہیں ہوں۔ صرف تمہارا ہوں۔ کیوں بے نیاز خدشات کو اپنے دل میں جگہ دیتی ہو.....؟“

”مگر وہ ہے..... اپنے اختیار کی بات تو نہیں ہیں ناں۔“ وہ بسوری۔

”میں بچپن سے آج تک تمہاری کا عذاب بہہ رہی ہوں۔ اب مجھے سے برداشت نہیں ہوتا۔“

”مجھے احساس ہے..... مگر میرا یقین کرو۔ یہ آخری دورہ ہے۔“ خاور نے اسے یقین دلایا۔

”بچ کہہ رہے ہیں.....؟ وعدہ کیجیے۔“ منزہ نے مصیبت سے ہاتھ پھیلا دیا۔

”وعدہ!“ خاور نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ویسا ہی پکا وعدہ جو شوہر کی گرم شاموں میں کبھی کیا تھا۔ منزہ مسکرا پڑی.....“ کہہ

”کہ یہ میرا..... آخری، آخری دورہ ہے۔“

”کہو تو اسد کی گواہی میں حلف اٹھا لوں.....؟ خاور نے شرارت سے اسے پھر چھیڑا۔

”ہوں.....“ ہوا بھی نہیں لگائے گا انہیں..... آپ کم ہیں تنگ کرنے کے لیے۔“

زہ کبھی ہوئی خاور سے پہلے باہر چلی گئی۔

ملکی سند تو شادی شدہ تھی۔ ظاہر ہے شادی سے فراغت پاتے ہی اپنے گھر روانہ ہو گئی تھی۔

لاس نے اپنی ساس کو اصرار کر کے روک لیا تھا۔

”تو یہ سوچ کر ہی وحشت آتی تھی کہ وہ اتنے بڑے گھر میں باہر مرتضیٰ کے ساتھ تنہا زندگی گزارے گی۔

لہذا کب تک انہیں روکتی رہتی۔ آخر ایک روز وہ وہ بھی چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد بے حد بولائی بولائی پھرتی رہی..... رات سر پر دیکھ کر تو اس کے حواس جواب دینے لگے

خواہ خواہ ادھر ادھر کام کے انداز میں خود کو مصروف سٹاہر کرتی رہی۔ یہاں تک باہر مرتضیٰ اس کی

تہنیت دیکھنے اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔

یہ لگتا بہت اچھی ہے۔“ وہ انہیں لاؤنج میں نظر آگئی..... انہیں سامنے دیکھ کر گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

”غور رکھیے۔“

ٹائیک میگزین اٹھا کر واپس چلے گئے۔

بل گھٹنے کی تاخیر کے بعد جب اس نے اپنے بیڈروم میں قدم رکھا..... تو وہ مطالعے میں مصروف تھے۔ انہوں نے

ادھر گھوس کیا۔

”تم سو گئی.....؟“

”جی.....“

انہوں نے پان کی پڑیا کھول رہے تھے۔ نالک کو نہ جانے کیوں عایت درجہ کراہیت کا احساس ہوا۔

”آپ اتنا گھٹیا نہ کہتے ہیں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

”جیسے آپ نے مجھے مجبوراً قبول کیا ہے۔“  
 ”اے خرفروہ سے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔“  
 آپ کی بات۔“

”نائلہ! میں نے آپ سے کوئی ایسی بات نہیں کی جو ریاضی کا مسئلہ محسوس ہو۔“  
 ”صاحب!۔۔۔“ نائلہ بستر کے کنارے سے اٹھ کر سامنے کرسی پر بیٹھی اور نہایت سنجیدگی ہے باہر مرتضیٰ کو مخاطب  
 ہمنوا الوقت دو انجان انسان ہیں۔۔۔۔۔ اس رشتے سے قبل میرا اور آپ کا کوئی تعلق یا رشتہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ اور پھر جن  
 میں میری آپ کے ساتھ شادی ہوئی ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئی آپ کے مطالبات محض جلد بازی کے سوا اور کچھ

لاہر ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی تعلقات میں مضبوطی آتی ہے۔۔۔۔۔ اور پھر میرے تو سب کچھ اب آپ ہی  
 مجھے ہر صورت اب آپ کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔  
 ”اپنی خوبصورت بات کہنے کے لیے آپ اتنے فاصلے پر جا بیٹھی ہیں۔“ باہر بے ساختہ مسکرا دیے۔  
 ہاتھ گوان کی نظروں کی پیش سے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔۔۔۔۔ ہفتے بھر میں بھی وہ پہلی ملاقات کے تاثر کے  
 ان کے سامنے آئی تھی۔  
 ”آپ می کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟“ نائلہ نے نگاہوں کے اثر سے بچنے کے لیے جلدی سے موضوع کا رخ  
 ”تو پھر آپ ادھر آئیں۔“  
 نائلہ ایک مجبور اور خوف کی کیفیت میں کرسی سے اٹھی تھی۔

ملیا اپنی بہنوں کے ساتھ ہاسٹل جا چکی تھیں۔۔۔۔۔ گھر ایک دم خالی سا محسوس ہونے لگا تھا۔  
 اسے تھائی سے عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی۔ اس لیے مغرب کی نماز اس نے باہر لان میں پڑھی تھی۔  
 دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ چونک کر اٹھ اٹھا اور یڈ سوز کی کار تیزی سے پورچ میں داخل ہوئی۔  
 لگا، بایست اور احساس زیاں نے اتنا طول کیا کہ دو قطرے تھیلیوں پر ٹپک پڑے۔  
 لاشعہ برادر کے بھی اتنا معزز، ہر خرد اور مطمئن ہے۔۔۔۔۔ اور میں بے تصور ہوتے ہوئے بھی در ماندہ ہوں اس کے  
 لئے بھی جتنا چاہتی ہوں اور یہ میرے سامنے ختم آکھڑا ہوتا ہے۔  
 اس نے خود ترسی کی کیفیت میں جانے نماز تہ کی اور سوچنے لگی اندر جائے یا نہیں۔ پھر اس نے طے کر لیا کہ جب تک  
 نہیں ہے وہ یہیں بیٹھی رہے گی۔  
 چہلوں کے بعد پٹھانی اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

”بلی، بیگم صبیہ کی امی کا کالا بیک آپ کدھر رکھا ہے؟ وہ اسپ تال میں منگا تا ہے۔“  
 ”کوہ! اس کی جان سلگ کر رہ گئی۔ اسن تلاش بھی کرتا تو وہ بیگ ڈھونڈ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بیگ شہزادہ کی  
 لگا کر رکھا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ پٹھانی سے شکلیہ کی وارڈ روم کھولنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

”جس وقت میں! اپنی سن میں پڑھا کرتا تھا اس وقت میری عمر اٹھارہ سال ہوگی۔ میں نے بڑا اعلیٰ قسم کا فٹنر کھانا  
 تھا۔۔۔۔۔ یہ پان تو نشہ چھڑانے کی آخری اسٹیج ہے۔ میں نے امی سے وعدہ کیا تھا۔“  
 شاید آپ کو پتا نہیں۔۔۔۔۔ میرے موجودہ والد میرے سوتیلے والد ہیں۔ میری والدہ کی یہ دوسری شادی ہے۔“  
 انہوں نے پہلی بات اوصوری چھوڑ کر نائلہ کو تازہ خبر ہم پہنچائی۔  
 نائلہ ایک حیرت کے عالم میں باہر مرتضیٰ کے چہرے کی سمت دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ شادی کے بعد پہلا موقع تھا کہ  
 نہایت گہری نگاہوں سے بغور ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر نران کے اصرار کے باوجود وہ اپنی نظروں کی جھلک اٹھا کر  
 دیتی تھی۔

دلہنایے کی چھب۔۔۔۔۔ خوبصورت رنگین لباس، چوڑیوں سے بھر کھائیاں اور نگاہوں میں الجھن اور تحیر۔  
 باہر مرتضیٰ گویا تسخیر ہو کر رہ گئے۔  
 ”مٹی ٹھیک کتنی تھیں۔“ حسن تو یہاں وہاں بے تماشا نکھر اہوا ہے کوئی کمی نہیں ہے۔ مگر اس لڑکی میں بے لک کر  
 والی کشش ہے۔۔۔۔۔ ایک سمجھ میں نہ آنے والا اسرار ہے۔“  
 ان کی آنکھوں کے تاثرات پل بھر میں بدل گئے۔ جذبوں کی لپک اتنی شدید تھی کہ نائلہ ہٹا کر رہ گئی۔  
 ”آپ بتا رہے تھے۔ کہ آپ کے والد گئے نہیں ہیں۔“ وہ جلدی سے نگاہیں پڑا کر پوچھنے لگی۔  
 ”ان باتوں کے لیے تو عمر بڑی ہے نائلہ!“ ان کی آواز نہ جانے کس نشے کے تحت بھاری ہو گئی۔  
 ”مگر مجھے ابھی بتائیے۔۔۔۔۔ ورنہ مجھے بے چینی رہے گی۔“ وہ ان کی بے ساختگی سے متحش دکھائی دینے لگی تھی۔  
 ”آپ اور ہم اب ہمیشہ کے لیے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔ بتا دیں گے۔ جلدی کیا ہے؟“ وہ مسکرائے۔ ان کے ارادوں  
 تبدیلی واضح تھی۔

”مگر مجھے جلدی ہے، آپ بتائیے ناں۔۔۔۔۔ مہر آئی۔“  
 ”مٹی نے آپ کو منع کیا ہے کہ آپ انہیں آئی نہیں بھی کہیں گی۔“ باہر مرتضیٰ نے ٹوک دیا۔  
 ”آہستہ آہستہ ہی عادت ہوگی۔“ وہ جلدی سے بولی۔  
 ”اچھا یہ بتائیے۔۔۔۔۔ آپ کوئی کیسی لگیں؟“ وہ جیسے اس کا مبرا آزار ہے تھے۔  
 ”بہت اچھی۔“ نائلہ کے سامنے تک سے درست ایک طرح داری عورت کا سراپا آ گیا۔  
 ”اور ہم۔۔۔۔۔؟“ باہر مرتضیٰ نے روانی سے اپنا ذکر بھی شامل کر دیا۔  
 نائلہ نے جیسے ہونٹ سی لیے اور ایک دم چپ ہو گئی۔  
 ”نائلہ ایک بات کہوں۔ آپ برا تو ضرور مانتیں گی۔ مگر۔۔۔۔۔“  
 نائلہ کا دل زور سے دھڑکا۔ ”اگلی خیر!“  
 ”جی کیے“ وہ ہنسنے لگی ہوئی۔  
 ”مجھے شعور کی گہرائی سے محسوس ہوتا ہے آپ اس شادی سے خوش نہیں ہیں۔“  
 نائلہ نے بری طرح گھبرا کر ان کی سمت دیکھا۔

”یہ درست ہے کہ عورت چاہے جانے اور مرد چاہنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ مگر فطری قوانین میں خاصی چلک  
 بہت سی باتیں ان میں خود بخود جذب ہو جاتی ہیں۔ یعنی مرد چاہتے چاہتے چاہے جانے کے لیے جتا ب جوتا

اپنی قسمت پر آنسو بہاتی وہ نہایت بے بسی کے عالم میں شکیلہ کے بیڈروم کی طرف بڑھی تھی۔ مگر رک گئی۔ احسن تھا۔

”مگل..... اندر جو صاحب بیٹھے ہیں، ان سے کہو، باہر آئیں، میں ان کی موجودگی میں اندر نہیں جا سکتی۔“  
یلے لہجے میں کہتی واپس پلٹ گئی۔  
تھوڑی دیر بعد پٹھانی واپس لاؤنج میں آگئی۔

”بی بی..... صاحب بولتا ہے..... جب میں آپ کے ہونے اور نہ ہونے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتا تو وہ میری کیوں کرتی ہیں؟“  
شہوار کے تو کھوٹوں سے لگی..... سر پر کھجی۔

”نہ پروا کرتی ہے میری جوتی۔“ وہ دہناتی ہوئی بیڈروم میں داخل ہو گئی اور ایک جھٹکے سے وارڈروب کا نچلا پٹ کھرا  
بیک نکالا اور بیڈ پر اچھال دیا۔ اور واپس اسی طوفانی رفتار سے لان میں آگئی اور لان چیئر پر گر گرنے کے انداز میں پیڑ  
دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”کس گناہ کی سزا ہے یہ.....؟“ اس کی سسکیاں ابھرنے لگی تھیں۔  
”بی بی..... لپ بٹال سے آپ کا فون ہے۔“ پٹھانی پھر اس کے سر پر کھڑی تھی۔  
”نہیں سن رہی میں فون دون..... کہہ دو نہیں ہوں میں یہاں..... مر گئی.....“ وہ میز پر بولی۔  
پٹھانی سہم کر لپٹے پاؤں اندر دوڑ گئی۔

”مرنے والوں سے کہہ دو زندہ ہو جائیں میں جا رہا ہوں۔ فون سن لیں۔“ اس نے پورچ میں سے احسن کی آواز  
اور پھر کھٹاک سے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ گویا وہ جا رہا تھا۔ گاڑی کے باہر نکلتے ہی وہ اندر چلی آئی تھی۔

رہیو ایک طرف بڑا ہوا تھا۔  
اس نے اٹھا کر آنکھیں سے کہا۔ ”ہیلو“  
دوسری جانب صفیہ تھیں۔

”شہوار..... بیٹے میں بول رہی ہوں تمہاری صفیہ خالہ.....!“  
”جی خالہ جان.....“ تمہاری آواز کو کیا ہوا.....؟ طبیعت تو ٹھیک ہے.....؟ وہ خاصی پریشان ہو گئیں۔  
”میرے سر میں درد ہے۔“ وہ پھر ناراض سے انداز میں گویا ہوئی۔

”تو سر درد کی کوئی گولی کھا لے..... اور آرام کرو۔ میں اس لیے فون کر رہی ہوں کہ میں آج یہیں ہوں۔ تم فکر نہ کرنا  
کھانا کرسو جانا۔ شکیلہ ہوش میں آگئی ہے اللہ کا شکر ہے اب حالت خطرے سے باہر ہے۔ انعام علی بھی دیر سے گھر پہنچا  
گے۔ تم گھبراؤ نہیں۔“  
”جی.....!“

”احسن چلا گیا.....؟“  
”آپ پھر صبح آئیں گی؟“ اس نے خالہ کا سوال نظر انداز کر کے خود سوال کر ڈالا۔  
”ہاں..... دیکھو..... تم پریشان نہ ہونا..... مجھے تمہاری فکر بہت ہے یہاں۔“  
”میں ٹھیک ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔“

اس نے رہیو کرئیل پر ڈال دیا اور آہستہ قدموں سے کچن میں چلی آئی۔  
”مجھے بھوک نہیں ہے..... آپ کے صاحب آئیں تو انہیں کھانے کے لیے پوچھ لیجیے گا..... میں اندر آرام کر رہی  
ہوں۔ کوئی بھی آئے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔“

اس وقت وہ سخت تھکی ہوئی تھی..... شدت سے تنہائی کی طلب ہو رہی تھی۔  
وہ شکیلہ کے بیڈروم میں چلی آئی۔ دروازہ بند نہیں کیا کہ مبادا انعام علی دروازہ بند دیکھ کر باہر ہی بیٹھ جائیں۔ یہ سوچ  
رکھہ سو رہی ہے۔

وہ ایک میگزین اٹھا کر بیڈ پر آگئی۔ سر ہانے لگے ہوئے ڈیک پر بچکیت اور چڑا کی کیسٹ لگا کر لیٹ گئی۔  
کمرے میں خوبصورت سی موسیقی بکھر گئی۔

آدمی آدمی کو کیا دے گا  
جو بھی دے گا وہی خدا دے گا  
میرا قاتل ہی میرا منصف ہے  
کیا میرے حق میں فیصلہ دے گا  
دو قطرے اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

زندگی کو قریب سے دیکھو  
اس کا چہرہ نہیں رلا دے گا  
ہم سے پوچھو دوستی کا صلہ  
دشمنوں کا بھی دل ہلا دے گا

آنسو تو اترے بہنے لگے..... اس کی کیفیت اس مسافر کی سی تھی جس کا سامان بھی گم ہو گیا ہو اور منزل بھی دور وہ حیران  
ایٹان کھڑا سوچ رہا ہو کہ کدھر جائے؟ آنسوؤں..... کی ترتیب ٹوٹ کر نہیں دے رہی تھی..... چڑا کی آواز میں ایک نئی  
الٹ شروع ہو چکی تھی۔ اس شعر پر وہ ایک لمحے کو چونک سی گئی۔ نہ جانے کیوں بہت اچھا لگا تھا۔

مجھ کو بے رنگ ہی مر نہ کر دیں کہیں رنگ اتنے  
بہر موسم، ہوا سُرخ، فضا نیلی ہے  
”ہونہ..... اب میری ذات میں رنگ کہاں۔ تقدیر کے سارے رنگ یکجا ہو کر مجھے سیاہ رنگ میں لپیٹ رہے  
ہیں۔“ آنسو پھر بہنے لگے۔

نہ جانے کب تک، مایوسی، ناامیدی، خود رسی کے جال میں الجھی رہی تھی کہ گھولا دروازہ ناک ہوا۔ اس نے چونک کر  
اٹھایا۔ انعام علی بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ اور یہ دیکھ کر اس کی روح تک زہر لی ہو گئی کہ ان سے دوا بچے پیچھے احسن بھی  
نہ تھا۔

اس نے جلدی سے منہ موڑا اور بیڈ سے اتر کر ان کی طرف سے رُخ موڑ کر دوپٹے سے جلدی جلدی چہرہ صاف  
کئے گئی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، شکیلہ اب خیریت سے ہیں۔“ انعام علی جانے کیا سمجھے۔  
”آف..... اللہ نے عزت رکھ لی تھی..... اس نے آگے بڑھ کر ڈیک خاموش کر دیا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس

کے اندر میں اتنی تیزی تھی کہ احسن فوراً ایک طرف ہو گیا۔ مخصوص خوشبو کی لپک اس کے تعاقب میں آئی تھی۔ احسن نے گھاس میں پانی اٹھ لیٹے ہوئے بڑی سنجیدگی سے انعام علی کو جواب دیا۔

”مگر ان کے مسائل تو اب آپ کی ذمہ داری ہیں۔“ انعام علی اب کچھ کھٹک گئے تھے۔ انہوں نے احسن کے تاثرات بھانپنے کے لیے جان بوجھ کر یہ جملہ کہا تھا۔

”میں اب ہر قسم کی ذمہ داری سے دست بردار ہو چکا ہوں۔۔۔۔۔ ان سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، بلکہ آپ یوں

کہیے۔ آئی ڈونٹ نو۔۔۔۔۔ ہواڑھی۔۔۔۔۔“

وہ بے رحم انداز میں کہہ کر کرسی دکیل کر کھڑا ہو گیا۔

انعام علی بھوکھا سے رہ گئے۔

شہوار تو جیسے پتھر کی ہو گئی اپنی اس توہین پر۔

”انعام بھائی۔۔۔۔۔ اگر یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں تو مجھے بھی نہیں پتا، یہ کون ہیں۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ انتہائی خود غرض، نفس پست اور تیسرے درجے کے انسان ہیں۔ مجھے تو ارے خوشی کے نیند نہیں آتی کہ اللہ نے مجھے اتنی جلد ایک غلط آدمی سے نجات دے دی۔۔۔۔۔ میں جتنا شکر کروں کم ہے۔“ وہ تیزی سے ہال سے باہر نکل گئی۔

انعام علی حیران و ششدر احسن کی شکل دیکھ رہے تھے بلکہ اس بھرپور حملے سے تو ایک لمحے کے لیے احسن بھی چکر مچا گیا تھا۔

”احسن۔۔۔۔۔“ انعام علی کا تحیر انتہا کو پہنچ رہا تھا۔

”یہ شہوار کیا کہہ گئی ہیں کہ اللہ نے مجھے اتنی جلدی نجات دے دی۔۔۔۔۔ آپ لوگ اتنے بڑے بڑے معاملات طے کر رہے ہیں۔ اور ہمیں کچھ خبر نہیں۔ میں آپ دونوں کے رویے سے الجھ ضرور رہا تھا مگر مجھے اس قدر انتہا کا اندازہ نہیں

تھا۔

جھگڑا ہو گیا ہے آپ دونوں میں۔۔۔۔۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے احسن سے مخاطب تھے۔

”ختم ہو گیا ہے اب ہر قسم کا جھگڑا“ احسن نے دونوں کا جواب دیا۔

انعام علی ان لوگوں میں سے تھے جو کسی کے ذاتی معاملات میں دخل در معقولات نہیں کرتے۔ مگر شکلیہ ان کی زندگی میں اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اور احسن شکلیہ کا حقیقی بھائی تھا۔

”خالہ جان کے علم میں ہے یہ سب کچھ۔۔۔۔۔“

”سارے جہان کے علم میں ہے۔۔۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں انعام علی بھائی۔۔۔۔۔ قصہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کوئی عجیب بات

ہوئی ہو۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی آواز بیڈر دم تک صاف پہنچ رہی ہے اسی لیے وہ خاصا اونچا بول رہا تھا۔

”میں بہت فیصلہ کن قسم کا انسان ہوں۔۔۔۔۔ دھوکے بازار گورج اتار کر بھی لے آئیں تو مجھے قبول نہیں۔ میں جس لڑکی سے آئندہ شادی کا ارادہ رکھتا ہوں وہ بہت فیر ہوگی۔۔۔۔۔“ انعام علی نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی۔

”ابھی تلاش جاری ہے؟“

”عظیم اور باوقار انسانوں کی یاد کے سہارے بھی زندگی بہت آرام سے گزر جاتی ہے۔ مگر دھوکے بازوں کو اپنے

کے اندر میں اتنی تیزی تھی کہ احسن فوراً ایک طرف ہو گیا۔ مخصوص خوشبو کی لپک اس کے تعاقب میں آئی تھی۔ احسن نے گھاس میں پانی اٹھ لیٹے ہوئے بڑی سنجیدگی سے انعام علی کو جواب دیا۔

”مگر ان کے مسائل تو اب آپ کی ذمہ داری ہیں۔“ انعام علی اب کچھ کھٹک گئے تھے۔ انہوں نے احسن کے تاثرات بھانپنے کے لیے جان بوجھ کر یہ جملہ کہا تھا۔

”میں اب ہر قسم کی ذمہ داری سے دست بردار ہو چکا ہوں۔۔۔۔۔ ان سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، بلکہ آپ یوں

کہیے۔ آئی ڈونٹ نو۔۔۔۔۔ ہواڑھی۔۔۔۔۔“

وہ بے رحم انداز میں کہہ کر کرسی دکیل کر کھڑا ہو گیا۔

انعام علی بھوکھا سے رہ گئے۔

شہوار تو جیسے پتھر کی ہو گئی اپنی اس توہین پر۔

”انعام بھائی۔۔۔۔۔ اگر یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں تو مجھے بھی نہیں پتا، یہ کون ہیں۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ انتہائی خود

غرض، نفس پست اور تیسرے درجے کے انسان ہیں۔ مجھے تو ارے خوشی کے نیند نہیں آتی کہ اللہ نے مجھے اتنی جلد ایک غلط

آدمی سے نجات دے دی۔۔۔۔۔ میں جتنا شکر کروں کم ہے۔“ وہ تیزی سے ہال سے باہر نکل گئی۔

انعام علی حیران و ششدر احسن کی شکل دیکھ رہے تھے بلکہ اس بھرپور حملے سے تو ایک لمحے کے لیے احسن بھی چکر مچا گیا تھا۔

”احسن۔۔۔۔۔“ انعام علی کا تحیر انتہا کو پہنچ رہا تھا۔

”یہ شہوار کیا کہہ گئی ہیں کہ اللہ نے مجھے اتنی جلدی نجات دے دی۔۔۔۔۔ آپ لوگ اتنے بڑے بڑے معاملات طے

کر رہے ہیں۔ اور ہمیں کچھ خبر نہیں۔ میں آپ دونوں کے رویے سے الجھ ضرور رہا تھا مگر مجھے اس قدر انتہا کا اندازہ نہیں

تھا۔

جھگڑا ہو گیا ہے آپ دونوں میں۔۔۔۔۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے احسن سے مخاطب تھے۔

”ختم ہو گیا ہے اب ہر قسم کا جھگڑا“ احسن نے دونوں کا جواب دیا۔

انعام علی ان لوگوں میں سے تھے جو کسی کے ذاتی معاملات میں دخل در معقولات نہیں کرتے۔ مگر شکلیہ ان کی زندگی میں اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اور احسن شکلیہ کا حقیقی بھائی تھا۔

”خالہ جان کے علم میں ہے یہ سب کچھ۔۔۔۔۔“

”سارے جہان کے علم میں ہے۔۔۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں انعام علی بھائی۔۔۔۔۔ قصہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کوئی عجیب بات

ہوئی ہو۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی آواز بیڈر دم تک صاف پہنچ رہی ہے اسی لیے وہ خاصا اونچا بول رہا تھا۔

”میں بہت فیصلہ کن قسم کا انسان ہوں۔۔۔۔۔ دھوکے بازار گورج اتار کر بھی لے آئیں تو مجھے قبول نہیں۔ میں جس لڑکی سے آئندہ شادی کا ارادہ رکھتا ہوں وہ بہت فیر ہوگی۔۔۔۔۔“ انعام علی نے تعجب سے اس کی شکل دیکھی۔

”ابھی تلاش جاری ہے؟“

”عظیم اور باوقار انسانوں کی یاد کے سہارے بھی زندگی بہت آرام سے گزر جاتی ہے۔ مگر دھوکے بازوں کو اپنے



حافظے میں جگہ دینا اور ان کی زیادتیوں کو یاد کر کے کڑھنا اور حقیقت اپنی ذات کی توہین کرتا ہے۔

”بہترین انتقام یہ ہے کہ آپ انہیں بھول کر بھی یاد نہ کریں۔“

انعام علی..... جو خود بھی ریگستان سے گزرنے والے کسی قافلے کے مسافر تھے۔ وہ اس امر پر سناکت سے بیٹھ کر اُسے کہ ان کے منہ مقابل کوئی ان سے زیادہ تھکا ہارا اور پیاسا تھا..... ان پر جیسے دردِ مشترک نازل ہوئے لگا۔

”انتقامی انداز مناسب نہیں ہے احسن، آپس میں اختلاف ہونا بڑی فطری سی بات ہے، اس کا مطلب یہ نہیں۔“

”جس خاتون کو شادی کے بعد بھی شوہر سے زیادہ دوسرے رشتے مقدم ہوں تو مطلب ہے کہ شوہر کے ہونے یا نہ ہونے سے اس کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو پھر میں اسے اپنے ساتھ کیوں نہ رکھوں جسے میرے نہ ہونے سے بہت فرق پڑتا ہو۔“

”تو گویا..... دوسرا انتخاب بھی موجود ہے؟“ انعام علی کو خود سے زیادہ عجلت پسند ملا تھا۔ خاصے استعجاب سے پوچھ رہے تھے۔

”جو انسان دور و دروٹی کمانے کی صلاحیت اور سر چھپانے کا ٹھکانا رکھتا ہو، اسے کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں۔“ وہ انتہائی اعتماد سے کہہ رہی تھی۔

”رشتہ اس وقت تک ہوتا ہے جب کوئی آپ کے احساسات میں دوڑتا بھاگتا محسوس ہو۔ جب کوئی تصور اور توقع ہی نہیں تو رشتے داری کیا معنی؟“ وہ رکھائی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ خاصے جلد باز ہیں احسن.....“ انعام علی سے شاید ان دونوں کی مفارقت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”میں اس جلد بازی پر مطمئن ہوں۔ کوئی سمجھتا تو انہیں ہے۔“ نہایت اطمینان سے کہا گیا۔ شوہر حق دق بیٹھی سب سن رہی تھی مگر یہ سب سن کر تو اسے اپنے لٹ جانے کا نئے سرے سے ملال ہوا تھا۔

”ایک خیر خواہ کی حیثیت سے میں آپ کو کسی عجلت بھرے فیصلے پر عمل درآمد نہیں کرنے دوں گا۔ آپ شوہر کو بہت غلام سمجھ رہے ہیں وہ بہت متوازن اور سلجھی ہوئی ہیں۔ میاں بیوی کے درمیان اختلافات اتنی جلدی فیصلہ کن صورت اختیار نہیں کیا کرتے۔“

”چھوڑیں اس قصے کو۔“ احسن نے انعام علی کی بات کا ٹ دی۔ ”جب کتاب ہی بند کر دی، اب اس کے باب نے سرسے کیا پڑھنا۔ اب یہ کتاب ہمارے ذوق کی نہیں رہی۔“

انعام علی..... نہایت خاموشی سے اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلے آئے۔

شوہر انہیں دیکھ کر بیڈروم سے ابھی اور زبردستی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ کھانا کھائیں شوہر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ محل سے گویا ہوئے۔ شوہر کی آنکھیں بھرتیں مگر وہ خاموش رہی۔

”آپ کھانا کھالیں۔“

”مجھے بھوک نہیں بھائی صاحب!“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”اس عمل سے سراسر نقصان آپ کا ہے۔ آپ کے اپنے ساتھ زیادتی ہے۔“

”میرا تو اس قدر نقصان ہو گیا ہے کہ کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا۔“ وہ بکھری گئی۔

یہ پابوسی ہے..... بری بات..... ٹھیکہ گھر آ جائیں تو انشاء اللہ کوئی نہ کوئی حل ہم ضرور نکالیں گے۔ ہم انتہائی پہل کر ٹوٹے نہیں دیں گے۔“

پہلی ”ٹوٹ چکا ہے۔“ وہ جھٹکے سے ابھی اور تیزی سے باہر آ گئی۔ بلکہ لاؤنج سے بھی تیزی سے گزر گئی اور لان میں لپ۔

اپنی بے چارگی پر وہ پھوٹ کر رو دنا چاہتی تھی۔

لان میں صرف ایک لائٹ آن تھی۔ ہر سو ایک ملگ جاسا اُجالا تھا..... وہ لان چپڑ پر ٹانگیں اٹھا کر بیٹھ گئی تھی اور گشتوں دے کر آنسو بہائے جا رہی تھی۔

دور و گسار کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

وہ ہونٹ بے وقوفی کی..... کس پتھر کو ہیرا سمجھ بیٹھی تھی..... اسے نہ جانے کون سے ملال کھائے جا رہے تھے۔

”انتقامی سائن انسان..... میں نے اس کے نام پر رسوائیاں خریدی ہیں۔ تھ ہے میری زندگی پر۔“

اب وہ دور و دور کر خود پر لعنت ملامت کر رہی تھی۔

”جس نے آنا فنا دوسرا انتخاب بھی کر لیا ہے۔ ایک نفس پرست اور عیاش آدمی..... بے ضمیر اور بے حس.....“ وہ ابھی تھی۔

ساتھ ساتھ دوپٹے سے آنکھ، ناک بھی پونچھ رہی تھی..... معاً اس کی حسِ شامہ نے سگریٹ کی مہک محسوس کی۔ وہ اگر چوک گئی۔

اور آنکھوں کے سامنے جیسے ستارے تاج گئے۔

وہ عین فٹ کے فاصلے پر نہایت اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اُڑا رہا تھا۔ اس نے اپنی دھن میں ادھر ادھر دیکھا پس تھا۔ اس کے بیٹھنے کے سائل سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خاصی دیر سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

وہ بڑی بے خبری اور تیزی میں سے لان میں آئی تھی اس لیے اس پاس کے ماحول کا اسے ہوش نہیں تھا۔ نہ جانے کیا ہوا ابھی تھی۔

کہیں کسی لفظ نے اس کی کمزوری ثابت نہ کر دی ہو.....؟ ایک نفرت آمیز خند شہ اسے لاحق ہوا۔ وجود جیسے پتھر کا ہو جیوش بھی محال محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے آہستگی سے پاؤں نیچے کیے..... اور بد شکل کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور سامنے دیکھے بغیر اندر کی سمت ابھڑا دیے۔

میاں کے لیے نہایت خوش لمن تبدیلی تھی کمی نے اسے ایک دُوروز کے لیے پنڈی بلایا تھا۔

ایک بے نام سا خوف جو اسے لاحق تھا توڑی دیر کے لیے ہوا ہو گیا تھا۔

اس نے بہت ذوق و شوق سے تیاری کی تھی کیونکہ کمی نے اسے فون پر بتایا تھا کہ وہاں ان کی دوست ان کی بہو اور بیٹے ہزاروں فیاضیت کا اہتمام کر رہی ہیں۔

اس نے پنگ ساڑھی کا انتخاب فیاضت کے لیے بطور خاص کیا۔ اس کے جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے باہر مرتضیٰ نے اٹھا۔

”ہم سے اچھی تو گویا ہماری ہی ہیں جو آپ اس قدر ”پردہ نشین“ اور پر جوش نظر آنے لگی ہیں۔“  
 نائلہ نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

”نائلہ..... آپ کی سے دوسری شادی سے متعلق کوئی بات نہیں کہنے کا۔“

”آپ نے مجھے پوری بات بتائی کب ہے جو میں ان سے ذکر کروں گی۔“ وہ خاصی سرد مہری سے بولی۔  
 ”پھر بھی جتنی بتائی ہے۔“

”اور ہاں۔ میرے نشتے سے متعلق بھی ان سے کوئی بات نہ کرنا۔“

”آپ لکھ کر دے دیجیے۔ مجھے ان سے کیا بات کرنا ہے اور کیا نہیں۔“ وہ جیسے اکٹا کر کہہ بیٹھی تھی اور ہنوز اپنے  
 میں مصروف تھی۔

”شاید اسے پتا ہے کہ جس دم یہ نظر اٹھا کر دیکھتی ہے، نہال کر دیتی ہے۔ اسی لیے شاید اتنا ترسنا سا نظر میں آ  
 ہے۔“

”اچھا لکھ کر بھی دے دیں گے۔ فی الحال یہ وہ ہدایات تو یاد رکھیں۔“

انہوں نے علی الصبح چنڑی روانہ ہونا تھا۔ اسے تیاری کا خوب بہانہ مل گیا تھا۔ یہاں وہاں خواہ مخواہ آنا جانا کا  
 تھا۔

باہر مرتضیٰ نے بیڈروم کی فضا سگریٹ کے دھوئیں سے تکلیف کر رکھی تھی۔ اس کا دم الٹ رہا تھا۔ اس نے باہر جا  
 سے پہلے دھڑکتے دل سے اجازت حاصل کرنا ضروری سمجھا۔

”اے۔ سی کی کوننگ سے آج کل مجھے نقصان ہو رہا ہے۔ سارا دن چھینکیں بند نہیں ہوتیں۔ دوسرے آپ نے ک  
 میں دھواں اس قدر کر رکھا ہے کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

”اس دھوئیں کی ذمہ دار تو آپ ہیں۔ آپ کی فراغت کے انتظار میں مجھے اس قدر افسوس لگ کرنا پڑی۔ آپ مجھے  
 دھوئیں میں تنہا چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہیں۔“

نائلہ نے بے بسی کی انتہا محسوس کرتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ اور ٹائٹ بلب جلا کر اپنے ”مقام“ پر آگئی۔  
 نہ جانے زندگی کے احساس سے دور کتنا وقت گزرا ہو گا۔ کہ وہ وحشت زدہ سی باہر آئی تھی۔

باہر مرتضیٰ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔  
 وہ ٹیرس پر آکر اپنی تقدیر پر آنسو بہانے لگی تھی کہ کال بیل کی رنگ ہوئی۔ رورو رو کر اس کی آنکھیں اور ناک سرخ آنا  
 ہو چکی تھیں۔

لازم سو نے نہت پر جا چکا تھا۔ باہر مرتضیٰ نے خبر تھے۔ ناچار اسی کو گیت پر پہنچا تھا۔  
 ”جی۔؟ کون ہے۔؟“ نائلہ کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے بھاری ہو رہی تھی۔

”میں..... ہوں اسد..... کراچی سے نازل ہوا ہوں۔“

نائلہ نے جلدی سے گیت کو لاک سے آزاد کر کے پٹ وا کر دیا۔  
 گیت لائٹ کی مدھم روشنی اور نیون سائن سے جگمگاتی نیم پائٹ کی روشنی بھی ایک دوسرے کے تاثرات کو بچا  
 کے لیے ناکافی تھی۔

”السلام علیکم.....“ مرنئی سفاری سوٹ میں ملبوس اسد نے بہت خوشگوار تاثرات کے ساتھ سلام کیا۔

”علیکم السلام۔“ وہ قدرے جھک کر گیت بند کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔

”ہاں سو گئے کیا.....؟“  
 ”جی..... نائلہ نے انحصار سے جواب دیا۔

”آپ جاگ رہی تھیں.....؟“  
 ”جی.....! وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

”کیوں.....؟“ انہوں نے یونہی پوچھا۔  
 نائلہ کا دل بھر آیا۔ اس نے بمشکل اشک سنبھالے۔

”میں دن میں سو گئی تھی..... شاید اس لیے نیند نہیں آرہی.....“ وہ نظریں نہکا کر کہہ رہی تھی۔  
 ”آپ نے مجھ سے ہی نہیں پوچھا۔ میں اتنی رات کو اچانک بغیر اطلاع کے کیوں آپ کو پریشان کرنے چلا

.....؟“ اسد نے ڈرائیگ روم میں پہنچ کر اپنا بریف کیس ایک صوفے پر ڈالتے ہوئے نائلہ سے سوال کیا۔  
 ”آپ کا اپنا گھر ہے اسد بھائی.....! مجھے اس قسم کے بے تکے سوال زیب نہیں دیتے۔“ وہ زبردستی چہرے پر

نکراہت لاتے ہوئے گویا ہوئی۔  
 ”صبح یہاں بہت اہم ملاقات کرنا ہے اور پلین میں سیٹ ہی ایسے ملی کہ آپ کو ناوقت ڈسٹرب کیا۔“

”آپ ایسا نہیں سوچیں..... ڈسٹرب ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ کی آمد تو خوشی کی بات ہے۔“ وہ  
 ہاتھ ملا کر میزبان کا کردار ادا کرنے لگی۔

”آپ کو ایک تکلیف مزید کرنا ہوگی۔“  
 ”حکم کیجیے.....“ وہ ان سے متواتر نظریں پڑا رہی تھی۔

”پلین میں جو کچھ بتایا گیا، وہ مجھے بھایا نہیں..... بھوک سخت لگ رہی ہے۔“  
 ”آپ پہنچ کیجیے..... میں پانچ منٹ میں کھانا لگاتی ہوں۔“ نائلہ کو جیسے ان کے پاس سے ملنے کا بہانا مل گیا

تھا۔ ”آپ پلیز ڈائیننگ ہال میں آجائیے۔“  
 اس نے جلدی سے فریزر سے کباب نکال کر تھلا شروع کیے۔ تو اچھا کر جلدی جلدی بیڑے بنانے لگی..... کتنا ہوا

کیموافرنج میں موجود تھا۔ اس نے جلدی جلدی ایک ٹھانڈا ٹھنڈا کٹ کر اس میں شامل کر لیا۔ پالک گوشت بھی موجود تھا۔ وہ  
 بھی گرم کرنے کے لیے برز پر رکھ دیا۔ ہاتھوں میں گویا بجلی سی بھر گئی تھی..... اس ہپڑ دھپڑ میں وہ کچھ دیر پہلے کی اپنی اذیت

لڑاوش کر بیٹھی تھی۔  
 ”معاف کیجیے گا۔ اندر آ سکتا ہوں۔“ اسد کچن کے دروازے میں کھڑے تھے۔

”تشریف لائیے۔“ وہ سادگی سے مسکرا کر گویا ہوئی۔  
 ”میں نے سوچا..... ایک تو آپ کو اتنی رات گئے ڈسٹرب کیا۔ پھر آپ کو ڈائیننگ ہال کا مارچ پاسٹ کرایا جائے اچھا

نہیں لگا، سوچا یہیں کھانا کھالیا جائے۔“  
 وہ کچن میں موجود کرسیوں والی ڈائیننگ ٹیبل کے مقابل آ بیٹھے۔

”خیال کرنے کا شکر ہے..... ویسے اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے اور آپ ہمارے ہیں۔“ نائلہ  
 نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ اور جلدی جلدی کھانا ٹیبل پر پہنچانے لگی۔ اسد بغور اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔

مدنور بابر کے اسٹائل ملاحظہ کر رہے تھے۔ وہ ان میں کوئی نئی سی بات محسوس کر رہے تھے۔ مگر کچھ نہیں پارہے تھے کہ  
ات ہے کیا۔

ڈرنک تو نہیں کیے ہوئے تھے کہ حالت ذوالاؤدل محسوس ہوتی۔ پبلک سے نشے نے محض ان کی آنکھیں سرخ کر دی  
پھر تھوڑی سی غائب دماغ لائق ہو گئی تھی جسے اسد کچی نیند سے بیداری پر محمول کر رہے تھے۔

تم سو جاؤ بابر..... بلکہ بھابی آپ بھی.....

ارے نہیں۔ آپ ٹھیک سے کھانا کھائیں..... میں آپ کا کرہ دیکھتی ہوں۔ بابر صاحب! آپ چلیے..... میں  
ہوں۔ وہ بہت آہستہ آواز میں بابر سے مخاطب ہوئی۔

ارے بھابی..... آپ بابر کے ساتھ ”صاحب“ لگاتی ہیں۔ جیسے آپ بابر کی بیگم نہ ہوں بلکہ کوئی گھوٹا۔ اسد  
بڑل۔

اور بھی بہت سی غیریت کی باتیں ہیں۔ بابر..... تم ہی ان کے کچھ فائض درست کرو۔ بابر مرتضیٰ جاتے جاتے  
مد صرف مسکرا دیے..... نائلہ چیزیں سینے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس نے بابر کی بات کی گہرائی محسوس نہیں کی۔

آج نائلہ بہت بیدار ہو گئی تھی۔ غسل سے فارغ ہو کر نماز و تلاوت میں مصروف ہو گئی تھی کہ اس نے اسد کو سر پر  
لی بجائے مسجد سے واپس آتے دیکھا..... تو اس کے دل میں ان کی شخصیت کا نقش مزید گہرا ہوا۔

اں کے دل میں خواہش بیدار ہو کہ کاش بابر بھی امور کے ساتھ ساتھ اپنے ”اصل“ سے بھی والہانہ نظر آئیں۔  
ان کو بھی وہ گلابی کپڑوں اور آسمانی چادر میں لپٹی نہایت متاثر کن لگی۔ درحقیقت انہوں نے بابر مرتضیٰ کی ”لنگ“ پر  
لیا..... اتنی خوش اطوار، باضابطہ، دین و دنیا سے ہم آہنگ لڑکیاں آج کل کہاں نظر آتی ہیں؟

لنگر سٹری لڑکیاں دیکھ کر ان کا پختہ شعور اذیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ وہ منزہ کی بے پناہ عزت کرتے تھے تو محض  
کے نہایت متوازن، سنجیدہ اور باشعور تھی..... اور اب نائلہ کا مقام بھی ان کی نگاہ میں بہت بلند ہو رہا تھا۔ وگرنہ جو  
لنگر مود کرتے تھے..... وہاں اس قدر سٹری پن اور تصنع پایا جاتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے بیچ وحشت محسوس کرتے تھے۔  
نوت پرست اور عیش کوش لوگوں کی سوسائٹی..... ورلڈ ٹور داستانیں، نئے فیشن، نئی عمارت، نئی گاڑی..... اس کے  
ہر کی چمکتی دکتی باتیں۔ ”ڈرائیونگ روم“ میں پیم پیٹی، دنیا کی تیار کی فیشن اسٹیل ”آہ“.....

خود کا تعلق بھی اسی سوسائٹی سے تھا مگر وہ ایک گہری، حساس اور حقیقت پسند عورت کی پرداخت کا نتیجہ تھی..... اسی  
”عمومی ماحول“ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا تھا۔ نائلہ کے بارے میں انہیں پتا چل چکا تھا کہ وہ منڈل کلاس سے تعلق رکھتی  
اں کا رکھ رکھاؤ، اعتماد اور بے نیازی..... اسے بے پناہ امتیاز بخشی تھی۔

لنگے تلکے اچالے میں اں پر یہ انکشاف ہوا۔

رنگین کڑوں عورتوں سے ملتا ہے۔

گھر عورت کی عزت نہیں کرتا۔

گلت میں کچھ بنیادی اوصاف ضروری ہوتے ہیں جس کی بنیاد پر اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

چمکے نائلہ بابر مرتضیٰ..... دل خود بخود احترام کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔

نائلہ تلاو، جے کے دوران گاہے گاہے نظر اٹھا کر لائن میں چلتے ہوئے اسد کو دیکھ رہی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر صفحے پر نشان

پنک کاشن کی ٹانگی پر سفید چکن کڑھائی کی چادر لپیٹے وہ خاصی منفردی لگ رہی تھی۔

”ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ کی طبیعت خراب ہے خدا نخواستہ.....“

نائلہ نے چونک کر اسد کی سمت دیکھا..... ”نہیں تو..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ قدرے مسکرا کر کرسی پر

”آپ کی آنکھیں سو جی ہوئیں اور چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔“ اسد براہ راست دیکھ رہے تھے۔

”ارے نہیں..... محض وہم ہے آپ کا۔“ اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔

”تو پھر آپ رو رہی نہیں۔“ اسد نے حتمی انداز میں کہا۔

نائلہ کو کچھ دیر پہلے کی افتاد یاد آگئی۔ اس کا دل بھر آیا۔

”ارے نہیں..... کوئی خاص بات نہیں..... بس شام سے کچھ ٹھیر چر ہے۔“

”تو آپ نے دوالی؟“ اور یہ آپ کے گال پر نشان کیسا ہے؟“ وہ چونک پڑے۔

نائلہ نے بے ساختہ اپنا ہاتھ رخسار پر رکھا لیا۔

”یہ پمیل چھوٹ گیا تھا..... شاید.....“ (توبہ..... موصوف کی آنکھیں ہیں یا سرچ لائینس؟) وہ جھلکی سی گئی۔

”بھابی..... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آپ دو امور وریں۔“

”جی..... سونے سے پہلے لے لوں گی۔“ وہ جیسے جان چھڑاتے ہوئے گویا ہوئی۔

”کھانے کے بعد آپ کیا پینا پیسند کریں گے، چائے یا کافی؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں..... شکریہ۔“

”کیا بابر جلدی سو گئے تھے؟“

”وہ تو روزانہ اسی وقت سو تے ہیں۔“

”آپ جاگ رہی نہیں یا کال بیل نے جگا دیا؟“

”میں جاگ رہی تھی.....“ وہ آہستگی سے کہہ رہی تھی۔

”نائلہ..... نیلی ڈارلنگ.....“ معاً بابر مرتضیٰ کی لہرائی ہوئی آواز بچن میں سنائی دی۔ اس سے قبل کہ نائلہ بابر مرتضیٰ

بابر مرتضیٰ اندر تھے۔

”زندگی..... آوازیں دے دے کر میرا ساؤنڈ بکس بیٹڑ ہو گیا۔ آپ کو رات بارہ بجے بھی بچن سے فرصت نہیں۔ آپ

کو اچھی طرح پتا ہے کہ ہم آپ کے بغیر۔“

نائلہ نے لپک کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بے حد غلیبی دکھائی دے رہی تھی۔

”اسد بھائی آئے ہوئے ہیں.....“ وہ شرمندہ سے انداز میں گویا ہوئی۔

”کہاں ہیں؟“ بابر نے سرخ آنکھیں اٹھا کر نائلہ کی سمت دیکھا۔

”وہ..... کھانا کھا رہے ہیں.....“ وہ چوری چوری کہتی تھی۔

”اسلام علیکم بابر صاحب.....“ اسد کھڑے ہو گئے تھے۔

”یار..... تم نے محض ڈنر کے لیے اتنی تکلیف اٹھائی؟“ بابر نے اپنی دانست میں مذاق کیا۔

”دراصل..... صبح چنڈی کی روانگی ہے، اس لیے میں جانتا تھا کہ یہ جلد سو جائیں..... ان کو کمرے سے غائب پانا تو

کافی دیر انتظار کیا.....“ بھی ہمارے تو فرشتوں کو خبر نہیں کہ یہ یہاں آپ کی مہمان داری میں مصروف ہیں۔

لگا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اسد بھائی..... آپ صبح کو چائے تو ضرور لیتے ہوں گے..... دیر تو نہیں ہوگئی.....؟“

”آپ اپنا کام جاری رکھیے بھابی..... جب فارغ ہوں چائے دے دیجیے گا۔“ اسد نے روادار مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

مگر نائلہ بچن کی سمت بڑھ گئی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر اسد تو اپنے کام سے چلے گئے تھے..... اور باہر کو کہہ گئے تھے کہ وہ پنڈی سے ہوتے ہو کر اچھی واپس جائیں گے..... یعنی اسی طرح آئی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

نائلہ اور بابر دن کے بارہ بجے پنڈی پہنچے تھے۔

مہر افروز انہیں دیکھ کر پھولی نہیں ساری تھیں۔ کھانے پر بھی خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ان کے شوہر یعنی بابر کے والد بھی گھر پر موجود تھے۔

نائلہ نے بطور خاص بابر اور ان کے بائیں تعلقات کا گہرا جائزہ لیا تھا..... اس نے محسوس کیا..... بابر کے والد کا نہایت متفنن اور دوستانہ ہے۔ اس کے برخلاف بابر کا انداز بے حد لادیا یا سادہ تھا۔

”آج شام کو آپ دونوں اپنی خالہ کے ہاں کھانے پر مدعو ہیں۔“ مہر افروز نے اطلاع دی۔ ”گزیلا (بیٹی) اپنے بچوں کے ساتھ وہیں پہنچ جائے گی۔“

”نائلہ! تم اچھی طرح ڈریس اپ ہونا۔ بالوں کا خوبصورت سا اسٹائل بنانا۔ کیونکہ ادھر تمہارے علاوہ بھی دروازہ موجود ہوں گی۔“

”بابر..... ایسا کیجیے..... کہ شام پانچ بجے کے قریب آپ نائلہ کو ”شائزر (SHINER)“ لے جائیے گا..... آپ وہاں اچھا سا پارٹی میک اپ کرایے گا..... آج دعوت میں دلہنوں کا پیشین ہے۔

خیر یہ تو مذاق کی بات ہے۔ دراصل..... بابر میرا انکوتا بیٹا ہے..... میں اس کی دلہن کو ہر وقت چمکتا دمکتا دیکھنا چاہوں۔ خوبصورت، فریٹش اور خوش باش۔“ (ابا اچھی عورت یہ ڈراما کرتے ہوئے اچھی تو نہیں لگتی) نائلہ نے دکھ سے کہا۔

کیا یہ اپنے بیٹے کے عیوب و نقائص سے واقف نہیں.....؟

کیا اس نے مجھے قربان گاہ پر چڑھا..... کے لیے منتخب کیا ہے.....؟

خومرہ اور نفسیاتی مریض..... بننا..... کیا اس طرح دار عورت کو پتا ہے کہ یہ کسی بے گناہ کو کس عذاب گھیت لائی ہے.....؟

میں ہر روز اذیت کے کس ٹیلے..... طے سے گزرتی ہوں.....؟

وہ نہایت بدگمان تھی..... مہر افروز اس سے بات چیت کر رہی تھیں مگر وہ ان سے حد درجہ تکلف سے پیش آرہی تھی۔ شام کو بابر اسے ”شائزر“ (SHINER) لے آئے تھے اور یہ کہہ کر واپس چلے گئے تھے کہ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد پا

لیں گے۔

نفوش دکش ہوں اور چہرہ پہلے ہی پُرکشش ہو تو یونیشن بھی انتہائی پُر جوش ہو جاتی ہے۔ بہت گرم جوش سے اسے کہا گیا۔

مگر اس کے پیچھے پڑی تو تقریباً سات بجے پیچھا بھوننا..... خوبصورت گجرا بالوں میں انکائی ہوئی یونیشن کے تھی اس کا آئینہ تھے۔

اب ایک وقت پر اسے لینے آگئے تھے۔

نائلہ ان کی گرم نگاہوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ کچھ بھی تھے بہر حال اس کے شوہر تھے۔ جیسا ہی نہیں اور نظریں جھک کر رہ گئی تھیں۔

”ہٹ اے منٹ نیلی.....“ وہ سامنے شاپ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے گویا ہوئے اور دوکان میں داخل ہو گئے بی گاڑی سے بیک کر کھڑی ہو گئی۔

”تعلیمات.....“

اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ یہ آواز ہزاروں میں پہچان سکتی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔ وہ کیا بولتی اس بلیک سلیک کا بھی رشتہ نہیں تھا۔

”ماشاء اللہ بہت پُر بہار موسم ہے اور ہمارا یہ حال یہ کہ ہم زندگی کو چیلنج کر رہے ہیں کہ پست حوصلے والے تیرا ساتھ کیا ہے..... زندگی ادھر آ جا۔ ہم تجھے گزاریں گے۔ اگرچہ آپ پہچانی نہیں جا رہی ہیں مگر جس کے حواس سے ایک چہرہ ہر پہچان جتا ہو وہ تو اچھٹی نگاہ میں پہچان سکتا ہے۔

سوچ رہا تھا ایسے ہی گزر جاؤں..... مگر زندگی سے خطاب کا اپنا مزاج ہے..... کاش آپ نے میرے ساتھ زیادتی نہ کی۔“

”بوش میں آئیے مسٹر رازی..... میرا آپ سے اس قسم کی گفتگو کا تعلق نہ تھا نہ ہے۔“ نائلہ کے خوف نے غصے کا نقاب لٹایا۔

”آپ بہت کچھ کر سکتی تھیں..... مگر آپ نے صرف زیادتی کی..... رہی تعلق کی بات تو مجھے اپنی یادداشت سے کھرج لگے..... اگر ممکن ہے۔“ وہ بڑے وثوق سے کہہ رہا تھا۔

”اور.....“ پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

”میلر.....!“ بابر مرتضیٰ اچھیجی کی سی کیفیت میں ہاتھ رازی کے سامنے بڑھا رہے تھے۔

نائلہ کے پیروں تلے سے زمین سرکنے لگی۔

”میرے ہر بندے..... بابر مرتضیٰ..... اس کی آواز گھنٹی گھنٹی ملتی تھی۔

”اوہ! بیلو..... بابر صاحب.....!“

”یہ میرے بھائی کے دوست ہیں۔ ہمارے محلے دار بھی ہوتے ہیں۔“ نائلہ کو مناسب تعارف بروقت ہو جھ گیا۔

”آپ یہیں پنڈی میں ہوتے ہیں؟“ بابر پوچھ رہے تھے۔

”نہیں جی..... بہر حال اسلام آباد والے پنڈی میں کبھی بھی ہو سکتے ہیں۔“ رازی مسکرایا۔

وہ حیلے بھانے سے نائلہ کی آنٹی اپنی نظروں سے اتار رہا تھا۔

”گاڑی کا لاک کھول لیے..... میں کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں۔“ وہ بے زاری سے بابر کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ اور لگ بھگ ہی وہ رازی کی سمت متوجہ ہوئے بغیر دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

بابر نے اس کا بد اخلاق اور روڈ سارو پیہلے ہی نوٹ کر لیا تھا۔

”اچھا صاحب مجھے اجازت دیجیے..... پھر ملیں گے..... حادثے کی طرح.....“ رازی کھربہا تھا۔

نانکھ نے اپنا زانو نہیں بدلا۔

باہر دوسری طرف سے آکر اپنی سیٹ سنبھال رہے تھے۔ نانکھ کی پیشانی پر پل پڑے ہوئے تھے۔ باہر کی خاموشی اور حد جنسی اور معنی خیز محسوس ہونے لگی تھی۔

”صرف اور صرف تمہاری وجہ سے میں اس شخص کے ساتھ ہوں..... رازی..... کاش میں تمہیں تمہاری ”زیادتی“ احساس دلا سکتی۔“

وردی ایک لہر عذاب کی طرح اس کی جاں سے گزر گئی تھی۔

ٹھیک گھر آگئی تھی اور گھر میں وہ مخصوص روشنی اتر آئی تھی جو مالکن کی موجودگی سے محسوس ہوتی ہے۔

صفیہ ہمہ وقت اس کی دیکھ بھال میں مصروف نظر آتی تھیں اور شکر کرتی تھیں کہ ان کی بیٹی مشکل سے نکل آئی۔

انہوں نے آج ماحول پر سکون دیکھتے ہوئے دن کے وقت کا انتخاب کر کے عائشہ کو فون کیا تھا..... اتفاق سے فون

عائشہ ہی نے ریسیو کیا تھا۔

”میں صفیہ بول رہی ہوں.....!“

”السلام علیکم باجی.....!“ عائشہ جیسے بے تاب سی ہو گئیں۔

”وعلیکم السلام..... کیسی ہو.....؟“

”ٹھیک ہوں باجی..... جب سے سنا ہے کہ شہوار آپ کے پاس ہے، کچھ سکون سا ہوا ہے دل کو..... شہوار کم

ہے.....؟“

”ٹھیک ہے ماشاء اللہ..... بات کرو گی اس سے؟“

”نہیں..... کیا فائدہ..... اس نے جو ہمارے ساتھ کیا ہے بہت ہے ہمارے لیے۔“

”حذر کرتی ہو عائشہ..... کیا کیا ہے اس نے..... معصوم بچی..... خواہ مخواہ کے عذاب سمیٹ رہی ہے۔“

”باجی..... احسن نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا..... آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں.....؟“ عائشہ کی آواز سے ناراض

ظاہر تھی۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ احسن نے جو کیا، وہ ٹھیک نہیں کیا..... مگر شیخ صاحب اور سردار بھائی نے ان معاملات میں

جو کردار ادا کیا..... وہ بری الذمہ نہیں ہیں۔“

”مگر احسن کی فاش غلطی بہر حال سب پر حاوی ہے..... آپ اس کے عیبوں پر پردہ نہ ڈالیں۔“

”عائشہ ہوش کے ناخن لو..... کیا ہم بچوں کے ساتھ بچے بن جائیں.....؟ میں سردار بھائی سے ماننا چاہتی ہوں۔“

”باجی..... آپ مجھے مزید کائناتوں میں نہ گھسیٹیں..... میرے گھر کی بنیادیں تو پہلے ہی ملی ہوئی ہیں۔“

”عائشہ..... تم انہیں سمجھانے کی کوشش تو کرو..... نہ وہ طلاق کے لیے اصرار کرتے اور نہ احسن یہ قدم اٹھاتا.....

سے کہو وہ اپنی شرط واپس لے لیں..... میں خود اسے رخصت کر آ کر لاؤں گی..... ہمارے گھر کی بات ہے..... اور یہ سب

جو رہا ہے محض جذباتیت ہے۔ اس سے زیادہ سمجھ نہیں۔“

”وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں..... شہوار کا تو اس گھر میں نام لینا گناہ ہے۔“ عائشہ کی آواز بھر آگئی۔

”میں کوشش تو کر دو کہ وہ کسی طرح مجھ سے مل لیں۔“

”ہاں..... وہ جسم بھائی سے کچھ زیادہ ہی ہیں کم نہیں ہیں۔“ عائشہ نے شکست انداز میں کہا۔ صفیہ نے تھک کر فون رکھ

دیا۔ ٹھیک گھر آگئی تھی اور گھر میں وہ مخصوص روشنی اتر آئی تھی جو مالکن کی موجودگی سے محسوس ہوتی ہے۔

”آئیے امی۔“

”کیا آؤں..... بیٹے..... تمہیں تو میری ہی نظر لگی ہے..... کہ مجھ پر چھینے تمہارے ہاتھ اڑا رہے ہیں۔“ وہ شکست

انداز میں بیٹھے ہوئے بولیں۔

”احسن ان کا اشارہ سمجھ گیا تھا..... لہذا خاموشی ہی میں بہتری سمجھی۔

”کیا سوچا ہے تم نے.....؟“ وہ پوچھ رہی تھیں۔

”میں سلسلے میں.....؟“ وہ انجان سا بن گیا۔

”شہوار کے سلسلے میں.....؟“ وہ دکھ سے کہہ رہی تھیں۔

”پتھہ تو ختم ہو چکا ہے امی.....“ وہ قطعی انداز میں بولا۔

”نہ تو ایک لمحے کو ساکت سی ہو گئیں۔

”فہم ہوش ہے، تم کیا کہہ رہے ہو..... جب تمہیں یہی سب کچھ کرنا تھا تو کیوں لائے تھے اسے اس کے گھر

پر کام تم اب کرنا چاہتے ہو، سردار بھائی وہی تو کرنے کو کہہ رہے تھے۔“

”مجھے اس وقت تک دھوکے بازی کا علم نہیں تھا..... بلکہ یوں سمجھتے، اس وقت تک مجھے کامیابی سے بیوقوف بنایا جا رہا تھا

راہنہ رہا تھا۔“

”کاش میں آؤ احسن..... کھیل سمجھا ہے تم نے.....؟“ صفیہ کو غصہ آ گیا۔

”میں نے تو نہیں سمجھا..... البتہ دوسروں نے ضرور سمجھا ہے.....“ وہ بھی قدرے ناراضگی سے کہہ رہا تھا۔

”گناہ کا دیا ہے اس نے تمہیں.....؟ وہ خود بخود ہی کب ہے..... بے گناہ اور معصوم بچی۔“

”امیر سے ساتھ رہنا نہیں چاہتی.....“

”مجھے ہوتم..... وہ احسن نہیں ہے۔“ صفیہ کو شدید غصہ آ گیا۔

”مجھ کو تم نے اس کے ساتھ کیا..... وہ غصے میں کہہ رہی ہے یہ سب..... اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوا ہے وہ حق

ہے غصہ کرنے میں..... آخر انسان ہے وہ.....“

”غصے میں نہیں ہوش و حواس میں فیصلہ سنا چکی ہے۔“ احسن نے شک انداز میں کہا۔

”گناہ.....“ صفیہ نے پٹھانی کو آواز دی..... ”شہوار کو بلا کر لاؤ.....“

”گناہ سے یہاں نہ بلا میں امی..... کوئی فائدہ نہیں۔“ احسن نے ماں کو روکا۔

”گناہ ہوش رہو تم.....“ وہ غلطی سے بولیں۔

”گناہ پریشانی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اسے نیچے کے حالات کی کچھ خبر نہیں تھی..... گناہ کے کاشن کر..... بڑی تیز رفتاری

کاشن آئی تھی۔

گناہ نے احسن کو پا کر ایک دم ٹھیک کر رک گئی تھی۔



”آؤ..... بیٹا..... میں نے بلایا ہے تمہیں۔“ صفیہ نے پیار سے اسے بلایا۔  
 وہ ہچکچاتی ہوئی ان کے نزدیک چلی آئی۔  
 ”آؤ۔ ادھر بیٹھو۔“

”میں ٹھیک ہوں خالد جان۔“ وہ قدرے اکھڑ پن سے بولی۔  
 ”احسن کہہ رہا ہے کہ تم یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہو اور.....“  
 ”ٹھیک کہہ رہے ہیں.....“ شہوار نے ان کی بات کاٹ دی۔  
 صفیہ کے دل پر گھونسا سا لگا۔

”بیٹے..... یہ باتیں بچوں کا کھیل تو نہیں ہیں۔“

”کچھ بھی ہو خالد جان..... میں ان کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی..... میری جتنی بے عزتی یہ کر سکتے تھے کر رہے ہیں..... اب مزید برداشت سے بہت زیادہ ہے.....“ وہ یہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔  
 ”شہوار..... بات سنو بیٹا.....“ صفیہ اسے آوازیں دیتی رہ گئیں۔

انہوں نے نظریں اٹھا کر سفید کرتے پاؤں میں لبوس احسن کو سمت دیکھا..... وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ہر  
 کی پٹیاں نوچ رہا تھا۔

”احسن..... بیٹے..... یہ بھی کوئی بات ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کو برباد کرنا..... تمہارے پاس مشکلات پہلے ہی کیا گیا ہے..... یہ تو مزید مول خریدنے والی بات ہے۔“ صفیہ دکھ سے کہہ رہی تھیں۔  
 ”وہ ناجائز تجربہ کار اور کم عمر ہے..... تم نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔“

”امی..... وہ مت کہنے جو سب کہہ رہے ہیں..... غیر جانب داری سے بات کیجیے..... کیا میں نے نکاح کے بعد  
 سے اشارتاً بھی جلد رخصتی کے لیے کہا.....؟“  
 صفیہ خاموش رہیں۔

”مجھے اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس تھا امی..... میں..... یقین کیجیے.....“ وہ رک گیا۔  
 ”مجھے..... آپ سے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا..... دیکھیے میں تو اپنے فرائض کی وجہ سے اپنی جلد شاد  
 خواہش مند نہیں تھا..... کہ کیوں خواہ مخواہ کسی لڑکی کو پابند کر دیا جائے..... اگر..... معاف کیجیے گا امی..... شہوار کی تائید  
 حاصل نہ ہوتی تو میں کسی قیمت پر اسے اپنا پابند نہ بناتا۔“

یہ سب معاملہ اتنی ہی نے بگاڑا ہے..... وہ سراسر زندہ دار ہیں..... کیوں انہوں نے خالو جان کو مجبور کیا کہ وہ شہوار کو  
 میں اسے پسند کرتا تھا..... میں نے بتائی ہوش و حواس اسے اپنا تھا..... کیسے دوسروں کے کہنے میں آکر اسے  
 دیتا..... نہ باجی حالت جنگ میں آتے نہ میں شہوار کو دہاں سے لے کر آتا۔“

”چھرا کیا ہو گیا ہے..... اب کیوں اسے زبردستی ٹھوکر کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہے.....؟“ صفیہ نے ناراض  
 انداز میں پوچھا۔

”میں یہ سب اسی کے لیے تو کر رہا تھا..... مگر میرے اس اقدام پر سب زیادہ عفت ملامت اس نے کی ہے۔“  
 کے موسم کی ساقھی نکلی..... کڑے وقت کی نہیں..... اس کی حقیقت کھل گئی ہے..... میں سب کچھ اسی کے لیے کر رہا تھا۔  
 میرا ساتھ دینا چاہیے تھا..... الٹا اپنے گھر والوں کو نوں پر کبہ رہی تھی کہ میں اس پر ظلم کر رہا ہوں۔

میں ظالم ہوں..... اسے اپنے مہربانوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔  
 باجی کی ضد سے زیادہ مجھے اس کی دوغلی پالیسی سے نقصان ہوا ہے..... اب یہ قصہ ختم کیجیے۔“  
 اس نے ٹھیل سے جاپاں اٹھائیں۔

”واہ ایسے کیسے ختم کیجھوں..... میں تمہاری ماں ہوں تمہاری ذمہ داریوں پر کیوں ناچوں؟ یہ تو شریف لڑکوں کی پہچان ہوتی  
 ہے کہ احسن کہ.....“

”وہ لڑکی ہی نہیں..... میری بیوی بھی تھی..... امی.....“ وہ بگڑے بگڑے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”معاشرے میں کچھ ضابطے۔“

”چھوڑیے امی..... ضابطے انسان کی ہٹا کے لیے بنائے جاتے ہیں فتا کے لیے نہیں.....“  
 اس نے پھر بات کاٹ دی۔

”بیٹھو..... تم جا کہاں رہے ہو.....؟“

”مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔“

”تم بیٹھو یہاں پر.....“ وہ جتنی سے گویا ہوئیں۔

”اور مجھے بتاؤ..... میں اس کا کیا کروں جسے تم بڑی دھونس سے لائے تھے۔“

”جو آپ کا جی کیجیے..... مجھے کوئی دلچسپی نہیں..... مجھے تو آپ جب کہیں گی میں لکھ کر.....“

”خاموش ہو جاؤ احسن، ایک لفظ بھی آگے بولو تو میری مری ہوئی صورت دیکھو۔“ صفیہ تو جیسے تڑپ کر رہ گئیں۔  
 ٹھیکہ جو گھناہٹ سے چلتی ہوئی صرف یہی دیکھنے آئی تھی کہ صفیہ اور احسن اتنی دیر سے کیا باتیں کر رہے ہیں..... چکرا  
 لگ گئی۔

صفیہ نے ٹھیکہ کو پہلی فرصت میں ساری کھٹاٹنا ڈالی تھی.....

”آپ ایسا نہیں کریں گے احسن بھائی..... اگر آپ نے ایسا کیا تو اچھا نہیں ہوگا..... آپ نے کھیل سمجھا ہے..... حد  
 بٹا ہے آپ نے.....“

”ٹھیک ہے..... میں اسے طلاق نہیں دے رہا..... مگر میں اسے اپنے ساتھ رکھنے کو کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں۔“

”دراصل احسن، تم سے میری ہر امید غلط تھی..... تم وہ نہیں ہو جو میں سمجھتی رہی ہوں۔“

میں دیکھتی ہوں تم کیسے اسے نہیں رکھتے.....“ وہ بھرپور غصے سے گویا ہوئی تھیں! احسن معنی شیر انداز میں مسکرایا۔

”امی..... دوسری طرف کی خبر لیجیے..... وہ خود کشی کر لے گی مگر میرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرے گی..... خاصے غیرت  
 باغیان سے تعلق رکھتی ہیں محترمہ.....“

”خود کشی کریں اس کے دشمن..... اسے تو خبر نہیں سمجھا لوں گی..... مگر تم.....“

”میں جتنی اعلان کر رہا ہوں کہ میں اس سے مطلق دلچسپی نہیں رکھتا ہوں.....“

آپ اسے میرے گھر میں ڈیکوریشن پیس بنا کر سجادیں..... تو آپ کی مرضی.....“

دیکھ کر تیزی سے باہر نکل گیا..... شاید اسے اپنے جیلے کی تندہی و تیزی کا ادراک تھا، اسی لیے ایک لمحہ مزید نہیں رکا۔

ٹھیکہ کی تو صلا سے زبان لنگ ہو گئی تھی.....

ٹھیکہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گویا انہیں تسکین دینے لگی تھی۔

آج جمعرات تھی۔

منزہ کی خوشی اس کی ایک ایک حرکت سے ظاہر تھی۔

”خاور کا یونان سے فون آتا تھا۔۔۔۔۔ ان کا میٹج ملا تھا کہ وہ جمعرات کے دن پاکستان کے وقت کے مطابق رات ۱۰ بجے فون کریں گے۔“

آٹھ بجنے میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔

معاملہ انتظار کا ہو تو وقت ٹھہرا ہوا لگتا ہے۔

خوشی کا ہوتو پر لگا کر اڑتا ہے۔

گڑیا سور ہی تھی۔ جگنو اپنے کھیل کھلونوں میں مگن تھا۔

پہلے تو اس نے خود کو بہت اچھی طرح تیار کیا۔ تازہ ترین شاپنگ کا اہم کارنامہ ہائٹ کاٹن کا سوٹ تھا۔ منفرذ کو اور تراش کا۔۔۔۔۔ وہ زیب تن کیا۔۔۔۔۔ بال وال ہٹا کر فارغ ہوئی تو بھی اچھا خاصا ٹائم تھا۔

وہ آنکھوں کا میک اپ کرنے بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔۔۔۔۔ پھر اپنی چوڑیوں کا ڈبہ لے کر آئی اور اطیم سے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

کڑھائی سے میچنگ کرتی چوڑیاں نکال کر علیحدہ کیں۔ دو ہاتھوں کے سیٹ تیار کیے اور کریم لگا لگا کر بمشکل چوڑیاں کو ”منزل مقصود“ تک پہنچایا۔

چوڑا سا کاٹن کا دو پٹہ کلف لگا ہوا شانوں پر پھیلا کر اپنی تیاری پر اپنے آپ کو داودی۔۔۔۔۔ اور گھڑی کی سمت دیکھا۔

”اُف اللہ۔۔۔۔۔ کب ہمیں گے آٹھ۔۔۔۔۔؟“

خاور سے ملاقات نے تو اسے وقت کی قدر قیمت سمجھا ہی تھی۔

پہلی مرتبہ خاور سے ملنے کے لیے اس نے گھڑی پانچ سال قبل آدھ گھنٹے میں سینکڑوں مرتبہ دیکھی تھی۔ خاور کے پاس کی فرسٹ کزن ارسہ نے رات نو بجے آنکسکیم کا پروگرام بنایا تھا۔ اور فون کر کے تمام مزدکی کزنز کو اکٹھا کر لیا۔

تا کہ رات کی میر پر بزرگوں کو مجبور کیا گئے۔ اور پھر وہ سب اسے خاور کی گاڑی میں چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب۔

تھیں۔۔۔۔۔ ایک تو راستے ہی میں اس کی خوب ڈرگت بنی تھی۔۔۔۔۔ اس کی اور خاور کی مشترکہ کزن اس کے ساتھ فرنٹ سیدہ بیٹھی تھی۔ اس صحت مند کزن کی وجہ سے خاور کے کس قدر قریب ہو کر بیٹھی تھی کیوں کہ چار کزنز پیچھے پھنسی ہوئی تھیں۔

اس دن بھی وہ بڑی ترنگ میں تیار ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اس دن بھی نو بڑی مشکل سے بچے تھے۔ اسے نہ جانے کیا بکے آگیا۔ بہت خوبصورت رنگ چہرے پر بکھر گئے تھے۔

اسی دم فون کی تھنٹی بجی۔۔۔۔۔ اس نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس کا دل خوشی ناچا۔۔۔۔۔ جتنی بے قرار وہ ہے۔ اتنے خاور بھی تو ہوں گے۔ اسی لیے پانچ منٹ پہلے ہی۔

اس نے دھڑکنے والے دل سے رسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔۔۔۔۔!“

”اوہ ہلو کے نیچے۔۔۔۔۔ تم نے بھی فون کے لیے یہی وقت لگانا تھا۔ دیکھو۔۔۔۔۔ نو بجے کر لیتا۔ خاور کا فون آ والا ہے۔“

ہاتھا۔ اس نے فون رکھا ہی تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔۔۔۔۔ اسے خاصی جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔

”تقریباً بھائی ہوئی دروازے تک گئی تھی۔

”اسلام علیکم!“ سانسے اسد مسکرا رہے تھے۔

”پاسٹرنس آپ کو خاصی گراں گزری ہوگئی۔۔۔۔۔ مگر ابھی آٹھ بجنے میں پورے دو منٹ باقی ہیں۔“

”نرو چوڑی سی حیران ہوئی پھر سب کچھ کر مسکرا دی۔۔۔۔۔“ گویا میٹج آپ کو بھی پہنچا ہے۔“

”واہیں ان کے ہمراہ اندر آتے ہوئے گویا ہوئی۔

”جناب۔۔۔۔۔“

”بچے کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“ اسد نے ادھر ادھر دیکھا۔

”ایک خند سے شغل فرما رہی ہیں اور دوسرے کھلونوں سے۔۔۔۔۔ سخت مصروفیت ہے۔“ وہ بیٹا شت سے مسکرا کر کہہ رہی

اسد بھی اس کی خوشی پر بے ساختہ ہنس دے۔

”پائے بناؤں اسد بھائی۔۔۔۔۔؟“ وہ اپنے کلف شدہ دوپٹے کو اچھی طرح جاتے ہوئی پوچھ رہی تھی۔

”اب جو کچھ ہوگا فون کے بعد ہوگا۔۔۔۔۔ آپ آرام سے تشریف رکھیے بھابی۔۔۔۔۔“

”اور آپ کہاں غائب تھے پورا ہفتہ۔۔۔۔۔؟“

”بھائی بڑی۔۔۔۔۔ ہنس۔۔۔۔۔ وہ شرارت سے مسکرائے۔۔۔۔۔“ دو دن کے لیے پنڈی بھی جانا ضروری تھا۔“

”پنڈی گئے تھے آپ۔۔۔۔۔؟“

”پنڈی اور اسلام آباد۔۔۔۔۔“

”کیسی ہیں آپ کی نئی دہن بھابی۔۔۔۔۔؟“ منزہ کو اچانک یاد آیا۔

”بہت مزے میں۔۔۔۔۔“

”اور آپ کی پھوپھو۔۔۔۔۔؟“

”وہ ان سے بھی زیادہ مزے میں۔۔۔۔۔“

”وہ اب بے ساختہ ہنس دے۔

”منزہ نے گھڑی کی سمت دیکھا۔“ آٹھ بج کر دو منٹ۔۔۔۔۔“

”آٹھ بج چکے ہیں اسد بھائی۔۔۔۔۔“ وہ بے زاری دکھائی دی۔

”بائیس منٹ کا مارجن تو رکھنا چاہیے بھابی۔۔۔۔۔“ اسد نے تسلی دی۔

”اب پانچ دس منٹ۔۔۔۔۔“ وہ اس طرح پہلو بدل رہی تھی جیسے صوفے میں کانٹے گڑے ہوں۔

”کی۔۔۔۔۔“ جگنو۔۔۔۔۔ روتا ہوا لاڈلے میں داخل ہوا۔

”لوٹے ہاڑوہا کر دیے۔ وہ اس کے بازوؤں میں سا گیا۔

”بھائی کھانا کھانے آئے گا۔ آپ پیاسے ہاتھیں کریں گے ناں۔۔۔۔۔؟“ وہ اس کے ریشمی بالوں کو چوم کر کہہ رہی تھی۔

”اب نے اٹھل کو سلام نہیں کیا۔۔۔۔۔ تنہی بری بات ہے بیٹا۔“

جگنو ماں کی آغوش میں منہ چھپا کر جیسے کسی پناہ میں آ گیا تھا..... اپنا موڈ اور زاویہ بدلنے پر آمادہ نہیں ہوا۔  
آٹھ دس..... پندرہ..... بیس..... ساڑھے آٹھ ہو گئے۔



”خاور کبھی ایسا دل ہلا دینے والا مذاق نہیں کر سکتے.....“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔  
”دیر بھی ہو جاتی ہے بھابی..... اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔“  
اسد نے سمجھایا۔

”پہنے نو..... نو.....“

منزہ کا موڈ سخت خراب ہو گیا۔

لڑن..... ٹرن..... فون کی تیل ریگ ہوئی۔ دل بے اختیار دھڑکا۔

”آپ اٹھائیے اسد بھائی.....“ منزہ جیسے روٹھ گئی تھی۔

اسد نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو..... اوہ..... جناب بلال صاحب..... یہیں ہیں آپ.....“

”بلال ہے بھابی.....“

منزہ جیسے بادل ٹخو استہٹھی۔

”ہیلو..... ٹھیک ہوں..... امی کیسی ہیں؟“ تم کب آؤ گے کراچی.....؟“

”پاپا لاسٹ فرائیڈے کو آئے تھے تھوڑی دیر کے لیے جگنو کو لے گئے تھے ایسے ہی سیر کرانے۔ مجھ سے تو زیادہ بات

ہو پائی..... ان کی مصروفیت جگنو کے ساتھ زیادہ رہی۔“

”نہیں..... شکیلہ باجی نہیں آئیں۔ یقین کرو..... اچھا چھوڑو..... تم اپنا ذہن مت الجھاؤ۔ میں فون بند کر رہی

ہوں۔ شاید خاور کافون آجائے۔“

”ہاں..... ابھی تک نہیں آیا..... مجھے ان کے آفس سے میٹج ملا تھا..... برنی صاحب کا فون آیا تھا۔ ان کا فون توڑ دیا نہیں ہو سکتا۔“

”شاید کوئی خاص بات ہو گئی ہو..... اچھا..... اوکے..... میں تمہیں صبح رنگ کر دوں گا۔“ مننزو نے ریسیور رکھ دیا۔ ایک اضمحلال سا اس پر طاری ہو چکا تھا۔

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی..... ٹپ ٹپ آنسو ٹپک پڑے۔  
اسد کو دلی رنج ہوا۔

ماں کو روتے ہوئے دیکھ کر جگنو بھی بسور نے لگا..... اسد نے جگنو کو گود میں اٹھالیا۔

”بھابی..... پلیز..... اس طرح نہیں کریں.....“

اسد کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں..... وہ ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئے۔

مگر جنگو انہیں بہت پریشان کر رہا تھا۔ وہ کبھی ڈرائیگ روم اور لاؤنج کی حد سے باہر نہیں گئے تھے۔۔۔۔۔ انہوں نے جنگو کو گودے اتار دیا۔ وہ جگمگا ہوا لاؤنج کی حد سے باہر نکل گیا۔ عین اسی دن مون کی کھنٹی بج اٹھی۔

اسد نے قدرے طمانیت کا سانس لیا۔

"جی..... جیلو..... یہی نمبر ہے..... مسز خاور..... موجود ہیں..... بھائی ہوں خاور کا..... جی.....؟..... جی.....!!!"

کب..... شپ یونان پہنچ ہی نہیں سکا..... اچھا.....!“

اسد کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو بات بھی ہے برداشت سے بہت زیادہ ہے۔

مامے جذب کے ان کا چہرہ گلابی اور کان کی ٹوئیں سرخ ہو رہی تھیں..... ”ٹھیک ہے۔“ انہوں نے ریسیور کھڑا کیا۔

انہیں گھر کی چھت اپنے اوپر آتی محسوس ہو رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے انہوں نے نوشہرہ کا کوڈ تلاش کر کے ڈائریکٹ ڈائل کیا۔

”بلال.....؟“

”اسد بات کر رہا ہوں..... پہلی فرصت میں کراچی آ جاؤ..... امی کو بھی لے آؤ تو بہتر ہو ہے..... مجھے اپنے بابا کا  
نمبر دے دو.....“

”ٹھیک ہے..... مگر میں بھابی سے فی الوقت کوئی بات نہیں کر سکتا..... پلیز سوال جواب میں وقت ضائع نہ کرو“ انہوں نے ریسور کھدیا..... لپٹے تو منزہ دروازے کے کفرم سے نکلی انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سفید اسٹائش سوٹ..... مجرم بھر کا کئی چوڑیاں..... نفیس سامیک اپ..... بالوں کا خوبصورت انداز..... پستان بالوں کی خوبصورت لٹ..... ناک میں رکھی لوہنگ۔

کاش یہ حادثہ میرے نام لگادیا ہوتا قدرت نے اسد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مخاطب کریں تو کس طرح.....

”اسد بھائی.....!“

اسد فولادی اعصاب رکھنے کے باوجود نظریں اٹھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

”بتا دیجئے مجھے..... کہ میرا خواب، میرا واہمہ..... میرا خدشہ..... سچ نکل آیا ہے۔“

وہ جیسے کنویں سے بولی تھی..... اسد کو اس کے وجدان و صحیح اندازے پر حیرت ہوئی۔ اس سے قبل کہ وہ زمین پر آتا

ہی بازو اسے سنبھال چکے تھے۔

یوں نے بیڈ پر اسے لٹا دیا۔ اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

اللہ کے دل تو چاہ رہا تھا، وہ اسی طرح بے حواس رہے تو بہتر ہے۔

وہاں جاگے تو طوفان جاگ پڑیں گے۔

انہوں نے پہلی فرصت میں انعام علی کو رنگ کیا۔ وہ سوچے تھے۔ فون نوکر نے ریسیو کیا تھا۔ اور صاحب کو اٹھانے کی ہمت کی تھی۔

اسد زچ ہو گئے۔ ”بندہ خدا اپنے صاحب کو اٹھاؤ اور کہو کہ ان کی بیٹی کا گھر جل گیا ہے۔“ اسد نے منزہ کی سمت ہونے پڑے دکھ سے کہا۔

دکرنے ایک منٹ ہو لڈ کرنے کے لیے کہا تھا۔

نہوڑی ویر بعد ریسیور سے شکلیہ کی آواز سنائی دی۔

"ایلو..... جی..... میں مسز انعام علی بات کر رہی ہوں۔" اس کا لہجہ خمیدہ سا تھا۔

فیڈم: ! میں منزہ کے گھر سے اسد بات کر رہا ہوں۔ آپ کی صاحبزادی کے ساتھ ٹریجڈی ہو گئی ہے خاور کا شپ  
 اٹلانٹک کی نذر ہو گیا۔ خاور جو راک اینڈ راک کمپنی کے شپ پرفرمنٹ انجینئر کے طور پر کام کرتے تھے۔ وہ اب ہم میں

ہے۔ ”اُن کا لہجہ کمزور اور آواز سست ہو گئی۔“

ایمپوز کریڈل پر ڈال کر وہ منزہ کے قریب آئے۔ اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے چندرہ میں منٹ کی گزشتوں کے بعد ہلکی سی سسکاری نے آکر اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

”ہاں بھی پلیز.....“ اسدا اس سے کچھ دور ہٹ گئے۔

مڑو خالی خالی آنکھوں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی یہ بھی غنیمت تھا کہ بچے سوچکے تھے۔

”اسد بھائی.....! خبر کیا آئی ہے؟ ایسی خبر جس میں کسی امکان و امید کی گنجائش ہوتی ہے۔“ اس کی آواز بھر گئی۔

اس کی جھکی نظریں نہ اٹھ سکیں۔

کئی انہونی نہیں ہوئی میرے ساتھ۔ جب خاور مجھے ملے تھے۔ اور میں ایک عظیم خوشی سے ہنسنے لگی تھی تب ہی مجھے غمناک لگنے لگا۔ مجھے اس خوشی کا تادان دینا ہوگا۔ اس لیے کہ میری مٹی خوشی کے لیے بالکل بھی موزوں ہے۔

ایلیا، آیب، اسد بھائی، ایک آیب۔ میرے ہونٹوں پر کھیننے والی مسکراہٹ کی تاک میں رہتا ہے۔ ”وہ چہرہ دونوں

”بھائی۔ بہت سے کام لیں۔ دکھ واقعی بہت بڑا ہے مگر برداشت کرنا ہے۔“

جب میں کہتی تھی تو کیوں نہیں مانے تھے۔ مجھے ایک بڑی خوشی کے سراب کے پیچھے دوڑا کر ہمیشہ کے عذاب میں خاور میں نے آپ کا کیا گزارا تھا۔؟؟

الہ آباد کے بکاشم انجمنی اُحدت پیدا ہو گئی۔ اور وہ ایک بار پھر بھرپور مٹی کی طرح ڈھکے گئی تھی اپنے بستر پر، اس دن کے

وہ ذہنی طور پر اسے دیکھی اور منتشر تھے کہ خود انہیں اس وقت کسی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ دو طالب علمیں کمر میں گزر رہی تھیں۔ اور اس کے بعد کا تمام عرصہ۔ خاور جب ملک میں ہوتے تھے تو ان کا زیادہ وقت اسد کے ساتھ ہی گزر شادی کے بعد خاور نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے اسد کو گھر کا اہم نوجو بنادیا تھا کہ منزہ کو وہ گھر کے ماحول سے ہٹا دیتے تھے۔

دوسرے خود اس نے بھی توازن کا "قانون" نہیں توڑا تھا۔ اسی وجہ سے یہ دوستی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سے مضبوط ہوتی چلی گئی تھی۔ خاور کو پتا نہیں چلتا تھا کہ اسدان کی زندگی میں اہم کس وجہ سے ہیں۔ اور اسد کو معلوم کہ خاور انہیں اس درجہ عزیز کیوں ہیں۔

اسد کو کبھی یہ دھیان نہیں آیا۔ کہ خاور کا سوسائٹی میں کیا مقام ہے۔ انہیں کیا حاصل ہے اور کس چیز سے محروم ہے اسی طرح۔

خاور کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اسد کی کامیابیات ہیں وہ کیا پہنچتے ہیں، کیا کھاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

بس ہر چیز سے بالاتر ہو کر وہ دونوں ایک دوسرے کو محسوس کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں فٹنی کرتے تھے۔ ایک کی ذات دوسرے کے لیے باعث طمانیت تھی۔ دنیا کے ہر قسم کے نفع و نقصان سے بالاتر تھی۔

منزہ کی حالت کے پیش نظر وہ اپنی چٹا نظر انداز کر کے اس کی سمت متوجہ ہو گئے تھے۔ مگر گھر کے ماحول میں اور سکوت چھایا تو اپنے وجود سے آوازیں آتی محسوس ہونے لگیں۔

خاور کی فعلی اور رشتے داروں کو اطلاع پہنچانے کا کام بھی انہوں نے ہی کرنا تھا۔ خاور کی صرف ایک بہن کا انہیں معلوم تھا۔ باقی معاملات منزہ کے ہوش میں آنے تک ملتوی کر دیئے تھے۔

تموڑی دیر بعد ڈاکٹر اور انعام علی آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔

انعام علی کی پیشانی پر لکھیں گہری ہوری تھیں۔ چہرے پر ناقابل فہم قسم کا تاثر تھا۔

وہ اسد کے قریب آئے تھے۔ اسد نے خود آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا کر جیسے تعزیت کی تھی۔ ڈاکٹر منزہ کے اپ میں مصروف تھا۔

انعام علی ڈاکٹر کے قریب آ کر کھڑے ہوئے تھے اور تشویش بھری نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہے تھے، ہانک کے بعد منزہ کے پوئے متحرک ہوئے اور اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

باپ کو سامنے دیکھ کر جیسے یقین نہ آیا۔

"پاپا! اس کی ہنگامی ہوئی آواز ابھری۔ انعام علی اس کے بستر پر بیٹھ گئے۔

اس کی عمر کی لڑکیاں ہنستی کھلتی فارغ پھر رہی ہیں۔ ہر جھیلے سے بے نیاز۔ انیس سال کی عمر میں شادی ہوئی سال میں بیوگی کے عذاب بھی لاحق ہو گئے۔

"یہ عورت! ان کی کس نس میں پھر زہر دوڑنے لگا۔

"یہ عورت۔ میرے لیے ہی نہیں میرے بچوں کے حق میں بھی ماسور ہے۔ کتنا کہا تھا کہ ہماری ایک ہی بچی؟

جلدی شادی کی ضرورت کیا ہے۔ ایک فیصد میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اس کی اتنی جلدی شادی ہو۔

جھونک دیا میری بیٹی کو بھی آگ میں۔ یہ اس کی اتنی ہی..... یہ اتنی بڑی قیامت۔

ولاد کا ڈکھ..... اپنی بیٹی کا غم۔ ان کے لبو کے ذرے ذرے میں۔ ایک ایک خلیے میں اُتر آتو انہیں اپنی ماں کے

ام علی..... انور بانو کس ڈکھ میں ہے یہ اس کے ماں باپ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ تمہیں اس کا ذرا احساس نہیں۔

ذات اپنی اولاد کی کوئی مشکل دیکھو گے تو پتا چلے گا.....

انہوں نے سخت ناراضگی کے عالم میں کہے تھے۔

ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے انہوں نے بدو عادی تھی۔

بدو عادی کا ذمہ دار بھی تم ہو۔ انہوں نے پھٹتے ہوئے دل کے ساتھ بیٹی کا ڈکھ محسوس کیا۔

بچے! انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جیسے کچھ کہنا چاہا۔

منزہ ان کی یہ شفقت جیسے برواشت نہیں کر سکی۔ تڑپ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔ انعام علی نے اسے

بچہ کی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

پڑا ہو کر رو رہی تھی۔ بلند آواز کے ساتھ۔ انعام علی کا گریبان اس کے آنسوؤں سے گیلیا ہو گیا تھا۔

اوصلا کرو..... ہمت سے کام لو..... انسانوں پر اس طرح کی بڑی بڑی مشکلات بھی آتی ہیں۔ وہ اس

کو پھرتے ہوئے اپنے لہجے پر قابو پانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

میں پھر اکیلا رہی گئی..... میں تو ہمیشہ سے اکیلی ہوں..... وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

میں کے بازوؤں کی گرفت بیٹی کے وجود پر مضبوط ہو گئی۔ ان کے دل میں جیسے دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

لیکن سوچتے بیٹے! میں ہوں ناں تمہارے پاس.....

پ کہاں ہیں میرے پاس..... آپ تو سایہ ہیں پاپا۔ میں آپ کے پیچھے بھاگ رہی ہوں مگر آپ ہاتھ نہیں آتے

نچوٹ کر رہ رہی تھی۔

اواسا شگاف انعام علی کے دل میں کہیں ہوا تھا۔

اسے انتقام کے جذبے نے مجھے کتنا بے خبر کر دیا۔ میرے بچے ذہنی طور پر اسے ذور ہیں۔ یہ تمہارا دوسرا بڑا ستم

بان پر نور بانو..... بیٹی کی آہ و بکا نے ان کی آنکھوں میں پانی بھر دیا۔

تمہارے دے ہوئے کون کون سے روگ نظر انداز کروں؟

چے آپ کو سنبھالو بیٹے..... فارغا ڈسک..... انہوں نے اس کی پریشانی پر بوسہ دیا۔

منزہ کے وجود پر جیسے چھوڑ برس پڑی۔

لٹاؤی قیمت ہے پاپا آپ کے قرب کی.....؟ مجھے پتا ہوتا تو بہت پہلے کوئی بڑا حادثہ اپنے نام لگا لیتی۔ وہ

تو بے رحم رہی تھی۔

اٹل کا وجود جیسے کسی آری کی زد میں تھا۔ بیٹی کا اتنا بدگمان دل۔

ماں محسوس ہوا جیسے ان کی ساری زندگی کسی عظیم کوتاہی کی زد میں آگئی ہو۔ ایسے نہیں کہتے بیٹا.....! تم میری بیٹی

الواد ہو۔ تم میرے دل سے کیسے دور ہو سکتی ہو؟

لٹنے ایک مرتبہ پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

ہس۔ اوروئے تو ہم ہمیشہ سے ہیں۔ مگر اب تو حد ہو گئی ہے۔ وہ پھر ملک پلک کر رو دی۔ پاپا..... آپ ہم



بہار بدحواسی تھی کہ ٹکلیہ ایک طرف کو کھڑی رہ گئی تھی۔ گویا اگر راہ میں آئی تو انعام علی روندتے ہوئے گزر جائیں

اس نے وارڈروب سے چادر نکالی اور اوڑھنے لگی۔

انعام علی نے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے اس کی سمت دیکھا تھا۔

”آپ نہیں جائیں گی..... آپ کا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے سختی سے کہا تھا۔

”اب بھی؟“ ٹکلیہ کے جیلے میں گہرائی تھی۔

”اب بھی۔“ انہوں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا تھا۔

”اپنی پوچھیں تو کیا کہوں.....؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اُڑ کر منزلہ کے پاس

سودہ سادہ اور بے ریا وہ بے ضرری مودب لڑکی جو کسی طرح بھی دو بچوں کی ماں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس حادثے کا

اس کا دل تڑپ گیا تھا۔

”بیاد دیجئے گا کہ میری بیٹی پر قیامت گزر رہی ہے۔ جو کچھ بھجایا تھا۔ آپ کے والد نے بھجایا تھا میں نے نہیں۔“

وہ یہ کہہ کر بھپاک سے باہر نکل گئے تھے۔

ایک غیر شعوری فاصلہ اس کے اور انعام علی کے درمیان آیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی مگر اس سے اصرار نہیں

کھا تھا۔

اس لیے کہ اصرار کا انحصار موڈ، ماحول، رویے اور رشتے پر ہوتا ہے۔

انعام علی کے جاتے ہی صفیہ اندرا گئی تھیں۔

”بیاتی جلدی میں کہاں گئے ہیں! انعام علی.....؟“ وہ فکر مند سی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

”جب میرے رشتے میں طاقت نہیں۔ تاثیر نہیں۔ جب میں بہت کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں۔“

جن رشتوں کی عملداری میں میرے وجود کی کوئی حیثیت نہیں۔

جب میری جزیں نہیں۔ پاؤں نہیں۔

تو میں کیوں۔ اپنے منہ سے وہ بات نکالوں جس کے نکالنے یا نہ نکالنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ای کو تباہی دلوں تو کیا۔ انعام علی کا خاندان مجھے اپنے سر پر بٹھالے گا.....؟

کبھی بھی نہیں۔ بس ایک کوفت اور ایک خداب امی کو مزید مل جائے گا۔ جس کی امی کے پاس پہلے ہی کچھ کی نہیں۔“

”کی ضروری کام سے گئے ہیں۔“

”بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ صفیہ نے ٹکلیہ کے انداز میں کچھ ناپن محسوس کیا۔

”شاید“ وہ اپنے بیڑ پر دراز ہو گئی..... اور آنکھیں پر بازو رکھ لیا۔

کیا کی تھی مجھ میں؟

قسمت والی یا بہتا کون ہوتی ہے؟

وہ جو کسی پوسٹن بن کر آتی ہے؟ اپنے غرے اٹھاتی ہے۔ جس کے آگے پیچھے اس کا شوہر پھرتا ہے، اس کے قدموں

لہجہ کی لعنتیں ڈھیر کرتا ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنے شوہر کے خاندان میں نمبر دو ہوتی ہے۔

یاد وہ بیاہتا ہے۔ جس کو بیاہنے کے لیے اس کی ساس، بہندوں نے جوتیاں گھسانا ہوتی ہیں۔ ٹھکن کیے ہوتے

سے بہت دور ہیں۔ یہ خیال میرے دل سے نہیں جاتا۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے۔ جس طرح آنکھوں کے ساتھ پگھلیں اور جسم کے ساتھ ہاتھ پاؤں پیوست ہوتے ہیں  
طرح اولاد والدین کے وجود سے وابستہ ہوتی ہے۔“

”پاپا!..... مجھے کوئی خوشی راس کیوں نہیں آتی.....؟ وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

انعام علی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی دھاکے میں اُن کے وجود کے پرغے اُڑ گئے ہوں۔ انہوں نے منزلہ کا سراپا  
سے نکالیا۔ وہ زندگی میں کبھی نہیں روئے تھے ان کی آنکھیں کبھی نہیں پھٹکی تھیں۔

مگر آج احساس ہوا کہ اولاد کی محبت زندگی میں ساری محبتوں پر حاوی ہوتی ہے۔

بے بس کر دینے والا اپنی ٹکلیہ ہوتی ہے۔

ایسا قرض۔ جو چمکانے نہیں چکتا۔

قاف کے اُس پار رہنے والا ایسا پرندہ جس کے وجود میں کسی اور کی زندگی ہوتی ہے۔ کہ جسے اذیت دی جا  
قیامت دوسری طرف ٹوٹی ہے۔

وہ تو یہ سوچتے رہے تھے کہ ان کی دن رات کی محنت شاید نے ان کی اولاد کو عیش و آرام کے سارے رنگ دے  
ہیں۔ دنیا کی نعمتیں ان کے قدموں میں بکھیر دی ہیں۔

اولاد کی اولاد تک کا معاشی مستقبل محفوظ کر دیا ہے۔

مگر تا آسودگی کا انکشاف۔ جیسے ان کی ساری محنت ہی کا رت گئی۔

”مجھے خوشی راس کیوں نہیں آتی؟“ ایسا کتنی خراش جملہ تھا کہ کانوں میں مستقل اذیت اُتر آئی تھی۔

وہ تو منزلہ کی شادی کے لیے ایک سے لاکھ تک راضی نہیں تھے۔ مگر جب انہیں پتا چلا کہ اس میں ان کی بیٹی کی خور  
توانہوں نے بادل نخواستہ اپنی رضامندی دی تھی۔

وہ اپنی محبتوں پر خود ہی مطمئن تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا شاید کہ محبت کی اطوار محبت کے احساس سے زیادہ  
اور اہم ہوا کرتی ہے۔

وگرنہ..... انہوں نے تو معاشرے کے کسی ممتاز اور فہرہ وان شخص سے کم تو اپنی بیٹی کے لیے سوچا بھی نہیں تھا۔

”خوشی اور غم تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہوا کرتے ہیں بیٹے!“ انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی سے بال سیٹے  
”یہ غلط ہے پاپا!..... اب تو صرف ڈھکھا طویل راستہ طے کرنا ہے۔“ اس کے آنسو تھنے کا نام نہیں لے رہے تھے

انعام علی نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ انہیں محسوس ہوا تھا۔ ان کی ساری ذہانت، لیاقت، صلاحیت بڑ  
ڈھکے کے سامنے بچ ہے۔

ٹکلیہ نے جس وقت انعام علی کو اس حادثے کی خبر دی تھی۔

وہ نہایت گہری غنڈ میں سوئے ہوئے تھے لیکن خبر سنتے ہی ایسے ہو گئے تھے جیسے برسوں سے جاگ رہے تھے۔  
نے انہیں کبھی اتنا پریشان اور بدحواس نہیں دیکھا تھا۔

صفیہ ایک کمرے میں عشاء کی نماز میں مصروف تھیں۔ شوہر اٹی..... دی لاؤنج میں تھی۔

انعام علی نے اپنے معمول کے انداز سے ہٹ کر بجلی کی کسی تیزی سے لباس تبدیل کیا تھا۔ ان کے انداز میں اس

ہیں۔ شوہر کے گرجنے، برسنے، روٹنے، ٹھنکنے کے باوجود اس کے خاندان میں مضبوطی سے پاؤں جمائے ہوئی ہے۔  
کون سی عورت ”خاص“ ہوتی ہے؟

وہ جو دوسری بیوی بن کر شاندار گھر میں تنہا ہوتی ہے۔

یادہ جو شوہر کے خاندان میں مسائل کے انبار کے ساتھ ہر لمحے معتبر حیثیت کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔

شوہر کی ٹھکرئی ہوئی عورت، سوتن کے مقابلے میں اپنے ہمراہ ہمدردی کی ایک عظیم مقدار رکھتی ہے۔

اُف.....! سارے عیش و آرام کے باوجود یہ نمبر دو کا احساس کس درجہ اذیت ناک ہے۔ ٹھیکہ کو شہید احساسِ محرومی لاحق ہو رہا تھا۔

”کیا کوئی مسئلہ درپیش ہے ٹھیکہ؟“ صنفیہ تو جیسے ٹھکراتی تھی۔ ”سو ٹھہ“ لیا کرتی تھیں۔

”نہیں امی! بس ایسے ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ آنسوؤں کے پھندے اس کے طلق میں اٹکنے لگے تھے۔

”اتنا تو تمہیں منہ کرتی ہوں کہ زیادہ چلو پھرو نہیں۔ بس یہی چند روز ہیں احتیاط کے۔“

”شوہر بھائی کہاں ہیں امی؟“ اس نے موضوع بدلنے میں عافیت سمجھی۔

”نماز پڑھ رہی تھی..... عائشہ سے کہا تھا میں نے کہ کسی بہانے آ جاؤ..... ہم دونوں یہیں آئے سانسے نہیں کوئی حل نکالیں۔“

”میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ احسن تو شوہر سے ایسے بھرا ہے جیسے کبے سے کافر۔ میں تو شوہار سے پوچھو پوچھ کر تکی

گئی ہوں۔ تم ذرا پوچھ کر دیکھنا۔ اب ایسا بھی سر پھر انہیں۔ شوہار اس کی اپنی پسند، اپنی خوشی تھی۔ یہ ایک ایسی کیا ہو گیا۔“

”شاید کسی اور کے دام میں آگے ہیں احسن بھائی اور جان بوجھ کر شوہر بھائی سے چھٹا چھڑانے کی کوشش کر رہے

ہیں۔ اتنے دن خاندان سے کٹے رہے ہیں۔ کیا پتا اس دوران کیا کچھ ہو گیا ہو؟“ ٹھیکہ کو بس یہی بات سمجھائی دی۔

”ارے نہیں اتنا کمزور نہیں ہے۔ باپ کا تھوڑا بہت تیرا منتقل ہوا ہی ہوگا۔ اور پھر خاندان سے کٹنا ہوا تھا۔ شوہار تو

تقریباً اس کے ساتھ ساتھ ہی ہے۔“

”امی.....! آپ ماں ہیں، آپ احسن بھائی کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے تو بہت مشکل نظر آتا ہے کہ

وہ شوہار کو بسالیس گے۔“

”انہی بد فال منہ سے نہیں نکالتے بیٹا.....! خاندان میں ہماری سات پشتیں قدم نہیں جاسکیں گی۔ شیطان کی طرح

عمر بھر کو مرد و بچہ گئے ہم۔“ صنفیہ تو جیسے دہل کر رہ گئیں۔

”میں تمہارے باپ کے ستانی ہوئی گئی ہوں۔ احسن نے ٹھک کیا تو جان پر کھیل جاؤں گی مگر بہن کی نظروں میں

ذلیل ہونا پسند نہیں کروں گی۔ اب حد ہو جائے گی۔“

عائشہ بتا رہی تھی کہ سردار بھائی کو سال بھر ہونے کو یا زینتوں پر نہیں گئے، کئی دنوں سے پروگرام بنارہے ہیں۔ پھر

آئے گی۔ محض اسی وجہ سے داماد کے در پر پڑی ہوں۔ وہ تو ہاتھ لگتا ہی نہیں۔“

”ٹھیکہ.....!“ صنفیہ بات کرتے کرتے چونک پڑیں۔

”جی امی.....؟“

”شوہار تو رہی ہے احسن کے ساتھ اسے تو پتا ہوگا اس کا گھر۔“

”مردہ جا سکیں گی کیوں؟“ ٹھیکہ نے یاد دلایا۔

برائے تو میں سمجھا لوں گی..... اصل فکر تو مجھے احسن کی ہے۔ وہ بہت بدلتا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ میرا بچہ

تھ سے نکل جائے مجھے کچھ کرنا ہوگا۔

ان میں نے چلنے کے لیے کہا تو کہنے لگا۔ امی وہ گھر نہیں سرائے ہے۔ میں دوسرے گھر میں شفٹ ہو رہا ہوں آپ

لے جاؤں گیا۔ یہ کہہ کر جو گیا۔ ابھی تک نہیں لوٹا۔“

فت حیزی سے گزر رہا ہے ٹھیکہ..... جتنی دیر مزید ہوگی اتنا نقصان ہوگا۔“

نہار.....! انہوں نے کمرے کے دروازے کے کچھ کھڑے ہو کر آواز دی۔

باز پڑھ چکی ہو تو ذرا ادھر آ جاؤ۔“

لے سوائے نظروں سے ماں کی سمت دیکھا۔ مگر صنفیہ نے آنکھیں پیرا کر گویا کچھ کہنے سے انکار کر کیا۔

ان حال جان! دو تین منٹ کے بعد شوہار اندر داخل ہوئی۔

پاں بیٹھو بیٹی! انہوں نے موڑھے کی سمت اشارہ کیا۔

نا.....!“ وہ بیٹھ گئی اور سوائے نظروں سے صنفیہ کی شکل دیکھنے لگی۔

تو پھر راز دہن بھی سوچتا ہے بیٹی.....؟ کچھ سوچا تم نے اپنے بارے میں؟“ انہوں نے جیسے تہید باندھی تھی۔

ان کا کوئی مستقبل ہوتا ہے۔ وہ اپنی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں۔ منصوبے بناتے ہیں۔ میں ذلیل و خوار در ماندہ

ہے۔ تنہی سے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

نہار تم اگر ایک نظم مزید بولیں۔ میں مرگئی ہوں کیا؟ میرا کوئی نہیں تھا جو میرے لیے لڑتا آگے بڑھتا۔ جو مجھے وہ

بڑھندوں میں گھیرے ہوئی تھی۔ کچھ ہم نے بھی رو کر نہیں دکھایا۔ حقیقت میں میرا کوئی نہیں تھا۔ سب کے ہوتے

نا۔

میں جنہیں اس جنم سے گزرنے نہیں دوں گی۔ جو مفت کے عذاب کی طرح میرا نالہ کاٹی ہے اگر میرے بیٹے نے

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

نا۔

”کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں رہا۔ تمہارے لہجہ میں یہ کیسا شک و بے یقینی ہے؟ تم میری حقیقی بہن کی اولاد ہو۔ ہو میری۔ یہو کی حیثیت سے تو میں نے تمہیں کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔ خیر یہ گھر کس طرف ہے احسن کا؟“ انہوں نے اچانک سوال کر دیا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ زود غصے انداز میں بولی۔

”مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہیں گھر کا پتا ہے۔“ صفیہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”اگر پتا بھی ہو تو فائدہ؟“ وہ آنسو بھرتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

صفیہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

”تم کم عمر اور اس قدر بے وقوف ہو، تمہیں احساس تک نہیں کہ تم کتنی بڑی مصیبت کے دہانے پر کھڑی ہو۔“

”کس نے کھرا کیا ہے؟“ اس کی آواز بھڑکنی گئی۔

”بیٹے! جو غلطی ہو گئی۔ اس کا ازالہ بھی تو ہونا چاہیے۔ اگر مشکل پڑی ہے تو آسانی بھی ڈھونڈنا چاہیے۔ ذمہ داری کو حق کی کھوج کرنا چاہیے۔ اس طرح تمہارا ڈال کر تم زندگی سے اپنے حصے کی روشنیاں کیسے حاصل کرو گی؟“

ایک اگر غلطی پر ہو تو دوسرے فرق کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ صورت حال کو سنبھالے اور آنے والی کسی کا پریشانی کا تہ باب کمرے۔ ٹھنڈے اور بے سکون دل و دماغ کے ساتھ۔

”آپ“ انہیں۔ کیوں کچھ نہیں کہتی؟“ اب آنسو آنکھوں سے نکل پڑے تھے۔

”تم میرا ساتھ دو ناں۔۔۔۔۔ پھر دیکھو، میں کیسے اس کے ہوش ٹھکانے لگاتی ہوں۔“

”کیا ساتھ دوں۔۔۔۔۔؟“

”مجھ پر بھروسہ کرنا اور جیسے میں کہتی ہوں، ویسے کرو۔ ایک مرتبہ وہ میری گرفت میں آجائے پھر دیکھنا میں بندوبست کرتی ہوں اس کا۔۔۔۔۔ ساری عمر یاد کرے گا۔ مگر تمہیں تو مجھ پر اعتبار ہی نہیں۔“

”یہ بات نہیں ہے خالہ جان۔۔۔۔۔ اوہ بہت بُرے ہیں۔ آپ یقین کریں۔“ وہ ہلکی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

صفیہ کا دل جیسے ڈوب گیا۔ (کیا کر بیٹھا ہے احسن اس کے ساتھ؟)

انہوں نے ٹھیکلہ کی سمت دیکھا جیسے بیٹی سے کہہ رہی ہوں کہ پوچھو، اس سے اُس کی جانے والی بُرائی کا اعجاز نام ہے۔

”وہ معافی مانگے گا تم سے، واقعی اگر اس نے زیادتی کی ہے۔“ صفیہ نے دلی کرب پر قابو پا کر کہا۔

اُف احسن اعتناغ کا شیشہ بالکل ہی کچی کر چکی۔

”تم مجھے احسن کے ہاں سے چلو۔۔۔۔۔ پھر دیکھو، میں کیا کرتی ہوں۔“ وہ سینے سے انہی درد کی لہر دبا کر بولیں۔

”میں وہاں نہیں جا سکتی۔ خالہ جان بلا اس سے آسان راستہ یہ ہے کہ آپ مجھے جان سے مار دیجیے۔“

”تمہاری عقل، تمہاری عمر اور تجربے کے مطابق کام کر رہی ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ میں تمہاری بہتری لیے کیا کچھ کر سکتی ہوں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے شہوار! اگر دن زیادہ ہو گئے تو تمہارے خالو کو سنبھالنا مشکل آجائے گا۔

بیٹے۔ اس معاشرے میں بیابان کی عزت اسی وقت تک ہے جب تک وہ اپنے شوہر کے گھر میں ہے پریشان آنا کرتی ہیں۔ مگر اصل بھی تو انسان ہی ڈھونڈتے ہیں۔

”تم کتنے دن رہیں احسن کے ساتھ؟“ انہوں نے بات بدل کر عجیب سے انداز میں سوال کیا۔ بقول اس کے کہ وہ بہت بُرے ہیں وہ اُس کی بُرائی تک پہنچنا چاہتی تھیں۔

”مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔“ اس نے آنکھیں پڑا لیں۔

”دیکھو بیٹی! مجھے یہ بات زیب نہیں دیتی کہ میں تم سے اس طرح کی باتیں کروں۔ مگر کیا کروں تم سمجھ بھی تو نہیں ہیں۔ دیکھو، اگر ان بڑے ہوئے حالات کے دوران ہی تم ہاں بن گئیں تو تم کو یا دلہل میں ڈھنسی چلی جاؤ گی۔“

”ہائیں۔“ شہوار کے تو گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔

”آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ خالہ جان!“ شرم اور کوفت سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔

”بھئی تم لڑکی ہو۔ بیاہتا ہو۔ شوہر کے ساتھ رہ رہی ہو۔۔۔۔۔ ایسی کیا عجیب بات کہہ دی میں نے؟ میں نے تو تمہیں بتا

ی ہوں کہ شادی کے بعد عورت صرف اپنے لیے نہیں جیتی۔ اس کی اولاد کی اہمیت ہر شے سے زیادہ ہو جاتی ہے۔“

”اُف!“ شہوار کو تاثرات دینا مشکل ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے بے بسی سے ٹھیکلہ کی

بات دیکھا۔

”بھائی جان! یہ بات جس طرح امی کے ذہن میں آگئی ہے۔ اسی طرح ہر اُس شخص کے ذہن میں ہے اور پورے گھر کے ساتھ ہے جسے یہ بات معلوم ہے کہ احسن بھائی آپ کو زبردستی لے گئے تھے خواہ آپ علف اٹھالیں۔ کوئی یقین نہیں کرے گا۔“

”آج تم احسن کے ساتھ بس جاؤ اپنے گھر پھر کوئی کہانی تمہارا تعاقب نہیں کرے گی اور آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے اسے نرمی سے سمجھایا۔

”ان باتوں میں تاک کا مسئلہ آڑے آجائے تو جگ ہنائی اور جاہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ٹھیکلہ۔ بیٹے۔ تمہارا

دادا بھو تو بے ناں گھر میں۔ اور دوسری گاڑی بھی کھڑی ہے۔“

”دوسری گاڑی تو شاید بلال کی ہے۔ وہ تو کوئی چلا تا ہی نہیں۔ پتا نہیں۔ چالی کہاں ہو گی۔“

”بلال۔۔۔۔۔؟ بلال کون؟ صفیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”ٹھیکلہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ (اُف۔ کیا ای بر ایک اور عذاب مسئلہ کروں۔۔۔۔۔؟)

”ہے کوئی۔ ای۔ ٹھہرے، میں چالی دیکھتی ہوں۔“ وہ آنکھیں پڑا کھڑی ہوئی۔

اول سے چاہتی تھی کہ صفیہ احسن کے پاس چلی جائیں۔ کیونکہ منہ والے حادثے کے بعد جانے کیا ہونے والا تھا۔

لہذا انعام علی اسے ساتھ ہی لے آئیں۔ ایک مسئلہ ابھی ختم نہیں ہوا پھر مزید۔

وہ اُنھ کے انعام علی کی وارڈ روم میں چالی تلاش کرنے لگی تھی۔

”دیکھو ہے تمہارا۔۔۔۔۔؟“ صفیہ نے پوچھا۔۔۔۔۔ وہ ٹھیکلہ کی ماں تھیں۔ ٹھیکلہ کی سسرال سے دلچسپی فطری ہی بات تھی۔

”کون سی؟“ ٹھیکلہ اپنے خیالات سے چونک کر باہر آئی۔

”بلال۔۔۔۔۔ یہی کہہ رہی تھیں تم۔“

”جہیں۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ شہوار جیسے بدک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”اب تم خاموش ہو جاؤ۔ یا پھر تم کھا کر کہہ دو کہ تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں۔“

وہ شہوار کو لیے ہوئے پوربج میں آئیں تو وہ چادر لپیٹنے ہوئے زار و قطار رو رہی تھی۔ منیفہ کو اس کے رونے سے بہت اذیت ہو رہی تھی۔ مگر وہ خود کو خاصا سخت ظاہر کر رہی تھیں کہ نرمی سے کام لے کر وہ دیکھ چکی تھیں۔

”بھائی جان!۔“ شکیلہ نے بڑی دقت سے اس کا نام لینا چھوڑا تھا۔ بڑی مشکل سے بھائی جان کہنے کی عادت والی تھی کہ دونوں بہت بے تکلف سہیلیاں تھیں۔ منیفہ نے نوک دیا تھا کہ وہ گھر کی بڑی بہو ہے۔ کوئی اس کا نام نہیں لے گا۔

”آپ خود کو ہلکان نہ کریں۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ یہ تو رشتہ ہی ایسا ہے۔ بعض اوقات تو غنا دکھائی دیتا ہے مگر کسی حادثے کے بعد پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ میاں بیوی کی ناراضگی اتنا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوتا۔ اس میں انسلٹ کی کوئی خاص بات نہیں۔“

”انہوں نے مجھے خود گھر سے نکالا تھا۔“ وہ روتے ہوئے جھلائی۔

”بابا!۔۔۔۔۔ انصاف تو غصہ ہے۔ نرمی جذباتیت۔ آتا ہے تو آخر بھی جاتا ہے۔ یہ کوئی مستقل کیفیت نہیں ہوتی۔ پلیز خود کو منجھلیں۔“

شکیلہ نے خود دروازہ کھول کر بٹھایا۔ منیفہ دوسری طرف سے بیٹھ چکی تھیں۔

گھڑی گھٹ سے ٹکلی۔ چونکدار موجود تھا۔ اس لیے وہ بے فکری سے اندر پلٹ گئی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے منزہ کے گھر رنگ کیا۔

وہ منیفہ اور شہوار کے ساتھ مصروف گفتگو ضرور تھی مگر گھڑی کی زک ہوئی سوئی کی طرح وہ ذہنی طور پر منزہ ہی کے قریب تھی۔

اسے خود حیرت تھی۔ کہ عورت کی زندگی میں کتنی خاموشی سے تبدیلیاں در آتی ہیں۔ اس کے ذہن پر شہوار اور منیفہ کے بچائے منزہ سوار تھی۔ نئے رشتے، نئے تعلق کس درجہ اہمیت اختیار کرتے ہیں۔ اسے خود ہی اپنی ذہنی تبدیلی پر حیرت ہوتی تھی۔

دوسری طرف اسد نے فون ریسو کیا تھا۔

”میں شکیلہ بول رہی ہوں۔“

”شکیلہ!۔۔۔۔۔؟ اسد جیسے پہچان نہیں پائے تھے۔

”بال کی والدہ دوئم۔“ اس نے گہرا سانس لیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ آپ نہیں آئیں؟“ اس کے ذہن میں فوری سوال ابھرا اور ہونٹوں پر آگیا۔

”اس کا جواب بھی کبھی دیں گے آپ کو۔“ شکیلہ کی آواز پرچس میں ابھری۔

”منزہ کی طبیعت کیسی ہے؟“ رشتے دار وغیرہ آگئے ہیں؟“

”وہ۔۔۔۔۔ بس بہت خراب حالت ہے۔ وقفہ وقفہ سے ہیوشی کا دورہ پڑ رہا ہے۔ کچھ لوگ آئے ہیں۔ پتا نہیں، خاور کدھشتے دار ہیں یا بھائی کے۔ میں نے پہلے دیکھا نہیں ہے۔“

”بانو باجی اور بلال آگئے۔۔۔۔۔؟“

”بس پہنچنے ہی والے ہیں۔“

”انعام صاحب کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“

”خالہ جان! آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں سے گرجاؤں گی۔“ وہ بے بسی بولی۔

شکیلہ نے گہرا سانس لے کر بیکلی دراز میں دیکھنا شروع کر دیں۔

شہوار کی مداخلت نے اس کی جان چھڑادی تھی۔

”سردار بھائی! تمہیں گھر ملانے پر رضامند نہیں۔ تمہارے خالو، وہ ان کے بھی سردار۔ تم میری بچی ہو تمہاری بھلائی میرا فرض ہے۔ اس کے تو ایسے دماغ ٹھکانے لگاؤں گی کہ یاد رکھے گا۔“

”چلیں چابی تول لگئی۔ میں ڈرائیور کو بلوائی ہوں۔“ شکیلہ دودھ پٹہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

”آپ دیکھیے گا، وہ ننھے کس قدر ذلیل نہیں گئے۔“ شہوار بڑی طرح رو رہی۔

”اب ختم کرو یہ قصہ۔۔۔۔۔ چلو اٹھو۔۔۔۔۔ اپنا سامان سمیٹو۔ تمہیں حالات کی نزاکت کا ذرا احساس نہیں۔ چلو اپنے کپڑے رکھو بیک میں۔“

منیفہ نے قدرے ناراضگی سے جیسے حکم دیا۔

”تمہاری ماں کو کتنے دن سے خبر ہے کہ تم یہاں ہو۔ میرے ساتھ۔ مگر دیکھو تو تمہارے باپ کی پہریداری کتنی سخت چل رہی ہے کہ وہ یہاں آنے کا موقع نہیں نکال سکی۔ ظاہر ہے، وہ ہر وقت گھر میں ہوتے ہیں۔

دانیال اور نوفل تک ملے نہیں آئے۔ اس لیے کہ تم انہیں دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکو گی اور وہ ننھے اس وقت تمہارے کسی کام آنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

تمہارا گھر بس جائے، آہستہ آہستہ سب مسئلے ختم ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔ سنا نہیں؟ جلدی کرو۔ تمہارے پاس اپنا بھلا سوچنے کی عقل نہیں تو پھر ہمارا اعتبار کرو۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔“

شہوار لا چاری اٹھ کر گئی ہوئی۔ اس سے کہیں بہتر ہو کہ مجھے موت ہی آجائے۔“ وہ زیر لب بو بڑاتی ہوئی باہر گئی تھی۔

”امی!۔۔۔۔۔ ڈرائیور باہر انتظار کر رہا ہے۔“ شکیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”پیارے شکر یہ راست تو نکلا۔“

”امی!۔۔۔۔۔ ایہ معاملہ بنا کر پھر آئیے گا۔ آپ میرے پاس رہنے کے لیے۔“ شکیلہ نے منیفہ سے کہا۔

”دیکھو گی۔ میں تو اس طرح ہو گئی ہوں جیسے میرا گھر رو رہی نہیں۔ اُدھر جیسا خدا معلوم کس حال میں ہیں۔“ انہیں اپنے گھر کی فکر لاحق ہوئی۔

”شکیلہ!۔“

”جی امی!۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی سمت دیکھا۔

”یہ انعام علی اپنے رشتے داروں سے ملنے ملاتے نہیں ہیں۔ اسے ذہن ہو گئے مجھے آئے ہوئے۔ کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دیا۔۔۔۔۔ صرف ان کے دوست کی بیگم آئی تھیں، وہ بھی باپ چل میں۔“

”دوسرے شہر میں رہتے ہیں ناں۔ اس لیے زیادہ آتا جاتا نہیں ہے۔“ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔

”گیارہ بجے تک تو آجائیں گے انعام علی۔“

”جی نٹاس!۔۔۔۔۔“

”وہ بھابھی کے پاس بیٹھے ہیں۔ جب سے آئے ہیں، وہیں ہیں۔“

شکیلہ کو یہ سن کر اچھا لگا۔

”خادو کی ڈیڈ باؤی۔“ شکیلہ نے جیسے انتہائی ڈکھ سے پوچھا۔

”ابھی اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی۔“ اس کے لہجے میں واضح کرب تھا۔

”آپ منزہ کا خیال رکھیے۔“

”انعام صاحب کو بلاؤں.....؟“

”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں..... مجھے تو صرف منزہ کی خبریت دریافت کرنا تھی اور یہ جانتا تھا کہ باجی پہنچ گئیں۔ بڑا مشکل سفر شروع ہوا ہے اب منزہ کا پلیر آپ اس کا خیال رکھیے۔“ اس نے ریسور رکھ دیا۔

اسد کو یہ ”ہوائی ہمدردی۔“ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ”آخر یہاں آنے میں کیا قحاح ہے؟“ بڑا قدرتی سا سوال ذہن میں اُبھر رہا تھا۔

چھٹی کا دن ہونے کے سبب نائلہ آج سارا دن مصروف رہی تھی۔

کئی ڈشز دوپہر کھانا تھیں۔ اس لیے شام کو بڑی فراغت سی محسوس ہو رہی تھی۔ بارشام کو چھ بجے تک پڑے سوئے رہے تھے۔ نائلہ کو ان کے سونے سے سخت گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ ان کی نیند پوری ہو گئی تو اس کا مطلب ہے۔ وہ رات کو اس کی نیند خراب کریں گے۔ وہ پانچ بجے سے انہیں اٹھا رہی تھی۔ مگر بے سود۔ نکل آ کر وہ غسل کرنے پر مئی۔

غسل کے فوراً بعد اس نے عصر کی نماز پڑھی۔ اور قرآن اٹھا کر لان میں چلی آئی۔ آج جمعہ تھا اور صغیہ نے سب اُٹھنے کے دن سورہ کہف پڑھنے کی عادت ڈالی ہوئی تھی۔

مغرب کی اذان سے کچھ پہلے اس نے کلام پاک کی تلاوت مکمل کی۔ اپنے بیڈروم میں واپس آئی تو باہر مرتضیٰ غسل کیے ہوئے ہاتھ گاؤں لپیٹنے پر دراز فون پر مصروف گفتگو تھے۔

”میری بیوی کیوں اعتراض کرے گی بھئی۔ اسے اس کے حقے کی ہر چیز مل جاتی ہے بالکل اسی طرح۔ جیسے پہلے آئی تھیں۔ اسی طرح آ جاؤ۔“

”تمہارے علاوہ بھی میری کئی دوست ہیں۔ تمہیں پتا ہے۔“

”غلط آئیڈیا تھا تمہارا۔ جو دوستی کے لیے موزوں ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ لائف پارٹنر کے طور پر بھی موزوں ہوں۔“

”یار.....! میری بیوی بہت اچھی ہے۔ اس میں مکمل ”بیوی پن“ موجود ہے۔ بہت پیاری سی بہت اوپنڈیکٹ۔ بہت چچی ہے گھر میں۔ باہر..... با..... آج ہی کیوں نہیں.....؟ شام کا کھانا ہمارے ساتھ۔“

”او..... کے..... باقی باتیں ملاقات پر۔“ انہوں نے ریسور رکھا اور وہ جائے نماز اٹھا کر باہر آ گئی۔ ذہن میں سوالات تو تھے مگر وہ کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد اندر میرا بے تک نہ لان ہی میں بیٹھی رہی۔ ابھی وہ ابھی بھی نہیں تھی کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ایک الٹرا مڈرن سی لڑکی نما خاتون پرس جھلانی گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔

جب تک وہ بارآمدے میں پہنچی۔ باہر مرتضیٰ بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کرنے کے لیے پہنچ چکے تھے۔ جیسے کہ بیٹھے۔

”ابھی ان کے قریب پہنچ چکی تھی۔“

مریم اور دہانت پھولوں سے آراستہ قمیڑیں پس سوٹ نائلہ نے زیب تن کر رکھا تھا۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ کمر سے نیچے ہوئے سیاہ چمکدار بال۔ میک اپ سے بے نیاز۔ مثبت سوچ کی وجہ سے ہر رونق اور ہر کشش چہرہ۔

”سسر بار.....؟“ نووارد موصوفہ نے نائلہ کو دیکھ کر باہر مرتضیٰ کی سمت سوالیہ انداز میں دیکھا۔

”مگر کیسی.....! انہوں نے ایک گرم اور تپتی ہوئی نظر نائلہ کے چہرے پر ڈالی اور مسکرا کر جواب دیا۔

”ہاؤ پرئی!“ محترمہ نے کھلے دل سے تعریف کی۔

”نائلہ! یہ میری دوست ہیں الوینہ سردی۔ ہم بہت اچھے دوست ہیں۔“

نائلہ نے جائے نماز دوسرے ہاتھ میں تھام کر دایاں ہاتھ بڑھا دیا.....! الوینہ سردی نے نہایت گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”نومیرج نہ کرنے کی تو تم نے قسم بھی کھائی تھی اور شرط بھی لگائی تھی۔“ الوینہ مسکرائی۔

”نقلی رائج میرج۔ پوچھ سکتی ہو میری سسرے۔“

”ممی کی پسند.....؟“

”آف کورس۔ بلکہ می سے زیادہ سسر کی۔ پسند ہی نہیں سسر کی ضد ہیں محترمہ!“

”ان کے اندر کسی کی ”ضد“ بننے کے تمام گٹس موجود ہیں۔“ الوینہ نے بلند قبہ لگایا۔

بار مسکرا دیے۔ تینوں ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔

”ایک ہفتہ ہی ہوا ہے، مجھے پیرس سے آئے ہوئے۔ آتے ہی تمہاری شادی کی خبر ملی۔ ٹھنا کے ڈر لیے۔ مجھے خیرت اُٹم نے اتنی جلدی شادی کیسے کر لی۔“

”جلدی کا کیا مطلب.....؟ مجھے شادی کرنے کے لیے کیا دوسرا جنم بھی ملنے کی اُمید تھی محترمہ آپ کو؟“ باہر نس

”نومیرج عظیم آئی تھی تمہاری شادی میں؟“ الوینہ نے کھوجنے کے انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔“ باہر نے مختصر جواب دیا۔

”تمہیں ڈرائنگ روم نہیں باہر.....؟ الوینہ نے غور سے باہر کو دیکھا۔

”بھئی، آفس کی کیا بات ہر انسان اپنی حد تک آزاد ہے۔ ہر شخص کو حق ہے کہ وہ زندگی سے اپنا حصہ وصول کرے۔ لہذا ہے پسند کرے۔“

”لو کی بہت ٹائٹ ہے۔ الوینٹ..... اور خواب پرور..... کیا خیال ہے؟“

”چھوڑیں اس قصبے کو۔ یہ بات کریں کہ میری بیوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بھئی مجھے تو اس سے اچھا کوئی نہیں لگا۔ بالکل مخصوص بے باک سے انداز میں اس کی سمت دیکھا۔

الوینہ سردی ہنس پڑی۔

”بھئی، تمہاری بیوی کے بارے میں تو رائے دے چکی ہوں۔ میں تو اس کی بات کر رہی ہوں جو تمہارے فراق میں



”اس میں میرا قصور.....؟“ باہر مرتضیٰ نے الوینہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تم اتنے بولڈ..... بے تکلف اور بے ساختہ کیوں ہو.....؟ ممکن ہے اسے غلط فہمی ہو گئی ہو۔“

”یہ میرا بیٹک نہیں ہے۔ بلیر اسٹاپ دس ٹاپک..... الوینہ..... وہ پزل سی لڑکی۔ اس نے مجھے پہلے ہی پریشان کیا ہے؟ سنس لیس..... اینڈ ٹانسس۔“

”جی ہاں۔ میرٹ پر میرڈ ہیں۔“ اس نے خوشی سے باہر مرتضیٰ کی سمت دیکھا۔  
 ”یار.....! جیلانی بہت پور کر رہا ہے۔ سال میں صرف ایک بار آیا ہے اس مرتبہ۔ اور بے بی لوگ سے ملنے ایک بجی ہو..... ایس..... اے نہیں گیا۔“

”جی تمہارے ٹھاٹ باٹ آخر اس کی مصروفیت ہی کا توسلہ ہیں۔“ باہر مرتضیٰ نے ہنس کر اس کی سمت دیکھا۔  
 ”آئی کورس..... او! اس رائٹ ٹو۔“ وہ ہنستی ہوئی اپنی کچھری کار کی ڈرائیو سیٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔  
 ”ہائے.....! اس نے تھوڑا سا شیشہ پیچ کر کے خدا حافظ کہا اور زن سے گھاڑی لے آئی۔“

نہا بخوبی بصورت عورت۔ زیورات سے آراستہ۔ لاکھوں روپے کی گاڑی۔ رات کا وقت کیا بولڈ نیس تھی۔ اس نے دلی ہرل میں جیسے اُسے شہباز دی۔

”کیا سوچ رہی ہو ڈیرہ..... کم آن۔“ بابر مرتضیٰ کہتے ہوئے برآمد کی سمت بڑھ گئے۔

گیٹ بند کر کے۔ وہ گھر کے دوسرے دروازے، کھڑکیاں چیک کرنے لگی۔ وہ دو پہر کو ڈائینک روم کی آرائش و صفائی میں مشغول رہی تھی۔ صبح سے اٹھی تھی۔ اس لیے نیند بہت آ رہی تھی۔ مگر۔ اسے یہ سوچ کر الجھن ہو رہی تھی کہ باہر آج دیر تک جاگیں گے وہ بیڈ روم میں آئی تو باہر پردے سرکائے کھڑکی سے باہر نہایت محویت کے عالم میں جانے کیا دیکھ رہے تھے اس نے آنکھیں سے لائٹ آف کی اور نائٹ بلب جلا دیا۔

”خیریت.....؟“ باہر چوک کر پلٹے۔

”گیارہ بج رہے ہیں، نیند آرہی ہے۔ آج دن بھر مصروف رہی ہوں، ذرا آرام نہیں کیا میں نے۔“

”بہر حال۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں کہہ کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔

”میری دوست بر کوئی کمٹس نہیں؟ کوئی تبصرہ.....؟“

”اچھی ہیں۔“ وہ کروٹ کے بل لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں۔ پہلی فرصت میں سو جانا چاہتی تھی۔

”یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے بہت بھاری گٹھڑی سر سے اتار چھین لی ہو..... یہ بات ہوئی؟“

”اس وقت مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ پھر سہی۔“ وہ جھٹلا گئی۔

”میں محسوس کر رہا ہوں جیسے تمہارا موڈ خراب ہے۔“

”مجھے صرف نیند آرہی ہے۔“ وہ بڑی طرح چڑھ گئی۔

”نیکی ڈانگ.....! یہ میری زندگی کے معمولات ہیں۔ تمہیں ان کا عادی ہونا پڑے گا۔“

”ہو جاؤں گی۔“ وہ جیسے جان چھڑا رہی تھی۔

دونوں کے قہقہے بلند تھے۔ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مار کر بوقت ضرورت ایک دوسرے سے اتفاق کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ "شاید تمہاری بیوی بوریٹ محسوس کر رہی ہے۔" الوینے بغور نالکہ کا چہرہ دیکھا۔

”ہاں، شاید اس لئے کہ اُسے اُسے ماحول اور ماتوں کی عادت نہیں ہے۔ نئی ڈارلنگ“

کافی۔ پلیز۔“ باہر مرتضیٰ نے جیسے درخواست کی۔  
وہ شکر منائی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے کافی بتانے میں قدرے دیر کر دی۔ اسے دوبارہ اُن دونوں کے پاس جاتے ہوئے خاصی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ناموگر کیفیت کے ساتھ ٹرائل و ٹیکنیک ڈارننگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسی طرح جوش و خروش سے اہل  
میں گن تھے۔

ناکلہ نے انہیں، کافی بنا کر اور کھانا تیار کرنے کا بہانا کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ کھانا تقریباً تیار ہی تھا۔  
جھوٹے موٹے لوازم باقی تھے۔ سویت ڈش تو وہ ہر وقت ہی تیار رکھتی تھی۔ مومک کی دال کا طوطہ، پنڈتک، کبیر، کسڑا  
میں ایک دو چیزیں تو ہر وقت ہی تیار رکھتی تھیں وجہ یہ تھی کہ فراغت کے لمحات میں اسے کچھ نہ کچھ... کرنے کی عادت  
تھی۔ شادی سے پہلے گھر میں علمی لحاظ سے اس پر سب سے زیادہ بھروسہ کیا جاتا تھا۔

اسی نے بہت اہتمام سے کھانے کی میز سجائی۔ تازہ پھولوں کا گلہستہ تو وہ یوں بھی روزانہ ٹیبل پر سجاتی تھی انا موجود تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر اس نے نہیں ڈانٹک میں آنے کے لیے کہا تھا۔

چائینز سوپ اور ترکش کوفتوں کے ساتھ اس نے ڈنر میں نیا پن پیدا کیا تھا۔

الوینہ سرمدی نے اپنی مخصوص فراخ دلی سے کام لے کر تاملہ کے تیار کردہ کھانوں کی تعریف کی تھی اور باہر کی ”لک“ برسرِ شگ ظاہر کیا تھا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے کے قریب دورِ رخصت ہوئی تھی۔ نائلہ اور باہر اسے خدا حافظ کہنے گیت تک آئے تھے۔

”نائیلہ باہر..... ہم آپ کی میزبانی کے لیے۔“ بے قرار ہیں۔ آپ اس لاپرواہ سے بندے کو خوش کرتی رہیں گے۔“

355

بلال ہیں۔ یہ ہمارے لیے نہیں ہے۔ آپ اسے گستاخی نہ سمجھیے گا۔ پلیز..... اس عمل میں سوائے ڈکھ کے اور کچھ بھی بلال ہے۔“  
وہ یہ کہہ کر باہر چلے گئے۔

وہاں موجود کئی خواتین نے تیوریاں چڑھائیں اور اشارے کناٹے کئے۔  
اتنے میں بلال آگے بڑھ کر بہن کو سینے سے لگا کر خاموش انگ بہانے لگا۔  
”بھئی.....! میں تمہیں کتنا دکھ رہی تھی۔ اور تم کہہ رہے تھے جب خاور بھائی چلے جائیں گے تو میں آ جاؤں گا وہ ہمیشہ لے لے چلے گئے۔ تم ہمیشہ کے لیے آ جاؤ۔“

وہاں موجود ہر فرد کی آنکھ اشکبار ہو گئی تھی۔ بھرپور بہا جیسی عمر..... اور بیوی..... ہر دل جیسے ڈکھ کی آتھام میں جا پڑا۔  
انعام علی اندر آگئے تھے اس کی آہ و بکا سن کر۔ اسے اپنے سینے لگا لیا۔ اور حاضر خواتین سے گویا ہوئے۔ ”پلیز، آپ لے خود پر قابو رکھیے۔ تب ہی اسے بھی کچھ موقع ملے گا۔ خود کو سنبھالنے لگا۔ ورنہ اس کا کیا ہوگا۔ یہ کبھی نہیں روئی۔ آپ اس کو وصل دیں۔“

نور بانو کے انگٹھ قہقہے گئے تھے۔ ان کے سامنے بالکل نئے۔ دوسرے۔ انعام علی تھے۔ جو بیٹی کے ڈکھ میں اتنے مدغم تھے کہ انہیں آس پاس کا کوئی ہوش نہیں تھا۔  
وگرنہ انہوں نے تو کبھی اپنے تاثرات پڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ یہ تو خیر ایسی اجنبی کی بات نہیں تھی کہ وہ بیٹی کی معیت پر پریشان تھے۔ نہایت فطری سامع تھا۔

وجہ یہ تھی کہ ان کی محبت کا اظہار دیکھنے کی نور بانو کو سخت تنہا تھی۔ وہ اپنے اعمال و افعال سے اپنی اولاد کے لیے محبت کا اظہار ضرور کرتے رہے تھے۔

مگر ان کے الفاظ، ان کا لہجہ۔ ہمیشہ سردی محسوس ہوتا تھا۔ جیتی کھلونے۔ پُر آسائش ماحول قیمتی لمبوس۔ شاندار تعلیمی ادارے۔ یہ سب ان کی محبتوں کے اظہار ہی تھے۔

مگر وہ سرد برقی فضا۔ جو چہرے کا احاطہ کیے رہتی تھی۔ آج ٹوٹ گئی تھی۔  
کس قدر رنگی ہے تمہاری توجہ۔ نور بانو کے سینے سے ٹپس اٹھی۔

نوشہرہ سے کراچی تک کا فیصلہ جیسے صدیوں پر محیط محسوس ہوا تھا۔ وہ راستے میں کتنی مرتبہ ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھی تھیں۔  
کہ بلال کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

غم کی میزان ان کے سامنے تھی۔  
ایک پلڑے میں ان کا ڈکھ تھا۔ دوسرے میں منزہ کا..... دونوں پلڑے اوپر نیچے ہو رہے تھے نظر میزان کا توازن

جانچنے میں ناکام ہو رہی تھی۔  
ان کے پاس امکانات کی توں تخرج جیسے زینے کی صورت تھی۔

اور ان کی بیٹی چاروں طرف پھیلنے والے اندھیرے کی رہلہ د۔  
بیٹی کے حق میں اتنے گھائے کا سودا محسوس کر کے دل ہی بیٹھنے لگا۔

اس احساس کے بعد سے اب تک آنکھیں خشک نہیں ہوئی تھیں۔ دل خوب بن بن کے آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ ڈاکٹر  
منزہ کو انکیشن کے ذریعے گہری نیند سلا دیا تھا۔

354

”میری بہت ساری فرینڈز ہیں میری..... ان مرڈ..... تم ان سے اگر جیسی فیل کرو گی تو حیات کرو گی۔ میں تیسرے درجے کا وہ معمولی آدمی نہیں ہوں جسے عورت لفٹ کرنا پسند نہیں کرتی اور وہ عورت کی قربت کو ترستا ہے۔ میرا تھرڈ کلاس مرڈ نہیں ہوں۔ میں ایک عورت سے صرف اسی وقت بات کرتا ہوں جب وہ اپنی رضامندی اور خوشی سے بات کرتی ہے۔ اور میرے ساتھ بیٹھنا پسند کرتی ہے میں عورت کے پیچھے بھاگنے والا مرڈ نہیں ہوں۔ جب کوئی عورت میری دوست بنتی ہے تو برابر ہی کی بنیاد پر..... میں..... ایز..... اٹ از..... اکول ٹریٹ کرتا ہوں۔“

”شاید تم بہت چالاک آدمی ہو۔ تم میں بہت سے فالٹس ہیں باہر رفتی.....! جن کی راز دار خدا کے بعد ہوں۔ جو شاید تمہاری ماں کو بھی پتا نہ ہوں تم جو ایک وحشی درندے ہو۔ تمہاری ہر برداشت کی گواہ تو صرف میں ہوں۔ کیا وجہ ہے؟

کیا وجہ ہے کہ۔ کہ تمہاری ملنے والیاں ایک سے ایک۔ خوبصورت، دولت مند تعلیم یافتہ۔ مہذب۔ تم نے ان سے کسی کو اپنا شریک حیات کیوں نہیں بنایا؟

مجھے می کی اس بات پر تو ویسے بھی اعتبار نہیں آیا تھا کہ باہر کسی آن دیکھی، خوبصورت، مشرقی لڑکی کو شریک حیات چاہتا تھا۔ تم اس کی آرزوؤں کی تکمیل ہو۔

ہونہ۔! سوسائٹی میں بڑے کزدفر سے رہنے والا شخص۔ یہ کتنا بڑا وحشی ہے۔ اس کی پول نہ کھل جاتی۔ اگر دیکھے اس کی وحشت۔ اس کا نیم پاگل پن۔“

نائلہ کا ذہن نیند کے پاتال میں اترتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

نور بانو اور بلال کس درجہ حواس یافتہ سے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

نور بانو کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے حواس گم تھے۔ سامنے ہی انعام علی نظر آگئے تھے۔ منزہ کو اپنے بازو میں سیٹے۔ پانی پلا رہے تھے۔

منزہ ماں کو دیکھتے ہی دیوانہ وار اٹھی تھی۔ اس کی چیخوں میں بے پناہ وحشت تھی۔

”امی..... کچھ بھی نہیں بچا۔ ڈھانچے کے میں مر جاؤں۔“ وہ ہلک ہلک کر روئی۔

نور بانو کا اپنا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ تو برسوں سے مرلیضہ چلی آ رہی تھیں۔ وہ خود با آواز بلند رو رہی تھیں۔ انعام کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

موجود خواتین نے ہشکل دونوں کو جھجھکیا۔

ایک بزرگ خاتون جو خاوری رشتے میں خالہ ہوتی تھیں اور بزدلیک ہی رہتی تھیں۔ کافی دیر سے آئی ہوئی تھیں۔

اسد نے خاور کے چچا زاد بھائی کو کون کر دیا تھا۔ انہوں نے ہی غالباً رشتہ داروں کو اطلاع دی تھی۔

بزرگ خاتون آگے بڑھ کر منزہ کی چوڑیاں اتارنے لگیں۔

”معاف کیجیے گا۔“ اسد جیسے تڑپ کر آگے بڑھے تھے۔ ”میرے خیال میں یہ کوئی ایسا ضروری اور شرعی عمل نہیں ہے کہ نہ کرنے سے دین و دنیا خراب ہونے کا اندیشہ ہو..... یہ ڈکھ کے لمحوں میں مزید ڈکھ پہنچانے والا عمل ہے۔ آپ رہیں پلیز.....

یہ بے جان شیشہ۔ اس سے کسی کی موت و زندگی وابستہ نہیں۔ اور شاید یہ تو خالص ہندو وائے فعل ہے۔ بھگواند

اور وہ اپنے دل کو سنبھالتے ہوئے وضو کر کے علیحدہ کمرے میں چلی آئیں کہ جب دل نامعلوم کسی طرح نہیں پہنچا  
ذکر الہی آخری علاج ہے۔

انہوں نے کلام پاک اٹھایا اور پائیس..... اور ایک دم ٹھکی گئیں۔

انعام علی صوفیہ کم بیڈ پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے۔ ان کے انداز میں حد سے زیادہ بے بسی اور بے چارگی تھی۔

”آخر ایک مرتبہ پھر تم نے اپنی سی کر کے دیکھ لی۔ بہت آفت تھی تمہیں اس کا گھر سامنے کی۔ مجھ پر جو بلا آتی ہے وہ آخر تمہارے ہی ذریعے کیوں آتی ہے۔“ ان کا لہجہ نہایت زہریلا تھا۔

”کاش مجھے علم غیب ہوتا۔ پھر شاید میری بچی پر یہ ناگہانی نڈوئی۔“ وہ کرب سے کہہ رہی تھیں۔

”جب تمہارے پاس علم غیب نہیں تو تم دوسروں کے مشورے پر کان کیوں نہیں دھرتیں.....؟“ سکتی مرتبہ میں تمہارا غرض کی جھینٹ چڑھوں گا؟“ انعام علی کا لہجہ شکستہ ہو گیا۔

نور بانو کی آنکھیں ایک دم بھرا گئیں۔

”میری خود غرض..... آہ.....“ وہ نماز کی چوکی پر بیٹھ کر کلام پاک کھولنے لگیں

”اگر میری بیٹی کو کچھ ہو گیا نور بانو..... تو.....“ وہ دھمکی آمیز انداز میں کچھ کہتے کہتے رگ مٹنے۔

”ہر گناہ۔ میرے سر۔ آخر یہ سلسلہ کب تک چلتا رہے گا۔ انعام علی۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”جب تک تم زندہ ہو۔“ وہ بے رحمی سے گویا ہوئے۔

اسی دم بلال کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں ماں باپ کو دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھکا۔ پھر آگے بڑھا۔

”خاور بھائی کے آفس سے فون آیا تھا پاپا؟ کیا کہہ رہے تھے وہ لوگ؟ خاور بھائی کی ڈیڈ باڈی کے بارے

میں.....؟“

”فون اسد..... نے اٹینڈ کیا تھا۔ منظرہ کے پاس تھا۔“ وہ اس کی سمت دیکھے بغیر بولے۔

بلال ماں پر ایک نظر ڈال کر دوبارہ باہر چلا گیا..... انعام علی نے نیم دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔

”صبح ہو چکی تھی۔ وہ تمام رشتے دار جن کے پاس اپنی کنوینس تھی۔ آچکے تھے۔ خاور کی بہن دونوں بچوں کو سنبھال رہی تھیں۔ جبکہ صدے سے ان کی اپنی حالت غیر تھی۔

اسد کے والدین بھی پہنچ چکے تھے۔ ان کی والدہ آنے جانے والوں کا خیال رکھنے میں مصروف تھیں اور بڑی ذمہ داری سے گھر میں متحرک تھیں۔

خاور کے والدین تو تھے نہیں۔ دو بھائی تھے دونوں باہر تھے۔ دو بہنیں شادی شدہ تھیں۔ ان میں ایک تو پہنچ چکی تھی۔ دوسری شہر سے ڈور کسی گھٹھ میں تھیں۔ ان کے شوہر وہاں ڈاکٹر تھے۔ وہ برسوں سے وہیں تھیں۔

جس گھر میں مرگ ہوتی ہے۔ اس کے درد دیوار سے بھی موت کی مہک آتی ہے۔ چہار سو ایک ماتم برپا تھا۔

ایک جوان اور خوش رو بیوہ۔ آبلہ پائی کے سفر سے دو چار ہو چکی تھی۔

موت کی ظالم مہک۔ اس کی خوشی کی ایک ایک کوپٹل میں رچ کر کسی نوزائیدہ بھول کا ہر امکان معدوم کر رہی تھی۔

”گاڑی گیٹ سے باہر نکلتے ہی ڈرائیور نے پوچھا تھا۔

”سیدھر جانا ہے؟“

اس کی ہچکیاں ہی نہیں تھم رہی تھیں۔

”نہ چھ رہا ہے، کدھر جانا ہے؟“ منیہ نے اسے ٹوکا۔

”بھڑون۔“ اس نے ناراض ناراض سے انداز میں جواب دیا تھا۔ اور گاڑی دوڑ پڑی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ فاصلہ زیادہ تھا اس لیے گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔

راستے کی بوریت اور طوالت کا احساس مٹانے کے لیے ڈرائیور نے کیسٹ لگا دی۔ یوں بھی ڈرائیور صرف اپنے کان کی پروا کرتے ہیں۔ ان کے متعلقین یا رشتے داروں کی نہیں۔ اس لیے اس کی کیسٹ لگانے کا انداز بے جبک اور بھلا تھا۔

خاصا باڈو ق ڈرائیور تھا۔ یا پھر یہ بلال کا ذوق تھا۔ دونوں ساس بہو ایک دم خاموش تھیں۔ غزل کا حرف حرف ان کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ چتر کی خوبصورت آواز بکھر رہی تھی۔

اب کے برسات کی رت اور بھی بھڑکیلی ہے

جسم سے آگ نکلتی ہے، فضا گیلی ہے

سوچتا ہوں کہ اب انجام سفر کیا ہو گا  
لوگ بھی کالج کے ہیں، راہ بھی پتھر پٹی ہے  
پہلے رگ رگ سے خون نچوڑا اس نے  
اب یہ کہتا ہے کہ رنگت ہی میری پیلی ہے  
مجھ کو بے رنگ ہی نہ کر دیں کہیں رنگ اتنے  
بزر موسم ہے، ہوا سرخ فضا نیلی ہے

اب کے برسات.....

مدمدم مدم موسیقی کے بیچ دوڑتی بھاتی موسیقی ایک مرکز پہنچنے کی کوشش میں تھیں۔ منیہ اس کی کیفیت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اس لیے گاہے گاہے اپنے آچھل سے اس کی آنکھیں پونچھ دیتی تھیں۔ اور اپنے ساتھ لگا کر پیار سے جھکی دیتی تھیں۔

”بیٹے..... بعض اوقات عورت اپنی عزت و وقار کے لیے اتنے کڑے امتحانوں سے گزرتی ہے۔ کہ ان امتحانوں سے زیادہ آسان موت نظر آتی ہے۔ مگر جب ہمت سے یہ کھٹنا نایاں طے کر لیتی ہے تو گھر اور معاشرے میں اس کے پاؤں جم جاتے ہیں۔

میری ساری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ آج تک امتحان مکمل نہیں ہوئے۔ خدا معلوم کتنی مرتبہ میں نے علیحدگی کی دھمکیاں سنی ہیں۔ یہ کوفت، یہ سختیاں میں نے بہت ممبرے جھیلی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کسی سے مدد نہیں مانگی۔ درد پر جا کر گولی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے مجھے ہر طرف سے عزت دی ہے۔ میں تمہارے خالو کو چھوڑ دیتی تو ان میں سے گولی بھی میرا نہیں رہتا۔

میرے نزدیک صرف عزت و وقار اہم ہے اور بعض اوقات پسندیدہ چیز بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ جس خلوص نیت سے

مکمل کلیہ، نیلہ کی بھلائی کی آرزو مند ہوں۔ اسی طرح تمہارے حق میں ہوں۔“

وہ آہستہ آہستہ بہت نرمی سے کہہ رہی تھیں۔  
 ”آپ دیکھیے گا۔ وہ کس طرح ذلیل کریں گے۔“ وہ ناراض سے انداز میں گویا ہوئی تھی۔  
 ”پھر تم اس کا حشر بھی دیکھنا۔“  
 وہ چپ ہو گئی تھی۔ ایک فیصد بھی دل راضی نہیں تھا۔ اپنے ہی شکستِ عہد کی شرمندگی اسے مارے ڈال رہی تھی۔ وہ عہد جو اس نے خود سے کیا تھا۔

خاصی دیر ہو گئی تھی۔ تب اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔  
 ”بھڑ زون تو آ گیا ہے بی بی! کس طرف جانا باب؟“ ڈرائیور نے رفتار بالکل آہستہ کر دی تھی۔  
 ”یہ سامنے جو مسجد ہے۔ اس کے دائیں طرف موڑ لو۔ پھر سیدھے چلنا۔ آخری گھر ہے۔“ وہ بتا کر چپ ہو گئی تھی۔  
 ہاتھ پیروں میں سنسنیٹ دوڑنے لگی تھی۔ دل عجیب طریقے سے دھڑکنے لگا تھا۔  
 ایک ذلت آمیز شکست کا احساس اس پر طاری ہو رہا تھا۔  
 ڈرائیور نے آخری ادھورے مکان کے سامنے گاڑی روک دی تھی۔



صفیہ نے اشتیاق سے باہر جھانکا۔ ان کی حرکات و سکنات میں جوش و جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔  
 انہوں نے جلدی سے دروازہ کھولا تھا۔ اور اسے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔  
 کال بیل پش کرنے کے بعد خاصا انتظار کرنا پڑا۔ غالباً وہ گہری نیند میں پہنچ چکا تھا یا کسی کام میں مصروف تھا۔  
 گیت بڑی آواز کے ساتھ کھولا گیا تھا۔ جتنی تیزی سے وہ آگے آیا تھا۔ اتنی تیزی سے پیچھے ہٹا تھا۔  
 ”امی..... آپ.....!“ احسن جیسے چکر ا گیا تھا۔  
 ”ہاں بھئی میں ہی ہوں..... تم اگر مجھے اپنے گھر نہیں لاؤ گے تو کیا میں نہیں آ سکتی.....؟“  
 وہ عالمِ تحیر میں کبھی گاڑی کی سمت، کبھی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
 ”ای..... آپ اکیلی.....!!! وہ گاڑی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بڑے تعجب سے پوچھ رہا تھا۔  
 ”اکیلی کیوں ہوتی..... اکیلا تو اللہ نے کبھی کیا ہی نہیں..... گاڑی میں تمہارے ایک اور مہمان بیٹھے ہیں پھیلی سیٹ پر۔ عزت و احترام سے اتار دلائیں۔“  
 وہ کھلے گیت میں اندر کی طرف بڑھتی چلی گئیں..... وہ ماں تھیں۔ سہیلی تو تھیں نہیں کہ دونوں کے ملن کا منظر شوق سے دیکھتیں یا دیکھنے کا شوق رکھتیں۔  
 احسن حد درجہ اشتیاق سے گاڑی کی سمت بڑھا..... وہ چادر کی اوٹ میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی..... مگر وہ سیکنڈ کے

میں جب کچھ کے آرام سے بیٹے ہوا، اس کا مطلب ہے کہ تم سوچتے تھے ماں بھی اس شرمیں تمہارا ساتھ دے  
ہیں کہ تم نے مجھ سے اس درجہ گراؤ کی امید رکھی۔“ انہوں نے سختی سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا  
اور قدم آگے بڑھا دیے۔

ہمیں ایک دوسرے کی ضرورت نہیں۔ تم نے تو اس بچی سے اس کے ماں باپ تک لپٹ کر ڈھاکے بڑھتے ہوئے بولیں۔

چہاری بلا سے۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔  
 ہلی۔ بات تو سنیں..... ٹھہریے..... آپ بیٹھے..... میں لے آتا ہوں اُسے۔“ وہ شکستہ لہجے میں بولا۔  
 بند کا دل خوشی سے ڈھڑکا..... یقیناً ان کا ”بیٹا“ موجود تھا۔  
 رکی گئیں اور چار اتار کر صوفے پر آرام سے بیٹھ گئیں۔  
 اس شکستہ انداز میں چلا ہوا گیٹ تک پہنچا تھا۔

”مذہباً جاؤ.....“ وہ گیٹ میں انک کر دیں بے ہول تھا۔  
 ”لو! تمہارے پاؤں جیسے جم چکے تھے۔ جنبس محال لگی اور آواز ابھنی۔  
 ”خیر! سب کی ہے آج سے کرکٹ ریف لے آئے۔“ وہ تضحیک سے گویا ہوا۔ انداز ہرگز صلح کے نہیں تھے۔

یہ وہیں تو میں کس حیثیت سے اندر جاؤں..... اور یہ خالہ جان کہاں رہ گئی ہیں۔ یہ تھناب میرے سر پر مسلط کر رہا ہے۔“

”ابن کمر تک آہی کُسرِ تواب سِخڑے کا معنی.....؟“ وہ سانب کی طرح بھٹکارا۔

”اُئی نہیں، لائی گئی ہوں۔“ وہ بھی عجب کر بولی۔

لنگر کے گھر سے باہر تو جانے نہیں دوں گا۔“ وہ اس کی سمت بڑھا۔

میں نے بظاہر نظریں جمکائے بیٹھی تھیں۔ مگر آہٹوں پر کان لگے ہوئے تھے۔ قدموں کی چاپ پر انہوں نے نظریں اٹائی۔

”آج ماؤ بیٹی..... یہی تمہارا اپنا گھر ہے۔ ارمان تو جانے کیا کیا تھا اس دل میں مگر اب تو صرف تمہاری بھلائی مند نظر ہے تمہارے سامنے، آج تمہاری ماں، کوٹھن کرکھا۔ وہ آجاتی تو شاید دوسرے انداز سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کر لیتی۔“

”میں تمہارا گھر تو دیکھ لوں..... کیا بنایا ہے احسن نے گھر؟“ وہ اٹختے ہوئے بولیں۔

میں نے ایک اچھی نظر اس ارڈالی..... ”تم بھی چلو میرے ساتھ.....“ دے تم نے تو دکھ ہی رکھا ہو گا سارا گھر۔



روانی میں کہ بیٹھی تھیں۔

ایک عجب سازت آمیز احساس اس کی رگ رگ میں اتر گیا۔ اس سے نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

اسی دم احسن اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور تفکر واضح تھا۔ لائٹ گرے شلوار سوٹ میں اس نے کہنیوں تک چڑھائے وہ خالص گھریلو بے تکلفانہ حلیے میں تھا۔

شہوار پست پر اس کی موجودگی محسوس کرنے کے ایک دم چوک ہو گئی تھی۔

آؤ.....! دھرمیرے پاس بیٹھو۔“ صفیہ نے احسن کو اپنے قریب بلایا۔ احسن خاموشی سے ان کے پہلو میں بیٹھا۔

”جب بہت عزیز لوگوں سے دوری کی عادت ہو جاتی ہے تو شاید عزیز لوگوں کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔ کتنے دن

سے لگ رہے ہو.....“ صفیہ کے لہجے میں کسی بڑے نقصان کا تاثر تھا۔ احسن نے بے ساختہ ان کا ہاتھ تمام لیا۔

”امی! آپ بھی.....؟“ آپ بھی طعنہ زنیوں کی صف میں۔ میرے پاس بچائی کیا ہے۔ سوائے آپ کی بات

محبت کے احساس کے.....! مگر نہ میں تو ہر طرف سے خالی ہوں۔ آپ کی وجہ سے محبت پر ابھی تھوڑا سا اعتبار ہے۔“ ام

نے گہری نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھا۔

اس کے لہجے کی یاسیت پر صفیہ کا حس دل بھر آیا۔ ان کی آنکھوں سے چند قطرے ٹپک پڑے۔

کتنا دور ہو چکا ہے مجھ سے..... کیسے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا ہے۔

”امی! باپ نے گھر سے دور کر دیا ہے..... آپ دل سے دور نہ کیجیے گا۔“ اس نے ماں کے شانے تمام لیے۔

”خدا نہ کرے۔ تو تو میری عمر بھر کی کمائی ہے۔“

”امی! آپ لوگوں کی باتوں میں نہ آجائیے گا۔ صرف آپ کی ذات نے مجھے بہت کچھ کرنے کا حوصلہ دے رکھا

ہے۔ آپ کی دعا سے اللہ نے مجھے بہت دیا ہے۔“

”میری اپنی سوچ، اپنی عقل ہے۔ میں کیوں لوگوں کی باتوں میں آنے لگی..... مگر تم نے ایک عظیم غلطی کر ڈالی

ہے..... اس کا ملال میرے دل سے نہیں جاتا۔“

”میں اپنی بیوی کو لے کر گیا تھا امی۔ میں نے کوئی نفل غیر قانونی یا غیر شرعی نہیں کیا تھا۔“ وہ کہنے سے پہلے ان

عند یہ کچھ گیا تھا۔

”مگر بیٹے معاشرے کے کچھ ضابطے.....“

”چھوڑیے امی۔ مجھ سے پوچھ کر نہیں بنائے گئے تھے ضابطے۔ ان ضابطوں میں میرا کوئی حصہ نہیں..... میں!

اس ضابطے کو مسترد کرتا ہوں جس کی زود میری شہرگ پر پڑتی ہے۔

میں اپنی جس قانونی بیوی کو لے کر آیا تھا وہ کوئی پندرہ سولہ سال کی لڑکی نہیں تھی کہ مجھ پر قانون کی خلاف ورزی کا

الزام آسکتا۔

جب سینکڑوں انسانوں کی موجودگی میں ایجاب و قبول ہو چکا پھر مجھ پر کچھ اچھالنے کا مطلب.....؟

آدھی رات کو جب ایک عورت اجڑے اجڑے رہ جاتی ہے۔ جب سرمائے کی کمی کے سبب ایک کو خیر لڑکی پر

ناک فیصلہ ٹھونسا جاتا ہے۔ جب مجھ جیسے انسان کو اپنے پیاروں سے بے لوث ہونے کے باوجود گھر سے دور کر دیا جاتا

ہے۔ اس وقت معاشرے کے ضابطے بنانے والے ٹھیکیدار عرش پر بیر کرنے لگے ہوتے ہیں.....؟

ان کچھ اچھالنے والوں سے کہیے کوئی ایسا ضابطہ تیار کریں کہ اس معاشرے میں رہنے والے ہر شیخ رحیم اللہ

ہوں کو پناہ کی ضمانت مل سکے۔ عزت کا یقین مل سکے۔ مت چھیڑیے مجھے امی..... اب میں ہر غیر فطری چیز جس نہیں

بپا جاتا ہوں۔“ وہ پھٹ پڑا۔

بہار کی ٹوٹائیں کپٹنے لگی تھیں۔

بند ہو گئی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

ایسا نہیں دودھ میں زہر پلایا تھا.....! اتنا زہر کہاں سے آگیا اس کی زبان میں؟

مگر بیٹے! میں تو زندہ انہی لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔“

کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے فوراً بات کاٹ دی۔

”اب ماں بیٹا ایک دوسرے سے دور رہ سکتے ہیں تو ہر رشتے کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے۔“ اس کی ضد ٹوٹی دکھائی نہیں

ہے۔ اس کے لہجے میں سفاک اور بے رحم قطعیت تھی۔

نیکو کا گلا جملہ تیار کرنا مشکل ہو گیا۔

بہار علیحدہ ساکت وصامت بیٹھی اس کی زبان سے آگ برتی محسوس کر رہی تھی۔

میرے لیے قانونی و شرعی تفریز و دلیل کے ساتھ لے آئیے، میں اپنی غلطی تسلیم کر لوں گا۔ بصورت دیگر میں کسی

کی الزام کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔“ وہ اسی انداز میں مزید کہتا ہوا۔

مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہاں فرد واحد کی ضد سے پورا گھر اندھا بنا رہا ہے۔“ صفیہ نے

نار سمجھایا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں..... آپ یہ بات اباجی کو سمجھانے کی کوشش کیجیے۔“ وہ آرام سے بولا۔

”مگر اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟“ وہ زچ ہو کر پوچھنے لگیں۔

میں سخت محنت کر کے اپنے بہن بھائیوں کے لیے مضبوط مستقبل کا خواہش مند ہوں۔ فی الحال یہی میرا مقصد

ہے..... احسن نے جواب دیا۔

”کس طرح؟ جس شاخ پر بیٹھے ہو..... اسی کو کاٹ رہے ہو.....“ صفیہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔

یہ شاخ کیسی بھی چو لہے کا ایندھن بن سکتی ہے۔ میرے گرنے کی پروا مت کیجیے۔“

ارباب کا جواب تیار..... صفیہ کا داغ چکرانے لگا۔

”آپ نے کھانا کھالیا.....؟“ احسن نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

”ہاں..... ہم کھانا کھا کر آئی ہیں۔“ صفیہ نے سامنے بیٹھی شہوار کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”نیکے تم شہوار سے پوچھ لو۔ اس نے بہت تھوڑا سا کھانا کھایا تھا شاید اسے بھوک لگ رہی ہو۔“

”آئیے امی میں آپ کو گھر دکھاؤں۔“ وہ سنی آن سنی کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں! وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔“

مگر فی الوقت نہ آپ سونے کے موڑ میں ہیں اور نہ میں..... ٹھیکے ہوئے باتیں بھی کریں گے۔“

”نہیں! یہ دیکھ کر صفیہ کا دل ڈوبا جا

”آؤ شہوار تم بھی آ جاؤ.....“ صفیہ کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔

شہوار نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔

کیا کرو گی یہاں اکیلی بیٹھ کر؟..... چلو اٹھو۔“

”آپ جائیں خالہ جان..... مجھے نیند آرہی ہے۔“ اس نے گم صم سے انداز میں جواب دیا۔  
”تو پھر سو جاؤ۔“

”آؤ..... پہلے میں تمہارے کھانے کا انتظام دیکھ لوں۔“

احسن نے ایک لمبے کوٹھڑ کران دونوں کی گفتگو سنی۔ پھر باہر نکل گیا۔

”میں نہیں سو جاؤں گی۔“ در ماندگی کا احساس عود کر آیا تو آواز میں آنسوؤں کا تاثر چھلک پڑا۔ مسلسل اصرار کیا  
اس کو لاقحہ تھی۔ اس کی گویا جیس ملی جگی تھیں۔ احسن کا اس سے مخاطب ہونا اس کی جیت نہیں تھی۔ یہ تو عینہ سگڑا  
صدقہ تھا۔ جب امید کی گہری نیند ہوئی ہوئی ہو۔

تو زندگی کی رفتار بھی ست پڑتی محسوس ہوتی ہے۔ ایک جمود جو اس پر چھا جاتا ہے۔

انگ اور رنگ تو وہ خوشنما تھیں ہیں جو خوش امید کی چین میں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ درحقیقت اس نے ایک  
مرتبہ بھی احسن کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس کا دل اس امر کے لئے راضی نہیں ہوتا تھا۔

”کیوں چھوٹے بچے کی طرح بے نکی ضد کرتی ہو۔ میں تمہارا مقام دینے یہاں آئی ہوں۔ تمہیں ساتھ لانی ہوں گی۔  
تیس سال سے اوپر کی گزرتی داؤ پر لگا کر آئی ہوں۔ تمہارے خالو کو ہوا بھی لگ گئی کہ میں احسن کے پاس ہو کر آ رہی ہوں۔“

میری بد نصیبی یہ ہے کہ مجھ پر تو تم لوگوں کو رحم بھی نہیں آتا.....“ ان کا لہجہ دکھ سے بوجھل ہو گیا۔

”تم وہیں جا کر آرام کرو جہاں پہلے آ کر سوتی تھیں..... اور سنو اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ تمہارے کانوں میں بندے غے  
کہاں گئے؟“ معان کی نظر اس کے کانوں پر پڑی۔

”پرس میں ہیں۔“ (شکیلہ نے دیا تھا بلک کلر کا پرس) وہ سادگی سے بولی۔

”اپنے آپ کو بھی کسی تھیلے میں رکھ لو سنیاں کر۔ چلو بندے کانوں میں ڈالو۔“ وہ جیسے ناراض ہو کر کہہ رہی تھیں۔  
”کیسی دیران ہو رہی ہیں آنکھیں..... کوئی سرمہ کا جل..... آج کل کی لڑکیاں تو اپنے وزن سے زیادہ میک اپ کا

شہوار آنسو پیٹے ہوئے پرس کھول کر بندے نکالنے لگی۔

”یہ خالہ جان تو بالکل سی ہدیگی ہیں۔“ اس نے اچھٹے ہوئے سوچا۔

”میرے سنگھار میں اب کوئی اثر نہیں۔“

(تیس سال پہلے آپ نے کسی انسان کو نہیں پتھر کے دیوتا کو جنم دیا تھا۔ کسی دیوتا سے کم تو نہیں سمجھتا ظالم خود کو۔)  
”جاؤ تم بیٹروں میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔“

”آپ کہاں سوئیں گی؟“ اسے نہ جانے کیوں خالہ سے بے حد حیا آنے لگی تھی۔ کچھ ان کا تاکیدی انداز بھی  
تھا۔

”پورا گھر پڑا ہے سامنے۔ کہیں بھی سو جاؤں گی۔“ وہ باہر نکل گئیں۔

شہوار بیٹروں میں چلی آئی۔

اس نے شخص خالہ کی بات مانی تھی۔ مزید کسی الجھن سے بچنے کے لئے..... درحقیقت اس کے دل میں احسن کے لئے

میں احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔

میں انداز میں اسے اندر لایا تھا۔ وہ مستقبل کے امریکا کا اندازہ لگانے کے لئے کافی تھا۔

ہانے دروازہ کھل کر کیا تو بہت خوبصورت ٹھنڈک نے اس کا استقبال کیا۔ اندر اے۔ سی آن تھا۔ گویا خوب ٹھٹھا  
ہوں۔

غلاب گاہ میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ آف دہائٹ دیواریں اس کی بیلو کلر کی ہو چکی تھیں۔ فرنیچر دہائٹ کلر کا  
بے دہائٹ تھے۔ کارپٹ دیواروں کا ہم رنگ تھا۔ سب کچھ تھا اس کے ساتھ بے ترتیبی ملائی تھی..... سائید ٹیبلر پر  
بڑھے کاغذ، چائے کا کپ، بیڈ پر ہاتھ ناول، اخبارات ٹائی..... کارپٹ پر دو تین انگلش میگزین، ایٹش ٹرے ایک  
واظہ بھی پڑا تھا۔ بیڈ کے سر ہانے لگے ریک میں بے ترتیب کتابیں اور ایک کونے میں ذرا سی جگہ کو غنیمت سمجھتے  
بے چارہ ٹیلی فون سیٹ بھی چپکا ہوا نظر آیا۔

”ہوں..... گویا فون بھی لگ چکا ہے۔ شاید ابھی شکیلہ کو بھی علم نہیں مگر نہ وہ ذکر ضرور کرتی۔ نہ بتانے کی کوئی وجہ  
بازن میں بھینا ہوگی۔“ وہ زہریلے انداز میں دھیرے سے مسکرائی۔

اٹا بھلا ہوا کرہ دیکھ کر وہ تو چکر اکر رہ گئی۔

کرے میں تو چیزیں رہتی ہیں۔ خود کہاں رہتے ہیں موصوف.....؟ ابریر فریشر کی نہایت لطیف مہک کرے کی فضا  
نذران پرور بنائے ہوئے تھی۔

کس درجہ اطمینان سے یہ شخص زندگی گزار رہا ہے۔ جب کہ نقصان کے سواے مسلسل ہو رہے ہیں۔

اے جیسے احسن کے سکون سے حد محسوس ہوا تھا۔

دروں کو خوار کر کے جنت بسائی ہوئی ہے..... ہونہہ.....

”تو پھر اس کے ساتھ کیوں نہیں جیسے میرے نہ ہونے سے بہت فرق پڑتا ہو.....“ معاس کے کانوں میں احسن کے  
اٹا بڑکت آئی۔

سنے کرے سے ایک احساس تو ہیں اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگا۔

دروں سے چیزیں سمیٹنے لگی۔ کتابیں ترتیب سے سیٹ کیں۔ ٹیلی فون سیٹ کو فرینے سے رکھا۔ ناول اٹھا کر ہاتھ روں  
کا کرانیں۔

ٹائی ہاتھ میں لی تو ایک پیاری سی مہک مشام جاں کو معطر کرتی چلی گئی۔ ایسا لگا جیسے ٹائی ہاتھ میں نہ لی ہو بلکہ اس کے  
ہاتھ پر سے ہاتھ رکھا ہو۔

داروڑ ب کھول کر وہ ٹائی لٹکانے ہی لگی تھی کہ دروازہ کھلا اور احسن اندر داخل ہوا۔ اس کی حالت چور جیسی ہو گئی.....  
کاؤسے سے زیادہ وجود داروڑ ب کے پٹ کی اوٹ میں تھا..... اف.....

ٹھکانے نے یہی سمجھا ہو گا کہ میں کمرے کی تلاشی لے رہی ہوں۔ بارے شر مندگی کے اس کی حالت غیر ہو گئی.....  
اٹے آہستہ سے داروڑ ب کا پٹ بند کا اور کارپٹ پر سے میگزین اٹھانے لگی..... ایٹش ٹرے اس کے سر ہانے جگہ بنا کر

چند کی داڑھی میں بیٹھے کے مصداق وہ زیادہ پھرتی سے صفائی میں مشغول ہو گئی اور یہ ظاہر کرنے لگی کہ داروڑ ب بھی  
مٹانے لگا ہی کی وجہ سے کھولی تھی۔ یا داروڑ ب کھولنے کا عمل ”صفائی“ کے عمل کا حصہ تھا۔

ہاؤ بھری طرح رو پڑیں۔

پہلی نے آگے بڑھ کر منہ کواپنے سینے سے لگا لیا۔

ہیں کرو بیٹے..... یہ میری تاب سے بہت زیادہ ہے۔“ ان کی آواز بھگ گئی۔

آپ کیا چاہتے ہیں پاپا..... میں اتم اروں.....؟ میں ماتم نہیں کر سکتی۔ میری عمر ماتم کرنے کی نہیں ہے۔ میں ماتم رہاں گی۔“

بہ جان ہی ہو کر انعام علی کے بازوؤں میں جھولنے لگی۔

ہمہ..... تم کسی نفسیاتی معالج سے رابطہ کرو..... کہیں خدا نخواستہ.....“ اسد کی امی نے تشویش بھری نظروں سے منظرہ دیکھا۔

”امی!“

ایم خالد اندر چلی آئیں اور کمرے کا ماحول دیکھ کر ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گئیں۔

”کوئی خبر آئی بہن.....؟ انہوں نے نور بانو کو مخاطب کیا۔

”جو خبر آتا تھی، وہ تو آ ہی چکی..... اب کوئی خبر نہیں۔“ نور بانو نے ایک سرد آہ کھینچی۔ خاصی دیر کمرے میں خاموشی رہی۔

نور بانو تو مزید زیر عتاب آ چکی تھیں۔ بقول انعام علی کے تم اسنے پُر زور انداز میں اس کی حمایت نہ کرتیں تو میں کبھی ہلائی نہ کرتا..... انہوں نے تو اس لیے ہائی بھری تھی کہ ان کے انکار پر بیٹی ان سے کبیدہ خاطر ہو کر ماں کی مزید لاپرواہی بن جائیں۔

انہیں اسٹا کر انعام علی کی سمت دیکھنے لگیں جو منظرہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کر رہے تھے۔“ نصیب نصیب کی ہے۔

براول خالی ہے اور کلائی میں چوڑیاں پڑی ہیں۔

برہی بیٹی کا دل آبا ہے مگر چوڑیوں پر افتاد ہے۔

برہی چچ کر غم مناسکتی ہے۔ مجھے اس کی طرح محروم رہنا ہے مگر مسکراتا ہے۔

اس معاشرے کی بیوہ مصلحتاً کر نسیں گی تو جرم ہوگا۔

میں نہیں منسو گی تو جرم ہوگا۔

گال اس کی سمجھ میں دکھا آ جائے تو اسے یہ صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ مل جائے۔“

خرو نے ایک بار پھر ہوش کی وادی میں قدم رکھا تھا۔ آنکھیں پھیلا پھیلا کر چند ٹاپے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اپنی داروہ بالکست بڑھ گئی۔

داروہ کھول کر نہ..... جانے کیا دیکھ رہی تھی..... پانچ منٹ کی الٹ پلٹ کے بعد وہ پلٹی۔ داروہ روپ کا دروازہ کھولا پھوڑ کر۔

اس کے ہاتھ میں سرخ ساڑھی تھی..... بے حد خوبصورت کام سے جگر جگر کرتی ساڑھی.....

”ایمہی اسد کی والدہ کے پاس آ گئی۔

”انہی..... یہ اس مرتبہ خاور نے گفت کی تھی ہماری شادی کی سالگرہ پر..... میں یہ بہن لوں..... خاور آنے والے

دو افراد کے مابین تعلقات اس مرحلے سے بھی گزر سکتے ہیں کہ قربت کی حد کے بعد تکلیف و اجنبیت کا منہ کریں۔

احسن سائڈ فیل کی دروازہ کھول کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ اس کی موجودگی سے سخت کانفیس ہو رہی تھی۔ معا اس نے ایک چھینک ماری پھر دوسری..... تسری..... گویا چھینکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ احسن داروہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اور آگے بڑھ کر اسے سی کی کونٹنگ کم کر دی..... پھر دروازہ بند کر دی اور اس کی سمت دیکھنے کھول کر باہر نکل گیا۔

تین دن گزر چکے تھے۔ رشتے دار بھی ایک ایک کر کے جانے لگے تھے۔

انعام علی ہنوز اپنے سب کام چھوڑے بیٹی کی دلجوئی میں لگے ہوئے تھے۔ اسد کی والدہ وہیں تھیں۔ اور داری سے گھر کے معاملات سنبھال رہی تھیں۔

ڈوبنے والے جہاز کے مسافروں میں سے صرف تیرہ کی لاشیں مل سکی تھیں جن میں سے چار عملے کے اور اٹھ خاور کا کوئی اہل تپا نہیں مل رہا تھا۔

شام ڈھلے اسد گھر میں داخل ہوئے تو منظرہ تیر کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی۔

”اسد بھائی.....! سب سے کہہ دیجئے، میں بیوہ نہیں ہوں..... میں نے اپنے شوہر کا کفن نہیں چھوایا۔ میرے دل پر کتنی روٹی..... میں نے ان کی قبر پر پھول نہیں چڑھائے۔ پھر میں بیوہ کیوں کہلاؤں.....؟ میں ہر شام ہاتھ گھار کروں گی اور خاور کا انتظار کروں گی دیکھیے گا۔ وہ اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھائے الہی ہو آ جائیں گے..... اور اپنے وعدے کے مطابق کہیں نہیں جائیں گے۔

ایک عمر کے دھڑکے ختم ہو جائیں گے..... پھر کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔ میری زندگی میں سکون ہی سکون ہوگا۔“ اس نے اسد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نہایت پرسکون انداز میں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ اسد کے سینے میں ایک لہر اٹھی۔

”بھابی..... آپ غسل کر کے کپڑے بدل لیجئے۔ بہت میلے ہو رہے ہیں.....“ انہوں نے اس سے نظریا ہوئے کہا۔

”آپ خاور کو آ لینے دیجئے..... پھر دیکھیں صبح شام کپڑے بدلوں گی.....“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں گویا انعام علی کے دل میں تیر سا گڑھ گیا۔

نور بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انہیں اپنے آپ پر قاتو نہیں رہا تھا۔

”امی..... آپ نہیں روئیں آپ کو نوٹس روئے کی عادت سی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ مجھے دیکھئے ہر وقت ہنسنے والی..... وہ مسکرائی۔

”اچھا بتائیے، آپ کیوں رو رہی ہیں.....؟ کیا آپ نے خاور کی ڈیڈ باڈی دیکھی ہے۔ ہمارے سامنے کوئی نہیں..... ہم کیوں روئیں.....؟ سب میری خوشیوں سے جلتے ہیں..... اسی لئے یہ افواہ اڑائی کہ خاور کا جہاز ڈوب گیا مجھے اکیلا چھوڑ کر جا ہی نہیں سکتے۔ ان کے وعدے سچے ہوتے ہیں۔ ان کی اسی بات نے تو مجھے متاثر کیا ہے۔ جو کچھ وہی کرتے ہیں۔“

ہیں مجھے یہ ساڑھی پہنہ دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے۔ ٹھیک ہے پاپا۔۔۔؟“

انعام علی نظر میں بڑا کردوسری ست دیکھنے لگے۔

منزہ ہاتھ روم میں چلی گئی۔ کمرے میں ہر شخص ایک دوسرے سے نگاہ بڑا کر ایک دم خاموشی کے عالم میں رہا تھا۔

خاصی دیر بعد منزہ باہر آئی۔ گولڈن بلاؤز کے ہمراہ سرخ ساڑھی بہت قریب سے باندھی تھی۔ ڈریسنگ سائے بیٹھ کر وہ بال بنانے لگی۔

انعام علی نے اسد کو اشارہ کیا اور دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے۔ اس نے بالوں میں برش کر کے دیا تھا۔

”ای اریڈلپ سنک لگا لوں۔“ وہ اسٹول گھما کر ان کی سمت مڑی۔ نور بانو کے حلق میں کچھ انگ گیا۔ دونا اٹھائیں۔

”ویسے خاد کو ڈارک میک اپ پسند نہیں ہے۔ کہتے ہیں، تمہیں میک اپ کی کیا ضرورت ہے تمہارا تو میک اپ میں نے کر دیا ہے۔“

پھر بھی۔۔۔ ای۔۔۔ عورتوں کو میک اپ کا شوق تو ہوتا ہی ہے، چاہے وہ کتنی خوبصورت ہوں۔ کیوں خالہ؟“ خالہ سے تائید چاہی۔

خالہ بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

منزہ نے لاکر سے چھوٹی چھوٹی جھکیاں نکال کر پہنیں۔ نور بانو نے صرف ایک نظر اس کی سمت دیکھا اور جیسے ان کا ہیچ شککتے کوکوں پر ڈال دیا۔

”خادر کہتے ہیں سرخ کپڑوں کے ساتھ جھمیں کی خوشبو بہت سوٹ کرتی ہے۔ کپڑوں کا رنگ تیز ہو تو استعمال کرنا چاہیے۔“

دونوں نیچے نیچے ہمسائی کے پاس تھے۔ اس لئے گھر میں حدود سکوت محسوس ہو رہا تھا۔

انعام علی کے کہنے پر اسد منزہ کو سائیکائٹس کے پاس لے جانے پر رضامند ہو گئے تھے۔

”آئیے بھابی۔۔۔۔۔ ذرا باہر چلتے ہیں۔“

وہ شعلہ جوالہ بنی منزہ کو دیکھ کر قدرے شگفتہ گئے تھے۔

”میاں۔۔۔ کہاں لے جا رہے ہو بند نصیب کو۔۔۔۔۔ یہ تو عدت میں ہے۔“ خالہ نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

”عدت گزارنے کے لئے ان کا زندہ رہنا شرط ہے۔“ انہیں جیسے غصہ آ گیا تھا۔

”کمال ہے۔۔۔ حالات کی نزاکت و تبدیلی بھی لوگ نہیں دیکھتے۔ اس کا ذوق تو ازن بکڑ رہا ہے، یہاں رہتے ہی نبھانے کی پڑی ہے۔ ٹھیک ہے عدت شرعی حکم ہے۔ مگر جان بچانے کے لئے قدرت نے تیسرے دن مرد و عورت کو دیا ہے۔۔۔۔۔ جان سے بڑھ کر تو یہاں کسی چیز کی اہمیت نہیں ہے۔“

آئیے بھابی پلیز۔۔۔ ای۔۔۔ ساتھ آپ بھی آجائیں۔“ اسد نے احتیاطاً اپنی والدہ کو ساتھ لینا مناسب سمجھا۔

”اسد بھائی! ای کو بھی لے لیں۔۔۔۔۔ ورنہ خادر پوچھیں گے ای مجھے ریو کر نے کیوں نہیں آئیں۔“ منزہ نے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بھابی اتم جاؤ بس۔۔۔۔۔ مجھے نماز پڑھنا ہے۔“ وہ آنسو ضبط کرتی ہوئی ہاتھ روم کی سمت بڑھ گئیں۔

بچوں کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اس کی ذہنی بے ترتیبی کا ایک مظاہرہ یہ ہوا تھا کہ وہ بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ میں، ہاتھ روم میں استعمال ہونے والی ربڑ کی چپل تھی۔۔۔۔۔ اور ہاتھ میں پرس کے بجائے پرفیوم کی شیشی تھی جو اس کے اسٹائل میں تمام کر سینے سے لگا رکھی تھی۔

دبی گاڑی کا انگا دوا دوا زہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ لامحالہ اسد کی والدہ کو پیچھے بیٹھنا پڑا۔ انہوں نے آگے جھک کر منزہ ہالک لگا دیا۔ گاڑی ابھی ذرا ہی آگے بڑھی تھی کہ وہ ایک دم پر جوش ہی ہو کر اسد کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔

مدبھائی!۔۔۔۔۔ پلیز مجھے یہ گھر لے دیں۔“ وہ ہر شوق انداز میں کہہ رہی تھی۔

ا۔۔۔۔۔ ہاں بیٹے۔۔۔۔۔ تسلی رکھو۔۔۔۔۔ لیتے ہیں گھر۔۔۔۔۔“ اسد کی والدہ نے ملاحت سے کہا۔

لے لے لے۔۔۔۔۔ وہ گھر لے دے دو۔۔۔۔۔

اپنی اتنی لے دیجیے۔۔۔۔۔ دو ہاتھ میں باندھوں گی اور ایک بالوں میں لگاؤں گی۔“

چاہی، تین دے دو۔۔۔۔۔“ انہیں روٹا آ گیا۔

مذہن پرس نکال کر پیسے دیے اور گاڑی پھر چل پڑی۔ منزہ گھر لے جانے میں منہک ہو گئی تھی۔

بچے میں اس کا چہرہ دیکھ کر اسد کی والدہ کی آنکھیں بھرتی تھیں۔

اس کے جھکے کا تاواں اس کے ذمے لگا ہے۔۔۔۔۔؟

اس کی عمر بھی اتنی نہیں کہ اپنے گناہوں کا اتنا عظیم کفارہ ادا کرے۔

”اپنی! آپ کے پاس ایک پن ہے۔ کہیں یہ گر نہ جائے۔“ منزہ کو سر میں اٹکے ہوئے گھرے کی طرف سے تشویش

”نہیں بیٹے۔۔۔۔۔ میں کبھی بالوں میں پن استعمال نہیں کی۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”ویسے خادر مجھے اس حلقے میں دیکھیں گے تو حیران تو۔۔۔۔۔ بہت ہوں گے۔ کیوں اسد بھائی۔۔۔۔۔؟“

اسد نے وٹا اسکیرین سے پار دیکھتے ہوئے بشکل اپنی گردن کو حرکت کرنے سے روکا۔

”خادر۔۔۔۔۔ بہت سخت امتحان ہے یا۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے اذیت کے اثر سے خود کو بے حال محسوس کیا۔

ابنا ناکہ صبح اس کے میکے ڈراپ کر گئے تھے اور کہا تھا کہ رات کو لے جائیں گے۔ ناکہ گھر میں داخل ہوتے ہی اس ناکہ ابھی جیسے کسی نے پنجرہ کھول کر پرندہ آزاد کیا ہو۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی نبیلہ اور انیلا ناشتے کے بعد والے کاموں میں مگن تھیں۔ انیلا نے پورے برآمدے پر لٹائی گھاٹ کا سامنا حوالہ بنا رکھا تھا۔۔۔۔۔ گویا اس کے ذمے اب وہ کام آگئے تھے جو ناکہ کرتی تھی۔

”آپا۔۔۔۔۔ آپا۔۔۔۔۔! وہ والہا نہ اس کی سمت بڑھی تھی جیسے مدتوں بعد مل رہی ہو۔

”السلام علیکم بلو آپا۔۔۔۔۔ کیسی ہیں۔۔۔۔۔؟ وہ انیلا کو گلے لگاتے ہوئے نبیلہ سے بھی مخاطب ہوئی۔

ناکہ جب بھی میکے آتی تھی تو نبیلہ اس کے ذہن پر سوار ہو جاتی تھی۔ ہزار اس نے بہن کو شریک راز کر لیا تھا مگر پھر بھی بہن سادہ کپڑے پہن کر آتی تھی۔ نہ سسرال کے قصے سناتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے ان قصوں سے نبیلہ کے اندر

لگا احساسِ محرومی جاگ پڑے گا۔۔۔۔۔ نہ ہی وہ بہنوں کے سامنے باہر کے ساتھ بیٹھ کر مذاق کرتی تھی بلکہ جب باہر

اسے لینے آتے تو وہ زیادہ کچن ہی کا کام سنبھال کر ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ یوں جیسے اس سے کوئی جوڑا ہوا ہو۔

”ٹھیک ہوں..... تم سناؤ۔“ نیلہ بغیر برتن دھوئے کچن میں سے باہر چلی آئی۔

”ٹھیک ہوں..... اور آج تو بے حد خوش ہوں کہ بہت سارا وقت آپ کے ساتھ گزاروں گی۔ میں نے باہر دیا ہے کہ سر شام ہی لینے نہ پہنچ جائیں۔ امی بھی گھر سے غیر حاضر ہیں۔ مجھے اپنے بہن بھائیوں کے پاس خاصا وقت چاہیے۔ امی نہیں گی تو کیا سوچیں گی کہ پیچھے آئی بھی نہیں۔“

”پتا نہیں کیسے ہیں باہر بھائی.....“ انیلانے ناک چڑھائی۔ ”شکل سے تو بہت اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک کے لیے بھی نہیں چھوڑا ہماری بہن کو..... دلہن بنایا ہے، خرید لیا ہے.....؟“ وہ خفگی سے گویا ہوئی۔

”کیا فائدہ..... ان باتوں سے گھر کا ماحول ہی خراب ہوتا ہے۔ جب ساری عمری ایک دوسرے کے ساتھ رہنا رات کا کیا مسئلہ.....“ نیلہ نے پرسکون انداز میں انیلانے کو ٹوکا۔

”اصل مقصد تو ملاقات کرنا ہوتا ہے۔ جب گھر بن جاتے ہیں تو مالکن کی گھر سے زیادہ دیر کی دوری پیچھے کام کا مزہ لگاتی ہے..... اور کام بڑھ جاتا ہے۔ دیکھ نہیں رہیں..... امی کی درجہ سے گھر میں کتنے کام کئے ہوئے ہیں۔ مزید گویا ہوئی۔

”امی کی بات دوسری ہے۔ آپا کی تو نئی نئی شادی ہوئی ہے۔“ بڑی نکتہ رس تھی انیلانے۔

”جب ذمہ داریاں سر لگ جاتی ہیں تو سننے پرانے سب جھٹنے چلے جاتے ہیں۔“

”کتنی سمجھدار ہیں آپا.....!“ نائلہ نے دل ہی دل میں نیلہ کو سراہا۔

”آپا کے گھر میں تو نوکر ہیں کام کرنے کے لیے..... باہر بھائی ایسے ہی پوکر کرتے ہیں۔“

”اچھا چھوڑو..... تم کیا قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔ آجاؤں گی کسی دن رہنے۔“ نائلہ نے انیلانے کو ٹوکا۔

”اور جیسے وہ رہنے دیں گے..... میری اتنی سہیلیوں کی باجیاں شادی شدہ ہیں۔ چرہ پرندہ دن آکر پڑاؤ ڈالتی وہ تو بلکہ تنگ آ جاتی ہیں۔ وہ میری دوست ہے ناں شکستہ..... کہتی ہے..... باجی آتی ہیں تو میں سب سے پہلے ڈرائنگ کے قہقی پر دے اور ڈیکوریشن پیس سنبھالتی ہوں۔ ان کے بچے بہت شرارتی ہیں۔“

”زور تو بچوں پر ہوا..... باجی کا کیا قصور.....“ نائلہ مسکرائی۔

”تمہیں کچھ سمجھا رہی ہے۔“ نیلہ شرارت سے مسکرائی۔ نائلہ بھی جھینپ کر مسکرا دی۔

”مجھے کیا سمجھا رہی ہے۔“ نائلہ نے تجاہل برتا۔

”میری کہ بچہ کو کسکا سمجھا کر لایا کرتا۔“ نیلہ ہنسی۔ نائلہ بھی ہنس پڑی۔

”خیر، میں ایسی نہیں ہوں۔ مجھے تو بہت شوق ہے، میرے ڈھیر سارے بھانجے، بھانجیاں، بیٹے، بیٹیوں ہوں پھوڑ کرنے والے۔“

”احسن بھائی کو فرمائش بھجوا دو۔ سب سے بڑے وہی ہیں۔ پہلے ادھر سے ہونا چاہیے۔“ نائلہ نے ہنس کر کہا۔

”شہوار بھائی سے بھی پوچھ لو۔ انہیں فرصت بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ تم نے ڈھیر سارے..... کہا ہے۔“ نیلہ مسکراتے ہوئے نائلہ کی سمت دیکھا۔

”خدا کرے امی احسن بھائی کا معاملہ نسا کر آئیں۔ مجھے ان کی طرف سے بہت فکر ہے۔ شہوار بھائی ان کے

باجیاں تو بھائی جان کو بہت آرام ہو جائے گا۔ اور میں سکون مل جائے گا۔“

”تھکلیہ باجی بتا تو رہی تھیں کہ بھائی جان بہت آرام سے ہیں۔ ہو سکتا ہے، وہ صرف ظاہر کرتے ہوں۔ انہوں نے تو مجھے اپنے جوتے بھی پالش نہیں کیے تھے۔“ نیلہ نے نائلہ کے جواب میں اپنی فکر مندی ظاہر کی۔

”بعض دفعہ تو احساس ہوتا ہے ہم سخت بد نصیب ہیں۔ اللہ نے اتنا اچھا بھائی دیا مگر ہم ان کی صورت کو ترستے ہیں۔ بالکیاں اپنے بھائیوں کی باتیں کرتی ہیں تو مجھے تو بہت رونا آتا ہے۔“

انیلانے کپڑے نچوڑتے ہوئے نہایت آزر دگی سے کہا۔

”مجھے تو حیرانی ہوئی ہے کہ باجی کے دل میں ان کے لیے ایک لمحے کو بھی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوتا۔“ نائلہ نے بھی بہت دکھ سے کہا۔

”ایسی بھی کیا آتا..... کہ انسان بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی قیمتی زندگی محروم رہ کر گزارے۔“ نیلہ نے خاصی تخیل سے کہا۔

”مگر کون سمجھائے۔ تلخی کے گلے میں گھنٹی کون ڈالے.....؟“ نائلہ نے بھی قدرے تلخی سے کہا۔

”بھائی جان کی وجہ سے امی کے چہرے پر جو سکون نظر آنے لگا تھا۔ وہ بھی رخصت ہو گیا۔ آئے دن ان کے سر میں روز جتا ہے۔“ نیلہ نے کہا۔

”سوچتی جو ہوں گی۔ بھائی جان تو ویسے بھی انہیں عزیز از جان ہیں۔“ نائلہ نے دکھ سے کہا۔

”راہیلہ، بیلا کب تک آئیں گی.....؟“ نائلہ نے جان بوجھ کر موضوع بدلا۔ کیا فائدہ اس بات کے ذکر سے جس سے کچھ حاصل نہ ہوتا ہو۔

”آج تو شاید دونوں جلدی آجائیں۔ راہیلہ کے پریکٹیکل تو کل شاید ختم ہو گئے۔“ انیلانے جواب دیا۔

”پتا ہے آج میں یہ پروگرام بنا کر آئی ہوں کہ یہاں سے شاپنگ کرنے جاؤں گی۔ آپ میں سے کسی کو ساتھ لے کر..... گھر کی کئی ضروری چیزوں کے علاوہ چند سوٹ کاشن کے لینا ہیں۔ مٹی پنڈی میں ہوتی ہیں..... باہر مصروف کاروبار.....

دیے بھی گھر آکر وہ باہر جانے کے تصور سے ہی چڑتے ہیں..... میں نے اندازہ لگا لیا تھا، اس لیے ان سے کبھی کہا ہی نہیں۔ ہماری ساتھ والی سپر مارکیٹ سے بہت اچھے پرنٹ لائی ہیں..... میں آج دراصل اسی مقصد کے لیے آئی ہوں۔

شادی کے ریشمی کپڑے دیکھ دیکھ کر میری تو طبیعت خراب ہونے لگی ہے۔ پتا نہیں امی کو کیا دھیان آ گیا تھا پنڈی سے لائی قمیص لان کے دوسوٹ..... دو تین شادی سے پہلے جو پہنتی تھی وہ لگتی تھی۔ مگر وہ پرانے ہی تو تھے۔ کتنا چلتے.....؟

آپا! آپ چلیں گی.....؟ اس نے نیلہ کی سمت دیکھا۔

نیلہ نے اس کی سمت دیکھا۔ کتنا ڈھال لیا تھا اس نے وقت کے سانچے میں خود کو۔ کسی طرح بھی تو کچھ ظاہر نہیں کرتی۔

حالانکہ اس کا وہ چہرہ آنکھیں آنسو کرب اور بے بسی میرے دل پر نقش ہو چکی ہے جو اس کی شادی کے اگلے روز مائے آیا تھا۔

ایک نفسیاتی مریض کے ساتھ وقت کاٹنا..... کوئی ٹکسی کھیل ہوتا ہے؟

”مجھے تو بہت کام ہے۔ انیلانے کو لے جانا.....“

”ہاں آپا۔ میں تو تیار ہوں۔ مجھے تو ویسے بھی سپر مارکیٹ سے شاپنگ کرنا اچھا لگتا ہے۔ ورائٹی جو بے حد ہوتی ہے۔



آپ کی شادی کی زیادہ تر شاپنگ امی کے ساتھ وہیں سے کی تھی۔ "انیلا جیسے خوشی سے کل ہنسی۔

"اباجی کب تک آجائیں گے۔" کیونکہ شیخ صاحب کا کوئی مخصوص وقت نہیں ہوتا تھا واپسی کا۔ اس لئے ناملہ یہ رہی تھی۔

"آج کل کویت ہو جاتے ہیں۔ وفاقی مختص سیکرٹریٹ میں دو گھنٹے کا پارٹ ٹائم کر رہے ہیں۔ عارضی طور سیٹ خالی ہوئی تھی وہاں۔" نبیلہ نے بتایا۔

"کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اس عمر میں کوئی محنت کرنے کی؟" ناملہ کو افسوس سا ہوا۔

"اب ان کے معاملے میں کون بول سکتا ہے۔ جب سخت ضرورت تھی اور امی ان سے پارٹ ٹائم کیلئے کہا کرتی تھیں سخت ناراض ہوتے تھے کہ یہ عورت مجھے کلبو کا تیل بنا دینا چاہتی ہے۔" نبیلہ نے سنجیدہ انداز میں باپ کے الفاظ دہرائے۔

"خیر ہم جلدی لوٹ آئیں گے۔" ناملہ نے کہا۔

"جب تک میں دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔" ناملہ نے نبیلہ سے کہا۔

"سب ہو جائے گا۔ تم بے فکر ہو اور آرام سے بیٹھو۔"

"چھوڑیں آپ! آپ تو بہت ہی تکلف کرنے لگی ہیں۔ حد ہوگئی ہے۔" وہ آستینیں چڑھا کر برتن دھونے لگی۔

"کیا کر رہی ہو نیلی۔۔۔۔۔ وصل جائیں گے۔ اپنے گھر سے بھی کرتی ہوئی آئی ہوگی۔" نبیلہ نے اسے روکا۔

"انیلا کو میں لے جاؤں گی تو پیچھے آپ اکیلا رہ جائیں گی۔ کیا کیا کریں گی؟ اب تو گھر میں امی بھی نہیں ہیں۔

اف کیسا عجیب لگ رہا ہے امی کے بغیر یہ گھر۔۔۔۔۔" وہ تیز انداز میں برتن دھونے لگی۔

نبیلہ خاموش ہو کر دوسرے کام میں لگ گئی۔

انیلا نے جلدی جلدی کپڑے دھوئے پھر نہانے چلی گئی۔ ناملہ نبیلہ کے ساتھ دوپہر کے کھانے میں مدد کرانے لگی۔

جب تک انیلا تیار ہوئی اچھا خاصا کام سمٹ چکا تھا۔

دونوں رکشے میں بیٹھ کر سپر مارکیٹ چلی آئیں۔ ناملہ نے تین چار لان کے سوٹ خریدے۔ ایک زبردستی انیلا کو

دلایا۔ کچھ ٹائڈز خریدے۔ مرج مصلحے کی پیکٹ لئے۔ راؤسک کا ایک شلوار سوٹ باہر کیلئے خرید اٹھا۔

ساڑھے نو سو روپے کا ایک شلوار سوٹ تھا۔ انیلا تو حیران رہ گئی تھی۔

"اتنا مہنگا۔۔۔۔۔!! آپا بابر بھائی کچھ نہیں گے تو نہیں۔۔۔۔۔؟ اباجی تو سو پچاس روپے زیادہ خرچ کرنے پر ہنگامہ کھڑا

دیتے ہیں۔"

ناملہ نے کوئی جواب نہ دیا 'صرف مسکرا دی،

"ارے آپا۔۔۔۔۔ آپ تو بہت امیر عورت ہو گئی ہیں۔ ایک وقت میں ہزاروں روپے کی شاپنگ کرتی ہیں۔" انیلا کو پیچھے

رٹک رہا تھا۔

"فکر نہ کرو۔۔۔۔۔ اللہ تمہیں بھی یہ سب دے گا۔" وہ پیکٹ بیگ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ (اللہ۔۔۔۔۔ بندے کو کیسے

کیسے پہلاتا ہے۔ اس نا سمجھ کو کیا پتا؟)

"پہلے بلو آپا کا تو مسئلہ حل ہو جائے۔ میری تو بعد کی بات ہے۔" انیلا نے قدرے افسردگی سے کہا۔

"وہ بہت لگی ہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا انشاء اللہ بہت اچھا ہوگا۔" ناملہ کے لہجہ میں عجیب سی یاسیت اتر آئی۔

انیلا نے قدرے تعجب سے ناملہ کی شکل دیکھی مگر خاموش رہی۔

(کہاں سے لگی ہیں؟ ان کی جگہ پر تو اللہ آپ کا عیش کر رہا ہے) اس نے سوچا تھا۔

"آؤ کچھ کھانی لیں، کسی ریستورنٹ میں چلتے ہیں۔" ناملہ نے کہا۔

"ریستورنٹ۔۔۔۔۔!!!!" انیلا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"جی! وہاں بھی ہمارے ہی جیسے لوگ جاتے ہیں۔ آسمان سے تھوڑی سی اترتے ہیں۔" وہ اس کی حیرت پر مسکرا دی۔

"اگر کسی نے دیکھ لیا۔۔۔۔۔؟" انیلا کو ڈر لگا۔

"تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ میں جو ہوں تمہارے ساتھ۔" ناملہ نے پرسکون انداز میں کہا۔

"آپ کیا شادی کے بعد تمیں مارخان ہو گئی ہیں۔؟" انیلا ہنسی

"سمجھنے میں حرج ہی کیا ہے۔" ناملہ بھی مسکرا کر بولی۔

"اگر اباجی کو پتا چل گیا۔۔۔۔۔؟" انیلا نے مزید خوف ظاہر کیا۔

"تو چل جائے۔ اباجی نے جہاں میری شادی کی ہے اپنی مرضی سے کی ہے۔ وہاں یہ سب روزانہ کے معمولات

ہیں۔ مجھے یہ ماحول اباجی ہی کی وجہ سے ملا ہے۔" اس نے قدرے ہنسی سے کہا۔

"آپ تو بہت جلدان کے ماحول میں ایڈجسٹ ہو گئی ہیں۔" انیلا نے جیسے سراہا تھا۔

"جب رہنا دو ہیں۔۔۔۔۔ بسنا دو ہیں تو پھر ایڈجسٹ ہونے میں دیر کیوں۔؟" ناملہ نے سنجیدگی سے کہا۔

دونوں پھر ایک رکشہ کر کے ایک شاندار سے ریستورنٹ میں پہنچ گئیں۔

انیلا کے انداز میں تو جھجک تھی مگر ناملہ نے بے حد خود اعتمادی سے شیشے کا دروازہ کھلایا اور اندر داخل ہو گئی تھی۔

ریستورنٹ کا شہنشاہ اور نیم تاریک سا ماحول انیلا کے لئے اجنبی تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی ماحول کو مزید بے تاثر بنا رہی تھی۔

ناملہ نے کھڑکی کے ساتھ والی کونے کی میز منتخب کی۔

"باہر کے ساتھ میں یہاں کئی بار آچکی ہوں۔ وہ دیکھو ویٹر مجھے پہچان کر تیزی سے اسی طرف آ رہا ہے جب بھی ہم

آتے ہیں۔ یہی ویٹر ہماری ٹیبل پر سر دس کرتا ہے۔"

"السلام علیکم میڈم۔۔۔۔۔!" اس نے کھٹ کھٹ دو پانی کے گلاس ٹیبل پر رکھے۔

ناملہ سر کو جنبش دے کر گویا سلام کا جواب دیا تھا۔

"آج صاحب نہیں ہیں۔۔۔۔۔؟" وہ پیشہ دارانہ اور قدرے خوشامدی انداز میں گویا ہوا۔

"صاحب اس وقت آفس میں ہوتے ہیں۔" ناملہ نے جواب دیا۔

"مگر وہ کبھی کبھی یہاں لنچ کیلئے آتے ہیں۔" ویٹر نے بتایا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ میرے علم میں نہیں ہے۔ بہر حال انہوں نے لنچ تو کرنا ہوتا ہے۔"

ناملہ مسکرائی۔ وہ پلٹ گیا اور جلد ہی دو نیم کا دروازہ کھلنے لگا واپس آ گیا۔

دونوں کے سامنے کارڈ وال کرایک اور ٹیبل کی سمت بڑھ گیا۔

"تم جو کھا نا پسند کرو۔۔۔۔۔ دیکھ لو اس میں۔" ناملہ نے بے نیازی سے کہا اور خود کارڈ پر نظریں دوڑانے لگی۔

"آپ ہی کچھ منگا لیں آپا۔ مجھے تو یہ سارے کا سارا ہی پسند ہے۔" انیلا نے اس کا کہا تھا اور کارڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"مجھے کھانا تو گھر جا کر کھائیں گے ورنہ بلو آپا ناراض ہوں گی۔"

چہا اخلاق اپنی جگہ مگر دوسری طرف کا موسم بھی دیکھیے۔“ اس نے نالکہ کے چہرے پر نظریں دوڑائیں۔ جیسے چاہے تھا۔ اس چہرے کے دیدار کا۔

”بار بھائی..... چلیں، اب تو بیٹھ جائیں۔ اب تو بار بھائی بھی آگئے۔“ انیلا نے سامنے دیکھتے ہوئے پُتے پر معصوم انداز میں کہا۔

ایک دم ٹھنکا۔

بکادل..... نیچے کہیں گھاسیوں میں اترنے لگا۔

پلاہری باڈی..... ”واقعی بار بار ان کے سر پر کھڑے تھے۔ وہ کرسی کھینچ کر نالکہ کے برابر بیٹھ گئے۔

گویا آج آپ دونوں..... مسٹر سرفراز کی مہمان ہیں.....“ ان کی بے تاثر آواز نالکہ کے کان میں لو کی طرح سرایت

ہی نہیں..... میں اور آپا تو شاپنگ کی تحسُن اُتارنے یہاں آئے تھے۔ رازی بھائی تو ابھی ابھی آئے ہیں۔“ انیلا

لڑکی گھبراہٹ قدر سے کہہ کر۔

”پھر آپ کی ٹیبل پر ان کی موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ انہیں آپ کا مہمان بننے کا شوق چرایا ہے۔“ بار بھیم سا

نے۔

”کمال کرتے ہیں صاحب آپ..... لُچ کا ٹائم ہے..... اس..... وجہ سے کوئی ٹیبل خالی نہیں ملی تو اس طرف

بسیوے آپ لوگوں کی میزبانی میرے لیے اعزاز ہے کم نہیں۔“ اس نے نظر بچا کر نالکہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا

”پلے تو پھر آپ آج یہ اعزاز حاصل کر لیں۔“ بار بھیمسکرائے۔

”ارے نہیں۔“ رازی شرمندہ سا نظر آیا۔

”بھئی۔“

”گویا آپ بچہ کا امکان پیدا کر کے اگلی ملاقات کے بھی خواہش مند ہیں.....؟“ بار نے قبضہ لگایا اور ایک نظر نالکہ

پر ڈالی۔

فوری صورت امکانات ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہئیں۔“ انیلا نے اپنی فطری ساوگی سے کہہ دیا۔ ایک ٹاپے کو سکوت سا چھا

بٹھا۔

”آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا.....؟ بار نے نالکہ کی سمت دیکھ کر پوچھا۔

”نہیں..... گھر پر بتو آئے کھانا تیار کیا ہوگا۔“ نالکہ نے آنکھیں سے جواب دیا۔ دو مردوں کی مرکز نگاہ بن کر وہ جیسے

گلاب میں گھری ہوئی تھی.....

”آپ بھی گھر چلیے ناں..... بتو آپا بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔“

”اچھے وہاں سے اٹھ جانے کو بے چین تھی۔ اسی لیے بتو آپا کی تعریف کرتے ہوئے اسے خیال نہیں رہا کہ اس کے

لہذاں سے تین چار دن پہلے تک بتو آپا کا نام اس شخص سے وابستہ رہا ہے..... اور بار ہمیشہ..... نیلے کے ذکر پر چپ ہو

باتے ہیں۔

”جیسے آپ حکم کریں بیگم صاحبہ!“ بار آف دباؤت سوٹ میں بہت بیچ رہے تھے۔ بلا کے خود اعتماد تھے۔ جب انہوں

اسٹیکس میں سے کچھ منگا لیتے ہیں۔ میں تو برگر کے بجائے کلب سینڈوچ پسند کرتی ہوں۔ اتنا بڑا برگر دیکھ کر ہی مجھ

بول چڑھ جاتا ہے۔“

اس نے ہنس کر کہا اور ویز کو اشارے سے بلایا اور چکن کارن سوپ، کلب سینڈوچ اور دو کوک لاسے کو کہا۔ انیلا بھر

خوش نظر آ رہی تھی۔ اسے نالکہ کی زندگی پر رشک آ رہا تھا۔

”آپا! وہ سامنے والے ہمیں کیسے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔“ انیلا کو تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی۔

”دیکھتے دو..... اچھی چیزوں کو لوگ دیکھتے ہی ہیں۔“ نالکہ نے لا پرواہی سے کہا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

”آپ بہت تیز ہو گئی ہیں آپا۔ ہر بات کا جواب تیار۔“ انیلا مسکرائی۔ نالکہ ہنس دی۔

تقریباً دس منٹ بعد ویز مطلوبہ اشیاء میز پر سجا گیا۔

نالکہ سوپ کچھ کر ٹنک وغیرہ چمڑے لگی۔ انیلا نے بھی اس کی تقلید کی۔

”یہ ساس ڈر اسلاؤ..... بہت لذیذ لگے گا.....“ اس نے انیلا کو ہدایت دی۔

”السلام علیکم! معزز خواتین۔“

نالکہ کے ہاتھ سے سوپ کا چمچہ گرتے گرتے بچا۔ یہ آواز وہ لاکھوں کے مجمع میں پہچان سکتی تھی..... اس نے قدرے

سراسیمہ ہو کر سر اٹھایا۔

کی رنگ چھلاتے ہوئے رازی بغور اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

دو کی ٹیبل کیونکہ کوئی خالی نہیں تھی، اس لیے وہ چار کرسیوں کی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھیں.....

”آپ اجازت دیں تو یہاں بیٹھ جاؤں..... آپ خود نظر دوڑا کر دیکھ لیجیے۔ کوئی ٹیبل خالی نہیں ہے۔ آخر ہمارے

ہونے کے ناتے آپ سے کچھ فائدہ تو اٹھا سکتے ہیں۔“ نالکہ کو اس کی بے تکلفی سے دشت سی ہوئی۔

اس سے قبل کہ وہ واقعی اجازت دیتی رازی انیلا کے برابر بیٹھ چکا تھا۔ اور ویز کو اشارہ کر رہا تھا۔

”آپ اکیلے.....؟“ انیلا نے بوکھلا کر بے ہنگام سوال کر دیا۔

”آہ..... ایسے دیسے.....؟ بہت ہی اکیلے ہیں“ اس نے کرسی کی پشت سے سر نکا کر بغور نالکہ کو دیکھا۔

نالکہ کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا..... جب کہ انیلا اطمینان سے سوپ پی کر سینڈوچ کے ساتھ

انصاف کرنے میں مگن تھی۔

”ہمیں بہت دیر ہو چکی ہے انیلا..... جلدی جلدی کھاؤ“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”آپ اپنا سینڈوچ تو کھائیں آپا!“

”بس سوپ پی کر کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا..... تم جلدی کرو۔“

انیلا اس کے بدلے ہوئے انداز پر حیران ہوئی۔ اور پھر جیسے بات سمجھ گئی۔

”آپ کوک تو پی لیں.....“ انیلا کو جیسے پیسے ضائع ہونے پر افسوس ہو رہا تھا۔

”ہاں..... ہاں پی رہی ہوں۔“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

”اگر آپ نے ہماری وجہ سے اپنا کھانا پیتا ترک کیا ہے تو اٹھ جاتے ہیں۔“ وہ واقعی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے نہیں رازی بھائی..... ہمیں واقعی دیر ہو گئی۔ پلیز آپ بیٹھیے۔“ انیلا نے اپنی اخلاقیات سے مجبور ہو کر بڑے

اصرار سے کہا۔

نے رازی کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ یا اگر لیا تھا تو ایک پرسٹ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔  
تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ایک منٹ تا مکہ..... میں ذرا آفس فون کر لوں۔“ بار نے کہا۔

”تو ہم گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ چالی دے دیجیے۔“ نائلہ نے آگے بڑھ کر بائرباز و تھام کر جیسے روکا تھا۔ اس تکلفی سے تو وہ کبھی گھر میں بھی پیش نہیں آئی تھی۔ شاید وہ رازی کو کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ بائرباز کے لیے بھی اس کا یہ اعزاز تھا۔ انہوں نے قدرے شریر انداز میں نائلہ کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور چالی اس کے ہاتھ میں دی تھی۔ پھر آگے گئے تھے۔

رازی سگریٹ انگلیوں میں دبائے ڈراتر چھا کر سی کی پشت سے ٹیک لگائے چور نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔  
”خدا حافظ رازی بھائی۔“ انیلانے کہا اور نائلہ بغیر کچھ کہے یا نگاہ اٹھائے آگے بڑھتی چلی گئی۔

”اگر بائرباز قدر براؤ مائنڈ نہ ہوتے تو یہ شخص کبھی کامیاب نہ ہو پکا ہوتا۔“ اس نے سگلتے ہوئے سوچا تھا۔  
کوئی اس سے پوچھے اب ان باتوں کا مقصد۔

کوئی فائدہ۔

کوئی حاصل۔

اگر یہ عشق ہے تو سخت نان سنس ہے۔

اسے ایک سے ایک لڑکی مل سکتی ہے..... خوش رُود اور خوش فصال..... انسان اپنی قیمتی اور ایک بار ملنے والی زندگی  
طرح کیوں ضائع کرتا ہے؟

ٹیکنالوجی میں اتنا آگے بڑھ گیا ہے یہ انسان۔

اسے بہت چھوڑا جانا چاہیے۔

اب مجھے ہی دیکھا جائے تو میں سمجھوتے کی اچھی خاصی روشن مثال ہوں۔

ایک پیچیدہ اور اذیت پرست انسان کے ساتھ خوف و دہشت کے ماحول میں وقت گزار رہی ہوں۔

کیا کروں پھر.....؟

روح تو میری مرجی ہے..... میں تو اس عہد کی مشینوں میں شامل ہوں۔

بائبر مرتضیٰ کے گھر میں سہولت کی ہر مشین موجود ہے۔

کپڑے دھونے کی..... مصالحہ پیسنے کی..... آٹا گوندھنے کی..... پانی چڑھانے کی..... پانی کھینچنے کی..... گھاس کا۔  
کی۔

ریسٹ سے چلنے والا شپ ریکارڈ..... ٹی وی، وی سی آر..... خود کا کیمرہ.....

ان مشینوں میں، میں مزید اضافہ ہوں۔

تم میرے سامنے آکر کیوں میری سوچوں کو پراگندہ کرتے ہو۔

پرانے زمانے میں بعض لوگ اپنی اولاد پیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے تھے پیدا ہوتے ہی.....  
میں یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔

وہ بہت ساری نفسانی عذتوں کو از خود فنا کر صرف پیکل کے باندی اور غلام ہوتے تھے۔

میں کسی پیکل کی جذبات پر دف باندی کی طرح ہو جانا چاہتی ہوں..... وحشی طور پر حدود درجہ پارسا.....  
مت آیا کرو میرے سامنے۔

سب کچھ فنا ہو چکا۔

صرف ضمیر باقی ہے۔

اسی سبب میرے اندر قوت حیات دوڑتی ہے۔

میں نے سینکڑوں انسانوں کے سامنے اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر..... بائبر مرتضیٰ کے نکاح میں آنے کی ہامی بھری  
تھی۔

ایک وہ زندگی جو میرا ماضی ہے، گزر گئی۔

ایک یہ ہے..... کسی..... عہد کی لاج

مت آیا کرو میری راہ میں۔

میری روح کا ایک ایک زخم جاگ پڑتا ہے۔

تمہارے قرب کی مہک میرے حافظے میں سرایت کرنے لگتی ہے۔

وہ قرب جو میرا گمن جیسی قیمتی دو پہر میں ایک دوسرے کو مینہ آیا تھا۔

بائبر سورج آگ برسا رہا تھا۔ اور.....

گاڑی کے اندر خواہشات کا ماتم برپا تھا۔

کیسے بھول سکتی ہوں۔

تمہاری جذباتیت اور حماقت نے تو مجھے یہ دن دکھائے ہیں۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چالی لگا کر دروازہ کھولا اور نہایت بے خبری اور لا پرواہی کے انداز میں ہاتھ ڈال کر  
بچلے دروازے کا لاک کھولا..... اور انیلانے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

عورت کی شادی ہونے کی دیر ہے۔ شوہر کی ایک ایک شے کے لیے مالکانہ انداز خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

انیلانے غور سے یہی دیکھ رہی تھی۔

نائلہ ڈرائیونگ سیٹ کے راستے گاڑی میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کر کے ساتھ والی سیٹ پر کھسک گئی..... اور اسے  
کی آن کر دیا۔

انیلانے کو اس کا ٹم ٹم سا انداز بہت محسوس ہو رہا تھا۔

”آپا..... کیسا لگتا ہے صاحب کے ساتھ آگے بیٹھنا.....؟“ وہ اس سے شرارت کرنے لگی۔

”چاہئیں..... کبھی غور ہی نہیں کیا.....“ اس نے سر سے اندامیں جواب دیا۔

اسی دم بائبر مرتضیٰ گاڑی کی طرف آتے دکھائی دیے۔ انیلانے مزید کچھ نہیں بولی۔ بائبر نے تیزی سے دروازہ کھولا اور  
بیٹھنے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

”بچیلے صاحب۔ آپ کے پہلے گاڑی میں بیٹھنے کا ایک فائدہ تو ہوا گاڑی ٹھنڈی ملی ہے۔“ وہ پیچھے دیکھتے ہوئے  
گاڑی بیک کرنے لگے۔

انیلانے تو جیسے کسی مرغزار میں پہنچی ہوئی تھی۔



کھانا کھانے کے بعد فوراً ہی باہر واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ رات کو واپس ہوں گے..... مجھے آج رات تک رکنے کی اجازت ہے۔“  
وہ خاصے کڑوے انداز میں بولی تھی۔

”شام ہو رہی ہے..... رات کون سا دور ہے.....؟ آج ایک ضروری برنس ڈنر اینڈ کرتا ہے۔ اور آپ کو میں ایک مرتبہ بتا چکا ہوں۔ خاندانی اور دوستانہ ڈنر میں آپ ہزار بار شرکت نہ کریں..... مگر برنس ڈنر آپ کو ہر صورت اینڈ کرنا ہو ہے۔ فل انیشن ہو کر..... جب اللہ نے اثر کیونکر کر لیں فل بیوی دی ہوئی ہے تو اس کے اثرات کو کیش کرانے میں کڑا حرف ہی نہیں..... صرف دو چار باتیں ہی تو کرتا ہوتی ہیں۔“  
باہر نے مسکرا کر اس کا پُر نور و صبح چہرہ دیکھا۔

”اسے روشن خیال کہتے ہیں.....؟“ اس نے طنزیہ مسکرا کر پوچھا۔

”جی..... قید و بند سے پاک آواز خیالی.....“

”آپ کو اچھا لگتا ہے۔ جب لوگ آپ کی بیوی کو بے حد شوق انداز میں دیکھتے ہیں..... آپ کو غیسی مل نہیں ہوتی.....؟“ اسے سخت غصہ آ گیا تھا۔

ماحول کے فرق سے احساس کے انداز بھی بدل جاتے ہیں..... ظاہر ہے باہر مرتضیٰ اور اس کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

”ارے جلیسی کسی.....؟ میں تو اس وقت بہت پراؤڈ فل کرتا ہوں۔ جب میرے ملنے والے تمہیں ایسا ماز کرے ہیں۔“

”مگر میں آج تھک چکی ہوں.....“ نائلہ کے انداز میں بے غوئی اور غور سی تھی۔

”ڈنر تو رات اٹھ بجے کے بعد ہی شروع ہوگا۔ تم اب گھر چلی جاؤ..... دو گھنٹے آرام کے بعد تیار ہو جانا..... یہ کون سا مسئلہ ہے۔“

نبیلہ نے برتن سیٹتے ہوئے فوراً مداخلت کی تھی۔

باہر جو نائلہ کے انداز پر خون کا گھونٹ پیتے ہوئے ہونٹ کاٹنے لگے تھے، باہر چلے گئے تھے خدا حافظ کہہ کر۔  
”حد کرتی ہو تم..... اس گھر کے مسئلے دیسے ہی ختم نہیں ہو رہے تم اور بات بڑھا رہے لگتی ہو۔“ نبیلہ نے سرزنش کی۔  
نائلہ وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

”جان مصیبت میں ڈال دی ہے میری..... ایک لمحہ، ایک گھڑی مرضی کی نہیں۔“ وہ رو رہی تھی۔

”پاگل مت بنو..... ہوش کے ناخن لو..... بے وقوف کہیں کی..... اپنا گھر مضبوط بناؤ..... بس.....“

”اور ہاں..... آئندہ رازنی لے تو طبیعت صاف کر دینا اس کی۔ کہہ دینا اس طرح راستے میں آنے اور بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نہ تم سے اور نہ باہر بھائی سے..... اس کے ماتھے پر لکھا ہے کہ وہ کیا ہے.....؟ کیا معلوم اس کے ارادے کیا ہیں..... کیوں بات کرتا ہے وہ تم سے.....“

باہر چابی ٹی وی پر بھول گئے تھے۔ ان کی آمد کا نبیلہ کو پتا ہی نہ چلا تھا۔

نائلہ دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی..... اور نبیلہ کے انداز میں سخت خنکی تھی..... وہ دروازے ہی میں ایک گئے۔

وہ نبیلہ کا انکلا جملہ سننے کے منتظر تھے۔

”میں کیا کر سکتی ہوں آپا..... آج میں جس حیثیت میں ہوں۔ اُکا کی وجہ سے ہوں۔“

”آپ جس دور سے گزر رہی ہیں..... اس کا ذمہ دار بھی دی ہے۔“

”خدا معلوم..... میری زبان اس کہ سامنے ٹھہر کیوں جاتی ہے؟ میں اس پر برس کیوں نہیں پڑتی.....“

”میرے دکھوں کا ہر سلسلہ اس کی ذات سے شروع ہوتا ہے۔“

”اگر آپ کو موقع ملے تو آپ ہی اس کہہ دیجیے گا۔ یہ سب کچھ.....“

”باہر بھائی.....!!!!“ نبیلہ ایک دم حواس باختہ سی ہو گئی..... اس کی اچانک نظر پڑی تھی۔ نائلہ نے بھی گردن موڑ کر اٹھا..... مگر وہ بالکل نارمل تھی۔

”یہاں گاڑی کی چابی رکھی ہوئی تھی۔“ باہر بے تاثر انداز میں ٹی وی کی سمت بڑھے تھے۔

”جی.....!“ نبیلہ نے ان سے پہلے آگئے بڑھ کر چابی اٹھائی اور بڑے عاجزانہ انداز میں ان کی سمت بڑھی..... اس نے ایک دم سفید پڑ چکی تھی۔

اس نے پشت پر ہاتھ باندھے ہوئے باہر کو بہت پُر سکون انداز میں ان کی باتیں سننے دیکھا تھا۔

اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اور دل، اس نے تو حشر اٹھا رکھا تھا۔ اس نے سبھی سبھی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھا تھا مگر تاثر اخذ نہ کر سکی تھی۔

باہر چابی لے کر واپس مڑ گئے تھے۔

نائلہ نے شائینگ کی ہوئی سب چیزیں اٹھائیں اور اپنا اسٹائشنس سا پرس دوسرے ہاتھ میں تھامتے ہوئے نبیلہ کی سمت لے گیا۔

”خدا حافظ آپا.....!“

اٹھا، بیٹلا اور راجیلہ بھی آکھڑی ہوئی تھیں..... رو بہی ان کے پیچھے گلدی نظر آ رہی تھی۔



”خدا حافظ آ یا.....!“

”ایٹلا..... اجڑ آئے تو کہتا..... ترس رہی ہوں اُسے۔ کیا وہ مجھ سے ملنے کی فرصت بھی نہیں نکال سکتا.....“ اگلا بڑی یاسیت سے ایٹلا کی سمت دیکھا اور بابر کی سمت بڑھ گئی۔

بابر دوسری طرف کا دروازہ کھولے منتظر تھے۔

وہ آگے بڑھی..... تو وہ لائٹر جلانے سگریٹ پر جھکے نظر آئے۔

اس کی آمد کو محسوس کر کے انہوں نے سر اٹھایا۔ نائلہ نے دروازہ بند کیا، بابر گاڑی ریورس کرنے لگے۔

”یہ ہے سٹرس فرز کا گھر؟“ انہوں نے براؤن گیٹ والے گھر کی سمت اشارہ کیا۔

”جی نہیں..... یہ بالکل ہمارے گھر کے سامنے والا..... وہائٹ گیٹ۔“ نائلہ نے سر دلچے میں جواب دیا۔ اور گھر موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”اچھی خاصی اونچ منٹ ہے ان لوگوں کی آپ کی فیملی سے.....“ بابر نے آہستگی سے کہا۔

”جی ہاں..... صرف“ ان لوگوں کی.....“ نائلہ نے بھی آہستہ مگر تلخ انداز میں جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے، بہت آنا جانا ہے.....“ بابر کا لہجہ..... ہنوز سادہ تھا۔

”جی نہیں..... صرف آنا، آتا ہے.....“ بابر کا لہجہ..... ہنوز سادہ تھا۔

”مگر تعلقات کی مضبوطی کا انحصار تو ہمیشہ دو طرفہ کارروائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔“

بابر نے سگریٹ منہ سے نکالے بغیر دھواں ناک امر منہ سے نکالتے ہوئے دے دے انداز میں کہا۔ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ کو حرکت دینے میں مصروف تھے۔

”مگر ہمارے ان سے تعلقات نہیں ہیں۔“ نائلہ نے جیسے چوکر کہا۔

بابر نے کن اکھیوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ درحقیقت وہ اس کے اعتداسے الجھ رہے تھے۔

”گھر جا کر آپ دو گھنٹے سو رہے گا۔ فریش ہو جائیں گی۔ تیار تو آپ جلد ہو ہی جاتی ہیں۔“

نائلہ خاموش رہی..... وہ بابر کے انداز سے نتیجہ اخذ کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

صافیہ جانے کے لیے تیار ہو چکی تھیں۔

اور شوہار کی حالت غیر ہو رہی تھی..... وہ ادھر ادھر چکر لگاتی پھر صافیہ کو بغور دیکھنے لگتی۔ بظاہر وہ انہیں دیکھتی تھی مگر اس پریشان خیالی اس کی آنکھوں سے ظاہر تھی۔

صافیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی..... وہ عجب بدحواس سی دکھائی دی..... حد سے زیادہ فکر مند بھی..... نیچے پاؤں..... کپڑے خشک آلود، بے ترتیب دوپٹہ..... اور جیسے بس نہ چلتا تھا کہ صافیہ کے پیروں سے لپٹ جائے۔

صافیہ کو اس کے اس سادہ اور سبے ہوئے انداز پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔

وہ آگے بڑھیں اور اس کا سر سینے سے لگا لیا۔

”گھبرانے کی کیا بات ہے..... یہی تمہارا اپنا گھر اور مستقل ٹھکانہ ہے۔ یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے۔ بلا شرت فو سے تم اس گھر کی مالک ہو۔ میں کوشش ترک نہیں کروں گی۔ انشاء اللہ ایک دن تمہارے والدین کو تمہاری بے گناہی کا پتہ آ جائے گا۔ محض تمہارے خیال سے میں نے احسن کو اس درجہ لعنت ملامت نہیں کی جتنا کہنا چاہیے تھا۔ جو ان لوگوں

معاذہ ہو تو بہت احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ مگر نہ انصاف انصاف ہی اٹھانا پڑ جاتا ہے۔ تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ جیسے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”خالہ جان.....!“ اس کی آواز بھرا گئی۔

صافیہ دو رہٹ گئیں مبادا وہ بلک بلک کر رو دے۔

”آخر کار بیٹے، عورت کو شوہر بچوں کے ہمراہ زندگی گزارنا ہوتی ہے۔ اب یہی تمہاری دنیا ہے۔“

”میں یہاں مرجاؤں گی.....“ اس نے ہونٹ کانٹے..... گویا اپنے آنکھوں کو روکا۔

”تمہارے سر کے صدمے میں تمہارے دشمن بھی جھیں بیٹی۔ میرے بیٹے کا تو سب کچھ اب تم ہی ہو۔ دیکھو اس کا ذیال رکھنا۔ اس کی بات کا بڑا نہ ماننا..... بہت اکیلا ہو گیا ہے میرا بچہ..... میرے جیسے جی۔“

وہ رو پڑیں..... اور چہرہ چادر سے چہرہ چھپا لیا.....

شہوار اپنی افتاد بھول بھال صافیہ کے رونے سے ایک دم حواس باختہ ہو گئی..... جیسے وہ صافیہ سے کسی قسم کی کمزوری کی توقع ہی نہیں رکھتی تھی۔

جلدی سے بھاگ کر پانی لائی۔

”خالہ جان..... آپ بھی رو رہی ہیں.....؟“ ایک بے ہنگام جملہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”یہ تو میرے معمولات میں شامل رہا ہے بیٹی.....؟“ انہوں نے ایک سرد آہ کھینچی اور شہوار کا دل جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

”خالہ جان..... آپ مجھے نہیں بلکہ ”انہیں“ سمجھا کر جانیے..... یقین کیجیے ”یہ“ ایسے نہیں ہیں جیسے آپ کو نظر آتے ہیں..... بہت بے رحم، بہت سخت ہیں..... خالہ جان میں تو قیامت تک ”ان“ سے رحم اور ترس کی توقع بھی نہیں کر سکتی..... آپ کیا کرتا.....“

وہ ایک دم زک گئی..... سیاہ لیدر چمیل پر نظر پڑ گئی تھی۔ احسن کمرے کے دروازے کی دہلیز پر ایستادہ تھا۔

صافیہ نے اسے ایک دم چپ ہوتے دیکھا تو گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے لگیں۔

”آپ تیار ہیں امی.....؟“ اس کی بھاری آواز نے فضا و ماحول میں ارتعاش پیدا کیا.....

”ہاں..... کون سا ساز و سامان ساتھ لائی تھی..... تم نے یونہی اتنی چیزیں بہنوں کے لیے ساتھ کر دیں۔“

وہ میری بہنیں ہیں امی..... ابھی تو میں نے ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔“ وہ سوٹ وائچ کلائی پر باندھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

صافیہ کو جیسے اس کے ان جملوں سے از سر نو اتانی ملی تھی۔ ایک دم خوش ہو کر ہاتھ کھڑی ہوئیں۔

”اللہ تمہیں زندگی کے ہر سٹھ سے نوازے..... جلو بیٹا..... دیکھو بیٹا..... تمہاری بہنوں کو تو اللہ نے باپ کا سایہ دے لیا ہے۔ مگر..... اس وقت یہ بہت اکیلی ہے..... عورت ذات ہے بیٹے..... کمزور اور محدود..... اس کا خیال رکھنا۔ جب لوگوں کی..... حالت کے ذمے دار بھی تم ہو۔“

احسن نے جھک کر وہ سوٹ کیس اٹھایا جو اس نے کچھ دیر قبل ماں کے حوالے کیا تھا۔

”پلیس امی.....“

گاڑی وہ نکال چکا تھا۔ ڈکی میں سوٹ کیس رکھ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا اور ماں کے لیے دروازہ کھول دیا۔

”جسے میں نے اپنے جگر کا ٹکڑا دیا ہے..... مجھے اس سے اچھا کون لگ سکتا ہے؟“ ان کی آنکھوں سے دو دو موتی ٹوٹ رہے۔ جو انہوں نے منہ موڑ کر صاف کر لیے۔

”خاور کہہ رہے تھے کہ اس مرتبہ ہم نوشہرہ جائیں گے تو بہت دن بٹھریں گے۔

امی..... مونا تو حسن ابدال میں ہوگی؟“ اس نے اپنی چچا زاد بہن کی بات پوچھا۔

”نہیں..... وہ تو امریکہ جا چکی ہے۔ کیا تم بھول گئیں؟“ نور بانو نے اسے یاد دلایا۔

”اوہ..... ہاں میں واقعی بھول گئی..... پتا نہیں میرا دماغ کیسا ہو گیا ہے۔ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

”کہیں میرا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا امی؟“ وہ ایک دم فکر مند سی نظر آئی۔

نور بانو کا جیچ جیچ کر رو پڑیں..... انہوں نے ہونٹ کاٹ کر جیسے اپنے اشکوں کو بہنے سے روکا۔

”خدا نہ کرے۔“ ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے امی..... خاور اس جیسے تک آ جائیں گے؟“ نور بانو جیسے پتھر کی ہو گئیں۔

”امی..... آپ ان کے آتے ہی مت چلی جائے گا۔ خاور کی اہمیت اپنی جگہ، مگر مجھے آپ کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے..... امی انسان کو کسی سے محبت نہیں کرنی چاہیے کہ پھر زندگی بھر اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہے۔

امی..... آپ کا کیا خیال ہے..... محبت کوئی اچھی چیز ہے؟ امی..... یہ تو بہت تکلیف دہ چیز ہے۔

ایک بار مل جائے تو کھونے کے ڈر سے آدمی کا سگھ چین ہی ختم ہو چکا ہے..... کیوں امی؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”امی..... محبت تو ایک سزا ہے۔ جس کو لاحق ہوتی ہے، وہ ہر وقت فکر مند رہتا ہے..... وہ بہت آرام میں ہوتے ہیں جنہوں نے اس کا ذائقہ نہیں چکھا ہوتا..... اب مجھے ہی دیکھیے..... جو محبت بھی پائی ہے، شدید ہی پائی ہے۔ ہر وقت ہان سولی پر لٹکی رہتی ہے..... خاور پاس ہوتے..... ہیں تو ان کے جانے کے خیال ہی سے دھشت ہوتی رہتی ہے۔ چلے جاتے ہیں تو ان کی جان کی خیر مانگتی رہتی ہوں۔“

”بس کرو۔ خدا کے لیے بس کرو۔“ نور بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

منزہ ایک دم خالی خالی آنکھوں سے انہیں گھورنے لگی۔

اسی دم دروازہ کھلا..... انعام علی اندر داخل ہوئے۔

”بہت اچھے..... زلزلے کے علاوہ کوئی اور کام بھی سیکھ لیا ہوتا بانو بیگم!“

ان کے لہجے میں آگ سی بھری ہوئی تھی۔

”پاپا..... آپ امی کو سمجھائیے..... کیوں روتی ہیں..... امی تو بہت لگی ہیں۔ آپ کبھی امی سے زیادہ دور نہیں رہے۔ کم زکرف (SHIP) پر تو نہیں رہے کہ خدا خواستہ کسی حادثے کا دھڑکا لگا رہے۔

امی..... آپ تو ایسے روز رہی ہیں جیسے کسی کی موت پر روتے ہیں..... حالانکہ ہم نے تو کبھی موت دیکھی ہی نہیں ہے.....

کیوں پاپا.....؟“

”نور بانو..... اگر میری بیٹی کو کچھ ہو گیا تو یہ تمہاری ذمہ داری پر ہوگا۔“ انعام علی نے جیسے دھمکی دی۔

”میں کیا کروں انعام علی..... آپ اس کی باتیں سنا کریں۔ شاید آپ سے برواشت ہو جائیں۔ میں اپنی بیٹی کی اُن تو نہیں ہوں۔“ وہ آنسو پونچھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

شہوار حسرت بھری نظروں سے گیٹ کے پتھوں بچ کھڑی صفیہ کو دیکھ رہی تھی۔ صفیہ نے ہاتھ اٹھا کر خدا حافظ کہا۔

”گیٹ بند کر لیٹے۔“ ساتھ ہی ہدایت بھی دے دی تھی۔ خیر سے اللہ نے تمہیں بہت کچھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ رہنے کے لیے کسی بوڑھی ملازمہ کا بندوبست کر لو..... اس کا دل بھل جائے گا..... کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا۔ کل کلاں آ بال بچے ہوں گے تو بھی اُس کی موجودگی سے فائدہ رہے گا۔

”سُن رہے ہو ناں میری بات.....؟“ انہیں احسن کی حاضردماغی پر شک ہوا۔

”جی.....! احسن نے بے تاثر لگا ہیں ہنوز وٹا سکرین پر جمائے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”امی..... اب تو میرے پاس فون کی سہولے ہے۔ آپ کر لیا کریں۔ آپ نہیں آپ کی آواز ہی سہی۔“ اس نے کمال ہوشیاری سے موضوع بدل دیا۔

اور صفیہ بھی آنے والی مکند دوری کے خیال سے آزرده ہو کر اس موضوع کی رو میں بہہ گئیں۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا کہ پوچھتیں۔ دفتر کا فون نمبر کیوں نہیں دیا تھا۔ یادہ فون پر ان سے بات کرتے ہوئے کس مصلحت کے پوچھ نظر کرتا تھا۔

مگر وہ ماں تھیں..... اور.....

اولاد کی کمزوریاں اور خامیاں ماں کے حافظے میں محفوظ نہیں رہتیں۔ مناسب رفتار سے چلتی گاڑی میں اپنے بیٹے پہلے میں بیٹھی ہوئی گویا وہ کوئی ابدی سکون کا سمندر پار کر رہی تھیں۔

احسن نے آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھائے تھے۔ اب اس کے تاثرات محفوظ ہو چکے تھے۔ مضبوط ہو چکے تھے۔ پروتار پر اعتماد بڑے گویا ہے گا۔ اچھی نظر سے دیکھ کر نظر بد سے بچانے والی آیات شروع کر چکی تھیں۔

نور بانو مسلسل دعائیں مانگنے میں مصروف تھیں۔

منزہ سیاہ کا مدار سوٹ پہنے کا ریپٹ پر آرام سے بیٹھی نیل پالش لگانے میں مصروف تھی۔ میرون لپ اسٹک ہونٹوں کی تراش بے حد واضح محسوس ہو رہی تھی۔ کسلے بال شانوں پر جھوم رہے تھے۔

نور بانو ایک ٹک سے دیکھنے لگیں۔

”کیا دیکھ رہی ہیں امی.....؟“ معاً منزہ نے نظریں اٹھائیں۔

”ہیں..... ہاں..... کچھ نہیں بیٹا.....“ وہ ایک دم گڑبڑا گئیں۔

”کیا میں اچھی لگ رہی ہوں.....؟“ وہ تھوڑا سا شرمناک مسکرائی۔

”میری بیٹی تو بے ہی بہت پیاری..... ہمیشہ اچھی لگتی ہے۔“ ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

”خاور کہتے ہیں، میں انڈین اداکارہ ساثرہ بانو میں بہت لگتی ہوں۔ واقعی امی.....؟“ اس نے مسکرا کر ماں کی سہا دیکھا۔

”ارے میری بیٹی کے سامنے ساثرہ بانو کیا چیز ہے۔ میری بیٹی تو بے حد پیاری ہے۔“ انہوں نے دردی ایک شدید اپنی رگ جاں میں اترتی محسوس کی۔

”ہاں بس خاور کی عادت ہے، پتا نہیں کس کس میں ملاتے رہتے ہیں مجھے۔ آپ کو کیسے لگتے ہیں خاور؟“ اس۔

سوال کیا۔



وہ مسرت جو ”کامیابی“ کا طلسمی تاج پہن کر آتی ہے۔

حصول مراد کا دروازہ ہوتی ہے۔

تخیل آرزو کی گھڑی ہوتی ہے۔

حقیقی مسرت کا پہرہ ہوتی ہے۔

جو انسان کی وقعت اُس کی اپنی نظر میں بڑھادی ہے۔

جو انسان کی ایک ایک ادا کو فیصلہ کن بنادیتی ہے۔

اس کی چال میں اعتماد اور لہجے میں زور بھردیتی ہے۔

انسان کو بغیر کرسی کے اقتدار کا مذاقہ چکھاتی ہے۔

الغرض.....

انسان کو ”کائنات“ کر دیتی ہے۔

وہ بھی اپنے ”فیصلے“ میں اتنی ہی بھرپور کامیابی کی خواہش مند تھی۔

اسے مسترد کیے جانے کے احساسِ ذلت سے نجات پانے کے لیے..... اپنی ذات کی اہمیت ثابت کرنے والا شدید

احساس چاہیے تھا۔

اس کی وقعت لا پتہ تھی۔

اعتماد گم تھا۔

جس کے سبب ایک مسلسل بے کلی لاحق تھی۔

وہ کوئی حشر اٹھا دینے کا خیال رکھتی تھی۔

ظلم و نا انصافی پر عملی احتجاج کی خواہش مند تھی۔

اس نے ذک پہنچائی ہے جو..... پناہ و مضبوطی کا نشان دکھائی دیتا تھا۔

میرے عزم و ارادے کے اب تو کچھ ہوا ”صحیح“۔

مگر احسن شیخ..... میں تمہاری نہیں رہی..... تم نے اپنا پرستی کے راستوں میں مجھے گنوا دیا۔ میں ایک مار لوری شدت

سے تمہیں مسترد کر دینا چاہتی ہوں۔

اگر ایسا نہیں ہوا تو

یہ احساس تو ہیں وہ بے وقعتی میری جان لے لے گا۔

اب یہی ایک عزم ہے۔

واحد ارادہ۔

اکیلا خواب۔

جو پورا ہو جائے تو پچھلی ساری ذلتوں و نا کامیوں کے داغ و زحل جائیں گے۔

مجھے بھی اپنی ذات کا نکتہ اطمینان منیر آجائے گا۔

تم نے سمجھا کیا ہے مجھے..... وہ دُور شہوار جو تمہارے سامنے نگاہ اٹھاتے ہوئے گھبراتی تھی۔

تمہاری موجودگی جس کے وجود میں حیا..... تار تار پرودیتی تھی.....

تمہیں اپنی ذات کا نصف جان لیا تھا۔

اپنے جذبات کی تخیل کی ذمہ داری تمہیں سونپ کر توازن قائم کر دیا تھا۔

مگر اب تو سرے سے توازن بگڑ چکا ہے۔

میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں رہا۔

کچھ بھی نہیں..... وہ چہرہ ہاتھوں میں ڈھانپ کر رودی۔

تم..... میرے قانونی، شرعی، اخلاقی مجرم ہو..... تمہارے جرائم میرے ظرف سے نہت زیادہ ہیں..... میں تمہیں کبھی مافی نہیں کروں گی۔

وہ جیسے ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا..... رات کے گیارہ بج رہے تھے..... وہ گیٹ تک گئی۔ اس کا چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

اور خود صوفے پر سر ہانے کش رکھ کر دروازہ گئی۔

ایک اخبار اٹھا کر نظریں دوڑانے لگی۔

خاصی دیر گزر گئی..... وہ اب بھی نہیں آیا تھا۔

وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر چٹ سونے کی کوشش کرنے لگی۔

اسی لمحے گیٹ پر کھٹ پڑ ہوئی۔

اس کا دل دھڑکا۔ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا..... مگر وہ بہت مضبوط بنی لیٹی رہی۔ پورچ میں گاڑی رکھنے کی آواز آئی تو اس

بے اطمینان کا سانس لیا..... وہی تھا۔

اس نے بازو کے بجائے دو پشمنہ پر ڈال لیا مگر اسی طرح چٹ لیٹی رہی۔

گیٹ بند ہونے کے بعد یقیناً اس نے رابرداری سے ہوتے ہوئے ڈرائنگ روم سے جھانکتے ہوئے گزرتا تھا۔ اس

مذکورہ کی آواز آئی اور غائب ہو گئی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ وہ گیٹ کھول کر سونے کے عمل سے ضرور تمللانے گا اسے مخاطب کرے گا۔ جواب میں وہ اپنے دل

بہر اس نکالے گی..... زہریلے لفظوں سے اسے چھلنی کر دے گی۔ مگر وہ اس طرح لا تعلق تھا گویا وہ موجود ہی نہیں۔

کافی دیر وہ شلگ شلگ کر کر وٹیں بدلتی رہی پھر نہ جانے کون سے پہرہ آخر سو گئی۔

مگر کچن کی کھٹ پڑ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

”ہونہہ.....!“ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔

”بی بی..... پکھا بند کر دوں، ادھر سے صفائی کرتا ہے.....“ ایک نسوانی آواز اس کے کانوں میں آئی..... وہ ہڑبڑا کر

بڑکی۔

”آف.....“ کا لے کر ٹے، ڈرڈلواریں میں ملبوس کشمیریوں جیسے نوکیلے نقوش والی ایک حسینہ حشر برپا کر رہی تھی۔

رنگ برنگی بوسیدہ سی اوزن سی سے اس کی نکھری ہوئی سنہری زلفیں جھانک رہی تھیں..... ادھر میرے خدا.....

”تم یہاں صفائی کرنے آتی ہو.....؟“

”بی بی بی..... کیا آم صفائی نہیں کر سکتا.....؟، آم صبح سے شام تک چھ کوٹھی فارغ کرتا اے..... ام پہاڑی لوگ ہے

بی بی..... پہاڑ کے دیا.....

وہ لا پرواہ سے کہہ کر ٹہکی اور بے نیازی سے جھانپو پنچھ میں مصروف ہو گئی۔

”تم..... تمہارے ماں باپ کو پتا ہے کہ تم یہاں کام کرنے آتی ہو.....؟“ اس نے حیرت سے اس کا سراپا دیکھا۔

”اُم کام کرنے آتا ہے..... مجرم تو نہیں۔ اس کو سب منوم اے.....“ وہ پھر اپنی اٹھان میں لگ گئی۔

”انہیں یہ پتا ہے کہ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ان کو سب منوم اے..... ام کس کوٹھی میں کب کام کرتا اے۔ کون سی کوٹھی میں کتنے بجے تک ہوتا اے۔

کس گھر میں کتنا لوگ اے..... کتنا چوٹا اے..... کتنا بڑا اے.....“

وہ اپنے کام میں مگن ہو کر..... بڑی معصومیت و سادگی سے گویا تھی۔

”اچھا.....“ شہوار کی نیند کی کیفیت پوری طرح زائل ہو چکی تھی۔ وہ حیرت سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”نام کیا ہے تمہارا.....؟“

”پھول بی بی.....“

(واہ..... نام تو بہت خوبصورت ہے) کشمیر کی کلی زیادہ مناسب رہتا۔“ وہ مسکرائی۔

”اتنا موٹا کلی.....؟“ وہ ہنس کر اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

”تمہاری ماں کو پتا ہے کہ یہاں صرف صاحب ہوتے ہیں.....؟“ ایک سوال جو ذہن میں ٹھک رہا تھا آخر زبان پر

آ گیا۔

”ہمارا ماں تو صاحب سے بات کیا تھا۔“ جواب ملا۔

شہوار نے اس کا فردا..... وہوش زبا بمشکر کو تو لیتی نظروں سے دیکھا۔ اسے احساس تک نہ ہوسکا کہ وہ کس درجہ ”احسن

کی بیوی“ ثابت ہو رہی ہے۔ قدرے حاسد، مختلط اور فکرمند.....

”تم کیا کیا کام کرتی ہو.....؟“

”جھاڑو..... پونچھا..... برتن کپڑا..... کبھی کبھی سلام..... بالیم..... فون کا مٹھنی سن کر ہیلو ہیلو..... صاحب اے۔

صاحب نہیں اے۔“ وہ کھٹکھٹا کر ٹہکی۔

”بڑی شارٹ ہینڈ“ مفلکوں کر لیتی تھی۔ شہوار نے دلچسپی سے دیکھا۔

(فون کو احسن کے بیڈروم میں ہے)

”تم صاحب کے بیڈروم میں چلی جاتی ہو جب صاحب ہوتے ہیں.....؟“ شہوار نے اس کے نقوش میں کچھ تلاش

کیا..... دل عجب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

(اتنا احسن تو اس کے جاننے والوں میں دور در دور کہیں نہیں ہے۔)

”ہاں..... ہم ہر جگہ چلا جاتا اے..... صاحب ہو یا نہ ہو..... ویسے بھی اُم صاحب کے جاننے سے پہلے فارغ ہو جاتا

ہے..... صاحب تالا لگا کر چلا جاتا اے ناں بھی۔“ اس نے بڑی عجیبی سے شہوار کو سمجھایا۔

”اسی لیے اُم کو صاحب سو روپیہ زیادہ دیتا ہے۔“ وہ ٹھیک پر کپڑا پھیرتے ہوئے بتا رہی تھی۔

”سو روپے زیادہ دیتے ہیں.....؟“ شہوار کو ایک جھجکا لگا۔

”وہ کیوں.....؟!! کس خوشی میں.....؟“ اس کے لہجے میں جیسے غلط فہم آیا۔

”اُم اس گھر میں بہت سویرے جوتا ہے..... اور صاحب کے سامنے کام سے فارغ ہوتا اے۔ پھر صاحب امارا

پر کہ گھر کو تالا لگاتا اے اور دفتر چلا جاتا اے..... اتنا سویرے کوئی کام کرنے پر راضی نہیں ہوتا۔ سو روپیہ زیادہ ملا تو

بھی ہو گیا۔“

”اوہ.....!“ شہوار نے گہرا سانس لیا۔

”ایک بات بتاؤ.....“ شہوار نے آہستگی سے کہا۔

”ہوں.....“ اس کی بے نیازی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

”جہیں یہاں اکیلا کب ہوتا اے۔ صاحب بھی تو ہوتا اے اور.....“ اس نے شہوار کو بغور دیکھتے ہوئے جیسے اس کی کم

پہاٹ کیا۔

”جی، میرا مطلب ہے صاحب سے۔“

”صاحب بھوت تو نہیں اے بی بی..... اُم اپنا حفاظت کرنا جانتا اے۔ اُم تمہارا مطلب سمجھ گیا۔

جب تک عورت کا مرضی نہیں ہوگا کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... اگر عورت اپنا حفاظت نہیں کر سکتا تو کیا ہوا۔ مروت

اے..... اُم اپنا عزت کی خاطر جان دے سکتا اے۔

الاراجوری اُم کو در در پھرا تا اے..... بی بی آپ ایسا نہیں سوچو۔“ وہ قدرے تعجب سے گویا ہوئی۔

”پھول بی بی..... اگر تمہارا انٹرویو ختم ہو چکا تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلاؤ۔“

شہوار کو احسن کی آواز بہت قریب سے سنائی دی..... وہ دھک سے رہ گئی۔ کیا اس نے پھول بی بی اور اس کی گفتگو سن

؟

بچے کیا ہو گیا تھا..... کیا ضرورت تھی..... اس انٹرویو میں تو سراسر اس کی اپنی کنزروی ظاہر ہو رہی تھی..... اسے اپنی

لی سے خود بھی الجھن ہوئی۔

ہماکت جیسی رہ گئی..... احسن عین اس کے مقابل آکر ٹھٹ گیا۔

ہول بی بی اپنی نہایت سلیقے سے پانی لائی۔

”صاحب! آپ کا جوتا لاؤں؟“

”ہاں لے آؤ۔“ وہ کپڑا بھی لے آتا جس سے جوتے صاف کرتے ہیں..... احسن نے گلاس ہونٹوں سے لگا کر

ٹون سے پانی پیا۔

اس سے یہ سوچ کر نظریں نہ اٹھائی گئیں کہ وہ ادھر ہی نہ دیکھ رہا ہو۔

ہول بی بی جوتے لے آئی اور عین احسن کے مقابل ٹھٹوں کے بل بیٹھ کر جوتوں پر کپڑا پھیرنے لگی۔

نیرا خیال ہے صرف کپڑا پھیرنے سے کام نہیں چلے گا..... یہ تازہ پاش مانگ رہے ہیں۔ برش اور ٹیوب لے آؤ۔“

ہول بی بی بھاگ کر برش اور ٹیوب لے آئی..... اور احسن کا اگلا حکم سنے بغیر بڑی مہارت سے جوتے چکانے لگی۔

ٹن کی گردش کے ساتھ ساتھ اس کا پورا وجود متحرک تھا۔

پنسر سے پھسلے گلتا تو برش والے ہاتھ سے سنہیال لیتی پھر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔

کن کے بالکل..... سامنے وہ اتنی پائنتی مارے بیٹھی تھی۔ وجود اس طرح متحرک تھا جیسے ٹن دبانے سے کوئی مشین

ناہے۔



اس کی جسمانی گردش شہوار کے احساسات پر بڑا عجیب اثر چھوڑ رہی تھی۔

”پھول بی بی!..... ایک طرف بیٹھ کر آرام سے پالش کرو۔ ادھر ہو جاؤ سائینڈ میں۔“

اس نے یہ حکم بڑے بے ساختہ انداز میں دیا تھا جیسے اسے خود پر اعتماد نہ رہا ہو۔

احسن نے اپنی جاندار اور شگفتگی ہوئی نظریں اس کی سمت بے ساختہ اٹھائی تھیں اور وہ جیسے کترا کر ایک طرف بڑھ گئی تھی۔

”فرق میں اتنے دنوں سے ایک رکھا ہوا ہے تمہیں پرسوں بھی کہا حالے جانا۔ پتھر بن جائے گا تو زکوٰۃ کی گئی؟“ احسن پھول بی بی سے مخاطب تھا۔

”ام بھول گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

”اور سالن بھی بھول گئی تھیں۔۔۔۔۔ وہ بہت اچھا سالن تھا مرغ کا۔۔۔۔۔ سب خراب ہو گیا۔۔۔۔۔ دھیان رکھا کرو۔۔۔۔۔“

مالکانہ انداز مخاطب سے کہہ رہا تھا۔

”کھانا آپ پکاتا اے صاحب؟“

”نہیں بھئی۔۔۔۔۔ مجھے کھانا پکانا نہیں آتا۔۔۔۔۔ بس گاڑی چل رہی ہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا تھا۔

”یہ نیگم صاحب اے صاحب۔۔۔۔۔؟“ پھول بی بی کا اشارہ شہوار کی سمت تھا۔

”سمجھ لو۔۔۔۔۔ کوئی حرج نہیں۔۔۔۔۔ فوراً جواب آیا تھا۔

شہوار نزو کی ہاتھ روم میں تھی۔۔۔۔۔ اس کی جان شلگ کر رہ گئی۔

۔۔۔۔۔ نوکرانی کی نظر میں اسے مشکوک بنا رہا ہے۔ شرم بھی نہیں آتی۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔ بھروسہ دوبارہ ڈرائیگ روم میں نہیں گئی

یہاں تک کہ اس کے احسن کی گاڑی کی آواز سنی۔۔۔۔۔ اسے ایک دم ایک طرح کی آزادی کا احساس ہوا۔

”پھول بی بی! گیٹ بند کرو۔“

”کر دیا بی بی۔۔۔۔۔“

وہ ایک کپ چائے بنا کر لاؤنج میں چلی آئی۔

”کام تو سب ہو گیا بی بی۔۔۔۔۔ ام جائے۔۔۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔۔۔ جاؤ۔۔۔۔۔ اور سنو اب اتنی صبح آنے کی ضرورت نہیں۔ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک آرام سے آ جایا کرو۔

اگر چاہو تو دوپہر کو آ جایا کرو۔۔۔۔۔ میں اگر دوپہر کو ہوتی بھی ہوں تو تین گھنٹے تک ہی سوتی ہوں۔ ظہر کی نماز کے بعد۔“

”آپ سو روپے کے واسطے ایسا بولتا اے۔۔۔۔۔؟“ پھول بی بی کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

”ارے نہیں بھئی۔۔۔۔۔ سو روپے نہیں کٹیں گے۔ فکر نہیں کرو۔ مگر کام تمہیں میری رضی کا کرنا ہو گا۔“ شہوار نے چائے

کا گھونٹ بھرا۔

”اب آپ اور ای رئے گا۔“ پھول بی بی کو وہ خاصی سخت لگی تھی۔

”شاید۔۔۔۔۔“

”اچھا تو آپ کا شادی پرانا اے۔۔۔۔۔؟ آپ اپنے باپ کے گھر گیا تھا۔ جب ای۔۔۔۔۔ آپ نے نہیں دیکھا۔ اچھا۔۔۔۔۔ ام

چلتا اے۔۔۔۔۔ اللہ حافظ۔۔۔۔۔“

وہ اپنا ایک توتلی جاؤ۔۔۔۔۔ تمہارے صاحب تو تمہیں یک کھاتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ نہ جانے کیوں مسکرا دی۔۔۔۔۔ عجیب

زہریلی سی مسکراہٹ تھی۔

رہا باپ کا گھر۔۔۔۔۔ تو بڑے بڑے احسانات ہیں تمہارے صاحب کے اس جان ناتواں پ۔ اپنا باپ گنوا دیا تھا تو

بہر داشت نہیں ہوا۔۔۔۔۔“

پھول بی بی جا چکی تھی۔

بائے بڑے گھر کی عین تنہائی تھی اور پہاڑ جیسا دن۔۔۔۔۔

ہال بیل کی آواز سن کر نالہ کوخت کوخت محسوس ہوئی تھی۔۔۔۔۔ باہر گھر پر نہیں تھے۔ لامحالہ اسے ہی آنے والے کی آؤ

رہا تھی۔

”شفیق! دیکھو گیٹ پر کون ہے۔“ اس نے نوکر سے کہا۔

”بی بی۔۔۔۔۔ کوئی تین صاحب آئے ہیں۔۔۔۔۔“ شفیق نے آکر بتایا۔

”عام سے انداز میں دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ڈرائیگ روم میں چلی آئی۔۔۔۔۔ اس کا انداز بادل نا خواستہ قسم کا تھا۔

”السلام علیکم۔۔۔۔۔“ تو وارد اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ولیکم السلام۔۔۔۔۔ تشریف رکھیے۔“ وہ خود ایک طرف بیٹھ گئی۔

”ہاں صاحب تو آج شاید دیر سے آئیں۔۔۔۔۔ آپ کی تعریف۔۔۔۔۔؟“ نالہ نے براؤن سوٹ میں ملبوس سنبہرے فریم

بال گائے تین صاحب کو بغور دیکھا۔

”میں باہر کا بہت قریبی دوست ہوں۔ آپ کی شادی میں شرکت کا اعزاز بھی حاصل کر چکا ہوں۔“ وہ بُر دباری سے

اُٹے۔

”اچھا۔۔۔۔۔!“ نالہ بھی تکلف سے مسکرائی۔

”میں یہاں اسلام آبادی۔۔۔۔۔ دی پر وڈیو سر ہوں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔! نالہ نے اب قدر سے دلچسپی سے انہیں دیکھا۔

”کون سا پروگرام ہے آج کل آپ کے پاس۔۔۔۔۔؟“ نالہ کی دلچسپیوں میں ٹی وی سرفہرست تھا۔

”میں آج کل علاقائی پروگرام کر رہا ہوں۔۔۔۔۔“ انہوں نے غور سے نالہ کا سراپا دیکھا۔

برون کاٹن کے سوٹ میں عام سے گھریلو انداز میں بھی وہ بہت جاذب محسوس ہو رہی تھی۔

”آپ کو ٹی وی میں کس درجہ دلچسپی ہے۔۔۔۔۔؟“ تین صاحب نے سوال کیا تھا۔

”اچھے پروگرام ضرور دیکھتی ہوں۔۔۔۔۔ اور بس۔۔۔۔۔“

”کبھی آپ کا جی نہیں چاہا کہ آپ بھی ٹی وی پر کام کریں۔۔۔۔۔“

”میں۔۔۔۔۔! نالہ نے شدید حیرت سے ان کی سمت دیکھا۔

”توبہ۔۔۔۔۔ توبہ۔۔۔۔۔“ نالہ نے مسکرا کر کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”ارے۔۔۔۔۔!“ تین صاحب ہنس دیے۔

”آپ تو اس طرح توبہ کر رہے ہیں گویا کفر کا عمل سرزد ہو گیا ہو۔“

”ہمارے جیسے لوگوں کے لیے یہ بات کفر سے کم نہیں۔“ نالہ نے جواب دیا۔

”آپ کے جیسے۔۔۔۔۔؟ باہر مرتضیٰ تو بہت پروگریزہ فکریہ۔۔۔۔۔ نہ ہیں۔“ تین صاحب کو جیسے اس کی بات سے

نہروٹھی تھی۔

”میں اپنی بات کر رہی ہوں..... میں بہت کتر گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں.....“ نائلہ نے کہا۔  
 ”مگر باہر مرتضیٰ.....“ متین صاحب کچھ کہتے کہتے رک گئے۔  
 ”ان کا اپنا لائف اسٹائل ہے۔“

”اب تو آپ کا بھی یہی ہونا چاہیے۔“ متین صاحب مسکرائے..... “آپ کی صورت میں ٹی وی کو ایک اچھا چھوڑ سکتا ہے۔“

”ارے نہیں.....“ نائلہ کو سنجیدگی اختیار کرنا پڑی..... “میں ایک شادی شدہ.....“

”چھوڑیے صاحب..... ہمارے ہاں تو تین تین بچوں کی مائیں کالج گرل کارول ادا کر رہی ہیں۔ اور آپ کا ابھی بگڑا ہی کیا ہے۔“ متین صاحب نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔

نائلہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

”میں باہر کونون کرتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”رہنے دیجیے۔ میں پھر آ جاؤں گا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں، آفس تو اپنا ہی ہے.....“ وہ کچھ سنے بغیر باہر نکل گئی۔

”ہیلو.....!“ اس نے رنگ کیا تو ایک غیر مانوس آواز ابھری۔

”مسز باہر بات کر رہی ہوں..... باہر صاحب سے بات کرائیں۔“

”وہ تو مس الوینہ کے ساتھ شاید گھر ہی گئے ہیں۔“ آواز کسی نوجوان مرد کی تھی۔

”بس.....!!“ اس نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔

”شاید مسز..... مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں میڈم.....“ اس نے خود ہی اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔

”بتایا نہیں کب تک لوٹیں گے؟“ اس کے چہرے پر سوچ کا عکس لہرایا۔

”جی نہیں.....“

”کیا اندازہ بھی نہیں؟“

”جی نہیں..... وہ تو جب اس طرح اٹھ کر جاتے ہیں تو واپس آفس نہیں آتے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ریسپورر کھدایا اور واپس ڈرائیونگ روم میں چل آئی۔

”مجھے افسوس ہے متین صاحب! باہر صاحب سے تو آپ کی ملاقات نہ ہو سکے گی..... ویسے گھر میں جیسے کے علاوہ مشکل ہی سے ملتے ہیں۔“ نائلہ نے بتایا۔

”میں تو اس لیے چلا آیا کہ بادشاہ آدمی ہے شاید گھر پر مل ہی جائے۔ ابھی دن کے گیارہ ہی تو بجے ہیں۔“

”جی بس.....“ نائلہ کے لبوں پر پھینکی سی مسکراہٹ لہری صورت ابھری۔

”میں ذرا ایک منٹ میں آئی۔“ اسے ایک دم کچھ یاد آیا تو باہر نکل گئی۔

نوکر کو چاہئے لائے کے لیے کہا..... اور واپس چلی آئی۔

”اچھا متین صاحب! یہ بتائیے کہ اب تک آپ کے کریڈٹ پر کون کون سے پروگرام ہیں.....“ اس نے نہایت اطمینان سے ان سے سوال کیا۔

”ابھی تک میں نے تین چالیس منٹ کے ”ڈیوریشن“ کے پروگرام کیے ہیں۔ وہ زیادہ تر سنجیدہ نوعیت کے پروگرام

ہی میں ایک پلے شروع ہونے والا ہے۔ اس میں دیکھیے آپ لوگ کس قسم کے رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔“ وہ

ب کبہر رہا ہوں ناں۔ آپ اس پلے میں آئیے۔“

یہ اداکاری نہیں آتی۔“ (کتنا بڑا جھوٹ بول رہی ہوں..... اور کتنی کیا رہی ہوں)

ب انسان کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اسے سب آ جاتا ہے..... بات کروں باہر سے؟“ متین صاحب باجوش سا بیدار ہوا۔

میں تو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ تو شاید سننے ہی مجھے انٹیشن ہی مجھے چھوڑنے پہنچ جائیں۔“ نائلہ ایک کھوکھلی سی ل کر بولی۔

بہر.....؟“ وہ حیران سے نظر آئے۔

لاکھ بہت کٹر مذہبی قسم کے باپ کی بیٹی ہوں۔ وہ مجھے سچ چوراہے میں گولی مار سکتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔

ن صاحب نے قدرے حیرت سے اس کو دیکھا۔ سادہ و صاف گو۔

راہ تو آپ خود مختار ہیں۔“

تی ہم مجبوروں پر تہمت ہے بخاری کی۔“ اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

ن صاحب ہنس پڑے..... چائے آچکی تھی۔ نائلہ نے بہت سلیقے سے مدارات کی کارروائی شروع کی۔

ب بات کہوں، مائنڈ مت کیجیے گا۔“ متین صاحب نے اس کی سمت دیکھا۔

ن نہیں..... آپ کیسے پلیز۔“ وہ چائے میں شکر ملائے ہوئے سادگی سے کبہر رہی تھی۔

پ تو اپنے اسٹائل میں باہر سے قطعی ڈفرنٹ ہیں..... گاڑی کیسے چل رہی ہے.....؟“

کے ہاتھوں کی گردش رکھ گئی..... اس نے چونک کر متین صاحب کا چہرہ دیکھا۔

اسے معاشرے میں عموماً مرد کی شرائط پر گاڑی چلتی ہے۔“ وہ مسکرائی۔

راہر دو رات ہی مرد نہیں ہیں..... بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ وہ انتہائی آزاد خیال ہیں۔“

باتو۔“ نائلہ کو بھی جانے کیا یاد آ گیا تو اس نے بے ساختہ اعتراف کر لیا۔

مادقات انسان اپنی کسی کمزوری کے سبب کچھ زیادہ نرمی بھی تو دکھاتا ہے۔

مذہن کی بیل رنگ ہوئی..... نائلہ مسکرائی ہوئی معذرت خواہانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

ن لالی میں آکر ریسپورر اٹھایا..... دوسری طرف اس کی آواز سنائی دی۔

سنے ایک عجیب انداز کی خوشی محسوس کی۔

غار ہے تھے کہ وہ اسلام آبادی میں ہیں اور کالج روڈ سے بات کر رہے ہیں۔

پہاں کیوں نہیں آئے.....؟“ اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی خوشی درآئی۔

ماں پآ جائیں..... باہر کا کچھ چٹانیں۔ وہ آفس میں بھی نہیں ہیں۔“ اسے سنے سے باہر کی مصروفیت یاد آئی۔

مڑھائی! آپ ایسا کریں، ایک بجے تک آ جائیں۔ میں بچ آپ کے ساتھ کروں گی۔ کسی ایسے ریسٹورنٹ

ٹپاٹا ہوا کھانے کا بالکل بھی موڈ نہیں۔“

اگر طرف اسد کے حیرانی پر مبنی تاثرات سنائی دیے تھے۔

اسد نے کہا۔

”جی ہاں.....“ اس نے کھڑکی کی سمت چہرہ موڑ لیا (اپنے وہی کوکون کھٹا کہتا ہے۔)

”آپ کے اور اس کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ مگر مجھے یقین ہے، آپ نے یہ چیلنج قبول کر لیا ہے۔“

اسد نے ایک موڑ کا نٹے ہوئے بہت دھوکے سے کہا۔

ہائل کا دل بھر آیا نہ جانے کیوں۔

(پھر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟)

”آج باہر کے ایک دوست متین صاحب آئے تھے۔“ نائلہ نے آہستہ سے کہا۔

”وہی تو نہیں جوئی وی پر ہوتے ہیں۔“ اسد کو خاصی معلومات تھی۔

”جی..... منشی..... بلاشبہ وہی..... کہہ رہے تھے، آپ ٹی وی پر کام کریں۔“

”آپ؟!!!!“ اسد نے گہری سست بڑھا ہوا ہاتھ دوبارہ اسٹرنگ پر رکھ دیا۔

”کیوں..... میں نہیں کر سکتی..... یوں بھی ہم میں سے ہر شخص پیدا انٹی ادا کار ہے۔ اپنا اپنا دار کھیل رہا ہے۔ یہ کوئی

کام تو نہیں۔“

”مگر بھابی..... آپ کا مزاج و انداز زندگی شاید اس ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے گا۔“

اسد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

بہنیں کچھ کرنے نہیں دیا گیا تو ہماری ذات کے بارے میں اتنا پُر یقین انداز کیوں؟ میں تو اب تک وہ نظر آتی

دوڑے گھر کے ”حکامِ اعلیٰ“ نے چاہا..... میں خود کیا ہوں، یہ تو ابھی کسی کو پتا ہی نہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں

لا۔

مذہب بڑی مہارت سے اپنے چونکنے کے عمل کو اس سے چھپایا۔

انجلی بات..... مگر بھابی جو بھی فیصلہ ہو، آپ کے حق میں اچھا ہونا چاہیے۔“ بالآخر انہوں نے کہا۔

لکھنا تو ملے۔ بھری فیصلہ تو بعد کا ہے اچھا ہے اور کیا نہ۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

مدعا شوٹی سے ڈرائیونگ کرنے لگے..... یہاں تک کہ ”اسٹارز“ میں داخل ہو گئے مگر کوئی بات نہ کی۔

”لیے اس مرتبہ یہ آپ نے کیا کیا؟“ وہ نشست پر بیٹھے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”کیا.....؟“ اسد آج اس کی ہر بات پر چونک اٹھتے تھے۔

”آپ سیدھے ہمارے ہاں آنے کے بجائے کہیں اور کیوں گئے.....؟ وہ بولی۔

ملنے گھر اسٹائس لیا۔

نماں اور میرا منیجر دراصل کراچی سے ساتھ ہی آئے تھے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ان کے ساتھ ٹھہروں..... ان کی

بہنیں..... انہی کی گاڑی اس وقت میرے استعمال میں ہے۔“

”منیجر ہیں تو آپ کیا ہیں.....؟“ اس نے ان کی سمت دیکھا۔

نماں تو مالک ہوں فرم کا.....“ اسد اس کی لاطینی پر جیسے مسکرا دیے۔

کے جسم کی فرم ہے آپ کی.....؟“ وہ آج جانے کیوں اس قدر باتیں کر رہی تھی۔

لیڈر کی مصنوعات ایک سپورٹ کرتے ہیں ہم..... آپ نے باہری سے پوچھ لیا ہوتا۔“

”دیکھیے..... آپ کو ہر قیمت پر یہاں پہنچنا ہے۔ بس..... ہم آج ساری شام باہر گزریں گے اور رات کا کھانا

گھر واپس آئیں گے۔“

”آپ اتنے حیران و پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ کیا یہ باہر کی سوسائٹی کا انداز نہیں.....؟ میں انتظار کر رہی ہوں۔

اس نے یہ کہہ کر۔ سیور کریٹل پر بہت آہستہ سے رکھ دیا تھا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

اسد خاصے اچھے ہوئے انداز میں گھر میں داخل ہوئے تھے۔

نائلہ پیازی اغین ساڑھی میں نہانی دھوئی تر دتا وہی نظر آ رہی تھی۔ وہ انہیں برآمدے سے ہی لگتی تھی۔

”ارے بھابی..... آپ تو واقعی تیار ہیں۔“ وہ مسکرائے۔

”آپ کا کیا خیال ہے، میں مذاق کر رہی تھی..... اور آپ اتنے حیران کیوں ہیں.....؟“

”آپ پہلے سے بہت چیلنج نظر آ رہی ہیں۔“ اسد نے ساڈی سے اعتراف کیا۔

وقت کرتا ہے پردوش برسوں

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا.....!

”کوئی بات بھی اچانک نہیں ہوتی اسد بھائی..... دراصل ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھ نہیں پاتا۔ کیا ذرا

ہے.....؟“ وہ مسکرائی..... اسد چکر اکر رہ گئے۔

”آئیے چلتے ہیں۔“ وہ میز حیاں اتر آئی۔

”جی بات یہ ہے کہ بھوک لگ رہی ہے..... باہر کے دوست متین صاحب آئے ہوئے تھے۔ باتیں کر کر کے ہمارا

اسٹیشن ختم ہو گیا۔“ وہ خود اعتمادی و لا پرواہی سے اسد کی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ یعنی جس گاڑی میں وہ آئے تھے۔

اسد حیرانی سے سوچتے ہوئے میکانیکی انداز میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئے۔

”کہاں چلیں بھابی.....؟“

”اسٹارز“ چلیں..... مجھے اس کا ماحول بہت پسند ہے۔“ نائلہ نے فوراً جواب دیا۔

اسد نے گاڑی کا رخ اسٹارز کی سمت موڑ دیا تھا۔

”اسد بھائی..... میں نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔“ نائلہ کو اچانک خیال آیا۔

سفید شلوار قمیض میں اسد بخلا ہونٹ دبائے بہت انہماک سے ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ ایک دم جیسے کسی خیال

چونکے۔

”ارے نہیں بھابی..... کسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ تو عین میری عزت افزائی ہے۔“ وہ مبہم سا مسکرائے۔

”آپ تو اسلام آباد اپنے کاروباری دورے پر ہی آتے ہیں ناں۔ اس لیے خیال آ گیا تھا۔“

”شکر..... میں سوچ رہی تھی کہ آپ کا پروگرام پوچھے بغیر کہیں اپنا پروگرام آپ پر مسلط تو نہیں کر دیا.....؟“ وہ ہنس دلا۔

اسد اس کے انداز پر دل ہی دل میں خاصے حیران ہو رہے تھے۔

باہر کیسے ہیں بھابی.....؟“

”اپنی شرائط پر زندگی گزار رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں انہیں کیسا ہونا چاہیے.....؟“ نائلہ نے اُلٹا سوال چڑھا۔

”میری تو دعا ہے آپ دونوں ہمیشہ خوشیوں بھری زندگی گزاریں۔ باہر قدرے آزاد خیال ہے مگر دل کا بہت

نائلہ نے سنی اس سنی کردی اور مینو پر نظریں دوڑانے لگی۔

”ایک بات پوچھوں بھابی..... ماسٹر نہ کیجیے گا۔“

نائلہ نے قدرے تشویش سے چوکاڑ پر سے جھانکا۔

باہر تو آپ کے ساتھ ٹھیک ہیں ناں.....؟“

نائلہ نے کارڈ ڈرا اوپر کر لیا۔ اب اس کا چہرہ مکمل کارڈ کی اوٹ میں تھا۔ وہ کرسی کی پشت سے آرام دوں گئی ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہیں.....“ اس نے قدرے تاخیر سے جواب دیا تھا۔

”ہوں.....“ اسد نے گال کے نیچے ہاتھ کا کچھ سوچنا شروع کر دیا۔

”اسد بھائی.....“

”جی.....؟“

”کھانا کھا کر مارگلہ کی طرف چلیں گے۔“

”مارگلہ.....!!!!“ اسد نے یوں دہرایا جیسے انہیں شک ہو کہ وہ کچھ اور کہہ رہی ہے۔

”جی زیادہ دور تو نہیں ہیں۔“ وہ مزید گویا ہوئی۔

”دور نزدیک کی بات نہیں ہیں۔“ ابھی تو میں یہیں ہوں۔ چھٹی والے دن چلیں گے۔ باہر بھی کھنی گے..... دراصل میں آج کل کسی شے میں دلچسپی نہیں لے سکتا.....“ اصل بات یہ ہے۔ “وہ ایک دم افراد کا لگے۔ “یقین کریں بھابی..... اس وقت کبھی قسم کی خوشی میں حصہ لینا میرے ضمیر کو گوارا نہیں۔“

”ہیں.....!!!!“ نائلہ پر شیاں سی دکھائی دی۔ “خیریت۔“

”بھابی..... میرے انتہائی عزیز دوست کی ڈیجھ ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ میرا تعلق انتہائی قریبی تھا۔ بے حد جذباتی تعلق رہا ہے میرا اس کے ساتھ۔“

آج کل ان کی بیوہ ذہنی طور پر ایٹارل ہیں۔ انہیں ایڈمٹ کرا کر آ رہا ہوں۔ اگر میرا آنا ضروری نہ ہوتا تو ت میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔

ایک دم بیگ ہیں اس کی وقف..... دد معصوم سے بچے ہیں..... دینا کے کام تو چلتے رہتے ہیں..... مگر..... میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے.....“ وہ دکھ سے کہہ رہے تھے۔

”یہ تو واقعی بہت افسوسناک خبر ہے۔“ نائلہ نے تاسف سے کہا۔

اسد خاموش ہو رہے.....

نائلہ نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر آڈر دیا..... اسد نہایت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ نائلہ نے ان کی نا مناسب نہ سمجھا۔

”اگر آپ کی خواہش ہے تو میں لے چلوں گا آپ کو مارگلہ۔“ اسد نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے غامض

”ارے نہیں..... ایسا کوئی ضروری نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

اسد نے نئے سرے سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

منہ کوڈرا رہیو جیسے ہی لے کر نکلا..... بلال گھر میں داخل ہوا۔

ٹھیکہ بانی سے باتیں کر رہی تھی۔

”السلام علیکم.....! بلال نے بڑے سنجیدہ انداز میں سلام کیا تھا۔

وہ جیڑی سے اس کے پیچھے آئی تھی۔

”کیسے ہو بلو.....؟“ اسے یہی بات سوچھی۔

”آدی ٹھیک ہو تو سلام کر سکتا ہے۔“ وہ گاؤں کے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تھا۔

ٹھیکہ تو جیسے ریٹھ عطشی نظر آنے لگی۔

”چائے بناؤں۔“ وہ محبت سے پوچھ رہی تھی۔

”نالیجیے.....“ وہ اس سے نظر نہیں ملتا تھا۔

”ہائیں..... کیا واقعی یہ بلال ہے۔ وہ جو روڈ لی کہا کرتا تھا..... مجھے جس چیز کی ضرورت ہوگی۔ خود لے لوں گا۔

ے باپ کا گھر ہے!

وہ نیم بستم کچن میں داخل دوڑ گئی۔

چائے بڑی چاہ سے بنائی..... ٹرے میں لوازمات سے سجائے اور لاؤنج میں چلی آئی۔

”آپ نے تو اس طرح اہتمام کیا ہے جیسے میں کوئی مہمان ہوں۔“ وہ ٹرے پر نظر ڈال کر کہہ رہا تھا۔

”اجھا تو کیا صرف مہمان ہی حسن سلوک کے حقدار ہوتے ہیں۔ تم تو انعام علی کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ہمارا تو سب کچھ باپ.....“ وہ غلوں سے بولی۔

بلال نے اٹھتے ہوئے ٹھیکہ پر ایک اپھنتی ہوئی نظر ڈالی.....

لائٹ براؤن جدید فیشن کے کپڑے پہنے ہوئے ٹھیکہ اپنے چہرے سے پھر بھی سادگی و خلوص کا پیکر نظر آ رہی تھی۔

”ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گی۔“ وہ کپ اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ٹھیکہ کا دل دھڑک گیا..... (الٹی خیر) ”نما کیوں مانوں گی۔ تم ہمارے بیٹے ہو۔“ (اس سے قبل تم نے میرے نکلے پر دایاں کب کی ہے۔)

”آپ کو آئی..... بانی کہتی ہیں۔“ وہ بولا۔

”ہول، پھر.....؟“ ٹھیکہ درحقیقت کچھ نہیں سمجھی..... (اور تم تو کچھ بھی نہیں کہتے)

”آپ ہماری کس رشتے سے باجی لگتی ہیں.....؟“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

(کیا آج یہ پھر سے یہ رشتے سمجھانے آیا ہے) وہ چپ رہی۔

”جب ہمارا اور آپ کا ساتھ ہمیشہ کے لیے ہے تو رشتہ واضح کیوں نہیں ہے؟“ وہ بہت آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

”یہ تو تمہاری مرضی ہے کہ تم کیا مقام دیتے ہو..... مگر نہ تم تو صرف ہماری اولاد ہو۔“ وہ نرمی سے گویا ہوئی۔

”پھر باجی سے کیا رشتہ بنتا ہے.....؟“

”تو تم کہو باجی۔“ ٹھیکہ نے کہا۔

”پھر.....؟“

”یہ تو تمہیں ملے کرنا چاہیے..... میں تمہارے باپ کے نکاح میں ہوں..... رشتہ تو بہت واضح ہے.....“ وہ آہستگی

”اگر میں آپ کو بھی کہوں تو آپ کو آکر ڈونٹ نہیں لگے گا۔۔۔۔۔؟“ وہ جیسے بدوقت تمام بولا۔

شکیلہ تو مارے خوشی کے جیسے حواس باختہ ہو گئی۔۔۔۔۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

”مجھے کیوں آکر ڈونٹ لگنے لگا۔۔۔۔۔ رشتی دنیا تک میں تمہاری ماں ہوں۔ یہی رشتہ ہے میرے اور درمیان۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا رشتہ استوار ہو ہی نہیں سکتا۔“

”میں نے آپ کو بہت ڈکھ دیا ہے۔۔۔۔۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ آپ نے تو کبھی میری بدتمیزیوں کی امی اور پاپا سے بھی نہیں کی۔“

”ارے نہیں۔۔۔۔۔ تم بالکل بھی بدتمیز نہیں ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم کبھی اس روز ڈاکٹر کو بلا کر نہ لاتے جس دن میری بہت خراب ہو گئی تھی۔

”آپ میری اتنی سی اچھی انی کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔“ وہ قدرے شرمندہ نظر آیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اس لیے کہ ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے انسان کا پتا ملتا ہے۔“ وہ رواداری سے بولی۔

”دراصل۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے بھجک کر رک گیا۔

”ہاں بولو۔۔۔۔۔“ شکیلہ نے جیسے اسے حوصلہ دیا۔

”میں یہ سمجھا تھا کہ آپ نے پاپا سے دولت کی خاطر شادی کی ہے۔“

”تو اب کیا خیال بدل گیا۔۔۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔۔۔“ وہ جیسے شرمندگی سے بولا۔

”آپ ہی آپ کیسے بدل گیا۔۔۔۔۔؟“ شکیلہ کو حیرانی ہوئی۔

”آپ کے اتنے بڑے غم میں جب آپ شریک نہیں ہوئیں تو میں نے امی سے اس موضوع پر بات کی تھی نے بتایا کہ پاپا نے آپ کو آنے نہیں دیا اور آپ فون کرتی رہتی ہیں۔ امی نے پھر مجھے ہر بات بتادی۔ اور انہوں نے بتایا۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ کایا بتایا۔۔۔۔۔؟“ شکیلہ بے تاب نظر آئی۔

”انہوں نے بتایا تمہارے پاپا نے دوسری شادی ہر حال میں کرنا تھی۔۔۔۔۔ آپ سے نہ کرتے تو کسی اور سے کر۔

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ شکیلہ کو واقعی حیرانی ہوئی۔

”میں نے بھی امی سے یہی پوچھا تھا۔ مگر انہوں نے نہیں بتایا۔ آپ پوچھ لیجیے گا۔ شاید آپ کو بتا دیں۔“ بلال

ہو کر چائے پینے لگا۔

”جب تمہیں نہیں بتایا تو مجھے کیا بتائیں گی۔

”آپ زور دیں تو شاید بتا ہی دیں۔ ہو سکتا ہے، اولاد کو بتانے والی بات نہ ہو۔“

شکیلہ نے فور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ (یہ تو خاصا سمجھ دار ہے۔)

”گویا تم بات کی سمجھانے پر آج مجھ سے بات کر رہے ہو۔“ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے خود ہی احساس ہوتا تھا کہ میری زیادتی کے جواب میں آپ بہت کر سکتی تھیں۔ مگر آپ نے میری بدتمیزیاں چھپائیں۔ میری حمایت سے آپ کو کبھی لگ سکتا تھا۔ آپ کو تو سب کچھ پہلے ہی ملا ہوا ہے۔“

ہاں۔۔۔۔۔ رکھ کر پھر دراز ہو گیا۔

”یہ مجھ پر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تمہارے دل میں یہ بات ڈال دی۔“ احساس تشکر سے شکیلہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“ اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

شکیلہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔

بلال اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کیوں رو رہی ہیں۔“ وہ پریشان دکھائی دیا۔

”اپنی اوقات پر اور اللہ کی نوازشوں پر غور کر رہی ہوں۔“ وہ آنسو پونچھ کر گویا ہوئی۔

بلال اس کی سادگی پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

”منزلہ کی طبیعت اب کیسی ہے۔۔۔۔۔؟“ وہ بات کا رخ بدلتے ہوئے بولی

بلال ہونٹ کاٹنے لگا۔

”حقیقت یہ ہے کہ میں۔۔۔۔۔ جب انسان پر غم کا پہاڑ ٹوٹتا ہے اور اس کے چودہ طبق روشن ہوتے ہیں تب اس کی عقل

نہیں روشن ہوتا ہے۔ شاید مجھے یہ عظیم ذکاوت ملتا تو میں آج بھی امی کی باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔

اپنے ذکاوت سے جب انسان دوسروں کے ذکاوت پر شروع کرتا ہے تو بہت حساس اور نرم ہو جاتا ہے۔ اپنے ذکاوت کے

میں اسے دوسروں کی تکلیفیں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ تکلیفیں اس کے ہاتھوں دوسروں کو پہنچی ہوں یا ان کا ذمہ دار

دوسرا ہو۔“

شکیلہ مارے تعجب کے اس کو دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ اتنی گہری باتیں کہاں سے سکھ لیں اس نے؟

”اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو زہر کھالوں گا میں۔۔۔۔۔“ اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

”ایسے نہیں کہتے بلال۔۔۔۔۔ اللہ نے چاہا تو اسے صبر آ جائے گا وہ ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔۔۔ اسے تو ہمیشہ سے زیادہ اب

کی ضرورت ہے۔“

اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر سمجھایا۔

”بھران کے ان لہجوں میں تو انسان کو اپنی جتنی شدہ توانائی کام میں لاتا ہوتی ہے۔۔۔۔۔ پھر مر جاتا ہے تو کیا ماں اس کے

رزقہ قبر میں لیٹ جاتی ہے۔۔۔۔۔؟

مہر کرتے ہوئے۔۔۔۔۔ جن بندوں کو اللہ بلند درجات کے لیے پسند کر لیتا ہے۔ انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ وہ ان

فیر معمولی درجات کے حق دار ثابت ہو سکیں اور باقی انسانوں کو اس فیصلے کے خلاف سوچنے کی بھی جرات نہ ہو۔

اور وہ خود کو دیکھ لیں، کس کو کیا ملا۔۔۔۔۔ اور کس وجہ سے ملا کس نے کس مقام کے لیے کیا کارواں کیا۔

یہاں سے تو ہم نے جانا ہی ہے۔ ہم نے۔۔۔۔۔ سب نے۔۔۔۔۔ خواہ بیماری کے بہانے جائیں یا حادثے کے بہانے۔

جو بیمار ہوتا ہے، وہ مر جاتا ہے۔

مگر مرنا تو وہ بھی ہے جو صحت مند ہوتا ہے۔

جانا تو طے ہے۔ پھر اس دنیا میں جہنم جانے والی چیزوں کی خاطر موت کو جان بوجھ کر گلے لگا لینا کہاں کی عقلمندی ہے۔

موت کی صورت میں ہم۔۔۔۔۔ اپنے آپ سے انتقام تو جب لیں جب ہمارے پاس ہمیشہ زندہ رہنے کا یقین و طاقت



شکیلہ بے ساختہ مسکرا دی.....

”پاپا کہاں ہیں؟“

بلاں کچھ نہیں بولا..... آنکھوں پر بازو رکھ کر ایسے ہو گیا جیسے سونا چاہتا ہو.....!

”ام خاصا باریک بینی کا ہے، آپ کی کارکردگی پر منحصر ہے، آپ دو سوڑھائی ہزار تک بھی کما سکیں گی۔“

سدا بہت توجہ سے دیکھ بھی رہے تھے اور سُن بھی رہے تھے۔

سبحم : "وہ بہت بڑا، ہم نظر آ رہا تھا۔"

شہوار نے آہستہ سے تپائی پر چائے کا کپ رکھا اور جلع پیر کی ملی کی طرح باہر نکلے گی۔

”نہو! یہ کپڑے استری کر دینا، اتنی دیر میں نہیں کُجھو ہی نکل جائے، یہ اسٹینڈ یہاں سے لے جاؤ، بکامبر وار کمرے میں رکھ لو، استری وہیں کیا کرو۔“

وہ ایک دم باہر نکل آئی اور دروازہ نہایت آہستگی سے بند کیا۔

گیارہ بجے دوپہر تک وہ اپنے کام سے فارغ ہو گئی، خود بھی نہادھو کر کپڑے بدلے، سیکے بال پھیلا کر ادھر ادھر مٹا دئے، اسے وہ بیان آیا کہ اس میں کتنی زبردست تبدیلی آچکی ہے۔ احسن کا ہوا اور خوف اس کے لاشعور تک سے نکل چکا تھا۔ عجیب قسم کی دھونس اس کے اندر آئی تھی۔ شاید یہ صنفیہ کے تعاون کا نتیجہ تھا۔

اب دوپہر کے لیے کیا پکایا جائے! کچھ ہے تو نہیں گھر میں، کیا احسن کو کھلو اؤں؟ مجھے تو انہیں سبق سکھانا ہے۔

اچانک اُس کی نظر پڑی، احسن ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر دراز نظر آیا۔۔۔۔۔ اخبار ہنوز سامنے تھا۔۔۔۔۔ غلامی دواگر لیے وہاں نظر آ رہا تھا کہ پھول بی بی کی کمرے کی صفائی کرے۔

وہ بال انگلیوں سے سلجھاتی ہوئی خاصی دیر تک کچھ سوچتی رہی..... پھر احسن کے بیڈروم میں چلی آئی..... سید میا دارا  
رودب کی سمت بڑھی تھی۔

لٹکے ہوئے کپڑوں کی جھیلیں ٹٹولنا شروع کیں۔ ”اب میں ملازمت کر رہی ہوں، ان کا ایک ایک پیسہ ان کو واپس کر سکتی ہوں..... فی الحال یہ بہت ضروری ہے، خواہ اسے چوری کہا جائے۔“ اس نے جیسے خود سے لڑائی کی۔

احسن کی ایک قیم کی جیب میں اُسے پرس محسوس ہوا، نکالا تو ذرا ریوچنگ لائسنس تھا..... ہونہہ..... اُس نے پھر تلاشی شروع کی۔

آخر ایک کوٹ کی جب سے پرس نکل ہی آیا۔ اُس نے جلدی جلدی کھولا۔ مختلف بابت کے نوٹوں میں سے اُس نے پانچ سو کے نوٹ کا انتخاب کیا۔ پرس واپس رکھا اور باہر آ گئی۔

”پھول بی بی!“

”جی بی بی۔“ وہ بھی دُور ہی سے چلائی۔

”ادھر آؤ۔“ وہ ڈرائیونگ روم کے سامنے راہداری میں کھڑی ہوئی تھی۔

”جی بی بی؟“ وہ فوراً آگئی تھی۔

”تمہیں یہاں کے بازار کا پتا ہے؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

احسن نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

”اُم..... سب بازار جانتا اے اور کھا۔“ بے نیازی سے جواب ملا۔

”اچھا ذرا میرے ہاتھ چلو۔“

”عید کا کپڑا واسطے؟“ پھول بی بی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”ابھی سے کہاں عید! اگر ہو بھی تو ہماری کیا عید؟ گھر کا سامان لاتا ہے، جلدی سے چپل پہنو، میں چادر لے کر آتی ہوں۔“ وہ ایک کمرے کی سمت بڑھتے ہوئے بولی۔

احسن نے اخبار پھر سامنے کر لیا تھا۔

دونوں نزدیکی بازار چلی آئیں، گوشت کی دکان پر اس قدر بھیڑ تھی کہ اُسے تو چکر سا آگیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد بٹ حاصل کر باقی تھیں، اس میں پھول بی بی کی بولڈنیرس اور چیر پھاڑ جگر بگڑ بنانے کا بہت زیادہ حصہ تھا۔

ہنری، سلاد اور دیگر اشیائے ضرورت لے کر جب وہ واپس گھر پہنچیں تو گیٹ اندر سے بند تھا۔

ایک تو سخت گرمی تیز دھوپ پھر گیٹ واہو نے کا انتظار، اس نے کال بیل کا بٹن دبانے کے ساتھ ساتھ زور زور سے رازہ بھی دھڑ دھڑا دیا۔

اسی تیز آواز میں کہ ساتھ والوں کی نوکرائی نے پورج کی دھلائی موقوف کر کے باہر جھانکنا ضروری سمجھا تھا۔  
بالآخر ٹیکسٹ مکمل گیا۔

”ہونہہ! پتا نہیں کون سے چور ڈاکو آ رہے ہیں، گنڈے چڑھانے کی پڑی رہتی ہے۔“ وہ بڑبڑاتی۔

وہ چار صوفے پر پھینک کر سامان لے کر لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اب اُسے جلدی جلدی دوپہر کے کھانے کی تیاری تھی۔ پچھلا کھول کر وہ اپنے ”ٹہنیں پیاز“ میں مصروف تھی۔

”پھول بی بی! ان کے..... میرا مطلب ہے اپنے صاحب کے کپڑے استری کرتی جانا۔“

پھول بی بی اندر چلی گئی۔

”پھول بی بی اندر چلی گئی۔“

”پھول بی بی!“ احسن کی آواز آئی۔

”جی صاحب۔“

”کہاں گئی تھیں تم؟“

”ساب! ام بی بی کے ساتھ بازار گیا تھا۔“

”کیوں؟“

”بی بی کو کھانا پکانے کی چیز لیتا تھا۔“

”اپنی بی بی سے پوچھو، پیسے کہاں سے لیے تھے؟“ احسن کی گبیسری آواز آئی۔

”بی بی! صاحب بولتا اے، پیسہ کہاں سے لیا تھا؟“ وہ فوراً ہی اس کے پاس آ موجود ہوئی۔

”ڈاکا ڈالا ہے، اُن سے مطلب؟“ پیاز کاٹنے کی وجہ سے اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ ایک دم بھڑک کر بولی، ہنھول بی بی یوب بدک کر پیچھے ہٹ گئی جیسے وہ کاٹ کھائے گی۔

احسن اخبار شیخ کرواپس اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا۔

نائلہ شبِ خوابی کا لباس پہن کر ڈرینک روم سے باہر آئی تو باہر اپنا پان نکالے کھانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ نائلہ نے نہایت ناگواری سے اُن کی سمت دیکھا۔

”سنا ہے بیگم! آپ نے آفس کیا تھا؟“ بابہ نے گلوری منہ میں دبائی۔ اُن کا انداز خوشگوار تھا۔

”جی! اگر آپ کی مجبوری، الوینہ کا میاں ملک سے باہر ہے تو کیا ہوا، آپ تو انہیں میسر ہیں۔“ وہ نریش بالوں میں جھرتے ہوئے قدرے لہرا کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”مگر میں، اُن کے میاں کا رول تو ادا نہیں کر سکتا۔“ باہر کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

”اب یہ تو میں نہیں جانتی۔“ نائلہ نے تضحی سے کہا۔

”میرے لیے آپ کافی ہیں۔“ باہر نے ایک میگزین اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔

”میں اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ نائلہ نے سنگدلی سے کہا۔

”میں ہر شب آپ کے ساتھ ہوتا ہوں محترمہ۔“

”یہ آپ کی مجبوری ہے، افسوس!“ وہ طنز پر مسکرائی۔

”میں صاحب آئے تھے۔“ وہ باہر کو جواباً خاموش دیکھ کر گویا ہوئی۔

”کچھ کہہ رہے تھے۔“ وہ مسکرائی۔

”مجھے علم ہے۔“ باہر نے جواب دیا۔

”کیا؟“ نائلہ چونکی۔

”بائی چالس ہی آج میں گھر آنے سے پہلے ان سے ملنے ٹی..... دی گیا تھا، کہہ رہے تھے تمہاری بیوی سیٹ لڑا ہے ایڈوائس کیوں نہیں لیتے؟ یہ تو ٹی..... دی پر اگر بہت ہی بار سوخ آسانی بن سکتی ہے۔“ وہ عام سے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”تو پھر کیا خیال ہے؟“ نائلہ نے اپنے ریشمی بال قبضت احتیاط سے کھینچے۔

”جیسے آپ جائیں۔“ باہر نے بڑے آرام سے جواب دیا۔

”مگر.....!“ نائلہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”ہوں..... مگر کیا؟“ باہر پوری طرح متوجہ تھے۔

”اگلے چھ سات ماہ تو شاید میں اسکرین پر سوٹ نہ کروں، اس کے بعد ہی اپنی دلی خواہش پوری کر سکوں گی۔“

نے نظریں اٹھ کا کر کہا۔

”کیوں؟ اگلے چھ سات ماہ تک آپ کوئی کورس کر رہی ہیں؟“ باہر چونکے۔

”جی.....“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”کوئی لینکویج کورس؟..... مگر اس سے اسکرین پر کیا فرق پڑ سکتا ہے؟“ باہر واقعی حیران ہوئے تھے۔

”یہ لینکویج کورس نہیں ہے، ایک آرٹ ہے۔“ وہ لا پرواہی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور لائٹ آف کر۔

ناٹ بلب جلادیا۔

”مسٹر!“ باہر نے پوری دلچسپی سے اسے دیکھا۔

”ایک تصویر تیار کرنا ہے۔ بہت سارے رنگ بھرنا ہیں..... جیتی جاگتی تصویر۔“

نائلہ کے چہرے پر فطری حبا کے رنگ آخر لہر اہی گئے۔

”نان سنس۔“ باہر نے میگزین کا پرٹ پرٹ دیا۔ نائلہ اپنی جگہ پر دہل کر رہ گئی۔

”وائس اے جو کہ اٹ از نوچ.....“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

نائلہ ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

”مگر..... (GREATEST) آف ڈن..... اسٹوڈنٹن..... نان سنس.....“

”یہ کس خوشی میں صلواتیں فرمائی جا رہی ہیں؟“ وہ بری طرح سنج پا ہو گئی تھی۔

”یہ اتنے دنوں سے نیوز چھپانے کی کیا تک تھی؟ کس قدر جاہلانہ حرکت ہے۔ اپنی خوش قسمتی پر ناز کریں کہ مجھ جیسے ایڈوائس شخص سے پالا پڑا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو.....“ وہ برہمی سے گویا ہوئے۔

”کیا مطلب؟“ نائلہ کا دل بیٹھنے لگا۔ ”اتنی گھٹی بات؟“

”اتنے دنوں تک بے بات مجھ سے کیوں بٹھپائی؟“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

”مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح بتایا جاتا ہے۔ میرا خیال تھا آپ خود بخود سمجھ جائیں گے۔“

نائلہ کی ہتھیلیاں پسینے سے تر ہو رہی تھیں..... باہر کی اتنی سستی بات نے اس کے ارسان خطا کر دیے تھے۔

”خود بخود کیسے..... یعنی آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہوتا بتانے کے لیے؟“ وہ سخت برہم تھے۔

”میں جی کا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”مگر ان کا فون تو آتا رہتا ہے۔“ وہ بالکل اس کے قریب کھڑے اسے گھور رہے تھے۔

”تو کیا فون پر بتا دیتے ہیں؟“ اس نے پیٹھ موڑ لی۔

نائلہ کی اس سادگی پر باہر کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

”قار یو ر انٹارکٹیشن..... مجھے فی الحال اولاد کی ضرورت نہیں۔“ وہ دوبارہ بیڈ پر جا کر دراز ہو گئے۔

”جی!“

”جی.....“ وہ اسی انداز میں گویا ہوئے۔ ”اٹ از سویٹ..... بہر حال ٹرائی کرنا.....“

مطلب کیا ہے آپ کا؟“ وہ دہل کر رہ گئی۔

”جی جو آپ نے سمجھا۔“ ان کی آنکھوں کی سُرخی بڑھنے لگی تھی۔ آواز دھیمی ہو رہی تھی۔

”یعنی میں خوشی کی لڑائی کروں؟“

لہنے عایت درجہ تعجب کے ساتھ پوچھا تھا۔

”جوتھ کا سنگ میل نظر آیا تھا..... ایک دم سے ادھر ادھر کہیں لڑھک گیا تھا۔“

”فوتگی کیوں؟ ہم زیادہ سے زیادہ پیسہ خرچ کرنے کی پوزیشن رکھتے ہیں..... میں تمہیں کسی سرکاری میسٹری ہوم یا ہتال میں تو نہیں لے جاؤں گا۔“

”بدو یہ سوچ کر.....“ وہ انداز پر اتر آئے تھے کہ وہ اس کی خود سری کا اندازہ لگا چکے تھے۔

”رہیں یہ سب کیوں کروں؟ آپ سینکڑوں آدمیوں کی بارات لے کر آئے تھے۔ مجھے لینے میں بھاگ کر تو نہیں

لے کر آئے اور صدے کے اپنا ذاتی توازن کھونے لگی۔

نائلہ..... مجھے پریشان نہیں کریں.....“ باہر کی آنکھیں نشے سے جو جھل ہونے لگیں۔

”ب تک بات صاف نہیں ہوتی..... میں یہیں کھڑی رہوں گی.....“ وہ بے حد ضدی دکھائی دی۔

”تو گئی ہے صاف..... مجھے اولاد نہیں چاہیے۔“ وہ کروٹ بدل کر ہنسی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔

”مائل میں ساری تکفیس، ساری کوفت ساری ذمہ داری ماں کی ہوتی ہے۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔“ باہر کی تمام

تیاں نائلہ کے حافظے میں جمع ہو گئیں تو وہ ہر مصلحت سے عادی ہو گئی۔

”بہت فرق پڑتا ہے۔ مجھے آپ کی فیل اٹیشن چاہیے..... مزید بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہوگا تو وہی جو

ہرد لیل..... ہر عاقلانہ منطق کو ملتوی کرنا تھا۔

”ایسے ہی“ ناملہ کی رگوں میں جیسے انگارے دوڑنے لگے۔ اس نے طیش کے عالم میں دروازے کی سرور بڑھائے۔

”ذیر..... تم بہت دامن لیدی ہو..... آئی ایڈ ماریو.....“ نائلہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ درآئی۔

نائلہ جہاں بھی وہیں رک گئی.....

”بلکہ تمہارے ایک اور بھدراد پر سو رہے ہیں..... یوں بھی انہوں نے ٹائٹ کوچ سے کراچی جانا ہے۔ اور بڑا بیدار ہوتا ہے۔ انہیں اٹھادوں..... وہ تمہیں عزت و احترام سے چھوڑ آئیں گے۔“ باہر نے قدرے مخموراً و اذ میں اسے مست اشارہ کیا۔

نالہ پے در پے حملوں سے جیسے ساکت سی ہو گئی۔  
اس کی زبان جیسے پتھر کی ہو کر ایک جگہ تک گئی تھی۔

”ہم نے تو آپ کا اجازت دے دی ہے۔ پھر کیا انتظار ہے۔“ بار نے آنکھیں موند لیں۔ ”مگر یاد رکھو تمہاری وقت کی دوری جو خلا چھوڑ جائے گی۔ وہ تمام زندگی نہیں بھرے گا۔۔۔۔۔ نائلہ بیگم!“

”آج کے بعد ہمارے درمیان کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔“ بابر کی آواز نہایت مدہم تھی۔

نائیلہ کی جی چاہا۔۔۔ ہر شے پر لعنت بھیج کر نجات کے اس لمحے سے فوراً فائدہ اٹھائے۔

مگر۔۔۔۔۔

صفیہ کے زار و قطار آنسو..... بد نصیبی کی جیسے طویل زنجیر.....  
نبیلہ کا رائیگاں ولا حاصل دکھ۔

ماں کا کلیجہ تو پہلے ہی بھٹی ہے۔ مزید انگارے لے جاؤں۔  
میرے جانے کے بعد اس گھر کا نقشہ کیا ہوگا؟

تو پھر یوں فرض کر لوں۔ جیسے کسی عظیم مقصد کی خاطر خود کو قربان گاہ پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ یوں جیسے..... ایک سزا سے سوسر محفوظ ہو جاتا ہے۔ مجھے جلدی سے جلد احسن بھائی کے ملنا چاہیے۔ دوسری صورت میں، میں سخت بے بہار ہوں..... وہ ہونٹ کا قاتلی سوچ رہی تھی۔

اس نے باہر کی سمت دیکھا وہ خواہش کے سمندر میں سرکش موجوں کی زد میں تھے۔ نیم ہوش مند، نیم بے ہوش ۱۱ حال اس کی سمت متوجہ تھے۔ نیند کا غلبہ اپنی جگہ تھا۔۔۔ اعلا اور انسانیت کی آرائش کرنے والے جذبات زہریلے ٹشوک پر تھے۔ کیسی آن اور کیسی خودداری۔ اس وقت اس شخص کو کیا ہوش کہ انا کی اہمیت کیا ہوتی ہے۔ اور یہ کہ اپنی انا کو کھرا لے کے انسان دوسرے فریق کو کس قدر عظیم فتح کے احساس سے ہمکنار کرتا ہے۔

سونا تو خیر کس بجنت نے تھاب اسد کی وجہ سے یوں بھی اُسے جلد اُٹھنا تھا۔ وہ اذیت و جہر کے پھلتی کروٹے والا احساسات کے ساتھ بستر پر چلی آئی۔ ایک لمحہ ایک گھڑی اپنی مرضی کی نہیں۔ مگر بابر مرتضیٰ..... میں اپنی مرضی کی ضرور گزاروں گی۔ تمہارے ہی گھر میں۔ تمہارے ہی سامنے۔

اسے اس وقت چُب رہا تھا۔

اللہ ربی ہیں آپ، اسد کے سر پر جیسے پہاڑ سا ٹوٹا تھا۔

”لوں مرے یس؟“ وہ حیرانی کی انتہا پر تھے۔



اشتا کر لیجیے اسد بھائی۔“

آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی بھابی..... بس ایک کپ چائے بہت ہے۔“ اسد فنی طور پر بہت الجھ گئے تھے۔  
رحمت کی کوئی بات نہیں۔ کچھ تو لیجیے..... میں ذرا ڈرائیو کو اٹھا کر آتی ہوں۔“  
آپ رہنے دیجیے..... میں اٹھا دیتا ہوں۔“ اسد باہر نکل گئے۔  
لدا نہیں جاتا دیکھتی رہی۔

اگر اسد نے واقعی اس موضوع پر باہر سے بات کر لی؟ کیا انجام ہو گا؟“  
پناہ برا سے معاف نہیں کریں گے..... شاید بہت بڑا طوفان آٹھ کھڑا ہو..... وہ اپنے وجود سے چمکتا فٹات آرتے  
یہ برداشت کر سکتے ہیں؟“

نے کیا کیا وہم اسے سنانے لگے تھے۔ اسی دم اسد واپس آ گئے تھے..... وہ سنبھل کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ تویہ سر  
رہی تھی۔ گھنے بالوں نے اس کا وجود مٹھا کر رکھا تھا۔

دلی کاٹن کے سوٹ میں اور کچھ رونے کی وجہ سے چہرے کے گلابی پن میں سرخی سی جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ پنک  
ل نمایاں سی لوگ اس کے سادہ سے چہرے کی بھرپور آرائش تھی۔ پچھلے دنوں باہر ہی نے یہ لوگ گفٹ کی تھی۔  
ہانٹ کی خوشی میں..... ایک انگوٹھی کے ہمراہ..... اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

اسد بھائی!“ نائلہ نے دوپٹے کا آچل سر پر ڈالتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

جی بھابی..... ارشاد!“ وہ ہنوز اسفردہ اور گم سم سے تھے۔

آپ پلیز..... باہر کو اشارتا بھی نہ بتائیے گا کہ.....“

آپ فکر مند نہ کریں..... میں سب سمجھتا ہوں..... مگر بھابی..... آپ پھوپھو سے اس موضوع پر ضرور بات کر لیں  
نہ یہ ڈپریشن بڑھ کر آپ کو اعصابی مریضہ بنا دے گا۔“

کیا وہ یقین کر لیں گی؟“

وہ بہت عقلمند اور شہنشاہی دماغ کی مالک ہیں۔“ اس کے منہ سے پھر تعریفی کلمات نکلے۔

جی..... عقلمند تو بہت ہیں۔“ نائلہ کے طنز میں بے ساختگی تھی۔

مدعا موش سے ہو کر رہ گئے۔

آپ کہیں تو پھوپھو سے میں بات کروں؟“ اسد نے نیا صل پیش کیا۔

نہیں..... باہر میرے شوہر ہو کر، اتنے براڈ مائنڈڈ ہو کر آپ کے نام سے مجھے ہرٹ کر سکتے ہیں۔ تو..... وہ تو پھر میر  
ماں اسد بھائی!“ نائلہ نے آئندہ کی الجھن سے بچنے کے لیے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔

مدنے یہ جملہ سن کر مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔

لکں درجہ ستم ظریفی تھی کہ اسد کو اپنے گھر کی چار دیواری میں ہی ہر طرح کی سٹکھ اور آرام میسر تھا۔

بان جھڑکنے والے انتہائی مہذب گھرے ہوئے تعلیم یافتہ والدین..... معاشی استحکام..... کاروباری ساکھ..... اس  
جودا دھر ا دھر سے مفت کے غم ان کو ملتے جاتے تھے۔

اچھا بھابی..... میں ذرا اتار ہو جاؤں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اسد بھائی ڈرائیو کو یہیں بھیج دیجیے۔ جائے کے لیے۔“

”ایک ماں سے زیادہ اولاد کی کیفیات سے کون واقف ہو سکتا ہے۔“ وہ بکڑ کر گویا ہوئی۔

”مگر باہر تو ہر طرح سے پرنکٹ ہیں۔“ اسد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”آپ یہ بتائیے تاحال سب سے زیادہ باہر قریب ہیں۔“ اسد نے سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

”لہذا مجھے ہی زیادہ جانا ہونا چاہیے۔“

”بھابی!“ اسد پکراے گئے تھے۔

”آپ ایک بار اُن سے مل کر یہ ضرور پوچھ لیجیے، میری طرف سے کہ میں نے یا میرے خاندان نے ان سے کیا  
کی تھی؟“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا مرض ہے باہر کو..... خدا نخواستہ؟“ اسد سخت پریشان نظر آئے۔

”میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔“ اس نے نگاہیں مڑا کر جواب دیا۔

اسد کے تو حواس گم ہو گئے۔ وہ تو کچھ انتہائی طرف ہی سوچنے لگے تھے۔

”مگر کچھ ارشاد تو ہو۔“ اس کی آواز پر سہم سا طاری تھا۔

”کیا باہر اپنے مرض سے آگاہ ہیں؟“ انہوں نے اگلا سوال کیا۔

”سو فیصد۔“ نائلہ نے چائے کی پتی کھولتے پانی میں ڈالی۔

”آپ نے ان سے علاج کے لیے نہیں کہا۔“ اسد کی آواز میں شکستگی در آئی۔

”وہ کہتے ہیں۔ ان کا یہ مرض ان کے لیے نوید زندگی ہے۔ وہ اس مرض کو نشے کی طرح چہٹائے ہوئے ہیں۔  
علاوہ..... وہ کہتے ہیں، اس مرض کے دورے سے وہ حیات نو حاصل کرتے ہیں..... اس کے بغیر ان کی زندگی۔

ہے۔“ نائلہ نے بتایا۔

”نشے کے علاوہ؟“ اسد یہیں پرانک گئے تھے۔ ”کیا وہ نشہ بھی کرتا ہے، کیا یہ بھیا نک انکشاف تھا۔

”وہ کہتے ہیں یہ ترک نشہ کی آخری منزل ہے۔ ہلکا بھرا..... نشہ تو نشہ ہے۔“

”تو یہ مرض ہے؟“ اسد جیسے کسی نتیجے پر پہنچے۔ اور نائلہ کی بات کاٹ دی تھی۔

”جی نہیں..... یہ مرض نہیں..... مرض کا حد ہے۔“ اس نے ان کے نتیجے کو فوراً مسترد کیا۔

”کیا میں اس سے اس موضوع پر بات کروں؟“ اسد کو یہی حل سوچھا۔

”بالکل نہیں۔“

”مگر میں اس کا بھائی ہوں۔“ اسد کو اس ممانعت شاق گزری۔

”آپ یقیناً یہی چاہیں گے کہ میں اس گھر میں آباد ہوں۔“ نائلہ نے فریج سے دودھ کا برتن نکالا۔

”اس میں کیا شک ہے؟“ اسد کو الجھن ہوئی۔

”آپ کی ہمدردی کا طعنہ مجھے مل چکا ہے..... مجھے تو آپ کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔“ نائلہ کی آواز بھر آئی

اسد گم سم سے کھڑے رہ گئے۔

”میں باہر سے اس قسم کی امید نہیں رکھتا تھا۔“ اسد نے ڈکھ سے کہا۔ ”مگر کچھ تو کرنا ہے۔“

”کسی کو بھی ان سے کسی قسم کی امید نہیں رکھنا چاہیے..... وہ صرف اپنی زندگی کو اہمیت دیتے ہیں۔“

اس نے ناشتے کے لوازمات نیکل پر رکھے۔

”بہتر!“ اسد باہر نکل گئے۔

ڈرائیور نے چائے پی گاڑی باہر نکالی اتنی دیر میں اسد کوٹ اور ٹائی کے اضافے کے ساتھ نیچے آ گئے۔ بلا ساہو  
کیس اور ایک بیگ ان کے ہمراہ تھا۔

”اپنا خیال رکھیے گا بھائی..... مجھے آپ کی طرف سے فکر ہے گی..... پلیز آپ پھو پھو سے ضرور ملیں۔“  
وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے تاکید کرنے لگے۔

”جی..... خدا حافظ اسد بھائی!“ اس نے گیٹ کا پٹ تھام کر آہستگی سے کہا تھا۔

”لوگ تو اتنے جلد باز اور ظالم ہیں، کوئی ذرا دکھائی نہ دے تو کہتے ہیں۔“ ”مر گیا“ اب یہ تو نہیں ہونا چاہیے ناں.....

”جی“  
ٹکلی خاموشی رہی۔

”اؤں سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ ہوش مند کی طرف آرہی ہے۔“  
”ہاں!“

”جی آئی!“ بلال ایک دم مستعد ہو گیا۔

”تم نے آفس سے معلوم کیا کہ خادرا آج کل کس پورٹ پر ہیں؟“ اس نے بھائی کی سمت بغور دیکھا تھا۔

”جی..... بہتر میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔“ بلال نے نظریں اٹھکا کر جواب دیا۔

”یہ دم کمرے میں برس داخل ہوئی پیچھے پیچھے اسد تھے۔“

”السلام علیکم بھائی!“ اسد صرف منہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ بعد میں انہوں نے ٹکلی کو سلام کیا تھا۔ ٹکلی پر نظر  
نی انہیں نالہ کا دھیان آیا تھا..... باہر کی شادی میں انہوں نے ٹکلی کو دیکھا تھا۔ مگر انہوں نے انعام علی کے گھر میں یا  
یہاں سے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔

”آپ آگئے..... شکریہ“ منہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”آپ آتے ہیں تو دل کہتا ہے جیسے آپ کے پیچھے پیچھے خادری آ رہے ہیں۔ شادی سے پہلے اور شادی کے بعد آپ  
لاگتا تھا ساتھ ساتھ دیکھا ہے۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرائی۔

”برائے رکھی گری پر بیٹھ گئے..... ان کے چہرے پر تشویش کے تاثرات گہرے ہو گئے تھے۔“

”اکثر سے طے تم؟“ انہوں نے بلال سے پوچھا۔

”نہیں!“ بلال نے نفی میں جواب دیا۔

”اسد بھائی!“ منہ نے مخاطب کیا۔

”جی بھائی؟“

”آپ کو یاد ہے۔ میری شادی والے دن خادری کی گاڑی کا ٹائز بچکر ہو گیا تھا۔ اور بارات کے لیٹ ہونے پر ہمارے  
نذر ہماگ دوڑ چکی تھی۔“

”باپ بائیک پر ہمارے ہاں بتانے آئے تھے کہ بارات کیوں لیٹ ہے۔ سنا ہے اسپر ٹائز نہیں مل پایا تھا۔  
بنا ہوتا تو نہیں ہے اور بھی تو گاڑیاں تھیں۔ دراصل نوشہرہ میں بارات اتنی لیٹ نہیں ہوتی۔ جبکہ کراچی میں تو  
بے ٹو بجے تک باراتیں آتی ہیں۔ کیوں؟ آپ کی آمد تو اچھی خبر کی علامت ہوتی ہے۔“

”نایا اچھی خبریلا ہے ہیں اسد بھائی؟“ منہ نے اداسی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

”لوگوں کی جواب سچائی نہ دیا..... ان کا سر جھکا ہی رہا۔“

”اور خود نہیں آ رہے تو فون ہی کر دیتے۔“

”کہہ رہی تھیں، یونانی عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ مگر خادری.....“

”لالی..... کیا کیا سوچ لیت ہیں آپ..... خوبصورت عورتیں بھلا کہاں نہیں ہوتیں۔“ اسد نے فوراً بات کاٹ دی۔

”خوبصورتی ہی اگر اس دنیا میں ترجیح ہوتی تو دنیا کی ساری خوبصورت عورتیں ہی غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ انہیں

ٹکلی بلال کے ساتھ منہ کو دیکھنے چلی آئی تھی۔ انعام علی نے اس کے ہاسپٹل جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔  
بھی بلال کے رویے سے انہیں طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ محض بلال کی خاطر ہی انہوں نے ٹکلی کو منہ کے گھر چلا  
نہیں دیا تھا۔

”کہ اس کی موجودگی سے رشتے داروں کو نہایت دلچسپ موضوع مل جائے گا۔ دکھوں کے موسم کی یہ عادیہ جانی  
مگر ہاسپٹل میں ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ سوائے منہ کی نندہ کوئی زیادہ نہیں آ جا رہا تھا۔ سلور پرنٹ  
سفید شلوار سوٹ میں لمبوس منہ درہے کا پٹ تھا سے باہر جھانک رہی تھی۔“

”ٹکلی اور بلال کو اندر آتے دیکھ کر اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا، دوبارہ منہ موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔“

”السلام علیکم آئی!“ بلال نے سلام کیا۔

”منہ بدستور باہر دیکھتی رہی۔“

”آئی..... یہی آپ سے ملنے آئی ہیں۔“ بلال نے اسے متوجہ کیا۔ ”ادھر آئیے ناں!“

”منہ بے دلی سے چلتی ہوئی بستر تک آئی۔“

”پتا نہیں خادری نے فون کیوں نہیں کیا۔ دل بہت پریشان ہے۔“

”وہ یا سیت سے کہتے ہوئے بیٹھ گئی۔“

”ٹکلی اس کی حالت دیکھ کر ملول سی نظر آنے لگی۔ منہ کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔“

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس نے محبت سے پوچھا۔

”ٹھیک نہیں ہوں..... دل بہت بے قرار ہے، پرندے کی طرح پھڑپھڑاتا رہتا ہے۔ خادریاں تو مسئلہ حل ہو۔“

”کے لہجے میں بلا کا درد تھا۔“

”خود کو سنبھالو منہ..... ایسے کس طرح گزرے گی۔“ ٹکلی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اب تو خادریاں گئے، جب ہی گزرے گی۔“ منہ بستر پر دراز ہو گئی۔

”بچوں کی خاطر ہی خود کو سنبھالو..... ان معصوموں کا ہی خیال کرو۔“ ٹکلی نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”جب ہی زندہ ہوں..... ورنہ نہ جانے میں بہت سکون ہے۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔

”کیوں؟“ ٹکلی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”خادری جو دکھائی نہیں دے رہے۔ زندگی کا یقین تو موجودگی سے ہے۔ وہ نظر نہیں آتے تو طرح طرح کے دہم

ستاتے ہیں۔“ اس کی آواز پر آنسو غالب آ گئے۔

ایسا لگتا ہے۔ کوئی زلزلہ آیا تھا۔ یا بہت بھیاںک طوفانی بارش۔ ہر طرف ٹوٹ بھوٹ سی ہے۔ دیرانی اور  
 "وہ بڑا حال ہو کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔  
 "ہائی..... اگر یہ دل بونی پریشان رہا تو دیکھیے گا ایک دن میں چپکے سے اوپر جا کر چھلانگ ماروں گی۔" اس نے  
 طرف کروٹ لے کر آنکھیں منہ بند لیں۔  
 مدنے زس کی سمت دیکھا جیسے اُسے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلا رہے ہوں۔ شکلیہ ترجمی ہو کر اس کے بالوں  
 اُسے ہاتھ پھیرنے لگی۔  
 "تو تھوڑی کے نیچے ہاتھ دیے ایک لگ سا منہ دیوار کو کھو رہا تھا۔

ایک دم بھکدوڑی مچ گئی تھی۔  
 "صاحب آئے ہیں..... سر آگئے ہیں..... مالک آئے ہیں۔"  
 شبوں پر بیٹھے ہوئے کارمگر مرد، عورتیں تو بدستور اپنے کام میں منہمک تھیں۔ البتہ دوسرے ملازمین بوکھلائے ہوئے  
 جے تھے۔  
 "ہاں! جی جی چڑھاٹ کے ساتھ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف مشینوں کا شور باقی رہ گیا۔  
 "اکرام صاحب کہاں ہیں؟" اسد کی آواز مشینوں کے شور کے سچے انجبری۔  
 "سر..... وہ اوپر گودام میں ہیں۔"  
 "اطلاع دیجیے انہیں۔" اسد نے دھیمی آواز میں کہا۔  
 "ٹھہرا دو روزے کے عین سامنے گری پر بیٹھی تھی۔ اسد کو قریب پا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔  
 "السلام علیکم سر!"  
 "یاد دیر ترش کے ٹوٹ میں جلوس وہ سجاؤ تازہ سی دکھائی دی۔  
 "وعلیکم السلام..... کام ہو رہا ہے؟"  
 "ٹھہرا نے عادتاً اپنا آنچل سر پڑا لیا۔ "لیس سر..... کام ہی کرنے آئے ہیں۔"  
 "لڑ..... اپنی پراہلم؟"  
 "تو ٹھیکس۔"  
 "مشکل تو نہیں ہے یہ کام؟"  
 "یہ تو بہت دلچسپ کام ہے۔ ڈنڈے ہی تو بجانے ہیں۔" وہ مسکرا دی۔  
 "اسد بھی رساؤں سکر آ کر آگے بڑھ گئے۔  
 "ماتے سے اکرام صاحب بھی لٹم پٹم چلے آ رہے تھے۔" "السلام علیکم سر..... یہ بہت اچھا ہوا سر آپ آگئے۔ سر کل  
 "لوگا..... زیادہ تر لوگ دو گھنٹے سے زیادہ اور نام پر راضی نہیں۔ جبکہ بیکنگ ساتھ ساتھ ہو رہی ہے۔"  
 "کیوں راضی نہیں ہیں۔ کیا ان لوگوں کو اور نام نہیں ملتا؟"  
 "سر یہ لوگ کہتے ہیں، بہت کم ہے۔"  
 "تو اکرام صاحب! آپ ان لوگوں سے کہیے باضابطہ بات کریں۔ ہم غور کریں گے۔ آپ انہیں یہ بھی بتائیے کہ

کسی ایک کارہنے ہی نہ دیا جاتا۔ کیا گھر میں خوبصورت بھایاں..... چچی..... تائی..... ممانی وغیرہ نہیں ہوتیں۔  
 خوبصورتی اخلاقیات کو پامال کرنے والی چیز تو نہیں ہوتی۔ دنیا میں کوئی بہت عزیز ہو جاتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا نہیں  
 لے سکتا..... چہرے کی خوبصورتی سے بھی زیادہ اہم کردار سے ہوتے ہیں۔ چہرے سے نہیں۔  
 حقیقت یہ ہے بھابی۔ کبھی بھی ایک چہرہ دوسرے چہرے کا بدل نہیں ہو سکتا۔ روح کا تقاضا چہرے کے ظاہر سے پورا  
 نہیں ہوتا۔"  
 اسد نے اتنی طویل بات محض اس لیے کی تھی کہ منزہ کا دھیان بنائیں۔ شکلیہ بہت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ کچھ  
 خوبصورتی اور سلجھاؤ تھا ان کی گفتگو میں۔  
 "مگر چہرے کے حسن کا جادو ایک اہل حقیقت ہے۔" منزہ نے گم سم انداز میں کہا۔  
 "جنہوں نے کسی کے کردار کا حسن کا ذائقہ چکھ لیا ہو۔ وہ ان ظاہری پہلا دوں سے نہیں بھینٹتے بھابی!"  
 "خود بہت حسن پرست ہیں۔" منزہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ خدشہ ظاہر کیا۔  
 "تو آپ بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔" اسد نے دکھ کی لہر اپنے سینے میں بھسک دی تھی۔  
 "اگر وہ اسی طرح مجھ سے دُور رہے تو غریب میرا ڈاؤن فال ہو جائے گا۔ میں بہت بد صورت ہو جاؤں گی۔" ہر  
 کی آنکھیں برس پڑیں۔  
 کمرے میں ایک وحشت ناک سناٹا طاری ہو گیا۔  
 "ایک تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے یہاں ہاسٹل میں کیوں رکھا جا رہا ہے۔ کیا ہوا مجھے؟ کیا جن غوروں نے  
 شوہر زیادہ دنوں تک گھر واپس نہ آئیں تو انہیں ہاسٹل میں رکھے دیا جاتا ہے اسد بھائی..... یہاں میرا دل بہت گہرا  
 ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔"  
 "بھابی! آپ کا دل پریشان ہے۔ آپ کے ذہن سکون کے لیے آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔"  
 اسد نے ملائمت سے سمجھایا۔  
 "حد ہے حماقت کی..... میرا ذہنی سکون تو یونان کے ساحلوں میں چھپا ہوا ہے۔ مجھے یہاں کیا سکون ملے گا؟"  
 بھوٹ بھوٹ کر رو دی..... شکلیہ نے اُسے اپنے شانے سے لگا لیا۔  
 اس کے رونے سے احساس ہوتا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آ رہی ہے۔  
 "باجی..... دل اتنا وحشت زدہ کیوں ہے؟"  
 شکلیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔  
 "باجی..... یہ کسی قیامت ہی آئی ہے۔ دل کسی خوشی کی امید سے کھلتا ہی نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ کوٹ گیا۔  
 اور ملے گا نہیں۔" وہ بھوٹ بھوٹ کر رو دی۔  
 "ایسی باتیں نہیں کرتے۔" شکلیہ نے اپنی چادر کے پلو سے اس کا چہرہ صاف کیا۔  
 "اللہ تمہیں صبر و برداشت دے ہم تو بہت باہمت ہو۔"  
 "اسد بھائی..... آپ بڑے ہمدرد بنے پھرتے ہیں..... آپ ابھی تک خادو کی خبر تک نہیں لے سکے۔ آپ بڑے  
 چپا نہیں ہے۔" منزہ نے ہینتر ابدل کرتی ہی کہا۔  
 اسد خاموش رہے۔

ہمارے ہاں تنخواہیں، مراعات، اور ٹائم نسجاً بہتر ہے۔ ہمیں کسی کا جائز حق مارنے سے قطعی دلچسپی نہیں۔ کل کارم  
لازمآ آج کام مکمل ہو جانا چاہیے۔

جب چیز وقت ہی پر نہ ملے تو پھر اس شوروغل کا کیا فائدہ؟ خواہ روپیہ ہو یا ریوس۔

”سرا“ شہوار گھبرا کر آٹھ کھڑی ہوئی۔

”جی بی بی!“

”سرا! آج پانچ بجے چھٹی نہیں ہوگی؟“

”جی بی بی..... مجبوری ہے۔ مگر آپ کو اس کے پیسے علیحدہ سے ملیں گے۔“

”سر کتنا نام؟“

مس ڈوشوار۔ آپ ”سر“ سے یہ باتیں کرنے کے بجائے مجھ سے آفس میں آکر بات کیجیے۔“ اکرام صاحب  
ایک دم مدخلت کی۔

”یہ باتیں سر سے کرنے کی نہیں ہیں..... مجھے ان ہی معاملات کو ذیل کرنے کی تنخواہ ملتی ہے۔“

اکرام صاحب ڈوشوار کو سمجھاتے ہوئے ساتھ ساتھ اسد ”صاحب“ کے تاثرات بھی دیکھ رہے تھے۔

”سوری سر..... جس طرح ایک دیہاتی کوشاںی دربار کے آداب نہیں معلوم ہوتے اسی طرح مجھے نوکری کی

نوکری کا سلیقہ بھی آجائے گا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں بی بی..... کیسے آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ اسد نے رواداری سے کہا..... اور ایک اپنی نگاہ اس  
سچ چہرے پر ڈالی تھی۔

”سر..... بات یہ ہے کہ میرے گھر پر کوئی نہیں ہوتا۔ اور مجھ میں تنہا اندھیرے میں سفر کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”آپ کو گھر پہنچا دیا جائے گا..... ڈزن میٹر۔“ اسد نے قدم آگے بڑھا دیے۔

”سرا!“ ڈوشوار نے جیسے کسی مسئلے سے بے چین ہو کر انہیں پھر مخاطب کیا۔

”جی بی بی!“ اسد بڑے قہر سے بھر کھڑے ہو گئے۔

”سر! پھر بھی کتنا نام لگ سکتا ہے۔“

”بی بی! آپ کیوں گھبرا رہی ہیں۔ آپ سے تو گھر میں کوئی باز پرس کرنے والا بھی نہیں ہے۔ آپ ہی تو نہ  
ہیں کہ گھر میں کوئی نہیں۔“ اسد نے یاد دلایا۔

”جی..... جی سر..... وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر.....“

”ٹھیک بھی ہے پھر بھی مگر..... یہ کیا بات ہوئی آپ تسلی رکھیے۔ آپ کو آپ کے گھر کے دروازے پر چھوڑا جائے گا

”جی سر!“ بے بسی سے شہوار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بلکہ ایک قطرہ تو رخسار پر لڑھک آیا۔ یا اللہ اکمل!

سمجھائے؟

اسد چونک سے گئے۔ نئی نئی دوسری ہے۔ ”عادت ہو جاتی ہے بی بی..... آپ اطمینان رکھیے۔ آپ کو پہنچا دیا

ذمہ داری ہے۔“ وہ آگے بڑھ گئے۔

وہ بے بسی ہو کر گری پر گر گئی۔ ”اللہ نے چاہا تو تمہارے ساتھ ایسا ہی ہو گا۔ جیسا تم نے میرے ساتھ کیا۔“

دل ہی دل میں اس حسن سے مخاطب تھی۔

سات پرسوں پہنچی تو اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ ”کچھ نام راتے میں بھی لگے گا۔ گھر کب تک پہنچے گی؟“  
سات پانچ پر آخر کار کام بند کرنے کا حکم ہوا۔ مطلوبہ کھپ تیار ہو گئی تھی..... اب باقی کام دوسری شفٹ کا تھا۔ یعنی  
بگ اور ترسل۔

وہ پرس اٹھا کر باہر نکلنے لگی تو چراسی نے بتایا اسد صاحب باہر گاڑی میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

وہ تدرے حیران ہی باہر آئی۔ واقعی اسد اس کے منتظر تھے۔

”آپ بفرزون میں ہوئی ہیں ناں، میرا روٹ تو نہیں ہے مگر گاڑی دوسری کارکن لڑکیوں و خواتین کو چھوڑتی جائے گی

آپ کو دیر ہو جائے گی مزید۔ جبکہ آپ رونے کے سلسلے میں خاصی جلد باز واقع ہوئی ہیں۔“

شہوار اس وقت تکلفات میں پڑ کر وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی..... جلدی سے بیٹھئی..... احسن تو آپکے ہوں گے۔

اود میرے خدا..... ان کے پاس تو صرف مین گیٹ کی چابی ہے جو اس نے پھول بی بی کے ہاتھ اسے پہنچائی تھی۔

ہداری ڈرائنگ روم اور احسن کے بیڈ روم کی چابیاں اس کے پاس تھیں۔ راہداری بند ہونے کی وجہ سے کچن کا راستہ بھی

رہو جاتا تھا۔ اُسے جتنی آستیں زبانی یا دھیس پڑھنا شروع کر دیں۔

اسد ترجمہی نظروں سے کئی بار اس کی گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ کا جائزہ لے چکے تھے۔ مگر ضرورت سے زیادہ انٹرویو

بے بس نہیں کرتا تھا۔

یا اللہ..... وہ وحشی تو پہلے ہی حدود پھیلا گ چکا ہے۔ پتا نہیں اسد کے سامنے اس کا کیا حشر کرے۔

”جی سر..... اس طرف لے لیجئے۔“ جتنا گھر نزدیک آ رہا تھا اوسان خطا ہو رہے تھے۔ اور تو کسی بات کا خوف نہیں تھا

رف اپنی بے عزتی کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

”یہ اس طرف..... جی..... جی۔“ وہ خوفزدہ سی سامنے دیکھ رہی تھی۔ گاڑی جیسے ہی گھر کے سامنے ٹکی اُس کی توری

کی ہمت بھی جواب دے گئی۔ گیٹ کھلا ہوا ہے۔ گاڑی کے اندر کی لائٹ آن تھی۔

”یہ ہے آپ کا گھر..... مگر اس کا تو گیٹ کھلا ہوا ہے۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ گھر میں کوئی نہیں۔“

انہنی ضرورت مند لڑکی کا گھر..... اس کے اسٹرکچر سے اس پر لگی لاکٹ کا اندازہ ہو سکتا تھا..... ابھی تو اسے پہلی تنخواہ

ملی تھی۔ اور کرائے پر اتنا بڑا گھر؟

”جی سر..... یہی میرا گھر ہے!“ وہ گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ اسد نے اُلجھی ہوئی نظروں سے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

دھوکے بازی بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ محنت کر رہی ہے۔ جان مار رہی ہے۔ سولہ سو روپے کی خاطر۔

مضبوط گھر..... پورچ میں کھڑی سرخ کار..... اور سولہ سو روپے کے لیے اتنی محنت گھر میں کوئی نہیں۔ اور کھلا ہوا

بٹن۔ وہ شک میں پڑ گئے تھے کتنے اصرار سے اس نے یہ نوکری حاصل کی تھی۔ کس کس طرح اپنے جتنی ہونے کا یقین

ایاتھا۔

انہوں نے عجیب سی الجھن میں گاڑی اشارت کی..... اسی دم احسن گیٹ کیک پیچوں سے آکھڑا ہوا۔

براؤن پیٹ، سفید قیس اور پیچنگ ٹائی جو ڈھلی کر کے چھوڑ دی گئی تھی۔

”آپ کا بہت بہت شکریہ!“ شہوار ان کی طرف آکر شکریہ ادا کر رہی تھی۔

جبکہ اسد احسن کی سمت متوجہ تھے۔ شہوار نے پلٹ کر ان کی نظروں کا تعاقب کیا۔ دل بری طرح دھڑک گیا۔ سچ جج

ساز لگا تھا۔

اسد نے خدا حافظ کہہ کر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

شہوار نے گیٹ کی سمت قدم بڑھائے تو احسن نے راستہ چھوڑ دیا۔ شہوار نے پرس سے چابیاں نکالیں۔ اور لاک کھولا شروع کیے۔

احسن غالباً چھوٹے سے لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا پرس، ریست واج، سگریٹ کی ڈبیہ ان جیمز کے بیچ رکھی تھی۔ پڑی تھی۔

دروازے کھول کر اس نے لائٹس آن کیں۔ اپنی چادر اور پرس بوجھ کی طرح پھینکا۔

جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کچن میں چلی آئی۔

تھکا چور کی واڈھی میں ہوا کرتا ہے۔

لہذا اسے یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ احسن اسے اسد کی گاڑی سے اتارنا دیکھ کر کیا سوچے گا۔

بلکہ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ گھر بند دیکھ کر اسے بے حد غصہ آ رہا ہوگا۔ اس نے جلدی سے چائے تیار کی۔ ایک کپ اپنے لئے اور ایک احسن کے لئے۔ اس کے بیڈ روم میں رکھنے آئی تو اسے ہاتھ روم میں پایا۔ چائے ایک پرچ سے ڈھانپ کر رکھ دی۔ اور واپس آ کر کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ ساتھ ساتھ چائے کے گھونٹ بھی بھرنے لگی۔ ضروری امور نمٹا کر وہ چاول صاف کرنے لگی۔ کچن کے سامنے کے کھلے حصے میں۔ وہاں قدرتی ہوا بھی آتی تھی۔ اور روشنی بھی۔ ٹیوب کی براہ راست پڑتی تھی۔ وہ چاول ضرور صاف کر رہی تھی۔ مگر ہر لمحے ایک دھڑکا سا اسے ہولارہا تھا۔ اسے جتنے دھاڑتے مردوں سے بہت دھشت ہوتی تھی۔ بھاری اور برہم آوازوں سے اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

معاں نے سامنے کھڑ پٹری آؤریں سنیں۔ سرمئی شلوار قمیص میں ملیوں پاؤں میں جم جم کرتی پٹاوری چپل پہنے۔ گاڑی باہر نکال رہا تھا۔

”ہیں۔ یہ اب پھر کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ ابھی۔

جب وہ گاڑی باہر لے گیا تو وہ گیٹ بند کرنے لگی۔ جب تک گیٹ پر پہنچی گاڑی آگے بڑھ چکی تھی۔

وہ گیٹ بند کر کے اس کے بیڈ روم کی لائٹ بند کرنے لگی تو گیلیا تو لیہ بیڈ پر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر تو لیہ اٹھایا تو چائے کے کپ پر نظر پڑی۔ وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ اور ٹھنڈی برف ہو چکی تھی۔ کیونکہ پنکھا فل اسپڈ سے چل رہا تھا۔

البتہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کپ کی چینک ہوئی تھی۔ یعنی کپ کے اوپر رکھی پرچ ہٹائی گئی تھی۔ شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ صبح کار کھا ہوا تو نہیں ہے۔

اس نے کچھ نہ کچھ کر بیسے شانے اچکائے۔ لائٹ اور پنکھا بند کر کے کپ واپس لے کر باہر آ گئی۔

اس نے دو تین آلو کے پرائے بنا کر ٹماڑ کی چٹنی تیار کی۔ ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ اور بڑے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کا کھانا تناول کرنے لگی۔ قدرے سکون کا احساس ہوا تو اس نے سارے دن کی کارروائی اپنے ذہن میں دہرائی شروع کی۔ کارکن عورتوں کی دھک بھری کہانی۔

چڑا اسی کے باطنی کی داستان۔ جب اس کا باپ ”پٹواری“ ہوا کرتا تھا۔ اور وہ گندم مول نہیں خرید کرتے تھے۔

اکرام صاحب کی ”پھننے خانی“ اور اسد کی مہربانی۔

کام تو کوئی اس قدر تھا کہ دینے والا نہیں۔ اگر اس ”جاہر سلطان“ کا ہوا سر پر مسلط نہ ہو۔ اس نے احسن کے بارے

چاہا۔  
نفس تو مجھے نچوڑ کر لی جائے گا۔

ہائے کیسا بدل گیا ہے۔ یہ ایسا تو نہیں تھا۔ اگر یہ ایسا ہوتا تو میں آج اس مصیبت میں کیوں آتی؟

نکمر ہے اس پر اس کی ماں کی گرفت ہے۔ جب ہی آج میں اسے مڑا پکھانے کی پوزیشن میں ہوں۔

ہائے مجھے اگر پتا چل جاتا کہ یہ شخص اس درجہ خود غرض اور ظالم ہے۔ ایک کک سی دی میں ہونے لگی۔

مگر میری ان کی جان پہچان دودن کی تو نہیں۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ ان کو اپنے سامنے دیکھا ہے۔

خالہ تو ہر قسم کی چھٹی کے موقع پر انہیں لانا نہیں بھولتی تھیں۔

چپ چپ۔ بردبار سے۔ اپنے کام میں مگن پڑ جاتی دکھ کر تک محدود نہ کیا۔ کبھی کبھی شرارت کرتے تھے۔ مگر صرف

ساتھ۔ اور یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ صرف میرے ساتھ ہی کیوں؟

مگر اب کیا ہوا؟ ان کے سر پر تو جیسے ہر وقت خون سوار ہوتا ہے۔ یہ ایسے کیوں ہوئے؟

مگر بالکل بھی قابل رحم نہیں ہیں۔ انہوں نے میرے ساتھ پورے گھرانے کو دکھ دیا ہے۔ میں ان کی اس بد صورت

ت و لغزش کا احساس ضرور دلاؤ گی۔ چاہے میرا مزید نقصان کیوں نہ ہو۔

ایک دم گھر کا دھپان آیا تو نوالہ حلق میں اٹکنے لگا۔

پتا نہیں، وہ لوگ میرے بارے میں کس انداز سے باتیں کرتے ہوں گے۔ نفرت و کراہیت کے ساتھ۔ بد دعاؤں

بھانسنے کے ساتھ۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے اٹھ کر ٹی۔ وی آن کر دیا۔ موسیقی کا پروگرام چل رہا تھا۔ مغنیہ

راہ تھی۔

وہ باتیں تیری، وہ فسانے تیرے

تکلفہ تکلفہ بہانے تیرے

احسن کو ملکہ پکھراج کی آواز میں یہ غزل بے حد پسند تھی۔ ایک دن اس نے کئی مرتبہ یہ غزل سنی تو نیلو فرنے کہا

آپ کو یہ غزل اتنی کیوں پسند ہے۔ ایک دم لائٹ سی تو ہے۔ کوئی خاص گہرا خیال تو نہیں۔ بس ایسے ہی ہے جیسے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی

جس نے ہماری گائے بنائی

”سخت بھونڈی ہونیو۔ بالکل حس لطیف سے عاری۔ تمہیں اس غزل میں حسن نظر نہیں آیا۔ تو اس کا مطلب ہے اللہ

نہیں حسن و حسن خیال سے بالکل پاک بنایا ہے۔“

اس نے نیلو کو فوج پھیرا تھا۔

”ذرا اپنی بہن سے پوچھو۔ کیسی ہے یہ غزل۔“

وہ ایک طرف بیٹھی دانیال کا کرتا کاڑھ رہی تھی۔ آفت کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ایک دم سہلا گئی تھی۔ احسن کی گرم

لٹ کا معمولی سا اظہار بھی اس کی جان پر بتا دیتا تھا۔

”کیا ”بہانے“ بناتی ہیں آپ؟“ نیلو کھٹکھٹا کر بھئی تھی۔

”بہانوں کی کیا کمی ہے ادھر۔ اتنے ہیں کہ ضرورت مندوں کو ادھار بھی مل سکتے ہیں۔“ احسن نے براہ راست اس پر

لڑکھائی۔



نیلوفر کی ہنسی رکھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

”مثلاً؟“ اس نے ہتھ پتھتے پوچھا تھا۔

”بتا دوں؟“ احسن نے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”جھوٹ گھڑنے کی نہیں ہو رہی۔“ اس نے برامان کر جواب دیا تھا۔

”آپ کو جھوٹا کہہ رہی ہیں۔“ نیلوفر نے اسے چڑھایا تھا۔

”کچھ کہیں تو سہی۔ کسی طرح اپنے قیمتی خیالات کا اظہار تو کریں۔ ورنہ یہ حالت ہے۔ گفتہ گفتہ بہانے تیرے“ وہ گنگنایا تھا۔ نیلوفر کا ہتھ پتھتے برامان ہو گیا تھا۔ اور اسے وہاں سے اٹھنا پڑا تھا۔

بس ایک داغ مجددہ مری کا نجات

جینیں تری آستانے ترے

مغنیہ گار رہی تھی۔ اور اس کے ذہن میں حشر برپا ہونے لگے تھے۔

اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے اسکرین کو گھورا۔ جیسے اسے ہی مخاطب کرنے کا ارادہ ہو۔

کیا ہوتے ہیں لوگ۔ پھر کیا بن جاتے ہیں۔ یقین ہی نہیں آتا۔ اس نے سوچا۔ انسان جس سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اس کے احسانات کا خیال کیوں نہیں کرتا؟ جو وقت کے ساتھ چہرے بدلے۔

اسے محبت تو نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو فزعی مصلحت یا خود غرضی ہوئی۔ محبت کرنے والا تو اتنا حساس ہوتا ہے۔ کہ اپنی وجہ سے دوسرے فریق کو مشکل میں ڈالنے کے بجائے اس کے عذاب بھی اپنے سر سے لیتا چاہتا ہے۔ محبت میں ایثار نہ ہو تو وہ محض۔ معمول کی کارروائی ہے۔

مجھے تو مجھے۔ تم نے تو جانے کتنے بے گناہوں کو کانٹوں میں محسوس کیا ہے۔ اس نے ٹی۔ وی کی آواز مزید تیز کر دی۔ تاکہ اندک احساس زیاں اس شو میں دب جائے۔ لیکن میں آ کر اس نے چیزیں ٹھکانے پر پہنچائیں۔ پھر کل کے پینے کے لئے کپڑے استری کرنے لگی۔ کل تین تو سوٹ تھے۔ جو ذرا اچھے محسوس ہوتے تھے۔

”یا اللہ۔ کیا میں ایک مینیجنگ سٹاف استعمال کروں گی۔ کیا اسد صاحب سے ایڈوائس کی بات کروں؟ مگر نہیں۔ اس طرح تو امیج خراب ہو گا۔ چلو۔ زندگی کا یہ رنگ بھی دیکھیں۔ وہ جیسے خود پر ہنسی۔ اور انہماک سے استری کرنے لگی۔

اگر یہ چوڑیاں نمینہ پھوپھو نے ندی ہوتیں تو میں یہی بیچ دیتی۔ اس نے چوڑیوں پر نظر ڈال کر سوچا۔

اس نے کپڑے لگاتے ہوئے احسن کے بارے میں سوچا۔ کیا مجھے ان کے کام کرنے چاہئیں؟“ مغنیہ نے بڑی حد تک اس کی سوچ پر اثر انداز ہو چکی تھیں۔

اور اسے خوابوں کی دنیا سے نکال کر حقیقت پسندی کی طرف لے آئی تھیں۔ جہاں محبوب اور شوہر کا فرق پتا چلتا ہے۔ اور انہوں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ خوش نما ماضی کو پیانا نہ بنا کر احسن کی پینائش نہ کرے۔ وہ عشق کے کارزار کا جونی نہیں۔ ٹھوس اور عملی انسان ہے۔ جس پر بھاری ذمہ داریوں نے اپنا پہرہ بٹھا رکھا ہے۔

اور یہ کہ طلاق یافتہ کا لیل لگنے کے بجائے اپنی زندگی کو دشمنانہ انداز اور حقیقت سے دو چار کرے۔

اس عمر میں تو سب ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا بھی ہونا چاہیے جو جذبات کے بہاؤ کے سامنے رسائی اور اطمینان کے بند باندھے۔ یہ مغنیہ کی کمال تھا۔ کہ وہ احسن کے چائے پانی کا دھیان کر لیتی تھی۔ مغنیہ نے جب سے اش کے

پہلے آکر اہوا خود پر پایا تو۔ شیخ رحیم الدین کے ساتھ گزارا ہوا ایک لمحہ اس کے سامنے کر دیا تھا۔ بیانی شکل میں۔ جھلند، خوش شخص و خوش اطوار۔ صابر، زبردست قوت برداشت کی مالک خالہ کی لبوں سے پر زندگی نے اسے بھی لب برداشت کرنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔

بے محسوس ہوا۔ بڑے وہ ہوتے ہیں جو زیادہ برداشت کرتے ہیں۔

ہر سب سے بڑھ کر خالہ ہی کے ذریعے قدرت نے احسن کو نیچا دکھانے کا سنہری موقع فراہم کیا تھا۔

”اے بے حد زنج کر دینے کی خواہش مند تھی۔ تاکہ آئندہ وہ ظالمانہ فیصلے کرنے سے پہلے غور و فکر کر لے۔

”اپنی ماں اور خالہ کی تاریخ دہرانا نہیں چاہتی۔ مظلوموں کی نظار میں لگنے کے بجائے وہ سر کردہ کے داغ درست لے گا عزم رکھتی تھی۔

بذرا اصل اسے بھی علم نہیں تھا کہ وہ کیا ہے۔ حالات کے اتار چڑھاؤ نے تو اسے خود پر واضح کیا تھا۔ اپنی پہچان ہوئی

اگر انسان آرام سے سب کچھ پاتا رہے تو اسے کچھ پتا ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ ساری دنیا مزے میں ہے۔ ”ہائے اللہ۔“ اگر انسان سکھ اور تکلیفیں نہ اٹھائے تو کتابہ وقوف۔“ بی بی نے صوفی کے نیچے کھڑکی تو سوچ کا نقطہ ہو گیا۔

کام مکمل ہوا تو وہ بڑے خضوع و خشوع سے ”خبر نامہ“ دیکھنے لگی۔ پھر کرتی بھی کیا؟ تو بے کس قدر آوارہ گرد شخص ہے۔

لہذا یہاں بیٹھی رہوں؟

گیت کھول کر سوؤں گی تو اور منہ پھول جائے گا۔ سارا زلزلہ بے چاری پھول بی بی پر گرے گا۔

ہرم کی خبریں شروع ہوئی۔ تو وہ دھوکہ کرنے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وقت کا نئے نہیں کٹ رہا تھا۔ نماز اس نے اس لئے ناکری تھی کہ ایک دم سناٹے سے اسے بہت خوف محسوس ہوتا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ وہ آجائے تو اطمینان سے نماز ناکرے۔

کس قدر اذیت ناک انتظار سے بعد کال بیل رنگ ہوئی تھی۔

اس نے محض نجات کے لمحے پانے کی خاطر تیزی سے گیت کھولا تھا کہ بہر حال اس کی موجودگی سے ہر طرح کا خوف نہ جاتا تھا۔

گیت واہوا اور وہ ایک دم تیزی سے پیچھے ہٹتی۔ بمشکل اپنی جگہ کو رہا تھا۔

احسن کے کالر سے لے کر نیچے تک خون کے جھینٹے تھے۔ اور دائیں بازو کی طرف بھی ننھے ننھے خون کے قطرہوں کے ننھے۔ احسن نے اس کی سمت دیکھے بنا پورا گیت وا کیا اور اپنی گاڑی اندر لانے لگا۔



”آپ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئے؟“ اس کی تو حالت خراب تھی۔ احسن خاموش رہا۔

”آپ ڈاکٹر کے پاس جائیے۔“

احسن نے جیسے اس کی آواز ہی نہیں سنی۔

اس نے خون آلود بنیان بھی اتار دی۔

”کیا کہہ رہی ہوں میں، ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جا رہے؟“ اس کی آواز میں بے بسی اور آنسوؤں کی نمی غالب تھی۔

”مت“ ”بھو“ یہاں، مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔“ احسن کی غراہٹ سن کر تو اس کی حالت پتلی ہو گئی۔

وہ وہیں کھڑی ہاتھ ملتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد گرم پانی کے برتن کے ہمراہ دوبارہ داخل

ہوئی۔ احسن ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا گردن پر اور دائیں رخسار پر روئی کے پھائے رکھے ہوئے تھا۔

اس میں آیوڈین کمس ہے، یہ گرم پانی دھم صاف.....!“

”کیا تکلیف ہے تمہیں؟ لے جاؤ اپنا پانی دانی، اب دوبارہ میرے بیڈروم میں مت آنا۔“ احسن نے کڑے تیور سے

ہاتھ گھورا۔

سیاہ لباس میں لمبوس، نماز کے اسٹائل میں سیاہ دوپٹا اوڑھے چہرے پر خوف اور سراسیمگی، اس نے نگاہوں کا زاویہ

بلیا۔

”مجھ سے خون نہیں دیکھا جاتا۔“ اس کی آنکھیں برس پڑیں۔

تومت دیکھو، کس نے کہا ہے؟“ احسن نے پھر پتھر سے پھوڑے۔

”جاؤ یہاں سے۔“ وہ پھر آئینے میں گردن دیکھنے لگا۔

شہوان نے ہتھیلی سے آنسو پونچھے اور جھک کر اس کے سامنے سے روئی اٹھائی۔ پانی میں بھگو کر نجوڑی اور احتیاط سے

دان سے خون کے نشان مٹانے لگی، کیونکہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کس دھبے کے نیچے خراش کا زخم ہے۔ گردن پر شیشے کے

بیک باریک ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔ جنہیں بہت احتیاط سے صاف کرنے کی ضرورت تھی۔ معمولی سی رگڑ سے کھال

ہلکی اتر سکتے تھے۔ بالوں پر شیشے کے ٹکڑے چپکتے دکھائی دے رہے تھے۔

”کس قدر خطرناک ہوتے ہیں یہ شیشے کے باریک ذرات مگر کس قدر زہد ہی ہے یہ شخص۔“ وہ فکر مند انداز میں شیشے

چپکتے ذرات دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اس کے رخسار کا زخم بھی کافی گہرا تھا، مگر اس طرف ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی فطری جھجک آڑے آئی۔ گردن کا پچھلا

دھڑکنے والا مددگار کے صاف ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے چہرے کی نسبت گردن زیادہ متاثر ہوئی تھی۔

وہ شائد لعنت ملامت کا کوڑہ پورا کر چکا تھا۔ یا اس کے جذبہ بے اختیار کے ہاتھوں پابند ہو گیا تھا۔ نظروں کا رخ

اسے خاموش بیٹھا رہا پھر اس کی مجبوری تھی۔

”ہینڈلنگ تو گھر میں نہیں ہوگی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی صورت آئینے میں دیکھی۔

”جو گاڑی ڈرائیو کرنا ہو یا زہر دینا بدعادت کی زد میں رہتا ہو۔ اسے اس طرح کے انتظامات کر کے رکھنا ہوتے ہیں۔

اس نے دراز کھول کر فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا۔ احسن کی آواز میں کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ بالکل سپاٹ لہجہ تھا آیوڈین

سے باہر والے ہاتھ نرم سے مل گئی تھی، جو اس نے حل کر دی تھی۔

”آپ کے تو بالوں میں بہت سارے شیشے کے ٹکڑے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔

وہ راہداری کے دروازے کے بیچ کھڑی ہو گئی تھی۔ دل موکے پتے کی طرح کا پینے لگا تھا۔ اس نے دیکھا گاڑی

وڈا سکرین ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے کانپتے کیلجے پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ دروازہ بند کر کے اتر آیا اور گیٹ بند کرنے لگا۔

آگے بڑھا تو گزرگاہ میں وہ پتھر کی طرح ایستادہ تھی۔ احسن نے مجبوراً اسے ہاتھ سے ایک طرف کیا۔ تب وہ

حواس میں آئی۔ جذباتی لڑکی ہی تو تھی۔ کوئی گھاگ اور آزمودہ کار عورت تو نہیں تھی۔ خون دیکھ کر ہی حواس کھو بیٹھی تھی۔

وہ اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی وہاں تک آئی۔ اور بند دروازہ کھول دیا تھا بغیر دستک دیے احسن

کے کھن کھول رہا تھا۔ آہٹ پر پلٹا تھا۔

اسے دیکھ کر پھر رخ موڑ لیا تھا۔ وہ آگے بڑھی، خون دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ دوسرے وڈا سکرین کی ہڈی

نے اس کے دل میں طرح طرح کے دوسرے پیدا کر دیے تھے۔

”اے..... ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟“ اس کی کانپتی آواز نے کمرے کے ماحول میں ارتعاش پیدا کیا۔

احسن نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہاتھ اوپر کر کے قیص اتارنا شروع کی۔ اس کے تو حواس گم تھے۔ اگر دھیان تھا

صرف خون کی طرف۔

”ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟“ وہ دوبارہ بولی۔ جیسے پہلے اس نے سنا نہ ہو۔

”کیا نظر آ رہا ہے؟“ وہ خشک اور سرد لہجے میں بلا خبر بولا۔

سفید بنیان پر خون کی سرخ، سرخی قیص کے مقابلے میں بہت گہری اور نمایاں تھی۔

خون گردن سے بہہ رہا تھا، یا ہاتھ تھا۔

”بیچھے ہنو“ شہزاد کو اس کا لہجہ بہت انسٹنٹ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے خود پر بہت جبر کیا اور پیچھے ہٹ گئی احسن نے ہاتھوں سے اپنا سر بھاڑا۔  
آپ اپنے کندھوں پر کوئی کپڑا ڈال لیجئے، ورنہ یہ اسکن پر چپک جائیں گے۔ اس وقت مشورہ دینا اس کی سخت مجبوری تھی۔

احسن نے ہاتھوں کی گردش روک دی۔ وہ بھاگ کر ٹاول اٹھا لائی اور ذرا دور ہی سے تھما دیا۔ احسن نے تویہ اپنے وجود پر پھیلا کر دو بارہ اپنے سر کو بھاڑنا شروع کر دیا۔

ہلکی سی سی کی آواز کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ روکا تھا اور وہ تیزی سے قریب آئی تھی۔ کالج کا نوکیلا گلہ اس کی ہتھیلی میں گڑا ہوا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے گلہ اٹھا لیا تو ہتھیلی پر سرخ خون اہل آیا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“ اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھما پھر ایک دم چھوڑ دیا۔

”میں کیا کروں؟“ وہ رونے لگی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔

دوسرے آپ کو کسی کی بات ماننے کی عادت نہیں ہے۔ اب کیا ہوگا؟ کس قدر کالج ہی کا کچ ہے۔ وہ بے حد پریشان سی ہو گئی۔

کاش ایسا ہو کہ تم ایک ہی دفعہ مجھے ردلو۔ عذاب میں، میں ہوں رونا پینا ان کا شروع۔ وہ جیسے عاجز آ کر بولا تھا۔  
اف! انسان ہے یا زہر کا پتار، حرف حرف زہریلا، میں تو مرغی ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتی اور پھر یہ تو.....!

وہ روئی سے ہتھیلی صاف کرنے لگا۔

”بینڈ بچ لگا دوں؟“ اس نے پھر اپنی خدمات پیش کیں۔

انسان وقت کے جذباتی دھارے میں بہتا جانے کیا کیا سوچتا رہتا ہے۔ یہ تو عمل کے وقت ہی فیصلہ ہوتا ہے۔ کہ کیا چاہیے؟

اور کس چیز کی اہمیت و ضرورت ہے۔ احسن نے اپنی برہم نظریں اس کی سمت اٹھائی تھیں اور وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

”مصیبت میں تو ڈال دیا ہے، زندگی آگ کا سمندر بنا دی ہے گولی مار دیجئے مجھے ایک مرتبہ، ہولا ہولا کر کیوں میری جان پر ہاتے رہتے ہیں۔ آئے کیوں تھے اس حلیے میں؟ کسی اسپتال میں چلے جاتے۔ وہ ہچکچیدوں سے رونے لگی۔

رونے کا تو بہانا چاہیے تھا اور پھر کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

”ادھر بیٹا، خالو جان، ادھر یہ..... بس ساری بہادری اسی میں ہے کہ عورتوں کو ڈراتے سہاتے رہو۔“ وہ بری طرح جھکیاں لے رہی تھی۔

”کیا لوگی چپ ہونے کا؟“ اسکی تنہی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

وہ یک دم چپ ہو گئی۔

واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دل میں جیسے قطعی غلط فہمی نہیں اور نہ ہی اس کے کسی عمل پر رد عمل ہے۔  
انتارڈ، پتھر اور احساسات سے عاری محسوس ہو رہا تھا کہ کبھی اس ثوبت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ صاف شدہ زخم پر دو انگلیاں لگی۔ اسے خود پتا نہیں تھا اس سے یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ جبکہ وہ اس کا مجرم بھی ہے۔

وہ سون تاک بھی چڑھا رہی تھی اور بینڈ بچ بھی لگا رہی تھی۔ احسن کی ہتھیلی سے خون گاہے بگاہے اُبھر رہا تھا۔ جو وہ نہ چھو دیتا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ بھائی ہوش و حواس زندگی میں پہلی بار تھما۔ زندگی کی حرارت سے مگر پور گلابی صاف مضبوط تھا۔..... صاف شفاف، بہت کم ککیریں تھیں، جو تھیں بہت واضح تھیں۔

ان وقت وہ شخص غرض تھی یا کمزور پریشان سی لڑکی۔ اس کے سفید نازک ہاتھ میں احسن کا بھرپور ہاتھ ایسے ہی لگ رہا تھا۔ اس نے اپنی طاقت سے زیادہ وزن اٹھا رکھا ہو۔

ن نے صرف پاؤں چھڑکا اور اس کی گردن کے زخموں پر بینڈ بچ مکمل کرنے لگی۔ وہ صرف اس کے زخموں کی طرف ہاتھوں کی طرف نہ آئی تھیں کی طرف اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے یا نہیں۔ اس نے ہمدردی اور انتہا تک کام مکمل کیا اور مزید ایک نظر اس پر ڈالے بغیر اس کی قمیص وغیرہ اٹھا کر باہر لے آئی تاکہ جھاڑ کر دھو ڈالے۔

بہن اچھی طرح جھاڑ کر جب وہ دوبارہ اس کے بیڈروم میں داخل آئی تو وہ فون کر رہا تھا۔ وہ سیدھی ہاتھ رو م میں سو رہی تھی۔ ہاں..... بیلو! احسن بات کر رہا ہوں۔

بارادھ صبح گھر سے ہوتے ہوئے جانا، شاید میں صبح آفس نہ جاؤں کلینک کتنے بجے جاتے ہو۔ ہاں بارادھ ہوتے چلے جانا، ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔ معمولی سا..... صرف ونڈ اسکرین ٹوٹی ہے..... ہڈیاں سلامت ہیں شاید اس لئے اور بیٹھی ہوئی مگر دواؤں کا حصار بچ رہی ہے۔

لڑے نزدیک ہوا ہے۔ میرا گھر تو ویسے ہی دیرانے میں ہے۔

ڈاکٹرین کے شیشے نے صرف زخم کیے ہیں، باقی خیریت ہے۔

رہو کے رخ پر گاڑی تھی۔ اس لئے شیشے پوری طاقت سے کھال میں گھس گئے۔ سوزی کی کیری میں لوہے کے نئے دھبی ونڈ اسکرین سے ٹکرائے..... بس بارادھ بن الجھا ہوا تھا۔ غلطی میری ہی ہے..... چھوڑو دھکر ہے اتنے پر ہی ٹل نام دیکھ لیں۔ زخم ٹھنڈے ہوں گے جب ہی زیادہ تکلیف کا احساس ہوگا۔

نہاں بارادھ ابھی نہیں، رات خاصی ہو گئی ہے۔ تم آرام کرو۔ شکر یہ۔ رات بھر کا انتظام ہو گیا ہے۔ ڈنٹ کثیر یار.....

ناتے نے ریسپور رکھ دیا تھا۔ وہ اس کے کپڑے دھو کر باہر نکلی تو وہ اپنے نائٹ سوٹ کی شرٹ پہنے، بیڈ پر آکھیں۔  
بارادھ نظر آیا۔ وہ بے پاؤں باہر آئی اور گیلری میں کپڑے پھیلا دیے۔

لوہی میں آ کر دوڑدھ گھر گیا، ایک بڑا گھاس تیار کیا۔ اس کے لیٹنے کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کھانا نہیں کھا۔ لہذا وہ گھاس ڈھانپ کر اس کے کمرے میں آئی اور سائیز ٹیبل پر گھاس رکھ دیا اور انگلی سے ٹیبل بجائی۔

..... سو دھ، وہ آہستہ سے گویا ہوئی اور فوراً ہی باہر نکلنے لگی۔

”میرا خیال ہے تمہاری جگہ اگر پھول بی بی ہوتی تو..... یہی کچھ کرتی۔“

جنگلی اور شگفتہ سے پر لہجہ، مستند کی محراب کو چھوٹا ہوا یہ اس کی آج تک کی کارگزاریوں کا انعام تھا۔  
ہاتھوں میں کھیلنے کودتے..... ساتھ ساتھ..... ہنسنے بولتے..... جذبوں کے جال کے بعد بلا آخر آج یہ خراج وصول۔

نالاہی چاہارات کے اندھیرے میں وہ کسی طرف اندھا دھند بھاگ کھڑی ہو اور بھاگتے بھاگتے کسی کھائی میں

”کیا ہوتا ہے، نصیب ہی خراب ہے جو رشتے میرے سامنے آتے ہیں۔ وہاں بات نہیں بنتی اور جو چور دروازوں  
 آتے ہیں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتی محن میں بچے تخت پر بیٹھ گئیں۔ چاروں سکون کے نہیں گزرتے۔  
 ”نہیں لوگ ہیں امی؟“ انیلا نے اپنے سنہری بالوں کی چوٹی آگے کر کے بل ڈالنا شروع کر دیے۔  
 ”مکان کے کوئی زمیندار ہیں۔ لڑکے نے زیادہ نہیں پڑھا ہوا اور پھر آگے پیچھے رشتوں کی لائن دوڑی۔ چھ بہنیں اور  
 بائی ہیں۔۔۔۔۔۔ سب چھوٹے۔۔۔۔۔۔ سب کی ذمہ داریاں۔“

منیہ گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

”امی! ہمارے ہاں بھی تو رشتوں کی لائن ڈوری ہے۔ خالد جان نے جب شہوار بھائی کا رشتہ دیا تھا۔ یہ سب سوچا ہو  
 رہا ہے تو۔۔۔۔۔۔ انیلا چپ ہو گئی۔

”ہوں، مگر میرے بیٹے جیسا بھی کوئی ہو۔“ انہوں نے بھدا افتخار کہا۔

”اگر کوئی غیر ذمہ دار جان چھڑانے والا ہوتا تو گھر سے دوری کو بہانا بنا کر لاگ ہو جاتا۔ اتنی دور بیٹھ کر بھی تم لوگوں کا  
 بال کرتا ہے۔“ وہ مزید گویا ہوئیں۔

”امی! ہر ماں اپنے بیٹے کے بارے میں یہی رائے رکھتی ہے۔“ انیلا نے خاصی سچائی کا مظاہرہ کیا تھا۔  
 منیہ ایک لحلے کے لئے چپ ہو گئیں۔

”اس کی ماں نہیں ہے بیٹے۔ سارا بوجھ لڑکے سر ہے۔ تم نہیں سمجھ رہی ہیں۔“ منیہ نے بیٹی کو سمجھایا۔

”پتہ تو ہے امی! آج کل سارے بوجھ پیسہ اتار دیتا ہے۔“ انیلا نے دونوں بہنوں کی خوش حالی کو مد نظر رکھ کر کہا تھا۔  
 ”مگر پیر شے کا علاج نہیں ہوتا بیٹے۔ انجان واجبی لوگ ذمہ داریوں کا ڈھیر، یہ تو وہی شل ہو گئی، آسمان سے گرا  
 آگیا۔“

”گہری فکر مندی سے کہہ رہی تھیں۔

”اور پھر سب سے بڑا ہے، کیا معلوم عمر کیا ہوگی؟“

منیہ دودھ کی جلی ہوئی تھیں۔ انہیں شیخ صاحب پر اعتبار نہیں رہا تھا۔

مکان میں لڑکیاں نہیں ہیں کیا؟ دور نزدیک کے لوگ انہیں بیٹی نہیں دے رہے۔ تب ہی تو وہ اتنی دور دیکھ رہے  
 انہیں طرح طرح کے دہم ستانے لگے تھے۔

”آپ دیکھ تو لیں امی!“

”ناگ دیکھ لوں، تمہارے باپ تو سب کچھ کر کر کے فیصلہ سنا دیتے ہیں، کہہ رہے ہیں لڑکے کی بھوپھی اور بہنیں  
 کچھ آئیں گی۔ لڑکی پسند آئی تو آگوشی پرنا جائیں گے۔ بقول تمہارے باپ کے انہیں تو سو جان سے منظور ہے یہ  
 بکریا دیکھوں، لڑکی تو ہے ہی اچھی، پسند کیوں نہیں آئے گی، کیا عیب ہے؟“

”بھوپھی امی! دیکھ تو لیں۔۔۔۔۔۔ انیلا کو نیلکا ”سانچہ“ نہیں بھولتا تھا۔

”اے مجھے اعتبار نہیں رہا اب ان کا، سیدھی سی بات ہے۔۔۔۔۔۔ وہ تجھی سے گویا ہوئیں

”گرمی! نیلی! آپا کا رشتہ بھی تو ابائی ہی نے کیا تھا، کتنے شاعر ہیں باہر بھائی۔۔۔۔۔۔“

”اب تو آج ہیں، پتا نہیں دل مطمئن کیوں نہیں، مجھے اپنی بیٹی کا چہرہ سہاگن کی طرح کھلا نہیں لگتا۔۔۔۔۔۔ ایک عجیب سا

شائے کی آنکھوں سے جھلکتا محسوس ہوتا ہے، کچھ ہلکی بھی تو نہیں ہے۔“

جاگرے اور زندگی کے پرندے کو آزاد کر دے۔  
 ”بے حس“ فیئر اسے آج تک احساس نہیں ہوسکا کہ اس نے میرے ساتھ کس قدر زیادتی کی ہے۔  
 زندہ لاش بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایک ٹیس سی سینے میں اٹھی تھی۔

شیخ رحیم الدین آج پھر ”قارم“ میں نظر آ رہے تھے۔

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“ انہوں نے انیلا سے دریافت کیا۔

”بازار گئی ہیں۔“

”اس عورت کا دل تو بس بازاروں ہی میں لگتا ہے۔ یہ کوئی وقت ہے شام کے ساڑھے پانچ بج رہے ہیں۔“  
 بڑائے۔

”مگر کی بر بدلوانا تھی ابائی۔ انیلا بولی۔

کسی عجیب جتن بھی ہے پورا گھر دفتر جاتا ہے۔ فرصت نہیں گوشت گلانے کی، سارا دن پڑے سوتے ہیں سرے  
 بکتے جھکتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مگر کے بغیر گزارے نہیں ہوتے۔

نیلہ نے گہری سانس لے کر انیلا کی سمت دیکھا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ کثرت ملامت میں اصلاح کا کون سا پہلو نکلتا ہے۔

انیلا نے منہ بنا کر کہا تھا۔

اسی وقت منیہ، احمر کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئیں۔ بیٹیوں کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی بولیں۔

”آگے تمہارے ابائی؟“

”جی“

”چائے وغیرہ کا پوچھا۔“ ان کا فوری اگلا سوال تھا۔

”بنارہی ہے بیلا، آپ کا پوچھ رہے تھے۔“ انیلا نے منہ بنا کر کہا۔

منیہ سامان رکھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”نیلی! آپا کے ہاں گئے تھے احمر؟“ انیلا نے پوچھا۔

”نہیں مع جاؤں گا۔ تھوڑی دیر کے لئے جاؤں گا تو وہ ناراض ہوں گی۔“

احمر نے سوچتی نظروں سے باپ کے کمرے کی سمت دیکھا تھا۔

”ابائی کا موڈ خراب ہے آپا؟“ اس کے چہرے پر فکر مندی سی تھی۔

”کوئی نئی بات نہیں آج تمہارے پاس؟“ نیلہ نے اس کے سر پر ہلکے سے جٹ لگا کر تنہی سے منہ کر کہا۔

”میں آپ کی خوبی تعلق دار نہیں مگر اولاد تو آپ کی اپنی ہے۔“ معافیہ بڑا بڑا ہوتی ہوئی کمرے سے باہر نکلیں۔

”بس لینڈ لاؤ بیٹے کا اور ماں باقی رہ گیا تھا۔ بیٹی دے کر یہ بھی پورا کر لیں گے۔ ایسے کیسے ہاں کہہ دیں جب کرم

کتبہ نہیں دیکھا۔“

”بیٹی نہ بیاہنے کے لئے بہانا بنایا تھا۔ بنیادی کا خدنا خواستہ جیج بیار تو نہیں ہے۔“

”کیا ہوا امی؟“ انیلا پریشان ہو کر ان کی طرف بڑھی۔

”یہ بات نہیں ہے امی! آپ تو بہت خوش ہیں، ایسے ٹھٹھ سے نوکروں سے کام لیتی ہیں، بالکل ملکہ جیسی لگتی ہیں۔“

”غلطیاں..... ہونہہ! ارے کسی کی غیرت تمہارے لال نے سرکوں پر اچھال دی، یہ غلطی ہے، قتل عمد سے بھی بڑا گناہ، جھو۔“ شیخ صاحب نے نہایت حقارت سے کہا۔

”سناہ تو اب کی بات نہ کریں شیخ صاحب! بات بہت نازک ہو جائے گی۔“ صفیہ نے ناراضگی سے کہا۔

”اُس کی غلطی پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کس کے پیدا کردہ حالات نے اُسے یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔“ صفیہ نے کہا۔

”ارے میں اتنا بے ضمیر نہیں کہ کسی کی بیٹی کو آنکھوں کے سامنے زندہ دفن ہوتے دیکھوں۔ مجھے اُس بچی کی خواری نہارے لاڈلے کے ہاتھوں صاف نظر آرہی تھی..... اس کے ماں باپ کو حقیقت سے آگاہ کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔“ وہ بھی سے گویا ہوئے۔

(اخلاقی فرض! ہونہہ!..... اپنے مطلب کے تو سب اخلاق یاد ہیں) صفیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایلا اٹھ کر جا بکائی تھی۔

”بچی کو دوبارہ جہنم میں جھونک آئیں، حالانکہ اُس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے تمہارے جگر گوشے سے نجات پائیے۔“ وہ کف اُڑا رہے تھے۔

”یعنی، میں بھی بچوں کے ساتھ بچی بن جاؤں، بچہ کھینے کے لیے چاند مانگتا ہے تو لوگ آسمان سے چاند توڑ لاتے ہیں؟“ صفیہ نے ناراضگی سے سوال کیا۔

”مگر وہ بچی نادان نہیں، وہ حقیقت کو پہچان چکی تھی۔ تمہاری طرح اس کی آنکھوں پر ماسکا کے جذبات کی پٹی نہیں بڑھی تھی۔“ شیخ صاحب چنگھاڑے۔

”تو پھر آپ نے کیوں نہیں رکھ لیا اُسے؟ اگر ایسی ہی ہمدردی تھی؟“ صفیہ نے قدرے ہڈ سکوں لہجے میں سوال کیا۔

”میں ہزار بار اُسے گھر لکانے اور رکھنے پر راضی ہوں، تمہاری بھانجی کی حیثیت سے، تمہاری بہو کی حیثیت سے نہیں مجھے اُس ناہنجار سے وابستہ ہر شے سے بیزاری ہے۔“

”مگر اس وابستگی میں ہمارا تعاون بھی شامل رہا ہے۔“ صفیہ نے یاد دلایا۔

”ہاں مگر وہ تعاون اُس وقت تھا جب وہ میرا بیٹا تھا، اب اُس سے میرا کوئی تعلق نہیں، جس روز وہ میرے مقابل آیا فلاں روز سے میرا اُس سے ہر رشتہ ختم۔“ شیخ صاحب پشت پر ہاتھ باندھ کر ہنسنے لگے۔

”رشتے اس طرح بھی ختم ہوتے ہیں۔“ صفیہ پھر بولی۔

”ہاں، رشتہ اسی وقت تک ہوتا ہے جب ذہن اسے قبول کرتا ہے۔ میرا ذہن اُسے قبول کرنے سے انکار کر چکا ہے۔“ وہ برہمی سے بولے۔

”تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کر کے، اپنی شامت بکائی ہے، اگر نبیلہ کا مسئلہ شروع نہ ہوتا تو میں تم کو اجازت دے دیتا کہ تم ہمیشہ کے لیے اپنے لُخت جگر کے پاس چلی جاؤ۔ سنا ہے بہت مال کما رہا ہے، کر رہا ہوگا اسٹیلنگ اور اُسے آتا ہی کیا ہے، جس مزاج کا مالک ہے، اُس حساب سے تو ڈاکے اور اسٹیلنگ سے ہی دولت کما سکتا ہے۔ تم اُس کی حرام کی کال پر عیش کرنا چاہو تو تمہیں نہیں روکوں گا۔“

”بس کریں شیخ صاحب۔“ صفیہ بلبلاتا کر رہ گئیں۔

”یہ بات نہیں ہے امی! آپ تو بہت خوش ہیں، ایسے ٹھٹھ سے نوکروں سے کام لیتی ہیں، بالکل ملکہ جیسی لگتی ہیں۔“

تو..... اتنا بڑا گھرانہ کے اشارے پر چلتا ہے۔“ ایلا نے فوراً ماں کی بات کاٹ کر رشک بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”یہی تو فرق ہے ماں، بہن کی نظر میں۔“ صفیہ یاسیت سے بولیں۔

”امی! نیلی آپ کو شاید بلو آپ کا بہت دکھ ہو..... بلو آپ کی اچھی جگہ شادی ہو جائے تو نیلی آپ کو بھی بچی خوشی مل جائے گی۔“

”ہاں شاید، یہ بات ہو، بہت حساس ہے میری بچی، اللہ نے اسے بہت سمجھ اور حوصلہ دیا ہے۔ وہ میرے ساتھ مجھے بڑا سہارا رہا تھا۔ میرے گھر کا تو اصول میرا لے کر گئی ہیں مہر افروز..... وہ اُن کی بیٹی..... کل کی لڑکی کیا چھائی کر ہے، نالکدہ کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

بیٹیاں تو میری سب ہی اچھی ہیں، مگر نالکدہ..... میری بچی غم خوار، بغیر کہے میرے دل کی حالت جان چکی تھی۔ اُسے ڈھیروں خوشیاں دے، اُسے گھر میں ہمیشہ سکھ لے، اللہ اُسے خوش بخت اولاد دے، میری بچی کو اللہ ہی اللہ! رکھے۔“ انہوں نے آنچل پھیلا کر نالکدہ کو عانیں دیں۔

”وہ لوگ کب آئیں گے امی؟“ ایلا کو پھر سے نیا موضوع یاد آیا۔

”اتوار کی شام کا کدہ رہے ہیں۔“ صفیہ نے اسفردگی سے جواب دیا۔

”تو ہم گھر کی صفائی شروع کر دیں؟“

”گھر تو صاف ہی ہے بیٹے، خواہ مخواہ جان ہلکان کرنے کا کیا فائدہ؟“

انہوں نے بدولی سے کہا۔

”امی! ایلا نے پھر مخاطب کیا۔

”ہوں.....“

”امی! احسن بھائی اور شہوار بھائی کی دوستی ہو گئی؟“ اُس نے جھپکتے ہوئے ذہن میں کلبلانے والا سوال آؤ کر دیا۔

”دونوں کی مرضی سے ہوا تھا یہ نکاح، گنجائش نکل ہی آتا تھی، سمجھا آئی ہوں۔ مگر احسن کے اطوار مجھے کھنگدہ ہے۔ شاید مجھے دکھانے کو ایسا کر رہا ہو، شہوار کو واقعی سمجھا نا مشکل تھا، بچی جو ہے۔“

”ہوں، تو بیٹے سے ملاقات آخر کر کے ہی آئیں..... مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔“ اچاکا قریب سے شیخ صاحب آواز ابھری۔

ایک لمحے کو تو صفیہ دم بخور رہ گئیں۔

”تو پھر کیا کرتی اُس کٹی پتنگ کا، جسے نہ اُس کے ماں باپ رکھنے پر راضی اور نہ آپ..... آخر میری بھی بیٹیاں جیسا کر دیں گی، وہی میرے آگے آئے گا، کس اندھے کوئیں میں پتنگی پھر؟ انہوں نے بہت سنہل کر جواب دیا تھا۔

”جہیں تو بہانا چاہئے تھا اُس تک حرام کے پاس جانے کا۔ کوئی عقل مند عورت ہوتی تو ایسے بیٹے کو شرم سے مارنے کو کہتی۔ بڑی ناک والے بننے ہیں ذواب بہادر، جس کا تھوک دیا تھا۔“

”شیخ صاحب! خدا کے لیے چُپ ہو جائیں، آپ کے آگے بھی بیٹیاں ہیں۔ بیٹی کے لیے لفظ خُشکنا انتہائی برا ہے، آپ تو ایسے طعنہ زنی کرتے ہیں، جیسے آپ کا اس کا برابر کا رشتہ ہو۔ بچے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔ بڑوں کو تو لانا



”آپ پر نعوذ باللہ وہی اترتی ہے جو اپنے شک یقین کی طرح بیان کرتے ہیں، اللہ کا خوف کریں۔“

”تمہارے پیٹ میں اسی طرح درد ہوتا ہے، جب بھی میں اس کی حقیقت بیان کرتا ہوں، تمہارے نزدیک ہو گا۔“

ولی اللہ، میرے سامنے اس کی وکالت کرنے کی کوشش مت کیا کرو، شیطان کی نسل ہے ناخبر۔“

صغیر کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ کا عکس پھیل گیا۔ وہ نکیہ لگا کر لیت گئیں۔

”بلو! ہانڈی چڑھا دو بیٹا!“

”اور سنو! اگر تم اپنے شہزادے سے کچھ لے کر آئی ہو تو میرے گھر میں خرچ مت کرنا۔ میں اپنی حق حلال کی مالکی ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔“

صغیر خاموش رہیں۔

”اس معصوم بچی کی آہیں تمہارے سر جانیں گی صغیر بیگم، تم اسے درندے کی کچھار میں چھوڑ کر آئی ہو، وقت نہ ہوگی اُسے تو میرا نام بدل دینا۔“ وہ بڑبڑائے۔

”اللہ نہ کرے۔“ صغیر نے ہول کر بے ساختہ کہا۔ ”کیا فٹ پاتھ پر بیٹھا آتی؟“ صغیر نے تلخی سے کہا تھا اور کھوت لے لے آنکھیں موند لی تھیں۔

شہوار کار بگروں کے نزدیک ٹہل رہی تھی۔ ایک سیکل اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اُس کی نزاکتیں اور باریکیاں جانچ رہی تھی۔ الٹ پلٹ میں مصروف تھی کہ چہرہ اسی نے اُسے متوجہ کیا۔

”بس! آپ کو صاحب بٹار ہے ہیں۔“

”اکرام صاحب؟“ وہ رک گئی۔

”جی نہیں اسد صاحب۔“ اُس نے وضاحت کی۔

”اسد صاحب! اچھا آ رہی ہوں۔“ اُس نے دوپٹے کو ترتیب سے سنبھالا اور چل پڑی۔

دروازہ چھتچھایا۔

”کم ان! اسد کی شائستہ اور سنجیدہ آواز ابھری۔

شہوار افس میں داخل ہو گئی۔ وہ بخور ان کا چہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔

”تشریف رکھیے۔“ اسد نے نظریں اٹھا کر بغیر کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

”بی بی! آپ نے اپنے کوائف ابھی تک جمع نہیں کرائے ٹھیک ہے کہ آپ کا کام لکھت پڑھت کا نہیں ہے مگر ذمہ داری کا تو ہے۔ آپ انگریزوں کی زبان پوری محنت کے ساتھ بول لیتی ہیں، سمجھ لیتی ہیں، آپ کے پڑھے لکھے ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ مگر ملازمت کے کچھ اصول تو اُتارے ہو کرتے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں بی بی؟“

”جی سر! شہوار کی آواز بہت آہستہ تھی۔

”دیکھیے بی بی! بغیر کوائف کے تو آج کل لوگ گھریلو ملازمین بھی نہیں رکھتے، یہ تو پھر ایک منظم ٹیکسٹری ہے۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے درخواست لکھ کر میرے سامنے دی ہے۔ پھر آپ کی نشست و برخاست اور مجبوری کا انتہائی اظہار ہم نے آ موقع دیا، آپ نے اچھی کارکردگی اور محنت کا مظاہرہ کیا۔“

معاف کیجئے گا سر۔“ شہوار درمیان میں بول پڑی۔

”اس نے اسد سے صرف جچ بولنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

میرے کوائف جس جگہ ہیں، وہاں میرا رابطہ نہیں ہو رہا، سر میں کچھ لے کر بھاگوں گی نہیں، آپ اطمینان رکھیے۔ چال ہے کہ مجھے کپڑوں کے لئے پیسے کی سخت ضرورت ہے۔ مگر میں نے ایڈوائس کی بات اس لئے نہیں کی کہ آپ

ن میری ضمانت کا کوئی ثبوت نہیں، میں آج ہی ٹرائی کروں گی۔ اپنے چھوٹے بھائی کو فون.....“

”ہائیں، یہ منہ سے کیا نکل گیا۔ شہوار گھبرا کر چپ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بات کو کیا رخ دے۔

مدد بہت غور سے اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے۔

”آپ کے چھوٹے بھائی کہیں دور ہوئے ہیں، مثلاً دوسرے شہر میں۔“

نہیں سر..... جی سر۔“ اس کی حالت غیر ہو گئی۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا، آپ کیوں مجھے شک میں مبتلا کر رہی ہیں، آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آپ اکیلی ہیں؟“ اسد بولے۔ ”اکیلی کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ دنیا میں آپ کا کوئی نہیں۔“

”اللہ نہ کرے، یہ بات نہیں سر! موجودہ حالت میں تنہا ہوں، رشتے تو سب ہیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

اسد کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا گیٹ میں کھڑا ہوا ویل ڈریس و جیہرہ سامر۔

”بی بی! آپ کرائے کے مکان میں رہتی ہیں؟“ ان کے ذہن میں فطری تجسس ابھرا۔

”جی نہیں۔“

”پھر آپ کے تنہا گھر کے مین گیٹ پر جو صاحب.....؟“

شہوار نے گھبرا کر ان کا چہرہ دیکھا۔ (اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا)

”وہ آپ ہی کا گھر ہے ناں؟“ اسد کے لہجے میں رسائیت و ملائمت تھی۔

”جی سر۔“

”اور وہ صاحب، آپ کے گھر ہی میں تو تھے، جبکہ آپ کا کہنا ہے..... بی بی کچھ کچھ بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔

ابحاشہ سرے سے بغاوت کے بعد لڑکیاں اسی طرح تنہا.....!“

”پلیز سر!“ شہوار جیسے تڑپ گئی۔ اب بات کردار پر آ گئی تھی۔

”سر! اس سے قبل کہ میری ذات مشکوک ٹھہرے، میں آپ کو جچ بتا دیتی ہوں، اس لئے کہ مجھے اپنا دقار ہر شے

بخدمت ہے۔

وہ میرے شوہر ہیں سر۔ اس کی آواز بہت آہستہ تھی۔

”جی!“ اسد سنبھل کر بیٹھے۔ ”ایسا تک رسک سے درست شوہر اور کپڑوں کے لئے ایڈوائس کی ضرورت.....!“ ان کا

ناغ چکر گیا۔

”تو بی بی! میرا مطلب بھی یہی ہے کہ آپ لوگوں نے شادی کی تو سب کو ناراض کر دیا، اسی وجہ سے آپ کوائف اپنے

نے بھائی سے منگنا چاہتی ہیں۔“ اسد نے امکانی نتیجہ نکالا اور سنا بھی دیا۔

”ہماری شادی ہمارے بزرگوں کی موجودگی میں ان کی رضامندی سے ہوئی تھی سر! ہماری کورٹ میرج نہیں ہے۔“

”آپ کے شوہر جاب لیس ہیں؟“

”نہیں سر! وہ تو ذلیل کام کرتے ہیں۔ گورنمنٹ سروس میں بھی ہیں اور پرانے دوست کے ساتھ بزنس بھی شیئر کرتے

لے۔“ اس نے اسد سے صرف جچ بولنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

”اوہ!“ اسد نے سر تھام لیا۔ ”پھر ہمارے ہاں ملازمت آپ کی مجبوری کیسے ہو گئی؟“

”سر!“ میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں۔

”جھگڑا ہے؟“ اسد نور بات کی تہہ میں اتر گئے۔

”آپ خیال نہ کیجیے گا بی بی! آپ چونکہ وڈاؤٹ ڈو کو شمس ہیں، اس لئے اپنے ملازمین کی چھان بین ہماری مجبوری میں کوئی بات نہیں سرا بلکہ آپ کا تو شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے کہ آپ نے میرا بھر دیا کیا۔ مگر آپ فکر نہ کیجیے میں ہی کوائف جمع کرادوں گی۔ انشاء اللہ۔“

”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہو چکا ہے؟“ اسد نے نہ جانے کیوں پوچھ لیا۔

وہ ہنر و سفید پرنٹ کے قہری پس سوٹ میں ملبوس مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

”ہمارا صرف نکاح ہوا تھا سر!“ وہ جھجکتے ہوئے گویا ہوئی۔

”میں سمجھا نہیں، نکاح و شادی میں کیا فرق ہوتا ہے؟“ اسد کی جزل تالچ اس معاملے میں خاصی محدود تھی۔

”میری رخصتی نہیں ہوئی تھی، اس لئے کہ اس وقت میری تعلیم مکمل نہیں تھی۔ اسے اس موضوع پر بات کرتے ہو۔

اسد سے بہت حیا محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سنسر کے ساتھ ضروری ضروری واقعات کے خلاصے بیان کر کے جیسے جا

چھڑائی۔ اسے یہ سب بہت مجبوری میں کرنا پڑا تھا کہ اس کی پوزیشن خراب ہو رہی تھی۔

”ہوں، تو یہ بات ہے۔“ اسد نے اپنی متناطیسی نظریں صرف ایک لکھنے کو اٹھائیں۔

”مگر یہ تو وہ جھگڑا ہے، جس کا ابھی کوئی حل نہیں نکلا۔“ اسد نے اسے یاد دلایا۔

”نکل تو گیا ہے سر، میں اپنا بوجھ خود اٹھاؤں گی۔ مجھے اس شخص سے کیا سروکار جس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔“

اسد بے ساختہ مسکرا دیے۔ نری جذباتیت و بچپنا، وہ اپنے کاغذات پر جھک گئے۔

”میں جاؤں سر؟“

”میں اپنے کوائف جلد ہی جمع کرادوں گی، کیا نکاح نامہ بھی دکھانا ہوگا سر؟“

”لا حول ولا قوہ“ اسد واقعی جھینپ گئے تھے۔

”میں آپ سے معذرت کر چکا ہوں بی بی، وہ سوالات میری مجبوری تھے، وگرنہ حقیقت تو یہ ہے مجھے ساری دنیا بے

خطا و سادہ دکھائی دیتی ہے۔“ انہوں نے نظریں جھکا کر خامے شرمندہ انداز میں کہا تھا۔

وہ دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

اسد نے اس کی کمر پر لہرائی سیاہ چوٹی کو اس طرح دیکھا جیسے وہ اپنا حساب کتاب دوبارہ ترتیب دے رہے

ہوں۔ انہوں نے گہری سانس لے کر ریو الونگ۔ حیر سے اپنا سر نکال دیا تھا۔

بدم چھپے ہو گئی۔

سفید شلوار قمیص میں ملبوس کوئی صاحب کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھے دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے

دیکھ لیا تھا۔ احسن نے بھی ان صاحب کی نگاہوں کا تعاقب کیا تھا۔ مگر نظریں فوراً موڑ لی تھیں کیونکہ اسے دیکھ لیا گیا

نہا، حالہ سلام کرنا فرض ہو گیا تھا۔

”السلام علیکم۔“ وہ دروازے کے بیچ کھڑی ہو گئی۔

”وعلیکم السلام۔“ ان کی نظریں سوالیہ تھیں۔ انہوں نے احسن کی طرف دیکھا تھا۔

”رشتے دار ہیں۔“ احسن نے پھر پھر پھوڑے تھے۔

”اچھا! تمہارے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ تمہاری فیملی تو اسلام آباد میں ہوتی ہے غالباً۔ وہی صاحب گویا ہوئے۔

بلیک سوزی کو تو کھڑی تھی، وہ کبھی براہروالوں کی ہے۔ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ظاہر ہے کوئی دوست ہی ہوگا عمر اور

ملاز بھی بتا رہے تھے۔

اس نے چائے بنائی، دو کپ تیار کئے، ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھے اور دوبارہ اس کی خواب گاہ میں چلی آئی۔ دروازہ

لگے سے تھپتھپایا اور اندر آ کر سائینڈ ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھی اور بغیر ادھر ادھر دیکھے باہر نکل آئی اور کھانے کی تیاری میں

لگ گئی۔

”ہاں، بس اب تو تم سے صرف رشتے داری ہی ہے۔ اس نے پیاز کاٹتے ہوئے سوچا۔“ مجھے بھی یہ منظور نہیں کہ تم

ہری ذات کے ساتھ اپنا حوالہ دو، کیا بنا کر رکھ دیا ہے مجھے۔“

وہ کافی دیر اپنے کام میں مصروف رہی تھی معا اس نے کال ٹیل کی آواز سنی۔

”الہی! اس گھر میں بھی لوگوں نے آنا شروع کر دیا ہے۔“ وہ دوپٹا اٹھا کر باہر آئی۔ دیکھا تو وہی صاحب باہر کھڑے

نے جوا بھی احسن کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ بڑی حیران ہوئی کہ کال ٹیل کس خوشی میں بجاتی گئی۔

”مجھے ڈاکٹر سمزد کہتے ہیں، میں صبح بھی آیا تھا، احسن کو سخت بخار ہے۔ سخت لاپرواہ شخص ہے، میں سمجھا کہ وہ یہاں تنہا

ہوتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ آپ لوگ بھی ساتھ رہتے ہیں۔“ ڈاکٹر سمزد نے ”لوگ“ کی اصطلاح استعمال کی۔ وجہ یہی

لگے تھے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ اس گھر میں ہوتی ہے۔

”صبح بخار میں دیکھ کر گیا تھا، اس لئے اب دوبارہ چلا آیا تھا۔ آپ پلیز، اس کا خیال کیجیے گا، کوشش کریں کہ یہ دودن

کم از کم ریست لے۔“ شکر یہ۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔“

وہ پلیٹ گئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے، جس کا ایک طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتی رہی پھر

بتر سے گیٹ بند کیا اور واپس بکن میں آ گئی۔

کھانا تیار کر کے عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز کے دوران خیال آیا کہ فوکل اکیڈمی میں توجہ تک ہوتا ہے۔ اس سے اسی

نت بات ہو سکتی ہے۔ گھر برفون کرتے ڈر لگتا ہے۔ مبادہ فون پیا اٹھائیں، عموماً فون وہی اٹھاتے تھے۔

اس نے پندرہ بیس منٹ میں نماز مکمل کی اور جائے نماز تہہ کے بغیر صوفے پر ڈال کر احسن کے بیڈروم میں چلی آئی۔

نت مجبوری تھی کہ فون اسی کے کمرے میں تھا۔

احسن نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پر سامنے متوجہ ہوا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر دوبارہ اخبار چرے کے سامنے کر لیا تھا۔

فون کا بیٹ عین اس کے سر پر تھا۔ وہ فون کی سمت ہی لیٹا تھا۔ وہ کھڑی انگلیاں مردوئی رہی، مگر اس اللہ کے بندے

فیکٹری کی وین اسے دروازے تک چھوڑ گئی تھی۔ آج تو احسن گھر پر ہی تھا۔ سارے گھر کی روشنیاں جلی ہوئی تھیں۔

وہ جلدی جلدی سیدھی چلتی گئی۔ ڈرائنگ روم میں اپنا پرس اور چادر پھینک کر بکن میں گھس گئی۔ سر اچکن بکٹ تھا، جانا

جل کر رہ گئی۔ دوپٹا کرسی پر ڈال کر جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو، چائے کا پانی رکھا اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

دل میں کھد بد ہو رہی تھی کہ خدا معلوم اس کا کیا حال ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ آج تو گیٹ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب

تھا کہ جاگ رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے بیڈروم کی طرف آئی، دروازہ دھیرے سے کھولا اور سر اندر ڈال دیا مگر

تا، ڈاکو منٹس نیلو فر سے لے لینا۔ سچ کسی طرح بھی میری بہت انسلٹ ہوئی ورنہ۔“

ایسی کہی ہیں نونل؟“ اسے ماں بری طرح یاد آئی۔  
 ’ٹھیک ہیں۔“ نونل مرد تھا، اسے بات سمیٹنے کی عادت تھی۔ عورتوں کی طرح پھیلانے اور مبالغہ کرنے کی فرصت نہیں  
 پھر پریشان بہن کو حقیقت بتا کر وہ اس کی پریشانوں میں اضافہ ہی کرتا۔  
 ’کچھ کہہ رہی تھیں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے بھائی کی صورت دیکھی۔  
 ’جی..... کہہ رہی تھیں کہ اب تم بھی ایک مرد کے ساتھ ہو، جو تمہارے پیارے ضد اور غصے میں کسی طرح سے کم نہیں،  
 بہری مجبور یوں کا احساس ہو گیا ہوگا۔ مجھے پتا ہے کہ میری بیٹی ایسی نہیں۔“  
 بہار تو ماں کا پیغام سن کر بری طرح سے تڑپ گئی۔ باوجود کے، آنکھوں سے قطرے ٹپک ہی پڑے تھے۔ (ہائے  
 ا.....!)  
 اور پتا؟“

’ٹھیک ہیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولا۔  
 نونل نے کچھ نہیں کہا؟“ اسے اپنی بہن اور سہیلی کا دھیان پوری شدت سے آیا۔  
 انہوں نے خط دیا ہے، اسی لفافے میں ہے۔“  
 اچھا! اسے جیسے روحانی مسرت ہوئی۔  
 لائیاں کو نہ دیا گیا ہوا ہے، اگلی دفعہ میں اسے آپ سے ملانے لے آؤں گا۔ امی کا اور نیلو فرآبی کا تو آنا خاصا مشکل  
 بہت الٹ رہتے ہیں۔“

ہائے پیارے سینے میں نونل ہی نہیں۔“ وہ تڑپ کر گویا ہوئی۔  
 آہ!“  
 ہوں! وہ بھائی کو جی بھر کر دیکھ رہی تھی۔  
 آہ! ہم نے حسن بھائی کا کیا کاڑا ہے، وہ ہم سے اس طرح بات کیوں کرتے ہیں“  
 کس طرح؟“ وہ دھیرے سے پوچھنے لگی۔  
 جیسے رات کو کر رہے تھے۔

انہیں اس معاشرے کے مردوں کو یہ کیا نفسیاتی بیماری ہے، بہن کا بھائی بڑی تہذیب سے بلیک میل ہوتا ہے، میں  
 مجرم ہوں، جو چاہے مجھے سزا دے سکتے ہو۔  
 مانے بھائی آواز میں کہا اور دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگی۔  
 نادقت اسد کی گاڑی بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور ان کے عین قریب آ کر رکی۔ شہوار سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔  
 مد گاڑی سے اترے، سیدھے انہی کی طرف آئے۔  
 السلام علیکم سر! اس نے سلام کیا تو نونل نے بھی تقلید کی۔  
 یہ ہمارے“ آؤں نونل، اور یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ میں نے کل آپ سے ذکر بھی کیا تھا۔  
 جی! اسد نے مسکرا کر جواب دیا۔ بظاہر اچھی نگاہ میں انہوں نے نونل کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا اور ”ناکا نہ نشان  
 کی سے آگے بڑھ گئے۔  
 اچھا آہ! میں چلتا ہوں۔“

پہ ساتھ لے جانے کے خواہش مند ہوں تو وہ دوسری بات ہے، محترمہ ایڈریس دے رہی ہیں، نوٹ کر لیجیے، اگر  
 مارے جذبات کے آپ کو گھر کا پتا بھی دیں تو آپ لوگوں کو خود ہی.....“ اس نے ریسورڈو بارہ بیڈ پر ڈال دیا۔  
 شہوار نے ریسورڈا اٹھا کر پتا بتا شروع کیا۔ احسن دوبارہ بیڈ پر دراز ہو گیا۔  
 ”تم غم نہ کرو، صبح انشاء اللہ بات ہوگی۔ اس نے ریسورڈ کیل پر ڈال دیا اور نوٹی کا سیٹ اٹھا کر ٹھکانے پر رکھا۔  
 احسن کی مداخلت سے وہ خوشی جو بھائی کی آواز سے پیدا ہوئی تھی، مگر کرسی ہی ہو گئی تھی۔ اس نے ٹرے اٹھا لی اور گم  
 سے انداز میں کمرے سے باہر آ گئی۔

فیکٹری آنے کے بعد وہ لمبے لمبے میں نونل کی منتظر تھی۔ گھر سے فیکٹری کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ آتے آتے ہی بند  
 آتا.....!  
 دس بجے کے قریب اطلاعی ملی کہ مس شہوار آپ کے بھائی آئے ہیں اور وہ جیسے افتاں و خیراں چیز اسی کے پیچ  
 بھاگی تھی۔ برآمدے میں پڑے اسٹول پر نونل چاروں طرف بغور نظریں دوڑا رہا تھا۔ بیلو جینز اور دو ہانٹ شرٹ مٹر  
 ملبوس، نو خیر سانو جوان، اس کا دل کٹ کٹ کر آنکھوں کے راستے پہنچ گیا۔  
 ”اتنی خوبصورت جوانیوں کو میرے وجود نے مر جھا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا..... کہ یہ فیکٹری تھی۔  
 نونل اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کیسی پیاس تھی آنکھوں میں، اس کا جی چاہا مگر جانے۔  
 ”السلام علیکم آہ!۔“

مارے رقت کے اس سے جواب نہ دیا گیا، سر ہلا کر رہ گئی۔ احسن سے نکاح کے بعد وہ اتار دئی تھی کہ اس سے پہلے  
 اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کوئی زندگی میں اتنا بھی روتا ہوگا۔ باپ کی دہشت ہی بہت تھی۔ ماں نے کبھی بھول کی چھڑی  
 سے بھی نہیں چھوٹا تھا۔ بہن بھائی سب سے چھوٹے تھے، بات مانی جاتی تھی، خیال رکھا جاتا تھا، جو عیب نقص ظاہر بھی ہو  
 جاتا تو ماں اپنی محبت و درگزر کی آ کر رکھتی تھی۔  
 پھر رونے کے کیا معنی، خدا نخواستہ کوئی گھر میں اتنا بیمار بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ مرنے لگے۔ پہلی بار بری طرح بے قرار ہو  
 کر روئی تھی، جب امی نے اس کی کلائیوں میں نکاح کی چوڑیاں چڑھائی تھیں، لڑکیوں سے پہنائی نہ گئیں۔ تو وہ اس کی  
 امی کو بلالائی تھیں۔

وہ نہائی دھوئی پھیلے بالوں پر دو پٹا ڈالے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ امی اس کے سامنے آ کر بیٹھ آ گئی تھیں اور نہایت نرمی و  
 پیار سے اس کا مہندی سے رچا ہوا ہاتھ لیا تھا۔ انتہائی احتیاط سے وہ چوڑیاں پہنا رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظر ان کے  
 چہرے پر پڑی۔

وہ ہونٹ کانٹے ہوئے آنسو پل رہی تھیں پھر بھی ان کی پلکوں پر نمونی چپکنے لگے تھے۔ شدت جذب سے چہرہ سرخ  
 نظر آنے لگا تھا۔

جانے کیا ہوا، کیسا احساس ہوا یوں لگا جیسے وجود میں طوفان اٹھ گیا ہو۔ اور وہ ان سے لپٹ کر زعمی میں پہلی بار اس  
 شدت سے روئی تھی کہ اس سے قبل اس طرح نہ روئی ہوگی۔ اور پھر..... احسن تمہارا نام کیا ساتھ لگا زعمی آنسوؤں میں  
 ڈوب گئی۔

اس نے سر آہ کھینچی۔

نظارہ آپ کی بہن!  
نیلوفر۔

اس نے افسردہ انداز میں خط تہہ کیا اور پرس میں رکھ لیا اور چینگ کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خاصی دیر بعد چراسی اس کاغذات فوٹو اسٹیٹ کرا کر لے آیا اور وہ کاغذات لے کر اسد کے آفس میں چلی آئی۔  
”تشریف رکھیے۔“ اسد نے اس پر سرسری نظر ڈال کر کہا۔

”یہ میرے ڈاکو سنس ہیں سر!“

”گڈ!“ اسد نے کاغذات اس کے ہاتھ سے لے لئے اور دیکھنے لگے۔

”آپ کی ملامت کچی، اب بے فکر ہو کر اپنا کام کریں۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔

”آپ نے ایڈوانس کی بات کی تھی؟“

”ذکر کیا تھا سبز مگر رہنے دیجیے، اب ایڈوانس لے لوں گی تو آئندہ ماہ پریشانی ہوگی، جیسے تیسے یہ مہینہ تو کٹ ہی گئے گا۔“

”پھر مجھے پانچ سو روپے پہلے ہی دینے ہیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پلٹ کر باہر جانے لگی۔

اسد نے اس کی پشت پر نظریں جم کر کچھ سوچا پھر جیسے سر جھٹک کر انٹرکام کاٹن پیش کرنے لگے۔

کال بیل بجی تو کوفت یہ اس کا برا حال ہو گیا۔ ایک تو دیسے ہی آتے ہی کچن میں گھسنا پڑتا تھا۔ اب یہاں سے گیٹ لے کر باہر مارچ پاسٹ۔ اس نے چھری ہاتھ سے رکھی، یہ تو طے تھا کہ وہ دروازہ کھولے ہر گز اپنے کمرے سے باہر نہیں گئے گا۔

وہ خون حلائی گیٹ تک آئی تھی کیونکہ یہ تو سو فیصد یقین تھا کہ کوئی من کا پیارا تو ہو نہیں سکتا۔ کون آئے گا یہاں؟  
اس نے ناگواری سے گیٹ کھولا۔

”ہائیں!“ اسے یقین نہیں آیا۔ سامنے شہینہ پھو پھو اور فیضان کھڑے تھے۔

”ارے میری جان! کیا دیدے پھاڑ رہی ہو، دشمن جاں یہ ہم ہی ہیں۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔

”حیران تو ہمیں ہونا چاہیے، یہ تم اسلام آباد سے شہلی شہلی پھر یہاں آ گئیں۔ ویسے مجھے اس نتیجے کا یقین تو تھا دیکھ کر اشی ہو رہی ہے۔

”السلام علیکم پھو پھو!“ وہ ابھی تک حواسوں میں نہیں تھی۔

”السلام علیکم بھابی جان!“ فیضان نے سلام کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

اس نے قدرے چونک کر پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور انہیں لے کر اندر آ گئی۔

”بادشاہ سلامت کہاں ہیں؟“ شہینہ پھو پھو نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

”اپنے تخت پر۔“ اس نے برجستہ کہا۔ شہینہ مسکرا کر صوفے پر بیٹھ گئیں اور وہ ان کے برابر۔

”ارے احسن نظر کیوں نہیں آ رہا۔ ٹی، وی بھی بند ہے، وقت بھی سوئے کانہیں ہے تو یہ کس قدر سناٹا ہے تمہارے تو بڑس میں بیچ بھی شور نہیں مچاتے۔ شہینہ بڑے سے گھر کی گہری خاموشی سے واقف گھبرا گئیں۔

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اسے مجبوراً بتانا پڑا۔

”آجایا کرو، تم تو آ سکتے ہو۔“ اس نے یاسیت سے کہا۔

”جی! میں پھر آؤں گا، آپ فکریہ کریں، ڈاکو سنس چیک کر لیں، اگر کوئی چیز کم ہو تو بتا دیجیے۔“

شہوار نے لفاظی کھول کر کاغذات چیک کئے۔ تمام مطلوبہ چیزیں موجود تھیں مع شناختی کارڈ اور نیلوفر کے خط کے۔  
”آپا!“

”ہوں۔“ وہ کاغذات لفافے میں رکھ رہی تھی۔

”آپ یہ فوکری کر رہی ہیں، آپ کو ڈر نہیں لگ رہا۔“ نوفل کے ذہن میں جو کھٹک تھی وہ زبان پر آ گئی۔

”کیا کروں، حکمرانی کے لئے جاگیر جو نہیں۔“ وہ سختی سے گویا ہوئی۔

”آپ اکیڈمی میں بڑھالیں۔“ نوفل کو جیسے اس کی ملازمت اچھی نہیں لگی تھی۔

”وہاں تنخواہ بہت کم ہوگی اور خواہ وہ تمہارے ہی لئے پریشانی۔“

”آپ ملازمت کیوں کر رہی ہیں، کیا احسن بھائی آپ کو پیسے نہیں دیتے؟ نوفل کو جیسے بہت کراہن تھی۔

”ان سے پیسے لینا ہی کس کو گوارہ ہے۔“ وہ سختی سے گویا ہوئی۔

نوفل نے چونک کر اس کی شکل دیکھی نہیں کیوں، انہیں دینا چاہئیں۔“

”چھوڑو تم ان باتوں کو، کیا رکھا ہے۔ اچھا سوچو، اچھا بولو اور بس خوش رہو۔

نوفل نے گہری سوچ کے ساتھ قدم آگے بڑھا دیے پھر ایک دم رک گیا۔

”آپا! اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو یہ احسن بھائی کے لئے اچھا نہیں ہوگا۔

شہوار سن کر کھڑی رہ گئی۔

”خدا حافظ۔“ نوفل مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

شہوار چراسی کے پاس چلی آئی..... اسے ڈاکو سنس فوٹو اسٹیٹ کرانے کے لئے دیے..... احتیاط کی تاکید۔  
رواپس ہال میں آ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

نوفل سے مل کر ایک طمانینی محسوس کر رہی تھی۔

سیٹ پر بیٹھے ہی اس نے نیلوفر کا خط کھولا اور پڑھنے لگی۔

”بیاری آپا!

السلام علیکم!

اللہ کرے آپ خیریت سے ہوں۔ آپ بہت یاد آتی ہیں۔ رات کو جب بستر پر آتی ہوں تو آپ کمرے میں ہوں

لکھائی دیتی ہیں۔ آپ کی باتیں یاد کرتی ہوں تو رو پڑتی ہوں۔

احسن بھائی نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا، مگر خدا کرے وہ آپ کے ساتھ اچھے ہوں۔ وہ تو ویسے بھی آپ کو بڑا

چاہتے ہیں۔ آپ کو اپنے قریب پاکر وہ یقیناً بہت خوش ہوں گے اور آپ کا بے حد خیال کرتے ہوں گے، مگر یہ آپ

ملازمت کیوں کر رہی ہیں۔ کیا احسن بھائی کو فاضل پر اہم ہے یا آپ مصروف رہنا چاہتی ہیں؟

امی نے توجہ سے سنا ہے، روٹی رہتی ہیں۔

پنا کے سامنے تو آپ کا ذکر ممنوع ہے۔ کیا کریں ایسی مشکل ہے کہ حل بھائی نہیں دیتا آپ اپنا خیال رکھیں، ہم

بالکل ٹھیک ہیں۔



ثمینہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ارے کیا ہو گیا بھئی؟ وہ قدرے سنجیدہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

فیضان بھی ان کے پیچھے چل دیا اور وہ جانے بنائے کچن میں آ گئی۔

اسٹیکس تو شاید احسن کی کمزوری تھے۔ خاصی مقدار میں موجود رہتے تھے۔ چائے بنا کر اس نے فلاسک بھرا لیا۔

سجائی اور اس کے کمرے میں چلی آئی۔

ثمینہ بیڈ پر احسن کے قریب بیٹھی تھیں اور وہ دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔

”تم سے کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ قطر چلو، مگر تمہاری ناک تو میرے ساتھ بھی جھٹ کرتی ہے۔ بھابی جان تمہارا یہ حال دیکھیں تو۔“

تم ہماری کمزوری ہو، لہذا تم ہمیں خوب ستاؤ، ہم سے اس بات کا بدلہ لو کہ ہم تمہارے پیچھے پاگل کیوں ہیں؟ تم ہماری اولاد ہو لہذا خوب تڑپاؤ ہمیں۔ انہوں نے نشوونما پر اس سے نکال کر ناک پونچھی۔

”ہائے میرا تو کلیجہ کانپ گیا۔ احسن تمہیں اگر اپنی نہیں تو کم از کم ہماری ہی فکر کرو۔“

احسن نے ثمینہ کو شانوں سے قہام لیا۔ چھو پھوپھو بلیر! کیا ہوا ہے مجھے ٹھیک تو ہوں۔ شکر کرنا چاہیے کہ ٹوٹنے چھوٹنے سے بچ گیا۔ اتنا چھوٹا دل بھی کس کام کا۔ وہ مسکرایا۔

ٹوٹیں پھوٹیں تمہارے دشمن۔ ہمیں تو اپنے بیٹے کی اس وقت ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ اپنی ماں کی طرف دیکھو جسے تمہارے نام تمہارے وجود کے احساس ہی سے نئی زندگی ملتی ہے۔

انہوں نے اس کا چہرہ قہام کر اس کے بالوں کو چوم لیا۔

”ارے تم نے ہمارے بچے کا صدقہ دے دو؟ ابھی اتارا؟ انہوں نے گم صدم کھڑی شہوار کو مخاطب کیا۔

احسن کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ایک لمبی صورت میں ابھری اور غائب ہو گئی۔

”کیسے اتارو؟ اس کے منہ سے گھبراہٹ میں بے لگا جملہ نکل گیا۔

جب تم اسے نظر لگاتی ہو تو کیسے اتارتی؟ وہ دویسے کھلی ڈلی بات کرتی تھیں۔

فیضان ہنس دیا۔ اس کے لئے کایہ انداز نیا نہیں تھا۔

احسن بھی بے ساختہ مسکرا دیا تھا۔ صورت حال ہی اس درجہ بے ساختگی لئے ہوئے تھی۔

اور اسے حدودِ جبرِ شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پلٹنے لگی۔

”کہاں جا رہی ہو، بیٹھو ادھر! بے چارہ بیمار تھا تمہاری مصروفیت وہی۔ ارے سچ۔ اسے تو ایسے نازوں سے پالا گیا ہے، آج جنازہ میں تمہارا ہوا ہے۔ رخصتوں سے گردن پٹی ہوئی ہے۔ تمہیں اس کی پٹی سے لگا رہنا چاہیے۔ ٹیپ بھی ڈرائنگ روم میں اور ٹی وی بھی، سچ اس سنانے میں تو مریض اکٹا کر اور مریض بن جائے۔

انہوں نے شہوار کو ٹوکا۔

انہوں نے کہا ہی نہیں۔ اس نے جان چھڑائی۔ احسن فیضان سے باتیں کرنے لگا۔

بچے خیال تو رکھے جاتے ہیں، رکھوائے نہیں جاتے۔

دیکھو ناں! کس قدر محنت کرتا ہے ایسے لوگوں کا تو ایکسٹرا آرڈینری (غیر معمولی) خیال رکھنا چاہیے۔ کتنا بڑا دل ہے اس پر، وہ گہری سانس لے کر باہر نکل آئی۔

ہونہ! اس سانس تو سانس ہوتی ہے۔ خواہ چھو بھی سانس ہو۔ اتنی تاکید پر اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔ وہ بھی اسی کے

ہا کہ وہ شیر ہو کی کو ان کی کوتاہیاں نظر نہیں آتیں۔ میری بربادی دکھائی نہیں دیتی، سر چڑھا رکھا ہے۔ جی تو اتنے ہی۔ احساسات سے عاری اور خود غرض۔

جانتی بھتی کھانا تیار کرنے لگی۔ درمیان میں بند کر کے کھول کر دو بستر بھی تیار کیے، کسٹرو بھی بنایا۔ احسن کا خصوصی بن دلیے کے ساتھ تیار کیا جھکن سے اس کی کڑوٹ رہی تھی۔ صبح ساڑھے پانچ بجے کی ابھی ہوئی تھی، پھول بی بی کو بھر سات بجے بلانا شروع کر دیا تھا۔ نماز پڑھ کر اس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ پھول بی بی، احسن کو ناشتا کرائی تھی۔

ہوتی تھی۔ پھر فیکٹری کی دروسری آتے ہی پھر کچن میں۔ انسان کو دلی اطمینان اور سچی خوشیاں میسر ہوں تو وہ ام میں بھی شاد رہتا ہے۔

لاریاں تنخیاں تو انسان کو پہلے ہی شل کیے ہوتی ہیں، کام مزید توڑ ڈالتا ہے۔

غنا کھلا کر ابھی مہمانوں سے باتیں بھی بنانا ہوں گی پھر صبح ہی صبح اٹھنا ہے۔ اسے رونا آ گیا۔

جدا، جو کچھ ہے وہی چلے گا۔ تم اپنی جان ہلکان نہ کرنا، اچانک ثمینہ کی آواز پشت سے آئی۔

کھانا تو تیار ہے پھوپھو!

ہاں، وہ ذرا فیضان اتھ لے رہا ہے۔ تم احسن کو کچھ کھلا پلا دو تاکہ وہ دوا کھا کر آرام سے سو جائے، ٹھیک ہے؟ اسی طرح منہ موڑے کھڑی رہی۔

تم نے مجھے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ احسن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میری بھی نظر گاڑی پر نہیں پڑی۔

چپ رہی۔ احسن کا ناشتہ دلیرے میں رکھنے لگی۔

کیا تم نے میری ہدایت پر برا مانا یا ہے؟ ثمینہ کو معاف اس کی چپ معنی خیز لگی۔

نہیں تو۔“ ناچار اسے بولنا پڑا۔

جدا! ابرامانے کی تو بات بھی نہیں، اس لئے کہ تم بھی ہمیں بے حد پیاری ہو، اگر وہ تمہارے ساتھ زیادتی کرے گا یہ لینا کس طرح دماغ ٹھکانے لگاؤں گی۔ تم دونوں خوش رہو تو میرے لئے یہی بہت ہے، یوں جیسے مجھے سارے خوشیاں مل جائیں۔ وہ مجھے بے حد پیارا ہے۔ ہمیشہ سے میرا مان رکھتا آیا ہے۔ میرے اپنے بھائی نے کفران ہے۔ کہاں ملتے ہیں ہر ایک کو ایسے بیٹے، جاؤ اسے کچھ کھلا دو تاکہ وہ آرام سے سو جائے، دوا بھی کھاتی ہے اس

مجبوری ذرا..... چیخ کر لوں پھر کھانا کھائیں گے۔ اس مرتبہ ہم نے سوچا پاکستان میں سب سے پہلے احسن کے گھر ہوں گے۔

بی جان کا فون کیا تھا، بہت اصرار سے بلایا ہے۔ ڈری ہوئی ہیں بے چاری، نیلہ کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ بھائی بھادر ہیں۔ صرف ان کی خاطر اس طرح بھاگ بھاگ آئی ہوں۔ میں نے تو کبھی بھی انہیں بھیجیا نہیں سمجھا میری ہیں، جھکیل کا سانحہ ہی میرے دل سے نہیں بنتا۔

دل نے دکھ سے کہا۔

دارے کے خفی جذبات بھاگ کی طرح بیٹھ گئے، آج کل کون اتنی پردا کرتا ہے۔ یہ ہزاروں خرچ کر کے صرف بھتیجی کی ایڑیں، کتنی انسانیت ہے پھوپھو میں، کتنا خوبصورت دل ہے ان کا۔

تو نہیں ہوا رشتہ؟ اسے فطری دلچسپی پیدا ہوئی۔

نابھگی جواب نہیں دیا۔ ثمینہ بولیں۔

یہ اور فیضان سونے کے لئے مجھے تو دھڑے اٹھانے اس کے کمرے میں دے پاؤں آئی۔ نہایت آہستگی سے  
بائی اور باہر نکلنے لگی۔

نیا "احسن کی آواز پشت سے آئی، وہ جاگ رہا تھا۔ زیو کے بلب کی روشی میں آنکھوں پر بازو رکھ چٹ لیتا تھا،  
مورہ ہے۔ صفیہ کے جانے کے بعد پہلی بار اس نے مخاطب ہونے میں پہلی کی تھی۔ وہ ہلٹی نہیں رک گئی۔

مے فارغ ہو کر جب بونے کا راہہ ہو تو ادھر آ جاتا۔

دار کے ہاتھ میں ٹرے کا نپ گئی۔

یہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری قطعی ضرورت نہیں، مگر میں اپنے باپ، اپنے اسلاف  
ناروی کی طرح طلاق کی دھمکی کے زور پر اپنا غلام نہیں بنانا چاہتا۔ جس دن تم میری ماں کے سامنے باقاعدہ مطالبہ  
اپنہاری آرزو پوری ہو جائے گی، وگرنہ زندگی اس طرح بھی گزر جائے گی۔

ب آپ کو میری ضرورت نہیں تو یہ دکھاوے کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ اپنی پہلی توہین پر اس کو چکر سا آنے لگا تھا۔  
راکولی فیصلہ جبریہ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں کسی دھمکی، کسی کمزوری سے بلیک میل نہیں کروں گا۔ تم جو چاہو گی، میرا  
ہمارے ساتھ پورا پورا ہوگا۔ میں زور اور بردستی جو کسی خاص جذبے کی بنیاد پر کی جاتی ہے سے دستبردار ہو چکا  
ہے لگے ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزار دو۔

اس نے اپنا بنا کر چھوڑ دیا  
کیا اسیری ہے کیا رہا کی ہے

جگر کا شعر بے ساختہ یاد آ گیا۔

بت جو زور و بردستی کا حوصلہ بخشی ہے، اس کا اپنا مزہ ہے، ایک طرف کارروائی صرف فرد واحد کی توہین ہی نہیں، ظلم  
ہے اور آمریت بھی، جب یہ مجھے اپنے لئے پسند نہیں تو کسی کے لئے بھی پسند نہیں، اتنا بڑا قدم تو میں نے تمہارے  
ت کا پاس کرتے ہوئے اٹھایا تھا۔ مگر تم میں ڈرانا کرنے کی اچھی صلاحیت ہے یہ معلوم نہ تھا۔  
اچھے دھیرے بول رہا تھا اور وہ ساکت کھڑی تھی۔

یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے آپ کون سا کسی سے ڈرتے ہیں۔ وہ بگڑ کر بولی۔

لے لے کنی الحال میری بیوی ہو۔

لے اپنے پیاروں کی تقریروں سے پاگل ہو چکا ہوں۔ میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس میں تمہارا بھی سکون  
نہی سمجھتا ہے، ورنہ بھلا مجھے تم سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس نے دوبارہ آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

یہ سب تم عقل سے کام لو گی، وگرنہ زور و بردستی کی قانونی اجازت فی الحال مجھے حاصل ہے۔

پہلی چمکتی باہر آ گئی۔

بادشاہ چار اپنا کیا اٹھا کر کمرے میں چلی آئی۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا اور ٹیکہ کار پٹ پر رکھ کر لیٹ گئی۔

سے کوئی خوف تو نہیں تھا، اس لئے کہ اسے احساس ہو چکا تھا کہ وہ کس قدر مغرور ہو گیا ہے۔

رات میں جونس، پھر بھی مظلوم..... ہونہ!

نیا دھیرے سے ساتھ کچھ کیا یا کہا تو چھو چھو کو بتا دوں گی..... بڑے آئے وہاں سے..... بے بسی کے احساس سے اس

راگ دہک اٹھی تھی۔

اس لئے کل ہی اسلام آباد چلی جاؤں گی، واپسی میں آ کر دو چار دن تمہارے پاس ٹھہروں گی۔ تم جاؤ  
پاس، پھر کریں گے باتیں۔

وہ پھر ٹرے کو سٹے کرتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ٹرے رکھ کر پھر واپس ہو گئی اور کھانا کھانے لگی۔

ثمینہ اور فیضان آگئے تو کھانا شروع ہوا۔

آپ کو ٹیبل پر احسن بھائی کی غیر موجودگی محسوس ہو رہی ہوگی؟ فیضان نے مسکرا کر دیوانہ مذاق کیا۔

ثمینہ دھیرے سے مسکرا دیں۔ شہوار بھی زبردستی مسکرائی۔

"اچھا آپ دونوں آسنے سامنے بیٹھتے ہیں یا برابر؟ وہ پھر شریر ہوا۔

ہم ساتھ کھانا ہی نہیں کھاتے۔ اس نے مذاق مذاق میں سچ بتا دیا۔

"کیوں آپ کے گھر پر کسی ظالم بادشاہ کی حکمرانی ہے۔ جو شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی نہیں پیتے؟

شہوار کو سچ کچھ ہنسی آ گئی۔

"احسن کے آنے اور جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ اس وجہ سے۔ اس نے آخر بات بنائی۔

مجھے کو تو ساتھ کھاتے ہوں گے، یہ تو بتانا ہوگا کہ آپ کی سیٹ کون سی ہوتی ہے۔ اور احسن بھائی کی کون سی لینا

چھیڑا۔

لو بھی، تم تو اپنی بھالی کے پیچھے ہی پڑ گئے۔

لودہ احسن بھی آگئے۔ ارے بھی تم کیوں اٹھ گئے؟ ثمینہ نے مسکرا کر کہا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ اتنی دیر سے کہاں ہیں؟ وہ آ کر ایک کرسی پر تنگ گیا۔

ہوں، تو اس پر بیٹھتے ہیں۔ فیضان نے شہوار کی طرف مسکرا کر کہا۔

ثمینہ ہنس دیں، احسن الجھ گیا۔

بھئی، شہوار کو تنگ کر رہا ہے کہ آپ دونوں ٹیبل پر کون سی سیٹ سنبھال لے ہیں۔

ثمینہ نے وضاحت کی۔

ہم ساتھ کھاتے ہی کب ہیں، میں کھانا کھاتا ہوں تو محترمہ سادی کی طرح پنگھلا ہلا کر میرے نوالے گنتی لگاتی

ثمینہ پانی پی رہی تھیں۔ ایک دم کھانے لگیں۔ فیضان نے قہقہہ لگایا اور وہ اس طرح شرمندہ ہو گئی جیسے درخت

ہوتا ہو۔

آپ کے ہاں الیکٹریک شئی پر ابلم ہے؟ فیضان نے دریافت کیا۔ مخاطب شہوار تھی۔

نہیں بھئی۔ وہ بھینگی سے بولی تھی۔

اچھا پھر ہاتھ کا پنگھلا، کیا اس میں سے دفا کی لہر نکلتی ہیں؟ اس نے احسن سے دریافت کیا۔

ایکلیکٹ! دیکھ لو تاں بچے کے ساتھ، اگر ہر قسم کے بچے کے ساتھ دفا شروع ہو گئی، تو دفا کی آندھیاں

بلکہ اسپر میں بھی ملنے لگے گی۔

ثمینہ کا اضافہ اتنا بے ساختہ و برجستہ تھا کہ قہقہہ اپنے آپ ہی بلند ہو گئے تھے، اصل بات اسی ہنسی مذاق

رہ گئی۔

کھانے کے بعد اس نے اور ثمینہ نے ایک ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ اس نے برتن دھوئے، صبح کے لئے

کیا ہر دفعہ انہی کی جیت ہوگی، میری قسمت میں ذلت دھواری رہ گئی ہے؟

میرے بھائی سے کس طرح بات کر رہے تھے۔ بے چارہ کتنا دکھی ہو رہا تھا، اسے نوفل کی اداس شکل یاد آگئی۔ کتنا غالم ہے یہ شخص، حد یہ ہے کہ اسے ظلم کا احساس تک نہیں۔

معا سے دھیان آیا کہ کہیں سوتی نہ رہ جائے۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں کھلی ہوتی تھیں۔ صبح ایک دم اس پر وار ہو جاتی تھی۔ اس بند کمرے میں تو رات دن کا پتا نہیں چلتا..... کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ اس نے ہٹائے اور لے نہیں کہ احسن کو اعتراض نہ ہو۔

وہ انہی اور اس کے سر ہانے سے ٹائم پیں اٹھانے لگی۔ اس کے ساتھ سگریٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ بستر پر گر پڑا۔ احسن نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا تھا۔

یہ..... ٹائم ہیں۔

غلطی ہوگئی، میں میدان، ہموار کر رہا ہوں تاکہ آئندہ یہ ڈراما کرنے کی توبت نہ آئے۔ انشاء اللہ غریب تم اپنی گرم کی زندگی گزر دوگی۔

کون گزرنے دے گا؟ آپ..... آپ کی والدہ؟ میراں..... آپ کے بہن بھائی آپ کی پھوپھو؟ ٹائم ہیں انکا الارم سیٹ کیا۔ سوں سوں کرتی ہوئی پھر جا کر لیٹ گئی۔

”اور ہاں، کان کھول کر سن لیجیے بہت ہوگئی۔ اول تو بات کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے اگر ضروری ہو تو الفاظ استعمال احتیاط سے کیا کریں۔ مگر نہ میں وہ سب کچھ کر گزروں گی جو آپ لوگوں نے خواب میں نہ سوچا ہوگا۔

سب کے سب بچھتا میں گے۔“ ریمیمبر فار ایور

اور کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگی، اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، کہ اس کی گرج چنک پر احسن کے تاثرات ہیں۔

تھوڑی دیر بعد غبار چھا تو حیرت ہوئی، اس کی برداشت اور خاموشی پر۔ خدا معلوم وہ کس وقت نیند سے غلطی تھی۔

منزہ گھبرا چکی تھی۔ ہوش و حواس بحال ہو چکے تھے۔

سفید دوپٹے اور سادہ سے سوتی سوٹ میں وہ گڑیا کی پونیاں بنارہی تھی۔ چہرے پر دل پاش پاش کر دینے والا حزن تھا۔ اسد مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

السلام علیکم بھابی! انہوں نے گڑیا کا زخار چھو کر پیار کیا۔

منزہ نے اس طرح جواب دیا کہ اسد سن بھی نہ سکے۔

ای کہاں ہیں؟ انہوں نے پوچھا۔

کھانا بنارہی ہیں۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

پاپا آئے تھے؟



منزہ نے گہرا سانس لیا۔ جی ایک وقت میں ایک ہی چیز ملتی ہے۔ شاید روزانہ آتے ہیں۔

اسد بھائی۔

جی بھابی!

آپ کو پتا ہے میری ماں بے حد مظلوم ہے اور لوگ ہیں کہ ترس مجھ پر کھاتے ہیں۔

جی مجھے دیکھئے! میں کس قدر کم ظرف ہوں، غم ہی نہیں سنبھالا جا رہا۔ کوئی دنیا میں، میں ہی اکیلی غمزہ تو نہیں۔ قدرت تو پاا کو سزا دی ہے، بیٹی کا جوڑو نا تو صدے سے چور ہیں اور میری ماں، جوڑی موجودگی میں بے جوڑ کتنا حوصلہ ہے

میں۔

اسد نے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ یوں بھی کریدو تجس سے وہ پرہیز ہی کرتے تھے۔ بہر حال دماغ تو الجھا تھا۔

لوگ پتا ہے کیا کہتے ہیں اسد بھائی۔

اسد خاموش رہے۔

کہتے ہیں کہ جوان و خوش شکل بیوہ، اس کے لئے آئندہ کے اچھے امکانات موجود رہتے ہیں۔

زندگی ہے کہ سودے بازی، نقصان پورے کرنے کی پڑی رہتی ہے۔ انہیں اتنا بھی نہیں پتا کہ بعض نقصان کبھی سن نہیں ہوتے، وہ ہچکیاں لے کر رو پڑی۔

اسد کا جگر پاش پاش ہونے لگا۔ ان کی لطیف و حساس طبیعت کے لئے یہ دورانیہ نہایت ہی تکلیف دہ تھا۔

بھابی پلیز! خود ہی حوصلوں کی باتیں کرتی ہیں خود ہی ٹوٹ جاتی ہیں، بتائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے نادمیت کے لئے آپ ہمیشہ تیار پائیں گی۔ یہ نقصان پورا کرنا اس دنیا میں کسی کے بس کی بات نہیں مگر انسانوں کو صبر

اللہ ہی دیتا ہے۔

اسد بیٹے۔

اودہ السلام علیکم آئی۔

خوش رہو، ٹھیک ہو؟

”الحمد للہ، آپ دعا میں یاد رکھیں گی تو انشاء اللہ ٹھیک ہی ہوں گے۔“

منزہ بیٹا! تم ذرا باہر جاؤ، مجھے اسد بیٹے سے ضروری بات کرنا ہے۔ نور بانو نے منزہ کو بڑی آزدگی سے دیکھا تھا۔

منزہ گڑیا کو گود میں بھر کر باہر نکل گئی۔

بیٹے! تم ہمارے ہو، میں جو کچھ تمہیں کہہ رہی ہوں، اس بات کا برا نہ منانا۔

نہیں آئی! آپ کیسے، اسد چونک کر ہمتن گوش ہو گئے۔

بیٹے! منزہ عدت میں ہے، شرعی لحاظ سے ہر وہ شخص جس سے اس کا نکاح جائز ہے۔ عدت کے دوران اس سے نہیں

مل سکتا۔

اسد سر جھکائے سنتے رہے۔ بہتر آئی! مجھے اس کا خود ہی خیال ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے دین کی کوئی بات خالی از

مصلحت نہیں، یہ بہت اہم نکتہ ہے۔

جیتے رہو۔ اللہ تمہاری اقبال مندی میں اضافہ کرے۔ میرے بیٹے تمہیں کوئی غم دکھ نہ لے۔

جیسی ٹھنڈی چھاؤں تم دوسروں کے لئے بنے رہتے ہو، اس طرح اللہ تمہیں آزمائش کی کڑی دھوپ سے ہمیشہ

بچائے آمین۔

میں چلتا ہوں۔

میں تمہارے لئے چائے لارہی ہوں۔

مجھے دیر ہو جائے گی۔ ابھی نماز بھی پڑھنا ہے۔ چائے تو میں ہمیشہ پیتا ہوں، اللہ حافظ، وہ چابی اٹھا کر ڈرائنگ روم

سے باہر نکل گئے۔

مہر افروز گھر میں داخل ہوئیں تو نائلہ سر پر کپڑا باندھ لائے، بالے صاف کرتے دکھائی دی تھی۔ ساس کو سنانے

دیکھ کر وہ ایک دم گڑبڑا گئی تھی۔

”السلام علیکم می۔“

”علیکم السلام! کیا ہو رہا ہے یہ..... یہ تو کیا اندازوں پر بٹھائے ہوئے ہیں؟ وہ لاڈلی اکلوتی بہو کو اس حال میں دیکھ کر

نورانی برافروختہ ہو گئیں۔

”لا حول ولا قوۃ۔“ نائلہ سینہ پ کر رہ گئی۔ نوری نہیں آئی آج، مجھے ایک جالانظر آیا تھا تو.....

خیر یہ تو تم کسی کو بھی کہہ سکتی تھیں۔ اور بھی تو ہیں۔ اف تھکن سے برا حال ہے، پنڈی سے یہاں تک ڈرائیو کرنے

ہوئے برا حال ہو جاتا ہے۔ ڈیر پہلے ٹھنڈا پانی پھر اچھی سی چائے۔

جی، بہتر! نائلہ نے سرے لپٹا کپڑا اتار دیا اور دوپٹا کرسی کی پشت سے اٹھا کر شانوں پر پھیلایا اور نور بانو پانی لے آئی۔

باہر آفس گیا ہوا ہے۔

جی۔ نائلہ چائے کے لئے خانہ ماں کو کہہ آئی تھی۔ جورات ہی اپنی چھٹیاں پوری کر کے واپس آیا تھا۔

وہ ان کے سامنے موڑھا ڈال کر بیٹھ گئی۔ اباجان کیسے ہیں؟

ٹھیک ہیں۔ اسد نے پنڈی فون کر کے مجھے تاکید کی تھی کہ میں تم سے مل لوں تم خاصی پریشان ہو۔ حالانکہ مجھے یہ

بھی نہیں لگی۔ تمہاری پریشانی کی اطلاع باہر کے بجائے اسد کے ذریعے..... تمہارا ضمیر باہر کے ساتھ ہے..... ہر چیز

نائلہ نے ایک بے نام سے خوف کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتا محسوس کیا۔ (یہ آپ نے کیا کیا اسد بھائی؟) اس نے

لڑیں اٹھا کر مہر افروز کی سمت دیکھا۔

می! جو بات بالآخر آپ تک پہنچ گئی، وہ بہر حال آپ کے لئے نئی توند ہوگی۔ وہ بمشکل گویا ہوئی۔

نہیں۔ یہ بات میرے لئے قطعاً نئی بلکہ شاکہ ہے۔ اور انفس کی بات یہ ہے کہ یہ غیر مصدقہ بات مجھے اسد کے

ریٹے سننے کو ملی۔ اسد مجھ سے زیادہ یا باہر سے زیادہ تم سے قریب کس طرح ہو گئے۔ کہ جو بات تم ہم سے نہیں کہہ سکتیں۔

ان کے کہہ دیتی ہو۔ ان کے لہجے کی چھین نائلہ کی جان پر انگارے کی طرح گری۔

وہ اس لئے می کہ آپ کی اپنی مصروف زندگی ہے اور باہر کی اپنی۔ آپ کے مصروف اوقات میں میرا کوئی حصہ نہیں۔

ان کے انداز میں پچھلے دکھوں کا تمام زہر اتر آیا۔ اس نے سر جھکائے رکھا۔

مگر اپنے گھر کی ایک اینٹ اکھاڑنے سے اپنے ہی گھر کو کزور بنانا کہاں کی دانشمندی ہے؟ مہر افروز کا لہجہ خشک تھا۔

اسی شاخ کو کاٹو گی جس پر بیٹھی ہو؟ مصروف تو آج کل ہر انسان ہے لیکن تم گھر کی فرد ہو۔ تمہیں ہم تک باضابطہ تو نہیں

پہنچا۔ جب چاہے جس وقت چاہے۔ رات کے کسی پہر۔ دن کے کسی لئے تم ہم تک پہنچ سکتی ہو۔ تمہیں کون منع کر سکتا ہے؟

تم ہماری بہن نہیں۔ ہماری بچی ہو۔ پیاری سی بیٹی ہو۔ خدا گواہ ہے۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ مجھے تم

سے ساس بن کر بھاؤ کرنا ہے۔ گڑیا سے کسی طرح کم نہیں ہے تمہارا حق۔

نائلہ کی آنکھوں سے خاموشی سے قطرے بہنے لگے۔ جولوہک کر فرش پر گر جاتے تھے۔

نائلہ! مہر افروز نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

نائلہ! ادھر آؤ میری جان۔ وہ صوفے پر اپنے برابر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوئیں۔

وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

نئی بیٹا۔ ادھر آؤ چندا۔ کیا کہہ رہی ہوں؟

نائلہ ہاتھوں سے رخسار پونچھتی ان کے قریب آ بیٹھی۔ مہر افروز نے اسے اپنے شانے سے لگا لیا۔ اس کے بالوں پر

برس دیا۔ آئی ایم سوری۔ مگر میں ہرٹ ہوئی تھی۔ یقین کرو۔

می۔ سب بانی چائیں ہوا۔ آپ یقین کریں میں نے جان بوجھ کر اسد بھائی کو بتانے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے یقین کیا۔ مگر مجھے ٹھیک سے پتا تو اب بھی کچھ نہیں۔ اسد کے فون سے اس درجہ ڈسٹرب ہوئی کہ بتا نہیں

سکتی۔ تمہارے بابا اباجان کا گوجا ہے ہیں ان کی پینک ادھوری چھوڑ کر آئی ہوں۔ کیا باہر پھر سے ڈرنک کرنے لگے؟

ان کی آواز پست تھی۔

نہیں۔ نائلہ نے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں۔

پھر؟ اس مرتبہ مہر افروز کی آواز میں اطمینان اور حیرت کا ملا جلا تاثر تھا۔

آپ کو ان کے عیب و ہنرمندوں کی سب کیفیتوں کا علم ہونا چاہیے۔ آپ ماں ہیں آخر۔ نائلہ نے ہنسنے کی ہنسی آواز میں جواب دیا۔

ہاں ایک حد تک میں اس کی کیفیتوں سے واقف ہوں۔ مگر بیوی جن حدود تک رسائی رکھتی ہے۔ ماں وہاں نہیں پہنچ سکتی۔ تم بابا جان کے متعلق ایک حد تک جان سکتی ہو۔ مگر ہمارے بیڈروم کے بند دروازے کے پیچھے ان کی کچھ خصوصیات ادائیں ہوں گی جن سے میں واقف ہوں گی یا میرا خدا۔

کیا بات ہے جودل میں ٹھٹھکا ہے سب کہہ دو۔ میں جتنی باہر کی ہوں۔ اتنی تمہاری بھی ہوں۔

انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر خدشات سے کاچتی آواز میں کہا تھا۔

میں آپ سے کیا کسی سے بھی نہیں کہہ سکتی۔ وہ رو پڑی۔

مہر افروز دھک سے رہ گئیں۔ ایسی کون سے بات ہے جو کسی سے بھی نہیں کہی جاسکتی؟

باہر نے بتایا تھا تم پر یکینف ہو؟ انہوں نے جیسے تصدیق چاہی۔

نائیلہ نے نظریں نہ اٹھائیں۔

کیا یہ خبر درست ہے؟ مہر افروز کا دل نہ جانے کیوں بیٹھا جا رہا تھا۔

جی! نائلہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

پھر۔ مہر افروز کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ پھر اور کیا بات ہے؟ تمہیں قسم ہے جلدی بتا دو۔ ورنہ میرا دل بیٹھ جائے گا۔

بارتو بہت اذیتناک سواریاں ہیں۔ آئیڈیل ہیلتھی پرسن۔ میں نے اس کی صحت کے سلسلے میں کبھی پریشانی نہیں اٹھائی۔ وہ تو ایک سولجر (سپاہی) کی طرح فٹ ہے۔ باتیں بھی بہت اپ ٹو ڈیٹ اور مائنڈ فیل کرتا ہے۔ اس کا تو مذاق بھی بہت جینیل اور کاسٹو نیچر ہے اس کی۔ بچپن میں مجھے پرائلم ہوتی تھی۔ بہت ضدی اور سرکش ہو گیا تھا۔ مگر اپنی سن سے باہر آ کر وہ بہت نارمل اور فٹ ہو گیا تھا۔ محنت کی تھی اس پر۔ یہ پیلجہ بات ہے۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

یہ تو آپ جانتی ہیں۔ کچھ میں بھی جانتی ہوں گی۔ نائلہ نے قدرے سختی سے کہا۔

ہاں۔ ہاں۔ کہو۔ بیوی تو دریافت کے ایک مرحلے سے ضرور گزرتی ہے۔ ان کی آواز میں جیسے خدشات کانپ رہے تھے۔

کیا آپ یہی کچھ جانتی ہیں جو آپ نے ابھی بتایا؟ اس نے پوچھا۔

ہاں۔ میری معلومات کی حد یہیں تک ہے۔ انہوں نے اعتراف کیا۔

کیا آپ نے باہر میں کوئی غیر معمولی بات کبھی نوٹ نہیں کی۔ اس نے مشکوک انداز میں دیکھا۔

بچپن میں وہ قدرے اناہل ہو گیا تھا مگر آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ بولیں۔

وہ ٹھیک نہیں ہوئے تھے۔ انہیں پردہ پوشی کرنے کا ہنر آ گیا تھا۔ وہ جگڑ کر بولی۔

مہر افروز، ایک لکھنے کو ساکت بیٹھی اس کی شکل دیکھتی رہی۔

کیوں مجھے استخوانوں میں ڈال رہی ہو۔ اصل بات کہہ دیجیے ڈالو۔ وہ بے چین ہو کر گویا ہوئیں۔

نائیلہ نے آستینیں الٹ دیں۔ ڈھیلی آستینیں اس نے بازوؤں تک چڑھالیں۔ سفید سفید بازوؤں پر سرخ نشانات بہت واضح تھے۔

یہ۔ یہ کیا ہے؟ مہر افروز نے اس کا بازو دیکھا۔ ان کے ہاتھ برف ہو رہے تھے۔

م۔ مارتا ہے وہ تمہیں؟ انہوں نے بحرمانہ انداز میں سوال کیا۔

نائیلہ نے کرتے کا اوپری ٹخن کھول کر گلے بچھ کیا۔ سرخ نشان وہاں بھی موجود تھے کچھ خشک ہو کر براؤن ہو رہے تھے۔

یہ۔ یہ کیا ہے؟ فارگا ڈسک نیلی۔ میری جان۔ کیا ہے یہ؟ وہ ایک دم حواس باختہ ہو گئیں۔

نائیلہ نے ٹخن بند کیا۔ آستینیں بچھیں۔ بہت اچھا تختہ مشق لائی ہیں آپ می باہر کے لئے۔

کیوں مارتا ہے وہ تمہیں؟ وہ جاہل تو نہیں۔ وہ از حد پریشان تھیں۔

اسے مارتا نہیں کہتے جی۔ نفسیاتی اصطلاح میں اذیت پرستی کہتے ہیں اسے۔ نفسیاتی مریض ہیں آپ کے بیٹے۔ نائلہ

کی آواز بھرا گئی۔

اوهو۔ مہر افروز پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

جس روز سے میری شادی ہوئی، مسلسل عذاب کاٹ رہی ہوں۔ بیچ مار کر مددگار بھی نہیں بلا سکتی۔ میں اسی طرح

تڑپ تڑپ کر مرنے جاؤں گی۔ یہ آپ نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے۔ وہ بچکیوں سے رونے لگی۔

مہر افروز نے اسے گلے لگایا اور ساڑھی کے پلو سے اس کے آنسو پونچھنے لگیں۔

مجھے قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے کی۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا۔ میں اس کی ماں ضرور ہوں۔ مگر اس کی تنہائی میں میرے

قدم نہیں۔ اف میرے خدا! کیا وہ سونے سے پہلے ڈر تک کرتا ہے؟ ان کا لہجہ یک دم ناتواں ہو گیا تھا۔

پان کھاتے ہیں نشے والا کہتے ہیں ڈر تک نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے جی سے۔ اس نے پھر کر جواب دیا۔

مہر افروز نے سر تھام لیا۔ جیسے پکڑا رہے ہوں۔

کیا تم نے اپنی ماں سے ذکر کیا؟ وہ جیسے خوفزدہ انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

مجھے جلتی پر تیل چھڑکانا نہیں آتا جی!

تھکنکس اے لوٹ مائی ڈاٹر۔ انہوں نے اس کے رخسار پر بے ساختہ پیار کیا۔

بہت بیڈلک ہے میری۔ ان کی آواز میں آنسوؤں کا تاثر تھا۔

نائیلہ نے چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔

درجن بھر سونے کی چوڑیاں ایک ہاتھ میں ڈائمنڈ کے کنگن دوسرے ہاتھ میں بیورسلک کی قیمتی ساڑھی، پر آسائش گھر،

لاکھوں کی ذاتی گاڑی۔ اور بہت بیڈلک۔ وہ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ صاحب اختیار عورت اور بیڈلک۔

”دوسری شادی ہے میری، پہلے شوہر لینڈ لارڈ اور جواری تھے۔ مگر شادی کے چار سال بعد طبی موت مر گئے تھے۔

ایک بہت اچھا آدمی میرا مطلب گارہوا۔ میں نے اس سے اچھا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ پہلے شوہر سے شادی سے پہلے

ان کا رشتہ آتا تھا۔ ہماری انڈر شینڈنگ تھی مگر میرے گھر والے زیادہ دولت کو ترجیح دے رہے تھے۔ ماحول بھی ایسا تھا کہ

میں زور نہ ڈال سکی۔

دوسری مرتبہ میری بیوی کے بعد وہ تنہا آئے۔ ان کے گھر والے ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس بار تمہارے بابا

جان ان سے جیت گئے، میں دو بچوں کی ماں تھی۔

مگر یہ بچے بھی میری خوبصورتی میں داغ نہ لگا سکے۔ تمہارے بابا جان کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ سات سالہ

رفاقت میں بھی ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔

تمہارے بابا جان بہت اچھے ہیں۔ مگر ہر انسان میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد انہوں نے کہانی الحال



وہ کچھ عرصے تک دونوں بچوں کو ساتھ نہیں رکھیں گے۔ بچے نانائانی کے پاس رہ گئے۔ باہر تین سال کا اور گڑیا سال بھر کی تھی۔ گڑیا میرے پہلے شوہر کی وفات کے بعد پیدا ہوئی تھی شاید ایک ماہ بعد۔

تمہارے بابا جان سے شادی کے بعد میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اللہ کی مرضی۔ میری امی بڑے باضابطہ انداز میں بچوں کو مجھ سے ملانے لاتی تھیں۔ کبھی میں ان سے ملنے جاتی تھی۔ بس باہر ہمیں سے بگڑنا شروع ہوا۔ حالانکہ جب دونوں بچے میرے پاس آگئے تو میں نے اس کی اصلاح میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

پتا نہیں کیوں۔ تمہارے بابا جان کے دل میں اس کے لئے وہ گنجائش پیدا نہیں ہو سکی تھی جو گڑیا کے لئے تھی۔ اب دیکھو۔ پنڈی اسلام آباد میں فاصلہ یہ کتنا ہے۔ مگر وہ اور باہر الگ الگ گھروں میں ہیں۔ باہر کا برنس اس کے سگے والد کی دولت سے شروع ہوا ہے۔ اس میں تمہارے بابا جان کا کوئی کسٹری بیوشن نہیں ہے۔ تم نے نوٹ کیا ہوگا باہر پنڈی بہت کم جاتا ہے۔ تمہارے بابا جان صرف ایک مرتبہ آئے۔ اس کے باوجود وہ ان کی تعریف سب کے سامنے کرتا ہے۔ تاکہ سوسائٹی میں بھرم رہے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بہت گنجائش ظاہر کرتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں اس کی تمام عمواریوں کا ازالہ کرو دیتا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی اس کی بیوی بہت ناکس اور بھگدار ہو۔ برداشت دینا روالی ہو۔ ہائی سوسائٹی موڈ کرنے والی لڑکیاں اپنی زندگی میں ہر طرح کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ مخالف حالات برداشت کرنے کے بجائے راستہ بدلنا پسند کرتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنا مزہ اور سکون کھوٹا کرنا نہیں چاہتیں۔

باہر کے مزاج میں خاصی سرکشی ہے اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے میں تمہاری یا نیلہ جیسی لڑکی کی آرزو مند تھی۔ تمہاری امی سے مل کر تم لوگوں کو دیکھ بھری میری تمہارا گھر نہ پسند آیا تھا۔ تمہاری ماں بہت ناکس عورت ہے۔ آئیڈیل مشرقی عورت تمہارے بابا جان کے بارے میں سنا تھا۔ مگر اس سوسائٹی میں مردانہ انداز تقریباً ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے پرواہ نہیں کی تھی۔ البتہ صغیرہ جس قدر بیماری اور وضع دار ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ بس انہیں میں ان کی بیٹیوں کو پالیا تھا۔

تاکہ..... جان۔ یہ گھر تم کو بسانا ہی نہیں بچانا بھی ہے۔ اپنی ساری زندگی کھول کر تمہارے سامنے رکھ دی ہے۔ اسی لئے تم گنجائش پیدا کرو۔

انہوں نے اس کے ہاتھ تمام کر جیسے درخواست کی تھی۔

میں انسان ہوں می۔ فولادی رو بوت نہیں ہوں۔ آپ میرے مسئلے کا حل بھی تو سوچئے۔

اسے ان کی بے گناہی کا یقین آ گیا تو لہجہ آپ ہی آپ نرم ہو گیا۔

”یہی میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ اگر باہر کو بھنگ بھی پڑ گئی کہ تم نے اس کے مرض کا تذکرہ مجھ سے یا کسی اور سے کیا ہے۔ تو وہ اسے اپنی انسٹل سمجھ کر تمہارے راستے مشکل کر دے گا۔ اس کا صرف یہ حل ہے کہ تم بہت پیار، درگزر اور برداشت سے کام لیتے اسے اس مرض کی سبب کا احساس دلاؤ اور سائیکا ٹرسٹ سے ملاقات کر کے مزید حل ڈھونڈو پھر اسے علاج پر آمادہ کرو۔ اس کے اس قدر قریب ہو جاؤ کہ وہ تمہارا عادی ہو جائے۔ تمہاری دوری کا تصور اسے پریشان کر دے۔ قدرت نے تمہیں ظاہری باطنی ہر خوبی دی ہے۔ یہی اس کا حل ہے۔ اگر اس کے مرض کا چرچا ہو گیا تو عین ممکن ہے۔ وہ لحاظ کے سارے پردے چاک کر کے علی الاعلان بڑی بڑی برائیوں کا ارتکاب کرنے لگے۔ اس وقت تم ہی اس کی راز دار، غمگسار، ہمدرد اور قریب ترین دوست ہو۔ میرا تعاون جس حد تک درکار ہوگا۔ میں جب تک موجود ہوں حاضر ہوں۔“

”اگر اس دوران میں مر گئی۔ کیا آپ محسوس کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے مریض کے ساتھ زندگی گزارنا کس درجہ اذیت

ہاں ہے۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ۔“ وہ پھر رو پڑی تھی۔

”نیلہ..... ایک عبادت کی طرح کر ڈالو۔ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔ بس ذرا سی ہمت چاہیے۔“

”مجھ میں نہیں ہے ہمت، جو کام آپ کے لئے مشکل ہے۔ وہ مجھے کیونکر آسان ہو سکتا ہے۔“ اس نے مہر افروز کی بات کاٹ ڈالی۔

”ماں اور بیوی کے رویے جدا ہوتے ہیں بیٹا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ انہوں نے ملاعت سے سمجھایا۔“ تاکہ نہ آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

”اگر پھر بھی کچھ نہ ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”شک رہے تو نیت عزم نہیں بنتی۔ کچھ ہوتا ہے تو جواب بھی کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے اسے سمجھا رہی تھیں۔

اس کو اس جملے سے عجیب طرح کی تقویت محسوس ہوئی۔

”بہتر می۔ آئی دل ڈرائی مائی بیٹ۔ وہ اپنے سر راہی ماحول کے مطابق عام بول چال میں انگریزی استعمال کرنے لگی تھی۔“

”اور ہاں می۔ میں نے اسد بھائی کو خود سے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو تنہائی میں اپنے نصیب کا ماتم کر رہی تھی کہ وہ اچانک آ گئے۔ ان کے اصرار پر اشارہ اچانک بتایا تھا۔“ اس نے نہ جانے کیا سوچ کر انہیں بتایا۔

”میں نے یقین کیا۔ میں تمہیں کچھ دنوں کے لئے پنڈی لے چلوں گی۔ ذرا ریٹ مل جائے گا۔“ انہوں نے پیار سے اسے دیکھ کر کہا۔

”باہر نہیں رہنے دیتے۔ کہیں بھی۔“

”دیکھ لوں گی اسے۔ پتا نہیں کون کون سی منطق نکال کر لے آئیں گے۔“

پھر میں بھی ماں ہوں اس کی، میرے وجود سے ہی پیدا ہوئی ہیں اس کی ساری منطقیں۔ وہ مسکرائیں۔

تاکہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی روشنی پھیلی۔ غم تقسیم ہوا تو وجود ہلکا پھلکا لگنے لگا۔

می..... ایک اور بات۔

ہوں کہو۔ وہ پھر تشویش میں مبتلا نظر آئیں۔

می۔ میں ٹی، دی پر کام کرنا چاہتی ہوں۔ بلکہ باہر تو بہت زور سے رہے ہیں۔ بس آپ سے پوچھنا باقی تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

دعز فلی۔ اٹ از سر پرائز۔ بھی جڑا مرتبہ کرو۔ تم میر ڈے ہو۔ تمہارا میاں تمہارے ساتھ ہے۔ ان میر ڈ لڑکی کیلئے تو بہت سی نزاکتیں ہوا کرتی ہیں۔ میر ڈ لڑکی تو بہت CONFIDENTLY شو بہرہ موڈ کر سکتی ہے۔ وہ بے حد خوش دکھائی دیں۔ ہاتھ سے نکلتی بھونٹیں پھر سے دسترس میں آتی محسوس ہوئی۔

تھینکس می۔ محسن سے ماری زندگی میں بہار کی آمد کا احساس بیدار ہوا۔

آزمائی ڈائر۔ وہ مسکرا دیں۔

او می۔ پلیز شرم نہ نہیں کریں۔ آپ بیٹھے، میں آپ کے لئے اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ وہ جھونکے کی طرح لہرائی باہر نکل گئی۔

مہر افروز نے اپنی زندگی کا ورق ورق اس کے سامنے پلٹ کا جیسے۔ واقعی اپنا نیت کا احساس دیا تھا۔ سر راہی رشتے

بھی تمہیں، یہی طوفان میل ملی تھی؟ ان کی نظریں اس کے سرخ و سپید چہرے پر تھیں۔

احسن کا انتخاب ہے۔ یقیناً ہوگا۔ جس کی ایٹھ ٹرے میں مگ پھول جڑے ہیں اسے نوکر بھی خوبصورت چاہئیں۔  
بہی بڑے دل والی ہو۔ عورتیں تو حسین نوکرانوں سے بہت خوف کھاتی ہیں۔  
کچے مسلمان جو ہوتے ہیں۔ سب کو برابر سمجھتے ہیں شیعہ کھلکھلائیں۔

قرآن میں بھی بہت غور کرتے ہیں۔ چار از دو ارج کی اجازت سب کو یاد رہتی ہے۔ وہ ہنس کر کہہ رہی تھی۔

ہاں بھی ان معاملات میں تو واقعی دیندار ہوتے ہیں۔ شیعہ نے اضافہ کیا پھر دونوں ہی ہنس پڑی تھیں۔

پھول بی بی ناشتہ کرلو۔ اور دیکھو پہلے صاحب کو دیکھ آؤ، اگر جاگ گئے ہیں تو چائے لے جاؤ۔

کون؟ پھول بی بی چائے لے جانے گی؟ نامعلوم لڑکی بیوی کے یہی چھوٹے چھوٹے کام تو شوہر سے اس کی محبت کا لہار ہوتے ہیں۔ فلمی ہیروئن کی طرح گانے گا گا کر تو محبت کا اظہار نہیں ہوا کرتا۔ ہماری اولاد بے مگر تمہارا مرد ہے۔ اس رنج نہیں کرتے، وقت کا کیا بھروسہ۔ آج کل کی تو لڑکیاں بھی اپنی عمر سے زیادہ ہوشیار ہوتی ہیں۔ شیعہ نے جھاڑ پلائی۔

تب وہ ناچار اس کے کمرے میں چلی آئی۔ وہ ہاتھ روم میں تھا۔ وہ کڑھتی ہوئی پلٹنے لگی۔

رات صاحب بہادر بخار میں پھنک رہے تھے۔ اب ہاتھ لیا جا رہا ہے۔ ہمیں کیا؟

اس نے شانے اچکائے۔ ایک قدم بڑھایا ہی تھا واپسی کے لئے کہ فون کی بیل رنگ ہوئی۔ وہ پھر اندر چلی آئی۔  
سیور اٹھایا پہلو۔

جی ڈاکٹر مسعود، جی ہاں، میں وہی ہوں وہ تو اس وقت غسل میں مصروف ہیں۔

ٹھنڈا پانی ڈال دوں ان پر۔ یہ تو میں نہیں کر سکتی۔

جی اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ان کو کوئی روکنے والا نہیں..... آپ بھی تکلیف نہ کیا کریں۔ وقت کی بربادی ہے۔

جی اب ہاتھ روم سے باہر آئیں گے تب ہی بتا چل سکے گا۔ کیونکہ میری رات سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی۔

نہیں سو رہے تھے اس لئے خیر خبر نہیں لی۔

وہ قدرے خجل ہو کر گیا ہوئی۔

معائنات کے ہاتھ سے بھیگا ٹھنڈا ہاتھ نکلایا۔ ریسیور ایک طرح سے جھین لیا گیا۔

وحشی ایک دم۔ بے شک انداز میں ریسیور لینے پر اس کی لطیف طبیعت پر جیسے ضرب سی پڑی تھی۔

سردھویا ہے اور کہنوں تک ہاتھ بس کہنوں سے ڈرا اوپر۔ اور گردن سے ڈرا نیچے پانی ڈالا ہے۔ نہایا تو نہیں ہوں۔

بچہ نہیں ہوں بار۔ ٹھیک ہوں اب کیوں۔ مجھے تازک انداز حسینہ بنانے پر تلے ہوئے۔ دو چار ٹاپیری زخمی برساری

یاد دہریوں کے ٹوکے اٹھائے دوڑ پڑی ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے پارٹی ڈالو۔

وہ باہر آگئی تھی۔ اسے خود بھی تیار ہونا تھا۔ اندر ہی اندر اسے ڈر بھی لگ رہا تھا کہ نہ جانے شیعہ اب کیا موڑ لیں۔

اراضی تو لازماً ہوں گی۔

مگر میں کب تک دوسروں کی پروا کرتی رہوں؟ اس کے اندر سے سرکشی نے بھر پور سراج بھارا۔ اس نے آج پھر سفید

اور بڑھتی ہوئی یعنی وہ پتہ سمیت سوٹ زیب تن کیا۔

جلدی جلدی بالوں کو سلجھا کر چوٹی کی اور بس یہ اس کی تیاری تھی۔

میں جوان دیکھے کچھ خوف و خدشات چھپے ہوئے ہیں۔ آج وہ بھی دور ہو گئے تھے۔ اعتماد وہم آہنگی کی نئی سرطلوع ہوئی تھی۔ گہری تنہائی کا احساس مٹ گیا تھا۔ زندگی میں ایک سبک پن در آیا تھا۔

اسے لگا جوں نے کہا۔ دیا ہو جائے گا۔ اور جب تک وہ بیوی اسٹوڈیوز میں اپنے آپ کو بھلا کر رکھے گی۔ باہر کے قریبی دوست متین صاحب کی سٹیم پوزیشن نے اسے وہاں قدم رکھنے سے پہلے ہی پر اعتماد کر دیا تھا۔ اسے کبھی ستر نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا اعتماد منزل بہ منزل مضبوط تھا۔

شمینہ نے حیرانی سے شوہار کے کام کرنے کا انداز دیکھا۔ پچھلے لگے ہوئے تھے اسے۔

جب وہ بیدار ہوئیں تو وہ ان سے پہلے بیدار ہو چکی تھی۔ اور لاؤنج میں نماز پڑھ رہی تھی۔ اب جب وہ نماز سے فارغ ہو کر باہر آئیں تو اسے اسی طرح مشغول دیکھا جیسے اس کی ٹرین چھوٹی جا رہی ہو۔

ارے بھئی۔ ہم اتنی صبح کب ناشتہ کرتے ہیں۔ کیوں بھاگ دوڑ پھاڑی ہے بھئی؟ وہ واقعی حیران تھیں۔

وہ مسکرا دی، بنا کچھ بولے اسی طرح کام میں لگی رہی۔

ارے آرام سے بیٹھ جاؤ۔ کیوں ریس کے کھوڑے کی طرح چھٹی ہوئی ہو۔ ابھی نہیں کر رہے ناشتہ ناشتہ، احسن بھی میرا خیال ہے۔ آفس نہیں جائے گا۔ اس کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔

اور یہ کیا تم نے چادل پھیلا رکھے ہیں ادھر، تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم ناشتے ہیں چادل ٹھونکتے ہیں۔ یادو پھر اور رات کا کھانا سورج نکلنے سے پہلے ہی پکا کر رکھ لیتی ہو۔

شوہار کی ہنسی چھوٹ گئی۔

بس کریں پھو پھو۔ جب آپ کا دل چاہے ناشتہ تب ہی کیجیے گا۔ کوئی زبردستی آپ کو سحری نہیں کر رہا۔ مجھے اپنا کام کر لینے دیں۔ کوئی حرج نہیں۔

حرج کیوں نہیں۔ خواہ وہ کی بھاگ دوڑ لگا رکھی ہے۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت آمیز انداز میں مسکرائیں۔

اسی وقت کال بیل رنگ ہوئی۔

اوہ شاید پھول بی بی آگئی۔ اتنی جلدی سات بج گئے۔ اپنے آپ ہی سوال جواب کرتی وہ گیت کھولنے چلی گئی۔ شمعینہ ہنوز الجھن میں تھیں۔

لو بھئی، اتنی صبح پھول کلیاں بھی آگئیں۔ کیا ہوا ہے یہاں لوگوں کو۔ نشان پر پیر رکھے بیٹھے رہتے ہیں کہ کب اجالا ہو اور دوڑیں۔

دودھ والا آگیا بی بی؟ ام بولا تھا اسے۔ اما را بی بی دودھ کا واسطے انتظار کرتا ہے۔ تم بوت لیٹ آتا ہے۔ بولا، اپنا بھیئیں لے کر دیں پونج جائے گا۔ تمہارا بی بی کے برتن میں ہی پہلا دھار لگائے گا۔ عجیب کرتا ہے۔ آپ اس کو بولنا بی بی ام عجیب والا نہیں آئے۔

ذرا دم بھی لے لو۔ صبح صبح خطاب کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ شوہاز زوج ہو کر ٹوکے لگی۔

شمینہ بنا پٹلیں چھپکے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

بھئی، کیا کیا چیزیں ہیں تمہارے ہاں۔ ایک ہی مرتبہ تبادو تاکہ میں ایک ہی مرتبہ حیران ہو کر فارغ ہو جاؤں۔  
شوہاز ہنستی ہوئی کچن میں واپس چلی گئی۔ پھول بی بی سینا سیٹی میں لگ گئی تھی۔ بڑی لا پرواہی سے اس نے شمعینہ کو سلام

پھر ہمیں کیا آفت آئی ہے اس جان ماری کی؟ اب وہ شہوار سے مخاطب ہوئیں۔

ایک زندہ وجود ہوں پھوپھو۔ محد دسکی۔ مگر اپنی بھی ضرورتیں ہیں یا کیا زہر کھالوں؟ اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔  
ہر کھائیں تمہارے دشمن ارے اس نے سینکڑوں لوگوں کے بیچ تمہاری ذمہ داری قبول کی ہے۔ تمہارا نان نفقہ اس  
ہے بابا۔ اگر شوق ہوا ہے تو کوئی ایسی نوکری حاصل کرو جس میں اس کی بھی عزت ہو۔ انہوں نے احسن کی سمت  
لیا۔

کری کرنا کوئی ایسے اجنبی کی بات نہیں ہے۔ مگر جس قسم کے حالات سے وہ گزر رہے تھے۔ اس نے سب ہی کو  
حاس بنا دیا تھا۔ بات بات پر شک سا ہوتا تھا۔ اسی سبب شمین نے کرید کی تھی اور واقعی کوئی بات برا آمد ہو رہی تھی۔  
بے تحش روٹی پکڑے کا نہیں ہوتا پھوپھو۔ وہ چپکے سے آنکھیں پونچھ کر بولی۔

بھئی۔ سارے جہاں کا دستور ہے یہ۔ اللہ نے کمانی کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ اور عورت کے ذمے یہ ہے کہ وہ  
بہی اور سعادت مند اولاد بخند دے۔ ان کی دیکھ بھال اور تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑے۔

اس سب کچھ سمجھ چکی ہوں اب تک جھڑا ہے تم دونوں میں۔ دو گھڑی میں سمجھ گئی تھی میں۔ وہ تو یہ چاہ رہی تھی تم دونوں  
رج خود ہی کھلو۔ ارے احسن بچوں کو مات کر دیا تم نے لڑکی بلکان ہو کر رہ گئی۔ اور یہ بھابی جان کون سے عقدے  
لگئی ہیں۔ چلو بیٹھو آرام سے گھر میں انہوں نے جیسے حکم دیا۔

لیز پھوپھو بڑی مشکل سے حاصل کی ہے میں نے یہ ملازمت۔ سوری یہ بات نہیں مان سکتی۔

کیہ رہے ہو احسن؟ انہیں جیسے دکھ سا ہوا۔

سن نے ایک گھر اسانس لیا اور کرسی پر مزید آرام سے بیٹھ گیا۔ ایک لپٹے کے لئے بھی نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔  
م نے اس کی ضرورتوں کا خیال رکھا ہوتا تھا یہ نوبت کیوں آئی۔ ظاہر ہے جب ناک کے مسئلے چل رہے ہیں ایسی  
میں یہ تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانے سے تو رہی۔ جب عورت گھر آئے ہیں تو اس کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کا  
ال رکھتے ہیں۔

پ سے کس نے کہا کہ میں انکار کر رہا ہوں؟

روانکار اقرار کے کیا پوسٹر لگائے جاتے ہیں؟ جب اسے تکلیف ہوئی تو باہر نکل کھڑی ہوئی۔

سب چیز گھر میں ہوتی ہے۔ بے نیازی سے جواب ملا۔

ایک عمر ہوتی ہے شوق کی احسن برامت ماننا تم ہماری اولاد دسکی۔ مگر اس کی اس ساری پریشانی میں تمہارا ہاتھ ہے۔  
تو ہمیشہ سے زیادہ اس وقت اس کی دلجوئی کرنا چاہیے۔

نیزہ کو یوں بھی وہ گل سے قربانی کی گائے گلنے لگی تھی۔ انتہائی رقتیں۔ بات بات پر رو پڑتی تھی۔

پنی دانست میں، میں نے مرتے دم تک کی پریشانی سے نجات دلانے کے لئے یہ سب کیا تھا۔ بڑے آرام سے الوبنا  
پھوپھو۔ آج کے دور میں علم قیافہ یعنی چہروں کا پڑھنا قلیل ہو چکا ہے۔

ت بات گھما کر ادھر ادھر۔

کیوں تم نے اس کا دھیان نہیں رکھا۔ کیوں ضرورت پیش آئی اسے؟ وہ ڈپٹ کر گویا ہوئیں۔

جی آئے دن ہی کہتے ہوئے ہیں۔ گھر میں سارا دن ضروری سامان موجود ہے۔ میرا ایک چیز ایسی ہے اس کو اضافی  
نہ دیتا ہوں کہ وہ ہر ہفتے ضروری اشیاء گھر میں بھردیتا ہے۔ درمیان میں بھی چکر لگا کر پوچھ لیتا ہے۔ آئے جانے

ریست واج کلائی میں ڈال کر وہ احسن کے لئے چائے کا کپ تیار کرنے لگیں میں چلی آئی۔ کپ نفاٹ تیار کیا۔  
ڈھانپ کر کمرے میں آئی۔ وہ کھڑکی کے پردے بٹائے باہر دیکھ رہا تھا۔

یہ چائے۔ اس نے کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے معمول کا جملہ ہرایا۔

احسن نے پلٹ کر اس کی سمت دیکھا۔ بلکہ اس کی تیاری کو دیکھا۔ مگر چپ رہا۔

وہ تیزی سے واپس آئی تو شمینہ لاؤنج میں کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔

نظری ہاف فریم عینک ان کی ناک پر جچی تھی۔ جس کے اوپر سے انہوں نے گھور کر اس کے لٹم پٹم انداز کو دیکھا  
رات تک کا تو تم نے انتظام کر لیا۔ اب کیا کل اور پرسوں کا کرنے چلی ہو؟

بس پھوپھو! بات ہی کچھ ایسی ہے بھول بی بی آج تم اطمینان سے کام کر لو اپنا کام، پھوپھو تو گھر ہی میں ہیں۔

ہاں تو گھر میں ہوں مگر تم کس گھر چلی ہو؟ وہ اسے پرس، چادر، سینڈل سنبھالنے دیکھ کر واقعی حیران ہوئیں۔

پھوپھو۔ سوری پھوپھو۔ آج اگر نئی نئی بات نہ ہوتی تو میں آج ضرور چھٹی کر لیتی۔ ناشتہ تیار ہے۔ ہاٹ پاٹ می  
پراٹھے ہیں۔ فریج ٹوسٹ بھی تیار کر لئے ہیں۔

ہم تمہارے گھر آئے ہیں بی بی۔ تم کہاں بھاگی جا رہی ہو؟ اب تو وہ مارے حیرانی کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

یہ میرا گھر نہیں ہے پھوپھو۔ ایک پناہ گاہ، عارضی، جو خالہ جان کے طفیل فی الحال مجھے حاصل ہے۔

شمینہ اس کی بات سنتے ہوئے اس کی پشت پر بھی دیکھ رہی تھیں۔ جہاں احسن کپ تھامے جانے کب آ کھڑا ہوا تھا۔

میں ایک فیکٹری میں ملازمت کر رہی ہوں پھوپھو۔ شاید آپ کو نہ بتاتی مگر کیا کروں ابھی چند روزی تو ہوتے ہیں۔

چھٹی کر لی تو ایسج ہی بگڑ جائے گا۔ پھوپھو مجبوری ہے۔ آپ برائیں منائے گا۔ اس نے انہیں تھام کر جیسے بھلانے کی  
کوشش کی۔

ادوہ اس کی ساری بھاگ دوڑ، افراتفری، انتہائے سمجھ میں آگئی۔

”گھر پناہ گاہ ہی تو ہوتا ہے۔ بیٹے!“

مگر اپنا گھر۔ اس نے سینڈل پہن کر سنبھالی۔ کتنی روڈ اور کھڑکی تھی اس دم شمینہ کو جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

تمہاری آمدنی کیا اتنی کم ہے احسن کہ اس بے چاری کو یہ بار بھی اٹھانا پڑ رہا ہے؟ ان کی آواز میں ایک دکھ سا تھا

یہ اپنی مرضی اور خوشی سے کر رہی ہیں پھوپھو۔ میں آپ کو کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔

وہ سرد لہجہ میں کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس میں مرضی اور خوشی کا کیا سوال۔ اللہ کا دیا سب کچھ تو ہے تمہارے پاس۔ پھر کیا ہے یہ سب؟ وہ قدرے ناراض

سے احسن کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

میں نے انہیں کہا ہے۔

پھر کیوں فیکٹری جاتی ہے یہ؟ جب تمہاری طرف سے اجازت ہے جب ہی تو جاتی ہے ناں؟

وہ اسی انداز میں گویا ہوئیں۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے پھوپھو!“

ارے بیٹھو یہاں۔ یہ کیا تماشانا ہوا ہے تم لوگوں نے؟ تمہارا پورا نہیں پڑا احسن؟

اللہ کا شکر ہے پھوپھو بہت کرم ہے اس نے ان کے سامنے سے اخبار اٹھالیا۔

کے ہم دونوں ہی قائل نہیں۔ شکلیہ کی جب سے طبیعت خراب ہوئی ہے وہ بھی آنے سے مجبور ہو گئی اور شہوار نے اہر طرف چلنے کا بھی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔  
تو گویا تم اسے کبھی آؤنگ پر بھی لے کر نہیں گئے۔ یہ گھر ہے اس کا یا ”کالا پانی“ یہ تو تم نے اس کا خیال رکھا ہوا۔  
ادھر آؤ تم..... وہ احسن سے مخاطب ہوئیں۔ اور تم بھی۔ وہ شہوار کو بازو سے پکڑ کر گویا ہوئیں اور اس کے پیٹھ پر طرف بڑھیں۔

اندرواغل ہوتے ہی انہوں نے وارڈروب کے چاروں پٹ کھول دیے۔

اس میں صرف تمہاری چیزیں ہیں۔ یہ ڈریسنگ ٹیبل..... اس پر بھی تمہارا قبضہ ہے۔ کتنے سوٹ ہیں تمہارے ہا شہوار.....؟

چار..... ایک شکلیہ نے بنایا تھا۔ دو خالہ جان نے۔ ایک میں گھر سے پہن کر آئی تھی۔ شہوار نے بھی کوئی اجڑا حادی دیکھا تو جیتانے ڈاڑیر نہ لگائی۔

ماشاء اللہ..... تم سے قیامت تک نہ برتے جائیں گے اتنے سارے کپڑے..... وہ احسن کی سمت دیکھ کر ناراض ہو گئیں۔

پھر یہ کہتے ہو اپنی مرضی سے کر رہی ہے۔ بڑی روحانی مسرت حاصل ہوتی اسے دھکے کھا کر۔ ایسا کرو، ایک ہا میں اسے بند کر دو اور ایک ہول دروازے میں بنا دو۔ وہیں سے کھانے کی پلیٹ اسے تھما دیا کرنا۔

دکھا اور صدمے سے شہید کی بری حالت تھی۔ انہیں احسن سے ایسی امید نہیں تھی۔  
احسن خاموش کھڑا چھو بھی کی صلواتیں سن رہا تھا۔

ہمیں معاف کر دینا شہوار..... ہماری بہت بڑی غفلت ہے جو زاید اعتماد کے نتیجے میں ہوئی..... ہمیں تمہاری ہر طرف سے خبر گیری کرنا چاہیے تھی۔ سارے جہاں سے کئی ہوئی ہو۔

میں بات نہیں کروں گی تم سے احسن۔ وہ رونے لگیں۔  
جو کچھ اس کے ساتھ ہوا کیا تھوڑا ہے۔ اگر میرے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا بی ہو گئی ہوتی مجھے۔ کتنا حوصلہ ہے اس

میں۔ ہمارے آگے بھی اولاد ہے۔ ہم خاموش تماشائی نہیں بنیں گے۔ خبردار جو تم نے مجھ سے بات کی۔ لاؤ اپنی فنگرز نمبر دو مجھے۔ میں کرتی ہوں وہاں فون۔ نہیں کر رہی ہماری پچی آپ کے ہاں نوکری دو کری۔ وہ آنکھیں پونچھنے ہو۔

شہوار سے مخاطب ہوئیں۔  
میں خود کر دیتی ہوں پھو پھو۔ شہوار نے انہیں سمجھایا۔ ایک طاقت ور حمایتی کے طور پر وہ اس وقت اسے ساری دیا۔

اچھی لگ رہی تھیں۔  
می۔ آ جاؤں..... کلاس ہو گئی.....؟ فیضان نے دروازہ کھول کر شرارت سے اندر جھانکا۔ جس وقت وہ لاؤٹا

تھے، وہ اٹھ کر باتھ روم میں برش کرنے میں مصروف تھا۔  
چلو..... میں بھی باہر آ رہی ہوں۔ شہوار فون کر کے جلدی سے آ جاؤ۔ وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

شہوار نے آگے بڑھ کر نمبر لایا۔ اکرام صاحب بول رہے تھے۔  
جی سر..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آج حاضر نہ ہو سکوں گی۔ صرف آج کی رخصت، بہت زیادہ خراب

آپ اسد صاحب سے کہیے گا۔ میں اپنی یقین دہانیوں میں ہر طرح سے مخلص ہوں..... مگر دیکھیے طبیعت کی خرابی تو ظہر

پوں سمجھنے لے ڈاؤن ہوں..... واقعی سر..... جھینک پو..... اس نے ریسیور رکھ دیا۔

ہاسنے صوفے پر کسی گہری سوچ میں غرق نظر آیا۔ اتنے روڈ اور انتہائی تاثرات تھے کہ خوف سے اسے جھرجھری جلدی سے باہر آ گئی۔ اور آتے ہی ناشہ ٹیبل پر سجانے لگی۔ اتنے میں شہیدہ اوٹین اشاکل کا جوڑا سر پر نکلتی

ہو گیا وہ شہوار۔

یہ تھا کہ اسے برا بھلا کہہ کر اب خود بھی رونے کو ہوری تھیں۔ اس کی جدوجہد اور مشکلات کے ایک ایک لمحے جس گھر اس کی زیادتی پر بھی چپ نہیں رہ سکتی تھیں۔

پو پو..... اس کے منہ سے خوفزدہ انداز میں نکل گیا۔

جی تم ہی..... جاؤ بلا لاؤ اسے۔

ان جھاڑ ملاطمت کے جواب میں خاموشی اختیار کر لے تو جھاڑ پلانے والے پر اس کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنی ”بی“ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور پھر آج کے دور کا وہ شخص جو ہر طرح سے خود مختار ہوتا تھا تباہی کسی کی سن لے؟

میں لوگوں کی حقیقی اولاد کس طرح سوال و جواب کرتی ہے۔

جی، بلا لاؤ ناں..... وہ اسے چپ دیکھ کر پھر گویا ہوئیں۔

پاراسے بلانے آئی۔

پو پو کہہ رہی ہیں ناشہ کر لیں۔ احسن نے قدرے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ بہت الجھن میں محسوس ہوتا تھا۔

اھر آؤ..... وہ شہوار سے مخاطب ہوا..... سر دلچپہ واضح تھا۔

میں..... اسے سچ سچ ڈر لگا۔

بار کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ سے مخاطب ہوں محترمہ..... ادھر آئیے۔ اس کا تو حلق سوکھنے لگا۔

اب وہ ساری جھاڑ کا بدلہ چکانے گا۔

برائی ہوئی آگے بڑھی۔

ازہ بند کر کے آؤ۔

..... اس نے پیچھے ہاتھ کر کے دروازہ دھکیل دیا۔

نہ نزدیک چلی آئی.....

کیے۔ اس نے اکھڑے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

نا نے اس کا بازو تھام کر جیسے اسے صوفے پر بیٹھ دیا۔

ایسا آرام سے اور بتاؤ کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ وہ سرخ نظریں اس کے چہرے پر بچائے ہوئے تھے۔  
بانیلہ؟

ملی کا فیصلہ..... جو تم نے مجھے سنایا تھا۔ پھو پھو کو کیوں نہیں سنایا تھا۔ اب جب کہ وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھیں۔

باتہ پیا کر رہے تھے۔ اس وقت آپ کو کیا تکلیف تھی۔ بہت سکون سے ہو رہا تھا یہ کام۔

تمہاری تکلیف کی تکلیف تھی۔ اس لئے کہ میں تمہارے تاثرات سے دھوکا کھائے ہوئے تھا۔ اور اب بھی  
مکان کی خاطر تمہاری مرضی کا فیصلہ کرنے کو تیار ہوں۔ وہ پرسکون انداز میں گویا ہوا۔

میری مرضی کیوں کہہ رہے ہیں۔ اپنی کیسے صرف۔ وہ بھڑک کر گویا ہوئی۔  
جی نہیں۔ میرا حافظہ اتنا کٹر ورنہ نہیں ہے۔

آپ نے جو اپنی والدہ سے فون پر کہا وہ مجھے ازبر ہے۔ آپ پر دھوکا دہی کا کیس ہے محترمہ۔ اودھ نارم کہہ رہا تھا۔

اور آپ۔ آپ کو کچھ اپنے کیے دھرے کا احساس ہے۔ کہیں کا نہیں چھوڑا آپ نے مجھے۔  
خیر یوں نہ کہو۔ بڑے اچھے امکانات ہیں تمہارے سامنے۔ ملازمت کے سلسلے میں کرائی گئی یقیناً دوسری سمت موڑنا اتنا مشکل بھی نہیں۔

مطلب کا ہے آپ کا؟ وہ بھڑک کر کھڑی ہو گئی۔  
جو چیز اچھی ہوتی ہے ظاہر وہ سب کو ہی اچھی لگتی ہے۔ جو باس اپنی معمولی ورکر کا اتنا خیال رکھے کہ دروازے تک چھوڑ کر جائے۔ اس کے دل میں ورکر کے لئے دوسروں سے زیادہ گنجائش ہوگی۔ ڈھوک سے کہاں آپ بغیر اسناد کے ملازمت حاصل نے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ جب تک دوسری طرف نرم گوشہ نہ ہو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بھی ایک فرم کو ڈیل کرتا ہوں۔ خاصے ورکرز ڈومینٹ کرتا ہوں۔ مرد و خواتین کے ورکرز، میرے ہاں تو اتنی گنجائش کبھی کسی کے لئے پیدا نہیں ہوئی؟ یہ نکتہ قابل غور ہے محترمہ۔  
وہ سگریٹ سلگانے جھک گیا تھا۔ اتنے واضح امکانات ہیں آپ کے سامنے۔

شہوار تو جیسے فضا میں معلق ہو گئی۔ زبان جیسے پتھر کی ہو گئی۔ جیسے اتنی پستی میں بھی اتر سکتے ہیں میں سوچ؟  
تھی بالآخر وہ گویا ہوئی۔

میں نہیں کہتا کہ آپ کا کیا پروگرام ہے فی الحال۔ مگر کھیل کا آغاز عموماً مرد کی طرف سے ہی ہوتا ہے۔  
طرف سے ٹھیک ٹھاک ہو تو عورت کو متوجہ اور پھر قائل کر ہی لیتا ہے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔ آپ کی زبانی سنگ میل نہیں رہا؟ وہ گہرا کس لئے کمر سامنے دیکھتے ہوئے دھواں چھوڑنے لگا۔  
شہوار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیسے اس کے جلا دھونے کا یقین کر رہی تھی۔

اور مزید یہ کہ۔

خاموش ہو جائیے۔ اگر ایک لفظ مزید کہا تو میں آپ کی جان لے لوں گی یا اپنی شہرگ کاٹ لوں گی طاقت سے چلائی۔

آپ۔ آپ وہ نہیں احسن۔ آہ۔ اسے چکر آ گیا۔ وہ صوفی کی بائیں طرف لڑھک مٹی تھی۔  
احسن جلتی سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا۔  
شہوار۔ اودھ مائی گاڈ۔ وہ جج چکر گیا۔  
پھوپھو تو آج "فائل" ہی کر ڈالیں کیں۔

اس نے شہوار کو جھک کر اٹھایا۔ اور بستر پر ڈال دیا۔ اور جگ سے چلتی چلو میں لے کر چھینے ڈالنا شروع کیا۔

اس نے ڈاکٹر مسعود کو زوری رنگ کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا۔  
یار۔ بس فائل آ جاؤ۔ بندہ خدا مجھے نہانے سے کچھ نہیں ہوا۔ ایک اور عیس ہے پلیز۔

نے تو کیس بن جائے گا مجھ پر۔

باصیبت ہے۔ اٹھ جاؤ، اللہ کی بندی۔ سخت مظلوم ہوں میں یقین کرو۔ اس کی جان پر بن رہی تھی۔  
بابا بر سے پھول بی بی کی آواز آئی۔ ساتھ ہی اس نے عادات دروازہ کھول دیا۔ پھر بڑی سی چیخ کے ساتھ

کہا ہو گیا صاحب۔ یہ تو لگتا ہے مر گیا۔ بے وقوف نے جلتی پر جیسے تل چمڑکا۔

ہاں سے کچھ نہیں ہوا بی بی کو چکر آ گیا تھا۔ وہ جھلایا۔

پھر۔؟ وہ سر کھجاتے ہوئے حیران سی شہوار کو دیکھ رہی تھی۔

طرح گھڑی دیکھ کر نہیں آتے سب کو چکر۔ جاؤ یہاں سے۔ اس نے ڈانٹا۔

دراز ترین صورت حال سے مطلع کرنے دوڑ گئی۔

ایت پریشانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بہنچے بھاگتی ہوئی آئیں۔

ہ؟ بولنے کیوں نہیں۔ کیوں لپٹی ہے یہ اس طرح؟ وہ دھپ سے بیٹر پر بیٹھ گئیں۔

نے ہی کچھ کیا ہے۔؟ انہوں نے مشکوک انداز میں احسن کو دیکھا۔

ہاں آجائیں گی محترمہ تو پوچھ لیجئے گا۔ اس نے جیسے بات ٹالی۔ وہ نظر نہیں ملارہا تھا۔ ٹھیندے ہوش میں لانے نے لگیں۔

لوٹن کر دو۔ سرخ لگا کر ایک دفعہ خون نکال لو اس کا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔

اں۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ فیضان اسی طرف آرہا تھا۔

ت خراب ہے بھابی جان کی۔؟ وہ فکر مند لہجے میں دریافت کرنے لگا۔

اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور لاؤنچ میں چلا آیا۔

لاپندرہ منٹ کے اندر اندر پہنچ گئے تھے۔ احسن نے گاڑی کی آواز سنتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔

ہے یار۔؟ وہ تو لپٹی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

اں۔ ایک مریضہ اندر تمہاری منتظر ہیں۔ اس نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

لزن تو نہیں۔؟ ڈاکٹر مسعود فوراً پہنچے۔

وی۔

لے اپنے بیڈروم چلا آیا۔

ڈاکٹر مسعود نے فکر مندی ایک نظر ڈال کر سلام کیا۔

مری پھوپھو ہیں۔ اس نے آہستہ آواز میں تعارف کرایا۔

ان کی حاجز اوی ہیں؟ انہوں نے شہوار کی سمت اشاری کر کے کہا۔

ن میں یہی آسکتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی یہاں رہتی ہوگی۔

ناری۔ ان موصوف کی بیگم صاحبہ۔ ٹھیندے سے گویا ہوئیں۔

نے بڑی حیرانی سے احسن کی سمت دیکھا۔



وہ نظریں چرا گیا۔ ڈاکٹر مسعود شمینہ کی طرف دیکھ کر خاموش ہو رہا اور شہوار کا چیک اپ کرنے لگے۔ ان کی دھڑکن سے تو یہ بات واضح ہے کہ بڑا گہرا صدمہ پہنچا ہے انہیں۔ خیریت.....؟ وہ شمینہ نے ہوئے..... خدا خواستہ خاندان میں کوئی۔

اللہ نہ کرے..... میں ڈراما سے باہر جا رہی ہوں۔ کر لیجئے آپ اس سے انٹرویو..... کیونکہ اس کی حالت یہی بھی شاہد ہے۔ شمینہ کے اندر میں بلا کی ناراضگی تھی۔ احسن بڑا پھنسا تھا۔

بڑے افسوس کی بات ہے یار..... میں تم سے ٹریٹ تو نہیں مانگ رہا تھا۔ میرے ساتھ غلط بیانی۔ ڈاکٹر مسعود شمینہ کے انداز میں اس سے کہا اور مسلسل اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ احسن مجرم کی طرح خاموش تھا۔

خاصی تک دود کے بعد اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ السلام علیکم بھائی..... کیسی ہیں؟ شہوار کو ان کے انداز پر اتنی حیرت ہوئی کہ ایک دم پوری طرح ہوش میں آ گئی۔

شاہد..... خود کو سنبھالیے..... کیا ہوا..... خیریت تو ہے ناں.....؟ شہوار نیکی سے سہارے بیٹھ گئی اور دوپٹہ درست کرنے لگی۔ ٹھیک ہوں میں۔ اس نے گم سم انداز میں جواب دیا۔

بچے کتنے ہیں..... اب چھپانے سے کیا فائدہ.....؟ وہ احسن سے مخاطب ہوئے۔ کیا باتیں کر رہے ہو یار؟ وہ اُلجھے ہوئے انداز میں مسکرا دیا۔ اب تمہارا اعتبار نہیں۔ سر سے پاؤں تک مشکوک ہو چکے ہو۔ ڈاکٹر مسعود نے اس کی طرف جیسے غصے سے دیکھا

یہ بات چھپانے کی ہوا کرتی ہے۔ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ مگر چھوڑو۔ بڑا افسوس ہوا۔ کیا فلمی اداکار کی حرکت ہے۔ انہیں جیسے دلی افسوس ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ میں تمہیں کسی دن شاید ساری صورت حال سمجھا دیتا مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ جتنا مرضی نا

جاؤ، جب تمہیں ساری بات معلوم ہو جائے گی تو یہ سارا بیجوت اتر جائے گا۔ بیٹھو میں چائے بنوا تا ہوں احسن نے زبردستی بٹھایا اور خود باہر چلا گیا۔ وہ سر جھکانے گہری سوچ میں غرق تھی۔

بھائی! آپ کے سامنے ہی تو تعارف کرایا تھا۔ اس نے آپ نے بھی سمجھ نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر مسعود نے جیسے الٹا بٹھانا چاہی۔ شہوار نے خالی خالی آنکھیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا پھر ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

خدا خواستہ کیا شاک پہنچا ہے آپ کو۔ کوئی بری خبر سن ہے۔ ہمت سے کام لیجئے زندگی کے بہت سے رنگ ہیں ان موقعوں پر اگر انسان خود کو سنبھالنے کی کوشش نہ کرے تو نفسیاتی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں جو..... انسان کو دیا کرتی ہیں جو صلے سے کام لیجئے۔

شہوار پھر کے بت کی طرح سامنے ٹھہرتی ہوئی ان کی بات سن رہی تھی۔

اپن رہی ہیں ناں.....؟ انہوں نے اس کی خاموشی توڑنا چاہی۔

.....! اس نے گویا سکاری سی بھری۔

یہ اس کے آنکھیں کھولنے ہی باہر چلی گئی تھیں۔ مبادا وہ سامنے ہمدرد پا کر پھر روٹنا بیٹنا شروع کر دے۔

بہترے تاخیر کے بعد چائے کا کپ لئے دوبارہ داخل ہوئیں۔

نہارے لئے چائے لاؤں شہوار.....؟ انہوں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

میں پھو پھو..... آپ پریشان مت ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ زبردستی مسکرا کر انہیں تسلی دینے لگی۔

بری فکر تو بالکل نہیں کرو اپنی حالت دیکھو چندا۔

ن آپ لوگ ان کا خیال رکھیے۔ ان کی توجہ بنائیے۔ ڈاکٹر مسعود نے کپ تھام کر پیشہ وارانہ انداز میں مشورہ دیا۔

اپنے قریب رہتے ہیں۔ شمینہ نے اخلاقیاتی توجہ ان کی طرف کی۔

میں اتنا قریب بھی نہیں۔ بس دل زیادہ قریب ہیں۔ وہ مسکرائے۔

سلام آباد کالج میں ہمارا ایف۔ ایس سی تک ساتھ رہا پھر میں کراچی آ گیا۔ ایس ایم سی میں میرا ایڈمیشن ہو گیا۔ بعد

ن پر کنکشن شروع کر دی۔ بس اب یہیں کے ہو رہے۔ اتفاقاً زمانہ اب پھر مل گئے ہیں۔ اسی وجہ سے تو مجھے افسوس

بال گہرا آگئیں اور اس نے مجھے ہوا تک نہیں لگائی۔ انہیں تاسف ہوا۔

ن..... بس آج کل اس کے ستارے ہی گردش میں ہیں۔ سب کو اس سے شکایت ہو چلی ہے۔ شمینہ نے نہایت دکھ

پ یہیں رہتی ہیں۔ احسن کے ساتھ؟ انہوں نے احسن کی پھو بھی ہونے کے تانے خصوصی توجہ دی۔

ہاں، میں تو بیس اکس سال سے قطر میں ہوں۔ ایک ضروری کام سے پاکستان آئی ہوں۔ آج شام اسلام آباد چلی

لاہاں سے ایک روز کے لئے اپنی سرال پھر واپسی میں یہیں سے ہو کر جاؤں گی۔ کل پندرہ دن کا پروگرام ہے۔

میں نے فیضان نے کمرے میں قدم رکھا۔

انفصی بیٹا..... ان سے ملو، یہ تمہارے احسن بھائی کے دوست ہیں ڈاکٹر مسعود۔

نان نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔

بٹھے میرا۔

ڈاکٹر مسعود بھی خوش آمدید کے انداز میں مسکرا دیے۔

میں ہیں بھائی جان آپ؟ فیضان بیڑ پر شہوار کے قریب بیٹھ گیا۔

نہیں ہوا مجھے..... ٹھیک ہوں۔ ایسے ہی بس چکر آ گیا تھا۔ اس نے پھر زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجائی۔ سی لمحے

رد داخل ہوا۔

آؤ نا حال بتاؤ یار۔ شکایت اپنی جگہ، پیشہ اپنی جگہ..... انہوں نے احسن کو مخاطب کیا۔

انت جان ہوں..... فناف سنبھل جاتا ہوں۔ اب یہ زخم ہیں، تکلیف تو ہو گی مگر..... کیا کیا جاسکتا ہے۔ وہ ڈاکٹر

کے برابر میں بیٹھ گیا۔

ہاں میں چلوں.....؟ اجازت دو..... خدا حافظ..... وہ شمینہ اور فیضان کی طرف متوجہ ہوئے۔

گہرا۔

نہیں بس..... اب تو صرف لڑائی کرنے کے لئے ملتا ہے۔ خوب بے وقوف بنایا تم نے؟ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔  
احسن نے صرف ایک مدھم سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ ان کو گیت تک رخصت کرنے کے خیال سے ان کے ساتھ  
باہر نکل گیا۔

پھوپھو آپ آج ہی چلی جائیں گی؟ اس نے پریشان سے انداز میں پوچھا۔

ہاں..... وہاں تو پہنچنا بہت ہی ضروری ہے۔ خدا معلوم کیا ہو جائے۔ بھابی جان بہت بے چینی سے میرا انتظار کر  
ہوں گی۔

گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تمہارا گھر ہے، تمہارا مرد ہے۔ پاؤں جمنا، اپنا سمجھو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔  
میں بھی اسے ڈرائیو کر کے جاؤں گی۔  
شہوار نے آنکھیں موند لیں۔ احسن کے الفاظ، ہنوز بھاری پتھر کی طرح اس کے دماغ میں ضرب لگا رہے تھے۔  
اب واقعی کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہی تھی۔

اتفاق ہی ہوا تھا۔ ٹمینہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئیں انہیں غیر معمولی چہل پھل کا احساس ہوا۔ ڈرائیو روم سے  
باتوں کی آواز آرہی تھی۔ سامنے ہی ناکلہ زرد ریشمی سوٹ پر سرخ ویلٹ کی شال اوڑھے نظر آگئی۔ خوشی سے چیخا مارا  
ٹمینہ سے گلے لگ گئی تھی۔

اور یہی چیخ ٹمینہ کی آمد کا غبارہ بن گئی۔ ہر طرف سے کوئی نہ کوئی آمو جو ہوا۔ صفیہ نے آگے بڑھ کر نند کو گلے لگا  
ٹمینہ نے گہری نظر سے ان کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی تاثر نظر نہ آیا۔

مہمان آئے ہوئے ہیں؟ انہوں نے احمر کو سینے سے لگا کر سوال کیا۔

ہاں۔ وہی ہیں ملتان والے..... صفیہ نے بے دلی سے جواب دیا۔ اور فیضان کو پیار کر نے لگیں۔ آگئے۔ آگئے۔ کچا  
آئے ہیں؟ انہیں فطری طور پر کھوج ہوئی۔

ہاں..... آئے تو پہلی مرتبہ ہیں۔ مگر لگتا یہی ہے پہلی مرتبہ بارات لے کر آئے ہیں۔ وہ قدرے آزدگی سے گویا ہوئے۔  
ٹمینہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئیں۔

بھائی صاحب کہاں ہیں؟ اندر ہیں۔ انہوں نے ڈرائیو روم کی سمت اشارہ کیا۔

ہاں..... اپنے پسندیدہ مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ بڑی خوش وقتی ہے انہوں نے جیسے جل کر کہا۔

تم ہاتھ منہ دھو لو۔ پھر مل لیتا۔ جاؤ احمر اپنے ابا جی کو بلا لاؤ۔ کہو پھوپھو آئی ہیں۔ وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ٹمینہ نے نیلہ کی سمت دیکھا۔ وہ جاسنی پرنٹ کے سوٹ میں بے حد سگوار محسوس ہو رہی تھی۔

چندا..... دل چھوٹا نہ کرنا..... کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ چاہے بھائی صاحب میرا کچھ بھی بگاڑ لیں..... آنا۔

بیٹھ جاؤ۔ اللہ مددگار ہے۔

اور یہ بلی کسی ہے۔ کیا دیدے پھاڑ رہی ہے۔ پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ انہوں نے پیالہ سے انیلا کے سر پر چھینٹا  
وہ ہنس رہی تھی۔

کتنی پیاری لگ رہی ہیں آپ کالی ساری میں دیکھ رہی ہوں وہ بولی۔

اچھا..... اچھی خبر ہے۔ وہ بھی مسکرا دیں۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئیں تو شیخ رحمہ الدین، بہن کے سواگت کے لئے باہر آچکے تھے۔ بہت خوش نظر آرہے  
تھے، ٹمینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

بہت اچھے وقت پر آئیں۔ نیلہ کے رشتے کے لئے لوگ آئے ہوئے ہیں..... آؤ اندر آ جاؤ۔ ویسے اس مرتبہ بڑی  
مدی چکر لگا تمہارا۔

جی بس..... سسرال میں شادی کا سلسلہ ہے۔ یہ کہنے لگے کہ تم ہی چلی جاؤ۔ مجھے تو چھٹی نہیں مل سکتی۔ ٹمینہ نے سوچا  
بھابھانا بغیر دیر کیسے بیان کر دیا۔

اچھا..... اچھا..... اچھی بات..... آؤ..... لڑکا بھی آیا ہوا ہے۔

آپ چلیے، آ رہی ہوں میں..... وہ ایک کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ بالوں کو برش کیا۔ ساری اچھی طرح سنبھالی۔  
آپ بھی آئیے نا بھابی جان! انہوں نے صفیہ کو مخاطب کیا۔

تم جاؤ جھنوں..... ہو آئی میں۔ وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بیزار کزن لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ ٹمینہ نے خاموشی میں  
بڑی کچھی اور ڈرائیو روم میں چلی گئیں۔

بسم اللہ..... ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

سامنے دو تین لڑکیاں سرخ گونا گونا کساری کے کپڑے زیب تن کیے نظر آئیں۔ ایک بزرگ خاتون سبز مخمل کے سوٹ  
میں اپنے جسم کی وجہ سے سنا ہوا الحاف معلوم ہوتی تھیں۔

دائیں جانب ایک دس بارہ سال کا لڑکا آتش گاہی قمیص..... اور زرد رنگ کی پتلون میں بہت قیصر دار نظر آنے کی  
پکسل کر رہا تھا۔ گاہے گاہے نظر اٹھا کر اپنی تیز اور تہذیب کا تاثر بھی دیکھنے کو شش کر رہا تھا۔ غالباً بہت زیادہ تاکید کا مارا  
ہوا تھا۔

بائیں جانب نظر ڈالی تو سانس ہی رک گیا۔

بڑا کڑیل سامر دھما مچھیں پہلا انعام حاصل کرنے کے قریب قریب تھیں۔ آف وائٹ شلوار سوٹ میں بھاری بھر کم  
جوتوں کے ہمراہ بڑے رعب سے بیٹھے تھے موصوف..... آؤ ٹمینہ..... یہ میری چھوٹی بہن ہے چھوٹی۔ قطر میں رہتی ہے۔

آج ہی آئی ہے۔ شیخ صاحب نے تعارف کرایا ٹمینہ نے سلام کیا۔

آؤ جی..... خیر ناں..... پیر..... کڑی دی پھوپھی اے..... ادب ناں سلام کر اے نوں۔

بزرگ خاتون نے فی الفور سفارتی آداب کا مظاہرہ کیا۔

لڑکے نے واقعی جھک کر سلام کیا..... بلکہ پیار لینے کے لئے ان کے آگے سر بھی پیش کر دیا۔

اسی لمٹانوں آ یاں نیں۔ خبر لگی ہوگی تہا نوں۔ بزرگ خاتون نے مزید پیش قدمی کی تھی۔

جی..... بس جی دل ملن دی دیراے..... لکھاں خوشیاں نیں۔ بال خوش رہن تے فیر ہو رکی چاہی دا۔ (بچے خوش رہیں  
اور کیا چاہیے)

ٹمینہ چپ رہیں۔

تینوں لڑکیاں ایک سے سرخ گونا گئے یونیفارم میں ملبوس بڑے رشک سے ٹمینہ جیسی میم کو دیکھ رہی تھیں۔

آپ تو ہوائی جہاز میں جاتے ہو گے جی باہر ملک۔ ان میں سے ایک نے لب کشائی کی۔

ہاں..... ٹمینہ باوجود چاہنے کے یہ نہ کہہ سکیں کہ مجبوری ہے کیونکہ خود تو انہیں سکتے۔ مگر وہ بچوں سے یہ بات طرز یہ کہہ

کراخا قیات جاہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

بمشکل وہ چندہ میں منٹ بیٹھیں پھر کھانے کا بہانا کر کے اٹھ آئیں۔ شیخ صاحب بدستور لڑکے سے انٹرویو کرنے میں مصروف تھے۔

ثمینہ باہر آئیں تو صفیہ نے فوراً ان کا چہرہ دیکھا۔

کیا ہے تمہارے بھائی کا انتخاب؟ وہ بے ساختہ لہجے میں پوچھ بیٹھیں۔

چھوڑیں بھائی جان اس قصے کو..... ان کو نفاٹ کھانا کھلا کر فارغ کریں۔ وہ جلدی سے نظریں چراتی کچن میں چلی گئیں۔ کیا کر رہی ہو لڑکیو، نفاٹ کھانا کھلا کر فارغ کرو..... روٹی تیار ہے؟

جی پھوپھو سب کچھ تیار ہے۔ نالکھ نے برتن نکالتے ہوئے غور سے ان کا چہرہ دیکھا۔

کیا دیکھ رہی ہو۔ جلدی سے فارغ کر کے جان چھڑاؤ۔ وہ جھلائیں۔

جان کہاں چھوٹے گی۔ ابا جان کے اسکرینیں یہ۔ بیلا بھئی۔ عجیب پھینکی سی بھئی۔

بہت چل نکل ہو۔ میرا لحاظ کیا کرو۔ پھوپھی ساس ہوں تمہاری۔ انہوں نے اس کے سر پر چپٹ لگائی..... بیلا جھینپ کر باہر نکل گئی۔

کھانا کھاتے کھاتے رات کے نو بج گئے۔ جیسے ہی وہ قافلہ روانہ ہوا سب نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ جیسے کسی ہم سے فارغ ہوئے ہوں۔

ثمینہ نے لڑکیوں کو تائید کی کہ وہ جلد نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں چلی جائیں۔ نالکھ کاشن کے کپڑے چھینچ کر کے باہر فطری کا انتظار کر رہی تھی۔ موقع ملا تو پھوپھی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔

ثمینہ نے چٹکے سے بتایا کہ وہ احسن کے پاس سے آ رہی ہیں۔ پھر مختصر احوال بھی بتا دیا۔

بڑوں کو کچھ کرنا ہو گا نیلی۔ ورنہ مجھے تو سارا کھیل ہی بگڑنا نظر آ رہا ہے۔ سارے زمانے میں ہماری تھوٹھو ہو گی۔ ہمارے لڑکے ہی کی جلد بازی کے سبب بچی در بدر ہے۔

ہائے پھوپھو..... ایسا نہ کہیں، دعا کریں کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔

ہاں بھئی دعا تو ہر دم ہے اب یہ نیا کیس۔

پھوپھو..... یہ رشتہ سب کو تائید ہے۔ فائل ہو چکا ہے۔ وہ قطعیت سے گویا ہوئی۔

ہاں۔ مگر ابھی مرحلہ طے ہونا باقی ہے۔

اگر اباجی بگڑ گئے۔

میں نیلہ کو لے کر قطر چلی جاؤں گی۔ مگر ٹھیکہ والا قصہ دوبارہ نہیں ہو گا۔

اباجی جانے دیں گے.....؟ نالکھ اس اطلاع پر چونکی۔

جب وہ بیٹیوں کے بوجھ اور ذمہ داری کا پتا پھینک کر پانے حق میں بات منواتا چاہیں گے تو میں کہہ دوں گی کہ قطر میں ملنے والے ہیں۔ لڑکی کنویں میں پھینکنے کے بجائے میرے ساتھ کر دیں۔ وہیں کروں گی اس کا بیاہ۔

ہائے کاش ایسا ہو جائے۔ نالکھ نے جیسے دعا کی۔

ٹھیکہ باجی کے ہاں گئی تھیں آپ؟

ارے کہاں احسن کے ہاں سے فرصت نہیں ہوئی۔ واپسی میں ہوتی جاؤں گی، وہ فون کرتی رہتی ہے مجھے بچہ بہت

خوش ہوتے ہیں جب اس کا فون آتا ہے۔

میں بھی کب سے پروگرام بناری ہوں کراچی جانے کا۔ اب تو میں اپنے بھائی سے مل سکتی ہوں۔ کہہ دوں گی کہ باہر کے رشتہ داروں سے ملنے گئی تھی..... اور اگر مل بھی لی تو کیا ہوا۔

اس کی مخصوص فطری خود مری خود گرا آئی۔ اب میں پراوہ نہیں کرتی کسی کی۔

ثمینہ نے قدرے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا مگر خاموش رہیں۔

مگر ہماری تو وہ مش ہے۔ آسان سے گرا کھجور میں الٹا۔ ایک تو باہر کی مصروفیات خیر، اس بار میں پوری کوشش کروں گی عین ممکن ہے بلوآ پا آپ کے ساتھ چلیں۔ پھر میں بھی پروگرام بنالوں گی۔ بڑا لطف رہے گا۔ ٹھیکہ باجی بہت خوش ہوں گی۔

مگر پھوپھو..... ہم رہیں گے احسن بھائی کے ہاں۔

ثمینہ اس کے منصوبے سن کر مسکرانے لگیں۔

سمجھ میں نہیں آتا..... جو بات سب کو نظر آتی ہے محسوس ہوتی ہے۔ اباجی کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ آپ نے دیکھا موصوف..... کس دامادی طرے سے فروکش تھے..... کہاں بلوآ پا جیسی لطیف مزاج لڑکی کہاں وہ..... اور پھر ان کے ساتھ تو اس قدر زبانی ہوئی ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نظریں سامنے گھر کی بالکنی پر پڑ گئیں۔

ان کا تو اب خاص خیال رکھنا چاہیے۔ ورنہ مر جائیں گی پھوپھو۔

خدا نہ کرے۔ تم فکر نہ کرو..... میں جو دوڑی بھاگی پھر رہی ہوں..... اب کچھ نہیں ہو گا انشاء اللہ بھابی سے تو وہ ضد بندھے ہیں..... میں انہیں سمجھاؤں گی، تم فکر نہ کرو۔ انہوں نے اسے تسلی دی۔ باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

آگے نالکھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

چلی جاؤ گی..... آج رک جاؤ۔

نہیں مانیں گے۔ نالکھ نے رخ موڑ کر جواب دیا۔

میں کہے دیتی ہوں ثمینہ نے کہا۔

رہنے دیں پھوپھو..... آ جاؤں گی کل..... اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔ ثمینہ کو اس کا انداز عجیب لگا۔ احمر نے دروازہ کھول دیا تھا۔ باہر مرتضیٰ آتے دکھائی دیے۔ سیاہ قمیڑی پیس سوٹ میں لمبوس پواؤزن کی دلفریب مہک کے ساتھ آس پاس چھا گئے۔

ماشاء اللہ ثمینہ نے بے ساختہ دل میں کہا..... اور محبت آمیز انداز میں مسکرا کر انکو خوش کیا۔

السلام علیکم..... آپ کب آئیں۔ دوپہر تک تو اس قسم کے کوئی آچار نہ تھے۔ وہ بھی مسکرائے تھے۔

بس اس کے بعد ہی کا واقعہ ہے..... آئیے..... اندر بیٹھتے ہیں۔ وہ برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

بیٹھنے کا تو اب وقت ہی نہیں۔ نالکھ کو پک کرنے کے آیا ہوں..... سواری..... اور آپ کسی ہیں؟

ارے باہر..... بیٹے یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤ ناں صفیہ اسٹور سے لٹکس تو باہر کو سامنے موجود پایا۔

نہیں امی..... بیٹھوں گا نہیں۔ بس جلدی ہے۔ نالکھ کو بلا دیں۔ اباجی سوچکے.....؟ باہر خاصی جلدی میں تھے۔

ابھی تو نہیں سوئے..... ان کے کمرے میں چلے جاؤ بیٹا۔ میں نالکھ کو بتائی ہوں۔ ان کی دانست میں نالکھ باہر کی آمد

سے بے خبر تھی۔ باہر سر کے کمرے کی طرف بڑھے تو نائلہ پر اس اٹھائے باہر آگئی۔

”کہاں گئے.....؟ اس نے ثمنینہ سے دریافت کیا۔

بھائی صاحب کو سلام کرنے گئے ہیں۔ ماشاء اللہ باہر کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔ اچھی کارکردگی ہے تمہاری۔ ثمنینہ مسکرائیں۔

نائلہ قدرے جھینپ کر مسکرائی۔

باہر دوست بعد ہی باہر تھے۔

چلیے بیگم۔ انہوں نے نائلہ کو مخاطب کیا۔

اچھا بھو پھو..... دیکھیے..... خیال رکھیے گا۔ اگر بلو یا کے ساتھ زیادتی ہوئی تو۔

ارے نہیں بیٹا فکر نہ کرو۔ ہمارے اپنے بچے ہوتم لوگ۔

انہوں نے تسلی دی۔ وہ اور صفیہ دروازے تک اسے رخصت کرنے آئیں۔ صفیہ بھی ہر مرحلے سے فی الفور نوٹ کر شخ صاحب کی آخری بات سننا چاہتی تھیں۔ لسانی فیملی نے انہیں بری طرح دغی خلفشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر چند ثمنینہ کے وجود سے انہیں خاصی تقویت تھی۔ مگر شخ صاحب خاصا پیچیدہ معرہ تھے۔ کوئی بات ان کے بارے میں حتی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی۔

انٹرا اور راجیلہ برتن دھو رہی تھیں۔ بیلا بستر سیٹ کرتی پھر رہی تھی۔ نیلہ خاصی دیر سے دکھائی نہیں دی تھی۔ فیضان اور احمر کارڈ زخمیل رہے تھے۔

دس بجے کے قریب ثمنینہ نے خجاشخ صاحب کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ گاؤں کیے سے ٹیک لگائے، نظر کا چشمہ ناک پر لٹکائے کوئی دفتر کی فائل دیکھ رہے تھے۔

آؤ ثمنینہ..... بیٹھو..... بھئی..... بچے ٹھیک ہیں.....؟

جی..... الحمد للہ..... سب ٹھیک ہے..... آپ کیسے ہیں۔ آپ تو کبھی فون بھی نہیں کرتے۔ ایسے لگتا ہے جیسے آپ کو یاد ہی نہیں رہتا کہ میں بھی دنیا میں ہوں۔ وہ شکایتی انداز میں پولیس۔

بس بھئی..... زندگی کے بکھیرؤں میں الجھا ہوا ہوں۔ تمہاری خیر خبر ملتی رہتی ہے۔ طبیعت مطمئن رہتی ہے۔ کہ تم اپنے گھر میں خوش ہو۔ اللہ کا شکر ہے۔

اور بھئی..... یہ جو آج سہماں آئے ہوئے تھے کیا خیال ہے ان کے بارے میں..... بلا لوالا اپنی بھابی کو۔ ان کے سامنے کر لیتے ہیں بات چیت۔

چھوڑیں بھائی صاحب..... وہ قابل موضوع نہیں ہیں۔ رہن سہن، بود و باش ہر طرح سے بے جوڑ..... نیلہ ہماری بچی ہے بوجھ تو نہیں..... وہ وہاں کبھی خوش نہیں رہ سکتی۔

ہاں خیر گھر والے تو خاصے اجڑے ہیں..... مگر لڑکا تو ٹھیک ہے..... ایف اے پڑھا ہے۔ زمین جائیداد بہت ہے۔ خوشحالی ہے گھر میں۔ لڑکیوں کا کیا ہے اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی۔ ایک بھائی ہے اس کا کیا مرد ذات۔ مرضی کا مالک۔ ایک روز سیاہ سفید لڑکے کا بی ہے۔ سربراہ تو اپنے گھر کا اب بھی وہی ہے۔ ہمیں لڑکے سے سروکار ہے

شخ صاحب نے بہن کو قائل کرنے کے لئے پوری طاقت استعمال کی۔

مگر بھائی صاحب..... اتنی بہنیں ہیں ماشاء اللہ کب کب نمبر لگیں گے۔ ایک تو مخالف ماحول، دوسرے ذمہ دار یوں

میں پس کر رہے جانے کی ہماری نیلہ۔ پہلے کیا کم شکاں گئے ہیں؟

مگر تم بتاؤ..... آج کل رشتوں کے معیار بن چکے ہیں۔ میرے پاس لاکھوں کا جینر نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں مجھ پر بوجھ بھی نہ پڑے اور میری بیٹیاں خوشحال گھروں میں جائیں۔ خوشحالی بہر حال سکون کا بہت بڑا بہانا ہے..... میں اپنی بچیوں کو غریب گھرانوں میں نہیں بیا ہوں گا۔ غربت انسان کو کبھی خوش نہیں ہونے دیتی یہ میرا تجربہ ہے۔

مگر بھائی صاحب..... دولت..... تمام خوشیوں کی بنیاد بھی نہیں ہوتی۔ دل کھلانے کی ذمہ داریاں ہوتی..... یہ نیلہ پر ظلم ہوگا۔ ثمنینہ نے سمجھایا۔

ٹھیکہ اور نائلہ لکاؤں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں..... یہ بھی بہل جانے کی۔ وہ تو..... حتیٰ فیصلہ کے بیٹھے تھے۔ اچھا اگر اس سے بہتر رشتہ نیلہ کو مل جائے؟ ثمنینہ کو اب الجھنے سے ڈر سا لگنے لگا تھا۔ کیونکہ انہیں زیادہ سننے کی عادت نہیں تھی۔

بسم اللہ..... لے آؤ..... انہوں نے چشمہ اتار کر نوڈ کیا اور میز پر رکھ دیا۔

وہاں قطر میں میرے بہت سے ملنے والے ہیں جو تیس تیس سالوں سے وہیں مقیم ہیں اور اپنے لڑکوں کے لئے پاکستان کی لڑکیاں تلاش کرتے ہیں۔ مگر اپنے دھندوں میں اس طرح جھنسے ہوئے ہیں کہ میں انہیں پاکستان چھاننے کا مشورہ نہیں دے سکتی۔ سوچ رہی ہوں نیلہ کو ڈوٹ ویز اپرا اپنے ساتھ لے جاؤں ماشاء اللہ ہر طرح سے اچھی ہے۔ ہو جائے گا مسئلہ حل۔ ثمنینہ..... نیلہ کی جان چھڑانے کے لئے ہر طرح کا قدم اٹھانے کو تیار تھیں۔

ٹھیکہ کا سانحہ۔ ہر شخص کو اپنی جگہ جتنا دکھ چکا تھا۔

ج بھائی صاحب یقین کریں..... بڑے اچھے اچھے لوگ ہیں..... ہمارا کام ہے ہمیں ہی مشکل اٹھا کر آسانی حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ بس آپ منع کر دیجیے۔ ان لوگوں کو اور نیلہ کو میرے ساتھ بھیج دیجیے..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انشاء اللہ۔

شخ صاحب ایک دم چپ ہو گئے۔ داہے، درے، منحنے، قدے بہن کا خلوص ہر قسم کے شک سے مبرا ہو کر ثابت ہو چکا تھا۔ دوسرے بھائی بہنوں میں سب سے چوٹی ہونے کے ناتے ایک خصوصی اہمیت ان کو ہمیشہ سے حاصل تھی..... صفیہ کی طرح بہن سے ضد کا تعلق بھی کبھی نہیں رہا تھا۔

ٹھیک ہے۔ کرو کھو اپنی سی کوشش..... ان کی حالت ہتھیار ڈالنے والی تھی..... گویا..... وہ بھی اس رشتے کو مجبوری ہی میں قبول کر رہے تھے۔

ثمنینہ ایک سینکڑ وہاں نہیں نکلیں..... اور خوشخبری سنانے باہر نکل آئیں۔

ان کی کامیابی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ ان کی بھاگ دوڑ بے کار نہیں گئی تھی۔

بس بھابی جان آپ نیلہ کے کاغذات کی تیاری شروع کریں۔ نیلہ میرے ساتھ جائے گی۔ کسی طرح یہاں سے تو نکلے۔ جان بچائیں اس کی۔ آگے جو ہوگا۔ اللہ مالک ہے۔

صفیہ کو طوفان ٹل جانے کا یقین دیر تک نہ آیا..... کیا واقعی انہیں زندگی میں اس محاذ پر فتح ہو چکی ہے۔ دیر تک بے یقینی کی کیفیت ان پر طاری رہی۔

فی الحال کچھ دنوں کے لئے میں اسے لے کر کراچی احسن کے پاس چلی جاؤں گی۔ نائلہ کہہ رہی تھی۔ وہ بھی احسن کے پاس جانا چاہ رہی ہے۔ بھائی صاحب سے کہہ دیں گے، ٹھیکہ کے ہاں جا رہے ہیں۔ اس دوران کاغذی کارروائی

عمل ہو جائے گی۔ کچھ اس کا ذہن بھی ادھر ادھر ہوگا۔ سوکھ کر کاٹنا ہو رہی ہے..... کیوں بھابی جان.....؟  
ہم تمہارے احسانات کا بدلہ تو کبھی نہ اتار سکیں گے، تمہیں اس کا صلہ تو جسہیں اللہ ہی دے گا۔ تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو  
شیخ صاحب کی زیادتی کا ہر داغ مٹنے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

میری اچھی بھابی، جب آپ خود اتنی اچھی ہیں کہ ہم آپ سے محبت کرنے پر مجبور ہیں تو اس میں ہمارا کریڈٹ کیا؟  
ثمینہ ان کے گلے لگ گئی تھیں۔

”نکل ناکہ کی طرف جاؤں گی تاکہ کراچی کا پردہ گرام بنایا جائے۔ باہر مرتضیٰ کو بھی تو رام کرنا ہے۔ کہہ رہی تھی اکیلے  
آنے جانے نہیں دیتے کہیں بھی۔“

بعض مردوں کی عادت ہے۔ دیئے تو بہت اچھا ہے ماشاء اللہ۔ صفیہ نے تعریف کی۔

اچھا ہے..... ہاں چلی جاؤ تم لوگ۔ شہوار اور شکیلہ بہت خوش ہوں گی۔ میں خاصا وقت صرف احسن کے ساتھ گزارنا  
چاہتی ہوں بھابی جان..... بات یہ ہے۔



تاروں کی آنکھ سے پھیننے والا خاموش آنسو۔

پھولوں کے دامن سے اپنے حسن و دلکشی کی بھرپور داد لیتا ہے۔

غم حسین بھی ہوا کرتا ہے۔

جب غم سے دوستی ہو جاتی ہے۔

جب انسان کو موت دور اور مشکل دکھائی دے تو اسے غم کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی ہوتے ہیں۔

بڑی قوت ہوتی ہے دکھ میں.....

کشاکش انسان کی برداشت کی استعداد بڑھاتی ہے۔

غم حد سے بڑھ جائے تو انسان کو چپ رہنے کی عادت ہونے لگتی ہے۔

پھر اس کی بردباری اور حلیمی کے اعزاز کو داد تحسین سے نوازا جاتا ہے۔ آنسو شبنم کہلاتا ہے۔ بعض اوقات دکھ انسان دھو

پکا کر بے حد دلکش بنا دیتا ہے۔

وہ قدر آور، معتبر، مستحکم سادہ دکھائی دے لگتا ہے۔

اسی لئے وہ ثمینہ کو پہلے سے زیادہ دلکش، بارعب اور پردہ دار دکھائی دی تھی۔ انہوں نے پہلی فرصت میں اسے حقیقت

سے آگاہ کیا تھا۔

اسے بتا دیا تھا کہ فی الحال ان کے ملنے والوں میں کوئی اس کے چوڑا نپ کا نہیں ہے۔ مگر اللہ بہت مہربان ہے۔ وہ

اس کی جان چھڑانے کے لئے یہ سب کہنے پر مجبور ہوئیں۔ اور اسے یہاں سے نکال لے جانے کا راستہ بنایا ہے۔ مگر وہ اس

کے دل سے کھیلنا نہیں چاہتیں۔ نبیلہ ان کے جج پر مسکرا دی تھی۔





تو آپ کی طبیعت خراب ہے۔ ادھر کام کا رٹ ہے اس پر سے آپ کی غیر حاضری۔ پروڈکشن مینجیر سے معلوم کیا انہوں نے بتایا کوئی اطلاع نہیں۔ بڑی حیرانی ہوئی۔ بی بی یہ تو بہت ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔ ایک دن کی غیر حاضری سے کام پر جواز پڑتا ہے ہم ایک دن پیچھے رہ جاتے ہیں۔ سپروائزر کے بغیر کام ادھورا رہتا ہے۔ دراصل آپ سے سیکرٹری سپروائزر ہیں وہ پہلے ہی لوگ لیو پر ہیں۔ پھر آپ نے فون نہ بھی غالباً نہیں دیا۔

اسد نے اس کے سر ہانے رکھے ٹیلی فون سیٹ پر نظر ڈال کر گویا اپنی آمد کی وجہ بیان کی۔

آپ تو بے حد بیار نظر آ رہی ہیں۔ اسد نے اس کے ہنسنے ہوئے زرد چہرے پر نظر ڈال کر کہا تھا۔

جی! اس کی آنکھیں بھرا آئیں۔

پھر بھی اس بیماری کا کوئی نام تو ہوگا۔ چیک اپ کرایا؟ اسد آئے تو خاصے تلخ موز میں تھے مگر اس کی اتنی ہی صورت ان کا سارا اہمال ٹھنڈا کر گئی تھی۔

جی۔ ڈاکٹر آئے تھے۔ شہوار نے بادل خواستہ جواب دیا تھا۔

اکرام صاحب آج آپ کو REPLACE کر رہے ہیں۔ انہیں کی تکلیف دیکھ کر اس وقت چلا آیا ہوں۔ سپر سپروائزر کو ہم ایمر جنسی کال بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان کا پریکٹس پراہم ہے۔ آپ ہمیں جواب دے دیجیے تاکہ ہم اگلا عمل مرتب کر سکیں۔

میں ملازمت چھوڑ تو نہیں رہی سر۔ یہ تو میری ضرورت ہے انشاء اللہ میں کل حاضر ہو جاؤں گی۔

نفسے کا شور و غل ہنوز جاری تھا۔ اسد نے ہاتھ بڑھا کر سوچ آف کر دیا۔ آپ کی اجازت سے۔ انہوں بند کر دیا۔

ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

اودہ..... پلیز سر۔ وہ جیسے اس بداخلاقی پر شرمندہ ہو گئی تھی۔

اسد نے ایک طائرانہ نظر کرے میں دوڑائی۔ سردیوں کے لئے ہیر، گرمیوں کے لئے اے، سی، بزم وینز کا رہٹ۔ سادہ ڈیزائن کا مگر قیمتی بیڈ۔ ون بیس صوفہ سیٹ کا رنڈیبلو۔ فینسی لائٹس۔ گولڈن فریم کا خوبصورت وال کلاک گولڈن فریم کی ہی ویسوزیز..... گولڈن منٹش فریم میں اٹار جڈ گراف سیاہ ڈزموٹ اور سرخ ٹائی میں احسن کا گلوزاپ زندگی سے بھر پور آنکھیں جیسے فریم ہی میں سے ہمکا م تھیں۔ اچھا خاصا پرتیش معیار زندگی تھا۔ پھر یہ بے چاری..... اسد نے بھرت اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

یہ..... انہوں نے تصویر کی سمت اشارہ کیا۔

شہوار نے قدرے گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔

احسن ہیں۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

آپ کے شوہر ناں؟

شہوار ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ مگر اسانس لے کر جیسے ناگواری سے بولی۔ جی۔

مجھے یہاں تک تو چھوڑ گئے۔

آپ کوئی اور بات کریں سر۔ اس نے تلخی سے کہا۔

ابھی تک جھگڑا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں۔ دیکھئے بی بی۔

السلام علیکم جناب۔ دفعتاً ڈاکٹر مسعود نے اندر قدم رکھا تھا۔

ڈاکٹر مسعود ہیں سر۔ شہوار اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر ڈاکٹر مسعود کے پیچھے دیکھا تھا۔ احسن ان کے ہمراہ تھا۔

بی طبیعت ہے بھالی؟ احسن بتا رہا تھا کہ آپ نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔

کھانے سے بھی نہیں مرتی۔ "وہ جیسے چڑ کر بولی۔

ڈاکٹر مسعود اسد کے برابر میں بیٹھ گئے۔

ایران لگا گیا ہے آپ نے؟ اسد ڈاکٹر مسعود کی سمت متوجہ ہوئے۔

انجینی یا خود کشی۔ کچھ بھی کہہ لیجیے۔ ڈاکٹر مسعود نے اپنا پنڈورا بکس کھول دیا۔

ایک اپ ویک اپ نہیں کر رہی۔ ٹھیک ہوں بس۔

بی بی لی تو چیک کرالیں۔ بہت لوہے۔ انہیں تو جیسے اپنی ذمہ داری پوری کرنا تھی۔

نہیں کرانا چیک۔ وہ پھر کر۔

بازر شہوار۔ یہ غلط بات ہے۔ ایسے نہیں کرتے۔ اسد کو مداخلت کرتا پڑی حالانکہ وہ جانے کے ارادے سے اٹھ ہوئے تھے۔

ڈاکٹر مسعود کو اچانک ان سے تعارف کا دھیان آیا۔

ارے آئیں۔ میرا مطلب ہے میرے آئیں۔ در شہوار کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا تو تعارف کرانے میں

ڈاکٹر واقعی الجھ گئے۔

ان کے ہاں ملازمت کرتی ہوں۔ بلکہ چند دن ہی ہوئے ہیں کرتے ہوئے۔

اپنا جیک اپ کرایے سے در شہوار اور اپنے تازہ ترین فیصلے سے مجھے مطلع کیجیے۔ اسد نے جانے کے لئے قدم

نہیں سر۔ پلیز آپ تشریف رکھیے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں بلکہ اگر آپ کافی پسند کرتے ہوں تو۔

ہاریٹ کیجیے۔ چائے سے زیادہ ضرورت اس وقت آپ کی اور آپ کی محب یابی کی ہے۔ وہ سادگی سے

بہ۔

نانے اسی دم اندر قدم رکھا تھا۔ شہوار کی نظر بلا ارادہ اس کی سمت اٹھی تھی۔ وہ بے حد روڈ اور برہم دکھائی دے رہا تھا۔

ماہر پلیز۔ آپ بیٹھیے۔ وہ جیسے احسن کو نظر انداز کرتی ان کی سمت بڑھی۔

ٹھیک ہو جائیں پھر مجھے مدعو کر کے چائے پلائیں۔ مجھے آپ کے ہاں چائے پی کر بے حد خوشی ہوگی۔

احسن انہیں بری طرح نظر انداز کر کے ڈاکٹر مسعود سے گفتگو کر رہا تھا۔

لے آگے بڑھ کر خود ہی احسن اور ڈاکٹر مسعود سے ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔

ارے کھا جانے والی نظروں سے احسن کی سمت دیکھا۔

انہیں آمیز رویہ۔ پھر وہ کیوں چائے پیتے یہاں۔

بہ بھالی۔

لے کھاناں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کسی چیک اپ کی ضرورت نہیں۔ پلیز آپ زحمت نہ کریں۔

یہ میرے ملنے والوں سے بے رخی سے ملیں گے تو میں ان کے ملنے والوں سے روڈی ملوں گی۔ اس نے مجھ سے مسعود سے احسن کے رویے کا انتقام لیا۔ اور چادر لپیٹ کر باہر چلی گئی۔ وہ احسن کی رقیبانہ سوچ تک پہنچنے سے قاصر تھی۔ اسی لئے اس کے انداز میں اس وجہ لا پر دانی تھی۔

حالا نکہ اسی رقابت نے اسے ان حالوں تک پہنچایا تھا۔

یار اتنے دل دروندے گزرتے تھے۔ اور اب یہ وقت ایک ہی قابو میں نہیں۔ ڈاکٹر مسعود نے احسن کو جیسے چھڑا تھا ہم ان سے کہیں گے اور نمبر حاصل کر سکتی ہوں تو ضرور کریں ہم انہیں انعام دیں گے۔ انہوں نے اس کی بات دیکھا۔ شرارت ان کے چہرے پر قصاں تھی۔

احسن جواباً مسکرا دیا۔

یہ گریں مار کر ہیں اس کے ہماری مہربانی کی وجہ سے اس سے زیادہ کی امید نہ رکھنا، ڈاکٹر مسعود کیونکہ راز دار ہو تھے۔ اس لئے دونوں کی گفتگو کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ مشکل ہے کہ جو آپ کو اس محاذ پر کامیابی ہو۔ ماشاء اللہ کیا چاہا ہے کیا بد ہے۔ آگے سے نکل کر چلی گئیں۔ اپنی بات کے اختتام پر ڈاکٹر مسعود نے خود ہی قہقہہ لگایا۔

زیادہ چڑھاؤ نہیں اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سرگرم لگا لگا۔ نیم وا آنکھوں سے دھواں چھوڑتے ہوئے سامنے دیکھ رہا تھا۔

یار بھائی کا بلڈ پریشر نارمل نہیں ہے۔ تمہیں۔

اس کا دماغ بھی نارمل نہیں ہے بی ایچ ایم۔ احسن نے قدرے ترشی سے بات کاٹی۔

اس کے ذمہ دار تم ہو۔ ڈاکٹر مسعود نے قطعاً انداز میں کہا تھا۔

تم بھی حریفوں کی صف میں..... خیر نئی بات نہیں۔ وہ ہم مسکرایا۔

چائے تو پلاؤ یار۔ کلینک میں پینے لگاؤ تو وہاں سے بھگا لائے۔ اور اب اتنی دیر ہو گئی۔

کہہ دیتے اپنی بھائی سے۔ وہ قدرے شریر ہوا۔

ابھی تو وہ پوری تمہاری نہیں۔ دیکھتے نہیں جب میں انہیں بھائی کہتا ہوں تو وہ کتنی ناراضگی سے مجھے گھورتی ہیں۔

یہ ان کی آنکھوں کا مستقل ایجنڈا ہو گیا ہے۔ وہ ہنس دیا۔

ایسا کرو تم باجی کہنا شروع کر دو۔ اس نے مشورہ دیا۔

تاکہ وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے باہر نکال دیں۔ ڈاکٹر مسعود نے غلط مشورہ دینے پر جیسے خبر لی۔

ہے تو خال۔ ایسا کر بھی سکتی ہے۔ اس نے گہرا کش لیا۔ اور ڈھیر سا رولہ حواں اپنے سامنے پھیلا لیا۔

اب یہ تو تم جانو..... مجھے تو چائے چاہیے۔

احسن نے ایش ٹرے میں ٹکڑا مسلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بھائی سے مت بیوانا۔

ابھی میرے پچھلے زخم ہرے ہیں۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے شرارت سے آنکھ ماری۔

میرا مطلب ہے وہ ریفیضہ ہیں۔ ڈاکٹر کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ریفیضہ کو تکلیف دے۔ کچھ سمجھے؟ ڈاکٹر نے وضاحت

مریضہ کو بیچ دوں چیک اپ کے لئے؟ احسن نے پوچھا۔

اتنی دیر میں کے ٹو مر ہو جائے گا اخبار میں تصویر لگے گی وہ علیحدہ۔

ڈاکٹر مسعود نے جیسے چڑایا۔ مطلب یہ تھا کہ رضا مند نہیں کر سکتے۔

شرشپ کا عادی ہوں ورنہ دیتا میں تمہیں ٹھیک ٹھاک جواب۔ احسن باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر مسعود کا جاندار قہقہہ لادرج میں بیٹھی شہوار نے بھی سنا تھا۔

جن تہا لادرج میں تھا صوفی پر نیم دراز بڑی ضخیم قسم کی فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ایٹ اور ٹوسٹ کاؤنٹر کے وہ اس سرطے سے بھی فارغ ہو چکا تھا۔

کال بیل بہت اہتمام سے بجی تھی۔

اس نے دال کلاک کی سمت دیکھا اٹھ بچ رہے تھے۔

ڈاکٹر مسعود آچکے پھول بی بی اس وقت کبھی نہیں آئی۔

وہ شاید بھو پھو اور فیضی آگئے ہوں۔ اس خیال کے ساتھ وہ تیزی سے اٹھا تھا۔

بیل کھولا تو ٹیکٹ شش بدرہ سارہ گیا۔ سامنے نیلہ کھڑی تھی۔

لو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

سلام علیکم۔ ہم بھی موجود ہیں صف سرفروشاں میں۔ ٹانگہ کی شوخ آواز بائیں طرف سے ابھری۔

حسن نے ہٹ کر جیسے انہیں راستہ دیا۔ اس کی حیرت میں کوئی کمی نہیں تھی۔

حالی کی نظر سڑک کے بائیں جانب اٹھی۔ ایک بڑا ڈیسینٹ سائندہ ٹیکسی ڈرائیور سے ٹٹ رہا تھا پھر اسے شمیمہ نظر

پاروڑی سے سامان اتارنا فیضان بھی۔

”وہ۔“

بلداور ٹانگہ اس کے ہٹتے ہی اندر چلی آئی تھیں۔ اور دائیں بائیں احسن سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی تھیں۔

وان کی پشت تھپتھپاتے ہوئے انہیں خاموش کرانے کی سعی میں مصروف ہو گیا تھا۔

’لا حول ولا قوہ‘ تم خوشی میں بھی اتار دیتی ہو۔ شمیمہ نے دونوں کو احسن سے الگ کیا۔

’السلام علیکم بھو بھو۔‘

ان کی سوالیہ نظریں فیضان کے ساتھ کھڑے اجنبی کی طرف تھیں۔

نیم السلام۔ یہ احسن ہیں باہر۔ وہ چہرہ موڑ کر باہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جو اسی قسم کی باضابطہ کارروائی کے منتظر تھے۔

باہر مرتضیٰ ہیں۔ احسن۔

اس سے تو احسن واقف تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے باہر کو سینے سے لگایا۔ اس شدت و گرم جوشی کو باہر

نے بھی بہت واضح محسوس کیا تھا۔ اس میل ملاپ کے دوران فیضان دوست کہیں اور دودھ دیکھ اندر پہنچا چکا تھا۔

اسے بھی فیضی تم کہاں ہو دو دو دو۔ احسن نے مخاطب کیا۔

آپ لفٹ ہی نہیں کر رہے۔ حالانکہ ہم بھی وہی ہیں جو باہر بھائی ہیں۔ فیضی نے شکوہ کیا۔

بکڑو دو رات قہقہہ پڑا تھا۔

بت پھار تم ہے یہ۔ شمیمہ نے محبت سے بیٹے کو گھورا۔

اب باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے تھے۔

بھابی جان کہاں ہیں؟ نالکھ نے شہوار کی غیر موجودگی فوراً نوٹ کی۔  
خیریت۔ اتنی جلدی سو گئی؟ ثمنینہ نے جیسے از خود اندازہ لگایا تھا۔  
احسن نے ایک اچھتی نظر بابر مرتضیٰ کی سمت ڈالی۔  
طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے۔

شہوار کا رپٹ پر تکیہ رکھے بزرگ کی چادر سر سے پاؤں تک اوڑھے بالکل چت لیٹی تھی۔ سانس کی جنبش تک نہیں ہو رہی تھی۔

تنبوں کے دل جیسے دھک سے رہ گئے۔

ثمنینہ نے بے تابانہ انداز میں اس کے چہرے کی جانب سے چادر ہٹائی تھی۔

اور نیم خواب سی شہوار نے پٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔

اوہ۔ ثمنینہ نے گہرا سانس لیا۔

اسلام علیکم پھوپھو۔ اس کی آواز بہت نحیف سی تھی۔

وعلیکم السلام۔ خوش رہو۔ دیکھو کون کون تمہارے پاس آیا ہے۔

وہ جیسے اس کے اندر امنگ پیدا کرنے کی خواہاں تھیں جب ہی اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ بہت اچھا لے رہی تھیں۔

شہوار کو جیسے کرفٹ لگا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے نالکھ اور نبیلہ کی سمت دیکھ رہی تھی۔

بھابی جان۔ نالکھ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی۔

نبیلہ۔ بلو۔ تہ۔ تم۔ اسے جیسے حیرانی کا دورہ پڑ چکا تھا۔

سر سے پاؤں تک۔ ہم وہ شوخی ہے اسے گدگد کر بولی۔

مگر..... وہ خالو جان..... وہ ہنوز حیران پریشان تھی۔

ان کے تصور میں ہم اس وقت شکلیہ باہمی کے ہاں ہیں۔ نبیلہ نے بھی لب کشائی کی۔

اوہ۔ شہوار نے گہرا سانس لیا۔ وہ سب سمجھ گئی تھی۔

اگر ان کو پتا چل گیا۔

چل جائے۔ اب تو آ ہی گئے ہیں۔ نالکھ نے قدرے خود سری اور بے خوفی سے شانے اچکا کر جواب دیا۔

ثمنینہ بہت غور سے شہوار کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

زردی کھنڈی ہوئی اور خشک ہونٹ۔ بے آبادی آنکھیں اور گہرے حلقے۔

یہ کیا حالت بنا رکھی ہے جان۔ انہیں جیسے اس پر ترس آیا۔ اس کا سر سینے سے لگا کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

کتنے اچھے ہیں آپ لوگ۔ تنہائی کے احساس سے گاہے گاہے دور کرتے رہتے ہیں۔ شہوار کی آنکھیں بھرا آئیں۔

کیوں احسن بھائی نہیں ہیں۔ نالکھ نے شوخی سے چھیڑا۔

شہوار کا دل بھر آیا۔

یا الہی لوگوں کو حقیقت پڑھنے کا ہنر کیوں نہیں آتا؟

مجھے تو کچھ اور پکڑ دکھائی دیتا ہے۔ ثمنینہ نے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

شہوار نے الجھ کر ان کی سمت دیکھا۔

جن کی فیملی میں اضافہ ہونے والا تو نہیں؟

نالکھ شرارت سے کھکاری۔

نبیلہ نے ثمنینہ کے پاؤں کا انگوٹھا دبا کر جیسے انہیں متوجہ کیا۔

ثمنینہ نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ احسن ان کے متوجہ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ انہیں اس کی آمد کا پتا ہی نہ چل سکا۔  
یہ اس درجہ تجویں۔

میں ابھی آتا ہوں دس پندرہ منٹ میں۔ آپ پلیز بابر کو بھی یہیں بلا لیں۔ وہ یہ کہہ کر فوراً لپٹ گیا تھا۔

باؤنبلی۔ بابر کو اور فیضی کو یہیں لے آؤ۔ تمہاری اتنی فکر لگی ہوئی تھی کہ صرف دودن رکی ہوں اور تیسرے دن پھر یہاں

کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اگر احسن نے کچھ کہا ہے تو بتاؤ۔ پھر تم دیکھنا ثمنینہ نے اس کی دل جوئی کی۔

بس سب کچھ دیکھ لیا ہے پھوپھو۔ اگر میری قسمت ہی خراب ہے تو آپ لوگ کیا کر سکتے ہیں؟

وہ قدرے تلخی سے بولی۔

لذت کرے کیوں ہے تمہاری قسمت خراب؟ مشکلیں تو آتی ہی جانے کے لئے ہیں۔ بے وقوف! چلو اٹھو۔ نہاؤ دھوؤ،  
بے بدلو۔ شامیاش۔

اٹھے بھابی جان۔ ہم آپ کے گھر آئے ہیں اور آپ ہیں کہ۔ ایسے ہوتے ہیں میزبان؟

نالکھ نے بھی اس کا ہاتھ تمام کر معنوی خشکی سے کہا۔

پٹے اٹھیے۔ کوئی بخار و خار بھی نہیں ہے آپ کو۔ صرف جدید دور کی جدید بیماری یعنی ڈپریشن ہے۔ آپ نہادھو کر

اوجائیں۔ پھر احسن بھائی سے کہیں گے کہ آپ کو لاگت ڈرائیو پر لے جائیں۔ ہم چونکہ تھکے ہوئے ہیں اس لئے

اے سوئیں گے۔ پھر صبح سے باتیں شروع کریں گے۔

نالکھ نے۔ ثمنینہ اور نبیلہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔ شہوار بھی ہنسنا مسکرائی۔

پٹے میں آپ کے کپڑے پر لیس کرتی ہوں آپ پانی سے دودھ ہاتھ کریں۔

ٹو جاؤ شہوار۔

لکھ قدر و حشمت ہو رہی ہے آپ کا یہ حال دیکھ کر۔ سولہ سٹکار تو آپ نے کبھی نہیں کیے مگر خوش لباسی میں تو مشہور

نالکھ نے تو جیسے اسکا یا۔

لالٹھ کھڑی ہوئی۔

نالکھ وارڈ روپ کھولی کر جمنا کتنے لگی۔ ثمنینہ اور نبیلہ بچے سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

ایک۔ آپ کے اور احسن بھائی کے یہی مشترکہ سوٹ ہیں؟

نالکھ نے وارڈ روپ کے اندر سر گھسا رکھا تھا۔

گھر سے کپڑے یہاں نہیں ہیں دوسرے کمرے میں ہیں۔ میں اس طرف غسل کر کے آتی ہوں۔

اوپر پاک سے باہر نکل گئی۔

الکھ لگ بیڈروم دونوں کے۔ ثمنینہ نے کچھ اس انداز میں کہا کہ نالکھ خاک نہیں سمجھی۔

نالکھ پر اگھر ہے۔ چار پانچ جیٹھ۔ چھ سات لوٹے لپاڑے دیور۔ دو چار کنواری نندیں۔ ذاتی ساس، بچیا ساس،

وہ بے چاری تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ یہاں وہاں آزاد دندناتے پھرتے ہو۔ کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔ کوئی لینے والا نہیں۔

جی ہاں۔ ویسے یہ جتنی بے چاری ہے۔ اتنا ہی بے چارہ میں بھی ہوں۔ چھوڑے اس بات کو آئیے کھانا کھاتے ہیں۔ بہت چھوڑ دیا۔ سارے خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے۔ جس کے سامنے جاؤ وہ بھی ذکر جھپڑ دیتا ہے۔ ذرا ہوش کے بالا اپنی ہی جائز منکوحہ کو سب کے سامنے بجرمہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

یہ سراسر مجھ پر الزام ہے۔ میں تو سب سے زیادہ مظلوم ہوں۔ جی بھر کر الو بنایا گیا ہوں۔ خیر چھوڑیں پھو پھو۔ دیکھیے مے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ وہ باہر اور فیضی پور ہو رہے ہوں گے۔ سوچتے ہوں گے خدا جانے کون سا گرین بلیو بن جان کر رہے ہیں۔ پلیز۔ سچ پھر اس کے بعد جو بھی آپ بات کریں گی اس کا جواب دوں گا۔ پھر جو آپ کی مرضی آئے میرے ساتھ سلوک کیجیے گا۔

ثمینہ اس کے انداز پر پھر بچ نکلیں۔ نانکھ اور نبیلہ دوران گفتگو باہر چلی گئی تھیں۔

شہوار بال بنا کر تم بھی آ جاؤ۔ دیر نہ لگانا۔

جی وہ اپنے دراز بالوں میں الجھی قدرے کوفت بھرے انداز میں جی بولی تھی مگر آواز اتنی آہستہ تھی۔ کہ ثمینہ اس کے رچھاؤ کو محسوس نہ کر سکتی تھی۔

شہوار کے ذہن کے پردے پر ماضی کے وہ خوبصورت نقوش اجاگر ہونے لگے تھے جن کا نتیجہ۔ آج کے دکھ تھے۔ یہ یقین ہی نہیں آتا تھا۔ یہ وہی احسن ہے۔

چھوٹی خالہ ہمیشہ ہی سے ہنگامہ پرور قسم کی شخصیت تھیں۔

زندگی میں بھر پور حصہ لینے والی۔

رجب میں ان ہاں میلاد اقرآن خوانی۔ شعبان میں بڑے پیمانے پر نیاز فاتحہ۔ رمضان میں روزوں کا بھر پور مقام والترام۔ الوداع کا نیا جوڑا۔ گھر کی سجادت غرابا کے لئے اظفار دکھانے کا انتظام۔ حتیٰ کہ زکوٰۃ کی تقسیم کی ذمہ داری بھی لائی تھیں۔ خود دے کر آتیں۔ شب قدر کا اہتمام ہوتا۔ اپنی بھانجیاں، بھتیجیاں بلا بھیجتیں۔ کہ اظفار و حرم میں کسی تقریب کا لگان ہوتا۔

پھر چاند رات کا اہتمام۔ عید کی تیاری۔ عید کی شب وہ اپنے ہاں ضیافت کا اہتمام کرتیں۔

گر میاں آئیں تو حلیمہ کی دعوت۔

سردیاں ہیں تو پائے پک رہے ہیں۔ وہ شور و غل جتنا جیسے شادی بیاہ کی تقریب ہو۔ گاجر کے حلوے اور پائے کی ادا کا واقعی سب کو انتظار ہوتا تھا۔ موسم کی ڈش اور ہنسی مسکراتی گرم جوش میزبان۔ سب کا بہت دل لگتا تھا۔ ان کے ہاں ان کے کسی بچے نہ کوئی کامیابی حاصل کی تو قرآن خوانی اور پارٹی لازمی۔ میاں کی ترقی ہوئی تو ان کے دوستوں کی ادا۔ حتیٰ کہ کوئی دل پسند سیاسی لیڈر چل بسا یا پار ہو گیا تو ایصال ثواب یا صحت یابی کی دعا کے لئے قرآن خوانی ساس سر اور ماں باپ کی برسی کی تاریخیں وہ کبھی نہیں بھولتی تھیں۔

اس قدر پرور پتی گھر میں سب ہی کا دل لگتا تھا۔

دعوت خواہ میاں کے دوستوں کی ہو، بھانجیاں و بھتیجیاں ضرور بلوائی جاتیں خود ان کے جلو میں ہنسی مسکراتی پھرتیں۔

کوئی ان کی زندہ دلی پر تبصرہ کرتا تو ان کی مرحومہ والدہ فورا ٹوک دیتی تھیں۔

نانی ساس، پھر اسی حساب سے سر بنو سر بے میاں کے کرے سے نکلیں گی۔ تو کس قدر شرم آئے گی۔ سب دیکھ گئے۔ کچھ سمجھیں کہ نہیں؟

ثمینہ نے قدرے چڑ کر نانکھ سے دریافت کیا تھا۔

نبیلہ ان کی بات پر قدرے جھنجھپ کر ایک اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔

کیا مطلب؟ نانکھ کو جیسے جھٹکا لگا۔

بہی لائی ہوں تمہیں دکھانے۔ یہ ہو رہا ہے۔ یہاں

مگر اس کا انجام کیا ہوگا۔ پھو پھو؟ نانکھ جیسے یکدم خوفزدہ ہو گئی۔

بات کروں گی ناں احسن سے پوچھوں گی جتنی خوشی دی تھی سود کے ساتھ واپس لو گے؟ اور سنو اتنی آسانی سے تمہیں ڈالوں گی۔ یہ کیا دوسرا جیم بھائی تیار ہو رہا ہے۔ لڑکی خوار ہو گئی ہے۔ بجائے اس کے کہ باپ کے الزامات کو ثابت کر کے دکھاتا۔ اثبات کر رہا ہے کہ جو باحق بجانب ہوا۔ دماغ ٹھکانے لگا دوں گی میں۔ تم دیکھنا ثمینہ کوچ غصہ آ گیا تھا۔

نانکھ اور نبیلہ چپ سی ہو گئیں۔

میں منٹ سے کچھ زائد وقت گزرا تھا کہ شہوار کیلے بال تولیے میں لپیٹے ان کے پاس آ گئی۔ زرد جدید اسٹائل ملبوس میں وہ پھٹکی پھٹکی ٹشمن سے بڑی بیماری لگ رہی تھی۔ اس نے اندر آ کر تولیہ شانوں پر پھیلا کر بال نکھیر لئے۔ دراز میں سے نیل کڑ نکال کر ناخن کاٹنے لگی۔

نبیلہ نے اپنے ہاتھ کی ساری شیشے کی چوڑیاں اتاریں اور قریب آ کر اس کا ہاتھ تمام کر چڑھانے لگی۔

ارے۔ رہنے دو ناں۔ سچ مجھے تو اس قسم کا کوئی شوق نہیں ہے۔ یقین کرو اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

آپ بھابی ہیں ہماری۔ وہاں ہمارے پاس ہوتیں ناں تو ہر وقت سجاتے۔ نبیلہ نے دوبارہ اس کا ہاتھ تمام کرنا کاروائی شروع کر دی۔

لوگ مزاروں پر پھول چڑھایا ہی کرتے ہیں۔ وہ ہر جہت مگر زہر خنداں ہو کر بولی تھی۔

شٹ اپ شہوار۔ خبردار آئندہ ایسی کوئی بات کی۔ ثمینہ نے اسے ڈانٹا۔

نبیلی۔ معاذ وازہ کھول کر احسن اندر داخل ہوا۔

جی بھائی جان۔ نانکھ فورا متوجہ ہو کر اٹھ کھڑی ہو گئی۔

وہ کھانا لے آئی ہیں۔ ویسے تو گرم ہے مگر دیکھو۔ اب بھی تم لوگ ہی کرو گے یہ سب۔

ظاہر ہے گھر والے تو ناکارہ بنا کر رکھ دیے ہیں۔ نہیں بنائے تو کوششیں جاری ہیں۔ ہم تمہارے پاس کھانے نہیں آتے۔ تعلق و قریبی رشتے کی ذوریان کسے آتے ہیں۔ باغیوں کی مہانداری خوش نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی ذات ہے۔ ثمینہ نے ناراض انداز میں اس کی بات کاٹ دی تھی۔

توبہ۔ توبہ۔ پھو پھو۔ اتنی ناراضگی۔ احسن نے انہیں شانوں سے تمام لیا۔

چھوڑو۔ یہ دکھاؤ۔ اکتنا سمجھا کر گئی تھی۔ یہ حشر کر رکھا ہے تم نے بچی کا؟ ثمینہ بدستور خنکی سے گویا ہوئیں اور شانوں

اس کے ہاتھ ہٹا دیے۔

اور جو بچی نے میرا حشر کیا ہوا ہے۔ اس نے آئینے پر نظر ڈال کر خاصی شہیدگی سے کہا۔



مہر اجانی رشین لیکن کا سوٹ پہنے بہت دلفریب سی نظر آ رہی تھی۔ کئے ہوئے بال کمر تک آ گئے تھے۔  
 احسن کو تو اس کی وہی حالت یاد رہتی تھی جب وہ آنکھوں پر بال ڈالے انہی میں سے جھانکتی رہتی تھی۔ تب اس کی امی  
 نیا خالہ اسے کھیل کے میدان سے کھینچ کھا کچ کر اس کی چھوٹی چھوٹی پونیاں بنادیا کرتی تھیں۔  
 ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ میں وہی ہوں۔ البتہ آپ بدل گئے ہیں۔ اتنے موٹے اور لمبے ہو گئے ہیں۔ تو بہ۔ میں تو  
 رڑ رہی گئی۔

ڈرنے کا تمہیں شوق ہے۔ اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔  
 جب ہی یہ معلوم ہوا تھا کہ موصوفہ خیر سے نویں جماعت میں قدم رنج فرما چکی ہیں۔ اور ہائیر سیکنڈری ایچ ڈیویٹ  
 لین ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کا یہ نیا انداز خاصا یاد رہ جانے والا تھا۔  
 ڈیڑھ دو سال کے بعد اس کا جانا ہوا تو وہ پشاور گئی ہوئی تھی۔ انٹر کام انگریز دے کر وہ بہت عرصے بعد اسلام آباد آئی  
 شادابی کا موسم اپنے عروج پر تھا۔ صغیر نے اس کو دیکھتے ہی سوچا تھا وہ اسے اپنی بہو بنالیں مگر سردار محبت علی خان کی  
 ریشیت اور احسن کی ذمہ دارانہ حالت کو سامنے رکھ کر خود ہی حقیقت پسندی کا مظاہرہ بھی کر ڈالا تھا۔ کہ اپنی خواہش  
 خود ہی دست بردار ہو گئی تھیں۔

حالا نک ان کی بہن عائشہ کی صحیح خطوط پر پرورش کے انداز نے شہور میں کوئی معنوی پن پیدا ہونے نہیں دیا تھا۔ بلکہ وہ  
 ہامی خاموش طبع اور فطری حیا کی حامل محسوس ہوتی تھی۔

احسن نے اس کی آدھ پر خوشی کا اظہار اسی طرح کیا تھا جس طرح کسی میزبان فرد کو کرنا چاہیے۔  
 لیکن اس کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا کہ صبح کو دیر سے نکلنے لگا ہے۔ اور اسے گھر آنے کی جلدی رہنے لگی ہے۔  
 گھر کی سمت بڑھتے قدموں نے اسے نئے احساسات سے متعارف کرایا۔ وہ اپنی کیفیت پر خود ہی حیران ہو کر مسکرا  
 اُرتا تھا۔

اور اندر قدم رکھتے ہی اس کی نظر متلاشی ہی ہو جاتی تھی۔  
 وہ خود کو ہر قسم کی کمزوری سے ماورا سمجھتا تھا نہ عمر زیادہ تھی نہ تجربہ۔ اسے اپنی بے بس کردینے والی کیفیت پر خاصی  
 طاہت بھی ہوئی تھی۔

یہ بھی کوئی بات ہے؟ اپنے ہی خیالات پر کنٹرول نہیں۔  
 یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

بڑی اسٹلٹک چیز ہے یہ۔ اسے پتا چل گیا تو کیا سوچے گی؟ میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی؟  
 لاجول دلا قوت۔

اسے خود اپنی سمجھ نہیں آتی تھی۔

اسی اویو بن والہاؤ میں دن خاموشی سے گزر گئے۔ وہ چلی بھی گئی۔ مگر احساسات کی تبدیلی احسن کو نیا سا کر گئی تھی۔  
 اس نے جیسے مقاصد حیات کا از سر نو تعین کیا۔

شہور کا حصول اس کی توجہ و خالص محبت۔ اس کے مقاصد میں شامل ہو چکے تھے۔

اس نے بار بار سوچا تھا۔ انسانوں کے اس بیکراں جہوم میں سے ایک انسان اس قدر اور اچانک اہم کس طرح ہو جاتا  
 ہے۔ کہ زندگی کے سارے لطف اسی کی رفاقت سے مشروط ہو جاتے ہیں۔

میری بچی کو نظر نہ لگا دینا۔ اللہ اس کے نصیب یونہی جگائے رکھے۔ اس کا سہاگ سلامت رہے۔

بہی وجہ تھی کہ ساری لڑکیاں ان کے گھر جانے کے بہانے ڈھونڈتی تھیں۔ شہور کی تو زیادہ چھٹیاں ہمیشہ امی کے  
 گزری تھیں۔

احسن کو وہ چھٹیاں پڑتے ہی پہلی چھٹی پر لینے جا پہنچتیں۔ احسن کے تایا جان کو وہ اس لئے خصوصیت سے پسند  
 کہ وہ ان کے پیارے بچے پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس لئے ان کی طرف سے ہمیشہ اجازت مل جایا کرتی تھی۔

وہ شہور سے خاصا بڑا تھا اس لئے بچپن میں وہ بے تکلفی تو نہ ہو پائی جو ہم عمر بچوں میں ہوا کرتی ہے۔ البتہ آپس کے  
 معصوم جھگڑوں میں وہ اکثر اسے اپنا جیتا لیا کرتے تھے۔ اس کے مضبوط جسم اور ”بڑے پن“ کا خاصا عرصہ تھا بچوں پر  
 اس قدر قرب رہ کر وہ گزرتے تھے کہ سب ایک دوسرے کے عادی تھے۔ کسی کو کسی میں کوئی ناپن محسوس نہ ہوتا تھا۔  
 اختلاف ٹکرائے دوستی کے مرحلوں سے اتنی بار گزرتا پڑا تھا۔ کہ یہ بھی روٹن میں شامل ہو گیا تھا۔

پھر اچانک باپ جیسے شوقین تایا جان کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اسے واپس اسلام آباد کا رخ کرنا پڑا  
 اسلام آباد کو راجپی کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی سارا گرما کی چھٹیوں میں کراچی کی طرف  
 بھاگتا تھا۔

اسی وجہ سے اسے اسلام آباد میں وقت بہت مشکل لگا تھا۔ مگر صغیر نے بڑی ذہانت و ملامت سے اہمیت کا وہ بہت تیز  
 دیا تھا جسے ماہ سال نے غیر محسوس طریقے پر تراش دیا تھا۔ ماں کی اہمیت و قدر و وقت کا احساس اس کے اندر جا کر گیا ہوا پھر تو  
 دوسرے پاؤں تک ماں کا ہو گیا۔ بلکہ اسے تو تاسف ہوا گزرتے ہوئے وقت پر جو اس نے ماں سے دور رہ کر گزارا تھا۔

شائستہ، صابر، ان تھک اور مضبوط۔ اعلیٰ مردانہ صلاحیتوں سے لبریز ظاہری طور پر دلکش نسوانیت کا بیکرہ۔ پھر یہ ہوا کہ  
 اس کے کراچی کے چکر آہستہ آہستہ کم ہو گئے۔ اسے ماں کی مصروفیت بہت ہو گئی۔ بی ایس سی فائنل کے امتحان سے قبل  
 چھوٹی خالہ کے پرزور اصرار پر ختم چھٹیوں میں کراچی پہنچا تھا۔ وہ چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔ شام ڈھل  
 رہی تھی۔

آہ۔ ایک طویل چنچ۔ پھر بھاگتے قدموں کی آواز۔ دھپ۔ کوئی اس کے سوٹ کیس پر ہی آ رہا۔  
 یادداشت۔ اس نے خود کو بھی سنبھالا اور گرنے والے کو بھی۔

اوہ۔ میرے خدا۔ اتنی موٹی چھٹکی۔ ذرا اور بڑی ہو جائے تو مگر چھک بچہ دکھائی دے۔  
 شہور اس مقام کر آنکھیں موندے کہہ رہی تھی۔

غالباً آپ مگر چھ میٹرنی ہوم میں خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔ کیونکہ میں نے آج تک مگر چھ کا بچہ نہیں دیکھا۔  
 نوزائیدہ۔ احسن نے اسے اس کے قدموں پر ٹھہرا کر جواب دیا تھا۔

اوہ۔ السلام علیکم احسن بھائی۔ شکر ہے آپ آ گئے۔ چھوٹی خالہ دوپہر سے مٹی ہوئی ہیں۔ کسی حاجی کو انوائٹ کرنے  
 ابھی تک جج نہیں ہوا۔ لاجول دلا قوت۔ میرا مطلب ہے ابھی تک نہیں آئیں۔ تو فیض (ملازم) ابھی تک دودھ لے کر نہیں  
 لوٹا۔ میں اسٹور میں مٹی چھوٹی خالہ گئی تھیں کہ وہ نیلا لحاف نکال لینا۔ خالو جان کے دوست آ رہے ہیں۔ لائٹ جلائی۔  
 اور چھٹکی۔

اس نے سر پکڑے پکڑے پوری رو داد احسن کو سنا ڈالی۔

احسن کو اس بار وہ قدرے نئی سی محسوس ہوئی۔ جیسے تازہ ہوا کا جھونکا۔

جس کی دلخواہ مسکراہٹ کے سامنے ملنے والے قارون کے خزانے بھی بے معنی اور مذاق محسوس ہوں۔ معلوم نہیں منظور نظر میں وہ کون سا الوہی رنگ ہوتا ہے جو اور کہیں نہیں ہوتی۔

محبت انسان کو کسی قدر کمزور بنا دیتی ہے کہ ہر وقت کسی دوسرے کے زیر اثر رہنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے پہل اسے خاصی جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی۔

مگر یہ اس قدر عظیم حملہ تھا کہ اس نے ہتھیار ڈال کر ذہن و دل میں مصالحت کا آغاز کیا تھا۔ جو عرصے کی رسم کٹی۔

شمل ہو رہے تھے۔

اس نے غزم میم کر لیا تھا کہ اب کراچی جائے گا تو خاصی بارہکی سے اپنی ذات کا اثر اس پر دیکھنے کی کوشش کرے اور جیت کر آئے گا۔

اسے خوشی تھی، وقت زیادہ دیر مبہم راستوں سے نہیں گزرا۔

بڑے ماموں کی بڑی بیٹی کی سالگرہ اور تھرڈ پروفیشنل میں بہترین کارکردگی کی مشترکہ تقریب تھی۔ وہ اپنے کزن کے ساتھ لان کی سجادت میں مصروف تھا۔ کسی ضروری اوزار کی وجہ سے وہ ماموں کے کمرے میں آیا تو وہ کسی کزن سے مصروف گفتگو تھی۔

نہیں بھی تم خود ہی کہہ دو مجھ سے نہیں ہوئی ان سے بات۔ ان کے تو دیکھنے بات کرنے کا انداز ہی بدل گیا ہے۔

کیا مطلب؟ انداز سے کیا مراد ہے؟

تو بہ انہیں تو کسی کی موجودگی کا احساس تک نہیں۔ میرا تو دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ وہ خاصے خفیف سے لہجے میں گویا تھی۔ اس کی مخاطب کزن کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

ہنسو نہیں کیا یہ ہنسنے کی بات ہے؟ شہوار نے خشکی سے ٹوکا تھا۔ اور ہاں کسی سے کہنا نہیں۔

تیرے میرے پیار کے چمچے ہر زبان پر سب کو معلوم ہے اور سب کو خبر ہو گئی۔

اس کی کزن لہک لہک کر گاری تھی۔

چپ ہو جاؤ خدا کے لئے اس سارے قصبے میں یہ پیار و یار کہاں سے ٹپک پڑا؟ شہوار نے زچ ہو کر ٹوکا تھا۔

ارے بابا! تو تم بدھو یا بن رہی ہو، ہمیں کیوں نہیں دیکھتے اطرح احسن بھائی؟ حالانکہ ہم بھی برے تو نہیں ہیں۔ اس کی کزن نے قدرے بسور کر کہا تھا۔

اچھا میں کہہ دوں گی کہ تمہیں دیکھ لیا کریں۔

کہنے سے کون دیکھتا ہے۔ میں تو اتار لگی بھی بن کر ان کے سامنے جاؤں تو وہ نہیں دیکھیں گے۔ کل ہی مجھ سے کہہ رہے تھے۔

تم سے کہہ رہے تھے کیا؟

شہوار نے خوفزدہ ہو کر جیسے بات کاٹ دی تھی۔

لہر ہے تھے۔

وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے

اک نظر میرا محبوب نظر تو دیکھو۔

اماؤ میرے سر کی قسم۔ شہوار رو ہانسی ہو گئی تھی۔

ہاں اس کی کزن ہنس ہنس رہی کر دہری ہو رہی تھی۔

سن اس سے زیادہ سن کر کہتا بھی کیا۔ اس سے بچشکر کوئی اسے تلاش کرتا دھڑا نکلتا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھ نظروں میں خاصی احتیاط لاشعوری طور پر پیدا ہو چکی تھی۔

لزن لوٹ پوٹ ہوتے ہوتے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

سن نے انجان سا بن کر ماموں جان کے بیڈ کے نیچے بنی ہوئی دراز کھینچ کر اوزاروں پر نظر دوڑانا شروع کر دی تھی۔ لیکن اس سے زیادہ سن کر کہتا بھی کیا۔ اس سے بچشکر کوئی اسے تلاش کرتا دھڑا نکلتا۔ اس نے کمرے میں قدم رکھ نظروں میں خاصی احتیاط لاشعوری طور پر پیدا ہو چکی تھی۔

لیا جا ہے؟

سن نے سر اٹھا کر کمرے میں نظر دوڑائی پھر اس کی سمت دیکھا۔

ہوار نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

سن اسکو دوڑا میور کا سیٹ نکال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ہوار!

نا!

مٹی تم مجھ سے اس قدر گھبرا کر بات کیوں کرتی ہو؟ کیا بہت خوفناک ہو گیا ہوں؟

نہیں تو، میں تو نہیں گھبراتی۔ اس نے جلدی سے کہا تھا۔

ہاں، گھبرانا بھی نہیں چاہیے وہی تو ہوں میں جو کبھی کبھی تمہیں سکول سے بھی لے کر آیا کرتا تھا۔ تمہارے علم کا بوجھ کولیک اپنے سر پر رکھ کر اور تم راستے بھول لو لی پاپ منہ مارتی دس منٹ کا سفر میں منٹ کا کر دیتی تھیں۔

برے کا نہ ہرے پر سوار کو کر تم نے نانی جان کے ہاں سے کس قدر کچے امرود کھائے ہیں تو زونڈ کر اس قسم کے کاموں نے چاہو تو ابھی بھی میری خدمات حاصل کر سکتی ہو۔

اثر رہا۔ شہوار کی پیشانی پر موتی چمکنے لگے۔

اچھا سنو! مجھے بھی وہی لطیفہ سناؤ جو نازیہ کو سناری تھیں۔ اس نے بڑی سادگی سے فرمائش کی۔ نہیں تو، میں تو کوئی لطیفہ نہیں سناری تھی۔ شہوار کی ٹانگیں کاٹنے لگیں۔

مردہ اتنا ہنس کیوں رہی تھی؟ وہ اسے کس قدر ستارہا تھا۔

ان کی تو عادت ہے۔ اسی طرح ہنستی ہے۔ اس کی آواز کی لرزش واضح تھی۔

لہو تو اسے چپک اپ کرنا چاہیے۔

مردان کرتے شلوار میں لمبوس چاندی کی بڑی بڑی جھمکیاں پہنے وہ اس کے حواس پر غالب آ رہی تھی۔

میں جاؤں؟ شہوار کی حالت غیر تھی۔

اس سے قبل کیا میری اجازت ہے۔ یہی جاتی رہی ہو؟ وہ پوچھ رہا تھا۔

آپ کچھ پوچھ رہے تھے۔ آپ نے ہی تو روکا تھا۔

جب بھی روکوں گا تو کیا رک جاؤ گی؟ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

شہوار کو بھی شاید یہ امید نہیں تھی۔ کلچر دھک سے رہ گیا۔

احسن کو ہی اس کی حالت پر ترس آ گیا۔ وہ بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گیا تھا۔

شہوار کے پاس کمرے میں اس کی بازگشت رہ گئی تھی۔

خواب آسامر کی پہلی گردش۔

غنائیت بھرے عہد کی پہلی برسات۔

رنگوں کی بارش کی پہلی پھوار۔

ذمہ داری کے تھانے کا پہلا انکشاف۔

وہ بارش میں بھیگنے والی کسی نازک سی بتل کی طرح کانپتی رہ گئی۔

اس کا کراچی کا بھی دورہ اس کی زندگی کا اہم سنگ میل بن گیا تھا۔

اس پارٹی کے اختتام پر اچانک ہی وہ حادثہ رونما ہوا جو ساری جوئیاں و تفریلات کو پھلانگ کر ایک نکتے پر آ کر زبردستی

ماصل بن گیا۔

شہوار کو کوڑ پوانزن ہو گیا۔ رات دس بجے کے بعد اسے پے در پے اٹلیاں شرو ہوئیں۔ بڑے ماموں عادتاً سونے کے

لئے جا چکے تھے۔ خاص خاص مہمان بھی رخصت ہو چکے تھے۔ احسن اپنے کزن وقار کے ساتھ چھوٹی خالہ کے ہال جا رہا

تھا۔ وہ گاڑی میں وقار کا انتظار کر رہا تھا عائنہ خالہ نے اسے کہا وہ شہوار کو کلینک لے جائے۔ پر تے کئے جا رہی ہیں

لے اپنے لئے یہ خبر پریشان کن تھی۔ شہوار کو عائنہ خالہ نے کچھ سیٹ پر لٹا دیا اور وہ زن سے گاڑی لے لڑا۔ اس نے یہ بھی

نہیں سوچا کہ شاید خالہ خود بھی ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں۔ پیچھے آوازیں آتی رہ گئیں۔ احسن یہ جاوہ جا۔

کلینک بھی نزدیک ہی تھا۔

فوری کارروائی کے بعد ڈرپ لگا دی گئی۔ وہ وہیں اس کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس نے اس کے زرد چہرے پر مشکری نظر ڈال کر پوچھا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا

انکھیں موند لی تھیں۔ اسے خوابیدہ جان کر وہ گھرفون کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

غالباً سب ہی فون کی گھنٹی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اتنی تیزی سے گاڑی لے کر نکلا تھا کہ کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں ملا تھا

فون دونوں کی مشترک تانی نے ریسو کیا تھا اور اس کی خبریت سن کر بولی تھیں۔

”کوئی پوانزن وائزن نہیں لڑی کو نظر لگ گئی ہے گھر لے آؤ نظر اتار دوں گی“ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

وہ فون کر کے واپس آیا تو وہ آنکھیں کھولے دروازے کی سمت دیکھ رہی تھی۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟ میں بھی گھر چلے گئے۔“

”فون کیا تھا گھر تانی جان کہہ رہی ہیں تم نے نظر لگا دی ہے بہت فور سے دیکھ رہے تھے۔“

اس نے سائڈ سے اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

جذبات کے اظہار کیلئے کثرت الفاظ شرط نہیں۔

اور محبت جیسا لطیف جذبہ کثرت الفاظ سے اپنا حسن کھو بیٹھتا ہے۔

یہ خالہ محسوساتی عمل ہے۔

بعض اوقات الفاظ بہت ہوتے ہیں مگر معنی بن کر نہیں دیتے۔

اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ نہیں ہوتا اور بات اپنے ہدف تک جا پہنچتی ہے۔

احسن نے اپنے جیلے کارڈ مل دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

عورت مرد کی نظر سے اس کا مطلب پا جاتی ہے۔

نرم و عورت کی چال میں اپنے قبول و مسترد ہونے کا اثر دیکھ لیتا ہے۔

اور پھر اس عمل میں خاموشی کے بھی انداز ہوتے ہیں۔

عورت کی اثبات بھری خاموشی مرد اس طرح پہچانتا ہے جیسے قدموں کے نشان سے چور کا راستہ پہچانا جاتا ہے۔

ہاں اپنے جیت جانے کا ہمیشہ سو فیصد یقین رہتا تھا۔ بعض اوقات یقین کی قوت نصیب کی ہر برائی پر غالب آ جاتی ہے۔

وہ اب بچی تو نہیں تھی جن موسموں کے رنگ اسے اس عہد میں درکار تھے وہ برس پڑے تھے۔

رات سو بارہ کے لگ بھگ جب وہ مین روڈ کے بجائے اندرونی روڈ پر گاڑی ڈرائیو کرنا مناسب رفتار سے گھر کی

بڑھ رہا تھا۔ وہ سیٹ سے ٹیک لگائے گم مسمی بیٹھی تھی۔ اس نے شہوار کو مخاطب کیا۔

”شہوار۔“

”جی۔“

”ایک بات سنو۔“

”جو دار تو میں دل محسوس کرتا ہے نظر پہچانتی ہے وہ اتنی جلدی آجکہ بند کر کے کسی سے نہیں کہتے بعض لوگ نادانی میں

ہوں کے راستے مشکل بنا دیتے ہیں۔ ابھی تو مجھے ایک طویل سفر طے کرنا ہے انتظار و توازن کا۔“

مجھے یہ کبھی اچھا نہیں لگے گا کہ خواہ مخواہ ہمارا تماشائے۔“

شہوار کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ اس کا اشارہ نازیہ سے اس کی گفتگو کی طرف ہے۔

اسے ٹوٹ کر حیا آئی تھی۔

یہ سوچ کر کہ وہ اس کی خفی سی نفز میں پہچان ہی نہیں اچھی طرح سمجھ بھی چکا ہے وہ جان چکا ہے مارے شرم کے اس

بہر نہ اٹھا گیا۔

احسن نے کئی بار اس کی سمت دیکھا۔ وہ سر جھکائے رہی۔ چادر نے دونوں اطراف سے اس کا چہرہ اوٹ میں کر رکھا تھا۔

اس نے گاڑی کی اندرونی روشنی بجھا دی۔ تاکہ وہ آرام سے بیٹھ جائے۔

کتنا زریک..... ذی فہم۔

شہوار سے قریب تھا جذبات سے قریب تھا۔

شہوار نے ایک جگر سوز کراہ کے ساتھ کر وٹ بدلی۔

جنگ داؤ سرخ و نیلے پرنٹ کے بلیکٹ میں گہری نیند سویا ہوا احسن اس کی شب بیداری سے کس درجہ بے خبر

اسے احتیاط کی تعلیم دینے والا کس درجہ غیر محتاط ہو چکا تھا۔

اس کی خاموشی سے ان کا مافی الضمیر سمجھنے والا اس درجہ بے حس ہو چکا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا۔

اس نے سوتے ہوئے احسن کی سمت ٹھٹکی باندھ لی۔

سارا ایہ بھی ہے جس کی رفاقت خوشیوں کی معراج لگتی تھی۔ قیامت تک کے لئے ہونٹوں سے ہنسی اس نے چھین لی ہے کتنے دن ہو گئے ہیں مجھے ہنسے ہوئے۔ اس نے اٹھلیوں پر گنا شروع کر دیا۔  
کیسی پاگلوں جیسی کیفیت ہو چکی تھی اس کی وہ اپنی اس حرکت پر خود ہی خفیف سی ہو گئی بلکہ اپنی حالت زار پر اکر ہوک سی اٹھی تھی سینے میں۔

صبح جب کچن میں آکر اس نے مہمانوں کی بیڈی کا انتظام شروع کیا تو باہر مرتضیٰ بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پاس ہی چلے آئے۔  
”صبح بخیر! اتنی صبح اٹھنے کا عادی تو نہیں ہوں مگر نئی جگہ وہ نیند نہیں آتی جو ذاتی خواب گاہ میں آتی ہے۔“  
”جی یہ تو ہے“ مگر ہماری طرف بھی دیکھیے ہم لڑکیوں کی خواب گاہیں زندگی میں کتنی بار پہنچ ہوتی ہیں اور ہمیں بے سرے سے نئی خواب گاہ کی عادت ڈالنا ہوتی ہے۔“

شہوار نے ان کے لئے چائے دم کرتے ہوئے خاصی بٹاشٹ سے کہا۔

”اوہ! اچھی پوائنٹ اپروچ ہے آپ کی۔“ باہر مسکرا دیئے۔

”یعنی آپ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ عورت کو زیادہ پر اہم فیس کرنا ہوتی ہیں کیوں؟“

شہوار نے ایک گہرا سانس لیا اور موزہ کھینچ کر انہیں بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔

باہر بیٹھ گئے تو اس نے ایک خوبصورت کپ پرچ میں چائے پیش کی۔

وہ ناشتے کا اہتمام کرتی رہی اور باہر سے بھی بات چیت ہوتی رہی۔ اسی مصروفیت میں اسے دھیان ہی نہ رہا کہ آج اس نے ”بیڈی“ میس کر دی ہے۔ دوسرے اسے اپنا خاص ضروری کام بھی یاد آ گیا۔ وہ باہر سے معذرت کر کے احسن کی خواب گاہ میں چلی آئی۔

باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے سے چند قدم آگے واش بیسن کے سامنے وہ شانوں پر تولیہ پھیلائے بیٹھا رہا تھا۔ وہ سیدھی فون کی طرف آگئی۔ اس نے اسد کی رہائش گاہ کا نمبر ملایا تھا۔

”ہیلو جی! اسد صاحب سے بات کرادیں..... سو رہے ہیں..... آپ ان کی امی ہیں؟ اچھا تو آپ سبج دے دیتے گا۔ میں ان کی پروڈکشن سپروائزر رہو اور بات کر رہی ہوں۔“

”جی.....؟“ ”ان کی نہیں..... میرا مطلب ہے کہ ان کی فیکٹری میں۔“ ایک ہلکی ہنسی شہوار کے لہجے میں درآئی۔

”ان سے صرف اتنا کہنا ہے مجھے ایک ہفتے کی لیوور کار ہے..... صرف ایک ہفتے کی۔“

احسن نے نہایت زور سے باتھ روم کا دروازہ بند کر لیا تھا۔

شہوار نے دروازے کی سمت دیکھا تک نہیں اور فون بند کر کے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

کیونکہ ان سب نے آج نوبے تک ٹھیکہ کی طرف چلے جانا تھا۔

رات کو باہر مرتضیٰ کی خاطر دول داری کی وجہ سے دوبارہ موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ ثمنہ احسن کا گھیراؤ کرتیں۔

ٹھیکہ کو محض سر پرانز دینے کا دھیان تھا اس نے فون جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔

ٹھیکہ منہ کو اپنے پاس لے آئی تھی اور دلیں یہ تھی کہ اس گھر میں اس کا ڈپریشن کم نہیں ہو سکا۔ ہر سمت ہر شے

موسم تھی۔ انعام علی نے اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ نور بانو کو بھی بیٹی کی خاطر وہیں آنا پڑا تھا۔ نور بانو لاؤنج میں قرآن پڑھ رہی تھیں۔

ٹھیکہ دونوں بچوں اور بلال کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔

سب سے آگے احسن اور باہر تھے۔ ان کے پیچھے ثمنہ ان سے پیچھے نائلہ، ثمنہ اور فیضان ایک جلوس سا تیار تھا گویا۔

ٹھیکہ کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ ہکا بکا کھڑی دیکھ رہی تھی۔

ثمنہ نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے گلے سے لگا لیا۔

”میری آمد پر حیران ہونا نائلہ نائلہ کو دیکھ کر۔“ انہوں نے ہنس کر پوچھا۔

”السلام علیکم۔“ بلال نے جھکنو کو گود میں اٹھا کر ثمنہ احسن باہر کو سلام کیا۔

”ولیکم السلام۔“ ثمنہ نے بہت محبت سے جواب دیا۔

”دیور ہے تمہارا؟ کچھ کچھ جھلک ہے اس میں انعام علی کی۔ خیر بھائی ایک دوسرے سے زیادہ ملتے ہوں یہ ضروری تو نہیں۔“

انہوں نے اپنی گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ بلال سے کہا۔



”بھابی جان نہیں آئی.....؟“ شکیلہ نے ان سب پر نظر ڈال کر پوچھا۔  
 ”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ نائلہ نے فوراً جواب دیا۔ مگر وہ بدستور نور بانو کی سمت متوجہ تھی۔  
 ”آئیے آپ لوگ ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ پھوپھو آپ یہیں بیٹھیں۔ نیلی اور بلو تم بھی۔“ وہ احسن بابر اور  
 بنان کو لے کر ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔

”آپ.....؟“ ثمنینہ کی سوئی ہنوز ایک جگہ انگی ہوئی تھی۔ وہ نور بانو سے پھر مخاطب ہوئیں۔  
 ”آپ مجھے نہیں جانتی ہیں۔ مجھے نور بانو کہتے ہیں۔“ وہ سر جھکا کر گویا ہوئیں۔  
 ”میں نے آپ کا نام پہلی مرتبہ سنا ہے۔“ ثمنینہ نے جیسے کوتاہی کا اعتراف کیا۔  
 ”شکیلہ نے آپ کو ہمارے بارے میں نہیں بتایا؟“ وہ قدرے چونکیں۔  
 ”کبھی اتفاق نہیں ہوا شاید۔“ ثمنینہ نے کہا۔  
 ”میں انعام علی کی پہلی بیوی ہوں۔“ انہوں نے مگر اسانس لیا۔  
 وہ تینوں کی تینوں ہکا بکارہ گئیں۔

”عجب ہے آپ تو شکیلہ سے نہایت قریبی رشتہ رکھتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ ک..... شاید اس نے کسی مصلحت کے  
 تحت ایسا کیا ہو۔ وہ بہت اچھی ہے۔ کسی بہت اچھی ماں کی بیٹی ہے۔ بیٹھے ناں۔ کھڑی کیوں ہیں.....؟“ نور بانو نے جیسے  
 کسی خیال سے چونک کر انہیں بیٹھنے کے لئے کہا۔  
 اسی دم بلال دوبارہ لاؤنج میں داخل ہوا۔ اور ان سب پر ایک نظر ڈالی۔  
 ”مچی کہاں ہیں.....؟“

”اندروں ڈرائنگ روم میں۔ بیٹے تم بھی وہیں جا کر بیٹھو۔ مہمانوں کے پاس۔“

”یہ.....؟“ نائلہ نے جیسے بدحواس ہو کر بلال کی سمت اشارہ کیا۔  
 ”بیٹا ہے میرا۔ بلال۔“ نور بانو ان کے تاثرات بخوبی دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہیں گھما پھرا کر بات کرنا نہیں آتی تھی۔  
 ”آپ کا مطلب.....؟“ ثمنینہ نے گھبرا کر ان کی صورت دیکھی۔

”جی میرا مطلب ہے۔ انعام علی کا بیٹا۔“ نور بانو نے اسی طمانیت بھرے انداز میں جواب دیا۔  
 نبیلہ نائلہ نے ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ ڈکھ کی برچھیاں ان کے سینے میں اتر گئی تھیں۔

ہائے ہماری پیاری باجی۔ حوادث زمانہ کے سامنے تھا..... ایک دم اکیلی..... یہ اتنی بہادر کب سے ہو گئیں۔  
 اباجی..... آپ کے کس کس ستم پر نگاہ کریں..... میں اپنا ڈکھ دیکھوں۔ ماں کا ڈکھ روؤں۔ شکیلہ باجی کے نصیب کا ماتم  
 کروں۔ بلو آپ کے زخم کنوں..... نہیں..... آپ ہمارے اباجی کیسے ہو سکتے ہیں؟  
 سب کے دل گوشت پوست سے بے ہیں آپ کا کس سے بنا ہے.....؟  
 فولاد بھی پگھل سکتا ہے۔ بارود سے چٹانیں بھی اڑ جاتی ہیں۔ آپ کے دل کو زمانے کی صلاحیت پوری کائنات میں  
 کہیں نہیں۔

نائلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ثمنینہ کو مارے ڈکھ کے جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ نبیلہ کا دل سوکھے چے کی طرح کا پ رہا تھا مگر وہ دونوں اپنی حالت  
 ہکا بولپانے میں خاصی کامیاب تھیں۔ مگر نائلہ..... اس کی حالت بڑی بے اختیار سی ہو رہی تھی۔

بلال نے شکیلہ کی سمت دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ وہ جیسے اس سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کیا کہنا چاہئے۔  
 شکیلہ نے نظریں جھکا لیں۔

”یہ بچے کس کے ہیں؟ ماشاء اللہ بہت پیارے ہیں۔“ ثمنینہ نے جگنو کے رخسار چھوئے۔

”ہمارے ہی ہیں۔ آئیے اندر چلتے ہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

سب اس کی قیادت میں پیچھے پیچھے ہوئے۔

نور بانو ان سب کو دیکھ کر دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”السلام علیکم!“ بیک وقت کئی آوازیں لاؤنج میں ابھریں۔

”والسلام السلام!“ نور بانو نے جواب دیتے ہوئے شکیلہ کی سمت دیکھا۔

”باجی۔ یہ میری پھوپھو ہیں اباجی کی چھوٹی بہن..... اور یہ نائلہ ونبیلہ ہیں میری چھوٹی بہنیں۔ یہ میرے بڑے بھائی

احسن ہیں اور یہ بابر ہیں نائلہ کے شوہر۔ اور ہاں یہ فیضان ہے۔ پھوپھو کا بیٹا۔“

شکیلہ نے فردا فردا سب کا تعارف کر لیا۔

”آپ کی تعریف۔“ ثمنینہ نور بانو سے مخاطب ہوئیں۔

”بلال..... دیکھنا رفیق (ملازم) آگیا سودا لے کر.....؟“ شکیلہ نے بلال سے کہا۔

بلال فوراً وہاں سے چلا گیا۔

وہ سب شکیلہ کی سمت پوری طرح متوجہ تھے۔



”جب ہم بھی ڈکھی اور غم آپ کے آس پاس بھی ہے تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک ہی گزر گاہ پر کیوں نہ چلیں۔“ انہوں نے نائلہ کی پشت چھپتا کر بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

”اگر آپ اپنے غموں کا ذمہ دار ہمیں سمجھتی ہیں تو بڑی نادانی ہے۔ اب تو ہم اور آپ ایک ہی ہیں ناں۔“ ان کے لہجے میں نہ جانے کیسی نا آسودگی تھی..... نائلہ نے جیسے ان کی خاطر خود پر قابو پایا۔

یہ تو خود دکھوں کی نگہری ہے..... شکلیہ باجی..... دکھوں کی کچھ تفصیلات بدلی ہیں..... عنوان تو بھروسہ ہے۔ ہمارے بارے میں صرف دنیا کے تاثرات بدلیں گے۔ ہمارے دلوں کا حال بدستور رہے گا۔ پہلے دنیا میں متوسط اور سختی طبقے کا فرد گرد آتی تھی۔ اب ہم اس ملک کے خوشحالوں میں گئے جاتے ہیں۔ باقی سب کچھ ہی طرح ہے۔

نور بانو جیسے اس کے اندر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

نائلہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“

”ماشاء اللہ وہ ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی..... بس یہی کائنات ہے میری۔“ (چوبیس سال ہو گئے۔ قسمت کی تیرگی ناں بس یہی دو جگنو ہیں میرے پاس) وہ مسکرائیں۔ نائلہ کو محسوس ہوا جیسے وہ نہ مسکرائیں تو اچھا ہے۔ کس قدر تکلیف میں ہوتی ہیں یہ مسکراتے ہوئے۔ اس نے ان کے بلکہ و تاثر سے عاری چہرے کی طرف دیکھا۔

”آپ ہمارے بھائی جان میرا مطلب ہے احسن بھائی سے ملی ہیں.....؟“ نائلہ کو اگلا مرحلہ یاد آیا۔

”ملی تو نہیں ہوں مگر شکلیہ نے آپ سب کے بارے میں پوری تفصیل سے بتایا ہوا ہے۔ آپ کی بھابھی شہوار بھی تو آتی ہیں۔“ (چوبیس آئیں آپ کے ساتھ.....؟) نور بانو نے دھیمے لہجے میں بتاتے ہوئے سوال کیا۔

نائلہ نے قدرے جرات سے ان کی سمت دیکھا۔ ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ شکلیہ باجی کے ان لوگوں سے کتنے ہی تعلقات ہیں۔ باہمی اعتماد کی فضا ہے۔ مگر احسن بھائی کو تو یہ سب پتا نہیں جب ان کو پتا چلے گا تو..... اباجی سے ان کی کشش کن انتہاؤں کو پہنچے گی.....؟

بابر کو یہ سب پتا چلے گا تو وہ ہمارے گھرانے کے بارے میں کیا تاثر قائم کریں گے.....؟

نائلہ کو گویا مزید مرحلے پر پیش تھے۔ بلال اور منزہ ڈرائنگ روم میں گئے ہیں۔ وہاں کیا صورت حال ہے۔ معاشی سچا پورا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ابھی آتی ہوں۔“ وہ ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔

”تم آرام کرو منزہ..... گڑیا کی فیڈر میں تیار کر دیتی ہوں۔“ اندر داخل ہوتے ہی اس کے کانوں میں شکلیہ کی آواز آئی ”نہیں۔ محی۔ آپ مہمانوں کے پاس بیٹھئے۔ لائے گڑیا کو مجھے دے دیجئے۔“

نائلہ کے قدم وہیں جم گئے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر احسن کی سمت دیکھا۔ احسن ایک دم ششدر سا رہ گیا۔ وہ شکلیہ کو فوراً یاد کئے گا تھا۔ اس کی نظروں میں لاتعداد سوالات تھے۔ شمیم نے بھی گردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

شکلیہ یہ سب بخوبی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے گڑیا کو منزہ کی گود میں دیا اور بلال کی گود سے جگنو کو لے لیا۔

”بلو..... یہ میرے بڑے بھائی احسن ہیں۔ تمہارے ماموں..... اور یہ میری چھوٹی بہن ہیں۔ یہ تہنہاری ہیں۔ یہ تہنہاری ہیں۔ نائلہ اور نائلہ اور یہ نائلہ کے شوہر ہیں بابر مرضی۔ یہ فیضان ہے چھوٹا کا دوسرا بیٹا۔“ شکلیہ نے بھرپور اہمیت سے تعارف کرایا۔

لاؤنج میں داخل ایک سکوت سا طاری ہو گیا تھا۔ بلال ڈرائنگ روم میں جا چکا تھا۔ نور بانو کی نظر نائلہ کے اشکوں پر پڑی۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔ اپنے پلو سے اس کے رخسار صاف کئے مگر نائلہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ نور بانو نے اس کا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

”دکھ تو ہمیں کہیں ہوتے ہیں۔ بس انکشاف میں دیر ہوتی ہے۔ جو شے ازل سے جان کو لگی ہے۔ اس پر کیا چونکا کر پڑیاں ہوتا۔“ ان کی آواز بھر آگئی۔

شمینہ اور نبیلہ جراتی سے نور بانو کو دیکھنے لگیں۔ انہیں وہ بہت عجیب و غریب لگی تھیں۔ سمجھ سے بالاتر۔

”دیکھو بیٹا۔ جو ہو چکا وہ تو ہو چکا۔ آگے جینے کی راہ ڈھونڈ کر ہی وقت کئے گا۔“

”السلام علیکم۔“ معاً ایک نسوانی آواز لاؤنج میں ابھر گئی۔

وہ سب جیسے چونک پڑیں۔ اب تو جیسے ہر نئی آواز پر ان کے کلیجے کانپتے تھے۔

سراٹھا کر سامنے دیکھا۔ زرد سوٹ اور سفید چادر میں سامنے منزہ کھڑی تھی۔

جیسے کوئی تصویر۔ بلکہ تصویر غم۔ چغتائی کے برش سے اظہار غم جیسے متحرک ہو گیا تھا۔

”آؤ منزہ.....!“

”یہ میری بیٹی ہے منزہ۔ بلال کی بڑی بہن۔“ نائلہ کے اٹک فوراً ختم گئے۔ اس نے منزہ کو جیسے ٹھنکی باندھ کر دیکھا۔ ان تینوں نے منزہ کے اندر کوئی غیر معمولی بات محسوس کی تھی۔ اس کے لب ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے جیسے آئندہ کھولنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

نبیلہ کو وہ اپنا آئینہ دکھائی دی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود اپنے مقابل آکھڑی ہوئی ہو۔

اتنے بڑے محل میں شہزادی افسردہ کیوں ہے؟ اس پر حالات کے دیونے کون سی قیامت ڈھائی ہے؟

میں اپنے دکھ میں ڈوب کر کسی جزیرے میں قید ہوں۔ میری باجی جانے کون کون سے مرحلے طے کر رہی ہے۔ اتنے ڈھیر سارے اپنوں کی موجودگی میں ”تہنا۔“

”آئیے۔ بیٹھئے۔“ اس نے شمیمہ کو ایک دم چپ دیکھ کر منزہ کو مخاطب کیا۔

نائلہ ابھی تک نور بانو کے بازوؤں میں تھی۔

”یہ شکلیہ کی چھوٹھی بہن ہیں۔“ منزہ نے زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں جیسے خوش آمدید کہا۔

”امی گڑیا کہاں ہے؟ اس کے فیڈر کا ٹائم ہو گیا ہے۔“

”تہنہاری مہی کے پاس ہے۔ ڈرائنگ روم میں ہیں وہ۔ ان کے بھائی وہ بہنوی آئے ہیں۔ جاؤ انہیں سلام کر آؤ۔ اور گڑیا کو بھی لے آؤ۔ ویسے تو یہ مدت میں ہے۔“ نور بانو کی زبان جیسے لڑکھرائی۔

ان تینوں پر جیسے ایک نیا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ شمیمہ تو گویا بلبلہ کا کٹھ کھڑی ہوئیں۔

”کیا قیامت آئی ہے اس بے چاری پر۔ یہ تو بہت کم عمر ہے۔ کس قدر معصوم۔“

”قیامت کچھ بھی نہیں دیکھتی۔ بس آ جاتی ہے۔“ نور بانو کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”میرا دادا شہر پر ملازم تھا۔ انجینئر تھا۔ سارے معصوم جیسے میرے ہی گھر کے لئے ہیں۔“

لاؤنج میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ماحول ہنوز پر غم تھا۔ بس دکھ کا چہرہ بدل گیا تھا۔ شمیمہ اس کے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلی گئی تھیں۔ نبیلہ بھی ان کے پیچھے ہوئی۔

گو یا ابھی تک تعارف نہیں ہوا تھا اور نہ ہی شہینہ نے اس کے سامنے کوئی اشارہ کیا تھا۔

”اس دن بخود شکیلہ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

”آپ کی والدہ محترمہ کہاں ہیں؟“ معاس کی سپاٹ آواز ابھری۔ وہ بلال سے مخاطب تھا۔ نہ جانے کس جواب کی تلاش تھی اسے.....!

”ابھی تو آپ ملے ہیں ان سے باہر لاؤنج میں۔“ بلال نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔ اس نے پھر شکیلہ کی سمت دیکھا۔ بابر خٹ جیرانی کے عالم میں تھے۔ کہ نائلہ کے گھر والے شکیلہ کے معاملات سے اس درجہ خبر ہیں۔ کیا نائلہ کی بہن نے اپنی مرضی سے یہ شادی کی ہے.....؟ ان کے ذہن میں سوال ابھرا۔ تب ہی تو یہ سب آج پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔

”آپ یہاں پہلی مرتبہ آئے ہیں؟ ہماری طرح۔“ بابر نے اس کو مخاطب کیا۔

”نہیں۔ پہلے بھی دو تین مرتبہ آچکا ہوں۔“ اس نے اپنے خیالات سے چونک کر بابر کو جواب دیا۔

بابر پر پھر تحیر آمیز جیرانی طاری ہو گئی

اس نے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں چلا ہوں۔“ آفس کی تو آج چھٹی ہوگی۔ فرم میں کام ہے۔ کل شپ روانہ ہوگا۔ مال لوڈ کرانا ہے۔ آپ مجھے بتا دیجئے کہ آپ لوگوں کا واپسی کا کیا پروگرام ہے؟ میں بڑی گاڑی بھجوا دوں گا۔“ اس کا انداز سرد اور لہجہ سپاٹ تھا۔

”آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔“ شکیلہ نے کھڑے ہو کر مزاحمت کی۔

”کھانا پینا تو زندگی بھر کا ہے۔ پھر سکی۔ میں تو اسی شہر میں ہوں۔ ہر دم تمہارے پاس۔“

اس نے شکیلہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جیسے اسے بہلایا۔

”شام کو بھابھی کو لے کر آجائے گا کھانا آج ہمیں کھائیے۔ پلیز بھائی جان۔“ شکیلہ بہن تھی۔ اس کے احساسات سے اس وقت بے حد قریب تھی۔ اپنے آپ کو بے حد مطمئن اور مگن ظاہر کر کے وہ اس کے دل سے بوجھ ہٹانا چاہ رہی تھی۔

”دیکھوں گا۔“

”نہیں۔ وعدہ کیجئے۔ شہوار بھابھی کو ضرور لے کر آئیے گا۔ دیکھیں بھائی جان پلیز۔“ اس نے اس کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھام کر جیسے منت کی۔

”شہوار کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اذیت میں آنے کی پوری کوشش کروں گا.....!“

”ٹھیک ہے وہ اب لے آتا۔“ شہینہ نے تیزی سے کہا۔

اس نے بلال کے چہرے پر نظر ڈالی اور گہرا سانس لیا۔ ”اچھا خدا حافظ!“

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ بلال حق میر جیرانی ادا کرنے کی خاطر اس کے پیچھے چل دیا۔

بابر نے بیوی کی سمت ابھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ نظریں چراگئی۔ بلال دوبارہ اندر داخل ہوا۔

”بلو..... باجی وہاں اکیلی ہیں۔ انہیں یہیں بلا لاؤ۔“ ملازمہ شالی نے اندر آ رہی تھی۔ بلال ماں کو بلائے باہر نکل گیا۔

شہینہ اپنی نشست سے اٹھ کر بابر کے برابر میں بیٹھ گئیں۔ انہیں اب دامادی فکر تھی۔ نائلہ کی مشکل کا خیال تھا۔

منزہ گڑیا کو لے کر باہر جا چکی تھی۔ بلال ماں کو لینے جا چکا تھا۔

”شکیلہ کی شادی رجم بھائی نے اچانک کی تھی۔ میں یہاں نہیں تھی۔ بڑی سادگی سے نکاح کر دیا تھا حتیٰ کہ منہ بھابھی کو بھی اعتماد میں نہیں لیا گیا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے تمہاری اور نائلہ کی شادی میں انہوں نے اپنا کلی اختیار استعمال

لیا۔ اس لئے شکیلہ کے گھر کے بارے میں کسی کو بھی معلومات نہیں تھیں آج سے پہلے..... بس رجم بھائی کا مزاج ہی ایسا ہے کہ وہ اپنے رائے کے علاوہ کسی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔“

”تو کیا شکیلہ نے بھی آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتایا۔“ بابر نے جیرانی سے پوچھا۔

”وہ منہ بھابھی کی بیٹی ہے۔ صابر ایثار پیشہ..... بیوقوف کہیں کی۔“ شہینہ کی آنکھیں بھرا گئیں۔

”اور پھر انسان کی پرائیویٹ لائف بھی تو ہوتی ہے۔ کسی کی ہر بات سب کو پتا ہونا ضروری تو نہیں۔“ نائلہ نے تلخی سے کہا اور اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔

بابر نے پھیلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر نظریں نائلہ کی سمت اٹھائیں۔

”مثلاً؟“ ان کے لہجے میں غراہٹ درآئی تھی جو صرف نائلہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔

”مثلاً میں ہی بتاؤں۔ یہ میری ذمہ داری تو نہیں۔“ انداز ہنوز ٹیکھا تھا۔

شکیلہ نے فوراً ژالی آگ کر کے کنکلس بابر کی سمت بڑھائے۔ اسے نائلہ کا انداز سمجھ تو نہیں آیا تھا مگر اس کی پرسنل بے ت کے کچھ محسوس کر لیا تھا اور مدافعت ضروری سمجھی تھی۔

”یہ لیجئے بابر بھائی۔ کافی یا چائے۔“ اس نے بغیر وقفے کے سوال کیا۔

”کافی..... قہر کریم مگر ہاف کپ۔“ انہوں نے پھر سے لہجہ بدل کر شائستگی سے جواب دیا۔ ”اگر ممکن ہو۔“ وہ مزید لپٹا ہوا۔

”نائلہ! یہ خاص کافی تو تم بناؤ۔ اس لئے کہ تم بابر کے ٹیٹ سے واقف ہو۔“ شہینہ نے نائلہ کو مخاطب کیا۔

اس نے اخبار رکھ کر شہینہ کے حکم کی تعمیل کی۔

نور بانو سراپھی طرح ڈھانچے بلال کے ہمراہ اندر آئیں۔ ”آئیے باجی ادھر آجائیے۔“ شکیلہ نے اپنے پہلو میں جگہ بنائی

نور بانو چپ چاپ اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

شہینہ نے نظریں اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔ وہ اسٹ پر پل پرنٹ کا بہت اسٹائلٹ سا سوٹ زیب تن کئے شکیلہ بہت آسودہ دھڑکن سی نظر آ رہی تھی۔

دونوں ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں۔ ناک میں دھڑکنی ہیرے کو لوگ۔ بالوں کا اونٹن سٹائل جوڑا۔ پیشانی پر گری

لٹا دو چار بالوں کی لٹیس۔ ہونٹوں پر لائٹ پر پل چمکدار لپ اسٹک۔ اعتماد سکون احساس ملکیت و تعریف۔ وہ آج سے دس پہلے والی شکیلہ ہرگز نہیں تھی۔

اور اس کے بائیں پہلو میں بیٹھی ہوئی نور بانو۔

اگوری کمر کے سوٹ میں پیشانی تک دوپٹہ منڈھے ہوئے۔ آنکھوں میں اداسی انداز میں تکلف و اجنبیت.....

نائلہ جیسا انداز..... بولنے کے انداز میں حد درجہ احتیاط۔

چہرہ ایک دم سفید۔ گلابی پن کی جھلک سے عاری۔ جیسے ان کے جسم میں خون ہی نہ ہو۔ ہونٹ ابھرے ہوئے

بیڑہ۔ قدرے سرخی مائل۔

آنکھوں کے نیچے باریک لکیریں۔ چھوٹے سے دہانے کے اطراف تو سی لکیریں۔

چہرے اور ہاتھوں کی جلد کی نمی اڑی ہوئی تھی۔ خشک جلد اداس تاثر۔ وہ شکیلہ کے مقابلے میں بہت تھکی ہوئی اور شل

آ رہی تھیں۔

انعام علی جیسے فریض صحت مند توانا جذبات کے حامل مرد کے آگے درحقیقت وہ بھی ہوئی عورت تھیں۔  
 شکیلہ سب کو اشیائے خورد و نوش پیش کر رہی تھی۔ برتنوں اور اس کی چوڑیوں کی کھنکھاہٹ کے علاوہ ڈرائنگ روم میں  
 اور کوئی آواز نہ تھی۔

”تم شکیلہ کے پاس کئی دنوں رہیں جن دنوں امی آئی ہوئی تھیں۔“  
 ”پھر.....!“

”تم کیا جانتی تھیں اس کے گھر کے بارے میں۔ اور کیا امی کو بھی پتا ہے؟“  
 ”کسی کو کچھ پتا نہیں۔ سوائے میرے۔ اس نے شکیلہ نے مجھ پر اعتبار کیا۔ اور صرف مجھے بتایا۔ اس کا خیال تھا شاید  
 جان کے لئے یہ صدمہ ناقابل برداشت ہو۔“

”تم نے مجھ سے کیوں چھپایا؟“ احسن نے تیزی سے بات کاٹ دی۔  
 ”گویا اس کا خیال درست نکلا۔ وہ آگاہ تھی۔“

”میرے آپ کے درمیان اس قسم کا وقت کبھی نہیں آیا کہ بتانے سمجھانے کی نوبت آتی۔“  
 ”مگر تمہیں یہ بات مجھے بتانا چاہئے تھی۔“

”کس حساب میں.....؟“ وہ تکی سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”میں یہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں شوٹ کر دوں گا تمہیں۔“ بہن کے ہاں سے اذیت ناک انکشاف نے

ایک چولیس ہلائی ہوئی تھیں۔ شہوار کے انداز نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔  
 ”کچھ سمجھتے تو سی۔ صرف کہتے رہیں گے کیا.....؟ اس نے آگے بڑھ کر سائیڈ ٹیبل سے ننھا سا مٹل نکالا جو ایک روز

ایک کے دوران نظر آ گیا تھا اور احسن کی سمت اچھالا۔ ”یہ لیجئے۔“  
 احسن نے تیزی سے کچھ کیا۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے؟“

”پتا نہیں۔ ویسے تو یہ پٹل ہے۔ شاید مجھے ہی ڈرانے کو رکھا ہے۔ کر دیجئے شوٹ مجھے۔“

”احسن نے پٹل ہاتھ میں تھام کر تدرے سوچا۔ پھر آگے بڑھ کر ٹیکے کے نیچے رکھ دیا اور اپنی جگنوؤں کی طرح چپکتی  
 نہیں شہوار کے چہرے پر نکادیں۔“

اس کی نظروں میں برق کوندی تھی جو سیدھی دل پر پڑتی تھی۔ برسوں پہلے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی۔

”مجھے افسوس ہے محترمہ ڈر شہوار کہ میں آپ کی زندگی میں کوئی آسانی برداشت نہیں کروں گا۔ آپ کو قید حیات سے  
 ہائی ملے۔ میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔ قرض سود کے ساتھ واپس لوں گا محترمہ۔ گھڑی گھڑی کا ایک ایک لمحہ گا۔ ایک ایک

بکا ایک ایک ٹاپے گا۔ یہاں تک کہ تم مجھ سے درخواست کرو کہ میں تم پر تھوڑا ہی سارجم کروں۔“

”خدا کے خوف سے ڈریئے احسن۔“

”تھوڑا تم بھی ڈرو خدا سے۔ اسے بھی دھوکے باز پسند نہیں۔“

”میں نے کسی کے ساتھ دھوکے بازی نہیں کی۔ میں قیامت تک آپ سے کسی قسم کی معذرت نہیں کروں گی۔“

”اگر آج سرور صاحب تمہیں لینے آجائیں۔“

”چلی جاؤں گی۔“

”کاش یہ معجزہ ہو جائے۔“ وہ بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ ایک سگادینے والی مسکراہٹ اس کے لبوں پر تھی۔ اس نے

کریٹ نکال کر سگایا اور سیدھا ہو گیا۔

”آپ نے مجھے اتنا تنگ کیا ہے جب ہی تو میں آپ خود بھی بے سکون ہیں۔“ وہ بولی۔

احسن بہت رش ڈرائیوگ کرتا ہوا گھر پہنچا تھا۔  
 شہوار مہمانوں کے جانے کے بعد کچھ بیڑے سے خبردار آ رہی تھی۔ پھول بی بی باپ لگائے پورچ دھوری تھی۔

احسن کی گاڑی کا ہارن سن کر پھول بی بی نے گیٹ وا کر کے باہر جھانکا اور سخت براسامہ بنایا۔

”صاحب! بی بی گاڑی باہر رہن دو۔ اس کا پیسے میں بوت مٹی لگا ہے۔“

”گاڑی باہر ہی ہے۔ میں واپس جاؤں گا۔ تم ٹکڑ نہیں کرو۔“ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں نظر آ رہا تھا۔ ”آج تم  
 ابھی تک یہیں ہو؟“ اس نے گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

”بی بی ام کو بولا تھا ساتھ والوں کا کام کر کے دوبارہ آ جانا۔ آج کام بہت اے۔ ام دوبارہ آیا اے۔“ اس نے آستین  
 سے پیشانی صاف کر کے تھکایا۔

”مشین کی بڑبڑی۔ اس نے رابرداری کے آخری سرے کی سمت دیکھا۔ شہوار پانچ چڑھائے پانی میں سڑ پڑ کر  
 دکھائی دی۔“

”تمہیں کس لئے رکھا ہے پھول بی بی۔ کپڑے بی بی کیوں دھوری ہے؟“ وہ ناگواری سے پھول بی بی کی سمت دیکھ  
 رہا تھا۔

”صاحب! بی بی بولا تھا آج کام بوت اے۔ تم صفائی کرو۔ کپڑا ام دھو لے گا۔“

احسن کیلئے فرش پر احتیاط سے چلتا ہوا شہوار تک پہنچا۔

”شہوار.....!“

شہوار تو جیسے اچھل ہی پڑی۔

”محترمہ“ کے طنزیہ خطاب کو سن کر اسے تو جیسے اب ”محترمہ“ ہی کی عادت ہو گئی تھی۔

اس نے خود پر قابو پایا اور کپڑے نچوڑنے میں دوبارہ مصروف ہو گئی۔ بس اک نگاہ غلط اس پر ڈالی تھی۔  
 ”ادھر آؤ۔ بات سنو۔“

”ادھر ہی سنا دیجئے ادھر کیا ہے۔“ اسی بے بہرہ لہجے میں جواب ملا۔

احسن کا تو جیسے خون ہی کھول گیا۔ کس درجہ خور ہو چکی ہے۔

”پھول بی بی کی موجودگی میں میں تم سے بات نہیں کر سکتا۔ بیڈ روم میں آؤ۔“ وہ جھمکانا انداز میں کہہ کر پلٹ گیا۔  
 ”ہونہ بیڈ روم میں آؤ۔“ اس کے حکم دینے کے انداز پر وہ نئے سرے سے سگی۔

”اللہ کے فضل سے ملازمت کرتی ہوں۔ کسی کے رعب میں نہیں آؤں گی۔“ وہ ہاتھوں سے جھاگ پونچھتی آئی۔  
 بڑھی۔ دوپٹہ ادھر ادھر کہیں نظر نہ آیا۔ ایک تولیہ کھینچ کر اپنے شانوں پر پھیلا دیا اور جیسے پاؤں پختی ہوئی بیڈ روم میں داخل

ہوئی۔

”فرمائیے۔ آج کیا نکلا ہے زنبیل سے؟“ وہ تنگی سے گویا ہوئی۔

”اگر تم خود اس ادا اپنی سطح سے نیچے آ جاؤں، خاصا سکون آ سکتا ہے میری زندگی میں۔ دو چار پیار پیارے سے پیہ میرے آگن میں کھیلین، لامحالہ میری زندگی میں خاص رنگ آ جائے گا۔“

”تایا جان نے؟“ بابر کو حیرت ہوئی کہ سپرہ بھائی کے نام نہیں بلکہ اس کے بیٹے کے نام؟  
”جی ہاں۔ میری زندگی کے گیارہ سال اپنے تایا جان کے گزرے ہیں۔ وہ بے اولاد تھے اور ان کی وائف بھی اس دنیا میں نہیں تھیں۔ بہر حال انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ چار سال کی عمر میں میں ان کے ساتھ بحرین چلا گیا۔ مجھے عیش و آرام ملان سے۔ یہ اور بات ہے کہ میری زندگی کے ساڑھے تین تعلیمی سال ضائع ہو گئے۔

ایک سال شروع میں جب اوویل کا امتحان دینے والا تھا۔ تاہم جان کو چھ ماہ کے لئے اقوام متحدہ ریکرڈ میں ایک کورس کے سلسلے میں جانا پڑا تقریباً دہ سال بعد جب ان کی ڈیجھ ہوئی اور مجھے اسلام آباد واپس جانا پڑا عجیب سی بدقسمتی ہو گئی تھی۔ اس لئے میڈیکل یا انجینئرنگ کی طرف سے میرا رجحان ختم ہو گیا۔ اس قدر محنت بھی کی جائے پھر ملزامت کے حصول کے وقت ہمر کا چکر۔ میں نے انیمل اے کر لیا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں۔ ”وہ نہیں دیا تھا۔“

”یہ بھی بلکہ یہ تو سب سے بہتر ہے۔“ بازر نے اضافہ کیا۔  
 ”دیے ہی زندگی میں خاصا پیچھے ہو گیا تھا۔ مزے خاصے مجھے پڑے تھے۔ مگر میں جو میری ذمہ دارانہ پوزیشن تھی اس لحاظ سے اب میں مزید ”دیے“ کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔“

ہم دونوں دوست ہیں بہت قریبی۔ اسی کا گھر ہے یہ۔ یوں سمجھ لیجئے وہ سہرا یہ ہے اور میں محنت۔“  
 ”آپ نے بہت اچھا کام شروع کیا ہے یہ تو کبھی نہ ختم ہونے والا کام ہے۔“  
 ”جی ہاں.....!“ احسن تے تانہ کی۔

”بھائی جان! آپ سر دس بھی تو کرتے ہیں۔“ فیضان نے بھی حصہ لیا۔  
 ”سر دس تو پہلے کی ہے، یہ تو بہت بعد میں شروع کیا ہے۔“ اس نے فیضان کو بتایا۔ ”بڑی جگ و دو کے بعد ٹرانسفر ہوا تھا یہاں اتنی مشکل سے کہ میں سر دس چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔“

”سروں کہاں ہے آپ کی؟“ یضآن نے دچکی کا مظاہرہ کیا۔  
 ”سول ایوی ایشن میں بڑی معمولی سی ملازمت ہے۔“ وہ مسکرایا۔  
 ”جگہ کا نام تو اچھا ہے۔ خاصا معزز سا۔“ یضآن نے بے ساختہ کہا۔

احسن و بابر ہنس دیئے۔

اسی دمِ ثمنیہ ذرا تنگ روم میں داخل ہوئیں۔

”احسن۔ سمجھاؤ اس فیلی کی بچی کو۔ روئے جا رہی ہے۔ بالکل خنیں بن رہی۔“

اسن ایک دم چونک کر سر دھکڑھکا ہوا گیا۔

”کیا آپ کو یہ خبر ہے؟“

”خود کو چھو تو تم۔“ وہ ایلین بلٹ گنسر، احسن تیزی سے ان کو چھو نکالا۔ وہ کہیں میں، غلطی سے منظر کے لیے

تھا۔ نائلہ نے تو دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا ہوا تھا۔ نبیلہ دوسرے موڑھے پر ساکت بیٹھی نائلہ کی سمت دیکھ رہی تھی۔

شہوار کے ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا دوسرا ہاتھ نالہ کے کان بٹھ چڑھا۔

”بھلا روئے سے کیا ہوتا ہے۔“ ساتھ ساتھ وہ سمجھا بھی رہی تھی۔

”زندگی میں کوئی چیز مرضی کی بھی ہوگی یا صرف ایڈجسٹمنٹ ہی کرتے رہیں گے؟“  
نائلہ کا ہلکا جیسے خون میں طول ہو کر رگ دریشے میں دوڑ رہا تھا۔

باہر اگلے روز ہی شام کی فلائٹ سے نائلہ کو لے کر اسلام آباد آ گئے تھے۔ نائلہ اگر ان کی غیر معمولی خاموشی محسوس نہ کرتی تو شاید ضد کر کے دو چار روز مزید رکتی۔ اس کی سمجھ میں ذرا نہ آیا کہ ان کا سوڈا اتنا بدلا ہوا کیوں ہے؟  
یہ بھی نہیں تھا کہ ان کا ”نشر“ چھوٹ گیا تھا اس لئے واپسی کی جلدی تھی۔ ان کی پوری تیاری رہتی تھی۔ آخر بیرون ملک بھی جاتے رہتے تھے۔ انہیں اپنا انتظام کرنا آتا تھا اور یوں بھی ”ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔“  
گھر آتے ہی اس نے متین صاحب کا فون ریسیو کیا جو اس کی غیر موجودگی میں بھی کئی مرتبہ رینگ کر چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اسکرپٹ مکمل ہو چکا ہے۔ وہ ٹی وی اسٹیشن پہنچ جائے۔ اسکرین ٹیسٹ تو اس کا ہو ہی چکا تھا۔ اب تو صرف پلے کی تیاری کا مرحلہ تھا۔

اسے اس نئی اطلاع سے یکدم خوشی ہوئی، جیسے فرار کی کوئی راہ نکل آئی ہو۔  
متین صاحب نے بتایا تھا۔ یہ سات اقتسام پر پنی سیریل ہے۔ اس کی پریکٹسی پرائم کے پیش نظر وہ جلد از جلد ریکارڈنگ شروع کرنے کے موڈ میں تھے۔

شام چار بجے باہر نے گاڑی بھجوا دی تھی اور وہ اسٹیشن چلی آئی تھی۔  
وہاں کا ماحول جیسے اس کی روح کا نقاشا بن گیا تھا۔ آنا جانا، آوازیں، تھپتھپاتیں، مباحثے۔ اور براہ راست ان چہروں سے رابطہ جن سے صرف اسکرین کی حد تک آشنا تھی۔  
وہ متین صاحب کے آفس میں بیٹھی ہوئی تھی کہ فون کی بیل ہوئی۔ متین صاحب نے فون اٹھاتے ہی ریسیور اس کی سمت بڑھا دیا۔

”کس کا ہے..... باہر ہیں؟“ اس نے متین صاحب کی سمت دیکھا۔  
”نہیں کوئی خاتون ہیں۔“

نائلہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔ ”جی ہیلو۔ نائلہ بات کر رہی ہوں۔“ دوسری طرف صغیہ تھیں۔  
”السلام علیکم امی! جی میں ٹھیک ہوں۔ جی باہر کے ساتھ ہی آئی ہوں۔ جی..... سب ٹھیک ہے۔“ اس نے ”سب“  
تدیر سے لہبا کھینچا۔ ”ٹھیک ہیں باجی۔ گھر فون کیا تھا؟“  
”جی میں ملازم کو تاکید کر کے آئی تھی کہ گھر سے کسی کا فون نہ آئے تو ٹی وی اسٹیشن کا نمبر دے دیتا۔“  
”ویسے اگر نہ بھی کہا ہوتا تو باہر سے پتا چل جاتا۔“

”کیا کہہ رہی ہوں؟ ٹی وی پر کیا ہوتا ہے امی؟ جی ہاں باہر کی سو فیصد اجازت سے..... باہر اباجی کا انتخاب ہیں امی..... اس گھر میں میں اباجی کی مرضی سے آئی ہوں۔ یہ سب ان کے ماحول سے ہم آہنگ ہے۔ نہایت براڈ مائنڈ لوگ ہیں۔“

(متین صاحب اسے اس قدر ”ذاتی“ گفتگو کرتے دیکھ کر اٹھ کر باہر چلے گئے تاکہ وہ مکمل کربات کر لے۔ کہ وہ محض نوادروٹی وی آرٹسٹ ہی نہیں۔ ان کے عزیز دوست کی بیوی اور ان کی بھانجی بھی تھی۔)

”اسی بات سے دیکھئے۔ اس میں وقت ان کے دوست کے پاس ہوں اور وہ اپنی کسی ”سہیلی“ کے پاس ہوں گے۔ نہیں ہوں گے تو جانے کے لئے سوچ رہے ہوں گے یا ان کی کوئی ”سہیلی“ خود انہیں لینے پہنچ جائے گی۔“ وہ ہنسی۔

”ہمارے تو نصیب میں ہی رہتا ہے۔“ وہ ناک آنکھ پونچھتے ہوئے بڑبڑائی۔  
”بری بات ہے نیلی! ایسے نہیں کہتے۔“ احسن نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
”وہ تو پہلے ہی اللہ میاں کی گائے ہیں پتا نہیں کیا گزرتی ہے بے چاری پر۔ کن کن مسئلوں سے غمتی ہیں۔ اتنا بڑا ظلم ہے کہ یہ میرا تو دل نہیں چاہتا میں اباجی سے کبھی ملوں۔“ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔  
”بری بات۔ بتا دے سب جو تم کر رہی ہو اس سے کیا ہوگا؟“ اس نے نائلہ کا بازو تھاما۔ ”انھو شاہ شامندھوؤ۔ لو یہ پانی پیو۔“ اس نے شہوار کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

نائلہ نے گلاس ہاتھ سے پرے کر دیا۔  
احسن نے زبردستی اسے کھڑا کیا۔ وہ ایک احسن کے سینے سے لگ گئی۔  
”آپ کو کیا بالکل دکھ نہیں ہوا۔ ایسی مورنی جیسی پیاری باجی۔ یہ ہوا ان کے ساتھ۔ اباجی نے گھر میں ہوا تک نہیں لگائی۔“ وہ بری طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔  
”نیلی۔“ ہوش کرو گڑیا۔ حالات و واقعات مخالف ہوں تو انسان مروت نہیں جاتے۔ مشکلوں میں ہر ایک کا حصہ ہے البتہ ہر مشکل کا رنگ مختلف ہوتا ہے۔

تم تو اتنی باہمت اور کچھ دار ہو۔ پھر بھی۔  
”آگ لگ جائے ایسی سمجھداری کو کہ انسان کھل کر اپنے دکھوں پر ماتم بھی نہ کر سکے۔“  
”وہ مطمئن ہے اس نے ایڈجسٹ کر لیا ہے خود کو۔ مت بلکان کرو خود کو۔“ احسن نے پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
”زندگی میں کوئی چیز مرضی کی بھی ہوگی یا صرف ایڈجسٹمنٹ ہی کرتے رہیں گے تمام عمر۔“ وہ احسن کا بازو ہٹا کر پھنکارتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اتنی تیزی میں کہ باہر ایک طرف فوری نہ ہٹتے تو ٹکراؤ یقینی تھا۔  
نبیلہ پھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔

”بلو..... تم تو بڑی ہو۔ سمجھایا کرو اسے۔“  
نبیلہ نے اپنی خالی خالی آنکھوں سے احسن کی سمت دیکھا۔

”بہت جذباتی ہے یہ۔ اس کی زندگی میں خاصا آرام رہا ہے ہر چیز بروقت ملتی رہی ہے۔ اس لئے زیادہ تکلیف اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔“  
نبیلہ نے انتہائی سرد انداز میں تجزیہ کیا۔  
”نہ جانے کیوں شہینہ آبدیدہ ہو گئیں۔“ میں ذرا صبر کر کے نماز پڑھ لوں۔“  
وہ چہرہ موڑ کر بولیں اور باہر نکل گئیں۔

”بھابھی جان! کھانا تو باجی کے ہاں کھا کر آئے ہیں آپ کچھ کھینچے گا نہیں۔ باہر بھائی البتہ دودھ پیچے ہیں سوئے سے پہلے۔“ وہ انھی اور احسن کے قریب سے گزر کر وہ بھی اسی سمت مڑ گئی جس طرف شہینہ مئی تھیں۔  
”احسن سینے پر بازو دینے کی گہری سوچ میں گم تھا۔ باہر اور فیضان واپس ڈرائنگ روم میں جا چکے تھے۔  
”آپ کے لئے کھانا لگاؤ؟“ شہوار نے اکھڑے ہوئے سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”ابھی نہیں۔“ وہ کسی خیال سے چونک کر اس کی سمت متوجہ ہوا۔ پھر آگے بڑھ کر چائے بنانے لگا۔ شہوار نے ایک لپٹے کو سوچا کہ آگے بڑھے پھر خود ہی ارادہ ملتوی کر کے لا پر وای سے شانے اچکائی ہوئی باہر کے پاس چلی آئی۔ جو ابھی تک نائلہ کے آنسوؤں اور اس کے الفاظ کے گرد اب میں تھے۔



”میری دماغی حالت بالکل نارمل ہے ای۔ آپ قطعاً پریشان نہ ہوں۔ اور میں بہت زیادہ خیریت سے ہوں۔ باہر کاروبار و سہیلیوں میں کتنے ہی مصروف سہی میری ناز برداریوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یقین کیجئے۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنے انک کا بومیس کئے۔

”اباجی قطعاً تعلق کر لیں گے؟ بہت خوشی کی خبر ہے۔ یقین کیجئے اگر کبھی باہر نے اپنے گھر سے بھی نکال دیا تو ابھی ان کے پاس نہیں آؤں گی۔ مگر..... آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں ای۔ میرا اپنا گھر ہے۔ میں اپنے میاں کی پسند سے زندگی گزار رہی ہوں۔ جس کے ساتھ اباجی نے میرا عمر بھر کا تعلق جوڑا ہے۔“

”آپ بڑی سے بڑی قسم لے لیں، میں باہر کی مرضی کیخلاف کبھی کوئی کام نہیں کرتی اباجی کے گھر سے تو میں آگئی ہوں۔ اب تو باہر ہی میری جنت و دوزخ ہیں۔ خدا حافظ ای! مجھے معاف کر دیجئے گا ای! میرے لہجے کی تخی! میرا کوئی شکوہ آپ کی ذات سے نہیں ہے۔“

اس نے ریسور رکھ دیا اور پرس سے ٹشو نکال کر اس نے آنکھوں میں آئے قطرے جذب کئے اور اگلے ہی لمحے اسکرپٹ اٹھا کر اس طرح منہبک ہو گئی جیسے سوائے اسکرپٹ کے کسی اور طرف دھیان ہی نہ ہو۔

پائلٹ کی منظوری تک اسے انتظار کے ایک مرحلے سے گزرنا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی لاحق ہر رہا تھا کہ پائلٹ کی منظوری میں کہیں وقت بہت آگے نہ نکل جائے۔ ٹھیک ہے آج کل کوزرٹس کا فیشن ہے، مگر انسان کی جاں ڈھال پر فرق پڑتا ہے ایک اسے باہر کاروبار بھی الجھائے ہوئے تھا بہت زیادہ خاموش ہو چکے تھے۔ زیادہ خطاب نشے کی حالت میں کر لیتے تھے۔ اگلے روز پھر دیوے ہی سرد مہر اور چپ۔ اسے دو درویرک اپنی کوئی غلطی یاد نہیں آئی تھی۔ اس لئے اسے پردہ بھی نہیں تھی۔ مگر وہ باوجود کوشش کے ان سے کہہ نہیں پارہی تھی کہ وہ متین صاحب کو متوجہ کریں۔ ہیڈ کوارٹر میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ اگر دو تین ماہ گزر گئے تو وہ ریکارڈنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں رہے گی۔ مگر باہر کا سرد رویہ دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ یوں بھی جو کچھ ہو رہا تھا۔ وہ باہر کی دلچسپی سے محروم تھا۔

مگر یہ عین اس کی خوش قسمتی تھی کہ پائلٹ منظور ہو گیا تھا۔ کہانی بھی خاصی اداس اور منفرد تھی۔ مری کے ڈاک بنگلے کے چوکیدار کی بیٹی کا رول تھا۔ جس نے اپنی اکلوتی اولاد میں اپنے ہر خواب کی تکمیل دیکھنا چاہی تھی۔ اسے پڑھا لکھا کر ڈاکٹر بنایا۔ وہ ہائی سینٹری مود کر لگی تو باپ کی حیثیت کے سبب اسے اپنے محبوب اور اس کے گھر والوں کے سامنے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کے محبوب کے گھر والوں کا خیال تھا کہ اتنے مشہور علاقے میں وہ چوکیدار تھا۔ اکثر مری جانے والے امراء اس سے واقف ہوں گے اسے جانتے ہوں گے۔ اگر نہیں بھی تو کبھی بھی یہ بھانڈا بیچوٹ سکتا ہے۔ ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ساری سینٹری انہیں کم ذات اور دو لوتا جانے گی۔ یہاں تو یوں بھی لوگ ایک دوسرے کے ”ویک پوائنٹ“ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اپنے اپنے احساس برتری کو استحکام بخشنے کے لئے! اب لڑکی کو باپ اور محبوب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ کھیل کا یہی وہ حصہ تھا جہاں نائلہ کو اپنی پر فارمنس کی صلاحیت منواتھا۔

سات اقساط کی سیریل تھی۔ تیسری قسط کی ریکارڈنگ کے دوران ہی پہلی قسط آنا پر چلی گئی تھی۔ اخبارات میں تو کھیل آئل ایر جانے سے پہلے اس کے تذکرے شروع ہو چکے تھے۔ لہذا اصحابیوں سے علیک سلیک شروع ہو چکی تھی۔

تیسری قسط کی ریکارڈنگ کے دوران ہی اسے اطلاع ملی کہ ایک بہت مشہور میگزین کا ناماندہ اس کا انٹرویو کرنا چاہتا

متین صاحب نے اسے بتایا کہ اس میگزین کی صحافی دنیا میں بہت اہمیت ہے اسے انٹرویو ضرور دینا چاہئے۔ اس پر وہ کانٹھوں نے ایس ایم بخاری بتایا تھا۔

مگر جب نائلہ نے متین صاحب کے کمرے میں قدم رکھا تو سات آسمان اس کی نظروں کے سامنے محوم گئے۔ سرخی مائل براؤن کوٹ اور دہانٹ پینٹ میں ملبوس رازی بہت غور سے دروازے کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نائلہ ڈنگ کے دوران اٹھ کر آئی تھی اس لئے کردار کی ڈیمانڈ کے مطابق ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ میڈیکل کالج کی طالبہ رہا۔ وہ سفید کوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوئی تھی۔ چہرہ بالکل سادہ تھا۔ ہاتھوں دکاؤں تک میں کچھ نہیں تھا۔ ایک ایسٹوڈنٹ کا سا حال تھا۔ جسے اپنی تعلیم کے علاوہ اور کسی شے سے دلچسپی نہ تھی۔

”السلام علیکم۔“ رازی کی نہ بھلائی جانے والی آواز کمرے میں گونجی

”آپ؟ ایس ایم بخاری.....“ نائلہ نے یکدم خود پر قابو پا کر خاصی سرد مہر اور درشتی سے پوچھا۔

”یہ میرا کارڈ ہے۔“ رازی نے ایک کارڈ اس کی سمت بڑھادیا جو نائلہ نے فوراً ہاتھ بڑھا کر لے لیا تھا کہ یہ بزنس سے ایک دم صحافی کیسے ہو گیا؟ وہ بھی اتنے مشہور میگزین میں؟

سفید رنگ کے کارڈ پر سنہری چھپائی تھی۔ جس پر ایس ایم بخاری لکھا تھا۔ میگزین کا نام اور تین چار فون نمبرز درج تھے۔ نائلہ نے نہایت تعجب سے پھر اس کی سمت دیکھا اور کارڈ اس کی سمت بڑھا دیا۔

”تشریف رکھئے۔“ رازی نے کارڈ واپس جیب میں ڈالتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

”شکریہ۔“ وہ کبھی رازی کے مقابل شعوری طور پر کئے سر نہیں آئی تھی حالانکہ وہ اس کا مسایہ تھا۔ لاشعوری طور پر اس کا پیچھے دوپٹے کا آنچل سر پر پھیلا لیا۔

متین صاحب کی موجودگی میں وہ اس سے ماضی کے حوالے سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک دم لائق و اجنبی ہو کر وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

رازی نے چھوٹا ٹیپ ریکارڈ اس کے قریب رکھ دیا۔ خود لکھے ہوئے سوالات پر نظر ڈالنے لگا۔ جو چھوٹی سی پاکٹ ڈی میں درج تھے۔

”ایک منٹ مسٹر بخاری۔“ نائلہ نے ٹیپ کا اسٹاپ پریس کر دیا۔

”میری طبیعت اس وقت اچھی نہیں، میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتی۔ کل ریکارڈنگ نہیں ہے۔ کل تھکن بھی نہیں ہوگی۔“

”اگر آپ کو بھر و سنا نہیں وہ دوسری بات ہے۔“

”آپ تو کل دفتر میں ہوں گے؟ میں آپ کو وہاں سے پک کر لوں گی۔ میرے گھر کے راستے ہی میں اس کا براؤنج ناہے۔ پھر میں آپ کو اپنے پسندیدہ ریستورنٹ میں لے کر جاؤں گی اور نہایت تفصیل سے آپ کو انٹرویو دوں گی۔“

رازی کی نظروں میں اس قدر تحریر تھا کہ بت کی طرح جامد سا نظر آیا۔ نائلہ اس کی کیفیت پر بے ساختہ کھلکھلا اٹھی۔

”متین بھائی مجھے ڈراپ کر دیجئے۔ رات بھی سوئیں پانی۔ بری حالت ہو رہی ہے۔“

”آ..... آ..... پ“

”جی میں نائلہ ہی ہوں۔ نائلہ باہر مرتضیٰ سابقہ نائلہ شہ۔“

”وہ تو میں جانتا ہوں۔“ وہ متین صاحب کی طرف دیکھ کر خفیف سا ہنسنے لگا۔

لہر سائے کی“ وہ قدرے تنگی سے گویا ہوئے۔

”ساری زندگی غلطیاں ہی کی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے۔“ وہ ایک سرد آہ کے ساتھ بولیں۔

(انعام علی۔ میں نے تو ساری زندگی آپ کی طرف نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ مبادا آپ کی شعلہ باز نظریں میری سمت ٹپی ہوئی نہ ہوں کیا رشتہ ہے ہمارے مابین؟)

”تمہارے اعتراف سے مجھے میرا ماضی تو ملنے سے رہا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”یہ تو صرف نا کردہ گناہوں کے اعتراف ہیں انعام علی۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولیں۔

”خود پر ترس کھانے کا یہ بہانا اچھا ہے۔ یہ بات تم کسی اور سے کہو وہ شاید یقین کر لے۔ اس رات کو اگر تم اپنی کارکردگی نہ دکھاتی تو.....“ وہ رک گئے۔

”مجھے تو احساس بھی نہیں تھا کہ آپ ہمیشہ کے لئے جارہے ہیں۔ میں نے تو اماں جان سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ اتنی رات کو آپ کہاں جارہے ہیں؟ میں تو یہی سمجھی تھی کہ آپ اماں جان سے مل کر جارہے ہیں۔“

”یہ سب تم نے بہت پروگرام کے ساتھ کیا تھا۔ تم سب کچھ جانتی تھیں۔“

”جب آپ کو ساری زندگی یقین نہیں آیا تو اب کیا کروں گی۔ یقین دلا کر؟“

اب تو جو کہنا سننا ہوگا۔ اللہ کے دربار میں ہوگا۔ میں آپ سے اس موضوع پر کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔“

معادہ ایک دم پھر چونک کر ان کی سمت دیکھنے لگیں۔ ”اس لفافے میں کیا ہے؟“

”منزلہ کے مستقبل کے لئے خوشیوں کی تلاش۔“ وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

نور بانو نے اٹھ کر ٹیوب جلائی۔ پردے گرے ہوئے تھے۔ اس لئے کمرے میں روشنی بہت مدھی تھی۔ پھر واپس اپنی جگہ بیٹھ کر لفافہ دیکھا جو سر بند نہیں تھا۔ بواس بات کی علامت تھی کہ لفافہ اس سے پہلے کئی ہاتھوں سے گزر چکا ہے۔ انہوں نے نہایت بے تابی سے لفافے میں سے ایک نہہ شدہ کاغذ نکالا۔ اور تیزی سے نظریں دوڑانے لگیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ وحدہ لا شریک کا ایک خاکسار و عاجز بندہ اپنے اجتہاد جس میں اللہ کا کرم و تعاون جو ہر کی حیثیت کے ساتھ آپ کے سوالات کے جوابات دے رہا ہے۔

مکرمی۔

جس عورت کا شوہر لا پتہ ہو جائے وہ عدالت سے زوجہ کرے۔

عدالت نکاح کے گواہ اور لا پتہ ہو جانے کے گواہ طلب کر کے اس عورت کو چار سال تک عدت کرنے کا حکم دے۔

اگر چار سال تک شوہر نہ آئے۔ نہ اس کا پتا چلے تو عدالت اس کے شوہر کی موت کا فیصلہ کرے۔

اس فیصلے کے بعد جب عورت چار مہینے دس دن شوہر کی موت کی عدت گزارنے عدت ختم ہو جانے کے بعد عورت دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ اگر مندرجہ ذیل شرائط کے مطابق عدالت نے اس کے شوہر کی وفات کا فیصلہ کر دیا تھا اور عورت نے موت کی عدت بھی گزاری تھی کہ شوہر واپس آ گیا۔

تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ عورت نے دوسری جگہ نکاح نہیں کیا تھا۔

یا اگر نکاح کیا تھا تو وہ رخصت ہو کر شوہر کے ساتھ نہیں رہی۔

”میرا مطلب یہ تھا آپ زحمت نہ کیجئے گا میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ کا ایڈریس؟“

”متین بھائی بابر کا کارڈ دے دیجئے انہیں۔“ دودو پیڑھ کاٹوں کے پیچھے اڑس کر حد درجے نیازی سے گویا ہوئی۔

متین صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آپ تشریف رکھئے بخاری صاحب! میں بھابھی کو گھر بھجوانے کا انتظام کر کے آتا ہوں۔ آپ چاہیں تو ڈرامے کے کسی اور کردار سے بات چیت کر سکتے ہیں۔“

”بہت بہت شکریہ متین صاحب۔ ویری ٹکس آف پور ریلی۔“

”آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو ڈرامہ کر سکتا ہوں۔“ وہ ناکلہ سے مخاطب ہوا۔

”شکریہ۔ دراصل میں اپنے میاں کو اطلاع دینے بغیر کسی اجنبی کے ساتھ اتنا لمبا روٹ طے نہیں کر سکتی۔ ایک بار پھر

شکریہ۔ ہمارا آپ کے ساتھ پروگرام کل ہے۔ آج انہیں اطلاع مل جائے گی کہ کل میں کہاں ہوں گی۔“

وہ پرس جھلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

رازی ہکا کا اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی ناکلہ ہے جس سے ملنے کے لئے وہ سوا گھ

رچا کر یہاں تک پہنچا تھا۔

نور بانو آنکھوں پر بازو رکھے نواسی کے برابر دراز تھیں۔ منزلہ گڑیا کے بالوں میں انگلیاں چلاتی نہ جانے کون سے

جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔ انعام علی کمرے میں داخل ہوئے۔

سفید سفاری سوٹ میں لمبوس اپنی پراسرار خاموشی کے ساتھ۔ پیچھے ہوئے ایک دوسرے میں پیوست لب جو دیکھنے میں یہ تاثر دیتے تھے کہ بہت مشکل سے کھلتے ہوں گے۔

”السلام علیکم!“ منزلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نور بانو نے چونک کر بازو آنکھوں پر سے ہٹایا۔

”وعلیکم السلام!“ انہوں نے دبی ہوئی آواز میں جواب دیا

منزلہ باہر چلی گئی۔

”سورہی ہو؟“ انعام علی نور بانو سے مخاطب تھے۔

”نہیں.....“ (اب سے نہیں جانے کب سے۔ بھر پور فینڈ نہیں سوئی۔ آہ)

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا براؤن لفافہ نور بانو کی سمت اچھال دیا۔ اور خود کرسی پر بیٹھ گئے۔

نور بانو کا چہرہ ڈھلے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”یہ..... یہ کیا ہے؟“ ان کی آواز ہلکلی لگی۔

”پڑھ لیٹا۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔“ وہ بہت دھیمے پن سے کہہ رہے تھے۔

”جگنو کہاں ہے؟“

”ٹھکیلے کے پاس.....“ نور بانو کی آواز میں ہنوز لرزش تھی۔

”منزلہ تو ٹھیک ہے ناں؟“

”جی..... روگ بھی تو لا علاج ہے۔“ وہ یاسیت سے گویا ہوئیں۔

”جب تک انسان کا سانس سے رشتہ قائم ہے اسے ناممکن لفظ سوچنے کے بجائے عمل کرتے رہنا چاہئے۔“

میری بیٹی جس عمر میں بیوہ ہوئی ہے۔ اس عمر میں تو لڑکیوں کی شادیاں بھی نہیں ہوتیں۔ تمہیں بہت جلدی تھی اس کا

اس صورت میں یہ ہے کہ عورت دوسرے شوہر کے ساتھ رخصت ہو کر چلی گئی تھی یا اس کے ساتھ تنہا ہوئی تھی۔ اس صورت میں بھی یہ عورت پہلے شوہر کے پاس رہے گی۔ لیکن اس صورت میں اس عورت کے ذمہ دوسرے شوہر کی عدت گزارنا لازم ہوگا۔ اور دوسرے شوہر کے ذمہ اس کا مہر بھی لازم ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ پہلے شوہر کے واپس آ جانے کی صورت میں یہ عورت بہر حال پہلے شوہر کی بیوی ہے۔

والسلام!

”اوہ..... انہوں نے مفتی کے دستخط پر نظر ڈال کر کمر اسانس لیا۔

انعام علی کس درجہ سرگرواں ہو چکے تھے۔ انسان کے عمل ہی میں تو رد عمل چھپا ہوا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ میری بھی اولاد ہے وہ کون سا موڑ ہے جب انسان اللہ کے حضور سرسجود ہو کر اپنے کردہ و نہا گناہوں کی معافی مانگتا ہے؟ وہ دروازہ کھول کر باہر آئیں۔ لاؤنج میں ٹیکلیہ کا رہنٹ پر ٹیٹھی بالوں میں تیل ڈال کر مساج کر رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر نور بانو کی سمت دیکھا۔

”انعام علی کہاں ہیں؟“ وہ ٹیکلیہ سے مخاطب ہوئیں۔

”لان میں چائے کا کہہ گئے ہیں۔ نچو ہمارے ہی ہے۔“ نور بانو نے کلاک کی سمت دیکھا۔ شام کے پانچ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ وہ لان میں چلی آئیں۔ انعام علی پاپ منہ میں دبائے انگریزی اخبار کھولے بیٹھے تھے۔ نور بانو کی موجودگی محسوس کر کے انہوں نے فوکل گلاسز سے انہیں گھورا۔ مگر کچھ بولے نہیں۔

”آپ نے ان کو شاید یہ نہیں بتایا کہ ہمارا داماد ایک حادثے میں لاپتا ہوا ہے۔ آپ نے شب کے حادثے کے بارے میں نہیں بتایا؟“

”جس انسان کی ڈیڈ باڈی نہیں ملتی اسے لاپتا ہی کہیں گے۔ جن ڈوبنے والوں کو پانی سے نکالا گیا ان میں صرف ایک موت کا شکار ہوا ہے باقی کی زندگی بچ گئی ہے۔ خادر کے علاوہ ایک اور جوان بھی لاپتا ہوا ہے۔

”لاپتا ہونے والوں کا بہر حال انتظار کیا جانا چاہئے۔ اتنے بڑے سمندر کے جانے کتنے کنارے ہوں گے۔“ انعام علی نے پاپ منہ سے نکال کر نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

”کیا یہ دل بہلاوا نہیں؟“ وہ بے ساختہ کہہ بیٹھیں۔

”دل جلانے اور ڈکھانے کے علاوہ کوئی دوسرا کام بھی سیکھا ہوتا۔“ وہ خشک لہجے میں کہہ کر دوبارہ اخبار دیکھنے لگے۔ نور بانو اگلے قدموں واپس ہوئیں۔

گڑیا کے خیال سے وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف آئی تھیں جو اس سے قبل گیسٹ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جیسے ہی اندر داخل ہوئیں وہ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ لفافہ اور مسئلے کا دستی جواب منظر کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے کاغذ تھک کر دوبارہ لفافے میں ڈالا۔

”چار سال انتظار کے بعد مزید چار سال بھی تو گزر سکتے ہیں اور پھر اس کے بعد مزید نئے چار سال۔“ وہ ہلکا سا ہنسی لگا کر ناں سے مخاطب ہوئی۔

”آنے والے چار سال تک میری زندگی کی گارنٹی بھی کسی مجتہد کسی مفتی سے لکھوا لیجئے ای۔ کوئی حرج نہیں۔“ تلخی سے گویا ہوئی۔

یہ نہیں کہتے بیٹے۔ بری بات۔

”مت بنائیے میرا تماشہ۔ میں دولت مند بیوہ ہوں۔ مجھے بکاؤ مال مت بنائیے۔ اب دنیا میں کوئی دوسرا خاوند نہیں کر ہو بھی تو کیا؟ میرے سارے مہر و سے خاوند کے ساتھ تھے۔“

”تمہارے پاپا جو فیصلہ کریں گے بہت سوچ سمجھ کر کریں گے۔ ہمارا دھیان اس کی طرف ہے۔ بہت نیک سیرت ہے۔

ب نیک ہونا بھی مصیبت۔ لوگ ”نیکی“ ہی کو بیک میلنگ کا ذریعہ بناتے ہیں تو یہ کیجئے امی..... بلکہ توبہ

استغفار..... اسد میرے بھائی ہیں۔ بس۔“ وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

نور بانو حیران پریشان اسے جاتا ہوا دیکھنے لگیں۔

نبیلہ اور فیضان قطر روانہ ہو چکے تھے۔ نبیلہ فی الحال ٹیکلیہ کے ہاں تھی۔ کچھ دن احسن کے ہاں بھی رہی تھی۔ حالانکہ ام الدین کو بیکس اطلاع ملی تھی کہ مستقل ٹیکلیہ کے ہاں ہے۔ گھر میں اس وقت وہ دونوں تھے۔ شوہر کپڑے استری کر رہا تھا۔ رات کے سوانح رہے تھے۔ احسن ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کھولے ”خبرنامہ“ دیکھ اور سن رہا تھا۔ عاشورا کو محسوس ہوا کہ فون کی تیل ریج ہو رہی ہے کیونکہ وہ ساتھ والے کمرے میں تھی۔ اس نے فوراً فون اٹھینڈ احسن کے بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔

”ٹھیک پھو پھو کا فون ہو نبیلہ کے کاغذات مکمل ہو گئے ہوں۔ اس کی اطلاع ہوگی۔ یا شاید ڈاکٹر مسعود کا فون ہوگا۔ اس نا ادریز بن میں رہیوں رہا تھا۔

”ہیلو..... کون احمر؟ اسلام آباد سے بول رہا ہے؟“

”ہاں گھر پر ہیں۔ ایک منٹ ہولڈ کر دلاتی ہوں۔“ ٹھٹھکی تو کوئی بات نہیں تھی بھائی کو فون کرنے میں کیا خاص بات تھی؟ اس لئے وہ لاپرواہی سے لاؤنج میں آئی۔

”احمر کا فون ہے۔“ اس نے بس اطلاع دی۔

”احمر کا؟“ احسن ایک دم کھڑا ہوگا۔ ”تم نے ٹھٹھک سے بھی سنا ہے۔ احمر کا فون ہے؟“

”ہاں بس اب تک ”بہری“ نہیں کہا تھا۔ بھانے سے یہ بھی کہہ لیں۔“ وہ بری طرح جل بھن کر رو گئی اور ٹی وی بند کر دی۔ وہی تو سننا چاہتی تھی کہ آخر احمر نے اتنی رات کو اتنی دور سے کیوں فون کیا ہے؟

غزنی سے دروازے کے قریب آئی تھی۔

”تم امی کو حوصلہ دو۔ میں ٹائٹ کوچ سے پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ شیرٹن پہنچ کر میں اطلاع بھجوا دوں گا۔ ہے میرے بر..... اچھا؟ تم بالکل پریشان مت ہونا اور نہ بھوٹی الحال ٹیکلیہ کو کوئی اطلاع نہ دو۔ سخت تاکید سمجھو۔ وہاں نبیلہ بھی ہے۔

”ناکھ ہوگی۔ اس وقت تم حوصلے سے کام لو اور رانی کا خیال رکھو۔“ اس نے رہیورد رکھا دیا۔

”نور دھاڑے دروازہ کھول کر اندر آئی۔

”کیا ہو گیا.....؟“ اس کا دل بری طرح سے دھک دھک کر رہا تھا۔



اللہ رے۔ کوئی حد بھی ہوگی اس خود پسندی کی۔“ اسے چکر سا آگیا۔

سب بڑے طریقے سے وہ اس کی ہستی پامال کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ وہ اسی جگہ پتھر کی طرح ایستادہ کھڑی تھی۔ ہینٹ گزرے تو وہ ہاتھ میں ایک بیگ لئے دوبارہ کمرے میں آیا اور سیدھا دروازے کی سمت بڑھا۔ دوسو ٹہہ بیگ میں رکھے اور دوسرے لوازمات بھی ساتھ ہی رکھ دیئے۔ پھر اپنا شیونگ بس نکالا اور ہاتھ روم میں چلا گیا۔

زیریں رکھ رہا تھا

وہ اسی طرح کھڑی ہوئی تھی اور ٹکڑ ٹکڑا سے ادھر ادھر آتے جاتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر دروازے کی طرف کھولی اور نیوی بی بیس سوٹ نکال کر ہاتھ روم میں چلا گیا۔

وہ پتھر کی طرح ہنوز اسی جگہ نصب تھی۔

دو تین منٹ بعد وہ باہر آ کر بال بنانے کے لئے ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ آئینے میں شہوار کی پشت دکھائی دی تھی۔ اس نے اچھتی ہوئی نگاہ اس کی دراز چوٹی پر ڈالی اور جھک کر دراز سے اپنا پرس نکالا۔ چند نوٹ نکال کر ٹیبل پر رکھ دیئے۔ پھر فون ڈائل کرنے لگا۔

”ہیلو..... مسعود امیر جنسی میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ گھر کا خیال رکھنا۔ آ کر بتاؤں گا۔ تفصیلات تو مجھے بھی پتا نہیں۔“

”بھائی کا فون آیا تھا۔ والد صاحب سے ہے والدہ سے تو نہیں۔ یہ مشکل وقت امی کا ہے اور اس کی خاطر میں بہت ذلیل ہونے کی ہمت بھی رکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تکلیف ابا جی ہے مگر پریشانی ”ماں“ کی ہے۔ ٹھیک؟ انشاء اللہ واپسی پر تفصیل سے بات ہوگی۔“

”میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا اگر آسانی سے ممکن ہو تو حنیف کو گاڑی وے کر بھیج دو۔ ورنہ یہاں دیئے ہی ٹیکسی ماے ملتی ہے اور پھر ایئر پورٹ جانے کے لئے۔ اوکے یار۔“

اس نے بریف کیس اٹھا کر ضروری چیزیں چیک کیں پھر شوز پہن کر ہاتھ دھوئے۔ دوبارہ بالوں میں برش چلایا۔

”گیت بند کرلو۔ رہداری کا دروازہ چیک کر لیتا۔“

اتنے بڑے گھر میں اکیلے سونے کے خیال سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔

حسن نے باہر نکلنے سے قبل اس پر ایک نگاہ غلط مجبوراً ڈالی تھی۔ آنکھوں سے بڑی روانی سے خاموش آنسو بہتے ہوئے رہ گور ہے تھے۔

”جلاؤ میں تمہیں شکلیہ کے ہاں چھوڑتا ہوا چلتا ہوں۔“ اسے جیسے اس کی مظلوم سی صورت پر ترس آ گیا تھا۔

”مگر انہیں یہ مت بتانا کہ میں احمد کا فون سن کر اسلام آباد گیا ہوں۔ ابا جی کی حالت سخت خراب ہے۔ خواجہ ان

ماکے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ رات خاصی ہو چکی ہے۔“ اس کے لہجے میں ناقابل یقین نرمی درآئی تھی۔

”آپ انہیں یہ بھی کہہ دیجئے گا کہ وہ لوگ مجھے فیکٹری آنے سے روک رہے ہیں۔ ویسے ہی اتنی چٹھیاں ہو چکی ہیں۔“

حسن خاموش رہا۔ وہ اپنی تیاری میں لگ گئی۔ دو تین سوٹ ایک بڑے شاہنگ بیگ میں ٹھونے اور چادر اور ڈھ کر تیار

کئے۔

”ٹیلے۔“

”اوہ..... یہ آپ کے پیسے تو یہاں رکھے ہوئے ہیں۔“

اس نے نوٹ اٹھا کر حسن کے حوالے کئے۔ حسن نے کچھ سوچا پھر اس کی سمت دیکھتے ہوئے واپس پرس میں رکھ لئے

احسن نے پلٹ کر دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نظریں جھکا کر گویا ہوا۔

”کچھ نہیں ہوا تو آپ اسلام آباد کیوں جا رہے ہیں؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”پابندی ہے مجھ پر.....؟“ وہ غرایا۔

”احمر نے کیوں فون کیا ہے؟“ وہ اس کی غراہٹ نظر انداز کر کے مصر ہوئی۔

”میرے اور تمہارے مابین کون سا رشتہ ہے کہ میں تم سے پرسٹو ڈسکس کروں۔“ وہ باہر نکلنے لگا۔ اجنبیت و بگاڑ

سفاکی کی حد تک بڑھی ہوئی محسوس ہوئی۔

”مم..... میں..... اکیلی نہیں رہوں گی یہاں۔“ وہ بے ساختہ کہہ بیٹھی۔

”اوہ.....!“ احسن نے گہرا سانس لیا۔ ”تو یہ بات ہے۔“ میں پھر کسی خوش فہمی کا شکار ہو چلا تھا۔

حالانکہ مجھے اچھی طرح پتا ہونا چاہئے کہ تمہاری نظر میں سوائے تمہاری ذات کے اور کوئی شے قابل ذکر نہیں

تمہیں ہر طرح کا فائدہ صرف اپنی ذات کے لئے چاہئے۔

جاوید کے خلاف اور میرے حق میں ووٹ بھی شاید اسی لئے دیا تھا۔ بندہ ویل آف سہی گنڈ لنگ زیادہ نہیں۔ تم کتنا

سطحی اور ظاہر پرست ہو اس لئے مجھے ترجیح دی کہ جب لوگ کہیں گے کہ ایک ٹھیک ٹھاک سا بندہ تم پر مرنا ہے تو تمہارا

ویلیو میں مزید اضافہ ہوگا۔“

”اوپر کے کمرے لاکڈ ہیں۔“ اس نے دریافت کیا۔

”کچھ بولے بغیر زینے کی سمت بڑھی تھی۔ احسن نے نیچے کا سارا حصہ چیک کیا۔ اتنے میں وہ واپس آگئی۔“

”لاکڈ ہیں۔“

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے دوبارہ بیڈروم میں آ گئے۔

”آ..... کپ بالکل ڈکھ پاریٹا نہیں۔ کچھ بھی سہی ہیں تو آپ کے باپ۔“

شہوار اس کے چہرے کے سر دین کو مطمئن سمجھی تھی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔

”جن کو کبھی بکھار تکلیف ملتی ہے ان کے ”ڈیزائن“ تبدیل ہوا کرتے ہیں۔ ہمارا تو اب مستقبل۔ یہی ہے محترمہ۔“

نے خاصی تلخی سے بظاہر مسکرا کر جواب دیا تھا اور وہ خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔

اسی دم گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔

شہوار نے بیڈروم کی چابی اٹھائی بیڈروم کی لائٹ آف کی اور دروازہ بند کر لیا، باہر آ کر گیٹ کا تالا لگایا۔

اس کے انداز میں جو بے ساختگی اور غیر شعوری ساما کا انداز تھا احسن نے اس کی ادا کا نوٹس لیا تھا۔

شہوار نے چابی بھائی پھر تالا کھینچ کر تسلی کی۔ پٹی تو احسن کے دیکھنے کے انداز پر گڑبڑا ہی گئی۔ مگر پھر اپنے حواس پر

پانی گاڑی کی سمت آگئی تھی۔

”یار! ذرا کھنٹھ سے نکال لینا۔“ احسن نے فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے ڈاکٹر مسعود کے کپاؤنٹر حریف سے کہا تھا۔

شہوار پیچھے بیٹھ چکی تھی۔

شہوار سوچ رہی تھی..... وہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے؟ یا اس کی تمام حیات مرچکی ہیں.....؟

نہ اسے متاسف دیکھا ہے۔ نہ اسے طول دیکھا ہے اور نہ ڈکھی۔ جیسے ساری دنیا اب تک اس کی شرائط کے مار

تھیا رڈالے ہوئے تھی۔

جب کبھی۔

کسی کے سامنے بھی..... کسی طرح بھی یہ شکست خوردہ نظر آئے گا تو کیسا لگے گا؟ مگر..... میری بے گناہی

ریاضتیں..... شائع تو نہیں جائیں گی۔ اور کوئی نہیں تو کیا اللہ تو میرے ساتھ ہے۔

ڈکھ بجھے کیا آزمائیں گے۔ میں ڈکھوں کو آڑ ماؤں گی۔ انشاء اللہ۔ یہ دنیا جتنی میرے اور احسن کے باپ کی

اور احسن کی ہے میری بھی ہے۔ میں اپنا حق وصول کے بنا اپنے قدم پیچھے نہ ہٹاؤں گی۔

ایک عجیب سا دلولہ اس کے لبوں میں دوڑنے لگا تھا۔

اس نے ہوش پہنچ کر صبح کا انتظار کیا تھا پھر احمر کو اطلاع پہنچائی تھی۔

اطلاع پہنچانے کے تیس منٹ بعد احمر اسے لینے آ پہنچا تھا..... اور آتے ہی بے ساختہ احسن کے سینے سے لگ گیا۔

احسن کافی دیر اسے اپنے سینے سے لگائے رہا۔ وہ احمر کے وجود سے نکلنے والی کسی ان دیکھی روشنی کے حصار میں تھا۔

وہ کیا خفیہ شے ہے جس کا ٹھکانہ پتا نہیں چلتا۔ مگر وہ انسانوں کو باہم کرنے کے کام آتی ہے۔ اچانک جاگ

ہے۔ عین کسی ضروری موقع پر.....! آس پاس دھیروں نو عمر نوجوان چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ مگر ان میں کوئی احمر نہیں ہوتا

اسے بہت اچھا لگ رہا تھا اس طرح احمر کو سینے سے لگائے رکھنا۔ جیسے لو کے موسم میں کورے منکے کا ٹھنڈا خوشبودار

جیسے جس کے بعد ٹھنڈی پھوار۔

جیسے طویل مسافت کے بعد کھلی چھت پر نرم بستر اور شام کی ہوا۔

(اباجی..... کتنا بڑا نقصان کیا ہوا ہے آپ نے میرا) اس نے احمر کی پشت تھپتپائی۔

”آپ گھر کیوں نہیں چلے آئے بھائی جان.....؟“ کتنے ترے ہوئے انداز میں وہ احسن کو دیکھ رہا تھا۔

احسن نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور قدرے مبہم مگر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”اگر یہ سب ہونے لگے تو اس الگ جان اور انفرادی زندگی کا کیا فائدہ.....؟ اپنا کردار ادا کر رہا ہوں۔ زندگی سے اپنا

وصول کر رہا ہوں۔ میری جان۔“

اس نے بریف کیس اٹھایا۔ دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ احسن نے کمرہ لاکڈ کیا۔

”اباجی کہاں ایڈٹ ہیں؟“

”راولپنڈی جنرل ہاسپٹل۔“

”ای بھی وہیں ہیں.....؟“

”جی.....“

”اتنی دور لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ قریب ہی بہت اچھے ہاسپٹل اور کلینک بھی تو موجود ہیں۔“

”وہاں چار جز بہت ہوتے ہیں۔ اباجی ٹھیک ہو جائیں گے تو امی پر خفا ہوں گے زیادہ پیسے خرچ کرنے پر۔“ احمر نے

پ کے انداز و اطوار احسن کو دوبارہ سے یاد دلانے کی کوشش کی۔

”ہاں۔ یہ الگ مسئلہ ہے۔“ احسن نے گہری سانس لیتے ہوئے احمر کی تائیدی کی۔

”ایک کب ہوا تھا.....؟“ اس کا ذہن بہت دور پہنچا ہوا تھا۔

”کل ہی..... بس ان کو ہاسپٹل میں داخل کرانے کے فوراً بعد میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“

”اب کیا صورت حال ہے.....؟“ احسن نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

احسن کا حلیہ اور اسٹائل ایسا تھا کہ ڈرائیور نے بغیر پوچھ گچھ کے دروازہ کھول دیا۔ وہ آگے بیٹھ گیا اور احمر عین اس کے

پیچھے۔

”پنڈی جنرل ہاسپٹل“ احسن نے مختصر کہا اور خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا۔ احسن نے صرف ایک کپ چائے پی کر

رائٹی اختیار کی تھی۔ ایک سگریٹ سلا کر گہرا کش لگانے کو بہت دل چاہ رہا تھا۔

مگر اس نے کبھی احمر کے سامنے سگریٹ نہیں پی تھی۔ مگر وہ اس سے خاصا چھوٹا تھا مگر شہور کو پہنچ چکا تھا۔

اپنے احکام و نصائح میں اثر پیدا کرنے کی خاطر لازم تھا کہ وہ خود پر قابو رکھے۔ باپ کی غیر ضروری سختی اور بے محل

اُکرت

بڑے بھائی کی دوری..... اس کے قدموں کو کسی بھی سمت موڑ سکتی تھی۔ لہذا اسے سخت احتیاط ضروری تھی۔

وہ بہت ضبط سے بیٹھا رہا۔ گاے بگاے وہ آئینے میں احمر کی صورت پر اک نظر ڈال لیتا تھا۔ اسے یہ سوچ کر حیرت

ہوتی کہ اس نے کبھی غور ہی نہ کیا کہ اسے احمر کتنا اچھا لگتا ہے شاید اس لئے کہ اس سے خون کا رشتہ ہے۔

یا اس لئے کہ وہ اس کی بات بے چوں و چرا مان لیتا ہے۔

یا پھر اس لئے کہ وہ مودب و کم گو ہے۔



کتنے تعجب کی بات ہے جن سے ہم اتنا قریب ہوتے ہیں کہ ان سے زیادہ کوئی نہیں ہوتا۔  
ہم کبھی ان پر غور ہی نہیں کرتے..... ایک معمول کی گاڑی ہوتی ہے کہ چلتی جاتی ہے۔  
اس کے خالی ذہن میں فلسفہ شروع ہو چکا تھا۔



وہ دونوں ہسپتال میں داخل ہوئے تو صفیہ انہیں راہداری میں مل گئیں۔ کریم کلر کی بڑی سی چادر میں خاصی پریشان اور نڈھال۔ آنکھوں سے لگتا تھا کہ رات بھر سوئیں نہیں۔

”السلام علیکم امی!“ وہ ان کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ وہ اس سے بے ساختہ لپٹ گئیں۔

”بہت ستایا ہے تمہارے باپ نے مگر اللہ گواہ ہے۔ میں نے ان کے لئے یہ سب کبھی نہیں چاہا۔“ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

”حوصلہ کریں امی..... ٹھیک ہو جائیں گے اباجی۔“ اس نے ماں کو اپنے بازو کے حصار میں سیٹھ لیا۔ ”کیا اباجی سے ملاقات ہو سکتی ہے.....؟“

”ہاں..... ہاں..... آؤ..... ویسے وہ ہوش میں نہیں ہیں۔“ وہ فوراً اس سے الگ ہو کر آگے آگے چل پڑیں۔

تینوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

شیخ رحیم الدین کا تو مند و جود بیڑ پر بھر بھری مٹی کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔

کتنے عرصے بعد باپ کے چہرے پر نگاہ پڑی تھی۔ وہ ساکت سا ہو کر سوچتی آنکھوں کے ساتھ انہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ ان کے صحت مند بازو دائیں بائیں بے جان انداز میں پڑے ہوئے تھے۔

ان بازوؤں میں سامنے کی سعادت اسے سال میں دو مرتبہ حاصل ہو جاتی تھی۔

عیدین کی نمازوں کے بعد وہ سب سے پہلے انہی سے عید ملتا تھا۔ نماز کے بعد خطبے کے دوران وہ اور احقر شیخ صاحب کے دائیں بائیں سر جھکائے بیٹھے رہتے تھے۔ خطبہ ختم ہوتے ہی شیخ صاحب..... کھڑے ہو کر سب سے پہلے احسن سے

”تم امی کو لے کر گھر جاؤ۔ انیلا وغیرہ بہت پریشان ہوں گی۔ انہیں اس وقت امی کی سخت ضرورت ہے۔ امی نے کل آرام بھی نہیں کیا۔ میں ہوں یہاں۔“

”احسن بیٹے.....!“

”پلیز امی ضد نہ کیجئے۔“

صفیہ خاموش ہو گئیں اور پھر بولیں.....

”تمہیں ڈاکٹر صاحب سے ملا دوں۔ تمہارا تعارف بھی کرادوں۔“

احسن شیخ صاحب پر جھکا ہوا تھا۔ ایک دم سیدھا ہو گیا۔

”میرے شناختی کارڈ پر باپ کے خانے میں اباجی کا نام لکھا ہوا ہے۔ یہ نامیں ساری دنیا مجھے ان کا بیٹا مانتی ہے۔“ وہ عجیب انداز میں مسکرایا تھا۔

”پلیز..... آپ جانیے امی۔ آرام کیجئے۔“

پھر اس نے پرس سے سوکانوٹ نکال کر احمر کی طرف بڑھایا۔

”جیکسی میں لے کر جانا۔“ یہ کہہ کر وہ ان کے ساتھ باہر تک آیا تھا۔

نالکہ کب سے تیار بیٹھی تھی۔ جاسمی ٹشو کا ٹرٹا سسک کا پانچواں چٹا ہوا دوپٹہ۔ پاؤں میں نازک بے ڈیزائن والی جاسمی ل۔ ہونٹوں پر ہم رنگ لپ سسک۔ بالوں کی سادہ سی چوٹی جس میں جاسمی ریشمی پرانہ ڈالا تھا۔

وہ لاؤنچ میں بیٹھی اخبار پھیلانے انتظار کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ قریب ہی ڈیک پر لٹ کے ٹمکین نعمات چل رہے تھے۔

جنا ہے جگر اٹھتا ہے دھواں

آنکھوں سے میری آنسو ہیں رواں

مرنے سے ہو جائے جو آسمان

ایسی یہ میری مشکل ہے کہاں

باہر آفس جانے کے لئے لاؤنچ سے گزرے۔ اس کے سر پر ایک پرایک نظر ڈالی۔ تب ہی نالکہ نے سر اٹھایا ”بہت اچھی بریں آپ آئیں گی آپ کی۔ اچھی تیاری ہے۔“ وہ مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔

”باہر صاحب!“ نالکہ نے انہیں مخاطب کیا۔

وہ ڈک گئے۔

”آپ ایک بچہ وہیں آجائیے گا۔ اکٹھے لچ کر لیں گے۔“

”سوری..... آج لچ الوینہ سردی کے ہاں ہے۔ اسٹیٹ سے اس کے بچے آئے ہوئے ہیں۔ آج ان سے ملاقات کا

تمام کیا ہے الوینہ نے..... اگر آپ جلدی فارغ ہو جائیں تو آجائیے گا۔ الوینہ کے ہاں کیوں؟“

باہر پوچھنے لگے۔

”دیکھوں گی.....“ اس نے پھر اخبار چہرے کے سامنے کر لیا۔

احسن نے کبھی غور نہیں کیا تھا کہ اس طرح سینے سے لگاتے ہوئے کسی قسم کی گرجوٹی ان کے انداز میں پائی جاتی تھی۔ عجیب مغول کا سا انداز ہوتا تھا۔

اس نے شیخ صاحب کو بغور دیکھا۔ چہرے پر جھریوں کا جال پڑ چکا تھا۔ ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔ بے بسی کی یہ تصویر شاید کبھی کسی کے تصور میں نہ آئی ہوگی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ گرج چک شروع ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سدا تو انائیوں کا سرچشمہ بنے ہوئی دھاڑتے رہیں گے۔

”سید صاحبہ بالکل ناکارہ ہو چکا ہے۔“ صفیہ کی آواز کرے کا سکوت توڑنے لگی۔

احسن نے نہایت ڈھکے دھنس سے باپ کے سر پرے پر نظر دوڑائی۔ اس کی آنکھوں میں گہرا انگڑ تھلکنے لگا تھا۔

”انسان خدا تو نہیں ہوتا۔ پھر وہ خدائی انداز کی غلط فہمی کس بنیاد پر اختیار کرتا ہے؟ کیا مجھ سے تو یہ حراقت سرزد نہیں ہو رہی؟“ اسے اپنا دھیان آیا۔

شکیلہ نے ابھی کچھ ہوئے عاکشہ خالہ کا بیان سنایا تھا جو بڑی ممانی کے ذریعے اسے سننے کو ملا تھا

”کہ باپ پہ پوت نسل پہ گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔“

”کیا واقعی وہ اپنے باپ کے انداز دہرا رہا ہے؟“ اسے ایک دم اپنی فکر پڑ گئی ”مگر میرے اور شہوار کے درمیان تو مسئلہ ہی اور قسم کے ہیں۔ میرا باپ تو انہماکی خوش قسمت ہے کہ اسے میری ماں جیسی راسخ اور فادار یوی ملی ہے جس نے اس شخص سے وفا کے تقاضے بنائے جس کی رفاقت بے یقینی کا دوسرا نام رہی۔

اس نے صفیہ کی سمت نہایت عقیدت سے دیکھا۔

”امی! آپ گھبرائیے نہیں۔ آج کل ہر مریض کا علاج ممکن ہے۔ اگر اباجی کو اعتراض نہ ہو تو میں انہیں علاج کے لئے باہر بھجوا دوں گا۔ مگر آپ ہمت نہ ہاریے۔“ اس نے صفیہ کو شانوں سے تھام کر تسلی دی۔

صفیہ اس کے سینے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”میرا ہیرے جیسا بیٹا مجھ سے دور کر دیا گیا ہے..... بیٹے رائے بیوہ اسے کیوں کہیں جس کا مرد مر گیا ہو رائے بیوہ ہے جس کا سگ بھائی بابینا اس سے چھن جائے۔ عورت جس سے نکاح کرے وہ اس کا مرد وہ پھر سے سہاگن۔ مگر اپنا پیٹ ٹھیک ملتا۔ اپنا خون نہیں ملتا۔ میرے دل کا چین میری آنکھوں کی ٹھنڈک تو تم ہو۔“

”امی..... میں آپ سے دوڑ نہیں ہوں۔ دیکھیے آپ نے حکم دیا میں حاضر ہو گیا۔“ اس نے صفیہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

”امی..... آپ پلیز روئیں نہیں۔“ احمر نے مداخلت کی۔ ”آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔“

”جس دن شیخ صاحب تمہارے بھائی کو سینے سے لگائیں گے طبیعت تو تب ہی بحال ہوگی۔“

وہ آنکھیں پونچھتی ہوئی احسن سے الگ ہو گئیں۔

احسن نے آگے بڑھ کر شیخ صاحب کی پیشانی چھوئی پھر ان کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ پھیرا۔ دایاں بالکل برف ہوا تھا جب کہ بائیں بازو میں زندگی کی حرارت دوڑ رہی تھی۔

”احمر.....!“

اسی دم باہر سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ رازی نے فون پر صبح ساڑھے نو بجے کا ٹائم دیا تھا۔

وہ پرس سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”گلشن.....!“ اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ جو فوراً ہی آمو جو ہوئی۔

”میں جا رہی ہوں۔ دوپہر کا کھانا ہم دونوں ہی باہر کھائیں گے۔“ اس نے باہر کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر بند کر لینا اندر سے..... لڑنا مت ایک دوسرے سے۔ دودھ چولہے پر رکھ کر دی سی آر لگا کر نہ بیٹھ جانا۔ یہ بند کر دو۔“ اہر نے ڈیک کی سمت اشارہ کیا۔

وہ باہر آئی تو باہر گاڑی نکال رہے تھے۔ گیٹ سے باہر رازی اپنی سوزو کی سوئفٹ لئے موجود تھا۔

باہر کو دیکھ کر وہ گاڑی سے باہر آیا۔

باہر جو گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی باہر لا رہے تھے۔ بری طرح چونک اٹھے تھے۔ نہایت گہرا سیاہ رنگ شلوار سوٹ زین تن کئے اور سیاہ ہی گلاسز آنکھوں پر لگائے وہ ایک دم ہشاش بشاش ورتنازہ دکھائی دیا تھا۔

باہر کی گاڑی باہر آ کر رازی کی گاڑی کی سمت بڑھا۔

باہر نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا مگر گاڑی سے اترے نہیں۔

”السلام علیکم!“ رازی کھڑکی کی سمت جھکا۔

”وعلیکم السلام..... ٹھیک ہیں آپ.....؟“ انہوں نے پیسے فارمیٹی بھائی۔

”جی بس میں ٹھیک ہی ہوں۔“ جواب ملا۔

”آپ صبحی کب سے ہو گئے.....؟“ ایک سوال جو ذہن میں چپنے لگا تھا زبانی پر آ گیا۔

”کچھ بھی ہوتے دیر کیا لگتی ہے.....؟“ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر سیدھا ہو گیا۔ اوکے۔“ نائلہ اس کی گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکی تھی۔

اس کے انداز میں ہلاکی خود اعتمادی اور خدو خال میں عجیب سی سرکشی جھلک رہی تھی۔

رازی نے باہر سے پہلے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ دونوں نے مختلف سمتوں میں جانا تھا۔

”آپ بہت تبدیل ہو چکی ہیں۔“ خاصی دیر خاموش رہنے کے بعد رازی نے لب کشائی کی۔

”جی تو اپنی ماہیت تبدیل نہیں کرتا..... آب و ہوا اور موسم مناسب نہ ہو تو مظاہر نہیں بننا۔ اگر موسم بدل جائے اور کے حق میں ہو جائے تو وہ زمین کا سینہ چیر کر اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلانے میں دیر نہیں لگاتا۔“

نائلہ نے پرس سے سن گلاسز نکال کر آنکھوں کے تاثرات محفوظ کئے۔

”بہت خوب..... ماشاء اللہ..... آپ کی ذہانت آپ کو بے خدو و بیادیل بنا رہی ہے۔“

”منڈی میں ہٹا رکھا ہے مردوں نے عورت کو۔ ایک قیمت بڑھا رہا ہے۔ دوسرا گرا رہا ہے۔ شاباش ہے آپ کو لوگا

کو.....“ نائلہ کا حرف زہر یلا تھا۔

”میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ میرا مقصد۔“

”مسٹر سرفراز۔ بات کا بس وہی مطلب ہوا کرتا ہے جو مخاطب کو سمجھ آتا ہے۔“ نائلہ نے تلخی سے بات کاٹ دی۔

”مگر اس میں سمجھنے والے کا بھی تو قصور ہو سکتا ہے۔“ رازی نے اس کی سمت دیکھا۔

”پھر تو بات کرنے والے کو اپنی عقل پر ماتم کرنا چاہئے کہ وہ مخاطب کی صلاحیت پر کئے بغیر اپنے اقوال زریں پیش کر

تا۔“

”لڑائی کا موڈ ہے.....؟“ رازی مسکرا دیا۔

نائلہ کے رگ و ریشے میں انگارے دوڑ رہے تھے۔ وہ نہایت ضبط سے منزل پر پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے رازی کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

”آپ مائیں نہ مائیں..... مگر میں حیرانی کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں۔“

میری روشنی تیرے خدو خال سے مختلف تو نہ تھی مگر

تو قریب آجئے دیکھ لو تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

دو دھیرے سے گنگنا گیا۔

”یہی وہ سیٹ تھی جس پر آپ کے بیٹھنے کا انداز کچھ اور تھا۔ آج بھی وہی گاڑی ہے وہی سیٹ ہے مگر آپ کا انداز سو

بد بدل چکا ہے۔“

نائلہ کے لب ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ان میں کوئی لرزش پیدا نہ ہوئی۔

رازی نے ریٹورٹ کے سامنے گاڑی پارک کی۔ نائلہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ رازی نے گاڑی

اک کی۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ریٹورٹ میں داخل ہوئے۔ وقت بھی کچھ ایسا تھا کہ رش نہیں تھا۔ بہت ساری

بلو خالی تھیں۔

نائلہ نے سب سے آخر کی اور بالکل کونے کی ٹیبل منتخب کی۔ وہ آگے آگے اور رازی پیچھے تھا۔

نائلہ اس طرح بیٹھی کہ تمام ٹیبلوں کی طرف ہو گئیں۔

رازی بیٹھ گیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا نسخا سٹپ ریکارڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور شن دبا دیا۔

نائلہ نے بجلی کی سی خیزی کے ساتھ ٹپ بند کیا اور ہاتھ سے ایک طرف کر دیا۔

مت کیجئے..... بلکہ بند کیجئے یہ ڈرامہ..... میں نے گھاس نہیں کھائی ہوئی ہے۔“ رازی ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگا۔

ویران کی ٹیبل پر پہنچ چکا تھا۔

”دو کافی..... بس.....“ نائلہ نے فوراً آرڈر دے کر اسے ٹھلایا۔

”کیسا ڈرامہ؟ میں سمجھا نہیں۔“ رازی نے بہت الجھ کر اس کی سمت دیکھا۔

”یہی کی آپ صحنائی وحنائی خاک نہیں ہیں..... محض عام مردوں کی طرح آپ نے مجھے ہراساں کرنے کی غرض سے

یہ سوانگ رچایا ہوا ہے۔“

ڈرامے بازی تو میں باہر مرتضیٰ کی بھی برداشت نہیں کرتی جس کے گھر میں رہتی ہوں۔ اور جس کا کھاتی ہوں۔“ وہ

پونکاری..... آگے رکھا گلاس اٹھا کر پانی پینے لگی۔

”جب آپ سب کچھ جان چکی ہیں تو صرف یہ پوچھئے۔ میں آپ سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

رازی کی آواز نہایت مدغم تھی مگر وہ براہ راست اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”پہلے آپ مجھ سے معلوم کیجئے کہ جب میں آپ کی یہ ڈرامے بازی سمجھ گئی تھی تو آپ کے ساتھ آ کیوں گئی.....؟“ وہ

اس کی سمت بغور دیکھ رہی تھی۔

”اگر واقعی یہ سب ہوا ہے تو کڑی سزا کا حقدار ہوں۔“ رازی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”کامگر بچولیشن خاصے روشن ضمیر ہیں آپ..... آپ کی سزایہ ہے کہ آپ میری بہن سے شادی کر لیجئے۔“

رازی کے ہاتھ نے کپ چھوٹے چھوٹے بچا۔

”یہ کیا مذاق ہے؟“ وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

”میرے اور آپ کے درمیان مذاق کا کوئی رشتہ نہیں۔ آپ کی طرف سے جو کچھ ہو ہم سہہ جائیں ہماری طرف سے

کچھ ہو تو مذاق ہے۔ ہماری ذات کا تماشا بنانے کے لئے آپ کو این اوسی جاری ہوا ہے۔“

اس کے لہجے میں زہر اُٹا آیا۔

رازی سر جھکائے کافی کے سپ لیتا رہا۔ یوں جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔

”آپ کی دفعہ میں کیا میں کسی اور جہاں کا باشندہ تھا کہ آپ کے والد صاحب کو قبول نہیں تھا اور اب وہ لوگ سی نی

نصوحیات پیدا ہو گئی ہیں کہ آپ کے والد صاحب کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

اس نے جیسے نالہ کولا جواب کر دیا چاہا۔

”میری دفعہ میں انہیں یقین ہو چلا تھا کہ میں اپنی قسمت کے فیصلے خود کرتی پھر رہی ہوں اور یہ ان کی آن کے خلاف

ہے کہ جو لوگ اس کے رحم و کرم پر ہوں وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود کریں اور اس مرتبہ میں اپنی آزاد حیثیت کے ساتھ اپنی

پوچھو کے ہمراہ ان کے سامنے ہوں۔ اور یوں بھی اب بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔“

”مگر یہ بہت ناممکن سی بات ہے۔“ رازی نے جیسے واضح انکار کیا۔

”مگر آپ کو یہ کرنا ہوگا“ آپ میرے عی نہیں میرے پورے گھر کے مجرم ہیں۔ جس لڑکی کی بارات چند روز پہلے ڈنک

جائے۔ اسے آپ کا معاشرہ اس طرح دیکھتا ہے جیسے وہ کسی گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوئی ہو۔“

”مگر یہ کتنی معنی خیز بات ہے دل یوں تو تبدیل نہیں ہوا کرتے۔“ وہ بہت آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

”آگ لگا دیجئے اسے دل کو کھس کر دیکھئے اس معاشرے کے اندر اور ٹٹولنے ان کے دل جانے کتنے ضرب تقسیم کے

مرحلے ہو رہے ہیں۔“ وہ بخٹی سے گویا ہوئی۔

”میرے باپ کی آمریت کے باوجود آپ میری ماں کی استقامت و وفاداری ملاحظہ کیجئے۔ میری بہن سوت بن کر

رہ گئی دو بچوں کے باپ کے ساتھ اسے دیکھئے تو کسی اتنی سادری کا گمان ہوگا۔“

اور میں جسے اپنا بہنوئی جان کر جانے کیا کیا منصوبے بنائے بیٹھی تھی۔ اب اس سے وفاداری کا یہ عالم ہے کہ آپ کے

رومال سے اپنے آنسو پونچھنا خیانت سمجھتی ہوں۔

میں آپ سے درخواست نہیں کروں گی آپ کا دامن تمام کریم کی اپیل نہیں کروں گی۔ میں آپ کی جان کو آجاؤں

گی مگر اپنی بات منوا کر دم لوں گی۔ آپ نے سمجھا کیا ہے؟

رازی چونک کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ ”دھمکی دے رہی ہیں۔“

”نہیں۔ اپنے ہونے کا احساس دل رہی ہوں دھمکی ہی دیتا ہوتی تو آپ کا ضمیر کیوں ٹٹولتی۔ شادی تو آپ نے کرنا

ہی ہے آج نہیں تو کل کسی سے بھی۔“

رازی خاموش ہو کر میز کی پکٹی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگا۔

”اچھا اب آپ یہ بتائیے کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے اب میں آپ کے کس کام کی؟

”چلے پہلے آپ ہی بتا دیجئے۔“ رازی نے کہنیاں ٹھیل پر رکھ کر ٹھوڑی اپنے ہاتھوں پر لٹائی اور بہت سکون سے دریافت کیا۔

”تو سنئے۔ میں آپ کے تمام عزائم عمر بھر کے لئے خاک میں ملا دینا چاہتی ہوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ نے مجھ سے

محبت کا ڈرامہ کیا۔ آپ نے دوبارہ اپنی والدہ کو رحمت دی۔ یہ آپ کی سچائی کا ثبوت ہے مگر نہایت انفس کے ساتھ کہا۔

رہا ہے کہ آپ نہایت سستی خود غرض اور مفاد پرست ہیں۔ ایک شے جو آپ کو حاصل نہ ہو سکی آپ اس کی کمی کا انتقام میرا

ذات سے لیں گے جبکہ میرے ہاتھ صاف ہیں کسی عہد و وفا کی ذمہ داری میرے ضمیر پر نہیں۔ شاید آپ کو یہ سن کر حیرت

ہوگی کہ باہر مرتضیٰ میرے بہنوئی ہوتے ہوئے رہ گئے اور میرے شوہر بن گئے۔

آپ کی وجہ سے سسر سرفراز صرف آپ کی وجہ سے۔“

”میری وجہ سے!“ رازی پر واقعی حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ”کیا کسی لڑکی کا رشتہ طلب کرنا ایسی انہونی ہوا کرتی ہے

آپ ماشاء اللہ اتنی نہیں ہیں جانے کتنے گھرانے اس نیت سے آپ کے گھر کا رخ کرتے ہوں گے۔“ رازی کو اس اثر

سے جیسے شدید دکھ ہوا تھا۔

”رشتہ ناگنگے کی وجہ سے نہیں“ آپ کی احمقانہ جذباتیت کی وجہ سے اب بھی نہیں سمجھے آپ۔“

”بھلا.....!“ رازی ایک ٹک اس کی سمت دیکھ رہا تھا (جتنی قریب ہو اس سے زیادہ دور ہو)

”ایک بھری دو پہر آپ نے میرا راستہ روکا تھا۔“

”مجھے اس پر کوئی ملال نہیں اگر نہ روکتا تو شاید عمر بھر غلط رہ جاتی۔“ اس نے نظر جھکالی۔

”آپ کی غلطی تو دور ہو گئی اور میں آپ کا بچایا ہوا ایک ایک انگارہ طے کر رہی ہوں۔“ اس کے سینے سے ہوک سی اٹھی

”اس روز آپ کے ساتھ اباجی نے مجھے دیکھ لیا تھا اور سزا کے طور پر انہوں نے میری بہن کی تقدیر میرے سر لگا دی

تھی۔ وہ آج بھی دلہن ہے اپنے حصے کے رنگ سینے کو خنجر بیٹھی ہے۔“ نالہ کو جانے کیا کیا یاد آیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

”اسے دو مرتبہ دو عظیم دکھ ملے ہیں اور دونوں مرتبہ ذمہ دار آپ ہیں۔ پہلی مرتبہ جب میرے دھوکے میں اسے خواب

دکھائے گئے دوسری مرتبہ جب اس کے لئے آنے والی بارات میرے نام لگی۔“

”ادھ نو۔“ رازی نے جیسے وحشت زدہ ہو کر اس کی صورت دیکھی۔

”آپ کا جرم ثابت ہے۔ محبت و عشق تو لطیف ترین جذبے ہیں۔“ جہاں یہ ہوتے ہیں وہاں تو حساسیت اس مقام پر

ہوتی ہے کہ انسان ہر ایک کو اپنی جگہ رکھ کر سوچنے لگتا ہے۔ آپ کو اپنی ناکامیوں کا ماتم کرنے سے فرصت نہیں۔ ادھر بھی

دیکھئے جہاں زخم آپ سے گھرے مگر آپ ہی کے عطا ہیں۔“

ویر کاٹی لے آیا۔ چند لمحوں کے لئے دونوں اطراف خاموشی چھا گئی۔

نالہ کافی بنانے لگی۔

”ادھ! میرے خدا! میں اس صورت حال کو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔“ رازی کی مدھم آواز ابھری۔

”یہی ہوتا ہے بلکہ اکثریت اپنی ذات کے نفع و نقصان میں اسی طرح محو ہے۔ سب کو یونہی اپنی اپنی پڑی ہے۔“

نالہ نے کافی رازی کے سامنے رکھ دی۔

”آپ بس مجھے یہ بتائیے کہ آپ سزا کا حقدار ہیں یا نہیں؟“ نالہ نے کافی بسپ لیتے ہوئے بڑی جرات سے رازی

کی سمت دیکھا۔

شیخ صاحب نے نہایت آہستگی سے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔

انہوں نے احسن کے ہاتھ سے اپنا چھڑا اور پانی کا اشارہ کیا۔ احسن نے ہاتھ برہا کر پانی کا گلاس اٹھا کر چمچ سے پی پلا تا شروع کر دیا۔ جو دائیں بائیں زیادہ گر ہاتھا اندر کم جا رہا تھا۔

کچھ دیر قبل ہی ان کی سانس کی رفتار خطرے سے باہر ہوئی تھی۔ "اس لئے آسجین ماسک ہٹا دیا گیا تھا۔ احسن سے ٹشو پیر سے گرنے والا پانی صاف کیا۔ اسی دم نرس اندر داخل ہوئی۔

”ہوش آ گیا ہے۔“ اس نے نرس کو اطلاع دی۔

”جسٹ اے منٹ! میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو بلا کر لاتی ہوں۔“ وہ اگلے قدموں باہر نکل گئی۔ احسن نے کھڑکی کی

مت دیکھا۔ رات کے سوا دو بج رہے تھے۔ اسے جانتے ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔

تج صاحب نے انہیں موندلی ہیں۔

ابھی! ان سے بے اختیار اور دلی

”اوہ! احسن نے سکون کا گمہ اسانس لیا۔“

ڈاکٹر آکر اپنی معمول کی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ احسن دوسری سمت سے آکر کھڑا ہو گیا۔

”آپ بیٹے ہیں ان کے؟“ ڈاکٹر نے احسن کی سمت دیکھا، پہلے ڈاکٹر کی ڈیوٹی تبدیل ہو چکی تھی۔ اب یہ نیا ڈاکٹر آیا

تھا۔ اس نے احسن کی سمت بڑی جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے لباس سے اس کی نشست و برخاست سے

اس کے وجود پر ایک ایک چیز سے بیڑے کے نیچے رکھے اس کے قیمتی بریف بیس سے اس کے معاشی استحکام کا پتا ملتا تھا۔

اس ظاہر و مادہ پرست دنیا کے عین مطابق ڈاکٹر کا انداز منسلو تبدیل ہو چکا تھا جبکہ رات کو صغیہ کی دیرانی اور اس کے

ماہی کے سادہ سے کہاں سے اسے مانی عطا کی ہوگی۔

”آپ کو میری بات سمجھ آ رہی ہے، اب آپ کے منہ ہیں۔“ ذاکٹر نے محض خوش اخلاقی کے مظاہرے کے طور پر مان

کی ذہنی حالت جاننے کی نیت سے ان بر جگہ جگہ پوچھا۔

شیخ صاحب نے اپنی چٹلیوں کو حرکت دی اور احسن کی سمت دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

احسن پر ایک قیامت گزر گئی۔

(وہ بات جو ہمارے لئے ہوتی ہے ہماری امانت ہوتی ہے وہ ہم سے ہی نہیں کہی جانی بانی سب سے کہہ دی جانی

ہے) اسے کیا کچھ نہ یاد آیا تھا۔

یہی لڑائی کی وہ اندھیری رات اور چہرہ سرور کے دن..... علیہ کے حوفاں بنی اپنی بے سادہ۔ ہر اہل

”مگر آج آج کل سے یہ شکر، محض آپ کے جاوہر اور غضب کی اتنا کمال ہے کہ دنیا کو مختلف زاویوں سے

ایکھنے کا موقع ملا۔ ایک ایک ٹھوکر مکتب ثابت ہوئی ہے اور جو زخم لگے ان کی گنتی ابھی سے کیا ابھی تو سلسلہ جاری ہے۔

”آپ بالکل نہیں گھبرا ئیں۔ انشاء اللہ مستقل علاج سے آپ پھر سے پہلے کی طرح چلنے پھرنے لگیں گے۔“ ڈاکٹر کی

آغا: پھر احسن کو نئے سرے سے ماحول میں متوجہ کیا۔



وہ جھک کر شیخ صاحب کا کبیل ٹھیک کرنے لگا۔

نالکہ کو گھر آتے ہی یہ روح فرسا خبر مل گئی تھی۔ اس نے باہر کو نون کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا وہ دوڑے چلے آئیں گے مگر اسے سخت حیرانی ہوئی۔ جب باہر کے بجائے ان کا ذرا نیوراً موجود ہوا۔ اب وہ اس بے چارے سے کیا سوال جواب کرتی فوراً ہاسٹل روانہ ہو گئی تھی۔ وہاں احسن کو دیکھ کر جو خوشی ہوئی تھی وہ باہر کی بے نیازی کے سبب چمکی سی پڑنے لگی تھی۔ اس کا ذہن ہنوز ایک نکتے پر اٹکا ہوا تھا۔ کیا اسد بھائی کی مہربانیوں کا طعنہ رازی کی طرف منتقل ہو گیا ہے؟ وہ رات گہری ہونے پر گھر واپس ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کا کتنا دل چاہتا تھا کہ وہ راستے میں ایٹلا وغیرہ کو سلی دیتی چلے مگر وہ باہر کے موڈ کو مد نظر رکھتے ہوئے سیدھی گھر آ گئی تھی۔

بابر اسے لاؤنج ہی میں ل گئے۔ ٹائٹ گاؤن میں ملبوس وہ کوئی انگشٹ فلم دیکھ رہے تھے۔

صرف ایک نظر نالکہ پر ڈال کر رسمی انداز سے پوچھا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے انکل کی؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بھی تنگی سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

”ہونہہ! مجھ سے کوئی وابستگی رکھے تو میری ذات سے وابستہ ہر شے کی اہمیت محسوس کرتے۔ ایک ڈی ملی ہوئی ہے۔ فراڈ ایک دم۔“ وہ غصے سے کھول رہی تھی۔ سارا دن مصروف گزارتا تھا۔ اس لئے تنگی سے برا حال تھا۔ نیم گرم پانی کا شاور لیا اور ہاتھ گاؤن میں ملبوس باہر آ گئی۔ کیلے بال نکھرائے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر کیونکس صاف کرنے لگی۔

”پروگرام کیسے رہا ماسٹر سر فراز کے ساتھ؟“ بابر نے کمرے میں داخل ہو کر پہلا سوال کیا۔

”ٹھیک ہی رہا۔“ وہ چیخ کر گویا ہوئی۔

”یہ بزنس مین سے صحافی آپ کی خاطر ہوئے ہیں۔“ ان کے لہجے میں کاٹ بلائی تھی۔

”شاید آپ کا تجزیہ درست ہو۔“ وہ بال پیچھے کرتے ہوئے لٹھ مار انداز میں بولی۔

”ظاہر ہے مجھے دچکپی ہونا چاہئے اس شخص سے آخر وہ تمہارا سایہ کس خوشی میں بنا ہوا ہے۔“

بابر ایڑی جینز پر نیم دراز ہو گئے۔

”حالانکہ میں تو قطعاً تجسس نہیں کرتی کہ الوینہ سرمدی اپنے میاں سے زیادہ آپ کے قریب کیوں رہتی ہے۔“

شاذہ صدمہ لگتے والا آپ کو دن میں کئی فون کیوں کرتی ہے؟

عندلیب الٹی بخش اپنی پلنگوں میں آپ کی شمولیت کیوں ضروری سمجھتی ہے؟

زاہی امیر علی ہفتے میں ایک بار ڈنر آپ کے ساتھ کیوں کرتی ہے؟

آپ جس کلاس سے خود کو شو کرتے ہیں اسے پوری طرح مین ٹین بھی تو کریں۔“

”اسٹاپ دس نان سنس ٹاکس۔“ بابر ایک دم برس پڑی۔ نالکہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

”عورت! ایک خاندان کو سول دوران منتقل کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنا نسب ایٹڈ کلین رکھنا چاہتا ہے۔“

”یہی بات ان خواتین کے شوہران سے کیوں نہیں کہتے جنہیں آپ سے دوستی کا دعویٰ ہے۔ آپ پر کیا فرشتہ ہونے کی اسٹیپ لگی ہے۔“ اس نے ری موور کی شیشی بند کر کے جیسے بھٹی تھی۔

”یہ خواتین جن کے نام تم نے ابھی لئے ان کے باپ دادا کی جڑیں اس کلاس میں ہیں۔ انہیں ہر کوئی برسوں سے جانتا ہے۔ جن سے ان کی شادیاں و منگنیاں ہوئی ہیں وہ ان کی ابتدا سے واقف ہیں۔“

مگر..... تم..... اچانک آئی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تمہارا ماضی کیا ہے۔ تمہارے عزائم کیا ہیں؟ اور یہ شخص تمہارے خاقب میں کیوں ہے؟

اور پھر تم ایک روز بے ساختگی میں سچ بول چکی ہو۔“

نالکہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”سچ؟ کون سا سچ؟ کیا سچ؟“

”یہی کہ زندگی میں کوئی چیز مرضی کی بھی ہوگی یا ایڈجسٹمنٹ ہی کرتے رہیں گے۔ یاد آیا احسن کے ہاں آپ کے منہ سے بلا ارادہ ہی سچ نکل گیا تھا۔“ بابر نے بڑے طفرے سے مکرارہے تھے۔

”اگر وہ تمہارا دوست ہے تو کبھی یہاں کیوں نہیں آیا مجھ سے ملے؟ جیسے کہ میری فریڈنڈم سے ملنے اور انوائسٹ کرنے آتی ہیں وہ چوروں کی طرح تم سے کیوں ملتا ہے؟“

ان سب باتوں کے علاوہ انسان کی کچھ مخصوص حرکات بھی ہوتی ہیں جو اسے مشتبہ بناتی ہیں۔“

”پہلے آپ مجھے یہ بتائیے آپ اس شخص پر کتنے چمکے ہیں یا میرے کسی جرم کا اعلان کر رہے ہیں؟“

نالکہ اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔

”اچانک آنے والے قابل اعتبار نہیں ہوتے تو ان کو اچانک کیوں لایا جاتا ہے؟ آپ میرے شوہر ہیں آپ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا کوئی تو ہیں آئینہ بابت نہیں بس میں پہلی اور آخری مرتبہ آپ کو بتا دیتا چاہتی ہوں ماضی میں میرا کسی سے کوئی کٹ منٹ نہیں رہا اور وہ مجھ سے ملنے کبھی چوروں کی طرح نہیں آیا۔“

مستر بابر مرتضیٰ! ہر عزت دار عورت کا اپنا معیار زندگی ہوتا ہے ہر عورت کو ایک لاشی سے مت ہانگنے میں الوینہ شاذہ یا راشی نہیں ہوں۔“

”ڈونٹ انسٹ ڈیم۔“ بابر دہاڑے۔

”آپ نے میری کتنی بار انسٹ کی ہے وہ زیادہ اور میں ”کم“ کیوں ہوں آپ کی نظر میں؟ اس لئے کہ آپ نے بڑی نہیں بلکہ تختہ مشق حاصل کیا ہے۔“

آپ اپنا پان کھائیے اور آرام کیجئے۔ ہر وقت کلاس ڈفرنس جتا کر آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ آغاز سب ہی کا ”خاروں“ سے ہے۔ ہونہہ۔“

پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا جیسے اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ عجیب ہنسی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

جب مدتوں انسان غم نہ بانٹ سکے تو شاید وہ یونہی نیم پاگل ہو جاتا ہے وہ کھٹ کھٹ کرتی باہر آ گئی اور راہداری میں بڑے ہوئے موٹو سے پڑھ گئی۔ کیا میں ساری زندگی اس شخص کی شرانگظ پر گزارتی رہوں گی جو میرا وجود چھلنی کر چکا ہے۔

”نالکہ!“ اچانک بہت قریب سے باہر کی آواز آئی۔

”میرا خیال ہے تم ایڈجسٹمنٹ کرتے کرتے تھک گئی ہو۔ چینیج کرو اور اسی وقت اپنے حیرتوں کے ہاں چلی جاؤ۔“

بابر مرتضیٰ حکم صادر کر کے واپس پلٹ گئے۔

نالکہ چند لمحوں کے لیے کیفیت میں بیٹھی رہی پھر ایک دم اٹھ کر کمرے میں آئی۔ ایک سوٹ نکالا اور ہاتھ روم میں ملی گئی۔ واپس آئی تو بابر بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ سے سونے کی چوڑیاں اتار کر ڈریسنگ

سکیل پر رکھ دیں اور پھر کانوں کے آدیزے اتارے اور اس کے بعد.....!

چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھا کر اپنے دو تین عام سے سوٹ رکھے۔ یہ سوٹ کیس اس کے جینز کا تھا۔

پہلے راہداری میں سوٹ کیس رکھ کر آئی پھر واپس آ کر چادر اوڑھی اور پرس اٹھا کر باہر آ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی باہر رفتی کی سمت نہیں دیکھا تھا۔

وہ ڈرائیور کو اٹھانے ہی جا رہی تھی کہ کال بیل رینگ ہوئی۔

اس وقت کون آ سکتا ہے؟ کہیں اسد بھائی نہ ہوں..... اوہ..... اس نے پرس سوٹ کیس پر رکھا اور گیٹ کی سمت بڑھی "کون؟"

"میں ہوں بھابھی! اسد!" دوسری طرف واقعی اسد تھے۔

اس نے جھٹ گیٹ کھول دیا۔ "السلام علیکم" اس نے اپنے مخصوص شستہ لہجے میں سلام کیا۔

"سوئی نہیں آپ ابھی تک؟ بہت دنوں سے بے چین تھا اس طرف آنے کے لئے۔ آپ کی بے حد فکر تھی کہ پتا نہیں آپ کیسی ہیں۔ اسی بتا رہی تھیں آج کل آپ کا پلے چل رہا ہے ٹی وی پر۔ مجھے تو ٹی وی دیکھنے کا نام نہیں ملتا۔ اس کا مطلب ہے کہ گاڑی ٹھیک جا رہی ہے باہر سو گئے؟"

اسد نے اندر آ کر خود ہی گیٹ بند کر دیا تھا۔

نائلہ مکمل خاموش تھی! بس ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔

"آپ آئی ہیں کہیں سے غالباً؟" اسد کی نظر راہداری میں رکھے سوٹ کیس اور پرس پر پڑی۔

"ڈائریکٹ آرہے ہیں کراچی سے؟" نائلہ نے لب کشائی کی۔

"قطعی ڈائریکٹ" مگر آپ اس وقت کہاں سے آئی ہیں پنڈی گئی ہوئی تھیں؟"

"نہیں۔" وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی لاؤنج تک آ گئی۔

"کھانا کھائیے گا؟"

"نہیں کھانا کھا چکا ہوں آپ سنا بیٹھیک ہیں ناں؟"

"چائے یا کافی بناؤں آپ کے لئے؟"

"نہیں اب تو بس سوئے کا پروگرام ہے۔"

"تو پھر آئیے میں بیڈروم کھول دیتی ہوں۔" وہ آگے بڑھ گئی اسد اس کے پیچھے ہوئے۔

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی ڈرائیور کے کوارٹر تک آئی تھی۔ پہلی دسک کو ہاتھ اٹھایا تھا کہ اسد نے راستے ہی میں تھام لیا۔

بھابھی پلیرز کیا کر رہی ہیں آپ ادھر آئیے میرے ساتھ۔

"پلیرز اسد بھائی! آپ جابجائے اپنے کمرے میں مجھے میرے معاملات کے ساتھ چہا چھوڑ دیجئے۔" اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"باہر کہاں ہیں؟"

"اپنے بیڈروم میں۔" وہ اسی طرح مزاحمت کرتی ہوئی بولی تھی۔

اسد اسے شانوں سے تھام کر زبردستی کے انداز میں باہر کے بیڈروم تک آئے اور در سے دسک دی۔

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا باہر آئے اور دونوں پر نظر پڑتے ہی پاؤں پیچھے ہٹائے۔

"السلام علیکم۔" اسد نے سلام کیا۔

"ولسلام۔" باہر خشک انداز میں جواب دے رہے تھے۔

"یہ کیا تماشایا ہوا ہے تم نے اتنی رات کو آئیے بھابھی بیٹھے یہاں حد ہو گئی۔ لا حول ولا قوۃ۔"

"اسد تم پر سٹوئج نہیں کرو۔" باہر اسی خشک انداز میں گویا ہوئے۔

"تمہارے پر سٹوئج میرے پر سٹوئج سے الگ نہیں ہیں بیٹھو ادھر خاموشی سے گھاس کھا گئے؟"

اسد نے خاصی ناراضگی سے کہا۔ "اتنی اچھی خاتون کے ساتھ یہ سلوک قطعی زیب نہیں دیتا۔ بتائیے بھابھی کیا ہوا ہے؟"

"میں اچانک آنے والی عورت ہوں انہیں میرے ماضی کی فکر ہے ان کا خیال ہے میں دھوکا دے رہی ہوں۔" نائلہ نے اسی طرح کھڑے کھڑے درشتی سے کہا۔

"کمال ہو گیا" میں آپ کو اپنی بہن اپنی بھابھی جان کر آپ پر ایمان لا چکا یہ آپ کا دم دم کا ساتھی..... کتنے افسوس کی بات ہے۔" اسد کو درحقیقت بہت دکھ ہوا تھا۔

"بھابھی! آپ میری بھابھی نہیں میری حقیقی بہن کی طرح ہیں آپ کو میری قسم مجھے ایک ایک بات بتا دیجئے احسن اس وقت موجود نہیں یہاں آپ مجھے ان کی جگہ سمجھئے۔" وہ نائلہ کے بھائیوں سے نام کی حد تک واقف تھے۔

نائلہ اتنا سننے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسد اس کے نزدیک آ بیٹھے۔ باہر اسی طرح پتھر کا بت بنے کھڑے رہے۔ نائلہ نے سسکیوں کے دوران سادہ ادا قہہ گوش گزار کر دیا۔ حتیٰ کہ راز کی کے بالائی میں کھڑے ہونے سے لے کر آج تک کے واقعات سنا دیئے۔

"آپ کا خیال ہے وہ آپ کی بہن سے شادی کر لے گا۔" اسد کا ذہن دوسری سمت پلٹ گیا۔

"ہاں اس لئے کہ وہ ایک باضمیر شخص ہے۔ وہ میرا نقصان ہر صورت پورے کرے گا۔ اگر میں اپنے باپ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی تو آج واقعات دوسرے ہوتے مگر میری اس سے کبھی کوئی کمٹ منٹ نہیں ہوا۔ آج میں صرف اسی ارادے سے ریٹائرمنٹ لے کر گئی تھی کہ وہ نیلہ پا کو اپنالے۔"

"ظاہر ہے اس میں آپ کا کیا قصور اگر ایک لڑکی اچھی ہے تو وہ کسی کا بھی انتخاب بن سکتی ہے۔" اسد نے اضافہ کیا۔ باہر بت کی طرح ساکت تھے۔ نیلہ سے شادی ہو۔ تو ہوتے نائلہ سے ہو جانا انہیں شیخ صاحب کا وہ غلت بھرا انداز آج بھی یاد تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ وہ فی الفور بابا جان سے ملنا چاہتے ہیں۔

باہر خوش صاحب کو پنڈی لے کر گئے تھے۔

"اس میں تھوڑی غلطی آپ کی بھی ہے بھابھی آپ کو یہ سارا قصہ باہر کو بتا دینا چاہئے تھا۔" اسد نے کہا۔

"اس کا موقع تو آنے دیا جاتا۔" نائلہ نے آنکھیں مگڑائیں۔

"آپ یہیں بیٹھے بھابھی باہر تم میرے ساتھ آؤ۔" اسد اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھ کر باہر کا بازو تھام لیا۔ باہر ایک معمول کی طرح ان کے ساتھ چلنے لگے۔

اسد سیدھے ڈرائنگ روم میں آئے۔ "بیٹھو یہاں۔"

"اتنے پڑھے لکھے آدمی ہو کر تم نے یہ کیا ڈیلنگ کی؟"



نور بانو نے تسبیح چوم کر ایک طرف رکھ دی۔ اور شکیلہ کے ساتھ ساتھ چلتی لان میں آگئیں۔ ”منزلہ جگنو کا چیک اپ کرنے کی جی جی ابھی تک نہیں آئی۔“ انہوں نے شکیلہ سے دریافت کیا۔

”آجائے گی زش ہوگا۔ بلال کے ساتھ ہے فرائیں کریں۔“ شکیلہ لان چیمبر پر ان کے مقابل بیٹھ گئی۔

”شہوار تو ساڑھے چھ بجے تک ہی آئیں گی۔“

”جی۔ نیلہ کو ظلم لا کر دے آئی ہوں۔“ شکیلہ نے جلدی سے موضوع بدلایا مبادا نور بانو شہوار کی سروس کے موضوع پر گفتگو شروع کر دیں۔

”شاید۔ وہ اس ماہ کے آخر تک قطر چلی جائے۔ پھوپھو کا فون آیا تھا کہ انتظامات تقریباً مکمل ہو چکے ہیں۔“

”تمہاری پھوپھی بہت اچھی ہیں شکیلہ۔ بہت محبت کرتی ہیں تم لوگوں سے۔“

”جی اسی میں تو کوئی شک نہیں۔ ہماری ایک سگی بہن انہوں نے گود لی تھی۔ شہزادیوں کی طرح پالا ہے اسے۔ ان کے ہاں بس بیٹے ہی ہوئے۔ ایک بچہ ان کا قدرے ایتارل ہے۔ پھر بھی پھوپھو پھوپا نہ ڈکھ کی کو محسوس نہیں ہونے دیتیں۔ فیضان کو تو آپ نے دیکھا ہی ہے۔ اس سے بڑا فیصل ہے اور فیضان سے چھوٹا فہد ہے جو ایتارل ہے۔“

”ہاں بس کوئی نہ کوئی ڈکھ لگا ہے ہر ایک جان کو۔ بہر حال شہینہ کی عادت بہت عمدہ ہے۔ اسنے اچھے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔“ نور بانو کو درحقیقت شہینہ کے بے ساختگی اور سادہ انداز گفتگو بہت بھایا تھا۔

”آپ بھی تو بہت اچھی ہیں آپ جیسے لوگ بھی بہت کم ہوتے ہیں۔“ شکیلہ نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ ”ارے نہیں بھئی۔ کوئی خوبی نہیں ہے مجھ میں۔ انعام علی غالباً لندن گئے ہوئے ہیں۔ کب تک آنے کا کہہ گئے تھے؟“ نور بانو نے شکیلہ کو اپنی ذات سے ہٹانے کی کوشش کی۔

”لندن سے تو انشاء اللہ کسی روز بھی واپس آجائیں گے۔ آپ کے دل میں کس طرح واپس آئیں گے۔ پہلے یہ بتائیے۔“ شکیلہ نے چیتر بدلایا۔

”میں سیدی سادگی عورت ہوں۔ میرے دل میں تو وہ اس دن سے ہیں جس دن میرا ان سے نکاح ہوا تھا۔“ سادگی سے نظریں جھکا کر بولیں۔

”آپ ان کے دل میں کیوں نہیں؟ کیا شکایت ہے انہیں آپ سے؟ جبکہ آپ تو نہایت بے ضرری ہیں۔“ شکیلہ کے ذہن میں عرصہ سے پلتا ہوا سوال زبان پر آ گیا۔

”آہ میرا نصیب۔“ نور بانو بے سزاؤ بھری۔

”کچھ تو ہوا ہوگا۔ درنہ جتنی اچھی آپ ہیں میں نے اتنی اچھی عورت اپنے آس پاس نہیں دیکھی۔“

شکیلہ کے انداز میں بڑی مضبوطی تھی۔

”کوئی فائدہ نہیں ان باتوں سے۔ بس اب تو گزر رہی مگی ہے۔“ ان کی آواز بھر مچی۔

”آپ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہیں باجی۔ میرا اور آپ کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ آپ مجھ پر اعتبار نہیں کر سکتیں۔“ شکیلہ نے قدرے افسردگی سے کہا۔

”یوں میرا دل نہ دکھاؤ شکیلہ۔ تم تو اتنی سہلی مائیں ہو کہ اپنی فتح مندی کا تمہیں احساس تک نہیں۔ تم انعام علی کے بابا سفید کی مالک ہو۔ اس کی منظور نظر ہو۔ اور اس کے باوجود میرے نکووں کے نیچے اپنی پتھیلیاں رکھتی ہو۔ سوچتی ہو کہ تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو میرے نیچے اپنے باپ کو ترس جاتے۔ انہوں نے دوسری شادی تو کرنا ہی تھی۔“

”اوہ میرے خدا پھر وہی بات۔ یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کیوں کرتا تھی؟ آپ ان پڑھ ہیں۔ بد صورت ہیں۔ پھوپھو کیا عیب ہے آپ میں۔“ شکیلہ پھر حرکت پکڑ لائی۔

”عیب وجود میں نہیں نصیب میں ہوا کرتے ہیں۔“ انہوں نے سزاؤ بھری۔

”تو پھر بتائیے اس ڈکھ کا آغاز کیا ہے؟ ورنہ میں سمجھوں گی آپ میری جھوٹی تعریف کرتی ہیں۔ درحقیقت آپ کو مجھ کوئی خدشہ ہے۔“ شکیلہ کے انداز میں ضد تھی۔ اس نے کرسی آگے کی۔

”یہ بات میں نے آج تک کسی سے نہیں کہی۔ بس میری جنت مکانی ساس تھیں۔ ویسے تو یہ بات میرا سارا دردھیال ہے مگر مجھ پر جو گزری اس سے صرف میری ساس باختر تھیں۔ شکیلہ۔ تمہیں یہ سب جان کر محض ڈکھ حاصل ہوگا اور کچھ ن۔“ نور بانو نے بخور اس کا چہرہ دیکھا۔

”یہ اضافہ ہوگا۔ مجھے برداشت کرنے کی تعلیم بھی ہے اور عادت بھی۔“ شکیلہ کا تھس اور بڑھ گیا۔

”مکرتم انعام علی پر یہ ظاہر نہیں کرو گی کہ میں نے ان کا ماضی تمہارے سامنے آشکار کر دیا ہے۔“

”حلف اٹھوا لیجئے۔“ شکیلہ کے صبر کا پتہ نہ گویا لہریز ہو چکا تھا۔

”میں نے تو احتیاطاً کہہ دیا۔ ورنہ تمہیں جان تو پہنچی ہوں۔“ نور بانو اس کی جز باتیت پر قدرے خفیف ہو گئیں۔

”بتا بھی کچھ باجی۔“ شکیلہ کے دل میں خوف و خدشات بیدار ہو رہے تھے مگر وہ کمال مہارت سے چھپا رہی تھی۔ آخر نام علی سے اس کی ذات وابستہ تھی۔

”میری ایک سہیلی تھی شکیلہ! بڑی طرح دار بڑی خوبصورت۔ انعام علی کو اس سے محبت نہیں بلکہ عشق ہو گیا تھا۔ نوشہرہ ماؤنی میں اس کے بڑے بھائی رہا کرتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے ان کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ والد اس کے پشاور کے ایک زے زمیندار تھے۔ اس کے ایک اور بھائی بھی تھے وہ بھی فوج میں تھے۔ ان دنوں سہالہ میں ہوا کرتے تھے مگر میں نے ان کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ البتہ میری سہیلی اکثر و بیشتر ان کا ذکر کیا کرتی تھی۔ ان کے لئے اولاد کی دعا کرتی تھی۔ وہ بھی شادی نہ تھے۔

ہماری دوستی سکول سے شروع ہوئی۔ میٹرک کرنے کے بعد ہمیں کالج جانے کی اجازت نہ ملی۔ البتہ یہ طے پایا کہ ہم بائوٹ انٹر کر لیں۔ ہم سے مراد میری تین چار ہم عمر کنز تھیں۔ میرے تین چچا ایک تالی یعنی انعام علی کے والد اور برے والد ہم سب ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے۔

ہمارے دادا جان کو اس بات پر اعتراض تھا کہ کوئی اجنبی ٹیوٹر ہمیں پڑھائے۔ سخت پردہ تھا ہمارے ہاں۔ دادا جان کے حکم سے ہی انعام علی ہم سب کو پڑھانے لگے۔ ان دنوں یہ گھر میں سب سے زیادہ کوالیفائیڈ تھے۔ خاصے ٹیوٹر اور لئے۔ میرے رہنے والے۔ میری وہ سہیلی بھی ہمارے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ وہ کوئی غیر معمولی حسین تو نہیں تھی مگر ہم سبھی اور بولی بانی لڑکیوں میں وہ بہت خود اعتماد اور پروقار ہوا کرتی تھی۔

انعام علی کا دل آگیا تھا اس پر۔ ”نور بانو نے قدرے آہستہ آواز میں کہتے ہوئے شکیلہ کی سمت دیکھا۔ جس کا چہرہ لڑکی طور پر لمبے بھر کو مضمر ہو گیا تھا۔

(شوہر کا معاشرت خواہ سابقہ ہی ہو عورت کے لئے بڑی اہم خبر ہوا کرتی ہے)

”انعام علی اس پر اظہار بھی کر بیٹھے تھے اور میری سہیلی نے مجھے اپنا نام از بنا لیا تھا۔ مجھے بڑی خوش ہوئی تھی۔ میں چشم تصور میں اسے اپنے گھر کے آئین میں اپنے گھر کی بہو کی حیثیت سے دیکھنے لگے تھے۔ اور سوچتی تھی یہ ایک دم فٹ اور خود



استادی لڑکی انعام علی کے ساتھ کتنی اچھی لگے گی۔

جب انعام علی کو بچہ چلا کہ میں اس محبت کی واحد راز دار ہو چکی ہوں تو وہ کبھی کبھار مجھے سے اس کے متعلق باتیں کر لیا کرتے۔ میں موقع پا کر فون پر ان کی بات چیت کر دیا کرتی۔ کبھی چیلے بہانے سے انہیں ڈرائنگ روم میں تہا کر دیتی۔ دونوں اکثر میرا شکریہ ادا کرتے کیونکہ میں جانتی تھی انعام علی بخیدہ اور ذمہ دار ہیں۔ وہ جسے چاہتے ہیں اسی کو گھر میں لائیں گے۔ اسی لئے میں ان کے لئے آسانیاں پیدا کر دیا کرتی تھی۔ اور پھر شکلیہ ہر عمر کے اپنے انداز ہوا کرتے ہیں۔

”جی ہاجی..... اچھا بھرا؟“ تجس عروج پر تھا۔

”بھرا۔ قدرت کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ میری سبیلی کے والدین جو پشاور میں تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر ہی اس کا رشتہ اپنے خاندان میں طے کر دیا۔ یہاں تک کہ تاریخ دے کر اسے بلوایا۔

انعام علی تو جیسے اپنا آپ بھلا بیٹھے۔ وہ مجھ سے کہا کرتے ”میں کچھ کروں۔ میں بند ماحول کی لڑکی اس وقت کیا کر سکتی تھی۔ مگر انعام علی بضد ہوئے کہ میں ان کی بھابی سے کہہ کر شادی رکواؤں اور یہ بھی کہہ دوں کہ انعام علی اپنے والدین سے بھج رہے ہیں۔

جی بات یہ میری اتنی ہمت نہیں تھی۔ میں خاموش ہو رہی۔ مجھے احساس تھا کہ وہ لوگ سنا پٹھان ہیں بات کے پکا قول کے سچے۔ وہ اپنی لڑکی کو جان سے تو مار سکتے ہیں۔ بات سے نہیں بھر سکتے۔ پھر میرا اس کی بھابی سے بات کرنا ہر کی بدنامی کا باعث ہی ہوتا اس کے علاوہ تو کچھ حاصل ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ مگر انعام علی نے کسی طرح تائی جان کو آدہ کر دیا۔ تاپا جان کو پوری بات نہ بتائی گئی۔ وہ لوگ گئے مگر بے سود۔ دونوں پارٹیاں معاملے کی گہرائی سے نا آشنا تھیں۔ تاپا جان تو سرے سے وہاں جانے پر راضی ہی نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ گھر میں بہت لڑکیاں ہیں ہمیں اپنوں کے بوجھ بچے کرنا چاہئیں۔ مگر انعام علی کیونکہ اپنے والدین کی واحد اولاد تھے اس لئے وہ مجبوراً وہاں گئے تھے۔

تاپا جان نے اس انکار کو اپنی ہنک محسوس کیا۔ وہ انعام علی پر بھی ناراض ہوئے تھے مگر انعام علی کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ تب تاپا جان نے ان کی توجہ ماحول سے ہٹانے کے لئے باہر بھجوا دیا۔

”مگر ہاجی..... میں آپ کا کیا قصور؟“ شکلیہ نے حیرانی سے ان کی بات کا ٹھک دی۔

”آگے بھی تو سنو۔“ نور بانو جیسے کسی میں کو دبا کر مسکرائیں۔

”انعام علی دو سال باہر گزار کر آئے مگر ان میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

میری سبیلی کے ساتھ ان دو سالوں میں یہ حادثہ ہوا کہ وہ بیوہ ہو کر واپس آ گئی۔ ایک بیٹا کو دیا تھا۔ بیٹی عدت کے دوران یا شاید دو ماہ بعد ہوئی۔

انعام علی کو جیسے ہی خبر پہنچی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور والدین سے مصر ہوئے کہ وہ دوبارہ جائیں مگر اس مرتبہ گھر کے سارے بڑے خصوصاً ان کی والدہ کسی قیمت پر رضامند نہ ہوئیں۔ وہ دو بچوں کی ماں سے اپنا کنوارا بیٹا بیاہنے کے لئے ایک سے لاکھ تک راضی نہیں تھیں۔ انعام علی نے اپنی تمام تر صلاحیت انہیں قائل کرنے کے لئے استعمال کی مگر وہ شمس مس نہ ہوئیں۔

پھر خدا معلوم انعام علی نے کس طرح میری سبیلی کے بھائی کو اپنا ہم خیال بنایا اور اپنے طور پر ان سے بات کی۔ ہم دئے نصیب۔ اس مرتبہ پھر انعام علی ہارے۔

ہوایوں کہ ان کا نکاح طے پا گیا تھا۔ اس مرتبہ میری سبیلی کی بھابی نے بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ پھر یہ کہ انعام علی بچہ

نی طور پر مستحکم پوزیشن میں تھے۔ ان کو اب وراثت چھن جانے کے بھی خوف نہیں تھے۔ خاندانی پس منظر سے تو اس نے کے لوگ واقف ہی تھے۔

شکلیہ اگر میاں شروع ہوئیں تھیں ان دنوں۔ مگر رات ابھی سردی ہوا کرتی تھی۔ پھر بھی ہم سب گھر والوں نے کھلی چھت بنا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ میری والدہ انعام علی کی والدہ اور ہماری دادی جان اپنے اپنے کمروں میں بیویا کرتی تھیں ایک رات مجھے ٹھنڈ محسوس ہوئی تو میں نیچے چلی آئی۔

یہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی کہ انعام علی رات کے اس پہر راہداری کا تالا کھول رہے ہیں۔ اور ایک چھوٹا سا سوٹ جس ان کے قریب رکھا تھا۔ تائی جان اپنے کمرے میں اکیلے ہوا کرتی تھیں۔ میں یا میری کوئی اور کزن جب چھت سے نیچے آ کر سونا چاہتی تو ان کے کمرے میں ہی ٹھس جاتی تھی۔ اور قالین پر کٹن ڈال کر اپنی نیند پوری کر لیا کرتی تھی۔ ان کا کمرہ ب سے نزدیک تھا۔ میں حیران و پریشان تائی جان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ نیم دراز تھیں اور صبح پڑھ رہی تھیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ انعام علی اتنی رات کو کہاں جا رہے ہیں؟

مجھے کیا معلوم تھا کہ ان ماں بیٹے کے درمیان کیا بات ہوئی۔ نوبت کہاں تک پہنچی؟ تائی جان تو جیسے دیوانہ وار باہر

گئیں۔ انہوں نے نہ میری طرف دیکھا اور نہ ایک لفظ منہ سے نکالا۔ ایک ایک لمحہ ضائع کئے بغیر وہ باہر لپکی تھیں۔

میں خوفزدہ اور ابھی ہوئی وہیں کھڑی تھیں۔ دو تین منٹ بعد کیا دیکھتی ہوں وہ انعام علی کا بازو تھا۔ اندر آ رہی ہیں۔ ”پہلے میرے ماں ہونے کا انکار کر دو پھر یہ گھر چھوڑنا۔ غضب خدا کا ایک غیر عورت کی اتنی اہمیت کہ ماں باپ پیروں نہ آ گئے۔ اتنے سنگدل ہو تم۔ لو بھلا۔ نور نہ دیکھتی تو میں تو آج لٹ گئی تھی۔ لگ گئی تھی ٹھکانے میری عمر بھر کی کمائی۔“ وہ

نہ ملتے ہوئے گلو گھر لے گئیں۔

بس اس دن سے میری شامت کا آغاز سمجھو۔

میری میری ہی گردن پر چلی۔ اگلے دن عصر مغرب کے درمیان میرا اور انعام علی کا نکاح ہو گیا۔ میں تو خبر کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر وہ مجھے اجازت بھی دیتے تب بھی۔ اتنی جراتیں اتنی ہمتیں کہاں تھیں ہم میں۔ اسے والدین جو ان بچوں کو ماں باپ ہونے کے باوجود ہمارے دادا دادی کے سامنے اپنی بات نہیں رکھ سکتے۔ پھر

ہاں کیا حیثیت تھی۔

انعام علی نے پہلی بات مجھے سے یہ کہی۔

”اگر تم اس رات اپنی چالاکی نہ دکھاتیں تو ہر طرح کی خوشی آج میرا مقدر ہوتی۔ اور یہ کہ تم سمجھ گئی تھیں کہ میں اس

نکاح کے ارادے سے باہر جا رہا تھا اور یہ کہ میں اگر چاہتی تو خاموش رہ کر ان کی خوشی کا راستہ کھول سکتی تھی۔“

شکلیہ۔ میرے ذہن کی اتنی اڑان کہاں تھی جواز خود سوچ لیتی کہ وہ نکاح کی غرض سے گھر چھوڑ رہے ہیں۔ اگر وہ مجھے

طرح دے کر جاتے تو شاید میں اس رات انہیں خود دروازہ پار کر دیتی۔

یہ میری وہ خطا ہے جس کی مجھے کبھی معافی نہیں مل سکتی۔ کہتے ہیں کہ میں نے پیاس کے وقت ان کے مشکیزے میں

نکاح کیا تھا۔

نکاح کے بعد یہ کراچی چلے آئے۔ پانچ سال نو شہرہ کا رخ نہیں کیا۔ میری ساس خود کراچی گئیں۔ انہیں اپنے ساتھ

لے جانے ان سے کیا کہا۔ پھر یہ کچھ میرے ہو گئے۔ مگر یہ دن بھی ہوا کی طرح گزر گئے۔ میری ساس کے آنکھیں بند

نستے ہیں میری دنیا پھر اندھیر ہو گئی۔ پھر وہ جو کرم بیک کی طرح ملتا تھا وہ رعایت بھی چلی گئی۔ یہ مجھ سے کہا کرتے تھے



جس خوشی سے میں محروم ہوں وہ تمہیں بھی نہیں ملے گی۔ اور یہ کہ میں دوسری شادی ضرور کروں گا۔ وہ سمجھتے ہیں میں نے جان بوجھ کر تائی جان کو سوتے سے جگا کر خبردار کیا تھا اور یہ کہ مجھے پتا تھا کہ تائی جان میری شادی ان سے کرنا چاہتی تھیں۔ یہ ہے میری افتاد۔

وہ کرسی کی پشت سے سر نکا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔

ٹھیکید سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے گھاس مسل رہی تھی۔ انعام علی کی زندگی میں شامل ایک مسز دعوت نے جو ”اہم“ ہونے کا مان بخشا تھا۔ وہ ریت کی طرح نکھر رہا تھا۔ شب کے سناٹے میں جو اپنی اہمیت کا انکار خوبصورت احساس بن کر وجود پر چھا جاتا تھا۔ وہ ریت کی طرح نکھر رہا تھا۔ جیسے کسی کو بے وقوف بننے بننے ایک دم احساس ہو جائے۔ ”آپ کے دل میں میرا ٹھکانا کس کو نے میں نکلے گا؟“ وہ نقصان زدہ بیوپاری۔ اور ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنا سر نہ اٹھایا رہی تھی۔

”کیسی نا حق سزا ملی ہے آپ کو۔“ ٹھیکید نے اپنی سزا کا احساس کم کرنے کی خاطر جیسے ان کی نسبتاً زیادہ بڑی سزا کا ذکر کیا۔ جیسے کوئی اپنے نقصان کو کسی بڑے نقصان سے نسبت دے کر اپنا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرے۔

”نہیں یہ انعام علی کی سزا تو نہیں کہ ان کی بیٹی کو یہ عظیم ڈکھلا ہے۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کچھ ہوتا ہے تو جو اب بھی کچھ ہوتا ہے۔ یہ دنیا اسباب و علل کی دنیا ہے۔ مکافات عمل کا چکر ہے۔ اللہ بھی یہی کہتا ہے۔ انسان کو وہی ملتا ہے جو وہ کماتا ہے۔

افسوس میری معصوم بچی۔ ”نور بانو نے سر ادا بھری۔“ مگر میری تلوار تو دو دھاری ہو گئی۔ جس پر میں چل رہی تھی بدلتوں سے تم انعام علی پر کبھی اشارہ بھی ظاہر نہ کرنا کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔ اب یہ گنتی کی چند سانس آرام سے گزر جائیں۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا باجی۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ان کا نام کیا ہے۔ باجی؟ یہ تو بتایا نہیں۔“ اسی دم نبیلہ گھبراہٹ ہوئی ان کے قریب چلی آئی۔ بے حد شکر سی۔

”باجی۔ امی کا فون آیا ہے ابھی ابھی۔ اباجی پر فالج کا ایک ہوا ہے۔ وہ اباجی کے پاس تھیں اس لئے فوراً فون نہ کر سکیں۔ اباجی کی حالت بہت خراب ہے۔“ نبیلہ کی آواز زندگی ہوئی تھی۔

”ہیں۔“ ٹھیکید ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کب؟ یہ نہیں بتایا۔ ہائے اللہ ای کس قدر پریشان ہوں گی۔“ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔

”بھائی جان اسلام آباد جا چکے ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے بھابھی جان کو یہاں چھوڑا تھا۔“ نبیلہ نے اطلاع دی

”تو کیا شہوار بھابھی کو پتا تھا؟ نہیں۔۔۔۔۔۔ وہ اتنی بڑی خبر نہیں چھپا سکتیں۔ بھائی جان نے انہیں بھی نہیں بتایا ہوگا۔“

ٹھیکید کے حواس جواب دے رہے تھے۔

”خود کو سنبھالو ٹھیکید۔ انشاء اللہ۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ارے نبیلہ۔ بیٹا رو نہیں۔“ انہوں نے نبیلہ کو سینے سے لگایا۔ ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں خود تم لوگوں کو اسلام آباد لے کر جاؤں گی۔ تسلی رکھو۔ بلال آجائے۔ پھر کچھ کرتے ہیں۔ گھبراہٹ نہیں۔“ نور بانو دونوں کو دلاسہ دے رہی تھیں۔

اسی دم شہوار گیت سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر از خود سمجھ گئی کہ اطلاع آگئی ہے۔

”السلام علیکم۔“ وہ قریب آ کر گویا ہوئی۔

”خیریت؟“ آخر اس نے کچھ تو کہنا ہی تھا۔

”اباجی پر فالج کا ایک ہو گیا ہے۔ شاید آپ کو پتا بھی ہے۔“ ٹھیکید نے اس کی شکل بغور دیکھی۔ شہوار اس کی گھبری لہروں سے جیسے ایک دم ہار مان گئی۔

”ہاں۔ احمر کا فون آیا تھا۔ مگر انہوں نے سخت تاکید کی تھی کہ تم لوگوں کو فوراً نہ بتایا جائے۔ خصوصاً نبیلہ کو۔ کہ تم لوگ پریشان ہو جاؤ گی۔“

”کمال ہے آپ اتنی بڑی خبر چھپائے رہیں۔“ ٹھیکید نے جیسے ناراضگی کا اظہار کیا۔

”جس کے گھر میں پناہ گزین ہوں۔ اب اس کی بات نہ مانوں۔ تم کب تک رہ سکتی ہو مجھے اپنے گھر یا رکھو۔ شکایت آزاد سے ہوا کرتی ہے غلام سے نہیں۔ غلام کو صرف سزا سنائی جاتی ہے۔ تم بھی سنا دو۔“ وہ سرد لہجے میں کہتی آگے بڑھ گئی۔

ٹھیکید نبیلہ اور نور بانو اسلام آباد روانہ ہو چکی تھیں۔ جبکہ شہوار منترہ اور بلال کے ہمراہ گھر پر ہی تھی۔ ٹھیکید نے تو شہوار سے چلنے کے لئے کہا تھا مگر اس کی نوکری کا مسئلہ تھا۔ وہ چاہنے کے باوجود انکار کر بیٹھی تھی۔

ٹھیکید نبیلہ کے نزدیک یہ بھی بحران کا حصہ تھا۔ وہ اس کی بے بسی پر مقدر بھرا اپنے قیمتی خیالات کا اظہار نہ کر سکیں اور یہ اصرار کر سکیں۔ وہ بیٹوں اطلاع ملنے کے اگلے روز صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد چلی گئی تھیں اور وہ ٹیکسٹری آگئی تھی۔

آج کل وہ ایک حتمی نتیجے پر پہنچنے اور عمل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ لے دے کر اُسے اپنے سر پر ہی اعتماد کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ پہلی فرصت میں اور احسن کے واپس آنے سے پہلے پہلے اسد سے ملنا چاہ رہی تھی۔

پتہ چلا وہ اسلام آباد آگئے ہوئے ہیں۔ وہ وہاں سے نہ جانے کتنی مرتبہ اسلام آباد آتے جاتے تھے۔ کوئی نئی اطلاع نہیں تھی مگر اس پر عجیب طرح کی بددی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کہ اچانک پتہ چلا کہ مالک آگئے ہیں۔ وہ اپنی بے چینی

چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی ان کے دفتر چلی آئی۔ حالانکہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے جیکٹوں کے ادھر بے پیس اس کی غلت کا پول کھول رہے تھے۔

”السلام علیکم سر۔“

”اوہ۔ آئیے۔ کیا حال چال ہیں۔ مزید چینیوں کا ارادہ تو نہیں؟“ وہ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گویا ہوئے تھے

”آپ مجھے کب تک شرمندہ کرتے رہیں گے سر؟“ وہ جھینپ گئی۔

”اچھا۔ آپ کو اس بات سے شرمندگی ہوتی ہے چلے آئندہ احتیاط کریں گے۔۔۔۔۔۔ دعدہ۔۔۔۔۔۔“

تشریف رکھنے۔ ”انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے پیٹنے کا اشارہ کیا۔

”کہنے کس سلسلے میں زحمت کی۔۔۔۔۔۔؟“

”سر۔۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ آپ کی بہت مستحکم پوزیشن ہے اور آپ کی اپروچ بھی خاصی ہے۔“

”الہی خیر۔۔۔۔۔۔ اسد میز پر کہیں ان کا کرا گئے کی طرف جھک آئے۔

”سر۔۔۔۔۔۔ آپ مجھے ایک کمرے کا ٹھکانہ دلوائیں۔“

”وہ گھر بدل کر آپ ایک کمرے میں محدود ہونا چاہتی ہیں؟ وہ گھر تو بہت اچھا ہے۔“ اسد نے اس کی بات کاٹ دی

”سر پلیز۔ آپ آگے بھی تو سنئے۔ مجھے ایک کمرہ صرف اپنے لئے چاہئے۔“

”کیا احسن صاحب نے آخری فیصلہ کر دیا؟“ اسد کو جیسے سانس سا ہوا۔

”وہ قیامت تک نہیں کریں گے۔ اگر ایک اور شادی بھی کر لیں گے تو تب بھی نہیں۔ وہ ایک منقسم مزاج شخص ہیں۔ وہ چاہیں گے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ان کے سامنے دم توڑ دوں۔ میں آپ کو حرف حرف حقیقت بتا چکی ہوں۔ بھڑا میں نے ایک لفظ بھی آپ سے نہیں چھپایا۔ شاید اس میں میرا لالچ شامل ہے کہ اگر میں آپ کو پوری صورت حال نہیں بتاؤں گی تو مجھے معاشرے سے آپ جیسا خالص سپورٹ کیسے مل سکے گا؟“

”اچھا.....“ اسد نے گہری سانس لے کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

”ایسے گھر میں کمرہ دلدادہ تھے جہاں مالک مکان خود بھی رہائش رکھتے ہوں۔ گھر الگ نہیں چاہئے۔ ایک کمرہ بس علیحدہ ہوتا کہ بچوں وغیرہ کے شور سے ڈسٹر بنس نہ ہو۔ مالک مکان اچھے ہوں۔ کرایہ بھی مناسب ہو۔“ اسد کے قہقہے نے اسے بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ہنسی ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگی۔

”کیوں بے وقوف بنا رہے ہیں آپ ایک دوسرے کو۔“ وہ مسکرائے۔

”معاف کیجئے گا سر..... اگر آپ ہیلپ کرنے کے موڈ میں نہیں تو دوسری بات ہے مگر اس طرح میرا مذاق تو ذرا اڑا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کوئی نیا جھگڑا.....؟“

”اب کسی نئی چیز کی گنجائش نہیں۔ حد تو یہ ہو گئی کہ وہ آپ کو بھی الزام دینے لگے۔ اس معاشرے کی صورت حال ہو گئی ہے کہ تنگی اور اچھائی کی موجودگی کا یقین نہیں آتا لوگوں کو۔ تنگی اور اچھائی کے عمل پر چونک پڑتے ہیں۔ راست باز کو شک سے دیکھتے ہیں۔ حد ہو گئی ہے۔“

”کیا کہتے ہیں وہ میرے بارے میں؟“ اسد نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔

”کچھ نہیں سر.....“ وہ سر جھکا کر باہر نکلنے لگی۔

”مس ڈر شہوار.....“

”لیس سر.....“ وہ رک گئی۔

”تنخواہ مل گئی آپ کو.....؟“

”جی سر.....!“

”مسٹر احسن کے پانچ سو روپے لوٹا دیئے آپ نے.....؟“

”پلیز سر.....“ اسے رونہ آ گیا۔

”اچھا چلئے..... دل براندہ کیجئے میں آج ہی آپ کو گھر دکھانے لے چلوں گا۔ خوش.....؟“

”بہت بہت شکریہ سر.....“ اسے جیسے کوئی عظیم خوشی ملی۔ جلدی سے باہر نکل گئی۔

ایک نیمار طرے طرے کرنے کی خوشی میں ڈھنگ سے باقی ماندہ کام بھی نہ ہو پایا۔

”یہ..... آپ کی حتی شکست ہوگی مسٹر احسن.....“ اس کے وجود میں نیا جوش تھا جسے مارنے لگا۔

ساڑھے چھ بجے سے وہ اسد کا انتظار کر رہی تھی۔ سات بجے وہ اپنے آفس سے نکلے۔

”دیر تو نہیں ہو گئی.....؟“ وہ اپنی گاڑی کی سمت بڑھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”خاصی.....“ مگر خیر آج کل تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ (شاید منزہ و بلال تھوڑا سا پریشان ہوں)

اسد نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ براہِ ریک سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”کمرے کے علاوہ ایک عدد کچن کا انتظام بھی تو ہونا چاہئے۔ بڑی ضروری چیز ہے۔“ اسد نے گاڑی وسیع و شفاف ترک پر ڈال دی۔

”اکیلی لڑکی کے لئے کوئی مسئلہ نہیں سر..... کچن کی ”سرگرمیاں“ تو زیادہ مردوں کی مرہون منت ہوا کرتی ہیں۔ یا پھر شاید بچوں کی وجہ سے کچن آباد ہوتے ہیں۔“

”دلچسپ خبر ہے۔“ اسد مسکرا دیئے۔

”خواتین ہوا کی طرف منہ کھول کر کھڑی رہتی ہیں غالباً۔“

شہوار دھیرے سے مسکرا کر سامنے دیکھنے لگی۔ خاصا انداز میرا چھپا چکا تھا۔ برقی قہقہے مل اٹھے تھے۔ وہ کافی دیر خاموش بھی رہی پھر ایک دم چونک پڑی۔

”سر! یہ تو ہماری طرف کا حصہ دکھائی دے رہا ہے۔“

”اچھا تو..... آپ کی کوئی چیز ”ہماری“ بھی ہے۔“

”سر..... میرا مطلب ہے گھر یہاں سے دور ہونا چاہئے۔“

”بہتر..... فرمائش نوٹ کر لی گئی۔ انہوں نے ایک موڑ کا نا پھر تیزی سے آگے کی جانب گاڑی بڑھائی اور ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔

وہ اسے نبٹا اُنجان اور نئے راستے سے لائے تھے۔

”چلئے..... شامیاش۔ اتر جائیے۔ مالک مکان بھی اچھا ہے اور کمرے بھی آرام دہ ہیں۔“

”سر! مجھے کم از کم آپ سے یہ امید نہیں تھی۔“ اسے جیسے اپنا مذاق بنائے جانے پر سخت صدمہ ہوا تھا۔

”آپ اس سوسائٹی کے بہت معزز لوگوں سے وابستہ ہیں۔ اگر آپ کو اگلے کو نہیں نظر نہیں آ رہے تو کوئی بات نہیں مجھے نظر آ رہے ہیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

”وہ گھر نہیں ہیں..... چابی انہی کے پاس ہے۔“ وہ رندمی ہوئی آواز میں بولی۔

”مگر مجھے تو کوئی تا لا نظر نہیں آ رہا۔“ اسد نے زور زور سے ہارن بجایا۔ ”اور لائٹ بھی جل رہی ہے۔“ تب شہوار نے

چونک کر دیکھا۔ واقعی گیٹ باہر سے لاک نہیں تھا اور راہداری سے روشنی آ رہی تھی۔

احسن چند منٹ قبل فرم آفس سے واپس آیا تھا۔ صبح پانچ بجے گھر پہنچا تھا۔ دو گھنٹے سو کر اپنے گورنمنٹ آفس چلا گیا تھا۔

اس سرکاری ملازمت کے سبب ہی وہ بھگم بھاگ واپس کراچی آیا تھا۔ کسی باقاعدہ درخواست کے بغیر ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

محکمہ سبکی گورنمنٹ سبکی ملازمتیں اتنی آسانی سے اور اچھے حکموں میں یونہی تو نہیں مل جایا کرتیں۔ تنخواہ محدود سبکی مراعات تو کوشش تھیں۔ شیخ صاحب کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ دوسرے باہر مستقل ان کے پاس تھے۔

وہ صفیہ کو تسلی دے کر باقاعدہ چھٹیاں لے کر دوبارہ آ جائے گا۔ کراچی واپس آ گیا تھا۔ دوسرے اس کے کھٹکے میں یہ

خیال جم گیا تھا۔ شیخ صاحب کا علاج یہاں کراچی میں ہونا چاہئے۔ وہ سوچ رہا تھا وہ مستقل انہیں یہیں لے آئے گا

اور اگر باہر بھیجنا پڑا تو یہاں زیادہ آسانی سے بندوبست ہو جائے گا۔

اس نے جو شرٹ اتاری تھی ہارن سن کر دوبارہ چپکن لی اور بشن بند کرتا باہر چلا آیا۔

”شاید مسعود ہے۔“ اس نے کھٹاک سے گیٹ کھولا مگر ایک دم چونک کر رہے پیچھے ہٹا۔

”السلام علیکم جناب۔“ اسد کی گرجوٹی واضح تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ احسن کا انداز نہایت سرد تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط انداز شہوار پر ڈالی تھی۔ اور راستہ چھوڑ دیا تھا۔

”مسٹر احسن تو قیامت تک مجھے انداز آنے کے لئے نہیں کہیں گے، مگر آپ تو کہیں گی؟“

”اوہ پلیز سر۔۔۔۔۔“ وہ احسن کی بد اخلاقی پر خفت آمیز انداز میں ان سے مخاطب ہوئی اور انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں

آگئی۔ (میر انصیب بکڑ چکا ہے سر۔ آپ کس خیال میں ہیں۔۔۔۔۔؟)

احسن بھی اسد کے انداز سے الجھا ہوا تھا۔ طوعاً کرہاً ان کے قریب آ بیٹھا۔

”اور سنا بیٹے۔ کیسے مزاج ہیں آپ کے۔۔۔۔۔؟“ اسد مسکرائے۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس کی آنکھیں اس کے اختصار سے واضح تھیں۔

”جو ٹھیک ہوتے ہیں ان کا فرض بنتا ہے وہ دوسرے بگڑے ہوؤں کو بھی ٹھیک کر دیں۔ یہ خاصی ان میچور ہیں۔“ اسد

نے شہوار کی طرف دیکھا۔ وہ بری طرح شیشا کر رہی تھی۔

”مسٹر احسن۔۔۔۔۔ جذبات خواہ ایک جیسے ہوں خیالات کے اختلاف سے بہت فرق پڑتا ہے۔ آپ کو ان سے ڈیلنگ

نہیں آتی یا آپ امتحان لے رہے ہیں ان کا۔۔۔۔۔؟“

”آپ مجھے اپنے اگلے پروگرام سے مطلع کیجئے۔“ احسن نے خشک انداز میں کہا۔

”یہی کہ انہیں مت ستائیے۔ یہ بس تعلیمی حد تک ذہن ہیں۔ پی آر کا شس بالکل نہیں ہیں۔ یقین کیجئے جو آپ چاہ

رہے ہیں قیامت تک نہ سمجھ پائیں گی۔

”وہ سوچ“ ہی نہیں ہے ان میں۔“ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ شہوار کو یوں لگا جیسے وہ سیدھے سیدھے اسے ”حق

اعظم“ کہہ رہے ہوں۔ اسے بے حد سکی محسوس ہوئی تھی۔

”یہاں تک کہ میں یا اپنی تحریر پر سن (any third person) انہیں احساس دلانے کہ آپ ان سے کیا چاہتے

ہیں؟“ اسد مزید گویا ہوئے۔

(لو مجھے نہیں پتا کیا کیا چاہتے ہیں؟ یہی کہ میں ان کے ساتھ مل کر خاندان کی دجیاں بکھیروں)

”مسٹر احسن۔۔۔۔۔ یہ بھی دیکھئے کہ اپنے والدین کو وفا و خون کا یقین دلا نا بھی معزز نسب کی ”مجبوری“ ہے۔“

احسن دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ شہوار اس درجہ انہیں راز دار بنا چکی ہے۔

”بڑے پروڈیکٹ سے سو فیصد متوقع ہو تو چھوٹے چھوٹے زائد اخراجات برداشت کر لیتا چاہیں۔ اور آپ تو ماسٹر

آف بزنس ایڈمنسٹریشن ہیں مسٹر احسن۔“

(یہی کہ بتا چکی ہیں محترمہ؟) احسن نے الجھے ہوئے انداز میں شہوار کی سمت دیکھا۔

”مس۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ سوری۔۔۔۔۔ مسز احسن۔ پلیز ایک کپ چائے۔ آج تو مصروفیت کا یہ حال رہا کہ چائے پینے کی

فرصت بھی نہیں ملی۔ چاروں سے اسلام آباد میں تھا۔ آج ہی واپس آیا ہوں۔ ڈیر سارا کام خطرہ کس قدر تیز ہے زندگی

کی رفتار۔ امی سخت ناراض ہوں گی۔ ان کے پاس بیٹہ کر باتیں کئے کتنے دن ہو گئے۔“

احسن ان کی اس درجہ سادگی پر بخور انہیں دیکھنے لگا (کیا واقعی یہ شخص اتنا سادہ ہے یا۔۔۔۔۔؟ مگر یہ اس وقت شہوار کے

ساتھ کیوں آیا ہے؟)

”مسٹر احسن! حیرت ہے آپ نے انہیں پسند کیا۔۔۔۔۔ اپنا یا۔۔۔۔۔ اور آپ ہی ان کی فطرت سے ناواقف ہیں۔ ویسے یہ

تعداد جوڑوں کا المیہ ہے کہ برسوں ساتھ رہتے ہیں مگر ایک دوسرے سے قطعی ناواقف ہوتے ہیں۔

دیکھئے۔۔۔۔۔ وہ آپ کے نام پر دنیا سے کٹی ہوئی ہیں۔ معاشرتی مروجہ اصولوں کے تحت وہ نہایت خسارے میں ہیں۔

غل آپ کی وجہ سے۔۔۔۔۔ تو زیادہ گنجائش آپ کی طرف سے پیدا ہونا چاہیے۔ اب اگر آپ نے ذرا سی تنگ دلی کا مظاہرہ

کیا تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔

آپ کہیں بلکہ اجازت دیں تو میں انہیں بتا دوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کس مقام پر ہرٹ ہوئے ہیں اور کہاں ڈس اپائنٹ۔

آپ کی جگہ شاید میں ہوتا تو میرے ہاں بھی یہی جذبات بیدار ہوتے۔

شاید اسی لئے کوئی تحریر پر سن ضرور ہونا چاہئے۔ ٹھنڈا اور عادل ثالث۔“

”کیا آپ اس وقت اسی رول میں ہیں۔“ احسن نے اس بار قدرے مسکرا کر ان کی سمت دیکھا۔

”شاید۔ اس لئے کہ اس میری پسند اور تناسب میری فطرت ہے۔ اشتیاق اور ڈسٹریس خواہ کہیں ہو مجھے برداشت

نہیں۔ شاید اس لئے کہ میں نے ایسے والدین کے ہاتھوں پرورش پائی جن کی دلچسپیاں مختلف تھیں مگر انہیں ایک دوسرے

کے جذبات کا بہت پاس و احترام ہے۔ میرے والد فطرت کے لحاظ سے پیدا کٹی سپاہی اور میری والدہ ادب و فکشن کی

دلدادہ گویا ڈسٹن کے ساتھ نہایت لطیف اور خوشگوار ماحول بنسرایا۔ طبیعت اپنے چاروں طرف بس یہی کچھ دیکھنا چاہتی

ہے۔ جہاں کہیں ماحول کو متوازن کرنے کے لئے اپنا تعاون محسوس کرتا ہوں آگے بڑھنے میں دیر نہیں لگاتا۔“

”دوبری ٹاکس۔“ احسن کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”میری نہیں۔ میرے والدین کی تعریف کیجئے۔ وراثت و ماحول ہر دو جگہ وہی ذمہ دار ہیں۔“ اسد نے قدرے تقاض

سے اپنے والدین کا تذکرہ کیا۔

”عورت تو بانی برتھ بڑی کمزور شے ہے۔ مقابلہ تو برابر والوں سے کیا جاتا ہے۔ آپ برابری کے حقوق کے نعرے

اور پراپیگنڈے کی زد میں نہ آئیے۔ وہ عمارت پر جا سکتی ہے۔ فلک ناپ سکتی ہے۔ کما کر کھلا سکتی ہے۔ مگر بعض جگہ اس کے

سارے ہتھیار کند ہو سکتے ہیں۔ مرد اگر انسانیت بھلا کر اس کی کلائی تمام کر اسے بے بس کر دے تو نفسوں کا مان خاک میں

ملانے کی ذمہ داری بھی بن سکتی ہے۔ پھر وہ محض ایک شکست خوردہ عورت ہو کر رہ جائے گی۔ جو اپنے آپ سے بھی آنکھ نہیں ملا

سکتی۔ مرد فریڈلنگی، موزی جی جب چاہے اپنا بیتر ابدل کرنے جہان کی ابتدا کر سکتا ہے۔

ہمارے ساتھ جو لوگ ہمیشہ اچھے ہیں کوشش کرنا چاہئے کہ ہم ان کو ہمیشہ اچھا رہنے دیں۔ ان کے ساتھ مکمل تعاون

کریں۔ گلاب ہنا کر بھول بونا کوئی ٹھنڈی نہیں احسن!“ اس بار اسد کا انداز قدرے بے تکلفانہ تھا۔

کمزوروں کے ساتھ کمال مہربانی سے پیش آنا تو بجا ہے خود جو انفرادی ہے۔ آخر کمزور کو بھی تو اپنے مقابل کی قوت نظر آ

رہی ہوتی ہے۔ شفقت، کرم، محبت یہ ”بڑے“ کام ہیں۔ بڑے خلوص والے لوگ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ میرے والد کہتے ہیں۔“

”آپ کے والد بت بڑے آدمی ہیں۔“ احسن کو ایک غلام ایک محرومی کا چبھتا ہوا احساس ہوا۔

”آئی او بلا مجھ مائی پیئرس۔“ اسد نے فخر یہ کہا۔

”ہم ہر دم دوسروں کے رویوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے رویے پر بھی غور کرنا چاہئے۔ حالات اس طرز

سدرہیں گے نہیں بلکہ مزید پیچیدہ ہو جائیں گے۔ آپ کی یہ عمر یہ دور لوٹ کر نہیں آئے گا۔ بعض اوقات انسان اپنے

بیاروں کو مطمئن کرنے کے لئے وہ کچھ کہہ جاتا ہے جو وہ پہلے سے سوچے ہوئے نہیں ہوتا۔ وہ کم عمر بھی ہیں اور نقصان زد

بھی۔ ان حالات میں آپ کو بہت کچھ نظر انداز کرنا ہوگا۔ آپ سے دلچسپی آپ سے وفاداری کا ثبوت وہ مکمل طور پر اس وقت دے چکی ہیں جب انہوں نے آپ کے حق میں ووٹ دے دیا تھا۔ آزمائے ہوئے کو آزمائنا بڑی نادانی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وہ بس ”مظلوم“ ہیں۔

اسد نے سگار نکال کر احسن کی سمت دیکھا۔

”آپ کی اجازت سے.....“

”اوہ ضرور.....“ احسن نے کسی خیال سے چونک کر کہا۔

”آپ شوق نہیں فرمائیں گے۔“ اسد نے احسن کو پیش کش کی۔

”جی نہیں..... میرا میٹ اور ہے۔“ احسن مسکرا دیا۔

”میں جانتا ہوں۔“ اسد نے شرارت سے کہا۔ دونوں ہنس دیے۔

اسد نے مختصر آج کے واقعے سے احسن کو آگاہ کیا اور صورت حال کی یقینی کا ایک بار احساس دلایا۔

”انہیں صرف اپنے ساتھ زیادتی کا احساس ہے۔ آپ انہیں یقین دلایے کہ یہ زیادتی آپ کے غلطوں کی شدت کا مکمل اظہار ہے۔“

اسی دم شہوار چائے کے ہمراہ اندر داخل ہوئی۔

احسن نے بہت عرصے کے بعد اس کی سمت بھرپور توجہ سے دیکھا۔

سبز کاشن کے جدید تراش کے گرے شلوار میں لمبوس ہنر دہنے کو قرینے سے شانوں پر پھیلائے وہ سادہ اور افسردہ دکھائی دی۔ وہ اس کا شوہر تھا مگر اس نے کبھی اس کا بے ترتیب دوپٹہ نہیں دیکھا تھا۔ ایسی عورت ایک حسین راز کی طرح محسوس ہوتی ہے جسے جاننے کا تجسس رہتا ہے۔

فلم ایکٹریز..... ٹی وی اداکارائیں..... ساتھ پڑھنے والی الٹرا ماڈرن طالبات۔ اسے ان کے بارے میں کبھی اشتیاق نہیں رہا۔

اس کی خاموشی اس کی حیا۔ اس کا گریز۔ کچھ تھا کہ کوئی اس کے دل میں وہ مقام نہ پاسکا تھا جس پر وہ انجانے میں قبضہ کر بیٹھی تھی۔

”شوگر.....“ وہ مقابل بیٹھی اسد سے مخاطب تھی۔

”صرف ایک۔“

”احسن سے نہیں پوچھیں گی.....؟“

”مجھے پتا ہے سر۔“ وہ قدرے ناگواری سے گویا ہوئی۔

”دیکھئے..... انہیں سب یاد ہے۔ میں سمجھا چائے پلانے کا ارادہ نہیں۔“ اسد نے مسکرا کر احسن کی سمت دیکھا۔

شہوار کی سمجھ میں ان کا یہ انداز نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دونوں کے سامنے چائے رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ بھی پی لیجئے۔ اگر پرہیز نہ ہو تو۔“ اسد نے شہوار کو متوجہ کیا جو پی وی پر رکھے گلدان میں پھول قرینے سے لگانے لگی تھی۔

”میں رات کو چائے نہیں پیتی سر۔ پھر نیند لیٹ آتی ہے اور صبح آنکھ نہیں کھلتی۔ پھر فیکٹری کی تیاری بھی کرنا ہوتی ہے۔“ اس نے بڑی تفصیل سے انکار کیا۔

”اب آپ تب ہی فیکٹر آئیں گی جب مسٹر احسن آپ کو اجازت دیں گے..... دوسری صورت میں جبری ریٹائرمنٹ۔“

احسن کا قبضہ بے ساختہ تھا جس میں اسد بھی شریک ہو گئے۔

شہوار تو جیسے گرتے گرتے پبی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر احسن کی سمت دیکھا مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ دونوں تازہ ترین سیاسی حالات پر بات چیت کرتے ہوئے چائے پینے لگے۔

اسد چائے ختم کرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

”آپ بہت ناؤں ہیں احسن! مگر لگتا ہے آپ کی تھکنگ پاور کی خانوں میں تقسیم ہے۔ بہر حال بہترین ذہانت یہ ہے انسان خود کو کرنے نہ دے۔ نیک خواہشات کے ساتھ اجازت.....؟“

”اگر لوگ فیکٹری نہ پہنچ سکے تو پھر آپ تو آئیں گے ناں.....؟“ احسن نے کن اکھیوں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے اسد سے کہا۔

”بشرطیکہ..... لوگ ہمیں بلائیں۔“ اسد نے برجستہ جواب دیا۔ دونوں کی مشترکہ ہنسی سے شہوار مارے حیرت کے خمجدی تھی۔ وہ وہیں ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی رہ گئی۔

”شہر میں ایک بھی پر غلط دوست موجود ہو تو سارے شہر کی فضا ہی دوستانہ لگتی ہے۔ ایک سائنس دان کا قول یاد آ رہا ہے۔“

احسن نے اسد کو مخاطب کیا۔

”ارشاد.....“ اسد نے جبکہ کراڑی کے اگلے دروازے کا لاک کھولا۔

”یہی کہ مجھے لیور (Liver) رکھنے کی جگہ بتادی جائے تو میں زمین کا یہ کرہ الٹ سکتا ہوں۔ اب سوال تو لیور رکھنے کا ہوتا ناں۔ بعض لوگ ہمدرد ہوتے ہیں بہت کہتے ہیں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کوئی پوائنٹ نہ نہیں کرتا۔ آپ کو لیور رکھنے کی جگہ معلوم ہے..... ٹھیکس۔“

وہ جو آپ نے ”سوچ“ والا پوائنٹ دیا ہے مجھے اچھا لگا۔“

”اس لئے کہ ہم میں جنس کا فرق نہیں ہے۔ میں آپ کی جگہ خود کو فٹ کر کے یہ پوائنٹ حاصل کر سکتا ہوں.....“ اسد مسکرا دیئے۔

”جب ناموافق حالات ذہن سے نکتہ رسائی کا ہنر چھین لیں۔ تب ایک پرسکون اور پر غلط فرد کی جگہ ہمارے آس پاس بن جاتی ہے جس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔“

موٹی جنیبر تھمکھتے مگر خضر بڑے کام آئے تھے..... احسن نے بڑی گہری بات کی۔

”سو ناؤں.....“ اسد نے بے اختیار اس کے ہاتھ تھام لئے۔

”خدا حافظ۔“ وہ گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

احسن نے گیٹ بند کیا، باہر کی لائٹس آن کیں۔ ڈرائنگ روم کے سوچ آف کے اور اپنے میڈر روم میں چلا آیا۔ وہ ریسیور کان سے لگائے کھڑی تھی۔

”سوری بلال..... تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوئی۔ احسن کے ساتھ۔ ہاں آگئے شاید آج ہی۔ ظاہر ہے پہلے سے بہتر ہوں گے جب ہی تو آگئے ہیں۔“

ایک دوسرے کے جذبات کا احترام سب سے پہلاستون ٹھہرے۔ جہاں قربانی مانگی نہ جائے خود دینے کی تمنا ہو۔ ہم اپنی اولاد کو وہ گھردیں..... جسے وہ اپنی سلطنت محسوس کریں۔ قید خانہ نہیں۔ ایک دیوار گر چکی ہے شہوار۔ اگلی بھی گرے گی۔ انشاء اللہ۔“

شہوار جیسے شل ہو چکی تھی۔ احسن کی پہل سے ہار گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس کی شدید اور اولین ضرورت ہے۔ اس کے مضبوط وجود کے اپنائیت بھرے احساس سے ایک نئی طاقت اور حوصلے کا سراغ ملا۔

وہ تیار ہونے لگی..... منہ ہاتھ دھو کر بال کھول کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بال سلجھا کر چوٹی گوندی۔ پھر پرس سے پنک لپ اسٹک نکال کر لگانے لگی، ہلکی تھی کہ سیاہ سوٹ میں لمبوس احسن اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا۔ بیزر برش اٹھا کر بال بنانے لگا۔ شہوار نے لپ اسٹک والا ہاتھ جلدی سے نیچے کر لیا اور قدرے جھینپ کر آئینے کے سامنے سے ہٹنے لگی۔

”اپنا کام کرو۔ کہاں چلیں؟“

”کر لیا ہے۔“ اس نے کبھی احسن کے سامنے میک اپ نہیں کیا تھا۔ دیکھ لئے جانے پر جیسے بے حد شرم آ رہی تھی۔ ”دیے کیوں ہتھیاروں سے لیس ہوتی ہو..... یوں بھی ٹھیک ہے۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر گویا ہوا۔ شہوار کی پلکوں پر منوں بوجھا پڑا۔ وہ نظریں نہ اٹھا سکی۔

”چلتے صاحب!“ وہ چایاں اٹھا کر اس سے مخاطب ہوا۔ اس نے مدتوں بعد احسن میں یہ ترنگ دیکھی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت سے زندگی پھوٹ رہی تھی۔

چلتے چلتے اس نے اسپرے کیا۔ پھر اس کے قریب آ کر اس پر بھی کرنے لگا۔ شہوار نے پھوار کے سامنے پھیلی کی جیسے روک رہی ہو۔

”فارمین (for man) ہے۔“

”جب تم ساتھ ہو گے تو ہر شے کہاں ہو جائے گی۔ کسی کو کیا خبر خوشیادھر سے آ رہی ہے یا۔“ شہوار نے دروازہ لاک کیا۔ پھر گھر کے دوسرے حصے بند کئے۔ اتنے میں احسن گاڑی باہر نکال کر ہارن بجانا شروع کر چکا تھا۔

وہ جلدی سے گیٹ میں تالا ڈال کر اس کے برابر والی سیٹ پر آ گئی۔ احسن بہت آرام سے گاڑی چلاتے ہوئے سیٹی پر ایک خوبصورت دھن گنگنا رہا تھا۔ شہوار کو اس کو دارنگی سے خوف سے آنے لگا تھا۔ حیا آمیز خوف۔

”ارے یہ گیت تو بے میرے پاس.....“ اس نے یکیشیں ٹولیں۔

”بہت سنیال کر رکھا ہوا تھا کسی ایسے ہی وقت کے لئے۔“

”کیا آپ کو اتنا سب کچھ ہو گزرنے پر بھی یقین تھا کہ.....“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”سو فیصد..... صاحب یقین مسلمان ہوں۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”ایسے کیسے گنوا دیے تھیں..... جان کی بازی لگا کر لائے تھے۔ مگر جس انداز میں سوچا تھا اس سے قدرے مختلف ہوا۔ مگر خیر..... تم میں وہ سوچ ہی نہیں ہے۔ چلو جلد ہی فٹ کر دیں گے۔ کبھی یہ حساب برابر ہو ہی جائے گا۔“

شہوار کے خاک بھی پلے نہیں پڑا۔

وہ دراصل ابھی ان سے تفصیلی بات نہیں ہوئی..... اوکے۔“ اس نے ریسورر کھ دیا۔ وہ ہلٹی تو وہ شاید وارڈ بکھول کر کپڑے نکالنے لگا تھا۔ وہ باہر جانے لگی۔

”شہوار.....“ کتنا پرانا انداز تھا ملاوے کا..... وہ اسی زمانے میں جا کھڑی ہوئی..... وہ رک گئی مگر ہلٹی نہیں۔

”کہاں جا رہی ہو.....“ تفصیلی بات چیت..... نہیں کرو گی؟“

شہوار کا دل دھک سے رہ گیا۔ (آخر سر نے ان سے کیا باتیں کر ڈالی ہیں)

”کچن جا رہی ہوں اور کہاں.....؟ اور مجھے بات چیت کی اس وقت کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔“

اس نے دروازہ کھولا۔ اسی بجڑے بجڑے انداز میں۔

”چھوڑ دے کچن وچن..... بسن پیار سے بنی ہوئی گلے کی ہو..... کھانا باہر کھائیں گے۔“

”ضرور کھائیے۔ میں روک تو نہیں رہی۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کا بازو احسن کی پہنی

گرفت میں تھا۔

”اب جانے بھی دور یار..... مجھے نہیں معلوم تھا تم اس قدر بے وقوف ہو۔ بے وقوف معافی کے قابل ہوتا ہے۔“

”نہ میں بے وقوف ہوں نہ میں معافی مانگ رہی ہوں۔“ وہ ایک دم بھڑی اٹھی۔

”بے وقوف کبھی معافی نہیں مانگتا..... معافی تو عظیم لوگ مانگتے ہیں۔ تم ذرا یہاں بیٹھو۔ میں ایک ”معذرت نامہ“ تاپ کر لوں۔“

اس نے شرارت سے بیڈ کی سمت بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”غلطیاں تو دیوا گئی میں ہو ہی جاتی ہیں غلطیاں دیکھتی ہوں ”دیوانہ پن“ نہیں دیکھتیں۔“

شہوار بحر خیر کے تھپتھپوں کی تاب نہ لاسکی دونوں ہاتھوں سے چہرہ اٹھانپ کر دھواں دھار روٹنا شروع کر دیا۔

احسن نے اسے تھام کر اپنے گلے سے لگایا..... وہ اسی طرح چپکاپیوں سے روٹی رہی۔ حتیٰ کہ آنسو انگلیوں سے باہر نکل

کر احسن کر اپنے گریبان پر محسوس ہونے لگے۔

”جنہوں نے ہمیں چھوڑا ہے ہم انہیں اپنا نہیں گے شہوار..... ہم نے جو عذاب اٹھائے ہیں ہمیں کچھ تو ملا

ہے..... مگر وہ جو راہیں ہمارے لئے منتخب کر رہے تھے وہاں ہمارے لئے کچھ بھی نہیں تھا..... ہمارا نکاح ان کی مرضی سے

ہوا تھا شہوار..... میں اپنی بیوی کو اپنے گھرایا تھا..... وہ جو تم اپنی مرضی سے کر رہی تھی وہ تمہارا فیصلہ بھی نہیں تھا..... اگر در

حقیقت یہ تمہارا فیصلہ ہوتا تو یہ سب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جو نقصان ہو چکا ایک دن اس کی تلافی ہو جائے گی مگر وہ جو ہمارا نقصان کر رہے تھے اس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ اپنی

جذباتی پسند ناپسند پر جیتی جاگتی زندگیاں بھینٹ چڑھا دینا کون سا دین ہے۔ مذہب ہے۔ کہاں کا قانون ہے؟

اگر تم اسی طرح مسئلے پیدا نہ کرتیں تو میں اپنی ساری توانائیاں دوسری سمت منتقل کر کے کب کا کوئی حل نکال چکا ہوتا۔

تم نہیں جانتیں..... اباجی کی پشیمان نگاہیں مجھے کیا کیا یاد دلا گئیں..... میں نے انہیں احساس تک نہیں ہونے دیا۔ کہ

میرے پچاسی کا پچندہ بنانے والے ہاتھ میرے اسی انار پرست باپ کے تھے۔“

شہوار اس سے الگ ہو گئی..... اور درپے سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

”چلو تم تیار ہو جاؤ، ہم کھانا باہر کھائیں گے۔ بہت سی باتیں کریں گے..... آؤ..... ہم ایسے گھر کی بنیاد رکھیں جہاں



”مجھے تو بالکل سمجھ نہیں آئی۔“

”کسی چیز کا وجود ہوتا ہے تو آتی ہے۔“ وہ شرارت سے کہہ کر کیسٹ لگانے لگا۔

شہوار قدرے ناراضگی سے اس کی طرف دیکھ کر سامنے دیکھنے لگی۔

ادمیرے دل کے چین..... چین آئے میرے دل کو دعا کیجئے

اپنا ہی سایہ دیکھ کے تم جان جہاں شرما گئے

ابھی تو یہ پہلی منزل ہے تم تو ابھی سے گھبرا گئے۔

”سنئے۔“ واپسی میں مجھے شکیلہ کے ہاں ڈراپ کر دیجئے گا۔ منزہ اکیلی ہے۔ اس کی خاموشی میں چھپی اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس سے باتیں کر کے اس کا دھیان بٹانا کوئی بڑی سی ٹنگی لگتی ہے۔“

مجھے معلوم تھا کہ کھٹائی تو ضرور ڈالو گی۔ خیر یہ بھی ضروری ہے۔

میں یوں بھی گھر میں دو چار اپنے جمع کیے بغیر تمہیں سیٹ نہیں کروں گا۔ کل کو یہی الزام دھردو گی کہ کمزوروں کے ساتھ

اس نے فقرہ ادھر اچھوڑ دیا۔ شہوار کا مارے حیا کے مرجانے کو جی چاہا۔

مگر کمزوروں کے ساتھ اس طرح کی گفتگو بھی نہیں کرنا چاہیے۔

اس نے یہ سوچ کر فوری طور پر پیش بندی کی مبادوہ مزید بے باک ہو جائے۔

یہ تو تم میرے اور اپنے بڑوں سے پوچھنا کہ اس طرح کی گفتگو کرنا چاہیے یا نہیں۔

احسن پلیز۔

خالو جان اب کیسے ہیں؟

بہت جلدی خیال آ گیا۔ جب سب جا رہے تھے تو تم کیوں نہیں گئیں؟ مگر ہاں تمہیں تو ابھی میرے پانچ سو روپے بھی واپس کرنا ہیں تو کرمی کا معاملہ ہے۔

شہوار کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سر یہی بتا گئے..... مگر کب.....؟ وہ بری طرح جھینپ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی..... پھر قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی۔

کیا کہا ہے سر نے آپ سے.....؟ وہ اس تبدیلی کا سراسر ذمہ دار اسدی کو سمجھ رہی تھی۔

کچھ نہیں..... بیڑی چارج کر کے گئے ہیں بس..... اور یہ کہ کسی کا کوئی سوچ لوڑ ہوتا ہے۔ آپ کا سرے سے غائب ہے جی نہیں..... وہ یہ نہیں کہہ سکتے..... وہ برامان گئی..... احسن ہنس دیا۔

میں کل شام پانچ بجے اسلام آباد فلائی کر جاؤں گا۔ دس دن کی لیو پر جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے میرے بغیر دل نہ لگے۔ چلنا ہو تو تیار کر لیتا۔ مگر پھر وہ تمہاری نوکری..... بکری تو تمہیں مل چکی ہے۔ نکالو وہ پانچ سو روپے۔

وہ اسی طرح طرح باہر جھانکتی رہی ایک شرمندگی کے احساس کے ساتھ۔

میں بعد میں آؤں گی۔ منزہ بلال کیسا سوچیں گے؟ انعام بھائی بھی لندن گئے ہوئے ہیں۔

یہ تو وہ احسن کو بتاتی چکی تھی۔ کہ صنفیہ نے فون کیا تھا کہ اس کے بعد شکیلہ، نبیلہ اور نور بانو کے ساتھ اسلام آباد چلی گئی تھیں۔ اس نے جملگ کر تے فن لینڈ کے مقابل کبابش کے نزدیک گاڑی پارک کی۔

صنفیہ ہاسٹل میں تھیں جس وقت وہ تینوں گھر پہنچیں..... انیلا کی حالت رو رو کر خراب ہو چکی تھی۔ شاید یہ وجہ ہو کہ شیخ

صاحب تمام بچوں میں اس سے خصوصی التفات برتتے تھے۔ شکیلہ، نبیلہ کو دیکھ کر انیلا، بیلا، راحیلہ تینوں نے رونام شروع کر دیا۔ نبیلہ بھی شروع ہو گئی۔

ہمارے تو بھائی جان بھی..... ہمارے پاس نہیں۔ اب تو اباجی بھی..... بیلا نے روتے ہوئے کہا۔ شکیلہ اور نور انوں انہیں دلاسا دینے لگ گئیں۔

احسن بھائی آئے تو تھے۔ شکیلہ نے انیلا کی شکل منولی۔

ہم سے تو ملے بھی نہیں۔ وہیں اباجی کے پاس رہے میں احمر کے ساتھ ملنے لگی تو وہ کہیں ملنے گئے ہوئے تھے۔ ہوئی میں ٹھہرے تھے۔

شکیلہ نے نور بانو کی طرف دیکھ کر اسے چپ ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سارے راستے یہی سوچ کر خوش ہوتی رہی۔ احسن بھائی کے لئے دروازے کھل گئے۔ مگر آہ۔

اس نے احمر کو اور ان تینوں کو نور بانو کے بارے کچھ نہ بتایا تھا۔ مگر صنفیہ گھر آئیں تو وہ عجیب استحسان میں پڑ گئی۔

یا الہی دکھ کے ان لحوں میں..... اس چور چور عورت کو مزید ہلکان کرتے۔ مگر ایک روز تو آخر پتا چلنا ہی ہے۔

صنفیہ نے سلام بھی کر لیا تھا۔ خیریت بھی پوچھ لی تھی۔ وہ منتظر تھیں کہ شکیلہ تعارف کرائے گی۔

ای..... یہ نور بانو جی ہیں..... بہت اچھی ہیں۔ میرا اتنا خیال کرتی ہیں کہ بتا نہیں سکتی۔ پہلے بھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ انعام صاحب کی بیگم ہیں۔ گھر میں ہماری بڑی اور خیر خواہ۔

صنفیہ ہکا بکا سی ہو کر شکیلہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ انعام کی بیگم تو یہ ہے کیا کہہ رہی ہے یہ؟

ان کا دماغ ماؤف ہونے لگا..... کوئی خیر کی خبر ہی میرے نام لگانی بھی مالک.....؟

نور بانو نے آگے بڑھ کر ان کے شانے تمام لئے جو ساکت کی کھڑکی تھیں۔

مجھے آپ کے دکھ کا دکھ ہے۔ آپا جان..... مگر اس میں یہاں موجود کسی کا بھی قصور یا حصہ نہیں..... آپ یقین کیجیے۔

یہ بھی انعام علی کی بیوی ہے۔ اور میں بھی۔ بس یہی قدر مشترک ہے۔ ہم دونوں میں۔ مگر نہ نصیب تو ہمارے ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ یہ جی جی کی سہاگن ہے اور میں بس نام کی۔

ان کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش صاف جھلکنے لگی تھی۔

صنفیہ کچھ نہیں سمجھیں۔ بس یہی دھیان آیا کہ ایک اور حرام نصیب ان کے مقابل آکر اہوا ہے۔ جانے انہیں کیا ہوا دو نور بانو کے گلے سے لگ کر بلک بلک کر رونے لگیں۔ انیلا جلدی سے پانی لے کر آئی۔ شکیلہ دونوں کو سنبھالنے میں لگ گئی صنفیہ بمشکل چپ ہوئیں۔

ای..... یہ بہت اچھی ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں اتنی اچھی۔ شکیلہ نے نور بانو کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

اگر یہ اتنی اچھی ہیں تو کبھی ذکر کیوں نہیں کیا۔ کتنا کمزور سمجھتے ہیں مجھے میرے بچے کمزور ہوتی تو عمر نہ گئی ہوتی کبھی کی۔ انہوں نے انیلا کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

انیلا نے دوسرا گلاس نور بانو کے ہاتھ میں تمہا دیا۔ وہ تینوں نور بانو کو اور شکیلہ کو عجیب تحیر آمیز انداز میں دیکھ رہی تھیں نہ جاسے کیا..... شاید ایک شخص کی دو بیویاں اور وہ بھی ایک ساتھ دیکھنے کا یہ ان کا پہلا اتفاق تھا۔

برادر والی بانی کے منہ سے انہوں نے سنا تھا..... سوت تو چون کی بھی بری۔ ان کے خیال میں تو یہ نہایت بد صورت رشتہ تھا مگر یہاں تو آگ ہی نقشہ تھا..... ان کی باجی تھی کہ امی سے زیادہ ان پر دھیان دے رہی تھی۔

دھڑکنوں کی رفتار بڑھ گئی۔

صبح سے رات گئے تک جانے کتنی بار فون کی بیل رینگ ہوتی تھی۔ مگر اس بیل کے ساتھ ہی جیسے وجدانی حس پوری طاقت سے ابھر کر کسی اہم بات سے مطلع کر رہی تھی۔  
وہ تقریباً بھاگتی ہوئی فون تک آئی تھی۔ ریسپور باہر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بے تابلی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ انہوں نے ریسپور اس کی سمت بڑھا دیا۔

مسٹر سرفراز۔

اوپر..... بعض اوقات اندر کی اطلاع کتنی سچی ہوتی ہے۔

جی..... نائلہ باہر بول رہی ہوں۔

وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہوں۔ الحمد للہ۔

دوسری طرف رازی کہہ رہا تھا۔

جن راہوں سے گزر کر آیا ہوں اس کے بعد اللہ سے دعا ہے اگر میری جان کا دشمن بھی ہو تو..... اسے یہ امتحان نہ ملیں۔ اپنے آپ کو سنا نہایت کٹھن کام ہے سزا بابر لیکن..... سزا احساس گناہ کے بعد نہایت ضروری ہے۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں میں آپ کی بہن کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دوں گا کہ وہ میرا تادان ہیں۔ کاش جو کچھ ہوا یہ کسی فیتے پر نقش ہو جاتا اور میں یہ اذیت ناک حصہ کاٹ کر کسی ڈسٹ بن میں پھینک دیتا۔ خالہ جان تو یہاں نہیں ہیں ان کا فون نمبر دے دیجئے۔ میرے والد بات کریں گے۔ کل امی اور روٹی آپ کی طرف آئیں گی۔ او۔ کے۔

رازی کی آواز بند ہو گئی۔ نائلہ نے ریسپور رکھ دیا۔ اور لاؤنج کی طرف آئی تھی جہاں باہر کی اطلاع کے منتظر تھے۔

کیا کہہ رہے تھے.....؟ کیا فیصلہ ہوا؟

وہی جو میری دلی خواہش تھی۔ اب ہم آپ کی شادی میں بالکل دیر نہیں کریں گے۔ خواہ سادگی سے کریں۔ خدا معلوم کب کیا ہو جائے۔ وہ باہر کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

میں دیکھ رہا ہوں۔ بالکل ریست نہیں لے رہی ہیں آپ۔ مجھے فکر ہو چلی ہے۔ آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ باہر نے یوں موضوع بدلا جیسے کوئی عام سی بات ہو۔ ایک طمانیت بہر حال چہرے پر تھی۔

بستر پر بھی وہ آرام نہیں ملتا جو اس احساس سے ملتا ہے کہ ہمارے آس پاس کتنے سارے لوگ ہمارا خیال کرنے والے ہیں۔ اس نے باہر کے بازو سے سر نکال دیا۔ ایک طمانیت کا گہرا احساس تھا۔ فکھن جیسے زینہ بڑبڑاتے لگی۔ محض دو منٹ کے وقفے سے باہر نے اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ سوچتی تھی۔

کس قدر رازی سلیپ ہیں نائلہ..... وہ اس کا خوابیدہ چہرہ دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر دو آئی تھی۔

شیخ صاحب کی زبان پر تالے پڑ چکے تھے۔ وہ زبان جو ہر وقت انگارے برساتی تھی۔ اس کی خاموشی پر جیسے صلیب کی احساس گناہ میں جلا ہو چکی تھیں۔ سوچتی تھیں کہ قبولیت کے لمحے میں ان کی برداشت تو جواب نہیں دے گئی تھی۔ احسن کی سمت دیکھتی تھیں۔ تو اپنے مان و یقین پر ناز کرنے کو جی چاہتا تھا۔ کس طرح باپ کا سایہ بنا ہوا تھا۔ صلیب کے دونوں بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ نہیں بھی آتی رہتی تھیں۔ مگر ایک نشتر جگر میں اٹک گیا تھا کہ عائشہ اب بھی نہیں آئی تھیں۔ حالانکہ

دنیا کے خیالات اور اصول شاید فطرت کی طرح اٹل نہیں ہوتے بڑی گنجائش رہتی ہے ان میں۔ انیلا کے ذہن میں بس یہی بات آئی تھی۔

ٹھیکہ نور بانو کے پاس بیٹھ کر ان سے بہنوں کا تعارف کرنے لگی۔ اور ان کی طرف دیکھ کر بار بار یوں مسکرا رہی تھی۔ گویا انہیں یاد دل رہی ہو کہ مسکراتا بھی چاہیے۔

صلیب نے آگے بڑھ کر بے اختیار اس کا چہرہ ہاتھوں میں تمام لیا اور جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ کتنے اچھے ہیں میرے بچے..... میں بھلا اس قابل کہاں تھی۔ ان کا انداز کم مہم تھا نور بانو کو وہ چاروں گھیر کر بیٹھیں تو ٹھیکہ نے موقع غنیمت جان کر ماں سے کہا۔

امی..... باجی کا بہت خیال رکھیے گا۔ یہ میرا اس طرح خیال کرتی ہیں جیسے کوئی بلوری برتن سنبھالتا ہوگا۔ جو میرے بچوں پر محبت کی نظر ڈالے میں اس کی آنکھوں میں اپنا نور اتار دوں۔ کیا سمجھا ہے تم نے ماں کو.....؟ یہ میری مہمان ہیں۔ اپنی دور سے چل کر تمہارے باپ کی عیادت کو آئی ہیں۔

صلیب نے کمال مہارت سے اپنا دکھ چھپا کر بیٹی تو تسلی دی۔ ٹھیکہ صلیب کے گلے سے لگ گئی۔ اف امی..... کتنی دور ہوں آپ سے۔ بس یہی غم ہے۔ مگر نہ اللہ نے مجھے ہر سکھ سے نوازا ہے۔ صلیب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ یہ میری بیٹی ہے دکھ سنبھالنے کا قرینہ ہے اسے۔

احسن شیخ صاحب کو کراچی لے گیا تھا۔ صلیب اور انیلا بھی ساتھ تھیں۔ امر راجیلہ، اور بیلا گھر پر تھے۔ کیونکہ نائلہ نزدیک ہی تھی۔ اس لئے صلیب خاصی بے فکر تھیں اس طرف سے۔

بیٹے کو باپ کی حیرت رازی میں جتا دیکھ کر جیسے ان کی عمر بڑھ گئی تھی۔ شیخ صاحب کی مجبور حالت دیکھ کر وہ ایک لفظ..... ایک حرف ملامت منہ سے نکالنا جرم سمجھنے لگی تھیں۔ کہ جب حساب کتاب کے لئے ایک ذات برحق موجود ہے۔ تو خود پر وزن کیوں ڈالا جائے۔ اپنے ہاتھ کیوں رکتے جائیں؟ وہ چپ تھیں۔ ہر چند انہیں شیخ صاحب کی اس بے بسی پر رونا آ جاتا تھا۔

کہاں وہ ٹھوکر سے درد داڑھ کھولنے والے۔ ایک آواز میں گھر کی بنیادیں ہلا دینے والے۔ مگر وہ کبھی ان کے ماضی کے متعلق کوئی ذکر نہیں کرتی تھیں۔

گھر یا پس پشت ڈالے وہ دن رات ان کی خدمت میں مصروف تھیں نائلہ کو جانے کیا کیا تاکید کر کے روانہ ہوئی تھیں۔ ایک طرف بیٹے کے چہرے کی محرم تھی۔ دوسری طرف اس کی حالت زار دوسری جانب مسلسل ریکارڈ ٹنگ۔ اور پھر رازی کے جواب کا جاں سوز انتظار۔ اسے یہ تھکا دینے والا دور لگا۔ مگر ایک جذبہ کار تھا جو اسے حوصلہ دے رہا تھا۔ آنے والے زمانے کے خوبصورت رنگ دکھا دکھا کر لپکار رہا تھا۔ نیلیہ کے مایوس چہرے پر کھل کر آنے والی مسکراہٹ۔

اور خود اس کی اپنی زندگی میں آنے والا خوبصورت اضافہ..... ایک اختیار من پسند زندگی۔ جانے کون کون سے جذبے اسے ان تھک بنائے ہوئے تھے۔

بابر کا معالج ہر دوسرے تیسرے روز گھر آ رہا تھا۔ اس موڑ پر اسے نئے دلوں سے میسر آئے تھے۔ اسے دن رات رازی کے فون کا انتظار تھا۔

آج بھی وہ عشاء کی نماز پڑھ کر وعاما گئے میں مصروف تھی کہ اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کا دل سٹک چھپلا پھر

بڑے بھائی احسن سے خور موڈ آف کیے ہوئے تھے۔ مگر آ تو گئے تھے۔ صنفی کتنی بار ان کے سامنے روئی تھیں کہ وہ کسی طرح سردار صاحب کو سمجھائیں کہ جو کچھ ہوا شیخ صاحب کی ان اپرستی کا نتیجہ تھا۔

انہیں وہ وقت نہیں بھولتا جب وہ اپنی والدہ کے انتقال پر بڑے بھائی کے ہاں نواب شاہ گئی تھیں۔ اور عائشہ نے ان سے کلام تک نہ کیا تھا۔ سگی بہن کا یہ رویہ انہیں پاگل سا کر گیا تھا۔ وہ تو غیبت ہوا کہ وہاں سردار محبت علی نہیں تھے ورنہ خدا معلوم کس ذلت سے انہیں گزرنا پڑتا۔

بجائے احسن پر غصہ کرنے کے وہ ہر مسئلے کا ذمہ دار شیخ صاحب ہی کو گردانتی تھیں۔

وہ اس وقت شیخ صاحب کے منہ میں بیچ سے پانی ڈال رہی تھیں۔ بڑے بھائی مرتضیٰ احمد اور چھوٹی بہن رمیصہ ان کے قریب بیٹھی تھیں۔ شیخ صاحب نے بائیں ہاتھ سے صنفی کو اشارہ کیا کہ وہ کاغذ اور قلم لائیں۔

صنفی احسن کی خرم کا پیڑ اور اسی کا قلم فوراً لے آئی تھیں۔

شیخ صاحب اُلٹے ہاتھ سے کچھ لکھنے لگے۔ وہ تینوں چپ چاپ انہیں لکھتا دیکھنے لگے۔ کافی دیر کی جدوجہد کے بعد انہوں نے پیڑ صنفی کی طرف کھسکا دیا۔

صنفی نے آگے بڑھ کر بے تابی سے ان کے لکھے پر نظر ڈالی۔ ٹوٹی پھوٹی تحریریں لکھا تھا۔

سردار میرے بیٹے کو معاف کر دو۔ دیکھو۔ میری سزا شروع ہو چکی ہے۔ شیخ رحیم۔

صنفی کا دل بھرا آیا۔ انہوں نے کاغذ علیحدہ کر کے مرتضیٰ احمد کی طرف بڑھایا۔ اسی دم نور بانو اندر داخل ہوئیں۔ صنفی شیخ صاحب سے ان کا تعارف کرا چکی تھیں۔

شیخ صاحب! یہ شادیانے بجانے کا موقع تو نہیں ہے۔ مگر ہمیں اپنے فرض تو ادا کرنے ہیں۔ آپ اپنا فیصلہ سنا دیجیے رازی کے والد کا فون آیا تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر ہمارے در پر دستک دی ہے۔ نبیلہ کا رشتہ مانگا ہے۔ کیا یہ اسے باہر بھیجنے سے زیادہ بہتر نہیں.....؟

صنفی نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب نے آنکھیں موند لیں۔ وہ چپ تھے کہ مجبور تھے۔ مگر ایک آنسو بائیں آنکھ کے گوشے نکلا اور کان کے پاس آ کر گم ہو گیا۔

نائلہ کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی ہے۔ وہ لوگ سادگی سے نکاح چاہتے ہیں۔ صنفی مزید گویا ہوئیں۔

اگر وہ لوگ اچھے ہیں تو آپ فرض ادا کرنے میں دیر نہ کیجیے۔ آپ پر تو یوں بھی بہت نادمہ ذاریاں ہیں۔

نور بانو نے بھی حصہ لیا۔

میرا خیال ہے صنفی اگر وہ لوگ تمہارے دیکھے بھالے ہیں تو انکار نہ کرنا۔ تم ویسے ہی مسائل میں گھری ہوئی ہو۔

مرتضیٰ احمد نے شیخ صاحب کا لکھا پرچہ جب میں ڈالتے ہوئے بہن سے کہا۔

بہت اچھے لوگ ہیں، دیکھے بھالے ہیں۔ لڑکے کی ماں بھی بہت سیدھی عورت ہے۔ ہمسائے ہیں ہمارے۔

صنفی نے سردارہ بھرتے ہوئے شیخ صاحب کی سمت دیکھا۔

میں آج شہینہ کو بھی فون کر دیتی ہوں۔ وہ اچھے کھڑی ہوئیں۔

عمر کیا ہوگی باجی۔ لڑکے کی؟ رمیصہ نے لاشعوری طور پر نور بانو کی سمت دیکھتے ہوئے بے ساختہ پوچھا۔ اور بلا ارادہ شیخ صاحب کی سمت دیکھا۔ ان کی نظروں میں لرزا دینے والی بے بسی تھی۔ جیسے کہہ رہے ہوں خدا کے لئے بس کرو۔

نکاح شہینہ کی آمد سے ایک دن بعد طے پایا تھا۔ نائلہ ٹھیکہ نے بھی صنفی کے ساتھ اپنے اہم سربراہوں کو دعوت نامے بھجوا دیے تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ رازی اور ان کے ساتھ آنے والے افراد ٹھیکہ کے ہاں ٹھہریں گے۔ اور وہیں سے بارات احسن کے ہاں آئے گی۔ صنفی اپنے طور پر احسن کو سارا قصہ سنا چکی تھیں۔ اچھا خاصہ رشتہ تھا۔ اسے کیا تردد ہوتا۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ ماں اس رشتے سے خوش ہے۔

نائلہ ایک ہفتہ قبل آچکی تھی۔ اس کی اقساط مکمل ہو گئی تھیں۔ اس لئے وہ تندی سے اب اس طرف مصروف تھی۔ ساری تیاریاں وہ اور ٹھیکہ کر رہی تھیں۔ نبیلہ نے ابھی تک کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔ نائلہ اس کے جوڑے ٹانگے میں مصروف تھی۔ شہزاد بھی ابھی اٹھ کر گئی تھی۔ اچانک نبیلہ نے اندر آ کر دروازے کی چٹختی پر حادی۔

آئیے آپا..... اب آپ کام چھوڑ کر ایک طرف بیٹھ جائیے۔ نائلہ اسی مصروف انداز میں گویا ہوئی۔

یہ کیا کرتی پھر رہی ہو تم؟ معافی کی سرور آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

دیکھ لیجیے۔ یہ سب کچھ آپ ہی کے لئے ہو رہا ہے۔ وہ اسی طرح مصروف انداز میں گویا ہوئی۔

یعنی۔ میرا تماشہ بنانے میں گویا ساری محنت تمہاری ہے۔ وہ بگڑے بگڑے انداز میں بولی۔

تو بے استغفار کریں آپا۔ کیوں اس طرح سوچتی ہیں۔ میرا کوئی رومانس نہیں چلا تھا اس کے ساتھ میں ہمیشہ اس کے سامنے سر اٹھا کر چل سکتی ہوں وہ بات اسی وقت ختم ہو گئی۔ میں صرف بابری بیوی ہوں۔ میرے قلب و ذہن پر صرف اب یہی نام نقش ہے۔

مگر میرا دل نہیں مانتا۔ نبیلہ اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

چھوڑیں آپا..... کن چکروں میں الجھی ہوئی ہیں۔ یوں بھی تو ہوتا ہے۔ ایک بہن مرجاتی ہے۔ دوسری بہن اس کی جگہ بیاہ دی جاتی ہے۔ پرانے آنچ پر نیا عروسی ڈرامہ شروع نہیں ہو جاتا؟ حقیقت پسند بیٹے آپا۔ بابری ذات سے میرا نام بڑی گنجائش ہے۔ آپ ہی آپ قبولیت پذیری کے راستے بن جاتے ہیں۔ اس نے سوئی آس پاس دیکھنا شروع کی۔

کہاں سے آئی ہے۔ مت میں یہ بقرائیت؟ نبیلہ گہری سانس لے کر لیٹ گئی۔

نائلہ مسکرا دی..... انسان سیدھے سیدھے قائل کیوں نہیں ہو جاتا؟ سراط بقرطاب بننے کا طعنہ کیوں دیتا ہے؟ نبیلہ کے سپاٹ چہرے پر نائلہ کی شوفی نے ہلکا سا شاہرہ مسکراہٹ کا دیا تھا۔

شہینہ، فیضان اور شائلہ آچکے تھے۔ صنفی شدت سے شہینہ کی منتظر تھیں۔ شہینہ اس مرحلے پر جی بھر کر خوش ہونا چاہتی تھیں مگر بھائی کی حالت دیکھ کر ان کی خوشی ماند پڑ گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنی عادت کے مطابق آگے آگے تھیں۔

صنفی سردار صاحب کو مہمانے کا پروگرام اس طرح بنا چکی تھیں کہ اپنی بہنوں۔ حصہ، رمیصہ، اور بھائیوں مرتضیٰ احمد اور ارتضیٰ احمد اور شہینہ کے ہمراہ وہاں جائیں گی۔ احسن کو تب بلوایا جائے گا جب وہاں گنجائش دیکھی جائے گی۔ ان کے خیال میں احسن کا فوری سامنا شاید ماحول میں چلک پیدا ہونے سے روک لے۔

وہ سب شیخ صاحب کے پرچے سمیت صبح چلے گئے تھے۔ احسن دھبہ وار اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف چھوٹے ماموں یعنی ارتضیٰ احمد تھے جو کہہ رہے تھے کہ احسن فی الفور پہنچ جائے۔

احسن نے ریسور رکھتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھائی تھی۔

اچھا بھئی..... دعا کرنا..... ڈرتے ڈرتے جا رہا ہوں۔ اس نے چلتے چلتے بالوں پر برش پھیرا۔  
آپ بھی؟ شہوار نے حیرت سے دیکھا۔

تمہارے بھی باپ ہیں بابا..... وہ شرارت سے کہتا ہوا ہاتھ پر کلک گیا۔

شہوار نے وضو کر کے جلدی سے نفل برائے قضاے حاجت پڑھنے لگی۔ وقت و ماحول سے بے نیاز ہو کر۔ درحقیقت اس کی جان سولی پر لگی تھی۔

اس نے ظہر کی نماز بھی پڑھ لی مگر جائے نماز سے نہ اٹھی۔ جائے نماز ایک مضبوط قلعہ محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے یہاں سے اٹھتے ہی کسی مشکل میں پھنس جائیں گے۔

دو پہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ نیلہ، انیلا، شائلہ کئی بار اسے دیکھ کر جا چکی تھیں۔ شام کے پانچ بجے تو اس کی ہول وشت بننے لگی..... یا اللہ، سب صبح سے گئے ہوئے ہیں۔ کچھ ہونہ گیا ہو۔ اللہ نہ کرے۔  
وہ تو کمرے میں ہی بند ہو چکی تھی۔

تب اس نے فیضان کی آواز سنی جو دستک دے کر کہہ رہا تھا۔

بھالی جان..... باہر آ جائے۔ آپ کے گھر والے آ گئے ہیں۔

شہوار کی ناگئیس کا پٹنے لگیں۔ جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سامنے نیلو فرکوپا۔ وہ ایک چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔

”اتنا روئے ہیں کہ آپ کا رب تو لمبی ہمارا حق ہو گئی ہے۔ وہ روئے ہوئے کہہ رہی تھی۔“

لومبھی۔ ان کے رونے اور ہنسنے کا ڈیزائن ایک ہی ہے۔

حسن کی آواز قریب سے آئی۔ شہوار نے فوراً سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا اس نے سب کی نظری بچا کر کٹری کا نشان بنایا۔ اسے جیسے یقین نہ آیا۔ وہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔

مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ سب لوگ ماموں جان کے پاس ہیں بھالی جان۔

فیضان نے اطلاع دی۔ وہ سر پر آنچل ڈالے خوفزدہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ نظر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔  
کا پتھی آواز میں سلام کر لیا تھا۔

عائشہ نے تیزی سے اٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔ دونوں رو رہی تھیں۔ صغیر چپ ہو جانے کی تلقین کر رہی تھیں۔  
کمرے میں ایک سکوت طاری ہو گیا تھا۔

سردار صاحب اٹھ کھڑے ہوئے..... اور شہوار کے قریب آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

میں آپ سے شروع سے کتنی رہی ہوں، ہماری بیٹی ایسی نہیں۔ عائشہ نے آنکھیں پونچھ کر سردار صاحب کو مخاطب کیا  
میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ ہوا تھا تو یہ دن بھی دیکھ لیا۔ اگر وہ ہو جاتا جو رحیم بھائی اور سردار بھائی چاہ رہے تھے تو  
یہ دن قیامت تک نہ آتا۔

ارنقی احمد نے ہمیشہ کی طرح احسن کے اقدام کی حمایت کی جو ان سب سے کم عمر تھے۔

بہر حال..... نری جذباتیت ماں باپ کو بالکل سوٹ نہیں کرتی۔ بچے جیتے جاتے انسان ہوتے ہیں۔ ذرا دربر کی  
جذباتیت ماحول کو اسلام سے پہلے والی حالت میں پہنچا دیتی ہے۔ رمیصہ نے اپنی مخصوص خود اعتمادی کے ساتھ دو ٹوک  
رائے کا اظہار کیا۔

شہوار کو عائشہ اپنے بازو کے گھیرے میں سینے بیٹھی تھیں۔

تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ شمیمہ نے رمیصہ کی تائید کی۔

جو جتنا خود مختار اور ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسے اتنا ہی پھونک پھونک کر قدم اٹھانا چاہیے۔

چلو شہوار..... سب کو اچھی سی چائے پلاؤ۔ کیونکہ تم میزبان نمبر ایک ہو۔ شمیمہ نے شہوار کو مخاطب کیا جو ابھی تک دم بخود  
نظر آ رہی تھی۔

اور ہاں احسن کو یہاں بھیج دینا۔

شہوار نے احسن کے نام پر سردار صاحب کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں مرنقی احمد کے ساتھ کسی مسئلے پر  
گفتگو میں مصروف تھے۔

اس نے باہر آ کر دیکھا۔ دانیال و نفل فیضان اور احمر کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر دونوں  
اس کے قریب آئے..... اور ایک ساتھ اس کے گلے لگ گئے۔

مبارک ہو آ پاپا..... دانیال نے بے حد خوشی سے مبارک باد دی۔

سچ اور جیت لازم و ملزوم ہیں دانیال..... خواہ سچ کی جیت میں دیر ہو۔ اگر سچائی کے ساتھ جیت کا یقین نہ ہوتا تو  
صدیوں پہلے انسان اس کا نام بھی بھول چکا ہوتا۔ پھر ہمت و حوصلہ پیدا کرنے کے لئے کسی اور کیفیت کی تلاش شروع ہو جاتی  
اس نے محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

تم لوگ بیٹھو..... میں تم لوگوں کو اچھی سی چائے پلاؤں ہوں..... نیلو فر کہاں ہے؟

وہ اوپر..... بلو آپ کے پاس ہیں۔

نائلہ ابھی بازار سے نہیں آئیں؟ اس نے احمر سے پوچھا۔ جو درودن قبل ہی راجیلہ ویلا کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ ابھی  
نہیں آئیں۔

وہ کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد صغیر اس کے پاس چلی آئیں۔ اسے گلے سے لگا کر پیار کرنے لگیں  
بہت مشکل سے ماں نے ہنس دیا بھائی۔ اندر سے تو شاید مان گئے ہوں مگر آن بہت ہے۔ وہ تو مرنقی بھائی کی  
وکالت کام آئی..... شاید اس وجہ سے بھی نرم ہو گئے کہ اب سب لوگ میرا ساتھ دے رہے تھے۔

احسن سے کچھ نہیں کہا؟ اس نے خالہ کو بخور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

کہنا کیا..... احسن اور ارنقی نے بہر حال قائل کر لیا کہ یہ اقدام طلاق جیسے مکروہ فعل سے بچنے کے لئے مجبور کیا گیا  
تھا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ اس کو تسلی دے کر باہر چلی گئیں۔

مہندی وغیرہ کا سلسلہ تو رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ پھر بھی نائلہ کے دو تین چکر شکیلہ کی طرف لگ گئے تھے۔ روٹی اور تمام گھر  
والوں کا شکیلہ خصوصی خیال رکھ رہی تھی۔ نور بانو اس کے ساتھ ساتھ تھیں۔ منزہ بھی شکیلہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ پھر بھی نائلہ وہاں  
آ کر دو تین مرتبہ دیکھ گئی تھی۔ رہیو کرنے تو۔ انعام علی باہر اور احسن گئے تھے۔ خواتین میں سے صغیر، شکیلہ اور شمیمہ گئی تھیں  
نائلہ بلال کے ساتھ آئی تھی۔ رازی اور انعام علی لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نائلہ ادھر ہی چلی آئی۔ السلام علیکم اور  
سنا بیٹے کیسے مزاج ہیں؟ وہ لان میں جبر پر بوئے مطمئن انداز میں بیٹھ گئی۔

بیورو کریٹ بھی آپ ہیں۔ پالیسی ساز بھی آپ ہیں۔ مزاج تو آپ ہی نے بنانا ہے۔ رازی مسکرا دیا۔



پالیسی ساز اچھے ہوں تو روشن مستقبل کے واضح امکانات ہوتے ہیں۔  
 نائلہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

آپ کا کیا خیال ہے انعام بھائی؟

میں ہر اچھے خیال کے ساتھ ہوں۔ انہوں نے بھی ہنس کر جواب دیا۔

اندر نائلہ کی آمد خبر پہنچ گئی تو روبی اور شکیلہ دیگر مہمانوں کے ساتھ وہیں چلی آئیں۔ اور یوں گفتگو کے آداب و  
 انداز بھی تبدیل ہو گئے۔

کل بارات تھی اسی حساب سے مصروفیات کا رنگ تھا۔ نائلہ شکیلہ کے ساتھ جادوہ خیال کر کے واپس آ گئی۔ تھی احسن  
 کی طرف۔

بارات کی آمد کے بعد اس وقت نہایت دلچسپ صورت حال پیدا ہو گئی۔ جب اسد اپنی والدہ کے ہمراہ قریب میں  
 شریک ہوئے۔ وہ نائلہ کے مدعو کردہ مہمانوں میں شامل تھے۔

احسن شہوار کو نور ابلا لایا تھا۔ جو سر کو موجود کچھ کر خاصی حیران و پریشان نظر آنے لگی تھی۔ مگر اسے پہچان کر بہت خوشی  
 ہوئی کہ وہ ان کے رشتے داروں میں شامل ہیں اور نائلہ کے دیور ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی والدہ کا سب سے تعارف کرایا۔  
 احسن کی والدہ نے خصوصی جذبات کے ساتھ ملا جس کے بیٹے نے اپنی ماں کو بڑی شخصیت کے طور پر متعارف کرایا تھا  
 باہر کی والدہ مہر افروز بھی آئی تھیں۔ جو اپنی بھائی اور اسد کی والدہ شاہ بانو کو وہاں دیکھ کر کم حیران نہ تھیں۔ اسد نے  
 بتلایا وہ تو اس دلچسپ صورت سے بہت پہلے لطف اندوز ہو چکے، جب ایک کارڈ انہیں نائلہ کی طرف سے پھر وہی کارڈ احسن  
 کی طرف سے موصول ہوا تھا۔

شکیلہ اور نور بانو کی طرف سے خالہ بھی خصوصیت سے مدعو تھیں۔ اور اب محفل میں اپنے شوٹے چھوڑ رہی تھیں۔  
 اچھا یہ بتائیں۔ آپ کیا پسند کی شادی کریں گے؟ وہ بڑی تہذیب سے اسد سے مخاطب تھیں۔  
 ارے بالکل نہیں۔ اس لئے کہ میں اپنے والدین کی پسند کو اپنی پسند سے زیادہ مکمل اور معیاری سمجھتا ہوں۔ پوچھ لیجیے  
 آپ میری امی سے۔ اسد نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔

ہاں بھئی۔ ہم خود اپنے بیٹے کے لئے بہت اچھی لڑکی کی تلاش میں ہیں۔  
 شاہ بانو نے محبت سے اسد کی سمت دیکھا۔

اچھا وہ جہری فرماک پہنے ہوئے بنی کھڑی ہے ناں۔ ہمارے مسائے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ لڑکی بڑی قابل ہے۔  
 اسے جہاز ڈانے کا شوق ہے۔

مگر خالہ میں اتنی بلندی سے گرنا نہیں چاہتا۔  
 بے ساختہ قہقہے پڑے تھے اس جملے پر بلال بھی دہن آ چکا تھا۔

اچھا چھوڑیں وہ دیکھیں وہ شکیلہ کی چھوٹی بہن، دلیپ تلی مگر کسی مور سی ہے۔  
 انہوں نے نیلا کی سمت اشارہ کیا جو دور نائلہ سے ہدایات لے رہی تھی۔ سنہری جالی کے کرتے دوپٹے اور سلک کے

پانچا سے میں وہ واقعی بہت اچھی لگ رہی تھی۔  
 مگر یہ تو خاصی چھوٹی ہوگی۔ اسد میاں سے عمر میں؟ شاہ بانو نے بھی خاصی دلچسپی سے اس کی سمت دیکھا۔

مرد کچھ دار ہو تو عورت اس کے قابل ہو جاتی ہے۔ خالہ نے اپنی پٹاری سے ایک تجربہ بان کی طرف منتقل کیا۔

اسد اتنی شد و حد سے کسی کو موضوع بننے دیکھ کر خاص طور پر ماں کی دلچسپی کی وجہ سے اس طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئے تھے  
 خالہ لگتا ہے۔ یہ کیس آپ جیت جائیں گی۔ بلال نے اسد کو اچھتی نظر سے ایتلا کی سمت دیکھتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔

سب دیکھ رہے ہیں ہم پر پابندی ہے کیا؟  
 وہ ہنس دیے۔

ایک منٹ۔ بلال نے چنگی بھائی۔

ایتلا جسٹ اے منٹ۔ اس نے ایتلا کو متوجہ کیا۔ آخر وہ اس کی کمی کی بہن تھی۔

وہ نوران کے قریب آئی۔ جی اس کے ہاتھ میں گجرا تھا۔

یہ درمالا کس کے گلے میں ڈالنے کے لئے ہے۔

توبہ۔ اسے ڈھیر دس شرم آ گئی۔

یہ تو شہوار بھائی کے لئے دیا ہے نیلی آپا نے۔

تم ان مہمانوں سے نہیں ملیں۔ اس نے مہر افروز اور شاہ بانو کی طرف دیکھا۔

میں جانتی ہوں جناب کو اور یہ تو نیلی آپا کی ساس ہیں۔ اور یہ اسد بھائی ہیں۔ آپا بہت تعریفیں کرتی ہیں۔

مجھے بہت شوق تھا انہیں دیکھنے کا وہ بڑی سادگی سے گویا ہوئی۔

مہر افروز شاہ بانو بلال اور خالہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ البتہ بلال کی شرارت پر اسد صرف مسکرا دیے تھے۔

آئی آپ کے ہاں پورا کرنے پر کوئی پابندی تو نہیں؟ بلال شاہ بانو سے مخاطب ہوا۔

بالکل نہیں۔ وہ بھی بلال کی شرارت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

کمال کرتی ہیں امی آپ بھی یہ تو ہے ہی شریر۔ اسد واقعی جھینپ گئے تھے۔

شکیلہ بھی ان کے پاس آ بیٹھی۔

باجی۔ آپ جانتی ہیں ناں اسد بھائی کو۔ نیلی آپا کتنی تعریفیں کرتی ہیں۔ ایسی کیا خاص بات ہے آپ میں؟ ایتلا نے  
 بھی ماحول کے لحاظ سے شوٹی کا مظاہرہ خاصی سادگی سے کیا۔

یہ تو انسان کے قریب رہنے سے پتا چلتا ہے بلال اسی انداز میں گویا ہوا۔

مہر افروز اور شاہ بانو ایک مرتبہ پھر زور سے ہنس دیں۔ اسد الگ مشکل میں پھنس گئے تھے۔

بلو یا بری بات ہے۔ انہوں نے فہمائشی انداز میں ٹوکا۔ ایتلا اسی بے نیازی سے دوبارہ اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد  
 دوبارہ واپس آ گئی۔

باجی آپ کو بانو باجی بلارہی ہیں۔

شکیلہ فوراً ایتلا کے ساتھ اس طرف آئی جہاں نور بانو کھڑی تھیں۔

جی باجی؟ اسے ان کا انداز خاصا اجنبی اور پراسرار سمجھوس ہوا۔

یہ اسد کی والدہ کے ساتھ کون بیٹھی ہیں؟

نائلہ کی ساس ہیں۔

کیا نام ہے ان کا؟

مہر افروز۔



تو اس کا مطلب ہے میں صحیح پہنچی۔ آؤ میں تمہیں ان سے ملواؤں۔ یہی ہیں وہ میری سہیلی۔

ارے نہیں۔ ٹھیکہ کو یکدم ایک دھچکے سا لگا۔

آؤ میرے ساتھ نور بانو اسے لے کر ان کے قریب آئیں۔ اسدا اور بلال اٹھ کر جا چکے تھے۔

ارے نور بانو تو واقعی۔ ادھر میرے خدا۔ مہر افروز نے ایک عالم تھیں انہیں لگے سے لگایا تھا۔

ہمیں تو تمہارے بارے میں سب جانتا رہا۔ ہماری مجبوری تو تم جانتی تھیں۔ کہ آنہیں سکتے تھے۔ مگر تم نے تو کبھی پلٹ کر پوچھا ہوتا۔

ٹھیکہ۔ ایک ٹک نہایت غور سے نئے سرے سے مہر افروز کو دیکھ رہی تھی۔

بس کیا پوچھے؟ اپنے ہی سوال جواب سے فرصت نہیں ملی۔

بھابی یہ میری دوست ہیں اسکول ساتھ جاتے تھے ہم۔

مہر افروز نے شاہ بانو سے تعارف کیا۔ پھر ٹھیکہ کی سمت متوجہ ہوئیں۔ بیٹھو ناں ٹھیکہ کھڑی کیوں ہو؟

تمہارا کیا تعلق ہے اس گھرانے سے۔ ویسے کبھی ذکر بھی نہیں ہوا۔ مہر افروز نے تجسس کیا۔

ہاں۔ بس تعلق بھی ہی بی جاتے ہیں۔ انعام علی کی دوسری بیوی ہیں یہ۔ وہ بہت آہستگی سے گویا ہوئیں۔

مہر افروز تعجب سے نور بانو کو دیکھنے لگیں۔ (ایسے دل پھینک تو نہ تھے انعام علی)

یہ بتاؤ جب پل پل کی خبر تھی تو اس خبر پر حیران کیوں ہوئیں؟ نور بانو بڑی اداسی سے پوچھنے لگیں۔

مجھے تمہاری خبر ہی ہے انعام علی کی نہیں۔ مہر افروز کرسی کھینچ کر نور بانو کے مزید نزدیک ہو گئیں۔

بس انہی خبروں کی وجہ سے یہ خبر بنی ہے۔ وہ یاسیت سے بولیں۔

کھانا کھانے کے بعد آرام سے بتاؤں گی۔ انعام علی سے نہیں ملو گی؟

میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت تو نہیں۔ مہر افروز نے کہا۔

اور پھر ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ ہے۔ سب اپنی اپنی زندگی اپنے اپنے انداز میں گزار رہے ہیں اور گزارنا بھی چاہیے۔

ٹھیکہ انہیں مصروف دیکھ کر اٹھ کر چلی گئی تھی۔

اچھا تمام بیٹھو۔ اگر چاہو تو ساتھ چلو اندر نکاح ہو رہا ہے۔ مہر افروز اٹھ کھڑی ہوئیں۔

بھابی آپ بیٹھیے۔ ابھی آتی ہوں میں۔ مہر افروز نور بانو کے ساتھ چل دیں۔

اندر آئیں تو سامنے ہی انعام علی نکاح کے کاغذات اٹھائے کھڑے تھے۔ نور بانو کے ساتھ مہر افروز کو دیکھ کر بری طرح چونک گئے۔

السلام علیکم مہر افروز نے اپنی حالت پر قابو پا کر عام سے انداز میں سلام کیا۔

آپ پہچان تو گئے ہوں گے۔ ویسے یہ بابر کی والدہ ہیں۔

نور بانو نے کہا۔ انعام علی۔ ایک دم دم گم سے نظر آنے لگے۔ پھر یکفٹ پلٹ کر نیل کی سمت بڑھ گئے۔

نور بانو کو مہر افروز سے دوبارہ تفصیلی بات کرنا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ ٹھیکہ اور انعام علی کے ساتھ رخصتی سے پہلے ہی گھر آ گئیں تھیں۔ کہ یہاں بھی بہت سے کام نہانا تھے۔

میرے خیال میں اگر مہر افروز آہی گئی تھیں تو ان سے ملائے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی۔ کیا رکھا ہے۔ ان

باتوں میں؟ انعام علی نور بانو کے کمرے میں آ کر ان سے مخاطب ہوئے۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابھی سب لوگ موجود ہیں۔ آپ چاہیں تو ان ہی سے میرا جرم پوچھ سکتے ہیں۔

میرے ہاتھ صاف ہیں۔ ساری گواہیاں موجود ہیں۔ وہ پہلی بار خاصی سختی سے گویا ہوئیں۔

مجھے کسی بھی گواہی کی ضرورت نہیں۔ میں سب کچھ بھلا چکا ہوں۔ وہ برہم لہجے میں کہہ رہے تھے۔

نہیں آپ نے بھلایا نہیں۔ اگر بھلا دیا ہوتا تو میری یہ ناجائز سزا ختم ہو گئی ہوتی۔

کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

یہی کہ جو آ زائش میرا زمانے کے لئے ہوتی ہے۔ اس میں میری قدرت عطا کرتی ہے۔ اور جو آ زائش

بطور سزا ہوتی ہے اس میں بڑی بے گلی ہوتی ہے۔ جین نہیں آتا نا انصافی میرے ساتھ ہوئی ہے۔ دکھ بیٹی اٹھارہ

ہے۔ وہ وراثت بھگت رہی ہے میرا امتحان دو گنا کر دیا ہے آپ نے۔

ان کی آواز زندہ گئی۔ کبھی بہت غور کیجیے گا۔

انعام علی ساکت کھڑے رہ گئے۔ نور بانو باہر نکل گئیں۔

ٹھیکہ کسی کام سے اندر آئی تو انعام علی اسی طرح خاموش کھڑے تھے۔

ٹھیکہ نور بانو کو بلاؤ۔ وہ کسی خیال سے چونک کر بولے۔

ٹھیکہ لائے پاؤں واپس ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد نور بانو چلی آئیں۔

جی۔

نور بانو بد دعاؤں کے الاؤ دے کاتے ہوئے یہ تو سوچتا تھا۔ اولاد صرف میری ہی نہیں تمہاری بھی ہے۔ ایک عجیب سی

فکرت ان کے لہجے سے مترشح تھی۔

میں نے کبھی بد دعا نہیں دی۔ منزہ اولاد ہے اور آپ میرے سر کے سائیں۔ میں نے تو یہ کہا ہے کہ مکافات عمل کسی۔

دعا بدعا نہیں کھتا جنہیں ہوتا۔ ابھی بھی غور کر لیجیے۔ اب تو ہمارے آگے دودھ پینے بچے بھی کھیل رہے ہیں۔ کبھی ناقابل

عبور دکھ کا پل تعمیر ہوتا دیکھیے تو یوں سوچے کوئی بہت بڑی خطا ہو گئی ہے۔ کبھی جگہ کنج بھی پشت میں کچھ منہ سے نکل گیا یا

علا سر زد ہو گیا۔ جنت مکانی تائی جان کہا کرتی تھیں۔ کیا آپ نے ان کے منہ سے کبھی نہیں سنا؟ وہ ان پڑھ تھیں۔ مگر

پڑھے لکھوں سے زیادہ روشن دماغ تھیں۔ بس یہی بات تھی۔

وہ انعام علی سے پوچھتی تھیں۔

منزہ کہاں ہے؟ وہ اپنی گم سمی کیفیت سے باہر آ کر پوچھ رہے تھے۔

وہ ابھی وہیں ہے احسن کی طرف۔

اور بلال؟

وہ بھی وہیں ہے۔ خیریت؟

”کچھ نہیں۔ وہ ہنوز کھوئے کھوئے سے تھے۔ کام سے فارغ ہو کر آ جاتا تم سے لڑنے کو جی چاہ رہا ہے۔“

نور بانو کو ایسا لگا جیسے چھت سر پر آرہی ہو۔

”جی؟“

انعام علی نے کوئی لفظ مزید نہیں کہا اور وارڈروب میں کوٹ لٹکا۔ نے لگے۔

نبیلہ رخصت ہو کر خلیہ کی طرف جا چکی تھی۔ نائلہ اپنی نند گزیا اور ایٹلا کی سمت سینا سمیٹی میں مصروف تھی۔ شہوار کھانا محفوظ کر رہی تھی۔

اسد بھی وہیں تھے لان میں منظر کو دیکھ کر اس کے پاس چلے آئے۔ چائنا سلک کے بیلو اور سادہ مگر تے شلواریں وہ جگنو کو گود میں اٹھائے باتیں کر رہی تھی۔

”اکیلی بیٹھی ہیں بھابھی؟“ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ای اور پھوٹا بھی فارغ نہیں ہوئیں۔“

”جی۔ گاڑی میں جگنہ نہیں تھی۔ کمال آنے کا کہہ گیا ہے۔“

وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں بولی۔

”اسد بھائی! اب تو میں عدت میں نہیں ہوں۔ پھر بھی آپ نہیں آئے؟“

”وہ میرے دوست اور بھائی کا گھر تھا۔ یہ آپ کے والد کا گھر ہے۔ بس یونہی احتیاطاً۔“

انہوں نے وضاحت کی۔

”ارے نہیں۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ انہی لوگوں جیسی۔ جتنی مضبوط کٹ منٹ خادر سے ہے اتنی ہی ان سے وابستہ چیزوں سے لوگوں سے۔ شاید کو آپ کو کبھی ہینک پڑی ہو یا پڑ جائے۔ لوگ کچھ اپنے انداز میں سوچ رہے ہیں۔ مگر آپ مجھ سے وعدہ کیجئے۔ رشتہ نہ بدلنے کا۔ خیالات نہ بدلنے کا۔“

اسد خاموشی سے سنتے رہے۔

”مجھے ایک کے بعد دوسرا شوہر پا سکتا ہے اس لئے کہ میں صاحب جائیداد ہوں تھوڑی سی شکل بھی اچھی ہے مگر جگنو اور گزیا کو باپ نہیں مل سکتا۔ خادر کو کتنا بھروسہ تھا مجھ پر۔ میں ان ہی کی اولاد کو امتحان میں ڈالوں؟ اگر آپ پر خلوص ہیں تو اپنی ہر شکل میں ہر پوزیشن میں خلوص کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ خلوص کسی مخصوص شکل یا مخصوص رشتے سے مشروط تو نہیں۔

خادر کو شاید یہی پسند تھا۔ میں ان کا انتظار کروں۔ میں آخری سانس تک اسی کیفیت سے پہلے رہوں گی۔“

”بھابھی! اگر آپ کی کٹ منٹ خادر سے اتنی مضبوط ہیں تو میری بھی اس سے کچھ کٹ منٹ ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا جب بھی شب پر جاتا تھا۔ اسد منظرہ و بچوں کا خیال رکھنا۔ میں آپ کے لئے ہر وقت حاضر ہوں۔ اور ہا وعدہ۔ ہزار وعدے لے لیجئے۔ میں اتفاق کرتا ہوں جب پہلی کٹ منٹ اتنی مضبوط ہو تو آگے گنجائش مشکل ہی سے نکلتی ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ خلوص کا مظاہرہ تو کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے۔ میں صرف یہ چاہوں گا کہ آپ مطمئن ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ۔ اسد بھائی۔ مجھے بس یہی کہنا تھا کہ میری خوشی کی خاطر کسی ”حمام با درگد“ میں نہ پھنس جائیے گا۔ میرے سوال جس میر شای کے لئے تھے وہ قاف کے اس پار مصروف ہے۔“

منظرہ نے نئے اور دوسرے چاند پر نظریں جمادیں۔ جگنو اس کے سینے کا مٹھی غیند سو رہا تھا۔

اسی دم احسن ان کے پاس چلا آیا۔

”ارے منظرہ۔ آپ اکیلی یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“

”نہیں تو اکیلی تو نہیں ہوں۔ یہ اسد بھائی تو ہیں۔ اور بلال آنے والا ہے۔“

”صبح چلی جائیے گا۔ آرام کریں۔“

”نہیں احسن! ساموں امی کے پاس گزیا ہے تنگ کرے گی انہیں۔“

”ایک تو آپ چاہیاں رکھ کر بھول جاتے ہیں ناگئیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اوپر نیچے آتے جاتے۔“

شہوار احسن کو دیکھ کر دوری سے شروع ہو گئی۔ قریب آئی تو اسد کو موجود پا کر جھینپ گئی۔

”آپ نے بالکل ٹھیک کہا تھا اسد۔ ایک ”سوچ“ واقعی کم ہے۔ اوپر نیچے باہر ج پاسٹ کرنے سے پہلے بھی مجھے سے رع کیا جاسکتا ہے۔“

احسن نے جیب سے چاہیاں نکالے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

اسد دھیرے سے ہنس دیئے تھے۔ منظرہ بھی جگنو کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

باہر نے اسد کو روک لیا تھا۔ شاہ بانڈا ان کے شوہر اور مہر افروز گھر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ شاہ بانو اور مہر افروز بچپلی پر باتوں میں مصروف تھیں۔

”یہ انعام علی کیا کر بیٹھے ہیں؟ تمہیں حیرانی نہیں ہوئی مہر؟“ شاہ بانو اپنے اندر اٹھنے سوالات کو زیادہ دیر روک نہ سکیں ”تم سے بات چیت ہوئی؟“ (وہ عا بنانہ متعارف تھیں انعام علی سے)

”چھوڑیں چھوٹی بھابھی اب کیا رکھا ہے۔ ان باتوں میں؟ مہر افروز خانہ سے تعلق انداز میں کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں ”پھر بھی؟ آخر یہ قدم اٹھانے کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ نور بانو تو ان کی سگی چچا زاد ہیں؟“ شاہ بانو ہنوز الجھی ہوئی تھیں۔

”منظرہ کے ہاں دیکھ کر میں واقعی چونکی تھی۔ پھر سوچا تھا ایک نام کے کئے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم اپنی عمر دیوں کا ہیوں کا غصہ کہیں تو اتارتے ہی ہیں۔ سیدھے سادے لوگ آخر ہوتے کس لئے ہیں؟ اس سے اچھا مصروف شاید ہی ہو چاروں کا، کسی کی بھڑاس ہی نکل جاتی ہے۔“ مہر افروز اسی انداز میں سچ کر بولیں۔

”کیا تمہیں دکھ ہوا۔ انعام علی کی دوسری شادی سے؟“ شاہ بانو ان کے انداز سے کچھ اور ہی سمجھیں۔

”اب میرا کیا واسطہ۔ اب میرے دکھ سکون ان کی ذات سے وابستہ نہیں۔ ہمارے راستے ہمیشہ کے لئے مختلف ہو گئے ہیں۔ میرا اپنا گھر اپنے مسائل ہیں۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئیں۔

”مگر ہے تو حیران کن یہ سب کچھ۔ کہاں تو تمہاری خاطر۔ بڑی بھابھی نے تو یہ بتایا تھا کہ۔“

”چھوڑیے چھوٹی بھابھی۔ انسان ساری زندگی اپنی غلطیوں و لغزشوں کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا رہتا ہے۔ آنے والی اب سی سرتیں انسان کو کس قدر خواہ ناخدا بنا دیتی ہیں۔ حالانکہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سوائے تکلیف وہ اور یاد رہ جانے لے نشانات کے۔ اور پھر ہر عمر کی الگ ترجیحات ہوتی ہیں۔ جیسے اب مجھے سوائے باہر گزیا کے اور کچھ یاد نہیں رہتا۔ اپنا لانا پنا بھول جاتی ہوں۔ ہر سوچ بس ان ہی پر جا کر تمام ہوتی ہے۔ پیچھے کی طرف تو بس سائے سے ہیں۔ جو کچھ ہے باہر تو سامنے ہی ہے۔“

”یہ زبردستی نہیں ہوا نہ کیا گیا۔ بس وقت گزرنے کے ساتھ قدرتی طور پر ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح ماں مرنے لے پیچے کی قبر میں اس کے ساتھ جا کر نہیں لیٹ جاتی۔ قدرت خود بخود ہر خلا کی بھرائی کرتی جاتی ہے۔ اگر یوں نہ ہو تو لاکھ طرح گزرے۔“ مہر افروز نے بڑی تفصیل سے انہیں سمجھایا۔

”ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ ایسا ہی ہوتا ہے تب ہی زندگی گزارنے کے لائق ہوتی ہے۔ مگر مجھے ہنوز اس بات پر حیرانی لہ انعام علی۔“

”رہنے دیجئے بھابھی جان۔ ہمیں اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا پتا نہیں ملتا۔ ہم ”دوسروں“ کا تجسس کیا کریں۔“

مہر افروز نے بھربات کاٹ دی۔

ساہ بانو نے گہری سانس لے کر ان کی طرف دیکھا۔

”آہ۔ کیا ہے یہ زندگی۔ کتنی خاموشی سے پہلا دوسرا ہو جاتا ہے۔“

احسن باپ کو دو پلانے کے خیال سے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔

صفیہ ایک کونے میں جائے نماز بچھائے عشاء کی نماز میں مصروف تھیں۔ شیخ صاحب چھت کی جانب ٹنگی باندھ دے کپڑے بدل چکی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کاشن کے سوٹ میں بے حد تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ہمراہ

دیکھ رہے تھے۔ قدموں کی چاپ پر انہوں نے نگاہوں کا زاویہ بدلا احسن کو دیکھ کر بڑی بے تابی سے پانی کا اشارہ کیا۔ رے سے باہر نکل آیا۔

احسن ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان کے قریب بیٹھ گیا اور چیخ سے ان کے منہ میں پانی ڈالنے لگا۔ ”سب ٹھیک ہو گیا نا۔“

اباجی؟ آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمت سے کام لیجئے۔ شیخ صاحب نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ لیجئے۔“ اس نے چیخ ان کے ہونٹوں سے لگایا اور انہیں بغور دیکھنے لگا۔

رشتے اس لئے پیدا کئے جاتے ہیں

اس لئے مہیا کئے جاتے ہیں

تا کہ محبت کا رواج ہو

محبت کا پرچار ہو

محبت کا پھیلاؤ ہو

محبت کی تشریح ہو

رشتے زندگی کا حسن نکھارنے آتے ہیں

رشتے انسان کو فیض رسا بناتے آتے ہیں

اس لئے نہیں کہ.....

رشتے قید کئے جائیں۔

ذاتی تسکین کا آئینہ بنائے جائیں۔

اس لئے نہیں کہ.....

رشتوں کے سینوں پر گھنے رکھ کر زخروں پر ناجائز اختیار و آمریت کی کند چھری پھیری جائے۔

اباجی۔ کتنا مطالعہ کرتے تھے آپ۔ کبھی تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ محسن انسانیت کی ساری زندگی رشتوں و قسطن کی تشریح ہے

رشتوں کی زنجیر تو فیض و محبت کے فولا دے ڈھالنا چاہئے۔

رشتوں کے مدارج کے ذریعے محبت کے درجے طے کئے جانا چاہیں۔

مجھے تو اس کے علاوہ انسان کی پیدائش..... کا اور کوئی دوسرا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔

سب سے عظیم محبت یعنی مالک حقیقی انہی مدارج کے اس پار ہمارا منتظر ہے۔

باپ کی بے بسی کی حالت کمرے کا سکوت اور آج تک کی ٹھکن۔ جاتے اسے کیا کیا یاد آنے لگا تھا۔

”ای! اباجی کو دوادے دی ہے؟“ صفیہ نماز ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں تو اس نے پوچھا۔

”ہاں وقت نہیں دیکھ رہے۔ کتنی رات گزر چکی ہے۔ تم نے کھانا کھا لیا؟“

”نہیں۔ باپ نے بھی نہیں کھایا ہے۔ ہم ابھی کھا لیتے ہیں۔ آپ نگر نہ کریں۔“ اس نے تسلی دی۔

شیخ صاحب نے بایاں ہاتھ احسن کے شانے پر رکھ کر جیسے کھانا کھا لینے کی تاکید کی۔

”خالد جان! وہ باپ بھائی بے چارے بھوکے بیٹھے ہیں۔“ ان کا کہیں پتا نہیں۔ دیکھئے ناں وہ آخر۔“ وہ بولتے

نہ رک گئی۔ دائیں طرف سے احسن اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ ”اور وہ ڈاکٹر صاحب (مسعود) بھی جانے کو بیٹھے

”آ رہا ہے بیٹی۔ باپ کو پانی بلارہا تھا۔“

صفیہ ایک کونے میں جائے نماز بچھائے عشاء کی نماز میں مصروف تھیں۔ شیخ صاحب چھت کی جانب ٹنگی باندھ دے کپڑے بدل چکی تھی۔ ڈھیلے ڈھالے کاشن کے سوٹ میں بے حد تھکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے ہمراہ

دیکھ رہے تھے۔ قدموں کی چاپ پر انہوں نے نگاہوں کا زاویہ بدلا احسن کو دیکھ کر بڑی بے تابی سے پانی کا اشارہ کیا۔ رے سے باہر نکل آیا۔

احسن ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ان کے قریب بیٹھ گیا اور چیخ سے ان کے منہ میں پانی ڈالنے لگا۔ ”سب ٹھیک ہو گیا نا۔“

اباجی؟ آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمت سے کام لیجئے۔ شیخ صاحب نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

”یہ لیجئے۔“ اس نے چیخ ان کے ہونٹوں سے لگایا اور انہیں بغور دیکھنے لگا۔

رشتے اس لئے پیدا کئے جاتے ہیں

اس لئے مہیا کئے جاتے ہیں

تا کہ محبت کا رواج ہو

محبت کا پرچار ہو

محبت کا پھیلاؤ ہو

محبت کی تشریح ہو

رشتے زندگی کا حسن نکھارنے آتے ہیں

رشتے انسان کو فیض رسا بناتے آتے ہیں

اس لئے نہیں کہ.....

رشتے قید کئے جائیں۔

ذاتی تسکین کا آئینہ بنائے جائیں۔

اس لئے نہیں کہ.....

رشتوں کے سینوں پر گھنے رکھ کر زخروں پر ناجائز اختیار و آمریت کی کند چھری پھیری جائے۔

اباجی۔ کتنا مطالعہ کرتے تھے آپ۔ کبھی تو آپ نے پڑھا ہوگا۔ محسن انسانیت کی ساری زندگی رشتوں و قسطن کی تشریح ہے

رشتوں کی زنجیر تو فیض و محبت کے فولا دے ڈھالنا چاہئے۔

رشتوں کے مدارج کے ذریعے محبت کے درجے طے کئے جانا چاہیں۔

مجھے تو اس کے علاوہ انسان کی پیدائش..... کا اور کوئی دوسرا مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔

سب سے عظیم محبت یعنی مالک حقیقی انہی مدارج کے اس پار ہمارا منتظر ہے۔

باپ کی بے بسی کی حالت کمرے کا سکوت اور آج تک کی ٹھکن۔ جاتے اسے کیا کیا یاد آنے لگا تھا۔

”ای! اباجی کو دوادے دی ہے؟“ صفیہ نماز ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں تو اس نے پوچھا۔

”ہاں وقت نہیں دیکھ رہے۔ کتنی رات گزر چکی ہے۔ تم نے کھانا کھا لیا؟“

”پہلے بتانا تھاں ناں۔ اب تو تھکن سے بری حالت ہے۔“ وہ بے زاری تھی۔  
 ”ابھی اتر جائے گی زندگی بھر کی تھکن۔“ گزیا کھلکھلائی۔ نالکہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔  
 ”اچھا بس۔ بہت ہو گیا۔ جلدی سے کپڑے بدل لیں۔“  
 نالکہ نے کپڑے استری کر کے اس کی گود میں ڈال دیئے۔  
 ”چلیں شاباش ٹائف۔ احسن بھائی کو دیکھیں۔ کیسے جی جان سے سیٹ ہو رہے ہیں۔ بابر کو لگا کر آئی ہوں۔ ان کے لاتی۔ مگر یہ دینا ہے تماشا سا بن جاتا۔ اس لئے یہی بہتر ہے۔ اب تم آرام کرو۔ تم ہماری بیٹی ہو، ہم نے تمہیں کبھی اپنی پیچھے۔ ذرا دل کی دھڑکن غور سے سنیں۔ ان کی ہنسی کی آواز آرہی ہے۔“

”نیل کی بچی۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

”ایسے نہ کہیں۔ میرے میاں کو بیٹے کا بڑا ارمان ہے۔ چلیں شاباش ٹائف۔ ورنہ بلاؤں گی احسن بھائی کو۔“  
 اس نے دھمکی دی جو کار کا ثابت ہوئی۔ وہ فوراً اٹھ گئی۔  
 نالکہ اور گزیا چوڑی خنجر کرتے لگیں۔ اور آپس میں شرارت آمیز جملے بازی بھی کر رہی تھیں۔  
 شہوار دس منٹ بعد ہی باہر آگئی۔

”اُف ابھی سے جلوے۔ ابھی تو سٹکھا زریور کے تیر بھی باقی ہیں۔“  
 شہوار بہت چھینچی چھینچی سی تھی۔ نالکہ سے آنکھیں نہ ملا رہی تھی۔  
 ”لیجئے ان کا تو ابھی سے یہ حال ہے جیسے ہم،“ وہ ہوں۔“ گزیا نے جملہ کسا۔  
 دونوں نے اسے اس کا میک اپ کیا۔ زیور پھول پہنائے۔  
 دوپٹہ اس کے سر پر پھیلا کر نالکہ شرارت سے کھنکاری۔  
 ”بلاؤں..... یا ذرا دل سنبھالنے کو وقفہ چاہئے۔“  
 ”نیل!.....! وہ بسوری۔“

”دیکھئے بھائی جان مصروف ہیں۔ دیر سویر ہو سکتی ہے۔ سومت جائے گا۔ باقی خیر خیریت صبح پوچھوں گی۔ چلو گزیا۔  
 آج لوگ اپنی تھکن اتاریں گے۔“  
 نالکہ گزیا کو لے کر باہر نکل گئی۔

وہ ڈرائیگ ٹیبل کے سامنے سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ بیڈ پر گلاب کی چٹیاں بکھری ہوئی تھیں۔  
 وہ بنوور دیکھنے لگی۔ اسی دم دروازہ کھلا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ عجیب طرح کی کیفیت ہو رہی تھی۔ سرائی کا  
 سامنے دیکھنا دو بھر لگا۔ کوئی اندر چلا آیا۔ اس کی ہتھیلیوں میں پسینا اتر آیا۔  
 آنے والا سامنے آکھڑا ہو گیا۔

”بیٹی..... میں ہوں تمہاری خالہ۔“ اس کے کانوں میں صغیرہ کی آواز آئی جو غالباً اس کی کیفیت کو بھانپ چکی تھیں۔  
 اس نے ایک گہری سانس لی۔

”دعا دینے آئی ہوں۔ جو خطا ہو گئی بھلا دیتا۔ نالکہ نے مجھے سے کہا تو مجھے دھیان آیا کہ تمہاری اور احسن کی باضابطہ ملاقات کا اہتمام تو کرنا چاہئے تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے بچے کیسے ہیں۔ تم اتنے عرصے سے احسن کے ساتھ ہو۔ اس عرصے میں تو لڑکیاں گود میں بچہ کھلانے لگتی ہیں۔ مگر ہمیں اپنی بیٹیوں کا پتہ ہے۔ یہ تمہاری منہ دکھائی کے لئے کب سے بنا رکھے تھے۔“

وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی کلائیوں میں ٹکٹن پہناتے لگیں۔  
 ”اللہ مبارک کرے۔ اللہ تمہیں نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کی توفیق دے۔ تمہیں ہر بلا سے بچائے۔  
 وہ اس کی پیشانی چوم کر دعا دیئے لگیں۔

”آج بہت بڑا بوجھ میرے سینے سے سرک گیا۔ میرا تو ارمان تھا کہ تمہیں تمہارے باپ کے ہاں سے رخصت کرا  
 ”مگر یہ دینا ہے تماشا سا بن جاتا۔ اس لئے یہی بہتر ہے۔ اب تم آرام کرو۔ تم ہماری بیٹی ہو، ہم نے تمہیں کبھی اپنی پیچھے نہیں سمجھا۔“

صغیرہ خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

ان کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ گاؤں کے ایک لگا کر جیسے سناٹے لگی۔

احسن کا منہ اٹھا کر کمرے میں آیا تو منظر دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ دوپٹہ نیچے پر پڑا ہوا تھا اور وہ بے سند سو رہی تھی۔  
 بند یا ڈھک کر کان کے پاس آ پڑی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور ڈھکی ہوئی بند یا اس کی پیشانی پر ٹکانے لگا اس عمل سے بھی اس کی نیند میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔ جب وہ اٹھ کر کیمٹیں الٹ پلٹ کرنے لگا اور ایک کیسٹ اٹھا کر لگا دی۔ مغنی و صغیرہ کی آواز رکرے کا سکوت توڑنے لگی۔

سامنے بیٹھ کر دل کو چراتے کیوں ہو!

خواب بن کر میری آنکھوں میں ساتے کیوں ہو

آپ کو دیکھ کر گھٹنا ہوا ہے چہرہ

رنگ آنکھوں میں بھی چھایا ہے حیا کا گہرا

تیر نظروں کے میرے دل پہ چلاتے کیوں ہو

موسیقی کے تیز سروں سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ احسن بربر میں بکیہ رکھ کر نیم دراز ہو چکا تھا۔ شہوار نے تھکاوٹ سے

چور ایک سسکاری بھری اور بے خبر انداز میں کروٹ بدلی۔ چوڑیوں سے بھرا ہاتھ احسن کے بازو پر آٹکا۔ وہ اسی طرح

مسکراہٹ دبائے مسکریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔

”احسن.....“ اس کے ہاتھ نے انسانی لمس کی گرامہٹ محسوس کی تو یکنخت چونک کر جاگ گئی۔

”جی جناب۔ آپ کا خادم۔“

وہ بری طرح جھینپ کر اپنا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔

”دیکھا آپ نے۔ کتنے نرم دل ہیں۔ آپ کو جگا یا نہیں۔“ اس نے سارا دھواں اس کے منہ پر چھوڑ دیا۔ وہ الجھ کر

دھواں ہاتھ سے ادھر ادھر کرنے لگی۔

”کہئے جناب کیا رہا۔ اب گمن گمن کر انتقامی کارروائیاں انجام ندیں تو احسن نام نہیں۔“

”کیا..... کیا ہے میں نے؟“ اس نے گھبرا کر اس کی سمت دیکھا مگر وہاں جذبول کے وہ طوفان تھے کہ اس نے بے

ساختہ بلکیں مگرائیں۔

اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا

وہ زادیہ بدل کر عین اس کے سامنے ہو گیا۔

”یوں نہ کریں۔ میرا دم نکل جائے گا۔“ وہ اس کی داری پر کاپٹنے لگی۔

”چینگ تو اپنی عادت ہی نہیں۔ قسم لے لو۔ تمہاری بے خبری کا کوئی ناجائز فائدہ اٹھایا ہو۔“  
وہ اس کی طرف جھک کر آہٹگی سے گویا ہوا۔

”اسی کمرے میں تم نے میری ہمتوں کے امتحان لئے ہیں۔ اب دیکھنا کیسا سلوک کرتا ہو۔“  
”کیا کریں گے؟“ وہ بدحواس سی ہو گئی۔

”نئی کتاب کھل رہی ہے۔ یہ رہا دیباچہ۔“ اس نے پہلی بے ساختگی کا مظاہرہ کیا۔  
شہوار نے چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔  
”اسن کو جیسے اس پر ترس سا آ گیا۔“

”کیوں اتنا گھبرا رہی ہوں۔ میں کون سا تیرتکوار لئے بیٹھا ہوں۔ ٹیک ایزی ڈیئر۔“ اس نے مسکراہٹ دبا۔  
ہوئے پھر دھواں نکھیرا۔

”اچھا یہ حقیر سا نذرانہ تو قبول کرو۔“

اس نے دل کی شکل کا لاکٹ اس کی گردن میں پہنانا شروع کیا۔ احسن کی اس قربت پر اس کا دل بے قابو ہونے لگا  
”دل تو مدت ہوئی دے دیا تھا۔ یہ محض یاد دہانی ہے۔“  
سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی اس لئے الفاظ واضح نہیں تھے۔  
”ذرا اپنا یہ ہاتھ تو دکھاؤ۔ بہت اچھی مہندی لگی ہے۔“

اس نے اپنے حق کی ایک اور مہم ہاتھ کی پشت پر ثبت کی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔  
”کیا کھڑکی سے کود جاؤ گی؟“ وہ اس کی اس حرکت پر بہت محفوظ ہوا۔  
”مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“

”بس سوچیں جتنا سونا تھا۔ اب ہماری مرضی سے سوؤ گی اور ہماری مرضی۔ سہ اٹھو گی۔“

اس نے دوسرا سگریٹ سلگانے کے لئے سگریٹ منہ میں دبا کر لائنز چلایا۔  
شہوار جو کافی دیر دھواں برداشت کر چکی تھی۔ بے ساختہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ سے سگریٹ کھینچ لیا۔  
”جو نئی زندگی شروع کی ہے اس کی حفاظت کرنا بھی سیکھئے۔“

بلا ارادہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

”کیا تنخواہ مقرر کی ہے محکمہ صحت والوں نے حضور کی؟ ایک تو میری بہنوں نے تمہیں پہلے یہ تیرتکوار سے لیس  
ہے۔ اب اداؤں کی گولہ باری کر دگی تو جوابی حملہ بھی ہوگا۔ دھیان رہے۔“

شہوار نے اس کے اختیار میں خود کو بے حد بے بس محسوس کیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆





افسانہ

ناول



الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

فون: 7314169

Mob: 0333-4327178-7211468

چرخہ عارفی